

© OneUrdu.com
بابا محمد یحییٰ خان



کا چل گویا

ظاہر و باطن کے عالم مکتشف

الہی! یہ کس نگر کے لوگ ہوتے ہیں.....؟

● ڈرویشی، ریت کا ذرا سا ڈرہ نہیں ہوتی اور نہ ہی ٹٹھی بھر ریگ کی مانند ہے۔ یہ تو ادب، خدمت، اطاعت اور ریاضت کے اُن گنت اُریوں کھریوں ڈڑوں کا خشک صحرا ہوتا ہے..... چکا چوند اُجالے میں سراب اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں قُطبی ستارا..... حاصل گھاٹ تو کبھی بگڑے نیل کا مات، ذلقِ اولیں تو کبھی کاسے قیس یہ فغان یعقوب بھی ہے اور کبھی صبرِ ایوب بھی یہ دُرش کاویانی بھی ہے اور عصائے سلیمانی بھی ہے یہ ہنر آذری بھی ہے اور سحر سامری بھی ہے.....!

● میں ڈرویشی کی راہ کا کمزور سا مسافر ہوں، راہِ راہ ہے نہ ہی ہمت و سکت، دُردِ بھنگ رہا ہوں، ٹھوکریں، زسوائیاں، رتھکے جاں ماریاں میرا نصیب ہیں۔ مجھے یہی حکم ہے کہ چلتے رہو..... اللہ کی زمین، آسمان، پہاڑ، دریا، صحرا، جنگل، ویرانے، گل خانے تمہارے منتظر ہیں، جاؤ! ان سے آشنائی پیدا کرو، یادہ جانوروں کی پیٹھ، گول پائیوں والی مشینوں پہ..... آہنی پروں والے پرندوں پہ..... سمندروں کے سینوں پہ تیرتے ہوئے راج ہنسوں پہ کہ ڈرویشی، دُریورہ گری نہیں..... دُریدہ دُری اور زُفُو گری ہے۔

● گندہ کرنا ایسا مشکل نہیں جتنا مشکل پاک صاف کرنا ہوتا ہے۔ سرسراتی ہوا کی مانند مست خرامی کبھی ایسی سوہان رُوح نہیں ہوتی جیسی حالتِ قید و قیام، رُوحِ فرسا ہوتی ہے..... کہہ بول لینا دینا بھی اتنا دکھ و درد کا باعث نہیں ہوتا جتنا کہ چُپ گم، جان جلاتی ہے۔ چٹکی کا قُطب خود تو دُہرا، کھڑا، گڑا اور پڑا رہتا ہے مگر مدار کے اندر پتھر پاؤں کو جمائے، چلائے، بھگائے رکھتا ہے..... آسمان، ستاروں سے زمین، دُڑوں سے..... سمندر، قطروں سے اور دشت و دُمن، اشجار و اُثمار سے جل تھل ہوتے ہیں.....!

© OneUrdu.com



UrduPhoto.com

● کالیاں اناں کالے رُوڑ
پینہ ورسا دے رُوڑ و رُوڑ



891-4393 Muhammad Yahya Khan, Baba
Kajal Khotha / Baba Muhammad
Yahya Khan, - Lahore : Sang-e-Meel
Publications, 2010.
968pp.
1. Urdu Literature - Novel.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز / منصف سے باقاعدہ
تقریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا اگر اس قسم کی
کوئی بھی سرور قیام صورت پڑے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے

2010

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

بابا محمد یحییٰ خان

412- زمکس بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

فون: 042-7844838

موبائل: 0300-9417829, 0333-9417829

0322-9417829, 0312-9417829

مشاورت و معاونت

نور الحسن

”بسم اللہ“ نظامی و من

شفیق فاروقی

سردار و نئیں درق

چند علی سنی

عقار احمد خان

انتساب من

عقبہ

صدر برہمی

رحیم اللہ خان

مشق کتابت

محمد مصدور امین

انتہام

راشد سلیم

رضوان بھٹی

بوجہ چند نام و مقامات اور واقعاتی کوائف و بیان میں چنداں ترسیم شریخ و تفسیر ناگزیر تھی..... کوئی بھی مطابقت مماثلت محض اتفاق ہوگی

ISBN-10: 969-35-2288-5

ISBN-13: 978-969-35-2288-4

Sang-e-Meel Publications

25 Street 44-Pakistan (Lower Mall) Lahore-54000 PAKISTAN

Phones: 37220100-37228143 Fax: 37245101

http://www.sang-e-meel.com e-mail: sang@sang-e-meel.com

ملکی حلیف ایڈیٹر پبلی کیشنز لاہور

کاجل کوٹھا

UrduPhoto.com

بابا محمد یحییٰ خان

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

سچائی

بڑے بابائی

شفیہاں بابائی کالے خان

حافظہ عطا محمد کاشمیری بابا رحمن کاشمیری ٹھہر گ

بابائی شاہ... کاشمیرے سنگھ سوامی کھور گھو

سائیں دھیرے چند... شاہ بابا دینا... رام را کھی

گلابی جان صوفی عبد اکرم کلپار (درگاہ حضرت بل شری عمر)

سلیمان آقائی اربطہ نیانی نیل نیانی مشہور الرحمن گیلانی

مسعود الرحمن گیلانی شارق بظلم چند نے نیماں والے

حضرت بیات بیگ عبد الغفور (میں فاضل مقال)

شاہ بابا دینا صوبہ عبد اللہ چکارا چنلا بابا

ایک جوزف بابا سیمان اللہ

خان بابا افغانی جی جان جی

فتح خان شروانی

ن ذف

ف ش دن... لافیل قوف

● دُر دُر دی دُر دُر نالوں دُر بن جا اک دُر دا
صاحب معاف کرے تقصیراں تے رہہ جاوے سچ پُر دا
اس پر دے دا اُہہ دُر ضامن جس دُر دا توں بُر دا
بُلتے شاہ جے پھر یے دُر دُر فیر صاحب معاف نہ کر دا



آپ کی
نذر

منڈی ہاں کر چٹلی ہاں —●—
صاحب تیری بندی ہاں



ہمارے کچھ اہم کتابیں.....

● کتاب کی شروعات میں ہی شادی بچے کے ایک رنجیت شادی کوٹھے کا کچھ احوال ہے جس کی چکر دار شکستہ بیڑیوں پر ٹولے دم چڑھتے چڑھتے میں بالآخر اس کی انتہائی منزل کی چھت پہ پہنچا کرتا تھا جہاں ناٹ ٹین اور لکڑی کی پٹھوں سے بنے ہوئے بے ڈھنگے سے کمرے کی ایک جھلکی کھٹاٹ پہ ڈھرا ہوا ایک نسوانی وجود کا تپاؤ حال ”کوٹھا“ میرا منتظر رہتا۔ میں اس کے لئے کچھ سے بری پائے کا شور مچا رہا اور امرتسریوں کے تندور سے کچھ لے کر جایا کرتا تھا۔ ہاں میں یہ بتانا بھول گیا کہ اس دوران ہڈ ہڈ المعروف جموں راکالے یعنی کالے خان میری جان کا جالا بنا میرے ساتھ ساتھ رہتا۔ یہ کالے خان اور کوٹھے والا نسوانی وجود کون تھے اور کیا تھے یہ آپ کو کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ سروسٹ بات ”کاہل کوٹھے“ کے کوٹھے پہ چڑھتی ہے۔

میرا مزاج اس موسیقار کی طرح ہے جس کے ہاں ذہن پہلے تخلیق ہوتی ہے اور لہلوں کی بھرت بعد میں کہ یہی صحیح تخلیقی طریقہ ہے۔ اصل چیز تو بنیاد ہے جو پکی اور سیدھی ہونی چاہیے۔ اس پہ بعد ازاں چاہو جیسا سمجھو تعمیر کر لو۔ میری دیگر کتب کے سرناموں کی طرح ”کاہل کوٹھا“ جیسا عنوان میں ہر س سے بھی پہلے میرے ہاں اتر چکا تھا لیکن اس پہ لکھنے کے مواقع وقت اور وسائل ہاتھ نہیں لگ رہے تھے۔ جب خاصا وقت گزر گیا اور لکھنے کی جانب کوئی فیش رفت نہ ہوئی تو تھک پڑ کر وقت گزاری کی خاطر جو نوک قلم آیا لکھتا چلا گیا۔ اسی طرح تین چار کتابیں معرض وجود میں آئیں۔ اب جو فہم نکلا تو ”پیارنگ کالا“ بھی منظر پہ آگئی۔ یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد یقین یہی تھا کہ اب ”کاہل کوٹھا“ بھی لکھی جائے گی اور اس موضوع کی بابت جو مواد سالہ اندر گلابا رہا ہے باہر نکل آئے اور مجھے ایک عذاب مسلسل سے نجات مل جائے گی۔ اب جو لکھنے بیٹھوں تو سمجھ نہ آئے کہ خشتِ اول کس رخ رکھوں۔ میری عجیب سی عادت کہ جب کسی بھی معاملہ میں ارجحین پیدا ہو جائے تو میں جوتا چکڑی سنہالے گھیس کالے کوسوں کے سفر پہ نکل لیتا ہوں۔ ایسا سفر جس کی نہ کوئی منزلِ ساقی نہ رہبرِ زاہد کا اہتمام اور نہ وقت کی قید۔ بس چل سو چل۔ چاہر خواہی چل دیے۔ تھک گئے تو بیچہ لیٹ لیے۔ مل گیا جو سوکھا لیا۔ دنیا داری وقت پیچیدہ

بال بچے داری۔۔۔ زندگی موت، سہولت و آرام وغیرہ کا دھیان رکھنے والے باویہ پتالی یا جہاں نوروی کے لئے موزوں نہیں ٹھہرتے۔۔۔ ہر طرح سے مادر پدر آزاد دیوانے ہی ایسے کارنامے انجام دیتے ہیں اور میں تو تھائی جہاندرہ پاگل۔۔۔!

خاصی شکل خواری کے بعد میں وسطی ایشیا سے ہوتا ہوا ریاست جموں کشمیر پہنچا تھا کہ یہاں مجھے ہمسائی 'دہنی' باطنی اور زوہانی حکمن دور کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ جموں اترتے ہی یکدم جیسے میرا اندر ہل اٹھا کہ "کا جل کوٹھا" کا دیا نہیں ہے چلے گا۔ آنے کو تو میں یہاں پہلے بھی گئی بار آچکا تھا مگر اس بار تو میرے اندر باہر کی کیفیت ہی جدا گانہ تھی۔ ہوٹل میں کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کے بعد میں نے سب سے پہلے حضرت بابا بالی شاہ کے مزار پر حاضری ضروری لگھی۔۔۔ فاتحہ سے فارغ ہو کر سامنے پڑانے قبرستان کی جانب آگیا۔ ادھر قوی کے کنارے سادہ سست پڑے رہتے ہیں۔ یہاں فاتحہ دعا کے بعد میں ان فقیروں میں تقسیم کرنے بیٹھ گیا۔ ان مستوں سے جتنا کچھ ایسا آسان نہیں ہوتا۔ ان میں زیادہ تر منشیات کے عادی و غیر جرم پیشہ ہوتے ہیں۔ کچھ مجنوں دیوانے اور کہیں کوئی اللہ سے لوگائے ہوئے مجذوب بھی دکھائی دے جاتا ہے۔ میں انہیں خوب جانتا پہچانتا ہوں۔ اسی دور ان آپا بچک میری تھوڑا دور ایک ٹھک وھڑک مجذوب پہ پڑی جو ایک ٹٹھی ہوئی قبر کے کنارے پہ بیٹھا ہوا میری ہی جانب دیکھ رہا تھا۔۔۔ نظر سے نظر ملتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا اس باوا سے سیٹک پھنسیں ہی پھنسیں۔ ایک کشمیری قبیلہ والے سے اپنے لئے قبوہ لیا اور ایک ٹکڑ قبوہ اور نظر اسی کے ہاتھ اس باوے کو بھی بھجوا دیا۔ اب جو میں نے پور نظروں سے اس کو دیکھا تو وہ گرم گرم ابلتا ہوا قبوہ اپنے سر پہ اٹھیل رہا تھا اور نونوں سرور دکھائی دے رہا تھا جیسے شدید اُمس اور گرمی میں کوئی برقاب اپنے اوپر ڈال رہا ہو۔ میں نزدیک مسکراتے ہوئے سوچنے لگا 'باوا نے بڑی شتابی اپنا تعارف کروا دیا۔ قبوہ چمکنے کے بعد ڈاویہ نگاہ بدلے پھر جو اوپر دیکھا تو وہ غائب دائیں بائیں دیکھنے پہ بھی جو دکھائی نہ دیا تو میں اٹھ کر قبر کے پاس پہنچ آیا۔ آگے ٹھکتے ہوئے جو ٹٹھی قبر میں جھانکا۔ باوا آرام سے قبر کی گیلی گاہ پہ اُدھ لیٹا میری جانب دیکھ رہا تھا۔ ایک آدھ دور پہلے ادھر جموں میں خوب بارش ہوئی تھی۔ قبرستان کی ٹھہر ٹھری مٹی گل گاڑی ہوئی تھی۔ میں خود دھنسنے قدموں کھڑا تھا۔ باوا نے ہاتھ اوپر بڑھا کر شاید باہر نکلنے کا عندیہ ظاہر کیا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے تمام کر جب اسے قبر سے نکالنے کی کوشش کی تو گیلی مٹی میں دھنسنے میرے پاؤں پھسل پڑے۔ دھڑم رہنا ہوا قبر کے اندر۔۔۔ نیچے مردہ اس پہ باوا اور اس کے گود میں۔۔۔ کپڑے منہ تک ہاتھ پاؤں سب کچھ برابر تھا۔ باوا

کبھی کبھی نہیں رہا اور میں نے کھائی پاڑہ مرغی کی مانند ہٹ ہٹ اوپر آسمان کی جانب تنک رہا تھا چاندھر چند چیلپیں ادھر ادھر جھپٹنے کے لئے پر تول رہی تھیں۔ کسی نہ کسی طور باہر نکلا اور باوا کو بھی کھینچ کھانچی باہر کیا۔۔۔۔۔ باہر نکلنے پہ باوا نے کبھی کبھی گرتے ہوئے میرا بازو تھاما اور اتنی تندی کی جانب گھسیتا ہوا لے چلا۔ ادھر پہنچ کر وہ پھلانگتے پھلانگتے پانی میں مستیاں کرنے لگا اور میں اپنے کپڑوں کی مٹی دھونے بیچہ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ میرے پاس آکر اجمان ہوا۔

”کیسے سینک چھنے۔۔۔۔۔ مزہ آیا؟“ تیرے لاہور میں جنوں کا کالا بیٹھا ہے۔ وہ سفیدال باقی بھی اپنی قبر خود سے پڑی ہے۔۔۔۔۔ اُن سے ملنا اور میرا آشیر واد دینا۔“

چند لمحے میری آنکھوں میں گھورتے ہوئے پھر گویا ہوا۔

”تم نے کبھی اپنے گھر کے کوٹھے کے علاوہ کوئی اور کوٹھا دیکھا ہے؟“

میرے اندر مل سے کھڑکنے لگے کہ کاجل کوٹھے کی بات جو میرے دل میں تھی باوا اب اسے ضرور کوٹھے پہ چڑھائے گا۔۔۔۔۔ میں کیا جواب دینا ڈیلے ٹھہراتے ہوئے باوا کو دیکھا کیسے۔

پھر خود ہی مسکرا کر باوا بتانے لگا۔ ”طوائف“ ولیہ بھی ہو سکتی کہائے کی طوائف ہی اسی طرح کوٹھا پہلے درس گا ہی کیوں نہ ہو اس کی شہرت کوٹھا ہی ہوگی۔۔۔۔۔ گھر کے کوٹھے اور طوائف والے کوٹھے میں سرے اور کاجل جیسا فرق ہوتا ہے۔ آنکھیں سرے سے لڑکیوں اور خیاں کھل سے بھرائے جاتے ہیں۔“

میں ہوافتوں کی مانند ان کی مشکل سے سمجھ میں آنے والی باتوں پہ غور کر رہا تھا کہ باوا مزید کہنے لگا۔

”ایک کاجل کوٹھا بھی ہوتا ہے۔ جس میں کالنگ کے ہوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اگر کوئی محض اس کے اندر جھانکا ہی لگا لے تو بھی وہ باہر بھیتر سے کالا شا ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے محض کاجل کوٹھا کا نام ہی سن اور سنبھال رکھا ہے کبھی اس کو دیکھا نہیں۔ کاجل کوٹھے کو جاننا اور لکھنا چاہتے ہو تو سامنے تین کاجل کوٹھے ہیں ایک ادھر شری گزرو سراشاہی محلہ لاہور اور تیسرا تیرے اپنے اندر۔۔۔۔۔“

قارئین! اس کتاب میں ان کوٹھوں کا بقدر ضرورت ذکر موجود ہے۔ ہاں باوا نے جن مزید کوٹھوں کی نشاندہی کی اس سے میں نے کچھ مزید سمجھا اور جانا کہ کاجل کوٹھے کا استعارہ ڈرویشی و فقر میں لیکن لیکن کیفیٹوں اور معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کاجل کوٹھے کے نام نے تو مجھے پہلے ہی جکڑ رکھا تھا اب اس باوا نے مجھے اک نئی جہت پہ ڈال دیا تھا۔ کاجل کوٹھا کاجل کوٹھا کاجل کوٹھا جیسے میرے اندر باہر کا ورد بن کر رہ گیا۔

انسانی غلبوت کے اندر اک جہاں سلا ہوا ہوتا ہے لیکن فقیر و رویش... غلبوت کے اندر کو کوٹھے
 جھرنے ٹپکی ڈیرے جیسے وسیع الطالاب استعاروں سے تعبیر کرتے ہیں... کوٹھے کے ساتھ جب لفظ کا جمل
 جڑ جاتا ہے تو کوٹھا پھر تصوف کے کوٹھے پہ چڑھ جاتا ہے۔ بادا نے مجھے مزید بتایا کہ جس قبر میں لڑھکا تھا وہ
 گری چھت کا کوٹھا ایک طوائف کا تھا... چھت بیٹھ جائے تو کوٹھا اگوٹھا ہو جاتا ہے۔ میں اس کی بیشی قبر
 کے کوٹھے کے نقصان کا اندازہ کر ہی رہا تھا کہ تم اپنے کا جمل کوٹھے کا مسئلہ لے کر بیچ میں آگئے... کوٹھا
 طوائف کا ہوا یا رویش کا وہ لوں کا مقصد آنے والوں کی دلچسپی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

تاریخیں ایسی تھی ابتدا کا جمل کوٹھے کی... اس بادا سے ملاقات کے بعد پھر اک زمانہ میں درپردہ
 خاک چھانتا رہا... قلم اٹھاتا پھر رکھ دیتا کہ اندر سے لکھنے کے لئے کچھ برآمد ہی نہیں ہوتا تھا... میں یہ
 سوچ کر خود کو تسلی دے لیتا کہ شاید ابھی وہ لمحہ مقصود نہیں آیا جس میں لکھنے کا امر ٹھکانا مقصود ہے...
 قصہ کوتاہ! پہلا کا جمل کوٹھا شری گھر کے انتہائی نواح ڈال کے اس پار کنارے پہ نہیں ماندہ ہی ٹاپو تھا ایک
 جگہ پہ دیکھا... جس بزرگ کے وسیلے وساطت سے میں نے یہ سب کچھ دیکھا سمجھا اور جانا وہ اپنے
 وقت کے ابدال تھے... ان سے ملاقات اور نشست برخواست کا احوال نہایت مختصر سا ہے کہ اس سے
 زیادہ لکھنے کا امر نہیں تھا۔ سنیں مجھ پہ یہ مقدمہ بھی ٹھلا کہ کچھلے چودہ پندرہ برس جو کا جمل کوٹھا کے سلسلہ میں
 مشکلات کی مد میں بیٹے یہ کچھ خالی از مصلحت نہیں تھے۔ ابھی تو میرا اپنا کا جمل کوٹھا کچا پکا تھا... اس کی
 کالک میں پکائی گہرائی سو گندی اور چھپی نہیں تھی۔ توے کے تھلے ہنڈیا کے چھلے کی سیاحی... میری کٹالی
 لگن کے تھلکن کے کالے لکڑ اور آلے مات کی پکٹ کا لک آپس میں زمین مابین اور آسمان سا فرق رکھتے
 ہیں۔ نرمد کا لائیں نرمدی ہوتا ہے۔ کا جمل تو شب تاریکیوں کا حیرت لقا پہ جو کہ ہر رات کے برائی کا
 مقدمہ نہیں ہوتا۔ مجھے کچھ اور ارداں ہونا تھا... میرے مشاہدات و تجربات میں گہرائی تو تھی مگر وہ گہرائی
 نہیں تھی جو اس موضوع پہ قلم کھولنے کی متقاضی تھی۔

گلستان میں کچھ ایسے گچ اور قلعے رویشیں جو عام نظر میں نہیں ہوتیں... ادھر کچھ خاص پودے
 بنیریاں ٹھل بنوئے آگے اور آگے گئے ہوتے ہیں۔ ادھر اٹھلانے والی ہوائیں چبکنے والی چڑیاں... ٹپکیاں
 اور بھوڑے بھوڑے بھی عامی نہیں ہوتے۔ ادھر اترنے والی پگڈنڈیاں بھی کشادہ آراستہ نہیں ہوتیں مگر
 کوئی تو ہوتے ہیں جو ادھر بھی جھانکتے ہیں... راہ کی آڑ باز چلا تھکتے ہیں۔ پنہم کا چاند تو صحن دالان سے
 بھی دکھائی دیتا ہے مگر دوج کا چاند اگر جھلک دکھلا سکتا ہے تو وہ جگہ کوئی کوٹھا ہی ہو سکتا ہے کہ قطعی تارا بھی

کسی مخصوص رنگ زوا یہ سے ہی جلوہ دکھاتا ہے۔

جب اپنا کامل کوٹھا پکا لگا ہوں میں ٹھہر گیا تو پھر اس کتاب پہ لکھنے کے مراحل شروع ہوئے۔ جہاں بھر کی کالکوں کو سینے کے بعد کامل کوٹھا بنا۔ اس کتاب کے اندر باہر سیاہیاں ہی سیاہیاں دکھائی دیں گی۔ میری دسترس میں اتنی ہی تھیں۔ میرے ملائے میں ایک گٹھی کالی گٹھی کے نام سے مشہور ہے۔ میں اکثر گزرتے ہوئے اس جگہ کو دیکھتا ہوں۔ میں بھی اپنے عارضی گھر کا نام کامل کوٹھا رکھنا چاہتا ہوں۔ کامل بلاک کامل ٹاؤن اور کامل ٹکڑے۔ مگر میں شاید ایسا نہیں کر سکتا کہ ہم سیاہ سوچوں کر تو ٹوٹوں میں کالی داس تو جو سکتے ہیں مگر کالی رنگت کو پسند نہیں کرتے۔ ہم نے کالا رنگ سوگ کا رنگ بنا رکھا ہے۔ کالا سوٹ کالے کپڑے، مٹ والے گھر، مسوس کے لئے مخصوص کر رکھے ہوتے ہیں۔ سیاہ دن، بلیک وارنٹ، کالا پانی، کالی زبان، کالی نکلنے والی کسی کالی رنگت والے کی تعمیر کے لئے کالو یا کالیا کہتا۔

میں کہتا ہوں کہ ایسی سوچ سمجھ رکھنے والوں کے ہاں کوئی کامل کوٹھا نہیں ہوتا۔ وہ نہیں جانتے کہ کالکوں میں کیسے کیسے حقیقی اُجالے چھپے ہوتے ہیں۔

ان صفحات میں ازمنہ قریب و غدیہم کے بحرت سے واقعات و حالات درج ہیں۔ کچھ کا تعلق تاریخ و تمدن اور کچھ کا سلسلہ اس دور کی طرز معاشرت، ثقافت اور تصوف و روحانیت سے بڑا ہوا ہے۔ تاریخ کا حصہ ایسے واقعات و حالات بنتے ہیں جن کے ڈانڈے عوام الناس، جنگی جغرافیائی اور سیاسی سماجی معاملات سے بڑے ہوئے اور اعلیٰ میں اٹھیں ہوتے ہیں۔ متواتر سینوں میں دفن، رنگوں میں زواں اور دماغوں میں ڈبے ہوئے اسراروں، تراڑوں کو نہ نکال سکتا ہے اور نہ ان پہ حرف زنی کر سکتا ہے۔ وہ تو وہ کچھ لکھتا یا محض کرتا ہے جو وہ سنتا دیکھتا یا محسوس کرتا ہے۔ صدیوں پرانے اسرار و واقعات جن کا واسطہ ذاتیات یا مخصوص کسی مقصد سے ہوتا ہے وہ سرایت ہی رہتے ہیں اور وقت زمانے کی زد میں آئے بغیر عہد رفتہ کا حصہ بن کر اساطیر میں ڈھل جاتے ہیں۔ اصول کائنات کے تحت جب کسی رد و بدل، الٹ پھیر، تبدیلی و تسادم کا ظہور ہوتا ہے تو پھر بہت سے نفرت و شکست اسرار کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ جیسے پہاڑوں کی آتش فشانی، دریاؤں سمندروں کے سیلاب و طوفان، ارضی جھٹکے زلزلے، آندھیاں، جھڑپ، آسمانی بجلیاں، دھماکے وغیرہ اپنے اندر بے شمار کرشماتی اسرار رکھتے ہیں۔ انسان کے لئے نئی نئی معلومات سامنے آتی ہیں۔ ارض و آفاق، بحر و بر نے اپنے بطنوں میں جو کچھ چھپایا ہوا ہے یہ سب کچھ جنوں اور انسانوں کے لئے ہے۔ قدسیوں کے کام کی یہ چیزیں نہیں ہیں۔ اب ان انسانوں میں کچھ مخصوص بندے بھی ہوتے

ہیں۔ یہ بندے خاص اس لئے ہوتے ہیں کہ ان کے پاس کچھ وہی علوم مابعد الطبیعیاتی حسیں اور چشم مینا ہوتی ہے۔ گزرا ہوا موجودہ اور آنے والا وقت زمانہ ان سے سرگوشیاں کرتا ہے۔ یہ ان کے حراج اور انداز سمجھتے ہیں۔ غیر مروجہ مشرودہ زبانیں، لوہیں، حرف و نقش، ان کے زہر و لب کشا ہوتے ہیں۔ روز و نزل سے روز و نشو و نہک کی ایک ایک ساعت مخلوق کی ہر حرکت و شلق کی ایک ایک جنبش تک رسائی اور آشنائی ہوتی ہے۔

اس کتاب میں ایک اہم باب یوں بھی شامل ہے کہ جس میں میرے مرشد علامہ فیلسوف ڈاکٹر میرے حکیم الامت حق اکاؤدائف و مسودہ خودی شاعر مشرق رومی کے مرید ہندی بالاسیا لکھوٹی اقبال لاہوری کے ترکیب نو عمری اور دوران تعلیم کے چند ایک مخصوص مشاغل و وظائف مذکور ہیں۔ اس دور و وقت آیام اور اصوات و صور و مریات کیفیات و جزویات کے محفوظات تک رسائی کے لیے زبان و مکان مقامات آہ و فغاں کے جھریوں جھریوں میں جمنا کٹنا کچھ آسان نہ تھا۔ رنگا لے قفل کھولنا پرانے ساز سر کرنا ذہن و زبان سے کٹی گزری باتیں از سر نو تازہ کرنا پتھروں میں جو تک لگانے کے مترادف ہوتا ہے۔ عقلی استغنائوں کا تو کھل رجاں مستورین کا منت کش ہونا پڑا۔ میرا رب قدر و خیر ہے جس پہ چاہے وہ عقدے کھول دے جسے چاہے تھہ میں جھانکنے اترنے کی توفیق عطا فرمادے۔ میرے ہاں قدرے آسانی یوں بھی تھی کہ گتے بلی کی طرح میری جس شامہ چمکی اور میرا گھر قریب مدرسہ سکول کالج اور مسجد پاس گلیاں کوچے بازار تھڑے دکانیں اکھاڑے وغیرہ کچھ بھی تو نہ تھا جس میں کسی نہ کسی نوع کی سنا جھے داری نہ ہو۔ علامہ کی قلندری خوشبو شب بھی اور آج بھی سیالکوٹ کے کوچوں بازاروں خزاروں و باروں میں الگ ہی محسوس ہوتی ہے۔ کسی اور کو تو نہیں جانتا لیکن میں اس خوشبو سے خوب شناسائی رکھتا ہوں۔ گھر کے پاس ہی مولوی میر حسن کا مکتب شیخ مولا بخش کا تالاب مرے کالج راہ راستے جو علامہ کی گزرگاہیں تھیں۔ وقت جو گزرا مشرودہ سر کہیں پتھر مولا تھڑے درخت بنوڑ دیں پہ موجود ہیں۔

انسان اپنے مادی جسم کے ساتھ کہیں تحلیل ہو جاتا ہے مگر اس سے وابستہ چیزیں اس کی یادیں بہت زمانہ تک اس کی یاد دلاتی رہتی ہیں۔ ان کی سانسوں کا دم گفتار کا آپ گم لہجے کی لا جوتی کھٹک آہیں تو انہیں پچکیاں آشوب زواں خند کی وحاس کھانس شب زواں کا شہ کا بار قافلہ کیا کچھ میرے زہر و نہک؟ سیالکوٹ میں میرے ایک سگی استاد جو عمر میں مجھ سے شاید چند برس ہی بڑے ہوں گے بڑے اقبال شناس ہی نہ تھے بلکہ اقبال کی خوشبو کے بھی غور کرتے تھے۔ ان کے توسط سے جہاں میں نے اور بہت

کچھ حاصل کیا وہیں خوش قسمتی سے ان نگاہوں سے بھی آشنائی ملی، چہرہ علامہ اپنے ابتدائی دور میں جھائی اور غور و فکر میں کچھ وقت گزارتے تھے۔ اور وہ چیدہ چیدہ مقامات بھی جہاں انہیں روحانیت میں درجات حاصل ہوئے۔ اللہ کی توفیق سے میں ایک لمبی تنگ و دو اور روحانی ریاضت کے بعد ان مقامات لمحات کو اپنی ظاہری باطنی بصارت نصیرت سے ہم آہنگ کرنے میں نہ صرف کامیاب ہوا بلکہ علامہ کے فیضان سے مزید بہت کچھ جاننے سمجھنے اور لکھنے کے اہل ہوا۔

آج آپ ہی ڈی پلیٹر میں ڈسک ڈال کر مجھے گزرے وقتوں انسانوں کی حرکت برکت جسم نطق دے کر دیکھنے کی حد تک یوں زندہ کر لیتے ہیں کہ وہ جتنا ہوا زمانہ اپنی تمام تر حقیقتوں اور تجزیات کے ساتھ آپ کے سامنے آ جاتا ہے۔

توجہ، تحلیل و تمثیل۔ فکری و جودی طہارت و تحلیل ضمیر اور سایہ فگن مہربان استغاثیں زاد راہ ہوں تو منزل از حائی قدم ہوتی ہے۔ اپنے من میں ادب کہ پاہا سراغ زندگی!۔ زندگی منس سانس لینے کا نام ہی نہیں، رسم زاپے کا کام بھی ہے۔ یہ صورت کے بیٹ سے جنم لیتے وقت ہی شروع نہیں ہو جاتی۔ یہ تو کتاب کے کسی ایڈیشن کی روحانی کی طرح ایک وجودی ترقی مرحلہ ہوتا ہے جو اصول تغیر کے تحت منظر شہود پہ آتا ہے جبکہ زندگی کی ابتدا تو اسی لمحہ شروع ہو گئی تھی جب مالک و خالق نے اپنے امر خاص کو کعبوت آدم میں قرار و قیام کا اذن بخشا تھا۔ ہر انسان کے اندر لمحہ محسوب سے لمحہ موجود تک کی ایک ایک ساعت سکوت پذیر ہے۔

فلٹر کے فلاسک میں گزرتا ہوا اک اک قطرہ آپ کیا ان مرحلہ وار گزرگاہوں سے نا آشنا ہوتا ہے جو منبع آب سے اس فلٹر تک کے سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھیں۔ سیلولر ٹیلیفون کی ہم کی مانند اللہ سبحانہ کے اس انسانی ٹیلیفون میں بھی ایک سم پڑی ہوتی ہے۔ جس میں ازل سے اب تک تمام پروگرام موجود ہوتے ہیں۔ اب یہ ایک الگ بات ہے کہ ٹیلیفون کی بیڑی کام نہ کرتی ہو۔ اس میں سٹیشن نہ ہو یا بند ہی بے چارہ میری طرح ان پڑھ پیٹھ ہو کہ اس کے فنکشن نہ جان پائے۔ کوئی بھی سم خود نہیں بولتی۔ اس کو زبان دینے کے لئے کسی ”علی“ اور ”بابا“ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو مکمل جاسم سم کہے تو پھر باطنی فنکشن ٹھٹکتے ہیں۔

محمد یحییٰ خان ”کھوجنے اور بوجھنے“ کا نام ہے اسی وجہ سے وہ مجھ سے عام قاری کے لئے خود ایک پہلی بن گیا ہے۔ جو بھی زندگی کو سمجھنے سمجھانے کے عمل میں غوطہ زن ہوگا زندگی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تیر گئی حیات کے حوالے کر دے گی۔ یہاں اتنی گہما گہمی، رنگ، رنگ، حالات، اونٹنی بچے سے آنا پڑا راستہ ہے ایسا گورکھ و چندا تشاداشات، انحراف اقرار، گورا کالا غرضیکہ اتنی کیفیات، حالات، اونٹنی بچے سے آنا پڑا راستہ ہے ایسا گورکھ و چندا نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا لیکن اسی پر بہتی کے لئے ایک روڈ میپ محمد یحییٰ خان نے بھی ”کا جل کوٹھا“ میں پیش کر دیا ہے۔ وہ قاری کو میلے میں کھولے ہوئے بچے کی طرح اٹلی پکڑ کر یوں کھینچے پھرتا ہے گویا عرفانی ہونے سے بچا رہا ہو۔

اس جہاں بنی، جہاں آرائی کے شعل میں محمد یحییٰ خان پرت و برزت کو نے کھدروں سے ماضی حال کی چیخ و پکار سے حاصل شدہ و حاکوں کا ایسا تانا بانا بناتا ہے کہ پڑھنے والا جذب ہو کر مٹوئی نہیں ہو جاتا بلکہ مظلوم جو گرہ بیٹھا رہ جاتا ہے۔ وہ کالے خاں کی بات کرے یا سفید اداں پانی کے حوالے سے سنتو کھ شگہ اور کشمیرے شگہ کا قصہ بیان کرے۔ گئی میاں گیمانی سادھوؤں کا قصہ لے بیٹھے یا کشمیر کے شکاروں کا ذکر کرے ہمیشہ وہ ایسی تصنیفات پیش کرتا ہے جو حیرانی سے گزر کر محض العقول واقعات میں ڈھل جاتی ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ محمد یحییٰ خان کی زبان ذاتی، سحر بیانی، انداز تحریر کسی دوسرے ادیب کے لئے قابل نقل ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ کھوجتا، دیکھتا، بوجھتا، رنگ، رنگ کی ترکیب الفاظ بھی اختراع کئے جاتا ہے۔ اس سائل میں لکھنے والا ادیب نو اور اس میں شامل ہوا کرتا ہے۔

ممتاز منشی نے لبیک میں جس کالے کوٹھے کا ذکر کیا تھا۔ یوں لگتا ہے وہ ذکر کہیں بازو گشت بن کر کا جل کوٹھے میں شامل ہو گیا ہے۔ بقول محمد یحییٰ خان آدمی ”علاقی ہو یا ملاقی“ ڈرڈر کہے یا ڈرڈر منشرک ہو زاہد ہو یا زندیق اس کی اصل تلاش انسانی کہنے کوٹھے سے چل کر کالے کوٹھے تک ہی ہے۔ محمد یحییٰ خان کے کالے کپڑے گواہ ہیں کہ وہ لحظہ بھر کے لئے بھی اس کھوجنے اور بوجھنے سے غافل نہیں ہوا۔ یہ خیران کن سفر مبارک ہو محمد یحییٰ خان کیونکہ اصلی اور آخری کھوج تو اسی کالے کوٹھے کی تلاش ہے۔

منظف و ارثی

بابا محمد یحییٰ خان کی ”پیارنگ کالا“ اور ”کاجل کوٹھا“ الف سے سی تک میں نے پڑھی ہے۔ تجزیہ کہتا ہے کہ یہ ناول تو ہرگز نہیں ہرگزشت یا آپ جتنی ہے وہ بھی بڑی عجیب سی ہر چند کہ ان عجائبات کا تعلق حلق کے اوپر سے نہیں حلق کے نیچے سے ہے تاہم بات ہی بات ہیں ترازو کوئی نہیں۔ ہر بات کا لچرہ مصنف کی ذات سے جڑا ہوا ہے الفاظ کی صنعت گری، خوبصورت پیرائے، ذخیرہ معلومات، خانقاہی اصطلاحیں، روحانی وارداتیں، صوفیانہ بی نیازی، شاعرانہ زندہ دلی، آنکھیں حُسن کی پیاسی، دل عشق کا دیوانہ، آگہی بے خبر، منزلیں بے سفر، ان حیرتوں کے درمیان بابا محمد یحییٰ خان ایسا دائرہ نظر آتے ہیں جہاں ہر طرف سے گیسوں کی کبیریں آکر ملتی ہیں کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

یاد خدا کے ساتھ ساتھ آتی رہی کسی کی یاد

اور بھی اک نواز ہم پڑھتے رہتے نماز میں

اگر بابا محمد یحییٰ خان کو اس شعر کی زندہ تفسیر کہا جائے تو یقیناً کوئی رنگ نہ انہیں مانے گا۔ ان کی محبتیں، حُسن سلوک اور فیہمدانی کے اظہار کا معصومانہ ڈھب بھی نقارے کی چوٹ کہہ رہا ہے کہ وہ باہر ہی سے کلا نہیں اندر سے بھی ہے۔ یہ گوئے ملامت کا درویش ایک چھٹی بھی ہے ایک گورکھ و چند بھی اور ایک آئندہ بھی آپ اسے دماغ سے حل کریں ہاتھوں سے سلجھائیں یاد یوار پر آویزاں کر دیں یہ فیصلہ آپ کا.....!

مقام، راوی یوکان کا دور افتادہ قدیم قصبہ واسن سٹی جسے سوئے کی تلاش میں سرگرداں آوارہ گردوں نے بسایا تھا، مجھے اگلی سویرے "ناپ آف دے ورلڈ روم" کی خزاں آلود شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے لاسکامیں داخل ہونا تھا اور میں اپنی گڈزی کی کیبن میں ٹھوک سوتا تھا جب گئی رات کسی نے دستک دی۔ باہر یوکان کے تاریک آسمان پر شمالی روشنیوں کا رنگین تانگ شروع ہو گیا ہے۔ دیکھو گے؟ رنگین بھڑکتی شعاعوں کا معجزہ کم لوگوں کو دیکھنے کو ملتا ہے دیکھو گے؟ اور وہاں ایک تاریک کلی میں تجا کھڑا منہ اٹھائے میں اس آسمان کو سحر انگیز حیرت میں مبتلا تھا جس پر کیسی رنگ رنگ کی روشنیاں گوندتی تھیں ان دیکھے ان سنے ان کہے رنگوں کے لہریے سانپ لہراتے سُر سراتے آنکھوں کو خیرہ کرتے تھے اور ان کے عجیب رنگ گوندتے ہوئے مجھ پر اترتے اور میں بھی انہی رنگوں میں رنگا جاتا۔ ابھی کچھ دلوں لاسکا کا معجزہ اپنی آنکھوں میں اترتے دیکھ رہا تھا تو لاکھ کوشش کے باوجود میں اس کے رنگ بیان کرنے سے قاصر رہا۔ اس لیے کہ وہ تو سب کے سب ان دیکھے ان سنے اور ان کہے تھے تو انہیں کیسے کوئی دیکھے کیسے کوئی انہیں سنے اور کیسے کوئی لکھے۔ تو میں نے شمالی روشنیوں کے ان رنگوں کو ان دیکھا ان سنا اور ان کہا رہے یا۔ میں تو صرف معلوم سے آگاہ تھا اور وہ نامعلوم کی سرحد کے باہر کہیں بھڑکتے تھے۔

کچھ ایسے ہی بابا عمر یحییٰ خان کی تحریر کے غلطی بھڑکتے رنگ شمالی روشنیوں کی مانند مجھے عاجز کرتے ہیں کہ اس کے چہرے موسم اور منظر بھی نامعلوم کی سرحد کے پار بھڑکتے ہیں اور

انہیں بیان کرنے کے لیے ابھی تک کوئی لغت وجود میں نہیں آئی۔ نامعلوم کے رنگوں سے میری آشنائی نہیں تو میں کیسے اور کن لفظوں میں ان کی توصیف کروں۔ بابا محمد یحییٰ خان کے دشت نامعلوم کے غزال تو اس کے اپنے تخلیق کردہ ہیں تو میں انہیں کس نام سے پکاروں۔ مائیکل انجلو کی مانند اس شخص کو اپنے تراشے ہوئے موسے کے مجسمے کو یہ نہیں کہنا پڑتا کہ بول تو ہی تو مکمل موسے ہے بلکہ اس کے تراشے ہوئے چہروں، منظر اور موسموں کے صتم ٹھوہرہ خود ہی ہم سے جو کلام ہونے لگتے ہیں۔

وہ جب خبر دیت کو بھی اپنی تخلیق کی جھلکی میں چھپاتا ہے تو جھلکی میں ہونے کی ڈالیاں دے لگتی ہیں۔ اس کی شہنشاہ اور اور ہلاکت خیز ہے اس کی تخلیق کردہ دنیا میں اترنے سے جان جائے کہ ابھی خدشہ ہے کہ وہ پاتاں سے روح کھینچ لیتا ہے۔

عجیب شعبہ ہاڑ سامری سحر طراز بہرہ پیہ بازی گر ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کے بنائے ہوئے قصے کہانیاں آپ کی حقیقت کی پرکھ پر پورا اتریں کہ ”دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر نکلا“ مجھ ایسوں کے اندر شکوک کے سنبھ لیے سے سرسراتے ہیں کہ ہم معلوم میں جھلکتے ہیں اور نامعلوم کی خبر نہیں رکھتے اور جب بابا محمد یحییٰ خان سے مولا ناروم کی مانند پوچھتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟ تو وہ عکس تبریز کے لہجہ میں جواب دیتا ہے کہ یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں۔

یہ طے ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہے جسے خبر نہیں۔ اور وہ کون ہے جسے خبر نہیں؟ پس اس کی خبر نہیں آتی۔

نائی جڑا نائی گھوڑا نائی دا آسوار

نائی نوں نائی دوڑائے نائی دا کھڑکار

(پلے شاہ)

عالم کی روشنی میرے چاروں طرف پھیلتی ہے
اس کی نکسی شعاعیں ہر اک شے کے باطن
کو ظاہر میں تبدیل کرتی ہیں..... میں
انکشافات کے ایک آتش فشاں کے وہانے پہ ہوں
میرے چاروں طرف ڈھوپ ہے!
میری اقدار کے سبز چشموں پہ صحراؤں کی ریت غیمہ لگن ہے
ہواؤں کے لہجے میں نئی کا اعلان ہے
اور درختوں کے سائے پھٹکتے ہوئے قافلوں کے تعاقب
میں صحرا کی پہنائیوں میں کہیں کھوپٹے ہیں
(بابائے شاہ کی کافی سے لیا گیا ہے)

وہ جو انگریزی میں (Style is the man himself) کی اصطلاح استعمال کی جاتی
ہے اس کا اطلاق یقیناً بابا محمد گنجی خان اور ان کی تحریروں پر کیا جاسکتا ہے۔
ان کی نثر ایسی لہر دار فطری، ہلکا جھک، سادہ اور پرکار ہے کہ آپ فوری طور پر اس کے لیے کوئی تشبیہ
تلاش نہیں کر سکتے۔ یہاں آپ کو ترجیح ملی ایک سرور محمد حسین آزاد اور ملازموزی تینوں کی جھلک تو سٹے کی
لیکن اس کے علاوہ اسے کسی ایک کے مماثل قرار دینا ممکن نہیں! یہی صورت حال ڈرویشی، تصوف، قلندری
اور مذہب اور عقیدوں کی قید سے آزاد ہو کر ان وارداتوں اور کیفیات کے ذکر کی ہے جو ان تحریروں میں
جاری و ساری نظر آتا ہے۔ وہ ہر شعبہ زندگی کی مخصوص زبان اور اصطلاحات کا بے محابا استعمال کرتے ہیں
اور اس رو میں بعض الفاظ کے معنی، عمل، استعمال اور املا میں ایسی تبدیلیاں بھی کرتے چلے جاتے ہیں کہ

بقول تاثیر..... ”مقام جنبش اور شکل ہی آتے ہیں“ وہ اس کی وضاحت میں اپنی کم بلی کو دلیل ٹھہراتے ہیں لیکن اگر ہم ”اسلوب خود صاحب اسلوب کا آئینہ ہوتا ہے“ سے اتفاق کرتے ہیں تو ہمیں اس مسئلے کو بھی ایک مختلف اور وسیع تر تناظر میں دیکھنا چاہیے لیکن اس پر پھر کبھی بات ہوگی۔ فی الوقت تو میں اس بے مثال قصہ گو اور اشفاق صاحب کی طرح فطری مجمع باز (یہ اصطلاح میں اس کے مثبت معانی کے حوالے سے استعمال کر رہا ہوں) کی چند ایسی خصوصیات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے ذاتی طور پر مجھے بہت متاثر کیا ہے شاعری اور ڈرامے سے اپنے فطری تعلق کی بنا پر مجھے وہ تحریریں اپنے دل سے زیادہ قریب محسوس ہوتی ہیں جن میں ان دونوں کے بنیادی اجزائے ترکیبی کو خوبصورتی، ندرت اور مہارت کے ساتھ پیش اور استعمال کیا گیا ہو۔ مثال کے طور پر بابا محمد یحییٰ خان کی زیر نظر کتاب ”کاجل کوٹھا“ کے اسلوب میں منظر نگاری، کردار نگاری، مکالمے، پراسراریت، بے ساختگی، چھوٹی چھوٹی پیمائشوں کے کلائمکس، زمان و مکالم کی وحدت Fantasy اور حقیقت کے ملاپ اور لفظوں کے تبادلات اور تشابہات کی وسیع ترسانی، دنیا کو اس کہانت اور کامیابی سے بڑھا گیا ہے کہ بجائے اس کے کہ قاری موضوع کے پیچھے پیچھے چلے موضوع اُس کے ساتھ ساتھ اس طرح چلنا شروع کر دیتا ہے جیسے پرانے دوست خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے سے باتیں کر سکتے ہیں۔ اسلوب تحریر کی معرفت ان دیکھے نامانوس اور ماشی سے مربوط مناظر کی ایسی شاندار کس بندی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے اس کی قریب ترین مثال شمس الرحمن فاروقی کے ناول ”نئی چاند تھے سر آسمان“ میں شام کا نظر آ جائے۔

”کاجل کوٹھا“ کا شمار ادب کی کون سی صنف میں ہوتا ہے؟ اس کا حساب تو قارئین اور نقاد حضرات کرتے رہیں گے مجھے تو اس وقت بس اتنا ہی کہنا ہے کہ یہ کتاب آپ کو ایک ایسی Insight سے متعارف کراتی ہے جسے بابا محمد یحییٰ خان کے شخصی تجربات، مشاہدات اور انجمنائی منفرد اور دلچسپ اسلوب تحریر نے ایک خاصے کی چیز بنا دیا ہے اور اسے پڑھنا جیسے ایک آئینہ خانے میں وقت گزارنا ہے ویسا ہی آئینہ خانہ جس کے بارے میں میر تقی میر نے کہا تھا کہ.....

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

بابا محمد یحییٰ خان کو سنیں جب پہلی دفعہ ملی تو ذرا بھی مرعوب نہ ہوئی۔ یہ ملاقات ماہنامہ ”تخلیق“ والے اعظم جاوید کے دفتر میں ہوئی تھی۔ اظہر نے کہا کہ جن خواتین کے سر نیچے ہوتے ہیں ان سے بابا بات نہیں کرتا۔ سنیں نے کہا کہ نہ کرے بات۔۔۔۔۔ ان کا وزینگ کارڈ رکھ کر حیرت سی ہوئی۔ تصویر تین چار فون نمبر درج۔ سنیں نے کہا کہ یہ بابا تو شہرت کی تلاش میں ہے۔

اشفاق احمد کے انتقال کے بعد جس طرح بانو قدسیہ نے چالیسویں تک فاتحہ خوانی کا سلسلہ جاری رکھا وہ انجمنی کا کمال تھا کہ غم کو اس طرح مٹایا کہ ہم سب صدمہ سہے جو گے ہو گئے۔ بانو قدسیہ کی بہو اور میری بیٹی ثریا انیس نے بھی اس طرح ہر روز اہتمام اور انتظام کیا کہ حق ادا کروایا۔ سنیں باباجی سے ملنے جلنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ میری دونوں بیٹیاں ان سے بہت متاثر ہوئیں۔ ان محفلوں میں ان سے اکثر ملاقات رہتی اور ان کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کتنے دانشمند اور جہاندیدہ ہیں۔

مگر میں نے سر پے دوپٹہ نہ اوڑھا۔۔۔۔۔ انہوں نے مجھے اپنی کتابیں دیں جن میں ”پیارنگ کالا“ بھی تھی۔ یہ ناول ہے کہ قصہ؟ آپ جانتی ہیں کہ جگہ جگہ؟۔۔۔۔۔ جو بھی ہے کمال ہے! کیا بروانی ہے؟ کیا تسلسل ہے؟ کیا انداز ہے؟ کیا مشاہدہ ہے؟ کیا لطافت ہے؟ کیا عبور ہے زبان پر۔۔۔۔۔ کاش میں ان کی طرح کی بڑی رائیٹر ہوتی۔ ان کے جیسا رائیٹر تو کیا میں دو سطر ہی بھی نہیں لکھ سکتی۔

(ایڈیٹر ماہنامہ ادب لطیف لاہور)



● مٹھی کالک چنے جھالے لیڑے پیڑے کالے
اڈھی راتی نجل کوٹھے بابا دیوے بالے

آگے ہو جاتا یقیناً اس کی اس خجرات رندانہ کا مقصد سکھوں کے سنے کی اس شکستہ بلڈنگ کی تنگ و تاریک چکر دار ٹوٹی پھوٹی میز جیوں پہ مہری رہبری کرنا ہوتا تھا۔ اس دوران وہ محض ایک آدھ میٹر ہی سی آگے اوپر ہوتا جبکہ اس کا بائیں ہاتھ میرے شانے پہ رہتا ساتھ ساتھ وہ مجھے شامائی بھی دیتا جاتا۔

”پاؤں سے نول لیجئے گا اگلی میز ہی ذرا چھوٹی ہے۔“ یا ”پاؤں ذرا دھیان سے دھرئیے گا انگلیں ذرا بھکی ہوئی ہیں۔“

ایک پون منزل اوپر سے ہی مجھے مائی دہنی کی ذمے کی دلدل میں منہ تک وحشی پھنسی سانس دھکی ہوئی تازہ توڑ کھانسی کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دینی شروع ہو جاتیں اور مجھے سبکیں سے ہی دکھائی دینے لگتا کہ اوپر کھلے آسمان کے زمین کے چھتے والے ذریعہ لہا کمرے کے باہر ایک تھلگی کھاٹ پہ وہ گھڑی سی دھری پڑی ہے۔ بوسیدہ سے ہر گھنٹے کی چری ہوئی نے۔۔۔ اس کے بے بیڑہ منہ میں کٹھن تک اتری ہوئی ہے تھپی ہوئی پھول آٹکھنوں میں بھٹی راکھ کی کھنڈی سفیدی اور ذودھیائی جھانے کی چمک جھرونی ہوئی پونچھیں کھنڈوں کھاٹے سر پہ جست کی طرے پھنی ہوئی ہیں۔

ہم پونچھیں تو ابھی کچھ آگے چلے گئے تھے کہ ایک اور شخص نے ہمارے سامنے کھڑے ہو کر کالے کالے کانٹے کے بعد میں ٹوڑا بھی کچھ آگے چلے گئے۔ اس شخص کی دھوئی دھواں دینے لگی ہے۔ کالے کانٹے جان جاتا ہے کہ کھڑی جان پہ بن رہی ہے وہ مجھے اپنے بازوؤں سے مزید سہارا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ میں اسے لائن سارے ہوں گی کچھ زور داری سے سمجھا یا۔ ”بھئی کالے کانٹے اچھے تھے ہار کر خواہ تو او کی ہمدردی نہ بنایا کر مجھے تمہاری قربت سے استغاثی کھینچتے ہو۔“ وہ بولے۔ ”میں نے میری طبیعت ماش کر کے لگتی ہے اور پھر تو بھی ایسا کون سا زخم ہے جو مجھے سنبھالا دے گا جس میں چند دن لے لے جاتے کر رکھ دیا ہوا ہے۔“ وہ جواب میں کمال احتیاتی سے جی بکی ہوتا رہتا۔

جب دوسری منزل کی تمام گرجی پہ پاؤں پڑتے ہیں تو ہم دونوں کے سانس پھولے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک ذمے کی باز پکڑے ہٹھلے اپنے بے سکت پاؤں پہ کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب ہم دونوں خدائی خوار پلچھوں کا اس منزل کے براہ راست میں کچھ وقت تک کر سانس اور اعصاب کی ورزش کا جائزہ لینا ضروری ہو جاتا۔ یہاں کچھ دیر نہ کئے میں اس کے علاوہ اور کوئی قباحت نہ تھی کہ ادھر پیشہ کمانے والی چند تسمیوں کے نمکائے تھے چھوٹے چھوٹے سیلین اور جس زود تاریک کمرے جن کی چٹکھنوں کے باہر سرکندوں بید بھٹوں کے نو ہزاروں پہ دھری وہ آہن کی قش طغلی میں مصروف ہوئیں بلکہ یوں کہ دانہ ڈالے دھم بھانے کسی کچھو کچھرو کے پھنسنے کا انتظار کرتی رہتیں۔ جوں ہی کسی کے دانے ڈکے پہ کوئی چٹھھی پڑتا تو وہ اس کا بھٹکا

ہوتیں تو ٹھمری خیال گیت غزل ہمیشہ ہانچے ہی رہتے۔۔۔ مگر میڈم اشیراں کا کامل یقین تھا کہ اگر وہ یہاں پیدا نہ ہوتی تو امبرسر امبرسر نہ ہوتا کوئی مالہ کوٹھے جیسا بست بسا ہوتا۔ وہ امبرسر بن کھلا کر بہت خوش ہوتی تھی۔
میں اس سے اپنا پنڈ اپنانے کی خاطر اکثر اس کی چاچا بوسی کروا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے کہیں کہہ دیا۔
”دادا اشیراں بائی، دادا باقر خاناں کھٹہ کلچے کشمیری چائے سریر۔ کیا بات تھی امبرسر کی۔“
وہ ابروؤں کی دھبلی کد میں چڑھا کر پچھنے لگی۔

”آپ کو کیسے پتہ؟ آپ تو امبرسر ہی نہیں ہیں۔“

میں نے ثروت جواب دیا۔

”امبرسر والوں کا دادا وہوں مجھے پتہ نہ ہوگا تو کسے ہوگا۔“

”ہائے ہائے.....“ وہ ہاتھ دھوئے بائیسٹ کا اٹھنا ڈکڑتے ہوئے ملک سکیڑ کر کہنے لگی۔

”بزرگوار! کھانا پیٹا تو زور کی بات اگر کبھی انگلی سے میرے پنڈے کا ٹکس ٹکس ہی چکھ لیا ہوتا تو پتہ چل جاتا کہ امبرسر کی اصل سوغات کیا تھی۔“

ابھی بار بجے اپنے دفتر میں دم درست کرنے کی غرض سے گھڑی، گھڑی بیٹھنے کی دعوت بھی دے چکی تھی۔ مگر..... ہاتھ دھوئے بائیسٹ کا اٹھنا ڈکڑتے ہوئے ملک سکیڑ کر کہنے لگی۔
کرتے دم ٹھارہی نہ پڑا ہے..... آج حالیکہ وہ حاجن اور بڑی بچی شاد وقت نمازن بھی تھی۔ بھٹی مشقوں کی تسبیح ہر وقت اس کے ہاتھ میں جھولتی رہتی۔
”میں نہیں کہتا ہوں کہ دیکھو وہ اکیلے میں کھوپڑی خرافات کھوسٹ کھوسٹ قبرستان میں کی ہوتی ہے۔“
”ہاں میں یہ کہتا ہوں کہ وہ اکیلے میں زور کرتے ہوئے پڑا ہوا اور خراب آفتاب کے بعد کی اندھے جاندار سے بے تعلق ہونے سے بے حد اجنباب برتا چاہئے۔“
”یہ صورت نہائی بڑے انیسویں ہاک اور نہتے لکیر بڑا آدہ ہو سکتے ہیں۔“

ایک بار میں اس نیم بھوتہ جی بولی یوزمی بولی سے اپنے بڑے چاچے کے گنچیز سے چا کر اوپر پونجی منزل کی جانب بڑھنے کا سوچتی ہی رہا تھا کہ اس نے اک ”اوالے بزرگانہ“ سے آگے جھک کر میرا کانچا ہوا ہاتھ پکڑ لیا۔

”عاجی صاحب! کیا ہوا؟ ہم گنچہ کار لوگ اس بدنام جگہ پر رہتے ہیں۔ خیر سے آپ کی اس عاجز بندی نے بھی زیادتیوں کے علاوہ وہی اور پانچ مرے کئے ہوئے ہیں۔ ماشاء اللہ آپ بھی عاجی نہیں بھی حاجن اور چیمپس مالہ لٹنی سے چند وہ تکی برک چھوٹی بھی ہوں۔“
”جی ہمارے پاس بھی گھڑی دو گھڑی بڑے کسے لئے بیٹھ جایا کریں اپنی نگاہ میں رکھیں ہمیں بھی فیضیاب ہونے کا موقع دیں۔“

مجھے پسند کرتا ہے اسی طرح اور بھی لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔ میں یہاں بازار میں بیٹھی ہوں یہاں ہر کوئی آ جا سکتا ہے۔ تو نے میرے کونچے پر یہ وار دات کر کے کوئی اچھا کام نہیں دکھایا اور غور سے سن کہ میں نے تو تیری رخصتی بن سکتی ہوں اور نہ ہی تیرے ساتھ یہ دکر سکتی ہوں۔ یہ میرا کونچا ہے۔ تیرا گاناں یا جا گیر نہیں تیرا گلہ یہاں نہیں چل سکتا۔“

سنّتوں کا کسی خود بخود ارشید کی ماتمرد و حیا کے ہونے کیلئے لگانا۔

”سفید اس ایسہ تھاں علاقہ میرا چننا جاگیر ہونے سے ہوئے مگر تو ضرور میری جاگیریں۔ میری سوتیلی
میری سستی میری میرا۔ اوسے میں میرے لئے بزاراں دیو پیاں تے لکھاں پتھر قربان کر سکدا آں۔
میںوں یعنی وہی پسندی نہیں اوتے میرا بددی داپاوا ہے۔“

اور مجھے تو پسند نہیں۔" سفیدال بانی نے آگے بڑھ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

تیری پسند یا نا پسند سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سناؤ کہ کی بات پتھر پہ لکھ رہا ہے۔

[illegible]

سُلو کے لئے کئی سزاؤں کے یہی اسے پیغام بھیج دیا تھا۔ کئی بات ہے کہ تو میری ہے میں نے تجھے

یہ کہہ کر لے جا رہا ہے۔ تو تیاری رکھ میں کسی سے بھی اندھی جھگڑ کی طرح آؤں گا اور تمہیں چھوڑ کی طرح اٹھا کر ساتھ لے جاؤں گا۔ سفید اداں پائی لے استہرا نیچے ہی نفی سے والپس کہلا بھیجا تھا کہ ایسا کوئی پیغام تجھے اپنی پتی کو بھیج دیا ہے۔ باقی رہی بیاد والی بات اگر تو سنتو کہ سنگھہ راتھ کی جگہ مہاراجہ جی جی سنگھہ بھی ہوتا تو میرا انکار تیری اس خواہش کا جواب ہوتا۔

● وصال یار فقط آرزو کی بات نہیں.....!

[illegible]

تھے انکار کالی کے پاس خجستہ کان کی او میں غم سا آویز دھرتی پر لٹکی ہوئی انھوں کے اکھڑاں کان

کے اندر تک پہنچتے ہوئے محسوس ہوا ہے تھے۔ پھر موٹے موٹے ہوتوں نے پورے کان کو ہی منہ میں لے لیا۔ "ہوں" کا رنگ انکو جیسے پورے وجود میں سند سا گیا ہو۔ آہستہ سے سر کوئی سا آہنگ آنچر۔

"سفید اس بائی! سنتوک یہاں تجھے بیاہنے آیا ہے۔" نصیحتی تو نہیں۔ میں نے تجھے کہا تھا "تو میری ہے۔ اب ٹیپ چاپ میرے ساتھ تھیں چ" میں ٹیل تو ذکر بڑی مشکلوں سے یہاں تک پہنچا ہوں۔"

سفید اس کے ہونٹوں پر گرفت ڈھیلی چائی تو اس مجمع کرتے ہوئے ہوئی۔

"سنتوک کے! تو راتھر سکھ ہے جو ہوڑ سفر ہوتے ہیں لیکن تم اس کے علاوہ ادب اس ڈسٹر گیر قافلہ اور بیوی کے بے وفا بھی ہو۔" میں رانچہوتہ مسلمان بن گیا ہی اپنے اصولوں بندھنوں اور اپنی من مرضی کی مالک ایک گائے والی طوائف ہوں اور تو ٹیل تو ذکر رات کے اس اندھیرے میں چوروں کی طرح ٹیپ چاپ ٹیپ چاپ کر رہے بیاہنے آیا ہے۔" پھر انہی کے بازوؤں کی گرفت کو قدرے ڈھیلا کر دیتے ہوئے کہنے لگی۔

"باجا کاچا۔" نہ اتنی اور نہ کوئی گواہ۔ بیاہ کر لے جانے والے تو بڑے عجیب "شان شوکت" سے ٹھوڑی پر سوار ہو کر ادنیٰ لینے آتے ہیں۔ اور تو قرض داروں کی طرح منہ ٹیپ چاپ کر کے بھاگ کر اندر آیا ہے۔"

سنتوک اس پر گرفت ڈھیلی کرتے ہوئے بولی۔

"اس کی سفید اس میں جتنے تیرے اچھے سن نہیں آیا۔ نی مال سمجھاتی تے پڑھ کر بھی کئی جانتا ہے میں ٹیل وئی نہ ہو کر کھڑے تیرے سارے چاہتے فرنگٹاں پوریوں کر دینا ہے پھر کھلے لیے مجھوڑی اسے۔ جس طرح کئی نسلے تے کئی ٹیلی ڈھیلی۔"

سفید اس ایک بار پھر نصیحتی کی طرح کہہ کر اس کی گرفت سے نکلتی کوشش کرتے ہوئے ہوئی۔

"سنتوک کے! کتنی مہربانی ہے کئی چپا کے کٹیاں پاوان دیں خواہشاں نہ رکھو۔ بیاہو سے دیو پار وچ مجھوڑیاں نہیں ہو گئیاں۔ ہاواٹس ٹیل چارہ جائے سے وچ ای تیری ڈھیرنی اسے۔ ہاں اک ٹھکی یاد رکھو کہ راتھی نال بیاہ پاوان والیاں نوں ساری دیاتی اوہڑیاں چلماں پھر بیاں پائیاں لے۔ چاچا بیاہ واپس ٹیل اندر اسے تیری سزا پوری نہیں ہوئی۔ یا تیرا اپنی دھرم جتنی کول اپنے ٹیل، دنگے اپنے کول۔ اپنی کھروڑی سوارک پھٹ کے ہمارا دی نکھو نہ بھراول۔ میں تیرے نال بے لیس کر سکدلی۔ تے ویوہ اسوال ہی پیدا نہیں ہوندا۔"

سنتوک کے لے کر ان پہ پورے کھاتے ہوئے سناپ کی مانند شکارا بھرتے ہوئے اسے گھسی بائوڑی چپا کی طرح اٹھا کر سینے سے لپٹا لیا۔ فرنگی پہ سے ہاشت ہر پاؤں اٹھے ہوئے وہ جیسے پھانسی کے پھندے پہ پھول رہی تھی۔ سنتوک کے کے موٹے موٹے ہونٹ اس کی گلاب سی نازک ہاتھڑیوں پہ پختی سے پھوست ہو چکے

تھے وہ بھی اپنی جہیزیت کا سارا کر دیا۔ اس کے منہ حلق میں اندر مل دینا چاہتا تھا۔ ایسی تلخ باتیں جنہوں نے اس کی رکتھ کی ساری سیکھی تھیں نہیں کر دی تھی۔

سفید اس کی پہلے زبان چل رہی تھی اب زبان بند ہونے کے بعد اس کے ہاتھ پاؤں چٹنے لگے تھے۔ جب وہ بھی تھک بار کر کے کھانا پڑا تو سنتو کے لئے اسے ہٹا کر بچے فرش پر چھٹی ہوئی ایک توٹک پھال دیا اور خود بھی اس سے ٹھڑ کر بیٹھ گیا۔

”نہن سفید اس اتنے سے سر پر پہیر لے نہیں جڑے ہوئے۔ جو ان خوبصورت عورت میرے گھر پر بھی ہے اور اس بازار کے ہر چہ بارے پہ بھی موجود ہے۔ میرے لئے خوبصورت عورتوں کی کمی نہیں۔ میرا من تھک پہنک گیا ہے اور تو جانتی ہے کہ کچھ اور سائب جہاں ایک بار اپنا من متکا بار جاتے ہیں اس کو کبھی نہیں بھولتے۔“

ماحول اب تھارے دیکھ بھاننے کے لئے سازگار ہو چکا تھا۔ اندر راہو یا دیکھ کر انسان جب ان کو روک کر لیتا ہے تو یہی اندر سے اس کا درد اسے روشنی اور ہوا دینے لگتے ہیں۔ اس کے ہاتھ ہلکے اور آنکھیں باز ہوتی ہیں۔ سفید اس بانی کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک عجیب سی بات گھومنے لگی۔ اس کے ہاتھوں نے اس کی ساری یہی ساری باتیں کی۔ وہ بازار پر دیکھی تھی اس کے چہرے پر ایک عجیب سی تھی۔ اور اس کے منہ میں کہا تو تھا۔ ہم اندر سے اس کی پستے کی طرح چمکتی ہوئی سبز عورتوں آنکھیں اسے بڑی بھلی لگیں۔ نہ کہا تو کیا سوچ کر سفید اس بانی نے ہاتھ دھو کر اس کی چٹائی اتار دی گھر دار کیس کھول دیے۔ چھوٹی سی تھی اس کی۔ اس کی ہاتھوں نے اس کے ہاتھوں میں لپیٹے ہوئے ہموار دانت۔ ہاتھ پھیلنے پھیلنے اس کی جلی لوال والے باغ میں چوڑی چوڑی پہنچی گیا تھا۔ اس کی دھک دھک دھک دھک کے ہو رہے تھے۔ سنتو کے لئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ سفید اس بانی نے اس کا ہاتھ نہ گھسی کی۔

”سنتو کے اتھو مجھ سے بہت پیار کرتا ہے کیا؟“

اس نے اس کے ہاتھ پہ ہنسا دیا اور ہاتھ بولے بے ساختگی سے اس رنگ میں جواب دیا۔

”میرے دل کی یہ دھک دھک تجھے کیا بتاتی ہے؟“

سفید اس بانی بڑے سکون سے اس کے شانے پہ ہر نکا کر بولی۔

”دل تو پاگل ہوتا ہے یہ تو میں اچک اچک تک کہتا ہی رہتا ہے۔ تو کہہ اپنے من سے بھی دل؟“

سنتو کے لئے اک نھدی لمبی سی آواز بھرتے ہوئے کہا۔

”من سے تو میں کئی بار کہ چکا۔ مگر تجھے اعتبار نہ آیا۔ اب منہ اور زبان چھوڑ لے یہ

کر پان..... اسے دل اسے گردن یہ جان حاضر ہے۔“

وہ کر پان کی اتنی سینے پہ دل کی جگہ رکھے ہوئے گردن جھکائے سامنے بیٹھا تھا۔
سفید اس بولی۔

”میری ایک شرط ہے کہ تو اپنی بیوی سے بے وفائی نہیں کرے گا۔ اس کی اجازت سے میرے ساتھ دوسرا بیاہ کرے گا۔ بیاہ سے پہلے مسلمان ہو جائے گا۔ اور اپنی یہ سزا پوری۔“
ابھی جملہ پورا نہ ہونے پایا تھا کہ اک دم پولیس سر پہ پہنچ گئی۔ سنتو کے جہاں بیٹھے ہو وہیں بیٹھے رہو۔ اٹھنے کی کوشش کی تو گولی چل جائے گی۔“

لیکن ہونی تو جھکا کی لے کر رفتہ رفتہ چلی تھی۔ کر پان کی نوک اس کے دل کے عین اوپر تھی۔ پولیس کی ہڑ بولنگ میں اس نے جھکا کی لے کر اٹھنے کی کوشش کی۔ بچے روئی کی تو شک پہ جو پاؤں رچنا وہ اپنے ہی بوجھ سے کر پان پہ پست ہو گیا۔ یہ سب کچھ ایسی بے خبری انجلیت اور ذرا مانی انداز میں سر زد ہوا کہ سنتو اور سفید اس چادر کو کانٹوں کان غیر محسوس ہوئی۔ وہ اسے کہے جا رہی ہے ”سنتو کے اکٹلی حرکت نہ کرنا“ چپ چاپ۔ گرفتار نہ ہو۔ اس سے قبل انتہا کرنا۔ سنتو کا اسی غلطی تھا۔ اس سے اسے دیکھ رہا ہے۔

پولیس نے اب پوری طرح سنتو کو گتھے سے میں لے چکی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ لوگوں کو آجاک چلا تھا۔ پاک پڑ میں نیچے بازار میں جگہ لوگ ہاگ جمع ہونے لگے۔ پولیس نے ڈرامے والوں کی مدد سے روشنی کا انتظام کیا۔

”خاموشی سے گرفتاری دے دے سنتو کے“ میں تیرا انتظار کروں گی۔“

سنتو کے نے ہلکی سی مسکراہٹ سے ان بات میں سر ہلایا۔ بڑی دقت سے کر پان والوں کو آلو کا پتہ ہوا۔ آجک باجنگ، سفید اس کی مائیک کو جوت نکلیں کیا۔ اور ہر کسی کی بھولی میں گردن ڈال دی۔ اس رات تک اور سفید اس کھل کر روئے تھے۔

دبیلے اور دل میں ایک قدر مشترک سے سمجھ جائیں تو آپرنگ دھواں دیتے ہیں۔ ایسا آواز اور کیسا انجام۔ آواز بھی نہ پانے کہ چکڑے گئے۔ وہ انداز ہی انداز ہوئے۔ ہو کر رہ گئی تھی۔ پہلی پہلی حرکت اور پہلا پہلا پیار بڑا سناٹے اور خشک کرتے ہیں۔

کچھ عرصہ قانونی عدالتی چکروں میں گزرا۔ اس دوران پیشہ وندہ بند ہوا، شوہا، شہر علاقے بازار میں بھی شہرت گزری۔ ویسی قتل و قتل کی دو ایک وارداتیں پہلے بھی اسی کوٹھے پہ ہو چکی تھیں۔ عدالتی ابھاروں

میں نے یس نے خوب مال ہنوار۔ دل دماغ سکون سے اور صندھ و قچی مال سے خالی ہو چکے تھے۔ سکھ برادری نے اکب پریشان کیا ہوا تھا۔ آخر ایک دن رہاں سے کوچ کا فیصلہ ہو گیا۔ اونسے کوچ نے سب کچھ سچ بچا کر سیدان باقی انبالہ چھوڑ کر امرتسر آٹھ آئی۔

یہاں نیا نیا نصیب ٹھکانا چاہئے اور پاؤں جمانے میں خاصا سہ لگے۔ کچھ جانتے پہچانتے والیاں کام آئیں۔ آہستہ آہستہ دیا بقی چلنے لگے لیکن سفید اس ہالی ابھی تک جتنے سے اکھڑی ہوئی تھی۔ خاندانہ نو جوانوں لڑکیوں میں ایسا دم سم نہیں تھا کڑیر سے بھرتی کفالت کر سکتیں۔ استادوں اساتذہوں پر جب غارتگوں سے لگے تو انہوں نے واسطہ دے کر وہائی دی۔

”اللہ کی ہمدی! آخر کب تک لوگ انکار میں رہیں گے۔ ہمیشہ دار لوگ ہیں، کسی بات کو دل پہ لیٹنا ہمارے طور طریقوں کے خلاف ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ تمہارا کہیں کوئی کوشش بھی تو نہیں۔ اب روٹا دھوتا چھوڑ۔ دیکھ سب ہی لوگ تیری حالت دیکھ دیکھ کر ہانپ رہے ہیں۔ اب تو قانون اور شریعت نے بھی انکسین دھماکا شروع کر دی ہیں۔ قرآن و احادیث کے کھاتے بدلتے جا رہے ہیں۔ اللہ میری دعا ہے“

آتش پیشہ درسیہ استادانوں کی ان آگہی وادید معاشی اور مالیہ لحاظ کے انہوں کے فراق و غریبوں کے بارے میں سامنے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ ان کے دسترخوان پر نہ وسیع انگلی و شرب کے سلسلے پر نہ لٹریچر و فیس ان کے آجوان و تھمتی پر نہ گہرے کونوہ و دراز تکبہ ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہیں انھوں نے لٹریچر و فیس ان کی اصل اوقات ہوتی ہے۔ ان کا کاروبار حیات کے امور پر مبنی ہے۔ ان کے فرائض میں بھی کمر بستہ ہو جاتا ہے۔ ان کے امت و انجام پر نہ جیسا تکبہ ہوتے ہیں۔ انھوں کی ان کی چھائی غرضیہ و برکت ایک دھبے کی نہیں ہوتی۔ ان کے کو پیہ ملتے اور شام بھر تلکے۔ پیشہ ور ہیں ان کے خوراکے۔ جو معاشی کے ہنگاموں اور ورنی تھمتی وں والے پانوں کے نیچے روندے جانے والے نیچے سبز اور نرغہ ٹوٹ لے سب ہیں وہ بیل کی پٹکا چوند اور لہو و لہو کی ریل کیل کا سامان ہی تو ہوتے ہیں۔

● جو قہار خوب بھارتیج وہی خوب خواہ !

مطربہ وقت نے انگریزی توڑی تو خانوں سے ساز ساز سے آواز اور عورت سے طوائف باہر نکل آئے۔ اچالے اور امرتسر میں دہلی کے چاؤڑی اور بھٹی کے پادس بدھ کا فرق ہے۔ ماں بیٹی نے کچھ ایسی

جاہوئی چھڑی تھمائی کہ کچھ مرے میں ہی سفیدیاں ہائی نے اپنا اچھا خاصا نام پیدا کر لیا۔ بازار کے پرانے گے بندھے کوٹھے ٹٹھکیں بیٹھیں لگیں۔ اچھے اچھے شن نواز کنز سینے گئی گئیں ہوا کے رخ کے ساتھ ادھر کا رخ پکڑنے لگے۔ نام اور شہرت جو پلکا کر اڑی تو فوراً زور سے بلاوے اور دھتوریں پھینکے گئیں۔ ان پھرتے کیا دیر لگتی ہے دیکھتے ہی دیکھتے حسن میٹھا کی نسبت بر سنے لگا۔

وقت کی بچا پاپ ایک اور ہی راگ شروع ہو گیا۔ کلام قدرت ہی ایسا ہے کہ کسی چیز کو ہاتھ نہیں قیصر کے ساتھ ہی خراب بھی شروع ہو جاتی ہے۔ ابھی خوشیوں کی شبنمیاں گونج رہی ہوتی ہیں کہ کہیں سے کوئی بُری خبر بھی تعاقب میں پہنچ جاتی ہے۔ شاید یہ سب کچھ نظام حیات کا لازمہ ہے۔ یہاں بھی ابھی بھری بھلوں اُن نے بھی نہ پائے تھے کہ ہر پکڑے گئے۔

بے زبے بنوا رہے تھے باتیں ہو رہی تھیں۔ اندر ہی اندر فضا کی چنگاریاں سٹلنے لگی تھیں۔ بندہ مسلم ایک دوسرے سے آنکھیں پڑانے لگے تھے۔ سفیدیاں ہائی کی ماں کی ایک ٹھٹھکی بھن بھن کے شاہی بازار میں بے دھڑانے کی ڈیرہ دار فی قہر اس نے خیردار لیا کہ حالات خراب ہو رہے ہیں کی ایک مسلمان طوائف نے اس سے کہا کہ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اس نے کہا کہ میں نے کہا ہے کہ اسے چھوڑ دو اور اپنے گھر سے پہلے ہی سڑک سے گرنے لگا۔ یہاں بھی پتلی آگ۔ میں نے کہا کہ اسے چھوڑ دو اور اپنے گھر سے۔

نہیں! کچھ گدھا ہے وہیں! چھوہا پندے فقیر! تاجروں اور طوائف۔ انہیں کڑی دولت کا خوشتر ہی اور آگ ہو چکا ہے۔ ان میں کچھ ٹھٹھکیں لگائی کر رہا ہے ہیں اور دوسرے بھڑک رہے ہیں اور وہ پیت چچا مٹی رکر کے خاموش ہو رہے ہیں۔

پاکستان، ہندوستان کے ہوا اسے میں بھی ٹھٹھکی لگائی کر لے والے پہلے ہی لوگ تھے۔ ابھی سرفہ افواہیں ہی گردش کر رہی تھیں کہ شاہ جہاں کی انارکلی سنست گڑا بھگوان پورو، اچھرو رام لڑکا شہنشاہی محلہ کرشن گڑا فہم اسٹوڈیو کاٹی اسپتال لکھنؤ پرک۔ وغیرہ خالی ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سفیدیاں ہائی کی ماں کی بدھی بھی اس نے ہن۔ دیکھا نہ دات چھوٹا سا ماں سمیٹا زچہ روشتہ کے چٹے بھل میں دابہ لٹکا یا استادوں اور خاندانوں سمیت بھڑک اُترتی۔ لکھی سیانی کہتا ہے کہ لے لے آکاں۔ ان بچوں کی سٹھیاں۔ چم پینی کے برتن، پینی کے بنے ہوئے دھڑکے میرٹھ سے منگوانے ہوئے شیطان، ہمارا نہ نیاں تھیں ہمارا اور دست پناہ تک اٹھا لائی تھی۔ سونے پہ سہا کہہ کہ یہاں پہنچے ہی ایک مسلمان طوائف کا باہر چوکھٹ تک بھرا چ اکھڑ گیا۔ ابور جاسٹے سے دو بھاری چندہوں کا کہہ کر چابی بمسالی کے حوالے کر گئی تھی کہ حالات درست ہوتے ہی واپس آ جائے گی۔ اسے کہتے ہیں مقداری کی سندھری کہ سفیدیاں ہائی کی ماں امرتھر سے بھی خوب سمیٹ لائی تھی اور اب

یہاں جہوز میں بھی جما ہوا یا سب کچھ مل گیا جس کی توقع تک نہ تھی۔ مگر یہاں پہنچ کر چوتھے مہینے ہی ایک اور جہوزی ہو گئی۔ سفید اداں ہائی کی ماں بیٹے میں لوٹ پوٹ ہو کر اپنے پادپاگ کر گئی۔ سفید اداں ہائی کی چھوٹی بہن مہم باندی کو اسی روز میٹھا برس لگا تھا۔

● جلوت نقش و مثال لذت جبر و محال !

ہموں کی کیا بات تھی یہاں کے اعلیٰ موسم نشی خنڈی ہوا میں سر ہلنے ہلکانہ خوشی سے سرخراہ
 ندی نالے ناچاؤر و شیں سر سے رینگنے انگ رینگے اور سب سے اچھے رنگ یہاں کے لوگ سریلے موہیتی کے
 لوگ انگ کے جانور عاشق۔ یہاں کے مروج مانول میں اک بدھم ہی موہتی ہے اور ایک دلاور ہی رومانیت
 لپٹی بسی رہتی تھی۔ قوی کنارے کے نگارے پھلوں پھولوں سے لہلہے پھندے شجارے مہاراجہ کے
 قوسورت نما آئینے نگاہی مہمان خانے ۱

[illegible]

جنوں کی یوں دیکھائی انھیں جس کے سن کی اور پانی تجربے مشاہدے اور ریاضت و شوق نے آپ سفید اس پانی کے پھر وہاں انشت و برسات میں اک پتہ و قاری نمکنت اور رچ و پیرا کر دیا تھا اس کی مدد سے گائیکی اور دلنشین بھاء و سحر کی شہرت و خوشیوں اب ہوا اس سے مل کر خواہ اس تک پہنچ چکی تھی ان ہی ایوانوں شہتوں سے دھو میں اڑاتی ہوئی مہک و مہک مہاراج کے دربار تک جا پہنچی جو خوش بھال و خوش گلو سفید اس پانی کی قدر و قیمت میں اک نمایاں اضافے کا سبب بنی۔

جو بری اور طوائف بڑے زبردست موقع اور سے شکار ہوتے ہیں۔ اپنے مال کی اہمیت اور گاہک کی شخصیت و حیثیت کا انہیں خوب اندازہ ہوتا ہے یہی ان کا اصل کمال و ہنر ہے جس سے یہ خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔

سفیدال بانی چاہتی تو لاہوری دروازہ کے اس معمولی سے گونچے سے اتر کر راجدھانی کے سرگرم لوگوں کی کسی بستی کی جانب ہو لیتی مگر اس نے ایسا نہ کیا۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ طوائف ہر حال میں طوائف ہی ہوتی ہے گونچے پر رہے یا گونچی میں اس کی اصالت و مقامت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اپنی اخلاقی فتنی اور مالی حیثیت کی وجہ سے نمایاں تو ہو سکتی ہے لیکن سانچ اور معاشرے میں یہ اشراف جیسے درجہ و درجے کی اہل نہیں ہو سکتی۔ اہل فن و ہنر کسب و کمال خاص طور پر ارباب نشاط و مشوہ میں انسانی رذیلوں کے کسب و بظاہر ان کا ادراک و وجوں سے کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوتا ہے۔ یہی وہ وجہ ہے کہ معاشرے کا حصہ ہونے کے باوجود یہ بے کار و فکار لوگ محلہ کے اٹھائی دیتے ہیں۔

وہ باری سرکاری جلسوں محفلوں میں بطور خاص بلوائی جانے لگی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس نے پلے اور فی مہانی کنگ سے عوام سے بھی اپنا تعلق قائم کیا۔ یہی وہ وجہ تھی کہ وہ جہاں جاسی بھی اپنی سہا

راہ سانی جموں میں مہاراجہ کے محلوں کے والی سی جیجی دیا توئی بڑے کج مکر پرست و زفرے سے اٹھاپیاں توئی ہوئی تھوڑا کرتی تھی اس کے شاداب کنارے نو بصرہ رت اور پڑے ہوئے کرستے تھے۔ چوں لچوں سے آراستہ ہاتھ پائیے تھوڑے ترے تھوڑے اور کافال شہر و شہر کی مہاراجہ سستی اخلاقی ہوئی معطر و مٹھلیں رہائش۔ برسات کی بھری نو چھاروں بہار بھری رتوں اور چاندنی کی پٹیلی ہوئی چاندی میں چمچم کرتی یہ امر اور رائیں۔ ایسے میں یہاں کے چھتائیوں میں ٹھہرے و نکھرے اور رنگ و نور کے قلعوں پر قائم اقرا کھڑے تھے۔ ہم لم ٹھہرتے ہوئے جھنڈوں کی نئی نئی قدیموں سے کہتے تھے ہی نکھر جائیں۔ شہنشاہ اور چکروں نے اپنی الگ دھومیں مچائی تھیں۔ شاہی پارک کے دروازے مہاراجہ کے منور لہجے جہاں میں گوجری زخمیوں کے چپک چپ کھنکھروں سے چٹک اٹھتے اور کشمیری (گوجری) دھیموں کی بے کاری کی نو بھر تھی۔ پھر تالس ٹومرے کی ٹکٹ میں ہار تھیں تو ہوں کے گزروں کے چوکوں سے کوئل گروں کے بھالے جب مدھرا رنگ کے رنگ گھومتے۔ تو غضا میں دھڑموں کے رنگ رات کی رانی کی مہک کی مانند گل مل سے جاتے اور پھر جیسے محلوں کے چپے گھسی ہوئی کشمیری شال کی طرح 'توئی دنی کے کنارے بھی اک کیف بھری غنودگی کو جھٹک کر جاگ پڑتے۔ خوش بھانوں کی دھلیں اچھے چکارے خوش جبینوں کے غول غٹھے خوش گلوں

کے تان پٹے بھی جو بن پے آ جاتے۔ جدھر لگاؤ واقعی خوش خوشحالوں اور کشادہ دھڑوں کے پڑے کے پڑے
 چھرنے ویسے بیٹھے ہیں۔ چاندنی میں قوی ندی کا پارے ایسا نکلیں مارتا دواپانی کو گہری کشمیری پہاڑی
 تک میں بسی ہوئی موسیقی۔ پے ڈھولے مابے گاؤں گیت دو ہے بول بولیاں کیا کچھ نہ ہوتا۔
 خوش جمالوں کے جلوے اس پہ مستزاد ہوتے۔۔۔۔۔

اکثر ایسا ہوتا کہ مہاراجہ کی حاضری میں اتری ہوئی زندیاں طوائفیں اور گانے بجانے والے شاہی
 ہارست فراغت پا کر بابا بانی شاہ کی سرکار میں سلام اور چوکی بھرنے کی خاطر حاضر ہو جاتے تھے۔ خاص طور پہ
 نوچندی جمہرات کے روز تو یہاں خوب گھما گھی ہوتی۔ برصغیر کی بڑی بڑی شخصے دار نامی گرامی گانے والیاں
 یہاں سلام کرنے کے لئے حاضر ہوتیں۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ چھتر دار گاہیں اور مزار و خیرہ طرف اس طبقے کے لئے مخصوص اور
 مشہور ہوتے ہیں۔ پاک و ہند میں مسلمانوں ہندوؤں کے بے شمار استھان اور مقامات ایسے ہیں جہاں زیادہ تر
 سبکی گانے ناچنے والی طوائفیں بڑی عقیدت سے حاضری دیتی ہیں۔ نکلاؤں کے بھی اپنے اپنے گراں بیچ ٹھہر
 اور مزار و ہار تھی۔ اسی طرح بد معاش اور سب کٹروں کے بھی اپنے اپنے چھتر دار گاہیں
 آست و اور ہوتے ہیں۔ یہ گاہیں گناہگاروں کے لئے ہوتے ہیں اور گناہگاروں کی سیالی کی
 صورت میں وہاں حاضری دیتے ہیں اور منت کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ ایسے پیشہ ور تھیں ہائی کمالی تھلتے
 والی کا ہیراں پر حاکم تھے۔ فلکات کے سونے چور کے علاقہ میں پیشہ ور طوائفوں کا ایک مندر ہے جہاں وہ
 باقاعدہ اپنی کمائی کا ایک مخصوص حصہ پیش کرتی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ہندو مذہب کے بعد ان کے
 کاروبار کی برکت کے لئے پراختا کرتا ہے ان کے لئے انکسائے کر کے اشراف و بڑے۔ دلی جنہاں گارے
 شہر سے میں بھی سبوں کا ایک استھان تھا چوالی کے علاقہ میں ہاتھ میں ایک مزار بھی طوائفوں کے
 لئے مشہور تھا۔ سبھی اسداسہاگ فقیروں جو زمانہ پڑے زور پہنتے ہیں کے بھی بہت سے مزارات یہاں
 موجود ہیں۔ جہد پرانی ہستی نظام الدین میں سلطانہ خانم ایک بزرگ کا مزار جو صرف فقہروں کے لئے
 "مرجع مسائن" ہے۔ بعد ازاں وہاں ہائی "بئی شاہی" مجھے میں کی ایک تھیں مزار طوائفوں کے بیروں کے
 ہیں۔ اسی طرح کچھ جید حیات بزرگ بھی موجود ہیں جن کی جید شہرت طوائفیں زندیاں اور گانے والیاں
 جیتا۔

امیر خسرو، بابا جیسے شاہ، شیخ نظام الدین اولیاء، حضرت حسین الدین دہشتی، خواجہ قطب الدین
 گفٹار کاکی، سرکار مال شہباز قلندر، شیخ ماحول حسین شاہ اسی طرح بشمول غالب اور قریب قریب تمام شعراء

اور بارہ کا تعلق خاطر کسی نہ کسی طور فنون لطیفہ خاص طور پر موسیقی و رقص کے حوالے سے اور باب خن و فن سے رہا ہے۔

راجہ جانی ہنوں میں بابا بانی شاہ کا مزار بھی چکھو ایسی ہی شہرت و نوعیت کا حامل تھا برصغیر کی چیدہ چیدہ گانے والیاں یہاں ضرور چوکی بھر لے آتی تھیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ بابا بانی شاہ جس کا گائے گائے کر خوش ہو جائیں اسے سرسوتی کا گیت حاصل ہو جاتا ہے گلے میں لپے اور جیسے سڑوں کا سیر اپڑ جاتا ہے کسی میدان میں ہار نہیں ہوتی۔ کامیابی کا مرانی اس کا مقتدا۔ اور شہرت و دولت اس کی پاندیاں بن جاتی ہیں۔ ایسا بھی کہا جاتا تھا کہ خاص طور پر نوچندی، بھارات کے روز یہاں چوکی بھرنے سے مراد پوری ہونے کی امید زیادہ ہوتی ہے جبکہ کھلی چاندنی میں دو پہر رات بھینٹنے پر بابا بانی شاہ کے تصرفات اور خود و سخا کا سمندر دیکھیں مار لے لگتا ہے۔ اس لئے گانے والیاں اس رات گھر سے گائے جیسی سے انتظار کیا کرتی تھیں۔ نذر نیاز مناجات و دعا درو سے فراغت کے بعد قریب کنارے ایک بڑے پتال میں خاص و عام جمع ہوتے۔ کبھی کبھی مہاراجہ بھی شرکت کر لیتے۔ گانے والی کو اس کے مراتب و مقام کے مطابق وقت اور پانیرانی ملتی تھی۔ اس حسیب میں جیسا رزق پائی لگتا ہوتا وہی ہوتی میں بڑے ہر ایک کی جتنی مہاراجہ کے دربار سے ملنے ہوتی ہاتھوں سے ہواہرات سننے والی اور اس کی یاد دہاریاں یہاں ہر ایک کے دل میں پھیل جاتیں ہوتی تھیں۔ اور من جل و مغل کیا مجال جو کسی جوانمرد کے سر سے پلو سرگب جائے کوئی نوبت نہ کرے یا ایسے ایسے بازاری دین کا مظاہرہ کرنے پائے اعلیٰ و ادنیٰ ہر کوئی حفظ و مراتب اور نظم و ضبط کا پابن کرتے تھے۔

بابا امرت تھ کے مکے چھٹک چند روز بعد ہی ساکھن بھٹی چوکی میں شروع ہو جاتا اور انہی رات میں اپنے رستہ جکوں کی نیند اور مسلسل مسافرت کی تھکن بھی اٹھارتے نہ پاتے کہ اور بابا بانی شاہ کا میلہ بھرنے لگتا ہندوستان کے گوشے گوشے سے چھوٹے بڑے ہر ایک کے موسمی پندوں کی مانند آتے شرمش ہو جاتے۔ راجہ جانی کی انتظامیہ کی جانب سے قوی کے دائیں کنارے والی دستہ کی دھیرنی والے سرسبز شاداب گیلے میدان میں چھوٹے درجوں اور شامیانوں کا ایک قصبہ سا آباد ہو جاتا۔ مہمانوں کے قیام و طعام کا سارا انصرام انتظامیہ کے ذمہ ہوتا۔ مکے کے آخری تیسرے روز مہاراجہ اپنے بیوی بچوں اور باریوں اور حکام کدین شہر کی سب سے میں بابا بانی شاہ کی حاضری کے لئے یہاں سے گیلے کے دو دروازوں پر کارری پتال میں دکھائے جانے والے پہاوانی جسٹائی کر رہے تھانہ ہادی ہادی آتے ہادی ہادی آتے تھے اور گیلے کی وادی میں ام لیا سوانگہ دھانے اور گانے بجانے کے مقاصد میں خود بصورت کار کردگی دکھائے یہ ان کی محنت و بھرپور رہتے انعامات سے نوازتے۔ غرضیکہ راجہ جانی میں آتے ہوئے ہزاروں ہندو مسلم سکھ عقیدت مند زائرین

نای گرامی گانے والیوں میں گانے دار مقابلے ہوتے تھے جس کے لئے وہ مہینوں پہلے تیاریاں شروع کر دیتی تھیں۔ ان طوائفوں اور ڈیرہ دارنیوں میں بھی ذہب بندی ہوتی تھی۔ اس مقصد کے لئے مہاراجہ کا ایک خاص منکر کام کرتا تھا جو کھٹک، بمبئی، آگرہ، امرتسر، لاہور کی بڑی بڑی ڈیرہ دارنیوں کے ذریعے کھنگالتا رہتا۔ جدھر کہیں کوئی کام کا دانہ موتی دکھائی دیتا اسے دام دعوت دے کر بلالیا جاتا۔ ایسی خصوصی دعوت پہنچتی طوائفیں شاہی مہمان خانہ میں ٹھہرائی جاتیں۔ ان کی خاطر مدارست پہ کوئی کسر اٹھانہ رکھی جاتی۔ وقتوں وقتوں منتخب مہر بادشاہوں اور بہت کامروں کو مہاراجہ کی سرکار سےس لوائے اور نذر گزارنے کا پروانہ ملتا۔ مہاراجہ جس خوش بخت پہ لگاؤ التفات کرتا اس کا دامن موتیوں سے بھر جاتا۔ باقیوں کو محض شرف پانی و خوشنودی کا اعزاز ہی نصیب ہوتا۔

● رام پوری پشمالی آدھا جن آدھا انسان۔۔۔

رام پور کا اصلی کارائی پشمان گانے تھا اس کی گھڑائی گڈی کے کاہ ہاں کھیلے میں یہاں بارہ مولا سرکار کا ایک بھائی تھا۔ ایک دن اس کا ایک دوست اس کے ساتھ ایک عمارت میں گیا کرتا تھا۔ چلا آیا یہاں ہے اس کا اور وہ چار روز کے لئے مکان شریف جانے کا تھا جہاں اس کے سہیلی عزیز رہتے تھے۔ ایک بچی رام پور کے کھیسے میں تھی۔ ایک رات جوں ٹھہر کر صبح دم سیا لکھ کے لئے روانہ اس کے پرہ گرام میں شامل تھا۔ ایک بھائی و سہیلی سہرا۔ دھرم شالے سہا طرے گئے کہیں بھی اسے شب بھری کے لئے جاگ نہ لی تھی۔ سہیلی طرسوں کے ان ٹھہر میں ہر چاہیہ آدمی آ رہا۔ بھول اور بگڑا جلی رہا نش چھوہیں بہت پہلے سے بکے تھیں۔ باجی ہو کر وہ کھیلوں کی جامع مسجد میں چلا آیا۔ عشاء کی نماز گزار اس نے اپنے گھر و عیش نظر ڈالی۔ لیکن تو دور کار یہاں تو پاؤں پہارے کو بھی جگہ نہ ملی۔ شلو کے میں رقم بھی تھی احتیاط اس نے اس اڈوہام میں چارے رہنا مناسب نہ سمجھا اور یہ سوچتے ہوئے مہاراجہ کے محلوں کی جانب نکل آیا کہ پہلو آج رات دیکھی کسی مٹنی ایک رات جوں کے نام۔ کھل صبح نہا دھو کر یہ لکھوے پہلے جائیں گے۔ شلو کے کی رقم کو مزید محفوظ کرتے ہوئے اب وہ پوری طرح گڑبگڑ کی گھبراہٹ اور روتی مینے میں ٹھن ہو گیا اب وہ ٹھنڈی سڑک کی جانب بڑھا آیا تھا۔ بلکہ جان کہاں چاہئے کہ لوگوں کے پیٹے مینے نے اسے بھی ای ڈٹ پہ ڈال دیا تھا۔ کشادہ سڑک ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چاند کی چاندنی نے ہر سو اب ٹھوٹی سا سماں باندھا ہوا تھا۔ لٹھا میں اک عجیب سی مہک نہ پئی ہوئی تھی۔ ہنرے مٹنی لدی مہاوٹ اور کچے آموں سی مہک۔ جو صرف جوں

قلم کار نے چاندنی راتوں میں ہی محسوس ہوتی ہے۔ بھانت بھانت کی بولیاں، خور و خور کے لوگ ہاگ، خمیر، جوتہ، پنجابی ڈاٹنگ، ڈوگری سٹے، گوجری بھنگے، راجستھانی غولے، کانپور اور کرناٹک کے کرلے، بمبئی کے جیسے کھجور کے بانگے، دہلی اور حیدرآباد کے پھیلے، رام پور کے بد مغزے، چٹان — ہر کوئی اپنے رنگ رنگ میں آئین تھا۔ مگر کالے خان کے علاوہ شاید ہی کوئی اکٹلا دو کیا ہو۔ اسے ایک دم اپنے اکٹیلے پن کا خیال آیا، پھر مڑھکتے ہوئے وہ کچھ اور آگے بڑھ آیا، یہاں سے وہ جھوم سے نکل کر سڑک کے کنارے پہل گیا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف وسیع سبزے کے قلعے تھے۔ گھٹے گھٹے درخت، خوشبودار جھانگے، ہمدرد رنگ، ٹھٹھٹ پیڑ پھولوں سے سجے تھے، کیاریاں، بارش عدن کی راہیں کھولتی ہوئی روشیں — بالوں کے درخت، سوگرنے کی جھڑیاں — یا من و سنبھل کے قطعات، کھلی، کھلی فضا میں دو دو اور ملاوے کی مانند کھلی ہوئی چاندنی نے اسے حیرت انگیز کیفیت پیدا کر دی، وہی تھی۔ اس نے اپنے پن کے آگے میں جیسے ایک گانٹھی پڑ گئی جو اس کی زور کی کھینچ پکڑ چارہ تھی وہ وہاں سو سا کنارے کے ساتھ ڈرا کر اٹھا، پھر گڑھاں کے ایک کونے پر آکر سا گیا، وہاں کلاپے کی شدت سے آجکھٹے سا لگا تھا۔

ایک آگے بڑھ کر وہی انداز کا ہونا سے جو انسان کو تھکا کر دیتا ہے، وہ ایک دائمی یا عارضی ہوتا ہے۔ یہ اس کے لیے اس وقت کی زندگی کے درپے ہو جاتا ہے، یہ اس کے لیے پہلے آ رہا ہوتا ہے اس کے بعد پھر اس کی پھر پانچ پن کی کیفیت سے وہ چارہ کرتا ہے اور پھر یہ جڑ سے جڑ سے ایک ایک ناک، مرض کی شکل اختیار کر لیتا ہے جیسے ایک خاص اصطلاح میں "عرق الکحل" سے ہونا جاتا ہے۔ اس مرض میں مبتلا مریضوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، کوئی خاص فرق نہیں ہے، کوئی خاص فرق نہیں ہے، کوئی خاص فرق نہیں ہے، کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اس میں بھی اس سے کچھ ایسی ہی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔

کہتے ہیں لاہوری، امرتسری اور سیالکوٹیوں کی طرح پٹھان اور سکھ حضرات کہیں بھی چلے جائیں، جہاں جہاں مقام، وحشت کے جیسے جیسے بھی مدارج سے گزریں۔ سمندر، تھری، کی کسی بھی منزل پہنچیں۔ پٹھان، سکھ، لاہوری اور امرتسری، سکھ، پٹھان ہی رہتے گا۔

رام پور کا یہ کھڑا اور تھیں راتوں سے منہ بھر پٹھان بھی رات بھر پٹھانوں کی طرح انڈیا کے منہ کا منہ کھلی شکل و سوچ کا بندہ تھا۔ بات بات پہ چٹو نکال کر مرنے مارنے پہ اترا آتا۔ جہاں پھر مریضوں کا علاج کی کوئی انتہائی تھی، وہیں بھی پٹھان جاتی۔ نو چھ کاپل و مکر کر، پٹھانوں، بڑوں، کالین، دین کر لینا۔ ان کے تو کے لیکن ہل تول زبان میزون کاٹے سے دہے۔ انکی گھنیری، چٹو کے کاتے ایک ہی اٹھی، جہاں سو گھنیں کہ نظر پھر دیکھنے سے نہیں دیکھنے لگیں۔ چپٹی ہوئی چھوٹی گول گول لٹری، مال، آٹھیں، جیسے کوئی

پرانا بھٹی بھوگلا اپنے کا عادی ہو۔ ٹکونا سا تنگ ماتھا ڈنٹل سی لوں 'سزے ہوئے بڑے بڑے سے کان' کھوڑی ناک۔ اور پھر گردن 'جانے تھی بھی یا محض خود سیدھے کا ندھوں پہ گھل تبست و سہری تھی۔' ٹھہرتے ہوئے گول ٹینگن سی رنگت والے لٹکے ہوئے ہونٹ۔ یہ تو اس کے حق میں بہتر ہی ہوا کہ رام پور میں کہیں پیدا ہوا اور بچا رہا۔ ورت ایسا نادر الوجود تھیں اگر کہیں کامل و قد صاف ہوتا تو پختون اسے تازہ آزمی ڈپنے کی کھال میں دم لچت کر کے کسی پہاڑی کی اوٹ میں پھینک دیتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ رب العزت نے اسے خاص طور پہ رعنائی 'اکاشی اور مردانہ و جاہت کا فیض بنائے میں کسی حکمت و مصلحت کا مثل دخل یقیناً نہیں رکھا ہوگا جو ہماری تمہاری نظروں سے اوجھل تھا۔ وورڈ ذات اور حفظ ذات کا ایک ایسا تاب دار الماس تھا جو شش پہلو تراشیدہ تھا مگر اس کے نیچے اس کے شش پہلوؤں کی لوک ارتکا ز ایسی نکلی ہوئی اور یوں خلیکی تھی کہ اس کی خوبیوں کا معترف بھی اس لوک کے آزار سے ہی نہیں نکلتا تھا۔

آسودہ حال کا درباری بندہ تھا۔ آگاہی الحال خالی تھا اور دیکھتا تو اس سے پورب تا پچھم جان پھرتا پٹکا تھا۔ اس بھلے دہلی بندہ جی آتی جاتی سانسوں کا اسیر نہ لگی ہر کر رہا تھا۔ تھی تو ایک حد تک خود پر غور و فکر و صورت دیکھتا پٹکا اپنے قربت داروں سے تھی اس نے ہمہ تن جھڑپنے کے ساتھ شش پہلو تراش کر اپنے بندہ جی ہوئی تھی اور اس کے ہر پہلو پر ایک ایک خاص بات لکھی ہوئی تھی۔ وہ لوگوں کی مہارانی دکھائی دیتی تھی بلکہ چاروں کے سامنے خانے کے نکاس آ رہے تھے۔ یہ سمجھ کر کسی بہتر کے آگے ایک بہتر سے تازہ دہلی کی اوقات کا دکھائی نہیں پاتا تھا۔ اسے آسودہ سرکان، سرخ شیشے کی لوک 'چاروں طرفوں' کہا کہیں کسی شخص کے درمیان نہال و مشغول رہ کر بھی اس کے سانس نہ سکتے رہتے ہیں۔ انہی اندر کی دکھائی و دکھائی سے جدا کرنا ہوا مشکل امر ہوتا ہے۔ قلبی نود و لپاں سے بے نیاز ہنسنے سحر کرتے صبح صبحے میں من لوگوں کے حق و دہر کا کافی مار کر یوں پڑا تھا جیسے کوئی ہنگلی بوڑھا آڑے کی آنکھ میں اندھا اور بے دم ہو کر کسی کھیت کھیاں یا گلی بازار میں اصراب آ کر رہا ہے یا جس طرح اپنے کو مار رہا ہے وہ جانے کا احساس کی دوسرے کی شادی میں شریک ہونے سے ہوتا ہے اسی طرح اپنے اندر سے اکیلے ہونے کی ڈھن۔ یاری ہوتی کے بعد صحن میں بندھے یا درہ ستوں میں ٹیلیوں اور شاداں و فرحان لوک باگوں کو دیکھ کر سو اہو جاتی ہے۔ چاہے اور چاہے جانے کی خواہشیں بھی ایسے لوگوں کے اندر کے خالی ابے کا ٹھنڈا کھڑا کھی تو ہوتی ہیں۔ کسی دہلیس کا سنگھاسن اگر فرمانروا سے خالی ہو کر ہی سی کھوپڑی جیسے سے صاف ہو کر یوں میں دید کی اندر۔ اور دل کا آن کسی من مو ہنہ سرے سے چھٹی سے خالی ہو کر جھینے میں کیا مزہ کبھی چاہتے؟ کھان کا عواد اور وصلی کا طہنٹ اپٹا جگہ۔ لیکن جو بھر انتظار اور اکلا پے میں سنگتی ہوئی لذت دھبی دھبی میٹھی سی آگ۔ کسک چھن چھپی ٹکی ہوتی ہے اس کی تھک تھک تو کوئی

نہیں جاسکتا۔ وہ ایک بار پھر وحتم چل کر رہا ہوا جہوم سے باہر نکل آیا۔ کافی دیر غور و غوض کرنے کے بعد وہ ایک لمبا چکر لگا کر اسٹیج کی بغل میں جاسن کے ایک بڑے سے درخت تلے چٹائی پالیا۔ یہ جگہ اسے کافی مناسب دکھائی پڑی ایک تو اسٹیج بالکل سامنے تھا دوسرے درخت اور بانئیں بغل ہونے کی وجہ سے یہاں آمد و رفت اور عام لوگوں کا بے محابا اثر و حاکم بھی نہیں تھا۔ اچانک اس کی نظر درخت کے اوپر پڑی جدھر چند مٹھلے نوجوان بڑے اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔

ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے کیا نہ کرے غلطی مچا کہ مہاراجہ پنڈال میں پد حار رہے ہیں۔ اسی دن بچہ اور افراتفری میں دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں کے ساتھ اسے بھی درخت پہ چڑھنے کا موقع مل گیا۔ جاسن کا نرانا چھتہ رور درخت ہاتھ کے ٹھٹھے پہنچے کی مانند پھینچے ہوئے موٹے موٹے ٹھن پتوں سے آبی پتی گنجان مہنیاں اور شاخسارے اوپر پہنچ کر اسے یوں لگا جیسے وہ کسی تھیں میں غلٹ گاس کی سیٹ پہ بیٹھ گیا ہو۔ وہ تو چاہتا بھی یہی تھا کہ تن تھا کہیں بیٹھ کر اس دآرام کو دیکھے نئے۔ اس کے سر پہ سر پہ کوٹریب سے محسوس کرے۔ وہ اپنی اس کامیابی پہ بہت مسرور تھا۔ اپنے تئیب وہ داندہ فرد تھا جو اس بزاروں کے پنڈال میں اتنی دھنی آسودگی ایسی قلبی ملاپ کے لئے جوئے بہ شوق فراوان فرماں یہاں نہ تھا۔

مقامی ٹکا کاروں نے آؤ گری اور گوجری برشا میں چند مقامی نوک گیت سناے جو شاید ترانے کی زمل کے تھے۔ جن میں مہاراجہ کے لئے ستائشی کلمات۔ ان کے ران پات کی تحریف اور ان کے شکہ شاتی کے لئے کامن میں تھیں۔ پھر چل سو گئی گیت ائے نئے نئے۔ ایک سے بڑھ کر ایک کالے والیاں تھیں۔ خاص و عام ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر گانے بگٹے آفرین و حسین پیش کر رہے تھے۔

گاسلے خان درخت کی ایک ٹھیلی پھٹک پہ ٹٹوسی سواری کی طرح ادھر ادھر تھیں ڈالے بڑی گونٹ سے کان جھانے آنکھیں نکالے پر اگر دم نکھو رہا تھا۔ اس وہ انداز سے جو اسٹریٹ و جتاہ تھا۔ اس کے پس میں نہیں تھا۔ وہ نہ وہ صرف سفیداں باقی تو ہی وہاں بٹھا دیتا اور باقی سب گانے والوں کو۔ راستہ بدر کر دیتا۔ اس طرح بوز بڑگی میں بیٹھے بیٹھے اس کے ذرا تو اور پیچھے دیکھنے لگے تھے مگر جہاں شوق اور عشق در آئے وہاں انسان ہر حسرت اور افسوس برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیتا ہے۔ وہ پہلو بدل بدل کر بڑھ چکا تھا اس انتظار میں کہ وہ غیرت نامید آئی کتاب آئی۔

جس پہ بھیکہ کیے بیٹھا تھا وہ جن ہلا۔ پہلی بار اسٹیج سے نظریں ہٹا کر نیچے دیکھا تو وہ تین نوجوان اوپر چڑھنے کی جستجو میں حتم گٹھا دکھائی پڑے۔ آخر ان میں سے دو جوان اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ان

کے لئے جس پر ہاتھ اسے بٹائے یا پھلانگے بناؤ دونوں اوپر نہیں چڑھ سکتے تھے۔ انہیں کچھ کہنے کا موقع
 یہ بھی ملے گا کہ خان مزید اوپر چڑھ آیا۔۔۔ پھنس کر بیٹھنے کے لئے یہ بھی جگہ بہتر تھی اس قیامت یہ تھی کہ
 ان سے کچھ کا منظر واضح نہیں تھا، گھبراہٹوں کے پتے آگے آتے تھے۔ شوق وافر ہو تو عقل ماری جاتی
 ہے۔ یہاں سے بھی بہتر کی کھوج میں مزید اوپر سرک گیا۔ یہاں اسٹیج کا منظر پہلے سے بھی صاف تھا۔ یہاں یہ
 وہ گھس تھا جس کی چھت سے بھی غصہ دو میزے اوپر معلق تھا لیکن یہ نہیں بڑا کمزور اور پٹایا اساتھا بیٹھنے ہی
 سے گھس بھی ہوا کہ شاید یہ گھس اس کا بوجھ نہ سہار سکے۔ مگر پھر وہی بات کہ شوق اور عشق سر پہ سوار ہوں تو بندہ
 بھگتا ہی کے بارے میں بڑے غلط سمجھنے لگا ہے۔ خوش فہمیوں اور خوش گمانیوں کی دھند میں سامنے منظر کو
 دیکھ کر رہا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ کیا ہوتا ہے تھا کئی اپنے آپ کو جبراً منواتے ہیں اور دھند وقت کے سورج کی
 گرمی سے بے وجود سمیٹے کہیں کا فوج ہو جاتی ہے۔

وہ ہاتھیں پھنسا کر دو ہاتھوں سے اوپر کی شاخوں کو پکڑ کر سست سست کر کسی طرح وہیں بیٹھ گیا۔

اوپر کی سانس اوپر نیچے کی نیچے کیونکہ اسٹیج پر سفید ہالی کی آمد کا اعلان ہو رہا تھا۔ کچھ چن بات میں
 اسے یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ گھس سے ابھری ہوئی ایک ٹوک بات کی کھوت اس کے دائیں منظر کی ٹوکی کی

UrduPhoto.com

سامنے اسٹیج کے درمیان سفید ہالی گزری تھی۔ مہاراج کے ساتھ چار بچے تالیوں اور
 سست گھسے سستوں کے ہالی کا سواگت کر رہا تھا۔ تالیوں کا شور گھسے ہی سفید ہالی کے نہایت ادب اور
 ان کے مہاراجہ اور چار بچوں کی جھٹ جھٹ کر سام گیا۔ قبولیت کا اشارہ دیتے ہی وہ اپنے سازندوں کے
 ہالیوں کی آست سے ہولی جیسے کسی مہارو نے اپنے رستم کی بھی تہہ پہنہ ہالی ڈال دی ہو۔

گھر ساز ملتے ہی اس نے سب روایت پہاڑی کا ٹاپ لیا۔ ٹاپ کا آؤپ تھا یہ بھائی کا
 ٹاپ بگلی چرچہ ایٹ کے ساتھ کالے خان والے نرم زمین نے نیلی داد دیتے ہوئے نغرا ہوا
 کالے خان اپنے ساتھ بہت سے بچے لہنیاں کوٹھلیں اور اپنے نیچے کے گھس پہ بیٹھے ایک اور تماشا
 کے ساتھ چھٹی منزل کی بلندی سے نیچے آگرا۔ درخت کے نیچے جگہ میں ایک کا سر پہنا۔ درمیانی زمین
 کے سانس کی ٹانگیں چلنے سے دو میزے زخمی ہوئے جبکہ ساتھ گرنے والے کا بازو تو انھوں اس کی کمر کے
 سے چڑھ کے کی ٹانگیں چلنے سے دو میزے زخمی ہوئے۔۔۔ تو تو خیر گزری کر گرنے والے نیچے گزے۔ نیچے تماشا
 کے سانس کی ٹانگیں چلنے سے دو میزے زخمی ہوئے۔۔۔ تو تو خیر گزری کر گرنے والے نیچے گزے۔ نیچے تماشا
 کے سانس کی ٹانگیں چلنے سے دو میزے زخمی ہوئے۔۔۔ تو تو خیر گزری کر گرنے والے نیچے گزے۔ نیچے تماشا
 کے سانس کی ٹانگیں چلنے سے دو میزے زخمی ہوئے۔۔۔ تو تو خیر گزری کر گرنے والے نیچے گزے۔ نیچے تماشا

”کیا ہوا۔ کیوں ہوا۔ کدھر ہوا۔“ ریاستی اہلکار ڈنڈے سلجھائے ادھر لپکے لوگوں کو ہٹا کر زلیوں کو نکال کر ہسپتال پہنچایا گیا۔ سارا مزہ کر کر کر ہوا گیا تھا۔ پنڈال میں مہاراجہ کی موجودگی کی وجہ سے اہلکاروں نے صورت حال پر فوراً اپنی قابو پایا اور پروگرام کو از سر نو پھر شروع کروا دیا گیا۔

مگر تال اور صورت حال سے اٹھری ہوئی سفید ایں باقی پھر جم کر نہ گاسکی۔ کالے خان کے گرنے کا سارا سامعہ اس کے سامنے ہی تو ہو گئے راتھا۔

اس کے زور و چند فٹ آگے۔ ”سفید ایں سفید ایں“ کا دوا دیا مگر نے والا اپنے زلیوں اور تکلیف کو بھول کر ”سفید ایں سفید ایں“ پکار رہا تھا۔ اس کے پھیلے ہوئے بازو اس کی وحشت سے بھٹی ہوئی آنکھیں اس کا دوا دیا اور جوش۔۔۔ گانا دانا سب بھول کر وہ محض اسے دیکھتی ہی تو رہ گئی تھی۔

کالے خان کو جب وہ زور و جوش آیا تو خود کو ہسپتال کے منتظر چیت پڑا ہوا پایا۔ ناف سے اوپر ہنسی کی دو فٹس تک جیسے سہلے کالینٹر پڑا ہوا تھا۔ گردن کے گرد کپڑے اور لوہے کی تار کا ٹکڑے جکڑا ہوا۔ بس آنکھیں اور ہنست آواز تھے باقی کچھ جیسے ساتھ ہی نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ راجہ کی بیٹی کے دوا دیا کئی گھر سے پتے گئے ہیں۔ جب گردن کے پیچھے جھٹکا پڑنے سے کدی کی کھوپڑی اور منہ کی مسکرت ہوا ہوتی ہے۔ اس کی ایک لہر اس کی ہنسی کی آواز سے ملتی ہے۔ اس کی ہنسی کی آواز سے اس کے منہ سے چکاوڑ کی طرح آہ جن کا باہر نکلی گئی۔ اس کے بعد وہ کافی دیر تک بے حس و ہوش رہا۔ چھوٹی بڑے پے پے اسے مزید معلوم ہوا کہ اس کے گھر سے بیٹے تک اعلیٰ درجہ کی بات وہ تو جھڑپ تک نہیں کر سکتا۔ بہت سامنے دیکھ کر اس اور منہ سے کہہ کہ ضرور کھٹکتے تو آتے اپنی بیٹی کی۔ راجہ سا آ گیا۔

مہاراجہ نے زلیوں کے علاج و معالجہ کے لئے خصوصی دستہ جاری کئے تھے۔ اسی وجہ سے اسے ہسپتال میں خصوصی توجہ دی جا رہی تھی۔ اس سنگین حادثہ کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ ورام پورا اپنے گھر والوں کو اطلاع کرنا مگر ہسپتال والوں کے کہنے سے باوجود بھی اس نے ایسا نہ کیا۔ نہ تو اس نے اپنے بیٹوں بچوں اور ستوں عزیزوں کے بارے میں کوئی تردید ظاہر کیا اور نہ کسی کاروباری نقصان کا اندیشہ۔ وہ تو جیسے چاہے اس سے کمر اپنے جان من تک پہنچ گیا تھا۔ ہاں پہ کوئی ترقیب شکایت ”پیشمانی“ چھٹاوا نہ کسی تکلیف درد سے ہائے داتے۔ مگر سے سمندر سا شانت چہرہ۔ وہ اپنے تسمو میں کہیں دور نظر نہیں دے رہے تھے۔ چپ چاپ بچ رہا تھا جیسے وہ کسی کچھ تو چاہتا تھا۔ سفید ایں باقی کے اس عجیب و غریب عاشق کو تو ان ہزاروں کے نقصان کی بھی رتی بھر پہتاناہ ہوئی جو حادثے کے وقت اس کے اندرونی شلو کے کی جیب میں تھے۔ نہ جانے کب کس ضرورت مند نے باقی چیزیں چھوڑ کر صرف روپے نکال لئے تھے۔ اس نے نہ ہسپتال والوں سے پوچھا نہ ہی کوئی ریت لکھوائی

پھر خان صاحب۔۔۔ تھکوں تھکوں انگلیوں اور قہر ستانوں میں خون تھوکتے پھرتے ہیں۔ فن اور فنکاروں کی ناقہ دی اوقت زمانے کی طوفا چٹھنی۔ شاگردوں اور دوستوں کی بے وفائی کا ریاض کرتے رہتے ہیں۔ آخر کسی ہسپتال میں "وائل دفتر" ہو کر اپنے انعام کو بچھتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ ان جالتوں کی وجہ سے کیسے کیسے لگانے روزگار مذکور بحری جوانی میں ہمیں واضح مفارقت دے گئے۔

بات سنیہاں پائی کی ہو رہی تھی کہ اُس دن کے سانچے کے بعد وہ تھک کر رہ گئی تھی۔ کوٹھے پہ بیٹھی نہ کوئی مجلس آرائی کی۔ گو یہ واقعہ کوئی ایسا سنگین بھی نہ تھا کہ جس کے ردِ عمل میں وہ بیویوں کا مہم و حسد سے سے ہاتھ کھینچ کر سنیاس لے کر بیٹھ جاتی۔

[illegible]

وہ چار روز اس نے انکی آواز بندھا رکھی تھی۔ وہ بند کو بھی کی طرح اپنے دین پر گہرے
 اثرات چھوڑ چکی تھی یا شاید جسے کی کوئی بندش تھی کہ وہ بند ہو انکی مانند کوئی سسکی بھی نہیں لے رہی تھی۔

● دُک دُک دے توئی آیا کیا میرے شہر وچ نمونیاں اُساں مانیاں.....!

جنوں کے گھر ہم سے بیماروں کی خبروں کی طرح بڑے نہانے اور رکھلے ہوتے ہیں۔ بلکہ اس سے کچھ ساری ہوتے ہیں۔ جسے نظیر کشمیر کی ہام پینڈیوں سے اچھا سوں کی مانند اترتی منگھلیں ہڈیوں کے قافلے سب اپنے چمن چھوڑ چکا ہو چلا ہو وہ زعفران کیڈو گلاب و گیندا ترنس و سترن سوسن و سنبل کی مہکاروں

عبداللہ گھس گھس چار یاری میں پھنسا ہوا کہیں رسولوں ہائی کو دیکھ نہ بیٹھا۔ ہوش خواں جانتے رہے۔
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب کچھ اٹھا کر اس کے قدموں میں رکھ دیا۔ رسولوں ہائی بھی اس دیوانے پر ایسی رنجش تھی کہ
 اس سے سے چاہنے لگی۔ اس شریف آدمی کے گھر میں بیوی بچے بھی تھے۔ مگر عشق لڑی بلا ہے سر پہ چڑھ
 جاتا ہے۔ وہ اس سرکشکھن سے ایسا بچڑا کہ اس کے گلے کا بار بن گیا۔ جس کے نتیجے میں سفید اس ہائی
 سفید ہو گیا۔

خوشیوں اور کامیابیاں اگر دائمی قائمی ہوں تو پھر شاید انسان انسان کی صورت میں زندہ ہی نہ رہے
 بلکہ کھٹکھٹ کامیابیاں ناکامیاں محبت نفرت اور مرے بھینے کے تغیراتی قوا سے استحکام دیتے ہیں۔ اس کے
 لیے مسیحا اور جو صلے فراخ کرتے ہیں۔ تدبیر اور عقد پر کے فلسفے کو سمجھنے میں مدد ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے
 لیے اس اور منزل کا یقین کرتے ہیں۔

اس شریف آدمی نے رسولوں ہائی پر اپنا سب کچھ نثار کر دیا۔ لیکن اپنے پہلے بیوی بچوں کے لئے اتنا
 کچھ نہ دیا کہ وہ بھی عمر کسی کے متاع نہ رہے۔ ایک اور کمال یہ کیا کہ مرے دست تک اپنے گھر کا خدا ان
 کے تعلق کی ہوا تک نہ گئے وہی۔ کوئی کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا مال ان کا گھر باری
 میں تھا۔ یہ ساری چیزیں ان کے پاس تھیں۔ اس کو مال کا بندھن نہ رہا۔ اور میرے۔ اس کے ہاتھ روز
 کے مال سے بھر جاتا تھا۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت وقت نے انگریزی تواریخ موسم بدلنے حالات بدلنے کی روٹنی۔ پھر جیسے
 جیسے نئے نئے کھیتے سے ہاتھ لگے۔ تو ان کے ہاتھ لگے۔ ان کو ان کا لیا جاتا رہا ہے۔ مگر جیسا تک
 سب کچھ ہی وہ سوتے میں بھی آنکھیں پینا نے لگتا ہے۔

جس سب سے لے ایک جیسا تک چہرہ لکھ لیا تھا انکی تین چار بیوی بیٹہ منہار میں بیٹھتے تھے کہ
 ان کے تین بیٹے ہیں ایک جیسا تک جو نکال آیا۔ انا کا نام وہ بیٹے کی رو میں آ کر رہا ہو گیا۔
 اس کے بعد یہ مر گیا۔ کہا کون سی لگی کا۔ وقت کا دریا اپنے رستے پر رواں دواں رہا۔ نئی پاک کر جانے
 کے لیے آدمی سے جو کچھ بھی رسولوں ہائی کو نصیب ہوا وہ کتنے دن چلتا۔

کہتے ہیں کہ دائر کے بال اور ریشمی کے مال دونوں میں برکت نہیں ہوتی۔ آئی چلائی ہوتی ہے۔
 کہتے ہیں اس بھی آیا کہ صرف دو چیزیں نہیں۔ ایک یہ پٹنی سلیمان اور آدمی چاندی کی یہ چھاننا
 جس میں ایک نغما ساز مزد پھنسا ہوا تھا۔ یہ مرنے والے نے انسانی کے طور پر خود رسولوں ہائی کی
 جگہ پر لگائی تھی۔

طوائف اور سانپ اگر اپنے گاروں پر باد ہونے والوں سے ہمدردی رکھیں یا ان کے ساتھ خود بھی بر باد ہو جائیں تو پھر طوائف، طوائف اور سانپ، سانپ نہیں ہوتے اور پھر سنیو لیوں اور طوائف زادیوں میں اپنی ولدیت جاننے کا کوئی شوق نہیں ہوتا۔ ہوش سنبھالنے پر رسولوں بانی نے سفیداں کو یہی بتایا تھا کہ یہ انگوٹھی تمہارے باپ نے مجھ پہ نیچا ور کی تھی۔ وہ اکثر ماں سے اپنے باپ کی یہ انگوٹھی مانگا کرتی تھی۔ اور کبھی رسولوں بڑی وقت سے اتار کر اسے دے بھی دیا کرتی تھی پھر سفیداں پہروں اس انگوٹھی سے بچوں کی مانند کھیلنا کرتی۔ اپنی پتی پتی انگلیوں میں پھنسا کر گھمایا کرتی۔ کبھی چوتھی گالوں سے مس کرتی اس سے اس کے چہرے پر اک عجیب سی مسکونی چمک ابھر آتی۔ وہ دنیا مافیہا سے بیگانہ سی ہو جاتی۔ اور رسولوں بھیگی آنکھوں سے اسے نکلتی رہتی۔ طوائف اور طوائف زادی ہونے کے باوجود۔ دونوں اسی مقام پہ انسان سی بن جاتیں تھیں۔ سفیداں نے کئی بار اپنے ذہنی الفاظ میں ماں سے یہ انگوٹھی طلب بھی کی۔

”ماں! میں تم سے اور کچھ نہیں مانگتی۔ صرف یہ انگوٹھی میرے آن دیکھ باپ کی آخری نکلانی مجھے دے دو۔“

رسولوں بانی جیسے انھروں سے اسے تو لیتی مہلی نہ مٹتی رہتی۔ صرف ایک بار سفیداں کے ضد کرنے پہ کہا تھا۔

”بھئی! میں نے گلوں کی نا! اس وقت میری انگلی سے اتار لیوں۔ جیتے ہی میں اسے خود سے لے لیا نہیں کر سکتی۔“

ایسا دل دہلانے والا جھنجھٹا کر سفیداں نے لے لی تھی۔ اس دن کے بعد سفیداں نے پھر کبھی ایسی حماقت نہیں کی تھی۔

اس سے رسولوں نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا۔ پھر وہ بچھٹائی بھی بہت کا حق پچی کی دل آزادی ہوئی۔ اسی دن کن میں رسولوں بانی بھی ماضی کے درپے کھول کر نمودار نہیں بیٹے سوں کی دھند میں اتر گئی۔

خوبصورت تو وہ خیر ایسی بھی نہ تھی کہ چٹانوں پہ عکس ڈالتی تو وہ بھڑک سے لوٹ جاویں۔ قد اسٹ میں بھی کوئی قیامت اٹھانے والی بات نہ تھی اور نہ ہی آنکھوں میں کچھ ایسے شرار و شرارت تھے کہ جدھر نگاہ ڈالتی اُدھر ہلکی کے جنگل غامض کر دیتی۔ اس وہ قبول صورت وہ مست تھی لیکن اس کے ہاں خوبصورت آواز اور موسیقی کے نغمہ و کمال کے ایسے جادو تھے جو ہم پہ پڑھ کر بولتے تھے۔ اس کے جیسے فصل میں بیٹنے والے بس اس کے ایسے ہو جاتے تھے کہ وہ ہزار کی بڑی بڑی خوبصورت نامور طوائفوں اور گانے والیوں سے جی ہٹا لیتے۔ اس

کھانہ کی طرح طرحی سبھاؤں، زچھاؤں اور آداب آداب ہی ایسے تھے کہ وہ طوائف ہوتے ہوئے بھی کوئی دیوی دکھائی دیتی تھیں۔ دوسری کا کوئی مدھر سا روپ ہو۔

ہائے کن زبے تماشیں اور موسیقی کے رہے سبے پرانے استاد کہتے تھے کہ رسولوں جیسی ایسی نے نہ تھیں جو دہائی شکستہ نرملی اور مٹھل گانگ آج تک پھر کہیں نظر آئی نہ نشانی ملی ہے۔ تان پٹے لیتے تھے۔ لیکن شہزادہ گلزار بائی اور باریک ہنرمندی سے اپنے اس انگوٹھی والے ہاتھ کو جڑے کی حرکتیں دیتی کہ شہزادہ سے ناگد سے ناگد دیکھنے سننے والا محض اس اعطائی اور انگی اور ٹخن لہجہ کی پاکیزگی سے ہی اندر باہر جھکے رہتا۔ وہ کسی لمحے سے ایسی پھرت سے انگوٹھی کو ہونٹوں سے مس کر لیتی کہ ہر کوئی اس کی اس ادا کو محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

اب برسوں بعد سفید الہائی بھی تان پٹتے لگاتے تھے اپنی اس انگوٹھی کو اپنے چہرے کے قریب لاتی جیسے شہزادہ کی انگوٹھی کے سر جھوٹے سرمہ دانی کے اندر سے سر کو اٹکھٹ کر کے باہر نکال دیتی ہو۔ جبکہ وہ اپنی ہاتھیں دھو رہی ہو۔ بائی اور باریک باپ کی نشانی انگوٹھی کو اپنے ہونٹوں سے مس کر رہی ہوتی۔ یہ نشانی اس کے ایمان کا حصہ ان پر تھا کہ اس کی آوازاں کا فن خاص و عام میں اس کی چاروں طرف سے دولت شہزادہ کی سب اسی

UrduPhoto.com

بابا گناہ کے پیاراؤں کی جانب سے شہزادہ گلزار آؤنے لگا تھا جبکہ گلنے کی مامی اس سے اس کے سر سے پہنچتی تھی پائی تھی وہ اسے اپنے لئے بد شکوئی محسوس کر رہی تھی۔ سیاہ رنگی آپ رواں ہوں۔ آواز دیا پیدا پڑے گا۔ چاند کے گرد ہالے گلنے ہوئے نیم گلنے ہوئے کر شیب ہال نشی ہوئی متوشش رہیں۔ ایسے میں کشمیر کی جانب سے انگوٹھیاں گورتی ہوئی پہ والی۔ مٹی بہریالی انگوٹھی اور کید زے کی انگوٹھی دیکھی دیکھ رہے تھے۔ آخر شب کا ٹوٹا ہوا شمار اور صبح کو نیند کا اٹھا ہوا شمار۔ قمریوں والیوں کے چہروں کے چہرے بھی اسے دل گرفتگی سے نہ کال سکے۔ اک اپنستی سی نظر قہ آدم آئینے پڑا دل کروہ پڑ کر وہی جھک پڑے تھے۔

نیز کا تعلق محض جاکن انھن۔ تار کی بارات کے سب سے ہی نہیں ہوتا۔ ارادے موج نہا حول اور ان کی کسی ضرورت سے بھی ہوتا ہے۔ اس کے اندر تو بے چیزیں کی کھوپیاں اور خدشات و غول کے کچھ۔ سچ سے تھے۔ بابا بانی شاہ کے میلے والے سائے کے زحوم کی "گز کر دھا" اور ہاتھ بازہ بڑھا کر سفید اس سفید کی "تار" کی "ری" کی "کم تھی" کہ بواب یہاں دھان سے عزیز ان دیکھے باپ کی نشانی انگوٹھی کے گلنے کی گندگی کی تان ٹوٹی بھی باقی رہ گئی تھی۔ نگینہ اور وہ میلے والا زخمی دیوانہ۔ جیسے دونوں آپس میں گلدند سے

ہو کر رہ گئے تھے۔ نیم وا آنکھوں میں گھنیر سی چٹکوں کے شاید ٹکڑے نیند کی کسی منہ چڑھی سی گھنیر نے نیکی لے لی تھی۔

● مریضِ عشق پہ رحمتِ خدا کی۔۔۔!

دن چڑھے جب کسٹندی ٹوٹی انگلیں ٹھکے تو اس کی بند آنکھیاں بھی وا ہوئیں تو ٹھکے در پہ سے چڑھتے سورج کی مہربان سی کرنیں اس کی بے ترتیب گھنیر سی زلفوں کے چنوا چھوئی تھیلیں رہی تھیں۔ چہرے پہ ہلکی سی طمانیت کا نور کھلا ہوا تھا۔ جیسے آمدنی طوفان اور موسلا دھار بارش کے بعد موسم نکھر آتا ہے۔ یہ جنت کا موسم ہی تو ہوتا ہے۔

وہ بھی ایک محسوس ہی غور دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دیر تک یونہی بے حس و حرکت پڑی رہی یا شاید وہ دیکھے ان دیکھے پنے کو یاد کر رہی تھی۔ یا ایک استاد بھورے جان کر تازہ اندر داخل ہوا ایک عوامی سا خط اس کے سامنے دھرا ہوا تھا۔

”پڑی! پہنچا یہ نہیں تھاں سے آیا ہے۔ بے رنگ تھا، اور کیا پوری اسی جبرماں بے کر گیا ہے۔“
وہ اپنے گنجے سر پہ ہاتھ بھیسرتے ہوئے اتھا بھرتے گچے میں کہنے لگا۔ ”پتھر اٹھ ہو! پتھر آج پتھر روز آن لگا ہے۔“
”تھر روزی کو پتھر سے پہنچ رہیاں تو۔۔۔ لای جی مارنے سے نہیں کھنکھن ہو جاتا ہے۔“
بھورے سے خط پہ یونہی ایک گھنیر سی نظر نہایت غور سے لگتی ہوئی۔

”استاد جی! ذرا امام باندی کو اندر بھیج دیں۔“

امام باندی چٹکی تو یہ انگلیاں چھیلا کر دکھاتے ہوئے کہنے لگی۔

”میری انگلی کا گھینے گم ہو گیا ہے۔ یہ ہم سب کے لئے کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔“

دونوں آگے بڑھ کر انگلی دیکھنے لگے۔۔۔ استاد جی ہونسلے۔

”دینا! کہیں نہ ہاتھ دھوئے نہاتے وہاٹے گر گیا ہوگا۔ چٹانہ کر ہم سب انہیں دھو دیں گے غلی

جائے گا۔“

پھر وہ سمجھائے کے انداز میں کہنے لگا۔

”بیٹا! کہو تو یوا کر اصراف کروادوں۔ آج شکر دار ہے۔ کچھ وال دینا۔“

سفید اداں باقی درمیان میں ٹوکتے ہوئے بولی۔

”استاد بی ابا بابا بی شاہ کے مینے کے دن حادثے کے بعد جیسے میرے سر ہی غم ہو گئے ہیں اور اب مجھے غم ہونے سے میری جانیں پلنے لڑکیاں جھگڑیں سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ میرے دل پہ دھب اور گلے ہیں گروہ پڑ گئی ہے۔ آج صبح جب میں ریاض میں بیٹھی تو محسوس ہوا کہ میں سب کچھ بھول گئی تھو بیٹھی ہوں“ گھونکنی ہوں۔“

جھونکی بہن امام بانہی چٹک کی پٹی پہ بیٹھتے ہوئے روہا نسوی بولی۔

”ویدی! حادثے نقصان تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ امر تیر اور انہالے ہمارے ساتھ کیا کچھ نہیں تھا اس سے پہلے تو تم نے ایسی مایوسی اور بے دلی بھی نہیں رکھائی۔ باقی رہی گلینے کی بات... مانا کہ یہ خوشی ہمارے لئے بہت قیمتی تھی تمہارا اس سے اک جذباتی لگاؤ تھا۔ ہم وعدہ کرتے ہیں ہم سب مل کر اسے صحت یابی کے اٹھو ہار دینگے۔ تمنا سچیں آتے ہیں مایوس ہو کر دوسروں کے جو بارے چڑھ جاتے ہیں آئی باندی کو یوں ایک انگلی اور اتفاقہ حادثے کی وجہ سے ٹھکرانا کفران نعمت ہے۔ اللہ پاک ناراض ہوتے

منفرد اس مانی رہے تھیں ہی ہو کر بولی۔

”... کیا تمہارا دل اس قدر بڑا ہے کہ اس سے بڑا ہو جائے۔ چلتا چلتا یہاں پہنچ کر چٹک میں آکر اسے دیکھ کر اسے گمانے یا سوچے۔ جاو! تم لوگ ہی جیسے محفل میں بیٹھ لیا کرو۔“

استاد ہاتھ بائیں سے ہٹ کر لے لگا۔

”سفیدال بچی! یہ سنئے! کھانا کھا کر تیار ہو کر بیٹھو۔ بات ساری تمہارے ذمہ برکت ہے۔ میں نہ کہ پتھری! اٹھ تیار ہو سیں تمہیں ریاض کروانا ہوں۔ تمہارے گھر سب واپس چلے آویں۔“

ادھر گیا تیار ہوتی۔ اس بے دلی سے ”اپنا استاد ہی ا!“ کہتے ہوئے ہاتھ باز جا کر بے رنگ خط کی بات حتمی ہوتی۔

خط پانچویں لڑائی لکھی سندھیے پیرا مڑا سے موصول ہوتے ہی رہتے تھے۔ مگر یہ خط ایک تو بے رنگ خط سے کہ عجیب سی وضع قطع لئے ہوئے تھا۔ ج سے بے ڈھبہ انداز سے سرنام لکھا ہوا تھا۔ ٹھیلی ہندوستان میں کی تھی سفیدال بانی امرتسری جموں۔ خط آلا پلٹا مگر بھیجے والے کا نام نہ تھا۔ لکھنے پہ نیلی یا سیاہ سیاہی کے چالے سرخ روشنائی سے تحریر تھا۔ تحریر کی طرح یہ روشنائی بھی ہموار اور یکساں ہی نہیں تھی۔ مزید عجیب دینے پہ پتہ چلا یہ روشنائی سے نہیں لکھا ہوا ہے اس کے لئے یہ بھی کوئی نئی انوکھی بات نہیں تھی۔

اکثر ایسا بھی ہوتا رہتا تھا۔ لیو سے لکھے ہوئے خط چتر و مال وغیرہ۔ اکثر پیار و محبت کے پنکڑ میں پھنسا ہوا انسان اس گلے کو متاثر کرنے کے لئے بڑی ادنیٰ ہو گئی حرکتیں کرتا ہے۔۔۔ اس نے بڑی بے نیازی سے خلاف چاک کیا دیکھیں اندر سے کتنا ہوا چھپچھو ا برآمد ہوتا ہے یا کوئی عشق کا تیر کھایا ہوا زخمی دل۔ مگر یہ خط تو کوئی اور بتی خوشبو لئے ہوئے تھا۔ لفافے کے اندر ایک اور لفافہ تھا جس کے دائیں گوشے ”علی حیرے چاہئے والوں کی خیر“ بائیں گوشے ”چھوٹا راکا لے“ لکھا تھا۔ اک عجیب سے تجسس اور حیرت مہرے انداز سے وہ آنکھیں پٹ پٹا رہی تھی۔۔۔ جب کچھ بوجھ میں نہ آیا تو چٹنگلی کا بیڑا ہوا دشمن ڈال کر اندر والے لفافے کو بھی کبوتر کے پونے کی طرح چاک کیا۔

عاشق کا خط ہو یا کیوڑ کا فاختہ کا پونہ۔ ہر آند کیا ہوتا ہے۔ چند اے نام و اشک۔ ہرے صرخ کا گنج
کے نئے نئے گلے چلے او چلے گھر یزے۔ اگلی کلاسی کے سب سے بلیا دل اور اندر کھسا ہوا حیر یا خنجر
عاشقاں اشعار۔ یا پھر سنے جینے خود کشی کی دھمکی۔

ہسپتال کے رجسٹر کارڈ پر درج ہے کہ گتے کا نڈا مٹا کر کاٹا تھا جس کے ایک طرف سرخیش کا نام مرضی تشخیص اور موجودہ حالت و حرکت وغیرہ شفا سے لے کر اس کا انتقال ہوا ہے۔ یہ ساری باتیں ایک ہی خط میں لکھی تھیں۔

میلے پتاپ کی لکائی ہوئی کوئی جان سے لوٹ کر گرتے والا ہوں یا کالا۔ جسے سب کے لئے نوا کر بھی اگر آپ کی تصور ہی کی تو یہ نصیب ہو جائے تو مجھے کبھی سب کے لئے نوا کر دے گا۔ آمین

ایک دم اس کی آنکھوں کے آگے دم مچلے والا حادثہ آ گیا۔ ماتھے پر تریبی اتر آئی ہاتھ پاؤں
تھر تھر کاہنے لگے اور دل تھا کہ دھک دھک کی دھکم پیل سے بیٹے باہر لوٹنے کو ہو۔ کچھ دیر تک بالکل
ساکت و جامد سی بڑی رہی پھر بڑی مشغلوں سے خود کو سنبھالا۔

طوائف کی زندگی کی بات اس کے پیشے کے تہہ نشے گھر اور دروگر کا ماحول اس کی سوجی بھج کے اپنے مخصوص اندازِ شاہانہ اغراضات یہ سب کچھ مال و زر و رنگ و راسخ، عشوہ و خمر و فراغِ مشربی اور نکاحِ خیزی سے مصلو ہوتا ہے۔ اس کی فوجیہ نی اور بھرپور شباب کے ملتا چند سال مہینے ہی اس کا نقلِ سرمایہ ہوتے ہیں۔ یہ نہیں وہ خوب سینت سینت کر رہتی ہے۔ وہ اپنے ایک ایک اشارے، غمزے، آوازوں، لہجوں، اعضاء کی ایک ایک حرکت ہمارے نفس کی اک اک گرو کا زیادہ سے زیادہ تاوان وصول کرنے میں کوشاں رہتی ہے تاکہ جوانی کی

ہوئے تھے۔ پیٹھ سے گردن تک جیسے وہ سنگ مرمر میں اُٹھایا ہوا ہو۔ سر گدی کا پیچھلا حصہ جس پہ ایک موٹی سلون پڑی ہوئی تھی نکلتا تھا۔ سیاہ بالوں سے لدے پھندے پھرے پھرے ننگے بازو۔ ایک ننگے کے نیچے۔
 ڈو جا سکئے کے اوپر۔ گہرا سیاہ مجو جک چہرہ بائیں جانب ڈالے ہوئے وہ کسی دیوہ ماں کے بیمار بچے کی مانند
 نیچ پچ پڑا ہوا تھا۔۔۔۔۔ سکئے میں دھسے ہوئے چہرے کا صرف آدھا حصہ ہی وہ دیکھ سکتی تھی۔ ایک غلامی آنکھ
 جو نیم بند تھی۔ ناک کا ایک تختہ اور مونے مونے اُردھ کھلے کھلے گونے ہوئے ہونٹ۔ وہ شاید کوئی انجیل سا
 خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ دیکھے جا رہی تھی۔ کبھی اس کے بھار چہرے پہ ہلکی سی مسکان ابھرنے لگتی اور کبھی اس
 کے خشک ہونٹ کسی انجانے اندیشے سے تھر تھرانے لگتے تو انہیں ہانپا سا لگ جاتا۔۔۔ پھر اچانک اس کا آدھا
 دکھائی دیتا ہوا چہرہ نمبرے ہوئے یا نی کی مانند شامت پڑ جاتا۔

راجوں رئیسوں سے ملا اور ہار جوائی اٹھوانے والی سرکشت سے آٹھوں پہر اٹھکیاں لینے والی
 چیت کی چاندنی کی مانند معشوق نہ دیکھے ذات اوقات "والی بات ذہرائی گئی تھی جو پہلے زقذ بھرتی ہوئی یہ برنی
 اس لہجہ جو نے کے بہت بڑھ چکی تھی۔ تقسیم ہوا یا پھر پہلے جہنم کے کسی بول تول کا چلے بھٹان تھا۔
 جو اپنے دام پوری آدھ کھانے کے پاؤں میں پھنسی پڑی تھی۔ وہ اور تک نہ تھی کھڑی ٹھہرنے کے ٹکڑوں سے
 تو تھی رہی۔ اس کی آواز میں کس طرح اس کا ایک ایک دم یہ ایک کر رہی تھی۔
 پھر یہ اس کی جان اس کے جسم سے الگ ہوئی۔ کالے خان لے نکلی سی گراو کے ساتھ بھڑکتا اپنا
 دایاں ہاتھ ٹھیکے کے پچھلے کال ہار گیا تھا۔ اس کی تیسری انگلی میں چاہنے کے پھول پانہ ہوا دکھائی دیا۔
 سفید اس ہائی کے تو وہ بے اٹل کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی ایک روپ اور حالت ویسے ہی اس
 کے پیٹ کی ناف میں گھسا آتا رہا ہے آپ وہ شکار سا تھیں۔ سفید اس ہائی نے ہاتھ اٹھا کر اپنی آنکھوں پہ لگاوا
 اڑی۔ وہ تو وہیں پہنچو جو تھی۔ اب دوبارہ کالے خان کی آنکھوں میں۔ دونوں ایک سی۔ یہ کیسے ممکن ہے
 دونوں ہاتھوں میں ایک ہی سالوں پر اپنی آنکھ لیاں۔ وہ پھر اسی گئی لیکن فوری طور پہ جو بات سمجھ میں آئی وہ یہ
 کہ ان دونوں آنکھوں کا آپس میں کوئی نہ کوئی سبب ہو تو ضرور ہے۔ کیا ہے کس طرح کا ہے؟ فی الفور اس کا
 جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے فور سے کالے خان کے چہرے کی طرف دیکھا مانتے پہ تھوڑی سی اسلے
 سانس چڑھا لے شاید کوئی اچھا سا خراب دیکھ رہا تھا۔ وہ خیر ارادوی طور پہ پانچ کی جانب سے بہت کر رہا تھے
 کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس جگہ کالے خان کا پانچوں آنکھیاں کھلا ہاتھ اس کے سینے مانتے تھا۔ اس نے اپنا
 ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ کے قریب لاکر پھیلا دیا۔ وہ شاید دونوں آنکھوں کا سوا نہ کرنا چاہ رہی تھی۔
 دل تھا بلنبوں اچھل رہا تھا کہ دھڑکنے کی بازگشت اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ ٹھیکے ہوئی شاید کچھ اور

میں نے بھی کہ دل کے دھماکوں اور سانسوں کی ہلکی ہلکی شرشر اہٹ اور قمازات سے کالے خان کے تارِ نفس تھمتھا رہے تھے۔۔۔ بھڑانہ بھی سفیدال بالی کی جانب تھا۔ سرخی شروع ووروں والی تھو تھا آنکھیں جھکوا کھا کر کھل گئی۔ کوئی چیز انتہائی قریب ہو تو واضح دکھائی نہیں دیتی۔ پھر ماندے بندے کی غنودگی تو پھٹتے پھٹتے ہی کتبہ بچھوتی ہے۔ یادداشت دماغ اور اوسمان بھی کہیں وقوف لے کر سکت پکڑتے ہیں۔

لیکن یہاں تو واردات ہی درگتھی۔ جہوں راکالے کی کایا کا ایک ایک کل پڑھ پہلے روز سے ہی
 کے نام کی رگڑ سے رست گر تھا اسے نقابست نیند کی گھمبیر باغیٹوں کی گھمبیر گھمبیروں یا نژدیک و دور کی
 سے کیا واسطہ؟... انار کی طرح پھولتے ہی "یا علی" ترے چاہنے والوں کی خیر۔۔۔ جہوں راکالے
 کی خیر۔۔۔ کا دھیمسا سا نعرہ بلند ہوا۔ یہ سب کچھ اچھا اور ایسا اچانک کہ سفیدان بائی بید سے
 شخص دیکھتی اور سنتی رہ گئی۔

سچی اور نطق توانائیاں جب لڑنے اور ہند لئے لگتی ہیں پھر ہنری شخصیں غور و ایں ہو جاتی ہیں۔
بہاؤی اچھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کا آئینہ بنے زور دتے۔

ایک روز محل کی مسجد میں جمع ہو کر دعا کرتے ہوئے تھیں کہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے لیے ان کی دعا قبول ہو۔

”آپ اصرار کریں پہنچ جائیں مریض سے زیادہ بات چیت کرنے کی اہمیت ہے۔“

خفیہ رہائی کے جیتے ہوئے کھیل

”ان کی تکلیف اور جانچ کے بارے میں“ میں ”کہہ جاتا چاہتی ہوں۔“

تو اسے گہری نظروں سے تولتے ہوئے پوچھنے لگی۔

اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو آپ شاید وہی خاتون ہیں جنہیں اسی نے اپنے گھر سے دھکے کھاتھا۔“ پھر

یہ سب لے گئی۔ "ان کی حالت 'منت سماجت' دیکھتے ہوئے میں نے کہا کھینے اور پوسٹ کرنے میں ان کی

سید اس بانی نے جواب میں مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہل کر شکریہ کہا۔ زمیں خوش ہوتے ہوئے بولی۔

مفتیوں کو یہاں اپنے سامنے پا کر میں بے حد خوشی محسوس کر رہی ہوں۔ آپ یہاں

جیسے کہ میں نے یونی ڈاٹ کام کو اطلاع کرتی ہوں وہی آپ کو مرچیں کے بارے میں پوری تفصیل بتائیں

اُس سے جان چھوٹی تو یہ پھر حیرتِ خوشی اور اک بیجانی سی کیفیت کے گرداب میں بھنس گئی۔
 دراصل وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ انگوٹھیوں کا پتھر کیا ہے۔ وہ کن آنکھوں سے انگوٹھی اور اُسے دیکھ رہی تھی۔
 کالے خان کی مجبوری یا معذوری یہ تھی کہ وہ چپ لیٹا ہی رہ سکتا تھا۔ کسی حرکت یا کردے کے لئے وہ
 بے بس تھا۔ پھر بھی وہ خفیف سی گردن ہلا ہلا کر اسے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بد وقت کہنے لگا۔
 ”سر کی سرکار! مجھے معذور جان کر معاف کر دینا۔ میں اگر ذرا بھی اُٹھنے کے قابل ہوتا تو واقعی
 دل و نگاہ فرش کر دیتا۔“

وہ مزید قریب ہو کر کہنے لگی۔

”یوں ہی خاموش اور بے حرکت لیٹے رہو کالے خان! تمہیں میرے لئے اتنی تکلیف کرنے کی
 ضرورت نہیں۔ میں تو خود ہی تمہاری عیادت کے لئے یہاں پہنچ گئی ہوں۔ کہو کیسے ہو؟۔ مجھے معلوم ہوا
 ہے کہ تم میرا گانا سننے کی خاطر کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ جامن کے چڑھے تھے۔ جامن کا کمزور نہیں
 تمہارا جو بوجھ سہا رہا۔ کا اور تم خاصی بلندی سے پیچے گر چے۔ جس کے نتیجے میں تم اس حالت کو پہنچے ہو۔ کیا
 تم مجھے مختلف حالت میں دیکھنے کے کچھ اور کچھ شوق ہے؟“

”بزرگ! یہ سب کچھ ہی ہوا اور جلد کچھ بھی ٹوٹا بہتے ٹوٹے ہوا۔ بلکہ تمہارا اللہ تعالیٰ جانے کے
 لئے تو اور بھی بہت کچھ ہونا چاہتا تھا۔ شوق نے مجھے وہاں پہنچایا۔ امانت نے مجھے جامن پہنچایا۔ اور
 پھر اتفاق سے میں نیچے گر پڑا۔ اور کچھ دیر ہی غیبی نقصان کو کچھ تیسری طرف سے حاصل ہوئی۔ ویسے سر کی سرکار!
 وہ تو جامن کا چیز تھا۔ وہاں لمبی بھی گڑی ہوتی تو اس پہ بھی چڑھ جاتا۔
 وہ قدرے جھل جھل جھل ہوتے ہوئے کہنے لگی۔

”تمہیں اس حالت میں زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولا۔

”تم نے پوچھا تو میرا جواب دینا فرض بنتا ہے۔“

حیدر اس بات پر کہنے کو تباہ نہیں کر رہی تھی مگر اس کا دل و دماغ انگشتیری والے گورکھ و سندے میں الجھا
 ہوا تھا۔ اسے جب بھی موقع ملتا وہ انگشتیری کو بے غور دیکھ لیتی۔ کبھی کبھار کالے خان کے قریب آئے لی
 ایک وجہ یہ بھی تھی۔ وہ بڑی بے تابی سے انگشتیری کے بارے میں جاننا چاہتی تھی مگر اسے کوئی مناسب موقع یا
 الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اسی اثناء میں ڈاکٹر اور وہی نہیں اندر داخل ہوئے۔ بڑا کوئی سڑیل قسم کا ہنگامی ہندو

سوار ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے اپنی بے تک کی انگشتی کو بار بار اُلت پلت کر دیکھا تھا۔ دونوں میں اُسے بالی برابر بھی کہیں فرق دکھائی نہیں دیا یہ انگوٹھیاں کسی مشین کی بنی ہوئی نہیں تھیں۔ یہ تو کسی انتہائی مشاق سنار کے فن کا نمونہ تھیں۔ سادہ، سخیل اور ضمن بھادنی سی لگتا تھا کسی خاص انسان نے انہیں اپنی پسند سے بنوایا ہو۔ اس نے بہتیرا مارا کھایا۔ مگر کچھ صحیح سے سمجھ میں نہ پڑا۔ جب زیادہ زور دیتی اور معاملے کو منطقی انداز فکر سے دیکھتی تو جو نتیجہ نکلتا وہ کوئی زیادہ خوشگوار نہ ہوتا۔ اس انگشتی کے حساب سے کالے خان سے اُس کا کوئی بہت قریب سبندھ نکلتا۔ کالے خان یا تو اُس کے مرحوم باپ کا کوئی قریبی عزیز ہے۔ بیٹا۔ اور یا پھر کوئی چور لیکن کالے خان چور نہیں ہو سکتا۔ تو پھر وہ بیٹا ہی ہو سکتا ہے۔ ایسی ہی انگوٹھی اس کے باپ نے اُس کی ماں کو اپنی محبت کی نشانی کے طور پر پہنائی تھی اور اب اسی طرح کی انگوٹھی کالے خان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اس تلخ حقیقت پہ سوچتے سوچتے باگلی کی ہو چکی تھی۔

ایک روز اس کے بازو پہ جگہ ہاتھ سے مالش کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”کالے خان ایسا انگشتی اتار دو ہاتھ پہ درم کی وجہ سے نرئی طرح پھنسی پڑی ہے۔“

اُس نے تو بھروسہ نہ کیا کہ اس کا اتارنا ممکن ہو گا۔ مگر یہاں تک کہ اس نے لاکھ کہنے کے

باد جو بھی ٹھیں اُتارنا۔ بھی تو اب انگوٹھی وہ گئی ہے میرے پاس۔ میرے ماں باپ نے میرے خاندان کی نشانی!“

طلحہ اس بالی کے کمال کو سمجھ گیا۔

”یہ تو سب ٹھیک ہے مگر یہ نرئی طرح اُلٹی میں پھنسی ہوئی ہے جبکہ چڑھ چڑھ سے تمہارا جسم سسٹے چڑھ گیا“

ہے۔ ہاتھ بازوؤں پہ درم اور دوران میں خاطر خواہ نہیں۔ اس لئے اس انگوٹھی کا اتارنا ہی بہتر ہے۔“

”اچھا! اگر تم بھی اسے میرے ہاتھ سے اتارنا مناسب سمجھتی ہو تو تو اتار لو۔“

اُس نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ اپنا ہاتھ اُٹھایا چھوڑ دیا۔ مگر طلحہ اس بالی پر مزید آ کر مارنے کے بعد بھی وہ

انگشتی نہ اتار سکی۔ جھل سی ہوئی۔

”بھئی! کالے خان ایہ تو کس سے کس نہیں ہوئی لگتا ہے اسے بھی تمہارے سے طلحہ کی پسند نہیں۔“

وہ اپنے دو پٹے کے پلو سے انگوٹھی صاف کرتے ہوئے بچ پٹنے لگی۔

”اچھا بیٹو یہ تمہاری ماں کی نشانی ہے باپ کی یا پھر جوہرہ.....؟“

اس کی دکھائی دینے والی ایک آنکھ میں جیسے اوس کا چھینٹا سا لگ گیا ہو۔ چند ٹاپے دو پٹلیں بند کیے

”ہاں امیں اپنے باپ کی بات کر رہا تھا۔ سڑکی سرکار! میرے اسی باپ نے میری عمارت و شاندار ماں کو زندہ ورگور کر دیا۔ وہ کسی طوائف کی زلفوں کا اسیر ہو کر مرناسی کا جن کر رہ گیا تھا۔ وہ تو بہت بعد میں معلوم ہوا وہ کاروباری مصروفیات کی آڑ میں اس طوائف کے ہاں قیام کرتا تھا پھر ایک وقت ایسا آگیا کہ اس کا اپنے بیوی بچوں سے التفات بالکل ہی ختم ہو کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ وہ انگوٹھی جو اس نے اپنے ہاتھ میں پہنی ہوئی تھی جس کے لئے کندن میرے دادا کی گھڑی سے لیا گیا تھا۔ جس کا نگینہ میری دادی کے بازو بند سے اتر آیا تھا۔ اور جس پہ میری ماں کا نام کندہ تھا۔ اسی اپنی محبوبہ طوائف کو تحفے میں دے دی۔“ کالے خان نے اتنا کہہ کر پھر خاموشی سادھ لی۔

سفید اداں بائی نے تھوڑی دیر بعد ”پھر“ کے دست پناہ سے پھر راکھ کے ڈھیر سے دہلی پننگاری نکالنے کی جستجو کی۔

”پھر ایک دن میرا باپ بیٹھا بیٹھا بیٹھے کی وبا میں لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد میری ماں بھی چل بسی۔ اس طرح ایک طوائف کی وجہ سے ہمارا ہنستا بستا گھر انا تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔ پھر میرے من میں ایسی گر جیجی بڑ گئیں کہ میری ماں نے ان کو لایا۔ وہ بوجھ بھاری رہ گئی تھی۔ انسانیت شرافت پرانی ہے پھر ایک سب سے غریب ہوئی۔ اپنے شوہر کے لئے سچا دل سے اس کا سبب سب سے فی مینا ہو گیا۔ آوارہ گردی شروع کر دی۔ موسیقی سے قدرے سکون لے لیتا تھا۔ چھپیلے دنوں میں کاروباری سلیس میں کچھ عزیزوں سے ملاقات کی غرض سے جھولی پہنچا۔ اگلے روز سیا کھوٹ رہا ہوا تھا۔ وقت گزاری کے لئے ایک باغ میں بیٹھا تھا کہ میرے قریب ہی کچھ جانوروں کے قتل کیے اپنے ساروں کو ستر کر رہے تھے۔ یونہی باتوں باتوں میں انہوں نے تمہاری گائیکی کی کچھ ایسی تعریف بانہی کہتیں ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ پھر جامن کا بچہ۔ ہسپتال اور اب یہ لا حاصل ہی بیکار باتیں۔“

سفید اداں بائی نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”یہ باتیں بیکار نہیں۔ بڑی کارآمد ہوں گی۔ اب صرف ایک اور بات بتاؤ۔ وہ طوائف جس کو آپ کے ابا سے تعلق خاص رہا تھا۔ کیا تم نے اسے دیکھا یا کچھ جانتے ہو گے کہ وہ کون تھی۔ کیاں تھی۔ کچھ نام وغیرہ؟“

”نہیں۔ ہمارے ابا نے اس کے بارے میں کبھی بھی کوئی بات نہ کہی تھی اور نہ ہی ہم نے کبھی جاننے کی کوشش کی۔ نا آسودہ غرو میوں کے ڈھیر کو کریدنے سے دکھ کے علاوہ اور تو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“

سفید ادا ہائی تو جیسے پاتال میں اتر گئی ہو۔ اس کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ بے وحشیانی میں اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔

”تم نے سچ کہا۔۔۔ علوانف اور گندگی کے ڈھیر سے سوائے بدبو کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“

پانچ سو ساڑھے دو ماہ تک سفید ادا ہائی ہسپتال میں اس کی چار پائی کی پٹی بنی رہی۔ اس دوران میں مسلسل بہت بڑا زہرہ لپٹے لپٹے ہی ہاتھ پاؤں انگلیوں کی ہلکی سی ورزش کرائی جاتی۔ یہ خود اپنے نازک نازک ہاتھوں سے اسے ذہنی تلاش کرتی سر سہلاتی۔ ٹھیک غذا تو سرے سے ہی بند تھی۔ سوپ نجس چائے یا پھر تھوڑے تھوڑے مٹھا بھل۔ یہ کھانا پلانا بھی سفید ادا ہائی کرتی تھی۔ بول بڑا بھی الگ اک بیج خامسک تھا۔ صبح کے لئے چار پائی کے نیچے انتظام تھا۔ پانچ گھنٹے کے بعد دوبارہ۔ ہر دوسرے روز انہما کر دیا جاتا۔ یہ اس بھی سفید ادا ہائی نرس کا ہاتھ بناتی۔۔۔ انکسے سے بچا سی فیصد درستی تھی۔ پلاسٹر کا نا تو جسم پر لگا ہوا تھا جیسے ابھی ابھی اس کا جنم ہوا ہو۔ اٹھنا بیٹھنا یا کھڑا ہونا اور چلنا تو جیسے بھول ہی گیا تھا۔ اب اسے چند منٹ بیٹھنے کچھ قدم چلنے اور ہلکی ورزش کی اجازت ملتی تھی۔ ہسپتال میں یہ چند روز گزارنے کے بعد سفید ادا ہائی اپنے گھر پہنچ گئی۔

اب تک تین ماہ تک سفید ادا ہائی اپنے کوم و خندے سے فارغ اور کالے خان کی نگار داری میں بیٹھ کر رہی تھی۔ اب نہ وہ خان سے پہلے والا کالے خان اور نہ وہ پہلے والی سفید ادا ہائی تھی۔

کالے خان کا یہ عالم کہ بیماری اور پیرا رسی سے چھڑوں کر کا زہا بن سا نکلی آیا تھا۔ رنگ پہلے ہی سڑا ہوا تھا۔ طبیعت مزاج کا بھی سڑیل ہو گیا۔ گردن قدرے آگے کو جھک کر رہ گئی جو دائیں بائیں حرکت پہ نہایت مشکل ہوتی تھی اور قدرے جیسے اونچے اونچے گھبراہٹ کم پڑ گیا ہو۔ کمر جولا جھک ی گئی تھی اب چلتے سے کھڑے سے نہ ہوتی۔ چال میں ہکا سالک۔ ذہن و ماغ پہ بھی شاید کچھ اثر نہ کیا تھا کہ وہ ایسا ماضی جھون بارہا دیکھ کر بے بسی سے غصہ سے آواز دے دیتا کہ کسی معمولی چیز کی طرح کہیں دکھ کر بھول چکا ہو۔ کچھ کھونٹے کا کھنڈہ یا دیوار پر لٹکے ہوئے کا نم لٹی ہے گھر بار کا ہارا حساب۔ جیسے ان کا کبھی وجود ہی نہ رہا تھا۔ وقت کا گزرنے سے دھیرے دھیرے آگے سرک رہا تھا اس سفر میں اس نے خود کو بے دست و پا پا کر خود کو دھارے کے کنارے لٹا دیا۔

گھٹری کے بارے میں سفید ادا ہائی کے اندیشے ایک ذمہ حقیقت کا روپ اختیار کر چکے تھے۔ اس

نے کمال ضبط و تحمل سے اس کڑوی حقیقت کو قبول کر لیا تھا کہ کالے خان سے اس کا خون کا رشتہ ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کی ماں بزاوری کی بیواہ تھی جبکہ اس کی ماں خاندانی طوائف تھی۔ کھانے طعام کی فوقیت اپنی جگہ۔ لیکن جس برتن میں کھانا پروسا جاتا ہے اس کی پاکی پلیدی کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ وہ اس حلقہ حقیقت اور خون کے اس تعلق کو اپنے سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں دفن کر دینا چاہتی تھی جبکہ یہ امر بھی اس کے لئے باعث اتقویت تھا کہ کالے خان کی اس سے عقیدت کسی غرض یا نفسانی خواہش کی مرادوار نہیں اور نہ وہ کئی کئی منزلہ لانے والا کوئی بھونرا عفت ہے۔ وہ تو اس کے فن و ہنر کا قدردان ہے۔ سوچتے سوچتے وہ بالآخر ایک حتمی فیصلے پہ پہنچ ہی گئی تھی۔

کالے خان کے غسل صحت کے بعد جب سفیدال ہائی نے ہاتھ دھو کر غسل سجا کر گانا بجانا شروع کرنا چاہا تو یہ عجیب سی شکل بنائے ہاتھ جوڑے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”خیر کی سرکار!۔۔۔۔۔ میں نے اپنا سب کچھ تیار کر دیا ہے۔ جس کا مجھے رتی بھر افسوس یا ملال نہیں۔۔۔۔۔ مجھے ساری باتوں کا علم ہے۔ یہی میرا سب سے بڑا نقص ہے۔ اب میری گزارش ہے کہ مجھ سے کبھی میرے باپ کے متعلق کوئی سوال نہ کرنا۔ اس کی جان کہ میں میری خیر چاہے والا ہوں۔ اپنے ہاں تھوڑی سی جگہ جہاں میں پڑا ہوں اور اپنی مشکل نفس میں ایک کونہ جہاں سے میں تیری مدد کر آؤں تو سن سکوں۔ میری روزی روٹی کی پختا نہ کرنا میں چاہا ہوں۔ اس کے بچے کوئی ٹھیکہ یا دھرم کر لوں گا۔“

دن بھر وہ ”بھونرا گالے“ کے آواز سے لگتا رہتا۔ شاید یہ اس کا کلیہ کلام بن چکا تھا۔ موٹی پھنس ٹھیلے پہ سہائے وہ سفیدال ہائی کے چہ پارے کے نیچے کچی کی ٹکڑی پہ کھڑا سچ سے شام کو جاتا۔ مستقل آنے جانے والوں دوکانداروں، بھڑواؤں اور قاضیوں سے اس کی وابستگی عجیب سیک بھی شروع ہو چکی تھی۔ خیر خیر بڑے اور سلام دے کر طہر پہ وہ ”یا علی“ تیرے چاہنے والوں کی خیر ”کالہ نہ خافوا“ استعمال کرتا تھا۔ بھونروں سے اس کی بے پناہ دلچسپی کی اسلی وجہ تو معلوم نہیں تھی۔ ہاں جو بھونرا جو بھونرا آتی تھی وہ یہ کہ رات اپنا روزی ٹھیکہ بڑھا کر جب وہ چہ پارے کی سیر حیاں چڑھتا تو اس کے ہاتھ میں ایک وزنی پوٹا آن چنیدہ پھلوں کا ہوتا جنہیں وہ اپنے پھلوں سے خوب چھانٹ چھانٹ کر اپنی نمرہں والی سرکار کے لئے بطور خاص علیحدہ کرتا۔ پھلوں میں آتے صرف جموں کے خوب موٹے موٹے رسیلے بیٹھے مگر ہلکے کیسلے جاسن بہت پسند تھے جاسنوں کے موسم میں جیسے جوان ہو جاتا۔ ٹھیلے پہ جاسنوں کا ٹیلہ بٹانے اوپر پھول سجائے وہ سارا دن

کالے خان کا پھلوں والا ٹھیلہ زمین پر صیوں کے نیچے تھا۔ ہر چڑھنے اترنے والے پاس کی نظر ہوتی۔ اب تو وہ وہاں کھڑے رہ کر ہر ایک کی کھڑی چڑھی اتری نظر بھی پیچھے لگا تھا۔ رات کا پہلا پیر ختم ہوتے ہی اچھل نکلیں نہ بکس وہ ٹھیلہ بڑھا کر اوپر چلا جاتا۔ سفید اس بانی کے لئے پھلوں کا ٹھیلہ اندر اس کی خواب گاہ میں پہنچا کر غسل خانے میں تھس جاتا۔ لہا لہو کر لباس تبدیل کرتا بالوں میں تیل لپیچتا۔ عطر پھیلانے سے وہ مال مٹھ کر پھر خاموشی سے بیٹھک میں داخل ہو کر اندرونی دروازے کی آؤٹ میں اپنی مخصوص جگہ پہ بیٹھ جاتا۔ اگلے لمحے وہ انگشتری والے ہاتھ اور سر کی ہلکی سی جنبش سے سلام کرنا نہ جھوٹا۔ سفید اس بانی ہلکی سی مسکان سے سلام کا جواب دیتی۔ دورانِ محفل وہ ہر تک نہ اٹھاتا۔ ایسے گہرے مراقبے میں آتر جاتا کہ اس کے گزر لینے کا شک نہ جاتا۔ شراب تو وہ چھوٹا تک نہ تھا اور نہ یہاں نشست میں سگریٹ پانی تک کو ہاتھ لگاتا۔ رات کے کسی پیر جب محفل پر خاموشی ہوتی ہو تو انہی غریبوں کی بوجھ سے صیوں سے اتر جاتا تو سازندوں اور خانہ زادوں میں فرشی جانے لگتی ہے پھر پڑے پڑے کرنسی کے نوٹ سمیٹنے کے لئے ایک ہڑ بونگ سی جگ جاتی۔ کالے خان اس کے خاموشی سے اٹھ کر نیچے محفل میں غنڈی کھولی کے ساتھ اپنی کونجی میں بیٹھ جاتا۔

کونجی کے ساتھ دروازے میں باہر کی جانب دروازے کے اگر دو کھڑا ہوتا تو زمین اس کے ہاتھ کے سامنے نوپر ہوتی۔ یہاں پہلے سے ایک بانی کی کونجی کی جانب کھتا تھا۔ جب تک اس کی درشن بھروسے کے اسے سفید اس بانی کے روشن نہ ہوتے اور وہ اسے ہاتھ کے اشارے سے آرام کرنے کا اذن دیتی ہو کہ کونجی کے باہر چھ کھٹ پہنچے اور وہ ایسے رہتا۔

● لیلیا کے مجاز.....!

ظوائف طوائف سے بہت پہلے ایک انسان بھی تو ہوتی ہے۔ انسان ہونا ایک بڑا شرف ہے اور یہ شرف انسان کی سوچی 'فعل' ذاتی استعداد اور علم و عقل سے تعبیر ہے۔ آگے خوش بختی سے اگر اسے عشق کی جاگ لاک لگ جائے تو یہ انسانیت کی اکہبہ کی جانب مائل ہو جاتا ہے جبکہ عشق پہلے لیا اسے مجاز کے عمل کی اتمام فہمیت کرتا ہے۔ بہت بعد پھر کہیں علاج کے کاب میں سرور و قلیل شوق ہو کر جہت قاصع کی فہر آخریں جہت کرتا ہے۔ عشق تا ریٹ و تدکیر کے تناسب و تقارن سے تائید رکھتا ہے۔ مادی اور نفسانی خواہشات کو دبا کر رہتا نہیں گردانتا۔ یہ مسلک و مذہب رسوم و روایات کی فرسودگیوں اور رنگ و نسل سن و سیرت کے طول و عرض کی بیہودگیوں سے گریزاں ہوتا ہے۔ یہ رشتوں ناقوس سے تو پہلے ہی رستگاری حاصل کر چکا ہوتا

ہے۔ اندر چلے سو وہ دریاں سے کہیں دور مغرب چاں کو لئے کسی کے حرم نامہ میں پڑا رہتا ہے۔

سفید اداں بائی خوب جان بچی تھی کہ کالے خان سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ لیکن وہ کسی طور بھی یہ حق حقیقت اس پہ آشکار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایسے معصوم اور شگفتہ خاطر انسان کو کسی اذیت سے دو چار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کالے خان تو اس کے ہاتھ کا پانی بھی نہیں پیتا تھا۔ سارا دن گلا چھڑا چھڑا "بھوں برا کالے" کے آواز سے گھبراتا۔ چاہے اس کے گھیسے پہ آؤ اور آم ہی پڑے ہوتے۔ کہتے تھاجوں کے جاموں لے ہی تو میرے من کو چکا گیا ہے۔ میرا من مومن ملایا ہے۔ مجھے کام و خدمت سے پہلے لگا یا ہے۔ بازار کو گھوٹوں گھوٹوں تھڑوں والے سب جانتے تھے کہ اس کی سفید اداں بائی سے جڑت بھوک جاں نہیں۔ سڑکی سڑاؤ میں ہے۔ وہ کسی بازار میں کا تماشین نہیں، وہ تو غلوں و سرف کے بازار میں کا تماشین ہے۔ موسم کی رعایت کے تحت نماز سے فارغ ہو کر اپنی کھٹیا کو سڑی کے باہر ہی درپے کے لٹا پہ ڈال بیٹھتا۔ پھر جب تک فینہ نہ چھپتی تھی کہ وہ سڑے پھر سڑے حرم نامہ میں لٹکتا رہتا۔ کھڑا ایسی ہی ہوتا کہ سفید اداں بائی جب بھی کسی وجہ سے درپے کو مل کر آکر کھیتی چلی۔ اسے بہت چلوے کی مانند کھسکیاں مارتا۔ اس کا کھانی دیتا ہے۔ ہاتھ لگا کر سڑاؤ کرتا اور دوسرے کی خبر پوچھتا۔

UrduPhoto.com

لکھے داں کی ایک سہانی سی شام تھی۔ ایک جگہ نہیں پتہ پڑا کہ وہ کیا جگہ کے آگے ایک ہاتھ مارا جی کھڑا ہوا تھا۔ بڑے غمراہی سے وہ بارے کے حرم نامے میں کھینچ کر لے گیا۔ ایسے ہی جیسے کوئی تھکا ہوا سہارا تھی وہ پیر میں کسی درخت کے دم درست کونے کی غرض سے ٹھہر جاتا۔ سڑاؤ ہاتھ کا اٹھ کھڑا ہوتا۔ فی الحال جیانی تھری پا کا ہاتھ ہے کہ پھر سوچوں والا کہ وہ نہ ہی چھڑتی سے لیے کھڑا اور بڑے سب و احترام سے پانچواں کھولی کر سر جو کا کے ہاتھ ہاتھ ہے کھڑا ہو گیا۔ جگہ سے اترنے والا بھی وہاں کہ جیسے وہ وہاں سے آیا ہو اور وہیں سے نہیں گئی جیانی اداں کھلوے سے اتر رہا ہو۔ اس پاس والے وہ کاندھڑا دار کے ایک پیر باروں کے درجوں اور پانچویں سے تھمکتی گاڑی ریلوایاں نوچیاں اس کو دروئی پھل علی درجہ سے وحشت کے متعلق اپنی اپنی دانش میں اندازے قائم کرتی ہیں۔ ارباب لکھا کے کلی کو پھونکا کر اس لکھا کوں پہ ہر شیشیت کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ یہاں کوئی کسی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا۔ کسی کی کچی دگر پردوں میں کہیں کوئی سڑاؤ نہیں دیکھائی دے جاتے تو بے طاقت لکھا کوں کا دھڑلے جانا ایک ٹھنڈی امر ہے۔ اس وقت یہاں بھی کچھ فوجی صورت حال تھی۔

اس وقت سفید اس ہائی کے کوچھے تلے اترنے والا بھی لاکھوں میں ایک ہی تھا۔ سرخ بانات کے انگرکھے کے نیچے چست پاجامہ پاؤں میں تھنڈی کی مطلقا سبک سلیم شاہی راج فیس سے گلے میں کھرے موتیوں کی مالا، خچرچی ہوئی علافی آنکھوں میں بلا کی حیرتی و حتمکت۔ نشتواں ناک کے نیچے موٹے موٹے سرخ ہونٹوں پہ بچھو کے فیض سی قلابے دار موٹھیں اور چہرے مہرے پہ اقبالی مندی کی کھلی ہوئی چاندنی ڈو بندہ تھا یا کوئی راوی بھولا ہوا کوہ قاف کا شہزادہ!

پورے پانچ قدم پہ کھرا کالے خان آنکھیں منہ خربوزے کے گھاؤ کی مانند کھولے آستے دیکھتا ہی رہ گیا۔ جس طرح گلے میں ریشہ گرنے سے کھر کھری سی لگ جاتی ہے بعینہ اس طرح اس کے دل کے اندر معلوم سے خدشات ریشے کی مانند گرنے لگے تھے اور اک عجیب سی بے کفی بے چینی درآتی تھی۔

یہ تو بازو خشن تھا۔ جدھر رزیلوں شریفوں کا آنا جانا لگا بندھا رہتا ہے۔ جبکہ سفید اس ہائی بھی کسی مسجد کے حجرے میں قفل راسخ تھی۔ نکلے کھیت دھڑالے سے اپنے چہرے میں گائے بھالے کا بھندا کرتی تھی یہ اس کا قماش تھا۔ آنے والا کوئی بھی ہوا سے چشم ماروٹن نہ لے سکتا تھا پانی نہ پاتا ہے۔ منہ سے بھی روٹش اور ہوا تک کے پانی اور لہو۔ پورے چاروں طرف ان کی منہ سے پانی کی آواز آتی ہے کہ کسے کھلے رہتے ہیں کبھی کبھی نہیں داتے۔

ڈرویش و کھانک کے کوائف میں چنداں تھاوت اور وہ دو دم کا بھی ہے۔ کوائف اپنے ہاں اترنے والوں کی جیب میں دام و درہم کی کھنک کا لٹا لٹا ہوا ہوتا ہے۔ جبکہ کھانک حاضری دینے والوں کے سینوں میں دو دم کی دھانس پہ ناک لگاتے ہوتا ہے۔ کوائف کے کوچھے اور ڈرویش کی کوٹھڑی کے مابین ایک تھاو چھتتی اترتی ہے جیوں اور سادہ جیتے ہوئے قدموں کا بھی ہوتا ہے۔

کوائف کے کوچھے کی سیدھیاں باہر سے نو پر تھار کی جانب چھتتی ہیں جبکہ ڈرویش کی کوٹھڑی کی طرف بڑھنے والے قدم اندر سے نیچے دروں خانے کی طرف جاتے ہیں۔

سو ڈرویش اور کوائف کے مابین یہی باہر اندر۔ نیچے اوپر اور درہم دام۔ دو دم کا فرق ہوتا ہے۔

وہ نو اور دو نہیں زادہ ہے۔ ٹکے قدموں سے کالے خان کے قریب آیا چہرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

”سفید اس ہائی کا بالا خانہ یہی ہے۔“

کالے خان ہونٹوں کی طرح بھانڈا لڑکھوٹے آنکھیں پھارنے کھڑا تھا لطف سے تو کچھ نہ چھوٹا اشیات
تسکین کھوٹا سر جلا کر رہ گیا۔۔۔ رئیس زادے نے چاندی کا ٹکٹا ہوا روپے کا سکہ اس کے ٹھیلے پر دھرا اور
پیسوں کی جانب بڑھ گیا۔ جدھر طوائف کے روپ میں سفید اداں ہوتی تھیں یا پھر سفید اداں بیگم کے روپ میں ہوتی
تھیں۔ وہ انہیں شکر اگر جانتا ہوتا تو اصلی سفید اداں اسے نیچے ہی کالے خان کے دروں خانے میں بیٹھی مل
جاتی۔ یہاں خانے میں تو صرف نقلی طوائف تھیں۔

نیچے بازار کی روٹھیں ابھی اپنے شباب پر نہیں پہنچی تھیں۔ ابھی تو چلمنوں کی اوٹ روٹ مسوی چہروں
کی غلطی تھی۔ ابھی پوری طرح روشن نہیں ہوئی تھیں۔ بانیاں اور فوجیاں ابھی ناز و آواز سنگھار اور
تکبر میں مصروف تھیں۔ خانہ زاد ملازم پیشوا ابھی پیچھا توں کے نیچے کھڑے چلمنوں کو تازہ کرنے کی چاریاں
تسکین تھے۔ بانیاں دھانیاں مل شکاری میں مٹن تھیں۔ دیر و در نیوں مانگیوں کی راکھ میں اور سرو تے ایک
دھڑلے سے تھے۔ ابھی تو چاندی کی پشتروں میں نقری درتوں میں لپٹی ہوئی گھوڑیوں کی شکل شبنم کی
جیسے غلطی تھی۔ شاہی تو ام اور گھوڑے کے زور سے لے کر شاہی ان کو منظر و شادان کر کے دالے خیر سے

UrduPhoto.com

اسباب کشا کے ہاں کا مارا کار و بار ہی سے اور نہ شکیست کے سم دم پر موقوف اور چلت چاہت پھرتا
تھا۔ کھاتے کھاتے کھاتے کھاتے کی اونچ نیچ اور پھینچ لپٹا کا ہوتا تھا۔ ان کے اگلے ان کے سے
کھانے کے جوتوں کا جنگل ہوتے ہیں بدتر یہ کھوت و کھوت کے اور بے صحت پینے لم ضم پڑے رہتے ہیں۔
کھانے کے شربت کے شربت کا کھانے ان کی چست چاہا میں چکا چوندی ٹھکان شروع ہو جاتی ہے۔ خون آشام
کھانے کی طرح یہ دانت گوشتے شروع کر دیتے ہیں۔

تسکین ہیں کہ طوائف کے بالا خانے پہ چڑھنے والا چڑھتا تو اپنے ہی پاؤں سے ہے۔ گھر و دھڑا
تسکین وہاں پہ نہیں آسے اوپر والے اٹھا کر نیچے پھینک دیتے ہیں۔

کالے خان بھیدی بھیدی آنکھوں سے دیکھ کر زور سے کپکپا کر چڑھتے دیکھ رہا تھا اور اور
تسکین سے سولے غلطی پی آم اپنی پھیلتی سڑتی آنکھوں سے کالے خان کو دیکھ رہے تھے۔ جنہیں وہ کالے
تسکین کے آواز سے لگا لگا کر فروخت کر رہا تھا۔ دیکھیں تو بھلا بھول کے جامنوں اور اودھم پور کے طوطا پی

”بھیا! کیا تکلیف ہے منہ سے تو کچھ بھولو؟“

اس کی دوبارہ ٹول خاں اور چہرے کے کرب سے یہ سمجھ گیا کہ یہ صرف دماغ کا ہی کھسکا ہوا نہیں۔
 صدمہ میں زبان سے بھی نکلا ہوا ہے۔ اس سے مایوس ہو کر وہ پھر اپنے پیچھوالے تخت کی جانب بڑھا یا سوچا کہ چلو
 اوپر جا کے جھانک لیتے ہیں۔ وہ وہے پاؤں اوپر چلا آیا۔ ہلکا سا پردہ کھسکا کر بیٹھک میں جھانکا تو وہ
 نوب زادہ مسند پر بیٹھا ریشمی تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھواں سے شغل کر رہا تھا۔ سامنے آنسوئی فرشی تپائی پہ
 شرب کی دو بوتلیں گلاس اور کچھ کھانے کو لٹکنے کا سامان دھرا پڑا تھا۔ سازندے سارے سرگرد رہے
 تھے۔ اور سر کی سرکار سفید اداں بائی بڑی لگاؤ سے اور چارہ سے اس کے سامنے میٹھی میٹھی ٹھنڈی سے اسے
 تک رہی تھی۔ کالے خاں کے تن بدن میں شعلے سے بھڑک اٹھے۔ اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ اک لڑوہ سا
 اس کے وجود پہ طاری ہو گیا۔ جسم کڑا پھر جو بھٹکا کھایا تو کمر کا تار ڈھانچا ہوا فیرہ پھر نہیں ادھر ادھر ہو
 گیا۔ یہ ریت کی دیوار کی طرح طرح دے کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ منہ سے لٹکی ہوئی ہلکی کر او بیٹھک میں
 پھٹے ہوئے لوگوں نے بھی سن لی تھی۔ سفید اداں بائی بھی سازندوں کے ساتھ ہنسی آئی۔ ڈانڈا لپٹی کر کے پیچھے
 اس کی کوٹھری چٹک پڑ گیا۔ ڈانڈا لپٹی کر اس نے سرسری جواب کے بعد پھر اسی ہیٹھالی میں ہی کمرے میں
 بیٹھ گیا۔ سازندے اس کے پیچھے سے نکلتے ہوئے اس کے سامنے سے گزرے۔ سازندے نے اس کی طرف سے اس کا
 سفید اداں بائی کوٹھری کا کہ سب کچھ یاد کر لیا۔ سفید اداں بائی نے اس سے صرف ایک سوال کیا کہ یہاں پر وہ
 کے جیسے کیوں کمرے تھے اور اپنا ٹھکانا سرشیم ہی کیوں بنوا دیا؟ وہ آئیں بائیں بھاگتے گئے لگا۔ کوئی
 نظر خواہ جواب نہ پا کر سفید اداں بائی سے ہیٹھالی چھوڑ کر وہیں لوٹ آئی۔ ایک کرہ تھی جو دونوں کے دلوں
 میں بگڑ گئی تھی۔

یہ تخمیرے سنگھ تھا۔ شہری مگر کے اصل پیر، خاندان کا چشمہ، بچہ راج۔ تراپورٹ کا جدی ورثہ
 ہوا تھا جبکہ ذلی کے گھر سے پانچویں پہ گولڈن راج جس نام کا ایک تین ستاروں والا ہوٹل اور اس کے علاوہ
 کئی مراک۔ ہر فعل کارڈوں میں کچھ لکڑی بستے بھی تھے۔ جو دراصل اس کی بچی پر تھی سنگھ کو بچ میں ملے تھے۔
 بچی صرف قانونی کاغذوں میں اس کی بیوی تھی۔ شادی کے بعد یہ لوگ نئی مومن منائے انگلی بند چلے گئے۔
 اس پر گمراہ جانے کس بات پہ کوئی کھتہ پتہ ہوئی کہ وہاں بغیر کوئی تسبیح کھڑا کئے بیٹھے مانسوں کی طرح ٹیبلہ
 کئے۔ ان کے مابین زبانی کھائی ایک معاہدہ ملے پایا۔ طلاق نہیں ہوگی۔ دونوں کو اپنی سن مرضی کا جیون
 گزارنے کا پورا پورا ادھیکار ہوگا۔ بچی نے دینچ میں ملنے والی تمام منقولہ غیر منقولہ جائیداد تخمیرے کے نام

کر دی اور صرف یہ شرط رکھی کہ وہ آپس کی منہ دہی کو کبھی کسی پہ ظاہر نہیں کرے گا۔ پریتی انگلیںڈ جا کر پھر واپس نہ آئی۔ جبکہ کشمیر سے واپس کشمیر آ گیا۔ پریتی نے وہاں اپنی پسند کا طرز حیات اختیار کر لیا تھا۔ ماڈلنگ کا شوق تو تھا ہی مزید تربیت اور تعلیم حاصل کر کے یہی پروفیشن اختیار کرنا اس کا ایک خواب تھا۔ پریتی سے عملی منہ دہی کے بعد کشمیر سے تو جیسے بچہ کر رہ گیا۔ عورت ذات سے اس کا اعتماد اُنھ چکا تھا۔ اس کے دن رات اب ناؤ نوش میں گزارنے لگے۔ بے تحاشا شراب نوشی نے اس کی صحت پر بادِ گر کے رکھ دی تھی۔ اب وہ اس حد تک آگے بڑھ چکا تھا کہ اپنی کشتی میں شراب کی بوتلیں بھر لیا کرتا ساتھ کسی سرخوئی سی منہ دہی کو بٹھا کر ساری ساری رات ڈلی کی دسمتوں اور گبرائیوں میں اپنے درد کا مداوا تلاش کرتا رہتا۔ اگلی صبح سویرے سویرے چھوٹی چھوٹی کشتیوں اور چھوٹے پہ سواری بچے بوڑھے شراب کی قیمتی خالی بوتلیں تلاش کرتے پھرتے جنہیں کشمیر سے خالی کرنے کے بعد وہ چار روپوں کے نوٹ اندر داخل کر دیتا تھا۔ پانیوں میں داخل کر دیتا۔ اس عیب سے شغل کے بعد صبح سے پہلے واپسی پہ حضرت ملی گئی درگاہ پہ سلام کرنا بھی نہ بھولتا۔ اچھی شراب کھنچی آواز اور اچھا کلام اس کی کمزوری بن چکا تھے۔ گوجری اور کشمیری بچے بول سرن اور پہاڑی انگ راگ پہ وہ بھوکہ خوب خراب کرتا رہتا تھا۔ وہ اسی دوران وہ تین بار انگلیںڈ بھی گیا۔ پریتی سے بھی ملاقات ہوئی مگر وہ اب شاید بہت ہی دور نکل چکی تھی۔ شہر آباد میں اس کا بھائی رہتا تھا۔ وہاں پریتی نے اپنی زندگی کی سبھل گئی کہ اس کا بھائی کشمیر میں ہوا تھا۔ وہ سبھل چلتی ہے قدیم قدروں کا دلہ ادھ کوئی پرچار ہے اور اچھرم ترسم سب کچھ فراموش کر کے ایک پتھر سا بن گئی تھی۔ ایسا پتھر جس کا کچھ وزن تو ہوتا ہے لیکن اس کے پاس کوئی حس نہیں ہوتی جذبات نہیں ہوتے۔ شاید یہ پریتی کا انداز رہا تھا۔

ایک روز بیٹھے بیٹھے نہ جانے ملی میں کیا آئی کشمیر سے لے شری نگر چھوڑ دیا۔ کاروبار اپنے کارندوں کے سپرد کر کے حیدر آباد چلا آیا۔ یہاں کا پُر لطافت ماحول ادب آداب۔ خاصیت و شرافت تکلف سے شہر ادب مہربانی میں رہتی ہی تھا۔ صاف ستھرے نعلینے ہوئے لوگ اسے اچھے لگے تھے۔ یہاں کے بالاجانوں میں بھی ایک سے ایک لگنے لگنے والی اس کے دل پہلا دے کے لئے موجود تھی۔ دن بد ہوش رہنے اور راتیں پینے پانے اور نینٹے نینٹے میں بسر ہونے لگیں۔ اب وہ آہستہ آہستہ یہاں کے انڈ رنگ میں رنگا جانے لگا۔ اس کی نشست و برخاست مختلف ادب آداب وضع قطع لباس رکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ مہاشے کوئی کشمیری بسکتھ ہیں۔

یہیں کہیں ایک نایاب سازندہ نے اسے نوہ دی کہ آندھرا پرورش کے بڑا پارتھی جنگل میں ایک ساتیں بابا جن کی عمر کوئی دوسو برس سے بھی زیادہ ہوگی۔ جنم جنم سے برگد کے ایک درخت پہ نکلے ہوئے ہیں۔

ان کا جسم اعضاء بھی درخت کا حصہ بن چکے ہیں۔ جسے آپ لٹھی سمجھ رہے ہوں گے وہ ان کی ٹانگ یا بازو
 بن چکا ہے، گھونگیں، کوٹلیں، ان کی پٹھے، کمر، گردن پہ بھی آگتے ہیں۔ ان کی داڑھی اور سر کی ہڈیوں میں
 ہڈیوں نے گھونسلے بنائے ہوئے ہیں اور یہ کہ وہ سائیں بابا وقت ماضی کے سب سے بڑے گروناٹیک ہیں۔
 رات بڑھیا کا قتل ہندھنا ان کے چہروں میں ہے۔ وہ جسے بھی اپنے جسم پہ آگے ہوئے گولہ کھلا دیتے ہیں۔
 سرسوتی دیتی اس کے گلے میں اپنا استخوان ڈال دیتی ہے۔ تیرے من کی چٹا اور اندر کی ڈکھن کا آپاے اسی
 جہان بابا کے درشن اور ان کے سر پر کی کوئی کوٹلی گولہ ہے۔ یہ کونھوں، ٹٹھکوں، مجروں میں گانے والیاں۔
 آنکھ جھپکے کی چنگاریاں ہیں، پل دوپل چنگی دنگی اور بچھ گئیں۔ تو وہیں جا اور اپنی چٹا کا آپاے پا۔!

شمیرے کا حیدر آباد میں یہ حق دین تھا۔ دن رات ایک کڑے دو بڑے جتنوں سے ذور دراز کے
 جتن پتر اپار تھی پہنچا رات کا سے تھا تو کونو ایک آشرم میں پڑ گیا۔ دوسرے دن کو بابا کی تلاش میں نکلا۔
 جس سے بھی پوچھا وہ اسے کوئی جواب دینے کی بجائے گھورتا ہوا اپنا رستہ پکڑتا ہے۔ بڑی مشکل سے ایک
 سالہ سے یہ یاد آکر اور بنگلہ میں کوئی پرانا چل سے جھڑکا لے جانے والا ہے جاتی ہیں بابا کا استخوان بھی ہے
 وہاں بھرتوں اور کھانسیوں کا سیرا ہے۔ ان میں کھڑا ایسا انسان اور چار چار ہے۔ یہ بڑا کڑا ہے بابا سے اوپر کھینچی
 جیتے ہیں اسے چکرا کر لے کر آتا لگا دیتے ہیں۔

سادھو کے ہاتھ کچھ پیسے تھماتے ہوئے اس نے راستے کی نو دی۔ اپنا پہلی صیلا تھا، سادھو کی
 رات پہ گھر کرتا ہوا بنگلہ کی جانب تھا۔ رات کے چھ بجے پہنچا۔ رات کی دس بجے کی دھول میں
 اسے سوتے مفلوک الحال لوگ، چہروں پہ حیرانی اور برائی کھنڈی ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے جھڑپوں پہ مشتعل
 تھیں۔ یہاں شاید شہزادوں کے قیدی، بھیل، سیکھاڑے بابا گڑی رہتے تھے۔ حیران نظروں اور ہر من چہروں
 کی کی جھونک، سخت کی جھونک سے ہر قسم کے کٹوں نے اس کا استقبال کیا۔ لگا تھا، عاشر کی ہندوؤں
 شمیر سے بچے گئیوں اور مسوسوں کی تختیوں اور طبقاتی استخوان کی جیہ و دستوں نے ان انسانوں کو غلامیوں
 عرقوں اور رذالتوں کا لھوت بنا دیا ہوا ہے۔ وہ انہی کے بارے میں سوچتا ہوا تھماڑ جھکاڑ سے اٹنے پہنے
 انسانوں چانگے بڑھ رہا تھا۔ ان لھوت نما انسانوں کی چھوٹی چھوٹی، ہتھیاں اور سخت لب بہت پیچھے رہ گئے
 تھے۔ آگے تاجہ نظروں پرانے ہی دیرانے۔ پھر چند راسا بنگلہ اور پھر صمد یوں پرانے کھنڈرات جیسے آگ
 دہرے جس سے ابھر کر سامنے آگئے تھے۔ کھنڈرات بھی جیسے لہے زمانوں میں مندڑ آشرم بھکتوں کے
 دھرم شلے یا یوگیوں کی تپیا کے استخوان رہے ہوں۔ بڑھ مت، جین مت، برہمن مت اور شیو مت میں۔

ساحلوں سے 'سوائی' چپ و دھار یوں 'پونگیوں' رملداتی و شہنوی تربیت و تپتیا کے لئے 'ہستیوں' شہروں سے دُور
جنگلوں 'ٹھپاؤں' ویرانوں اور پہاڑوں گھائیوں میں ایسے ہی دھرم شالے اور آشرم تعمیر کئے جاتے تھے۔ آج بھی
تھرا، ہیر و وارنہ، رس، 'مپیا' پڑیاگ، 'نچن' و 'توگڑی' سرسوتی اور کشمیر میں ایسے آشرم اور دھرم شالے موجود ہیں۔

بند و غلغلا چار مقاصد حیات قرار دیتا ہے۔

ارتھ (معیشت)، کام (بھس)، دھرم (مذہب) اور موکش (نجات) آگے پھر بندوبست کے بڑے
معتبر دھرم پر چاری فلاسفر منو نے بھی حیاتِ انسانی کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ہر ایک کی حدود واضح کر دیں۔

(۱) برہم چرہ آشرم (25 برس تک) (۲) گرہست آشرم (25-50 برس تک)

(۳) بان پرست آشرم (50-75 برس تک) (۴) صنیش آشرم (75 سے 100 برس تک) (۵)

اسی فلاسفی کی تربیت اور تکمیل و ترویج کے لئے یہ آشرم بنائے جاتے تھے۔ بندہ مت نے بھی تپتیا اور
کارکرم پر یہ آشرمیں ضرور بندہ مت سے ہی مستعار لیا۔ آج بھی جہت 'سری' لگا اور دیگر مطالب کی دشوار گزار
ترالوں اور کھنجر گھائیوں میں انہوں انہوں کاموں کے یہ آشرم عماروں گھیاؤں یا سداؤں اور بلوں کی
صورت میں

UrduPhoto.com

یہ جگہ بھی سنا چکی ایسی ہی کوئی ہستی ہی ہو۔ بستیاں سب اڑا جاتی ہیں تو جہتوں کے سیرے
ہی جاتی ہیں۔ وہاں پھر رگہ جہتوں اور باب آتے ہیں۔ بھگتوں کے لاکھل آبرام کرتے ہیں۔ بیل
اور بوم پیدا ہو جاتے ہیں۔ بندہ بننے اپنی دھار پڑی اور ٹوٹنے سے مزید خوف و ہراس کی نصیب
کر لے کے لئے نکلیں سے ٹپک پڑتے ہیں۔

اب وہ ایسی ویران ہی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں شاید ہی کوئی بدوشہ انسان آتا پلندہ کرے اور گرد کے
گھنڈرات اور پرتھوی پرتھ سے پتہ چلتا تھا کہ صدیوں پہلے یہاں کیسی دنیا آباد رہی ہوگی۔ ان کے گیان دھرم
کی کیسی کیسی نیکیاں موجود تھیں۔ گاؤں گاؤں کے ٹوٹے پھوٹے گھسے۔ مصلو ان میں پوکر تھی جب پوری کی (مسی
ہوئی منڈیر مگھت کے چم کے۔ ایک استخوان ہوم کرنے کے لئے دکھائی دیا۔ اثنان کے لئے تالاب بنے
پھولے ترلے ہوئے پھر گھنیں کھیں سگرت میں اشلوک بھی ٹھہرے ہوئے دکائی دیے۔ اب وہ راکھی ذرا
کی دھما دھنے کے کارن ایک گھس پ سے چتر پہ بیٹھ گیا۔ پاس ہی چھپے اپنا کپڑوں کتابوں کا تھیرا بھی رکھ
لیا۔ سگریٹ سٹکا کر دو چار کش ہی لینے تھے کہ چھپے بندوں کے ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ پلٹ دیکھا

اپنے عروج اور جسم فروشی اپنی انتہا پہ ہوتی ہے۔۔۔ ملک بھر کی طوائفیں نویشائیں کنچیاں یہاں دایہ پیش وصول کرتی ہیں۔ خاص طور پہ چکیسوں نویدوں سنیا سیوں کی بڑی چاندی ہوتی ہے۔ جگہ جگہ آپ کو انسانی اکٹھ نظر آئیں گے۔ سٹکڑوں انسان حلقے میں کھڑے ہوتے ہیں اور میان میں ایک جہت دھار یا سنیا سی۔۔۔ بڑے بڑے دیو مالائی کہانیاں قہقہے سنارہا ہوگا۔۔۔ ایسے ایسے دلچسپ اور سنسنی خیز قہقہے سچی جھوٹی کہانیاں اور ایسی خوب لفظی اچے بڑبائی کہ سننے والا لہو دیکھتا رہ جائے۔۔۔ مجمع ہمارا لوگوں کی طبیعت پر چا کرنا حول بنا کر پھر یہ (میری طرح) اپنی گھٹا درمیان میں ہی بند کر دیتے ہیں اور اپنے تریاق کشتے جسم وغیرہ بیچنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ دھوکہ باز اپنے فن میں ایسے طاق کہ آپوں کی راکھ کو سوا لاکھ میں بیچ دیں۔۔۔ کئی چنڈالوں مجموعوں میں آپ کی آنکھوں کے سامنے کشتے جسم اور دیگر دوائیں بھی تیار ہوتی ہیں۔ لوگ آنکھیں چاڑھنے سانس روکے ان سنیا سیوں کے شہرے دیکھتے ہیں۔ ہمیں زندہ کالے ٹانگ کے منہ سے منکا اور پھر اس کے دانتوں سے مہلک زہر منہ سے چوس کر باہر نکالنا جا رہا ہے۔ اسے کچا کچا کچا یا جا رہا ہے۔ حلق میں داخل کر کے ناک یا کان سے باہر نکالنا جا رہا ہے۔ زہر لے سائیں سے زبان پہ لٹوایا جا رہا ہے۔۔۔ شول پینٹ کے آریار ہو رہا ہے۔ آگ کے شعلوں سے اٹھان ہو رہا ہے۔۔۔ گاروں اور ٹوٹیل پٹوں اور ٹوٹیاں لی جا رہی ہیں۔ ایک جگہ دھاروں کے میں دھار یا جا رہا ہے۔ ایک جگہ میں دھار دھار لٹوایا پٹا انڈوں بیٹھا میں کھوٹا بیچوں اور آنت تیز کر رہا ہے۔ کالے ناک الو کالے سرے ہنسی سرے کالے کمرے اور پچھلا گھڑیاں وغیرہ کے قہقہے ہو رہے ہیں۔ ایک جگہ ایک کالی چڑیل سی صورت کو گدی کے پاؤں سے ہاتھ کر ایک درخت سے لٹایا ہوا ہے۔ کہ جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی ہنسی لٹوایا ہوا ہے۔ ایک لڑکی کا سر تا لوموٹھ کمر اور پر ایک جھاری سائز کا الو بٹھایا ہوا ہے۔ کہیں گردن تک ایک جن بھیے منس کوز میں گاڑا ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں کا لوں سے خون دس رہا ہے۔ ایک جگہ ایک مادھو اپنے الف ننگے چنڈے پہ ہزاروں بچھوڑوں کو چمٹا کے پٹا ہوا ہے اور انہی بچھوڑوں کو پکڑ پکڑ کر سے سے کھا رہا ہے۔ ایک دیالے میں خون بھرا پڑا ہے وقفہ وقفہ اس کا منہ بھی لے لیتا ہے۔۔۔ سینکڑوں میں نے سو سو سالہ یوگی جہت دھار سے سنیا سی با بے دیکھے۔ جن کی تختہ لمبی تھی یہ ان کے جسم کو کھڑکھڑا کر رکھتے تھے۔ سر کی جھیں اچاوا کے جنگلوں کی طرح جکڑی جڑی ہوئیں اور حشرات اٹھانٹ سے بھری ہوئیں۔ کئی کئی منٹ بے مینڈھے کے بیٹگوں کی مانند مزے ملے کھائے ہوئے کھر بہہ تاشن چکاڑوں کی طرح اٹھتے ننگے ہوئے سا دھو۔ اور کئی کئی دن جس دم کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیشہ ور شہید و باز۔

ہندو مت کے حوالے سے اعتقاد پڑھیں ہوئے والے اس کثیر المشاغل اور وسیع القاصد میلے میں میری

● بندرا بن کا بندرا برام.....!

اس مہا کبھ کے میلے میں اتفاق سے میری رسائی ایک بندروں والے قلندر (بمعنی مداری) ہو گئی۔ یعنی قلندر اور بندر کے درمیان میں میں ایک چھتھر پھنس گیا۔ نام اس کا بندرا برام تھا۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق اس نے تمام عمر اپنے سرے پھٹے جسم پہ بوسیدہ لنگوٹ کے سوا اور کچھ نہ پہنا تھا۔ اس کا سارا جسم موسموں کی خدمت سے لکھنا اور بندروں کیسے مجھ سے چھوڑے چھوڑے بالوں سے اٹھول اٹا ہوا تھا۔ بندروں میں رہتے ہوئے اس کا چہرہ مہرہ بھی قریب قریب بنو مان سا ہو گیا تھا۔ بس فرق صرف دسم لنگوٹ اور منہ میں زبان کا تھا۔ اور زبان بھی ایسی چربی اور رسی کی سینکڑوں کا مجمع اس نے اپنی ٹوٹری زبان کے ذریعہ سے اپنے گرد اکٹھا کر رکھا تھا۔ میں خود پہیلے میں ہار گوشت اور چربی زبان لچھے دار گفتگو کرنے والے مجمع بازوں، شعیبوں، گروں، خطیبوں، رنگہ بازوں اور کوسو بازوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔ ان کے چیلے گوشت کی بوئی استخ تیلے کی صورت یا مربی افغانی پلاؤ میں چپے کی شکل میں سامنے آتے۔ عیسائیں اورک کی ہوا کیوں کی اوت میں کہیں کہیں بویا حبیب آبادی پہیلی کی ہر پکڑ انوں پہ ہمارے قاب قبضہ میں لگے۔ اس کے سبب میں چپے کی ہار کا دھنک کھانا ہوتی ہے۔ ان مجمع بازوں کی قہر زبانی "اتو اسے یوں سمجھئے کہ اگر چہ بلی بوئی زبان کا چھارہ ہوتی ہے تو ان کی چہرہ زبانی کان کا لٹکارا ہوتی ہے۔ طوطا جی، سکندر، قواقرعین، داستان امیر خور، قصہ ہرچہ اور دہشت ہزار داستان الف لیلی، امیر علی شگ و غیرہ۔ جو بلی زبان والے راہی داستان گوئی کے آیتے ایسے کمال و کھار ہا ہوتا ہے کہ ارد گرد پہروں سے اپنے سروں کی منی پہ سید سکت و حرکت۔ دنیا و مافیہا اور کیسے بیٹے سے بے خبر اس کی چہ بلی گفتگو کے سحر میں جکڑے کھڑے ہوتے ہیں۔

میں بھی ادھر ادھر گئے تھیں "اگر تہا اس بندر والے سے مجمع میں بندر کھی کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس با کمال اور بندر کمال شخص نے مجھ ایسے زانی خند سے کہ چند منٹوں میں پکچن کر دیا۔ ہر چند کہ میں شخص یہ پکھنے کے لئے لگا تو کہ "ادھر کیا ہو رہا ہے؟ جھوک سے نہ اٹھائی تھا۔ چند ہیے تاکہ جھانک کر پھر سید جسے کسی صاحب پہ پیٹ پاج کا ارادہ تھا۔ ہاں اس بندر والے کے خٹے تہب زبانی اور مجمع کے درمیان چند تہب و غریب قسم کے بندر تھا چاروں نے دوسرے لوگوں کی مانند مجھے بھی پاندہ لیا تھا۔ یہ مجمع باز بلی بلی ہندی استروک سنسکرت بھاشا میں کو کلام کسی قدیم ہی دیو مالائی کھا کے لفظ مروٹ پہ تھا۔ جس کے اہم کردار بندر تھے۔ اٹھے ہوئے سر پر ہاروں کی ٹھپیاں بچھنی ہوئی بندروں کی مانند منسی ہوئی چھوٹی چھوٹی

انھیں سے دہشت و خباثت کے شرارے پھوٹ رہے تھے۔ بڑے بڑے کانوں کی ٹنگی ہوئی گونجیں پھرک
 جی تھیں اور موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں پہ پھینے ہوئے معدوم سے ناک سے یوں سیجاں سی ٹکل رہی تھیں جیسے
 کسی رند کی گڑیا کی ناف والی سیٹی اس کی ناک میں پھنسی پڑی ہو۔ اس کے ٹکڑوہ جسم پہ بھورے بالوں کا ایک
 بے شکل تھو جسے خباثت اور غوسٹ کے آتشیں جکڑوں شیطانی شر شرار کے شعلوں نے آگ دکھادی ہو۔ کچھ
 جگہ پر سر پہ کچھ بچ گیا ہو۔ ٹنگوٹے بھی بس یہی کچھ کہ وہ اپنی حد و حد میں محدود تھا۔ کپڑے کی ایک تھک تار نیچے
 سے جاتی ہوئی پیچھے چھینل سے پتھروں کے درمیان کہیں پہنچ کر ٹھہری ہو گئی تھی۔ اس کی فروتنی اور کبرنی کا یہ عالم
 تھا کہ کسی چاہاکہ آگے ہاتھ جوڑ کر کہوں۔ بابا! یہ تکلف بھی اتار دیا پھر ان دیوتہ ضرورت سے زیادہ بالغ
 تھیں۔ کا بھی کوئی انتظام کرو۔ جو سہ عام بیچ کھیت ایسی حرکتیں کر رہے ہیں کہ ان کی حرکتوں کو دیکھتے ہوئے
 بڑے شرم کسی کا نہیں اور جانے کوئی نہیں چاہتا۔ وہ تو آسانی ہوئی کہ اس کی شہد بھندی متکرت بھاشا بھی
 ان کی ان قبیلہ حرکتوں سے ہی پلے پڑ رہی تھی۔ کیونکہ وہ لہجہ جگہ رہو کچھ کہتا ہندو اس کی من من تمسلی اور
 محکمہ چش کر کے لگتے۔ بندروں کا یہ کمال اس سے پہلے بھی دیکھا نہ تھا ان کا کمال اتنی خوشیاں پہ شرم
 سے مگر یہ اس قبیلہ بندوں میں دو بات بھی دیکھ کر ہر بندہ اور بندہ کی گونجیں آواز آئے۔ آپ کی ہندو کو سہ عام کوئی
 شرم نہ آتا۔ اس کی اس بات سے دیکھ کر بندوں کی ہمتیں ٹوٹ گئیں۔ اس کی اس بات سے دیکھ کر بندوں کی ہمتیں ٹوٹ گئیں۔ اس کی اس بات سے دیکھ کر بندوں کی ہمتیں ٹوٹ گئیں۔

اور اصل میں یہاں اس وقت پہنچا تو سب دوسری سادھو اپنی سادگی کی قربانیاں قربان کر رہے تھے۔
 ان کے ہاتھوں کی جنسی طاقت کے سحر و سحر کر رہے تھے۔ اصل مقصد یہی تھا کہ ان کی طاقت سے حاصل کئے گئے فوائد
 کو سب کو دیا جائے۔ اس نے اچانک ایک کراچی کو دلی اٹھالی۔ اس میں سے ایک رہنما نکلا۔ پھر زمین پہ پڑے
 گئے پانی کے ایک ٹکڑ میں ہال کر کہنے لگا۔

”اس خالی دیکھنے کے نظر ہمارے جی نی سر پر کی پٹلی شلتی ہے یہ شلتی ہے پھر گرم حاصل کرنے کے لئے
 کھڑے۔ جو گرم جھیلے پڑتے ہیں۔ اس کے لئے مجھے ایک ایسے ہی ہنر (بندہ) کی کہانی کرنا پڑتی ہے جو اس
 سے تپ و کھور ہے ہیں۔ پھر بتاؤ کچھ میں اس پانی کو جس میں اچھی اچھی پانی کی پراکرم والا دیکھا دلا
 ہے۔ اس ہنر کو پلاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے پانی اسی ٹکڑ میں چلا دیا۔ پانی پینے کی دیر تھی بندہ نے
 سب سے پہلے پانی اور چت لیت گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ خراساے لینے کا جیسے وہ گہری فینڈ میں چلا گیا اور۔ پھر
 پینے سے دیکھتے اس مفار نے ایک بھر پوری انحرولی توڑی۔ پھر پورا ہر اعلیٰوں تک کھول کر کھی کھی کھا کھا
 لے لگا۔ ہر کی پھر تلی آنکھوں میں عجب سی چمک عود آتی تھی۔ اب وہ ڈھ پلنے لگا جیسے اکھاڑے میں

وہ بے فروت شاید میری بات صحیح سے سن نہیں پایا تھا بلکہ۔

”بچہ! میرے پاس کسی کھانج کھڑا ج کا دار نہیں..... سر پر شعلی پڑش بہت کا تریاق ہے۔ کھانسی

کھانج کا لپٹا ہوتا تو پہلے اپنے ہانرے کو رتا ہر کھٹ کھا جتا رہت ہے۔“

”مہاراج! میں نے کھانج کھلی کی بات نہیں کی، کھوج کھٹ کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے بندروں

سے لای دیکھی ہے، بندر تو بہت سے دیکھے۔ مگر ایسا قدر کا کٹھ اور چمچ روا لا بندر میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔“

سارحو نے اسی بندر کے چلیبی والے ڈونے سے چلیبی کا ایک کٹھ اٹھا کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

”لو پہلے بنو مان جی کا پر شاد چکھ لو۔“

میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”مجھے چھما کریں میں مثالی نہیں کھاتا مجھے شوگر ہے۔“ مجھے پتہ نہیں چلا کہ اس ہانر کی چٹا ہارے تائیں۔“

سارحو نے میرے انکار پر وہ چلیبی اپنے منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ کھانج چلیبی کی مثالی تو منٹھ منٹھ اور منٹھ سے جنم لینے والی ڈر گھٹاؤں سے کھانسی کی رکھشا کرتی

وہ چلیبی کا ایک کٹھ لا بندر کے منہ میں ڈالتے ہوئے کہتا ہے۔“

”اگرچہ اس کا نام کھانسی دیا گیا ہے مگر اس کا کھانسی لپٹا ہوا ہے۔“

”نہ کوئی پتہ چلتا ہے؟“

”مہاراج! مجھ کو کچھ کچھ بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر کوئی منٹھ چھپا ہوا ہے اور منٹھ کو کچھ کر

کھانسی سسکتا ہوتا ہے کہ اس کے اندر بھی کھانسی نہ کھنکھائی کوئی چھوٹا سا پتھر یا کچھ اور چھپا ہوا ہے۔“

”اگرچہ اس کا نام کھانسی دیا گیا ہے مگر اس کا کھانسی لپٹا ہوا ہے۔“

”میں اس کا نام کھانسی دیتا ہوں۔“

”اس سے حق منکر کہ وہ کوئی جواب دیتا۔“ اسی بندر نے پیچھے کھڑے ہو کر خود کہتے ہوئے میرے سر

پر ہاتھ رکھ کر شروع کر دی۔ جیسے وہ جو کس تلاش کرنا چاہ رہا ہو۔ سارحو نے ایک بھیا کھ سا قبضہ لگا کر

کہہ دیا۔

”تم نے اوش ٹھیک سمجھا ہے، بندر بچپن کی طرح ہوتا ہے جو کھانسی میں پھنسا ہوتا ہے۔“ اور منٹھ

کھانسی سے کوئی مانند ہوتا ہے جو ہر ہانر کے بھتر موجود ہوتا ہے۔“

میں نے کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے ایک اور سوال پھوڑ دیا۔

”مہاراج! یہ جو بنو مان جی کی پوچھا جاتی ہے۔ ہانروں کو جو عزت احترام دیا جاتا ہے۔“ طرح

طرح کے چھل مٹھائیاں پکوان پیش کئے جاتے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ ایسے ہی ہونا چاہئے؟۔۔۔

وہ درشتگی سے ٹھکرتے ہوئے بولا۔

”ہمارے لئے دیوتا سامان ہیں! یہ ہنومان جی کے کٹم قبیلے سے ہیں۔۔۔ ان کی پوجا اور اجست کرنے ہمارے دھرم کے دھرم ہیں۔۔۔“

آب میں بولا۔ ”لیکن ان کی حرکتیں اور عادات بھی تو دیوتاؤں ہی ہونی چاہئیں۔ یہ تو اپنی حرکتوں سے ناک میں دم اور عاداتوں سے انسان کو شرمندہ کر دیتے ہیں۔ دیوتاؤں کو تو بڑا بھل کول۔ کاج کرم بھی پوک پوٹر ہونے چاہئیں۔“

مجھے حیرانی ہوئی کہ سادھو نے میری باتوں کا ڈراما سننے کی بجائے مجھے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”تم سچ کہتے ہو سچ! اپنی اپنی جگہ ہے جو جڑی بدھ متی میں سما یا دعی تم نے اٹھل دیا

پرتو! یہ بھی جالو کہ دیوتاؤں کے من میں بڑا عجید آدم ہے۔ ایسا ہی عجید آدم ہے جنہاں اور پیش میں ہوتا ہے۔“

وہ عجیب مجھے نالین چارہ بات تھی۔ میں ایک سال بھر پچھتا رہا تھا۔

”ہمارا راج! آپ نے اپنی دوا اس بندہ کو کھلائی اور تمہیں جو کچھ بندہ سے ہر نہ ہوا اور وہ بھی سہ

UrduPhoto.com

کے سامنے۔۔۔ سب جہازیں اٹھتا، کھوڑا، گائے، بھینس، گھوڑا، گدھے اسی طرح بھی کرتے ہیں اور

انہیں سب دیکھتے ہیں، کچھ کم تر ستر میں ہے۔ جو اس میں راج شرم کرتے ہیں وہ بچتے ہیں۔ تم نے اچھا

درا دیا، انی غار میں کھپا گئے، تو وہ بھی ہوں گی نہیں دیکھیں تو غصہ ہو گیا۔ کچھ مورتا کی سکھشا اوش ہے اور پھر

اس معاملے میں مہا گرو ہے۔۔۔“

اچانک وہی پرتو غصہ کر رہا تھا۔ سامنے آ بیٹھا اور اگلی سیڑی سے وہی قبیح حرکت کر کے لگا ہوا کچھ

بندر کرتے رہے ہیں۔۔۔ اور ہمیں آؤ بگاڑا کھٹھ آیا۔

بات بندہ سے بندگی تھی کہ تھیجے۔ کچھ کا سفری تھیلا اندر اچکے کر کے لیا تھا۔ وہ آگے آگے ٹوٹا ہوا

ہوا چھڑائی کھلا نکلا ہوا تھیلا گھسیٹے ہوئے جا رہا تھا اور یہ بدحواسی سا پیچھے پیچھے پکاتا ہوا ہلکا کم بھاگ۔ نور ہاتھ۔ مگر

گہاں ہنومان جی عباد راج اور کہاں صرف ایک کتے کا سکھ۔ دو بھاگتے آگے آگے تک اٹھل آیا تھا۔

آخر ایک کٹی پٹائی سی جگہ پہ وہ ٹوٹے سامنے۔ سامنے چھوڑا جنگ تھا یا درختوں کا ذخیرہ۔ یہ بندہ اور میری کھینچ

غائب ہو گیا تھا۔ تھیلے میں اچھا درسا لے پرتی کے خطوط تصویریں، ضروری کاغذات، نوٹھ پیٹ برش۔ اور

جائے بندر ہی بندر... لمبی لمبی اُموں والے لنگور سفید اور سیاہ چہروں والے ننھے ننھے بندر چھاتیوں کے ساتھ چمٹے ہوئے ٹھیلے چلکپدے سے بچے۔ تھیلہ اُجھول آتے اپنی پزنگی کہ یہ تو اس کے تن کے کپڑے تک اُتار لے جاویں گے۔ یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ وہ اسے پکڑ کر کہیں قید کر دیں یا اس چھتار برگد والے بابے کے پاس لے جا کر اپنے ساتھ بندر بنوا دیں۔ وہ اسی شش و پنج میں پھنسا سوچ رہا تھا کیا کرے کیا نہ کرے کہ ایک موٹا سا گولہ چناک کر کے اس کے سر پر پڑا وہ عین چار پڑے پھر بارش میں اولوں کی طرح یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ جیسے ہونان کی فوج اسے راون سمجھ کر چاند ماری کر رہی ہو۔ سرخ سینہ وری گولہ گرینڈوں کی مانند اس کے سر جسم سے ٹکرا کر پھٹ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ لیسڈار سرخ تپوں کی غلاقت سے متحہ کر رہ گیا۔ جو ہونا تھا ہو چکا کپڑے بُری طرح تھوڑے گئے۔ تاک نہ تھا بے پہچان ہو کر رہ گئے۔ جہاں ناس وہاں ستیا ناس بلکہ سناڑھے ستیا ناس وہ براندیشہ سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر برگد کے تربیت یافتہ جسم کے حصے سے قید نکال کر بیٹھ گیا کہ اب جو ہو سو ہو... چادر اور گرہن کا ذکر تنگ پنڈے یوں پڑ گیا جیسے بندروں کو دعوت دے رہا ہو کہ بھائی کو گولہ خوب اپنے دل کی حسرت نکال کو۔ کو تو پیچھے سے پالہا اب بھی نکال دوں۔ جب ایک آنکھ سے اُٹھ جائے تو دوجی آنکھ میں شرم کا کیا کھلم۔ چاند ماری میں اور شدت آگئی... آہیں نہیں بائیں اُسمان سے بندر ہی بندر تھے۔

ایسا عجیب و غریب عالم تھا کہ یہاں پر بندر ہی بندر تھے۔ ان کے پاس کوئی اور شے نہ تھی۔ اب بھی وہ چیخا کر دوسرے بندروں کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ اس نے ظاہر تھا یہ ان کا سردار بندر ہے۔ جس نے شاید بندروں کا ہر اول دستہ تھا۔ جو ان جو ان ایک سے قتل کا کچھ چناک۔ پو بند اور بار کے تربیت یافتہ تاک تاک کو جس کے پیچھے کے اُجھادوں پر گولہ کی گولیاں برس رہی تھیں۔ کیا محال جو دائیں بائیں شاخوں نیچے پسیلوں یا تال کی تھدی پہ کوئی ضرب و ضرب آئے یا کہ ان چہرے پہ گولہ نکال گئے۔ شہرے ہوا پر پتہ ان کہ جب سے ہڈ و قیے بندر ہیں۔ کچھ دیر یہ تماشا دیکھنے کے بعد پھر جانے ہی میں کیا سالی کہ کھڑے ہو کر آزار نہ دے دیا گیا اور پالہا پیچھے سر کاویا۔ مٹی پھیل جی یوں سے نجات حاصل کرنے کا پراثر چہرہ پر تھا چاہا۔ اب وہ چاروں شانے الٹ لٹا کر برگد کے نیچے کھڑا تھا۔ ٹک ٹک ٹک کے لئے نام نہاد لنگور کا پتہ یا پتھہر کی کھنگلی تک کا تکلف نہ تھا۔

میرا تجربہ بتاتا ہے کہ شراوت، فٹس، لیلیٹ، گندی گالی، بڑے خرامی یا بے حیائی بے غیرتی کو صرف انکی ہی شیرے والی آنکھیں دکھانے کی دیر ہوتی ہے پھر چل سوچل والا سلسلہ چل نکلتا ہے اور آدمی اندر باہر سے ایسا نکلا نکلا ہو جاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

کشمیر سے نکلنے کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ بندروں کی جگہ اگر دس بندے بد معاش بھی ہوتے تو یہ اس سے بہت سکتا تھا۔ مگر کیا کہیے کہ دس بد معاش ایک بندہ سے عاجز آ جاتے ہیں۔ اب کوئی دیکھا کہ گھر دو پہر پنج ویرانے بیابانے بھوت پریت کے بیسے بابا بزرگ کے ذریعے کشمیر سے نکلے گا کھڑا ہے اور بندہ اس کی بعد آؤا رہے ہیں۔ اب بندروں نے اپنا چاند ماری کا ہدف بدل دیا تھا۔ بیٹے چھاتی سے نکلیں نیچے ترائی میں اب فراخی کر رہے تھے۔ یہ نئی صورت حال اس کے لئے خاصی پریشان کن تھی۔ اور کچھ نہ سمجھا تو وہ منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔۔۔ یہ کیا ہوا؟ ایک دم خاموشی۔ گولگوں کی چاند ماری نکلے گا۔۔۔ دھماچو کڑی جیسے کچھ تھا ہی نہیں۔ ایسی خاموشی اور سوکت کہ اسے اپنے دل کے دھڑکنے کی دھم دھم تک پہنچی رہنے لگی۔ وہ پریشان سا ہو کر نکلیوں سے اپنے وائیں ہائیں دیکھنے لگا۔ بندہ غائب تھے۔ ہکا سا گھر اب تو پر جھاٹکا۔ وہاں بھی سداوتے ڈال ڈال کے خالی۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا کرنا ہے اسے؟ یہ سارے کرتوتیں کہاں غائب ہو گئے؟۔۔۔ پھر خیال آیا کہ اس کی یہ الف لہلا ننگے بولنے کی ترکیب کام کرتی تھی سارے کو نڈر۔ اپنی اس سے بچ کر بھاگ گئے۔ وہ اپنی فتمندی سے غرور ہو کر پانچوڑا اٹھانے کے لئے بھوکا کھانا پکھانے سے کوئی بندہ اس کے بچانے نہ آنے لگا۔ شاید اس جھاد کے کانٹے نہ اٹھا سکا۔ پانچوڑا اٹھانے کی حالت میں کچھ جلتے تھے۔ یہ تڑپنا تھا۔ وہاں بھی اس کی اس کی حالت تھی۔ اب جو اس کی نظر اپنی جگہ جیسے وندنا کی تھی۔ وہ پانی تو چھینکتے نکتے رو گئی۔ چند حرکتیں راہ لی اور اٹھا کر گشت بنگا۔ پیچھے پیچھے اٹھائے آگے۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی ضرورت نہیں کہ کشمیر کے ساتھ کیا جیتی۔

آگے وہی چھوٹی سی جگہ تھی۔ وہاں کے لوگوں نے اسے دیکھا اور برہنہ حالت میں اپنی طرف سے ہاتھ دیکھا تو انہوں نے اپنے بچوں اور عورتوں کو چھوڑ کر ان میں دھکیل دیا۔ سمجھتی کے چند ایک یہ لوگ نے اس کی کھسکی ہوئی حالت پر ہنس کھا کر اسے مل پان کرنا یا تان ڈھانے کو کہنا۔ اسے کمرہاں سے بچتا ہوا۔

وہ اصل کشمیر سے نکلنے پہنچی یہ بولی کہ اس نے بندروں کے لئے کسی پہل منگائی وغیرہ کا بندہ دست نہیں کرتا۔ بکیرہ بندہ اس کا تھیلا بھی منگائی اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں منگائی۔ مگر اس قہیلے میں تو بندہ بڑے کتا بنی اور سگریٹ وغیرہ تھے۔ جو اس نے بزرگ بابا کے پاس رکھ دیے تھے۔

پھر ایک وقت بعد جب سفید اداں بانی کسی نہایتی کے پردہ گرام کے سلسلے میں ادھر آئی تو بزرگ بابا کے پاس گئے۔ وہاں بھی حاضری کے لئے کچھ تھی۔ بابا نے اسے کشمیر کا تھیلا اور کپڑے دیے اور تاکید کی کہ

انٹیمیمے کو تلاش کر کے اس کی چیزیں اس کے حوالے کرے اور بابا کا آشیہ داد بھی دے۔

کشمیر سے کے سامان میں اس کی ایک دو تصویریں اور چند ذاتی خطوط بھی تھے۔ سبب سے اس کا پتہ حاصل کر کے سفید اس بانی نے کشمیر کے کوئٹے بعد دیگرے دو تین خط بھی لکھوائے۔ مگر اس کی جانب سے کوئی جواب نہ ملا۔ کشمیر سے تو آوارہ بادل کی طرح کبھی اس ڈگر۔ اس واقعہ کے اڑھائی تین برس بعد ان خطوط میں سے صرف ایک خط کسی طرح کشمیر تک پہنچ پایا۔ ظاہر ہے کہ کشمیر سے لے اپنی کتابوں انٹری اور تصویروں کے لئے سفید اس بانی سے رابطہ کرنا ضروری سمجھا۔ ویسے بھی وہ سفید اس بانی کے فن اس کی شہرت شخصیت سے خاصا متاثر تھا۔ لیکن وہ بدو ملنے یا سامنے بیٹھ سنے کا ابھی تک کوئی موقعہ میسر نہیں آیا تھا۔ امرتسر لکھے گئے کسی خط کا جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ اس سے ملنے خود گل آیا۔

● جموں میں سمیٹا حملوں.....

جنوں میں ایسے وہاں گھبراہٹ کے علاقے میں اس کی ہشتیت چاہتا تھا وہیں ایک برائی ہوئی عورت جو جوتھی جہاں موسم سرما تھا یہاں اس کی سارا دم ہشتیت کی سبب وہاں کے شر پھر سے جنوں پہنچا تو یہاں کے موسم نے اسے گنگا آکر دکھایا۔ یہی میں تھانی کہ اب جنوں میں جم کر کہیں گے آس نے ملازموں کو کھڑکیوں کی سٹائی سٹرائی کا کہہ دیا۔ خانہ سامان اور گونا گونا ہوا۔ ہر ایک روغن امرت کے علاوہ تیار فرجے خانے لپکے قالین۔ مسنے پھر میں برائی ہوئی ایک فوجی صحت آرام وہاں لٹائیں قیام کا وہکا منظر پیش کرنے لگی۔ امرت ویزٹین کے دور ان اس نے ایک آدھ بار نہایت خاموشی سے بھیر سامنے آنے دوئے اس بازار کا چکر بھی لگا لیا۔ وقت بہ وقت پہنچی کر سلیدیاں ہائی کے چہ دارے کو بھی اچھتی سی نظر سے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی طبع امرت کے بالکل مخالف۔ بڑے صبر اور سچ کج اس مہارکے گزری کا انتہا ذکر رہا تھا۔ جب وہ اپنی من چاہی تیاری اور شوق فرماواں کے ساتھ سلیدیاں ہائی کو اپنی آمد کی اطلاع دے گا۔ وہ دراصل اسے ایک بڑا امر پراختیہ بنا دیا رہا تھا۔

• کشمیریے، ولکیے، پڑجھالے، اسپرے.....!

وہ ایک بڑا حاکم تھا، فنون لطیفہ اور سیر و سیاحت سے دلچسپی رکھنے والا امیر کبیر خاندانی آدمی تھا۔ جوانی

کی جھپ ابھی اس کے آنگن سے پوری طرح نہیں مٹی تھی اور نہ ہی ابھی سر پہ چاندی کا کوئی تاک ہار پڑا تھا۔ اس کے نیچے ہوئے ذوق و شوق جس جمال کی فراوانی، مضامین و مشاہدے کی عادت اور رقص و موسیقی سے محبت نے اسے اپنے حلقہ قرابت کی ہر وجہ میں مقبول و منظور بنا دیا ہوا تھا۔ صنف نازک کے بارے میں بھی اس نے ایسے دینے خیالات رکھتا تھا۔ عورت اس کے نزدیک محض دل بہلا دیا کوئی دل لگی کی جنس نہیں تھی اور نہ ہی قلبی دل بستگی یا عیش عیاشی کا کوئی سامان۔ وہ تو بڑے کچھے مہذب انسانوں کی طرح اس کی توقیر و تعظیم کا قائل تھا اور اسے کائنات کا حسن زندگی کا رنگ اور خوشیوں، مسرتوں کی ترنگ کا محور سمجھتا تھا۔ گو اس کی پہلی بیوی بڑی سنگھ جو فیشن آزادی اور شخصی بے راہروی کی ولدادہ تھی جس پہ نئی طرح مغربی رنگ چڑھا ہوا تھا بد قسمتی سے یہ اسے اپنے رنگ و صفت میں نہ ڈھال سکا۔ بالآخر یہ قیمتی اور شاندار شادی بیوی بد مزگی کا شکار ہو کر خاص اذیت ناک سلجھ گئی پہنچ ہوئی۔ اس بے پیمانہ تجربے کے بعد بھی صنف نازک کے بارے میں اس کے خیالات و جذبات میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی پیدا نہ ہوئی بلکہ پر جی سنگھ — یعنی عورت کے اس روپ و رنگ کو محض اس نے شک سے دلبرانہ اور جانبدارانہ انداز سے ہی ملدی کیا تھا۔ اس کی آوارگی موسیقی سے غیر معمولی تھی۔ شریف شام سے شفق اور زندگی کے معاملات میں گھراؤں و اسراروں کے تلون سماجی شاید اسی زمانے کے درمیان ہوئے ہوں گے۔ اس کے بعد اس نے ایک باغیچہ میں رہنا پسند کیا جس میں آوارگیوں اور شادمان کر شاہرہ ایسا اکابرے بنے بے آب و گیرہ صحرائیں تھیں کہ رومن درختوں کی جھڑیوں میں رہتا تھا۔ موسیقی کی باتوں والا چنانچہ اس نے انگریزوں و مسلمانوں کے ساتھ ساتھ اپنے بچے سکول کی سندھ سے ملتی تھی۔ اور اسی طرح انگریزوں کی بیٹی بھی شاید اسے نو دفراموشی کی فراہمی میں مدد دیتی اور کسی غم و غماز کی تسکین پر تیار ہوتی تھی۔ جبکہ غیر شعوری طور پر وہ ان کی بچیوں میں کسی اختراک و اثر کو کھوجتا رہتا جو عورت کے متعلق اس کے حسن عین کو قائم رکھ سکے۔ مگر وہ جو سنا لے کہہ سکے۔ عورت کے سر پہ جتنے ہال اسے ہی اس کے چلنے۔ مگر وہ شاید اس کا محض باہمی کو کھوجتا رہتا تھا کہ جس کی بابت یہ بھی کہا گیا ہے کہ چھٹی پنی ماری ویسے ہی کن ماری۔ یا پھر کہتے سنے اس کے اچھے اسے ہی بھلیں اس کے رنگ۔ اس ایسی اکی رنگی اور حسن ماری ماری اس کی نگاہوں میں۔ اب اس کو بچے میں پہننا بھی اس کی اک سون تھی۔

کھوج کھیلے آنگن نکالتے اور نیلے خطوں و لہروں کی تلاش میں ہوتا تو حلقہ ہاتھوں کے طور پہ وہ پیریا کے لہ میں بھی جھانکنے کو بے وقوفی نہیں گردانتا۔ سفید اس بانی تک رسائی بھی اس کی ایسی ہی ٹیلی ٹیلی تھی۔ پناہندوں والے سامان کا تھیلا لینا تو بس اک فحش وسیلہ بن گیا تھا۔ اس تھیلے میں تھا ہی کیا؟ اس کی

بے سمت بے مہار اور بے قاعدہ زندگی کے قریب قریب پہنچے اس برسوں کا نچوڑ۔ مختلف ڈائریوں کے اُپلے اوراق پہ سرخان کے کسی مریض کی قے کے پھینٹوں کی مانند اٹھ اٹھے۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں یہ سب کچھ سفید اس بانی کی نگاہ میں نہ آ گیا ہو۔ پرانی نئی چند تصویریں۔ پرانی سگھ کے ساتھ۔ گزرے وقتوں کے وہ تین پرست۔ کالج کے وقتوں کی کلاس فیلوز کے ساتھ کچھ پوز کچھ پرانے خطا بس ایسا ہی الم علم۔ جو بھی تھا اس کو دیکھ چٹک کر کوئی بھی انسان صاحب سامان کی حیثیت شخصیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ یہ تو نگاہی لیتا ہے۔ جس یگی کچھ جھنجھٹ تھا۔ گرہ جانے سفید اس بانی نے اس کے بارے میں کیا کیا کچھ مان کر لیا ہو۔

حویلی کی صفائی سٹرائی اور نئے سرے سے سجاوٹ بناوٹ میں کئی دن لگ گئے تھے۔ اس دوران وہ خود کو بھی "آمادہ ملاقات" کرتا رہا۔ ایک ایک چیز کی جگہ اس کے اندر سے سر اٹھاری تھی۔ کسی بھی چیز کا شوق جب حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو وہ چیز ایک ان دیکھے پہلوں کی سی شکلیں اختیار کرنا شروع کر دیتی ہے۔ کبھی کسی رنگ میں کبھی کسی روپ میں۔ کبھی بھی اور ذرا لانی بھی شوق وصال بھی اٹھاتا ہے۔ فرقت و فراق کے حوے بھی ٹوٹنے لگتے ہیں۔ خوف و گلاب کی سرسراہٹ بھی سنسنی ای پیدا کر دیتی ہے۔ انوں کی لویں شلک اٹھتی ہیں۔

دل و دماغ کی شب و شب حالتیں وقت بوقت بدلتی ہیں۔ اچھا خاصا سلیپ و آئی ٹن پتھر بن کر رہ جاتا ہے۔ یہی ہوا کہ وہ سلیپ کے ساتھ ہی تھی۔ ایک ایک چیز کی الٹ پلٹ کر باقیات کبیرے قوہ تسمیہ سے رہا ہی نہیں تھا۔ سفید اس سفید ان کہتے کرتے وہ عقل و دست سے بھی سنبھلا کر لیا تھا۔ یہاں وہ کھڑی ہوئی یہاں بیٹھے ہوئی۔ ادھر دیکھ رہی ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ ہر روز کو کے بار جانے کا یا ر کرتا مگر ہر مرتبہ وہ کہیں نہ کہیں الگ جاتا۔ یہ دن شہد نہیں کے ٹیک نہیں موسم گدرا لے تو پھر بہتر ہوگا۔ غرضی کے ٹھکانے سرتے چکر لیں تو شب۔ پانچواں کی شب چھلین گئے۔ غرضیکہ کوئی نہ کوئی بہانہ بات پیرا کر کے وہ دونوں کو کاٹ رہا۔ جس طرح ہوشیار وہ کاٹا اور مصروفی قہقہے پیدا کر کے حیرانہ لانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح مصوم سے عاشق معشوق بھی مزہ لینے کی خاطر مصروفی اور فراق کی کیفیت پیدا کر لیتے ہیں۔ مصروفی ناراضی شکل سے نکلے لڑائی جھگڑا خوبصورت نمونے کی نگاہی آواز آری وغیرہ وغیرہ۔ مگر تاکہ الم ہاں بھی ایک دن کی جاتی ہے اور نشتے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

آخر ایک نہانی سی شام وہ سفید اس بانی کے "آستانے" پہ پہنچ ہی گیا۔ کوٹھے اور کوٹوالی آنے جانے

کے لئے جنگی اطلاع کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جن کے ہاں کج اعمالی اور خوش مالی دودھ پلا کھٹکے دونوں جگہوں پر آ جاسکتے ہیں۔ ویسے بھی اگر سفید ہاں ہائی کے ہاں پہنچنے کے لئے جنگی اطلاع کی پابندی ہوتی تو وہ درخواہ تھا نہ کہ گناہ۔ وہ بن بنائے اچانک سامنے پہنچ کر اسے متحیر کر دینا چاہتا تھا۔ جبکہ صرف قبیلے کے حوالے سے ایسی خبریں کچھ کی آشنائی میں کسی خوش گمانی کی کوئی گنجائش نہیں تھی یا شاید وہ لگے بندھے وقت سے پہلے وہاں پہنچ کر اس کے روزمرہ کے روپ میں دیکھنا چاہ رہا ہو یا وہاں ظاہری باطنی شخصی ضد و خال کی اپنے انداز میں پرکھ کر نہ چاہتا ہو۔ محرومیاں، بادیاں، بیاد اقطار، صبر اور جبر، پھر مجبوریاں اور مذوریوں بھی انسان کو کتنے تیار رکھ جاتی ہیں۔ اس کی نظر میں کتنی گہرائی اور تجربے میں کیسی گیرائی پیدا کر دیتی ہیں کہ اس میں اپنی ذات کے سمیٹے، ٹھکڑے، پھیلنے، بکھرنے کے قریب آ جاتے ہیں۔ چہ کے لئے کراہتی جینوں کو چپ چاپ چبانے کا اصول اور ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اپنے اندر کے دافعوں کو چر آغلوں کی مانند ٹھکانے کے ڈھنگ آ جاتے ہیں۔ جاری ستاری کی کاپی کی طرح آتے جاتے سانسوں میں سرگم کی سی آروہی امر و ہی الامیٹے کا گن سنگنا اُخت سے خوب کسی نے کہا۔

عالمِ ہند
UrduPhoto.com

سفید ہاں ہائی کی ہار کا، بوالہ لگاؤ سا، آواز کی شرکاء پہنچنے کے لئے بسر و چشم سار و پھل تو نہ خالیات میں سے ایک ریخس زادہ کے طور پر ہاں پہنچنا قرین مصلحت جانا۔

اس دور زمانے میں روضہ سادہ نوادین امر اور دھما ایسے ہی کر و فرامطراق اور غلات ہات سے شعر و فنِ نغمہ پرستی کے جڑوں، مفلوں میں شریک نہوا کرتے تھے۔ ان کے قیمتی ملبوں اٹالے، دھالے، سر کی کاہار میں ہاتھ کی بزاؤ پھڑی گئے کی موتی ملا منقش یا پائیں نہیں کیا، تم نم کھیں، کھارنی بان کا جب جب کھڑی کھچے دار نہ لھیں، رنگی رنگین لباس زیباری نہا۔ آ کے پیچھے کے طرح وار چپ واہ سب خستہ لا۔ روپوں اشرفیوں اور چہرہ مہروں کی اطلس و بجا کی نئی مولی طلائی و قرنی کا مدار تھیلاں۔ ان کے خدائی دہریوں کے سروں پر بچے موتیوں کے تھوبے بندھے ہوتے۔ ان جاہری لوازمات سے ان کے سہرا تب کی جانچ ہوتی اور اسی تناسب و تسلی سے ان کی نشست، اور خاطر و مدارات کا اجنام بوج۔ جن سے ان اچھے وقتوں میں سٹلے کم سواد اور بے جیتے ان چنیدہ جگہوں۔ اٹلی پائے کی طوائفوں اور گلی گانے والیوں کی قربت کا تصور بھی نہیں کر پاتے تھے۔

بہرحقی والے لوگ کہتے ہیں۔ سارا سنگھارا ملازم پالتو جانور ہتھیار بیوی اور تعلقات۔ اگر انہیں
 صحت نرس میں نہ کیا جائے تو ہر نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہیں ہوتا۔ بانیوں 'مہرائیوں' گانے بجانے والیوں
 کے ہیں۔ تعلیم و ریاضت اور نرسیت کے سہ کا بہت دھیان رکھا جاتا ہے۔ جس کا مطلب ہوتا ہے کہ محض
 جسم تلخ کرنے سے پہلے تمام انتظامات تسلی آمیز کر لیں۔ سارا دن کو ستر کرنا۔ نشست کے تمام لوازمات مثلاً
 پتھر، چھان، خورد و نوش کا سامان۔ بخورات، سہرے، گھرے، خوشبو، بات۔ جھاز، فانوس۔ شمعیں
 گندھیں۔ ادبوں، کھڑکیوں، خرابوں، بھروگوں کے گھن پندے۔ مورتی چلمیں، خش منیاں، جالیاں
 جیسے لڑکی، ٹالپے، قالین چاندنیاں۔ تلپے پر بھرے، لپکے دابے۔ غرضیکہ ایک ایک چیز کے معیار اور
 نکتہ ہمارا دیکھا ہوتا ہے امیر کیہ تقاضیں چونکہ بڑے فحاشت پسند اور نازک مزاج ہوتے۔ اس لئے بڑی بڑی
 مورتی، سبکی، زیورہ دار نیاں۔ گانے والی اور بھر اترنے والی، متحدہ ارطو انہیں اپنے نرسیت کے سہ پہ خاصا
 دھیان دیتیں۔ بلکہ بعض مذہبی طوائفوں کے خاص خاص گھرانے اپنے اسی نرسیت سے خصوصی توجہ اور
 تمام انتظامات کے حوالے کی بنا پہ خاصی شہرت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے ستر میں دور میں بڑی
 شہرت حاصل کی تھی۔ خاص طور پہ بی بی آگہ، گھنٹا، آریا، سینگھارا، اور نکلتا۔ ستر کی بڑی گھنٹے
 تھیں۔ ان کے ستر پر انہوں نے کتنی ہی شہرت حاصل کی تھی۔ ان کے ستر پر انہوں نے کتنی ہی شہرت حاصل کی تھی۔
 ستر کی گھنٹے تھیں۔ گھر یہاں وہ مولوی مدن کی اسی بات نہیں تھی۔

UrduPhoto.com

• گندھرب و زرشن

سفید بانی نے کیوں پھانوں کے تھال کو سامنے سے جاتے ہوئے دائیں شانے کے تیر سے لگا
 دو بیچ چو گھٹ ایک شے کی مانند یوں استاد تھا جیسے ہی ماہر مجسمہ ساز نے روحانی و دہر بانی
 سے گھر سے نہ جاہت و جمال کا ایک ٹپل بیکہ تراش کر صرف سفید بانی سے اور ہر کمال پائے کے لئے یہ
 سفید سفید بانی کی پہلی ہی نگاہ نے ٹپلے کے حوالے سے دیر سے پہنچنے والے اور ہزاروں کاروبار کے
 ستر سے صحت سے پہلے آنے والے اس البیہ مہمان کو خود سے ہی پہچان لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں
 شہرت کی تک شتیاق اور بی شانی پہ ٹپلوں کی بجائے شکایت کی جگہ سی تراش دہرائی تھی۔ اس کے کسی
 آنکھوں میں بھی نہیں تھا کہ بول اپنا ٹپک بھولے بسرے قیلے والا کشمیرے سنگھ اک سین خیال کی مانند
 صحت جانے گا۔ ہونٹوں کے عنابی شکوے ہلکے سے قہر قہر اٹھنے وہ مہبوت سی کٹی رو گئی بولانی سی لپکن نے شاید

کسی کیفیت میں اس کے شائے پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ نکل شبنم کی چٹیل جھانچنی کی مانند جھکولنے لگے اس کا بازو حرکت میں آیا اور موسیٰ ہاتھ کے اشارے سے کچن گودہاں سے نکلنے کا اذان دیتے ہوئے وہ یوں اٹھی جیسے کسی کا فوری شمع کا ہوا بیوا نکل کر دیا ہو۔ وہ چلتی ہوئی لیٹ کی طرح سر ہالیں تک ہوا ٹھکی تھی۔ ایسے میں سر شام جنت نظیر کشمیر کی بالائیوں سے وادی کی آترائیوں تک مست مست ملک ملک اترنے والی پولی پولی گلی گلی پر وادی ان سے کشمیر کے سنگھ کے بچے سے اٹھتی ہوئی چاہت کی خوشبو کا پتہ دے چکی تھی۔ معاً ایک ملازم ہی تمیز کے تکلف میں رچی بسی آواز ابھری۔

”آداب عرض ہے، میں شاید بے وقت اور بغیر اطلاع کے حاضر ہوا ہوں۔ مگر ابھی تک آپ کی چونکٹ نہیں آئی۔ اجازت ہو تو آندرا جاؤں۔“

اسے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا اور ایسی شست زبان اور پاکیزہ لہجہ۔ وہ انہماط سے لہرا رہی تھی۔ کھڑی کھڑی سر کو خیف سا جھکول دیتے ہوئے گویا ہوئی۔

”سُورج ہے آپ آئے تو شری کشمیر سے سمجھتی آپ صاریے التشریف لائیں۔ ہند کی تسلیمات بہالائی ہے۔“

”اسے براہ رسوائت کرتے ہوئے بولی۔“

”اسے اپنی دائیں جانب ایک منظمی تو شک سے بولے اور کی کلی کی طرح چلتی۔“

”آج کل میں پتھر اٹھیں۔“ وہ شادی کی طبیعت کے بغیر کچھ زیادہ ہی چمک اٹھی تھی۔

کشمیر کے سنگھ اس سے مہاراجہ راجیت سنگھ کا لالہ چاچا کہہ رہے تھے تو نگہ راجا تھا۔ تکی تکی رہتی ہوئی

سو فچوں کے نرم بار ایک انکار سے دہکتے ہوئے لہجہ ہوتے۔ مضبوط مردانہ زبان آنکھوں میں وہ دوسری مستی دردی ہوئی۔ بڑی گود سے خیداں بالی کی ٹپٹلی زخم راج کاہل سے مٹھو ہو رہا تھا۔ سوپنے لکھتی

وہ خیداں بالی ہے جس سے منے کے لئے وہ کیسے کیسے بے تاب رہا۔ کتنے بے انتظار کا منت کھیچا۔ جس کی گانگی اور مدھر آواز کے فسوں نے اسے دیوانہ بنائے رکھا۔ جس سے اک تعلق خاطر نے اس کی پارہ جفت طبیعت میں اک ضمیر ابھرا کر دیا تھا۔ سچی تو تھی جس کے قصہ اور مزہم تخم نے اس کے منتخب ہلاک کے بارے میں نوٹ کر کھرتے ہوئے احماد کو ایک بار پھر استحکام کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ اور پھر وہی چمکی لا حاصل زندگی میں قدرے قریب اور بے رونق شب و روز میں کچھ مصروفیت نکل آئی تھی۔

ہر ایک ایک ویدی سے قدرے چھٹتے ہوئے ہوئی۔

اے خدا! ایسے بھی کیا سینک کھل آئے میرے ماتھے پہ کہ مہاشے، کچھکے ہی پارہے ہیں۔“

۱۰۔ نہایت کم محکمے (کی طور پر)۔

یہاں پر ایک عجیب و غریب ماحول ہے۔

یوٹا اس کے ثمرات جواب کے بخوبی کا مزہ لیتے ہوئے بولی۔

مبارج! کہاں آفتاب کی کرن لو کہیں اک حقیر اڑا خاک۔ ایسے بے میلی نصیب اُمر ہے

آواز کی طرح ہوتے ہیں۔ اک شعر آپ کی غزل ہے۔

اکثر یہی ہوتا ہے کہ محبت کی طلب میں

دل ملتے ہیں آجی میں ستمارے ملاؤں ملے

شعر پڑھتے ہوئے اچانک اسے ایک ایسا ہی زبردستی کے ستارے اور نصیبے ملائے۔ ۱۱۱ سنسٹوک سنگھ یاد

میں نے اس کی طرح دل پھینک دیا تھا اس کی بھی وہی صورت تھی لیکن وہ ابھی کیا کچھ بچھڑتا ہے۔

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

شجرہٴ سنت کا..... اس کے اندر جیسے سنت کو نام کے نل کھڑے شروں ہو گئے اور پختے کی پتلی

نے اس شخص کو اس میں دوسرا تصور بڑھادی نہیں بلکہ نے کو انہماک سے دیکھا ہے۔ چنانچہ

جس اور ہزاروں نوجوانوں کی زندگیوں کو برباد کر دیا۔

چہ یہاں بیٹھے وہی ۱۹۸۱ء کی یادیں اٹھیں۔ چلیاں کے نیچے شاید کسی آسمانی لوح پر لکھا گئے جاتے۔

”سب سے بڑا ہے۔“

میں اور خیالی بھی شاید نرینہ کی بازی کی مانند خوشنما ہے۔ جوتے ہیں۔ نرم نرم مائیں نظر نواز دھنوں

عجب افسوس کہ انسان جب ان بدی پر راز پرندوں کے پیچھے لگ جاتا ہے تو پھر وہ

یہ سب کچھ کہہ کر وہ اٹھ کر چلی گئی۔

جہاں کہیں مرغزار تریں گویا پرواز ہوتے ہیں۔ اسی طرح کان بھی قزاق ہوتے ہیں مگر وہ کسی اور

فریگولائی یہ سمجھتے ہوئے ہیں۔

یہاں بھی شاید یہی کیفیت طاری تھی۔ سفید اداں ہائی سائے میٹھی ہے۔ آنکھوں سے آنکھیں نہ جاتیں۔۔۔ سوال و جواب جو رہے ہیں۔ مگر درمیان میں وہی سوچوں اور خیالوں کے مرغزار ہیں۔ نہ جاتے کہاں سے ٹپک پڑے تھے۔ چند بو بھل سے لمحے جب سفید اداں ہائی نے نہ آنکھ جھپکی اور نہ خاموشی کی مہر توڑ لی۔ کشمیر کے کو موقع مل گیا۔

”آپ نے خوب شعر پڑھا۔ اب کیا یوں نظریں گاڑے میرے چہرے پہ شرمندگی تلاش کر رہی ہیں؟ یونہی اچانک نادانی میں یہ نصیبوں والی بات منہ سے نکل گئی۔ آپ نے فوراً الوداعی — مجھے جا سنا تیس تو خوش فہمی میں جی لینے دیا ہوتا۔“

یہ کچھ من لینے کے باوجود بھی سفید اس بائی کی خوبصورت میں کچھ تبدیلی نہ آئی تو کشمیر نے لہجے کا جادو بولتے ہوئے پھر پھر بھی سوال کر دیا۔

پھر تانہوں کے بعد وہ چوتھے ہوئے گئے گی۔

”کشمیر میں شوق کا دکھائی دیا تھا۔ تمہاری آنکھیں ٹانگ نکلتے جیسے ہو گا۔“
 ”سنتو کا کون؟“ کشمیر کے لئے قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
 ”وہ بارہ چھوٹے چاکرے کا زلی ہوئی اسی خواہناک لکچر میں ہے گی۔“
 ”وہی ذیل کی طرح لوگ! لکچر میں ہنسی نہ آئے، کمزری انجمی ہوئی گردن وہی نہ
 وہی ناجاہت... اور وہی ہی نصیبوں والی ہاں۔“

سرکونٹی میں جلاتے ہوئے وہ گھبرائی ہوئے کہنے لگی۔

ہاتھوں سے چہرہ چھپا سکتے اور وہ بانسوی ہو گئی۔ شمشیر ایسے کیفیت دیکھ کر کھیر اٹھا گیا۔
 ”کون تھا یہ سنو گے۔ مجھے دانا ایسی تمہاری بات سنوں گا۔ کیا راستہ تھا اس سے“ شمشیر
 نے بڑے فکری سے کام لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

مفید اس بات نے مجھ کو کے جھلو کے میں بیٹھے ہوئے سازدوں کو ہاتھ کے اشارے سے نچے

کہہ دیتے ہوئے کہا۔

”کبھی سنتو کے نے بھی مجھ سے نصیبوں کی بات کی تھی۔ وہ بھی اپنی اور میرے نصیبوں کو آپس میں ملانا چاہتا تھا۔ وہ بھی تمہاری طرح دل کی بات زبان پہ لانے میں دیر نہیں کرتا تھا۔ بسکھ بڑے جلد باز اور جذباتی ہوتے ہیں دل دینے اور لینے کے معاملے میں بڑے خود کشیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ چیز بکنے یا ملنے والی ہے کہ نہیں۔ جھٹ مول بول لگا دیتے ہیں۔ تم نے بھی تو ابھی یہی کچھ کیا۔“

وہ رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے پھر کہنے لگا۔

”مجھے سنتو کے کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔ اس سے تمہارا کیا ناتا تھا۔ اب وہ کہاں ہے کیا

ہو گیا؟“

سفید اس بائی اب قدرے الجھل چکی تھی۔ بڑی رمان سے کہنے لگی۔

”اس کے بارے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اک خواجہ تھا خیال تھا۔ اک

کلمہ جو اس کے چہرے کی مانند۔ اک جھکڑ دا وزو لا جس سے کی تھی سے آیا اس سے کہیں زیادہ تندی و جہانی

ہو گئی۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کو نہیں دیکھا۔ وہ ایک اور عالم تھا۔ اب اس کا حال نہ ہوا۔

”اب اس کا حال؟“ وہ اس سے بہت کچھ کتر باتیں کرتا دیکھ کر خوب مٹھوٹا ہوا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح کی

باتوں کے پناہ دھیان دینے کی کو شش کر رہی ہے۔

”ابھی اب میری سنتو کے گھر آئے۔ کچھ دنوں کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔

اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔

اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔

اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔

اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔

اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔

اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔

اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔

اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔

اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔ اب اس کے چلے آئے۔

”تو آپ اصل میں اپنی دائریوں اور تصویروں کی خاطر تشریف لائے ہیں۔“

وہ مزہ لیتے ہوئے بولا۔

”بھئی اگر کیوں بھی کہ میں تمہیں دیکھنے ملنے آیا ہوں تو تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ اس لئے یہی کہ

لو کہ میں دائریوں اور تصویروں کی خاطر آیا ہوں۔ آپ خدا کے لئے صرف اتنا بتاؤ کہ میرا تھیلا محفوظ ہے۔

کہیں بندروں نے ستیا ناس کر دیا ہے؟“

”مجھے تو کتنا پہنا تھیلا ملا تھا جسے میں نے جوں کا توں امانت سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ تمہارے پاؤں

ایک چپل بھی ہے دوسرا پاؤں تلاش کے باوجود ابھر کہیں نظر نہیں آیا۔“

اب کشمیرے نے اک نیا سوال کر دیا۔

”تم وہاں گئی تھی تو بندروں نے تمہارے ساتھ کوئی ایسا اور ایسا سلوک نہیں کیا تھا؟“

”نہیں بابا بچن نہیں۔ بندروں کے لئے کھانے پینے کے لئے بھوکے جاؤ تو ان کا ذماغ خراب

ہے کہ وہ خود کو لوگوں کو بے وقوف کرتے پھریں۔ بلکہ وہ تو جنگلوں کی ترکھیا سمجھا کرتے ہیں۔ بابا کے منہ

تک پہنچا ہے۔ باتروں کے سامان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔“

”اب اس مسئلے پر بات کرو۔ میں نے اس مسئلے کو پہلے ہی میں نے دیکھا ہے۔“

”نہیں بابا بچن۔ گمنی اور مہا گمنی ہیں۔ شگیت دڈیا کے ساگر کے مہا تارہ ہیں۔ جو کوئی ان کے چانہ

لیتا ہے ان کی شرفی کی توشیح واد حاصل کر لیتا ہے وہ شگیت شاد وادی شگیتی اور شگیتی حاصل کر لیتا ہے۔ میں

نکوت اور من کی موت میں وہاں کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرا وہاں پہنچنا کبھی نہیں کیا۔“

مشیدا اب باقی سن کر بولی۔

”وہ کیسے؟“

”میں نے کہا مہا چوری نہ ہوئی۔ البتہ وہاں سے الگ نکلت ہوئی۔ اور تو اور میرے کپڑے

اُتر گئے اور میں جسے چڑے ڈھونڈ کر وہاں سے ہٹا کر تھا۔“

وہ اس کی ایسی حالت سن کر کھسیانی سی ہنسی سے کہنے لگی۔

”تم نے کہا کہ بابا کے پاس جانے سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مگر میرا دشا اس ہے کہ برگد بابا مہا شگیتی

ہیں۔ جو بھی ادھر ان کے چٹوں تک پہنچتا ہے وہ کبھی کھالے میں نہیں رہتا۔ جو جس جیت ارادے سے

ہے اس کو اس کی ضرورت رہتی ہے۔ میں تو برس میں ایک دو بار ضرور وہاں جاتی ہوں۔ بس نواتی ہوں

میں رہتی ہوں۔ میرے سروں میں سو رنگ تانوں میں ترتر لاپوں میں انگش اکا لگانا انہی کی شگیتی

کر بیٹھ جاتی ہیں اور اکثر یہ کام وہ اہل عمری میں کر لیتی ہیں کہ آتش جوان ہوتا ہے یعنی یہ بڑھاپے کا انتھام بھرے میلے میں ہی کر لینے پہ یقین رکھتی ہیں۔ پرانی بیٹا ہو یا بڑھی گائیکہ۔ تار دونوں کے ہی ڈھیلے پڑے ہوتے ہیں جو بھرائی کسائی سے ٹوٹ تو سکتے ہیں تنگ کر ارتعاش وار جھلا پیدا نہیں کر سکتے۔

شمشاہ بانی امرتسر والی، حیدر بانی، حیدر بانی، خورشید بیگم اختر بانی، اقبال بانو، شریاملتا کنگڑ، زہرہ بانی اقبال، والی روشن آراء، بیگم ممتاز بیگم فریدہ خانم، امراؤ بیگم شمشاد بیگم، ملکہ پکھراج، عابدہ پروین، زاہدہ پروین، نور جہاں وغیرہ یہ چند ایک ایسے قبیل کی مشہور گائے والیاں ہیں جنہوں نے جوانی کماٹی اور بڑھاپے میں جھن کی بھری بجائی۔ اور بھی جنہیں آج کی نسل نہیں جانتی پہچانتی۔ خاص طور پہ محض گائے بجائے کا دھندا پیشہ اکثر وہی طوائفیں اختیار کرتی ہیں جو شکل و چہرہ کسی جسمانی مقرر یا پھر جنوں کی حد تک موسیقی سے لگاؤ رکھتی ہیں۔ جن کے نزدیک گائیکی کے کاری پر اوجھنا اور عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ جبکہ اس فن سے نام و نمود یا مال و زر رکھنا کرنا ان کا مقصد و مسلک نہیں ہوتا۔

عیدیاں بانی کا تعلق بھی اسی کشمیری قوم سے تھا۔ قد کاٹھ، شکل و صورت، لباس، روپ بھی شمشاد، اللہ گائے کے رائج۔ جیسا آواز کی لہر، جسک اور فنی، سو وہ لوگ بھی ان میں سے تھے۔ ان سے نبھان لہ کہلوئے وہی اور اس میں کسی نئی لہر کے رنگ نہیں پڑے تھے۔ ان کے پاس گائے کی سنت سے کس نہر آواز بادی زعفرانی زرد چھرنے والا۔

مردت طوائف جو یا محراب کر لے والی ہو تو وہ مقام نہ ہوگے۔ جہت ہی ہوتی ہے۔ اس پر رنگ مردانہ لنگ لگانے سے ہی چڑھتے ہیں۔ مرد کی محبت و مروت کی نظر اسے اس کی اپنی نحر میں عزت بخشی ہے۔ لاکھ مود ہو یا کافرا، مذہب سے روئے یا نہ چاہے۔ اس کے حق کے ایک ایک ذریعہ ذہم کی گوریوں سے۔

بھل بن بھل کی مانگھی ناہیں، بڑش بن بھگ میں ناری ناہیں۔

کی جلتہ جگ جگ رہتی ہے۔ جنکی مور پاس کے لنگ سنگ از صبر۔ کھے گئے۔ اس کے بھیڑ باہ کی سادگی رہا کرن ہی پڑش کی پڑجن سے پڑاہت ہے۔ دن رات کے مختلف پہروں کے ہزاروں میں جو تھکھو وچنچن پھرتا رہے ہوتے ہیں بظاہر تو ان کی چنچن پھرتا نہیں کا تا بنگ ایک سہی لگتا ہے۔ لیکن سہ کے سہ پہ سہ کوئی سچا دکھتی ہے کچھ دکھاتا ہے کہ پل ہی پہلو بہ لہا سہ ہر پہلو پہ کس لنگ۔ لنگ سر میں گن پاتا ہے۔

بھی گن سر شاید اس سہ کے سم لگن کی سوت تھی۔ رات کا وہ چاہیہر بھی چک میں تھکھو۔ بانہ سہ رات کے چند آڑے جھینے توڑے توڑ چکا تھا کہ کیدارا را گئی چپکے سے گنگنائی ہوئی آبرائی۔ ویک مہاراج

کے لیے تھکے تھکے والی کمرافٹ بھی اُدھارت لینے دے۔

اس سارا حصہ سندھ بندہ ہمارے پیمان پھوڑے کشمیر سے جی پڑے تھے۔ سفید اداں بائی نے بھی
سے لے کر میں ایسی تائیں چلتا نہیں آڑے توڑے بہاؤں کی پھریریاں پھیریں کہ ساری کمرتوں اور
سینوں کے سینوں پہ پسینہ آ گیا۔ اس پہلی شب 'سفید اداں بائی' ایسے ہی بھر گئی تھی کہ کشمیر سے لنگھ اس کی
کامیابی سرکاری پہ پورا کشمیر بچھا اور کر چکا تھا۔

یہ یہاں موقع تھا کہ کالے خان کو بھی دوسرے خان زادوں اور روزمرہ کے آنے جانے کی طرح محفل
میں جیسے کی اجازت نہ ملی تھی۔ وہ پوری رات اپنی کونجری کے سامنے اکڑوں بیٹھا اس پائیں جھرو کے کی
جگہ سے لنگھتا رہا۔ جگہ سے لنگھتا رہا۔ جگہ سے لنگھتا رہا۔ جگہ سے لنگھتا رہا۔ جگہ سے لنگھتا رہا۔
تھکے ہوئے ہاتھوں کی گھڑائی بان کو بھی اُدھر سے دیکھ آیا تھا۔ جو بڑی مستعدی سے کھڑا بیڑی سے شعل کر رہا
تھوڑے عرصے کے بعد وہ پھر اس کے پاس پہنچا تھا۔

کچھ کچھ جل جانی کا پیلو۔ کچھ تو بیٹھے کے بیٹھے ہی ہار چکا تھا۔ کچھ تو بیٹھے کے بیٹھے ہی ہار چکا تھا۔
UrduPhoto.com

اور کس مٹی کا بنا ہوا تھا یہ کوئی بد مغز کہ ایک ہی پاپ اور بے شمار بیڑیاں۔
اور کس مٹی کا بنا ہوا تھا یہ کوئی بد مغز کہ ایک ہی پاپ اور بے شمار بیڑیاں۔

جیسے کبھی کسی پاک صاف جگہ پہ کبھی بیٹھ جاتی ہے۔ یہی طرح کبھی بیٹھے بٹھائے یا وہ کوئی بات
میں سے کہ نہ خود بیٹھ جاتی ہے۔ کالے خان کے ذہن دل میں بھی اس دھن کو دیکھ کر یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ
کالے خان کے کئے کوڑوں میں ضرور بیٹھے گا۔ ان بیڑیوں پہ سے بھلوں سندھوں کا آکرنا چڑھنا تو لگا ہی
تھا۔ اسی طرح اسی عمارت ترو دیکھیں ہوا تھا۔ اسے ان اور ایسے سوچا بھی نہیں چاہئے تھا کہ یہ کو کچھ
ہو گا۔ دھوکے کی نمایاں خواہش ہے پسند ہے اور مایا جال ہیں۔ یہاں کے زور و زور کے ساتھ بھیس
کے کالے کترے والی قینچیاں 'استرے' پر شیدو ہوتے ہیں۔ یہاں مصنوعی دل بہانے والی اداؤں
کو کچھ سترہوں اور جھوٹے عشق محبت کے کہیوں 'بیاد اعتبار' کے ناموں سے بھری تجویزوں میں سندھ لگائی
ہوئی ہے۔ یہاں عزت 'غیرت' کی لٹکا ہوا مہم کی کوئی نہیں موجود نہیں ہوتی۔ خواہ صورت پر چھایوں کی اس گری
تھوڑے کچھ رہنے مانتے کا کوئی ذہن نہیں ہوتا۔ ماں 'بہن' 'بھائی' 'باپ' 'شوہر'۔ ان سب رشتوں
میں کو صرف ایک ہی مشترکہ پہچان ہے وہ ہے پیڑہ و جن اور شہرت پھر۔ پھر۔ اسے ایسی چٹا کیوں لگی

برزخ...؟ مجھے ایک وقت سمجھائی دیا کہ وقت کا صلہ اور گردشِ اُن تینوں کا برزخ... افلاک کا نکات کی سرحدی، امتناعی گہری غار کی صورت ہے جسے عالمانِ افلاکیات و سنوات بلیک ہول کہتے ہیں۔ اس کا ثنائی جب ہول کی مانند ایک انسانیاتی بلیک ہول بھی ہوتا ہے یا ایک اسے دریافت کرنا ہر کسی دسترس میں نہیں ہوتا۔ ہول ہولی حلاصیتوں اور حیشیتوں کی طرح یہ بھی کہیں محدود سی کیفیت میں دبا پڑا ہوتا ہے۔

اس کا تو نام ہی کالے خان تھا۔ جسے رام پور سے اپنے مخصوص لہجے میں ”کالا خول“ کہہ گزرتے تھے۔ ہر چند کہ کالے خان پہ ظاہر کالے خان ہی تھا مگر بہ باطن وہ شاید کالا خول یعنی بلیک ہول تھا۔ وقت کا صلہ اور گردش کا برزخ اُن تینوں کیفیتوں، قوتوں کی رمی سا بیکنگ کا فاضل فضل۔ یہ شاید دنیا کے اُن چند کالے خانوں میں سے ایک کالا تھا جو کسی طور اپنے اندر کی کالی سرنگ دریافت کر لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ سو نہ نہیں کالا سوتا آتہ ہے کالی چھپک اور کالی کھانسی بھی کچھ نہیں کہتی۔ اس کے پاس شاید کوئی ایسا دیرینہ منتظر تھا جو ہول باوجود اِٹ شاہ ایسے جنوں کے لئے جانا ضروری ہے جو کسی کالی لٹی پہ عاشق ہوئے گا ارادہ رکھتے

UrduPhoto.com

یہ چاروں کالی حالت کی طرح ہوتے ہیں۔ کالی رات کی کالی اُٹھل میں ہر شے کالی ہوتی ہے۔ کالی سوئی کالے چہرے کالے باطن کا بلیک ہول

و خوب جانتا تھا کہ اس کی رسائی جنت والوں سے ہے اور نہ دوزخیوں تک۔ وہ ایک نہ معلوم کی جانب گھست رہا ہے۔ اندھیری لامتناہی گہری سرنگ خونِ آشام پگھلا رہی۔ نیچے کچ کچ دلدلی کچھتے پھلاتے ”کالتے“ اُٹھلاتے اندھے سر میں چوہے۔ جو شاید خود کسی بد زو کی کھوج میں سرگرداں تھے۔ جو انہیں اس برزخ سے نجات دلاوے۔ یہی کچھ محسوس کرتے اور سوچتے سوچتے اس کے مفلوج و مانع کے پاس۔ اور مغرب کمر کے منہ سے جنت سے نکلتے۔ کبھی کبھی سوچ کی یہ لہریں بھی سر اٹھاتی کہ اس نے تو اس حیرت سے نفس جیسے سرور کی ہلکھا مانگی تھی کہ اس کی شکست سہا کے کسی کو نے میں بیٹھ کر، اپنے تھوٹے تن کے صحن کی مستطیپ سمسکار کر سکے۔ اسی کارن تو اس نے سب کچھ آج دیا تھا۔ پھر اس کی کھوپڑی میں یہ بھی آیا کہ وہ بڑے بڑے دھواں مہا پڑش! جو غسوں کے پردوں روئیں کے تو شک بیچنے۔ سونے

کے پاس جب یہ گمانی اور بے اعتماد کے جھگڑا غصیاں مسلسل زور آزمائیاں کرتے رہتے ہیں۔ عقیدت میں
 وہ شک و شبہ نہیں ہوتا۔ ہم دو کا نادر لوگ ہوتے ہیں یہاں عقیدتیں نہیں پالتے یا بیچتے۔ ہم ادھر بہتر ادا نہیں
 کرتے۔ سبوتاں اور خلوتوں کے سوا کرتے ہیں۔ تم شاید نہیں جانتے ایک طوائف کو اپنا پیشہ کمانے کے
 لئے جس قدر ضرورتیاب ہوتا ہے۔ محض چند سال شباب اور پھر بہت سے گھبے برس بڑھاپے کے ذیل عذاب
 کے ایسی مختصر مدت میں وہ سب کچھ کر لینا چاہتی ہے۔“

کالے خان اس کی تلخ حقیقت سے نصیری و تحزری باتیں سن کر حیران ماسوج رہا تھا کہ ایک
 عورت یہ طوائف سے بہتر عزت عزت آقا زوہ انجام اچھائی لڑائی اور محبت و عقیدت کو کون جانتا ہوگا۔
 کہتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔۔۔۔۔!

”کالے خان! میرے ہاں ہر قسم کے قدر دان آگے ہیں اور مجھے ان کی پسندنا پسند کا خیال رکھنا پڑتا
 ہے۔ یہ تو قدر دان اپنے اور میرے درمیان کسی تیسرے کا وجود برداشت نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔ وہ کھری چاندی کی
 تختی ہونے کی اثر قیاس خلعت کی شرط یہ ہی تذکرے ہیں۔“

کالے خان قہر کر پڑا۔

UrduPhoto.com

”ہاں کالے خان! تم ایسا کہہ سکتے ہو۔“

”ایسا کروم! میں اپنے پیارے کے دروازے بند کر دوں۔ یہی باتوں میں نہیں رہے سکتا ہوں۔“

ایک استہزائیہ سی ہنسی سے لڑائی لے کر جواب دیا۔

”یہ ایک طرف تو ہو سکتا ہے، دوسری طرف نہیں۔“

کالے خان نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔۔۔۔۔!“

”یوں سمجھو کہ ہالی وولوں ہاتھوں سے بے توفیق کی آواز کو مٹاتی ہے یعنی میں بھی نہیں قبول کروں
 تہمت یعنی ہے۔ تم قارون کا لڑاں بھی میرے قدموں میں ڈالیں گے، جب بھی تم شمشاس کے برابر وہ تو توجہ اور
 ریت حاصل نہیں کر پاؤ گے جو شرعی شہیمے تنگہ کے لئے میرے من میں پیدا ہو چکی ہے۔ اب وہ مجھے چاہے
 نہ کہہ بھی نہ دے تب بھی میرا حق من سب اسی کا ہے۔“

کالے خان تسلیم ہاں ہائی کی گفتگو سن کر حیران رہ گیا۔ پہلے تو سمجھی اس نے ایسی یہاں گفتگو نہیں

کرتی تھی۔ وہ تو پوچھ بیٹھا۔

”تم نے تو ابھی کہا تھا کہ طوائف کے لئے صرف اور صرف دولت ہی سب کچھ ہے؟“
 ”ہاں کہا تھا۔ اور اب بھی یہی کہتی ہوں۔ لیکن جب کوئی طوائف کسی کو اپنا میت مان لیتی ہے تو پھر اچانک کچھ اس پر قربان بھی کر دیتی ہے۔ اور اپنے پلے سوائے اس کے پیار کے اور کچھ بھی تو نہیں رہنے دیتی۔“ وہ بڑے پیار سے پوچھنے لگی۔

”کالے خان! تم میری کلا کے عاشق تھے یا میرے۔۔۔ تمہیں یہاں کس نے باندھ رکھا ہے۔۔۔ وہ عقیدت یا محبت۔۔۔ جواب دو۔۔۔؟“
 دوسرے جھکائے کہہ رہا تھا۔

”میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم میری سڑوں کی ملک ہو۔ تمہارے سڑ۔۔۔ تمہارا لہجہ سحر انگیزت میرے نیکل من کو شائق دیتا ہے۔ میں نے تم کو تو تمہارا جسم اور تمہاری سحر و جادو نہیں چاہی۔ بس یہی کہ مجھے اپنی سنگیت سجا میں بیٹھنے دیا کرو۔“

”میں نے کشمیرے سنگھ کی موجودگی میں کسی کا بھی وہاں بیٹھنا پسند نہیں کرتی۔ اور ہاں شاید میں بہت جلد اس بازار اس کو طے پہنچاؤں۔۔۔۔۔ مجھے شہرت سے محبت ہے۔۔۔۔۔ میں اسے کہیں اور کشمیرے سنگھ کے ساتھ لے جاؤں گی۔ یہاں اس کا نام اس بازار کی کلا ہے۔۔۔۔۔ میں اسے یہاں اور اب ایک دوسرے کے لئے ہی چھین اور نہیں گے۔“

وہ کچھ کچھ پھر کہنے لگی۔ ”اگر تم چاہو تو ابھی بھی کچھ نہیں بھڑا اچھا آگے کیا راست مت کھونا کرو۔ ورنہ بدیہ میں شاید یہ جتنا اچھا کشمیرے سنگھ کی تو ملی ہو جاؤں۔ ظاہر ہے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ وہاں نہیں لے جا سکوں گی اور یہاں میرے پیچھے ان بازار کی لوگوں کے ساتھ تم نہیں رہ سکو گے۔ بولو کیا کہتے دو خوب سوچ کر جواب دیجئے۔۔۔؟“

وہ بڑے سکون و تسلی سے سب کچھ سن رہا تھا۔ پھر اسی دھیرے سے بولا۔
 ”میری سڑوں کی سرکار! میں نے تو اسی دن واپسی کی ساری ہتھیاں جلا ڈالی تھیں جس دن تمہارے نام کا قرضہ ادا تھا اور پھر مجھے یہاں بابا بانی شاہ اور جنوں راکھوں نے باندھ لیا ہوا ہے۔ میں نے اب کہاں جانا ہے۔“

پھر وہ اسے اک سرت بھری نکادے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔
 ”تم یہاں سے چلی بھی جاؤ، مگر ہوگی تو میرے والی میں۔۔۔۔۔ اسی جنوں میں اور میں جانتا ہوں کہ تم بابا بانی شاہ کے دربار پہ حاضری دینے جانا نہیں رہ سکتی۔ میں یہاں سے اٹھ کر وہاں جا بیٹھوں گا۔ جہاں سے

بڑے کھوں کی نشانی پرانی ہوئی کا آب نقش ہی بدلا ہوا تھا۔ ڈیوڑھی، قمیز، مہرائیں، غلام گریز، جھروکے اور اونچی کاٹھ وہاں کے وسیع و عریض کمروں کو ایسی خوبصورتی اور نفاست و مہارت سے آراستہ کیا گیا کہ قدامت اور جدیدیت دونوں کے انداز و محاسن بڑی دلچسپی سے ابھر کے سامنے آ گئے تھے۔ لان اور آتھ باغیچے میں کشمیر کے قیمتی خوش رنگ پھل پھولوں کے درخت پودے اور جھانڑ بھارے کچھ ایسی ترتیب و ترکیب سے استوار و آراستہ تھے کہ نگارہ کرنے والا صاحب خانہ کے ذوق و جمال اور حسن نفاست کی داد دینے پر نہیں رو سکتا تھا۔ پرانی وضع قطع کا کشمیری مسلمان ملازم پہلے کام کی دو مائیں، شری نگر کا رسوینا اور خبر دہری پیہامور مسلح گورکھا۔ گاڑی بان، مائیں، مگرے، سہرے سنگار کے لئے گھرگ کی مائیں۔ ہر حکم بجالانے پر معذور و مستعد خدام اور تن من و حسن سے عاشق کشمیرے سنگھ سا شوہر۔ سفید اباں بانی کو اور کیا چاہئے تھا؟

کشمیرے سنگھ نے صرف دو باتیں کی تھیں۔ ایک یہ کہ وہ اس سے کورٹ کھینچ کرے گا اور اپنا دھرم نہیں بدلے گا۔ دوسری یہ بات۔ کورٹ سے اترنے کے بعد وہ اپنا باغی فراموش کر دے گی۔ اس نے دوسرے کو بے نیاز اور بالکل قلیل کے کسی فرد سے کوئی تعلق راہ میں سستی نہیں رکھے گی۔ کشمیرے سنگھ نے انہوں نے ہائیڈراڈیور میں سے بڑا ہوائی جہاز میں سے ایک مائیں کی ڈال دی تھی۔ سفید اباں بانی نے اپنے وین ڈھرم پر قائم رہتے ہوئے کشمیرے سنگھ سے بیاہ کر لیا تھا۔ بیاہ بھی کیا تھا۔ ایک چھوٹی سی تقریب میں کشمیرے سنگھ کے چند قریبی دوست اور رشتہ دار شامل ہوئے۔ سفید اباں بانی کی صاحب سے ایک کشمیری مولوی صاحب اور ایک نیم پانچ قاری صاحب عوامی بازار کی کٹروالی مسجد میں نماز مدرس، موزن اور امام بھی تھے۔

سہاگ رات کشمیرے سنگھ نے اسے ایک بیش قیمت الماس کی انگشتری تحفہ میں پہنائی تھی۔ اننگلی میں چھوڑ بھی اس کی ماں کی دی ہوئی انگلی بھڑکتی تھی۔ جو گم ہو چکی تھی اور ہاتھ ایسی ہی انگلی اسے کالے خان کی انگلی میں پڑی ہوئی دکھائی دی تھی۔ پوچھنے پر اس نے بتایا تھا کہ یہ انگلی اس کے مرحوم باپ نے اس کی مرحومہ ماں کو بھی خود پہنائی تھی۔

ہاتھ اسی سے سہاگ رات اسے کالے خان یاد آ گیا۔ دادان، معصوم۔ اگر وہ یہ انگلی والا ہاتھ جان جاتا تو اس پر کیا جتنی۔ سفید اباں بانی پر تو اس نے کچھ خاص اثر ہے ہوا کہ اس کے پیشے میں رشتوں، ناتوں کو کچھ اہمیت نہیں دی جاتی اور اگر وہ کچھ اہمیت دینا بھی چاہتی تو اب حالات کی چٹن بنگلی کو پاٹ دیا بہت زیادہ ٹھہرا اور گھسا چکی تھی۔ اب تو شخص ایک طرفہ سا بچے خون کا ہلکا سا احساس و بھرم قائم رکھنا بھی بڑی بات تھی۔

جسیدہاں بائی اسے بھند بھجوری وکراہ بھجاری تھی۔

یہ فقیر بے سنگھ والا معاملہ بھی شاید اس کے لاشعور میں ابھرتی ہوگی کسی خلش خدشے کا زبِ عمل تھا۔
 اصل وہ کالے خان کا سامنا کرتے ہوئے کتراتے تھی۔ آخر قحطی تو اشراف کا خون۔ اب یہ علیحدہ سی بات تھی
 کہ شریف نے اپنا خون کس گندی موری میں اندل دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ذلیل کیسا بھی شرافت کا لہارہ اوڑھ
 لے وہ اصل رنگ و رنگ چھپا نہیں سکتا۔ جبکہ شریف خاندانی انسان کیسے بھی معاملے میں یا کیسے بھی بُرے
 حال میں بہ حالات کا شکار ہو۔ وہ اپنی ہنسی جیسی خوشبو بہک کو لگا نہیں سکتا۔ بھلا مانس اپنا سہم ہمیشہ خیر و خول پہ ہی
 لگے گا۔ جیسا کہ کالے خان نے بھی اپنی بات کے سنے کی مٹی نہیں چھوڑی تھی۔ سفید اں بائی اور چوہا رے کی
 بے چین سے اتر رہی تھی تو وہ پچھارے جانب چند تصویر بچاں جو سفید اں بائی کی تھیں اور اپنا برا کے نام سا بیٹا
 جہاں جہاں میں دباے کو ٹھہرے اور کوٹھڑی کو الوداعی نظروں سے دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا تھا۔ جبکہ سفید اں بائی بھی اس
 کی دلی بولی جانٹل کا ٹیچہ کی شرمندہ دانی اپنی ہنسی تھیلی میں ڈال لاتی تھی۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی تھا اپنے دیر سے
 سنے کے ذریعے میں ڈال دیا تھا۔ نصیحتی سے وہ چپ چاپ راضی ہو مٹا سا اپنے بے شر خیمے کے پاس کھڑا
 سفید اں بائی کو فقیر بے سنگھ کے کتے پہ سوار ہوتے دیکھتا رہتا تھا کہ یہ کتے کتے ہی جھپٹ جاتے ہیں جس کی
 بات سن کر فقیر بے سنگھ کی دلی دھڑکن ہو جاتی ہے۔ اس کی اس سرباگ اور کھلی کے راستے کیا۔ وہ چون
 کھڑا ہوتا ہے کتے میں بیٹھ گئی تھی جیسے بازار سے سودا سٹک لینے کے لئے جا رہی ہو۔ مگر باں مانس نے آگ
 جھانک کر دیا اک سو گاہوں کی تھو پائی میں تھا اور یہی واحد چیز تھی جسے وہ اس کو بھند سے لے کر لیتی تھی۔
 کیا کیا تے ہاتھوں کھلے خان نے اپنے اہل و عیال کیا۔ قحطی کے بھی چھکی سی مسکراہٹ سے
 سے جواب دیا تھا چہرہ بے تک نے کا بچھوڑا دکھائی دیتا رہا۔ وہ دم بخود کھڑا دیکھتا رہا۔ دیکھ کر وہاں
 کتے کے بعد وہ اک لمبی سی سانس کھینچتے ہوئے بابا بانی شاہ کے حزر کی جانب پل دیا۔

• سو فی فقیر دی، مرضی بے پیر دی.....

سفید اں بائی کو دی ہوئی شرمندہ دانی بھی خوب تھی۔ اسے یاد تھا کچھ عرصہ پہلے ایک جمہرات کے
 سے ملے۔ یہ وہ سفید اں بائی کی محبت میں بابا بانی شاہ کے مزار پہ حاضر ہوا تھا۔ وہ اندر ہر آہ سے
 کھینچتوں کی سخت میں پڑ گئی۔ یہ باہر تاروں اور بیڑوں کی پھاڑوں میں سنتوں بھگتوں درویشوں کی
 صحت میں دم کش دھرنے بیٹھ گیا۔ یہیں ایک ٹنگ دھڑنگ مجذوب بھی اپنے آپ میں مست سا پڑا ہوا تھا۔

آلے والے والوں سے پتہ پڑا کہ چند روز پہلے انہیں اوپر کے برفانی پہاڑوں سے نیچے اتر رہے۔

یہ مجذب بابہ بھی شاید دیوانوں اور لڑکوں کے مابین کی کوئی چیز ہوتے ہیں۔ جہاں لنگ گئی وہاں لٹ گئے اور جدھر ٹھیکر پڑی اُدھر ہی ٹھٹھک گئے۔ من چلنے پہ چل پڑے اور لنگ ٹھہرنے پہ ٹھہر جاتے ہیں۔ کچھ جان نہیں پڑتا تھا یہ بابا بندہ ہیں یا مسلمان؟ شاید ایسے مجذبوں کو نہ بھی کھکھڑوں میں پڑنے سے کوئی ڈر تھیں ہی نہیں ہوتی۔ جنادھاری کہ منہ ہاتھ اناک نقشہ کچھ بھی تو واضح دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بلوں پہ منہ کی کھال۔ میلے کیلے چمکت میں کندھے ہونے بالوں کا لدلی ہنگل۔ ہتھیلی سے ڈرا چھوٹی پھوڑے کی دھجھکی سے چٹنی ہوئی ناف کے نیچے لنگ رہی تھی۔ سینگوں کی مانند 'مڑے مڑے' علیحدہ مکروہہ ناخن آپس میں ختم ٹٹھا کعب و ہن سے تھڑی تھڑی ٹوٹھیں۔ داڑھی کے ریشوں ہنڈوں اور ٹکڑوں تعفن کے اٹھنے ہوئے کھسکوں سے پتہ چلتا تھا کہ بابا بڑوں ملکاں تھرائی کے قریب نہیں چلے۔ سر کی ٹھٹھاؤں اور ہنڈے کے ڈرو رو بے تھا شاہد ہونے والوں سے بھی یہی اندازہ ہوتا تھا کہ یہ جبروت کبھی برفانی پہاڑوں کی اندھیری کھوٹوں کا دروں میں برفانی ریچھوں کی سا جھے واری میں نہر سرام کرتے رہے ہیں۔ جوگی 'شیوا' کی فیر رویش کچھ پہاڑوں سے نیچے وادیوں میں اترتے ہوئے ہیں۔ کسی ایک لڑکے کیلئے اس سے پانچا تھا کہ کا مٹنی خیز سر اس کی ناک میں سے نکلتا ہے۔

UrduPhoto.com

جوگی اتر پہاڑوں آیا پانی پانی اور دھجھ کے

پہاڑوں کے خلوئے والے جوگی لوگ کچھ اس طور تک دھڑلے بھی نہیں ہوتے کہ کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکے۔ ان کے ہاں کچھ نہ ہو سکتا ہے۔ لڑکے کا اتنا ہی علم ہے کہ مجذب تو جیسے ہر شے کے لیے نیاز سا ہوتا ہے۔ اسے احساس، احتمال، خوف و تجالوت، تکلف و ترواہ سے بے خبر ہو کر نہیں ہوتا۔ جب نظری کچھ نہ آوے نہائی ہی کچھ نہ دے سوچ و سمجھ کے سوتے ہی خشک چڑے ہوں اور اندیشہ نو و دیاں کا خوف نہ اپنے پرانے کا مفہوم منہ کی اور من و توتی تھرا تھوک ہو جائے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔ یاد سے شاید پھر باقی جذبات کا جذام ہی دوہا جاتا ہے۔ ہوش کی خبر بے ہوشی اور غش کا غروش بے خبر کوٹھ بن جاتیں تو پھر مجذب اپنے پڑے کھوئے کی حالت باقی بچ جاتا ہے۔ جو لاکھ کوشش کے باوجود پھر بھی نہیں سکتا۔ کارر پڑا کو کوڑے اس کا لہذا گوشت چپے کر جاتے ہیں۔ اور کچھ نہ نہاںد اک پالا باقی بچ جاتا ہے جو رسات کی دم جھم ہو مقدار سے چند قطرے قیام کر جائیں تو قیوم دیجیں۔ ورنہ دھول مٹی گرنے والی میں گرن وڑے دھوپ میں ٹپکتے دکھائی دیتے ہیں۔ جنہیں جہل اندھے کھانٹاں کے جھومر تعمیر کرنے ہیں۔

یہ بھی کوئی ایسا ہی مجذوب تھا جس سے اتفاقاً کالے خان کی مدد بھیڑ ہو گئی تھی۔ ہر چند مجذوب کی ایک بے قصور ترنگ یا رنگ انگ ہوتا ہے۔ اس مجذوب بابے کا رنگ یہ تھا کہ اس کے سامنے ایک خاصی عمدہ سرمہ لایوں کی دھری پڑی تھی۔ نگری لاکھا کانسی جیتل منی۔ رنگین منتش کی مختلف چھوٹی بڑی سب سے بڑی دھری۔ جیسے مجذوب نے بیچنے کی خاطر دکان سجا رکھی ہو۔ کالے خان پرے بیٹھا دیکھا کیجئے کہ مجذوب کے چرخ بچھونے آتا وہ کوئی نہ کوئی سرمہ دانی ضرور نذر گزارتا۔ یہ ترنگ میں ہوتا تو نذر قبول کر کے سرمہ دانی سے سلامی کھینچ کر پیچوں پہ پھیر لیتا اور سرمہ دانی سامنے پڑے ڈبیر میں ڈال دیتا۔ اور اگر پیسہ نہ ہوتا تو نذر پہ نظر ڈالتا اور نہ ہی پیش کرنے والے "نذیر بیگ" کو نظروں میں لاتا۔

کالے خان تو یہی سوچ کر اس کے پاس بیٹھا تھا کہ کوئی الوپ انجمن "میرے" کا سرمہ بیچنے والا سوانگ ہو جائے بیٹھا ہے۔ ابھی اس کا بیان شروع ہو گا جو اس کے سرمے کی سلامی بھیجے نے والے اندھے کو دن میں کچھ شب فراق کے مارے کو صبح وصال کی نوید سناتا ہو گا۔ کچھ دیر وہ اس کے بیان کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ سرمہ لایوں والا عجائب خانہ دیکھتا رہا۔ جب آستان گیا اور مجذوب نے بھی اسے گھبراہٹ سے ڈالی تو وہ

UrduPhoto.com

مجذوب نے جیسے سنا ہی نہ ہو گا کالے خان اس کے جواب کے انتظار میں سرمہ لایوں پہ غور کر رہا تھا۔ مجذوب کی جانب سے کوئی جواب تو نہ ملا البتہ اس کو ان ٹکروں میں ایک ٹکڑے سرور مل گیا۔ ایک ٹکڑے سینہ کا تھک کی بنی ہوئی سرمہ لایوں۔ یہ سنا ہی نہ ہو گا کہ کالے خان نے جواب دیا کہ "کیا دیکھا کی پڑی۔۔۔ اس سے کیا بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر ایک لی۔ گول مٹول چھوٹے آٹو سے سی پیٹ کے بیچے پینہ ابھی گول اور گول۔ سلامی کے اوپر بھی یہ بھولی کاٹھا سا بڑا جیسے۔ کچھ تھک کر وہ پیام پڑ گیا ہو۔ ابھی یہ اس کے سرمہ دانی کو گھبراہٹ کر دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک ٹونٹو اور بانوں والا ہلکا سا بچہ۔ یہ مجذوب کو دیکھ کر اس کے کانوں والا ہاتھ تھا۔ سرمہ دانی بیچنے منی میں گر پڑی۔ اس اچانک میلے سے کھرا کر ایک دم ہاتھ جوڑتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

"مجھ کو کچھ مہاراج آجھ سے بھول ہوئی۔" کہتے ہوئے وہ اُسے پاؤں دیکھ کر ہوا۔ مجذوب نے کھڑے ٹکروں سے اُسے ٹکروں ہاتھ۔ کالے خان ابھی سمجھنے نہیں پایا تھا کہ مجذوب وہیں بیٹھے بیٹھے دھارتے ہوئے ہاتھ ہوئے لگا۔ اس پریشانی اور شرشارتشی میں اس پاس اور آنے جانے والے بھی قہقہہ دیکھنے لگے۔ کچھ دیر جب وہ خاک میں خوب لوٹ لوٹ ہو گیا تو بڑی ڈبیر سے اپنی سیدھ بیٹھ گیا جیسے

تھیں۔ کبھی تو نہیں۔ سرمردانی کا جمل سرمرد جو بھی تھا ایسے پھیلے ہوئے تھا جیسے سلائی سے نہ لگا ہو، قلمی سفیدی
 نہ کرتے سے پھیرا گیا ہو۔ اب وہ سرمردانی کے ذوالے ہو گیا۔ سرمردجو نکالی باہر کیا اندر جھانکا بلایا
 کڑھیا ہوا حقیرہ سے ہتھیلی پر اٹھا لیا جھکا یا مگر کیا مجال جو شکرے کی آنکھ کے گل کے برابر بھی کوئی سرمرد کا جمل
 نہ تھا۔ سرمردجو کی سلائی نکالی پہ پھیری۔ ایسی صاف شخری کہ کوئی ہلکا سا نشان دھند تک نہ پڑا۔
 جب سرمردانی اندر باہر سے یوں صاف جیسے کسی نے خوب دھو دھا کر اسے افواں بھرنے کے لئے رکھ
 رکھا ہو۔ جب اس کی کھوپڑی میں کچھ نہ سہایا تو اسے شلو کے کی جیب میں ڈال کر گل کے نیچے آ بیٹھا پانی کے
 چھوٹے سرمرد سے تو کیا۔ غرضیکہ سو جتن کر لئے پر آنکھوں میں خمی اور پپلوں پہ تھیں سیاہی نہ کی۔ اسے یہ
 معلوم نہیں ہے دور وہ اور بے کار سے لگے کہ کالک سیاہی اور پوکھی پڑ گئی تھی۔ ایسے میں وہ مجذوب و حجاز
 کا کلام اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ ان دنوں ان آنکھیں پھیلنے لگی تھیں۔

مصر کے قاز کے بعد والان سے گزرتے ہوئے کہیں سفید اس ہائی کی نظر اس پر پڑی مٹی تو وہ بھی
 اس سے پریشان نہ ہوئی۔

UrduPhoto.com

اس سے یہ کہیں۔ یہ خزانوں کی انکڑیں والی صحرانی کالک کہاں سے پڑی۔ تو پہ تو پہ آنکھیں
 نہ کھلیں۔ کہاں سے پڑی۔ کالی کھلیں۔
 وہ ایک خوشگوار جہت میں گھری ہوئی اتنی قریب آئی کہ مائٹوں کی تاریں آپس میں الجھنے لگیں
 گئیں۔ سیدھے اسے اور صوبے کے میدان سے کی پوٹ کے پاس انھیں کی ملک سے ایسا شاد کام ہوا۔
 میں ہو گیا کہ وہ اس سے کیا پوچھ رہی ہے۔ بس یہ حراسے ہا کے لے لے کر خوش ہو رہا تھا۔ وہ بھی اس کی
 کالک کو کھینچتے ہوئے مگر اکر رہ گئی۔

رات آئی مٹی پھر اک اور اپنا ہوا آنکھوں میں جھیلی اور پپلوں پہ تھیں سیاہی خود بخود
 نہ کی۔ کہیں پہلے والی حالت پہ آئیں۔ یہ اچانک تبدیلی بھی کالے خان کی کچھ عقل سے ہوا
 کہ وہ اس نے رات پھر اس سرمردانی کو آزمانے کی بجائی۔ خوب اسے الٹ پٹ کر دیکھا۔
 کہ نہ تھا۔ وہی لگا کر اس کے اندر پھیری پھیری مگر اندر کچھ ہوتا تو سامنے آتا۔ وہ سوچتا رہ گیا کہ
 کالک کے ذوالے اسے کیا جنت منتر سی سرمردانی تھا وہی ہے جس میں سرمرد کا جمل تو نظر نہ آوے پر جب سلائی

پھیر لو تو آنکھیں سیاحی سے پاتی جائیں۔ پھر کافی گھنٹا کی طرح نوب برس کر خود مکمل بھی جائیں۔ اس دوران ادھر بھی گیا ہو سکتا ہے کہ اس کی کاٹھ یا سرچھو میں کوئی چپکنا رہو۔ اس رات اس نے پھر ایک ایک ملائی آنکھوں میں پھیر لی تھی۔ نتیجہ وہی کہ صبح آنکھیں کا جمل کوٹھڑی بنی ہو گئیں۔ دو چار روز بعد اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ جب سے اس نے یہ سرمہ دانی استعمال کرنی شروع کی ہے تب سے اسے ایک خوشگوار تسخکی اور تراوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ دل و مانع جیسے روشن روشن رہنے لگے ہوں۔ سنے بھی سہانے آنے لگے تھے۔ گویا یہ چارویں سرمہ دانی اس کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔

سفیروں بانی کے بعد اگر اسے کسی کی چٹنگی رہتی تو وہ یہی غرور دانی تھی جسے وہ بڑی حفاظت اور محبت سے خوشبودار روٹی میں لپیٹ لپات کر خلو کے کی اندرونی جیب میں ڈالے رکھتا تھا۔

انہی دنوں وہ جمعرات کے ایک خاص اہتمام سے بابا بانی شاہ کے حوالہ پر پہنچا کہ مجذوب بابا کے چرنوں میں بیٹھے گا۔ دو اپنے ساتھ کچھ مکھانیاں بھی لیتا گیا تھا مگر وہاں امتحان خالی تھا۔ تو کب پاس سے پتا چلا کہ بابا بانی کے تانے بچنے لگے کی مانند کہیں سے آیا تھا اور پھر جانے کب آنے لگی۔ حضور کی صورت سے نہی غائب ہو گیا۔

UrduPhoto.com

جو خواہاں ہو، اب لڑنے والی کی اہمیت اور فضا بحث کی خاطر اس کی مازگ سی گویاں میں چاندی کی رنجہ والی وی اسی زنجیر پہلے سے خال اور کن کھڑوتی کی سلاخیاں بندھی ہوئی تھیں اور یہ میں سینے پہ دل کے جگہ لٹکی رہتی تھی۔ اب رات کا بیٹھنے سے آنکھوں میں سلاخی پھیرنا اور ان کی ہلکی ہلکی ہن چکا تھا۔ آنکھوں میں جوت ہکا کر رات بھر خوب مزے مزے کے پسند دیکھنا، اب تو آگنا سامنے کرنے والوں نے بھی اس کی آنکھوں کی کالک پہ بات کرنی چھوڑ دی تھی۔

ایک دوپہر کڑا کے کی گری اور لوہا پس رہی تھی۔ کوٹھے اور کونجروں کے مین اس سادھے اپنے اپنے اپنے لکڑیوں میں ڈبکے پڑے تھے۔ ایسے ہی پیشداروں میں انہی کی راتیں جاگتی ہیں وہ دن کے ابالے میں جان عمر و گزرتے ہیں۔ ابابلیوں پر گاروؤں جھنڈکروں اور خون آشاموں کی طرح یہ بھٹے اور رات کو تو اپنی اٹنگ توڑتے ہیں۔ بازوؤں میں گال کی پے ہانڈے وہ بھی اونگ رہا تھا کہ شہنشاہ کی ایک آنکھیں ہر کی طرح لڑاتی ہوئی ایک طائرہ آئی اور بیخام ایسا کہ بالی ہی اس کو یاد کر رہی ہیں۔ ہنر پر آکر اٹھا پوچھنے لگا۔ اس وقت غصے سے تو ہے؟ سوچنے لگا اس دوپہر سے پیشداروں میں فوجی کی بھی ہو جائے تو مینٹ کو شام تک ڈھانپ کر آگے پیچھے پڑے رہتے ہیں کہ آرام اقلولہ میں کھنڈت نہ پڑے۔ وہ مزید جانکاری کے لئے پوچھنے لگا۔

”آخر پہ چلے کر ٹھہرا کیا.....؟“

”وہ لڑک سی ناک ٹکیٹر تے ہوئے ہوئی۔“ لاشمنوں کی طبیعت مامدی ہے۔“

”کچھ منہ سے بھی تو پھوٹو ہوا کیا ہے.....؟“ وہ اٹھتے ہوئے دھاڑا۔

”خود چل کر دیکھ لو۔ صبح سے چھپر کھٹ کی پٹی سے لگی پڑی ہیں۔“

یہ گرم بھاگ پانچا تو دیکھا سفید اں ہائی چٹ پڑی ہے ایک ملازمہ آنکھوں پہ برف کے پونچے سے

کھڑکی ہی تھی۔ آنکھوں کے پٹ پٹے پڑے تھے۔ کالے خان کی آہٹ پا کر کہنے لگی۔

”پٹنیدوں کے پٹھے کھنچے پڑے ہیں۔ آنکھوں کے ڈیلوں میں ڈگل مگل ہو رہی ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آ

ہی کر کیا چٹا پڑی..... کچھ تم ہی اپنی انگلی سے چارہ کرو۔“

کالے خان کیا کہتا..... جان معاذ کو توں کوں سے اسے کیا دھڑلے

پہلے آنکھیں نکا ٹکر ٹکر دیکھتا

یہ کچھ سماعت لے کر دلا۔

”یوہا بکے ہاتھ سے گدی مانتا سہارا دیں.....“

سفید اں ہائی چٹ پڑی تھی۔ کمر سے بدل کر ٹھوٹی۔

”کچھ منہ سے بھی تو پھوٹو ہوا کیا ہے.....؟“ وہ اٹھتے ہوئے دھاڑا۔

”وہ آنکھیں بند کر کے مانتا سہارا دیتے کچھ یاد کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”سفید اں ہائی! امارا جبے گدا دیں۔ منہ سے جھٹ پڑے آنکھیں کھنچیں اس طرح ڈکھی پڑیں تو ماں

کے کمرے چل سے کروں کی رہیں پٹنیاں پچے کر بکے ہاتھ سے ماش کر یا کرتی تھیں پچر گڑی وہ گڑی

تھیں سر نہ لہنے تو سنوں پڑ جاتا تھا۔ اب جھپٹے پچر وار کوئے سے سر کا گدہ پٹنے کو آگیا تھا۔ میا بھر وہاں

تھیں جیسا کہ کھنکھیر کر تھیں۔ پس باوا کی سرمدانی سے سر پچو کھینچا اور آنکھوں سے چھو لیا تھا۔“

”سر پچو کا سر منہ لے اور ڈیل کی ڈکھن سے کیسا سبب نہ..... کالے خان؟“ سفید اں ہائی نے

سچیں پیچے پیچے اوہتے ہوئے انتظار کیا تھا۔

”کیونکہ تو نہیں جانوں۔ چٹو اتنا پتہ ہے کہ سرمدانی اور سر پچو بھی سر سے شروع ہوتے

ہیں۔ جیسے عقیقت تین ڈال کی ٹکھٹے کو کوں سروں کی کوئے شانت کر دیتی ہے۔ پٹے ہی میرے بابا کی سرمدانی

تھی میری شہزادی سرگردانی کو سرد کر دیتی ہے۔“

آنکھیں جھپٹتے ہوئے سفید اں ہائی ٹکے چھوڑ کر اٹھ بیٹھی۔ عجیب عجیب نظروں سے اسے تو لے

انہی کی قسمت کی قسمت کے سفر کے بعد شری گمر بس ٹرمینل پہنچ کر جو ایک گونہ سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ صاحبِ نگاہ ہی نشہ ہوتا ہے۔ شری گمر ڈل روڈ، گلبرگ، نیشنل کھس، شری گمر مارگ، ویلی روڈ، فیروزہ اور خاص طور پر پشاور میں پرانی ریت اقامت گاہوں کے علاوہ ادنیٰ اور اعلیٰ اقسام کے ہوٹلوں، مولوں، ہاٹوں اور فیسٹوں کی آمد کی نہیں۔ قمری نور خانو سٹار ہوٹلوں، گلڈیز فلینٹر اور وی آئی بی ہس کی ایسی بہتات کم از کم ہندوستان میں نہیں کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ یہ بڑے آسائش، شامانہ اور انتہائی مہنگی قیام گاہیں مجھ ایسے عام سیر پالنے کے طبقے کے قیام کی جگہیں نہیں..... یہاں تو بڑے بڑے کاروباری لوگ، غیر ملکی سیاح، فلم سے راہنی سون کے پتہ سس، بڑے نوڈولیتے جوڑے یا پھر وہ چھیدہ لوگ جن کے ہاں کالے دھن کی کمی نہیں ہوتی۔ میری عجیبیت کے لوگ دھرم شالوں، سراؤں اور پرائیویٹ بھنوں بازوں یعنی چارپائی ہوٹلوں میں آسرا لے لیتے ہیں۔ ان کے کرائے مصارف نہ ہوتے بڑے بڑے ہیں۔ یہاں کھانا مقامی غریب لوگ اپنے گھروں کے کھانے سے کھتوں اور کچھتوں کے فالٹو جیسے بھی کرائے پا اٹھا دیتے ہیں۔ ڈل کے پانچویں میں حیرتی ہوئی چھوٹی سی کھیتیں، کھیتیں چند دنوں یا پھر بے یزوں کے لئے بھی دستیاب ہو جاتی ہیں۔ یعنی یہ سب کچھ بندے کی قسمت ہے اور قسمت یہ موقوف ہوتا ہے۔

UrduPhoto.com

کڑی میں اچھی خاصی واقفیت کے باوجود میں اپنے قیام کے لئے موسم اور استطاعتِ ذہنی کے لحاظ سے فیصلہ کرتا ہوں۔ دوستوں کے ہاں اس لئے قیام نہیں کرتا کہ یہ خاصا مہنگا اور بے آزار پڑتا ہے۔ یہ بھی آزادی کے آڑے پہلے میڈانی شہروں اور غریب کی طرح دکھائش کے مادی لوگوں کے لئے نہیں ہے۔ وہاں ہاش اپنا بڑا مشکل کام ہے۔ موٹی، مہتر افغانی اور محاشی بھجوریوں کی بنا پر کشمیری لوگ بڑے بڑے تھے۔ انہوں نے دھارم کے ماحول میں رہنے کے مادی ہوتے ہیں۔ ان کے قسمت خائے مال خائے قسمت خائے بستی کی جھبیں کشادہ خاطر کی مظہر نہیں ہوتیں۔ خاص طور پر موسم سرما برف باری کے موسم میں تو سانس لینے کے لئے بھی یہ نمہ باز نہیں نکالتے۔ کمروں والاٹوں میں آگ کے الاٹا ٹرولوں کے لئے کھلی ہوئی کھنکیاں، ٹراٹز کرتے کھنکیوں کی پھواریاں بھرتے ہوئے جھٹے۔ کھنکیوں کی آپس میں لگرائی ہوئی کھنکیاں پھواریوں پر چڑھے گھنٹا بول اور پھولوں کے دیگیوں سے خارج ہوتی ہوئی بھاٹیں ایسا جیس دم پیدا کرتے ہیں کہ انسان ٹچل ٹچل نہرل سا ہو جاتا ہے۔

شری گمر میں کھنگی کم اور تری زیادہ ہے۔ ملت کش لوگ اکثر چھوٹے چھوٹے گھوٹلا نما کھڑکی کے کھنکیوں کی مانند رہتے ہیں۔ جبکہ دو تہائی آبادی کی سکونت ڈل کے پانچوں اور پہاڑوں کی اونچی

واحد روزہ اکثر بندھی دکھائی پڑا۔ دنیا کے ہنگاموں سے دور ہر چیز سے بیگانہ یہ دیوانہ نہ تو کسی سے بات چیت کرتا اور نہ ہی کسی سے کچھ مانگتا یا کھاتا پیتا دکھائی دیا۔ کہاں سے آیا کون ہے اس کا دین و حرم کیا ہے یہ بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔۔۔ بس کہیں سے کبھی ادھر آیا۔ کشتی کرائے پہ لی لائسنس کی فیس جمع کرائی۔ ٹھیکیدار کا بھٹہ بھرا اور منہ سر ڈال کر ڈل میں پڑ گیا۔

اس کشتی کا کوئی گھوڑا بھی تو نہ تھا۔ ہوا کا جدھر رخ ہوتا ادھر کو ہولیتی۔ جس ریوڑ کا کوئی رکھوالا اور جس عورت کا کوئی گھر والا اور جس چنگ کی ڈور کسی کے ہاتھوں نہ ہو اور ایسی کشتی جس کا کوئی ناخدا نہ اتر ہو اس کا شاید پھر خدا ہی حافظ ہوتا ہے جدھر چل پڑی ادھر چلی گئی اور جہاں رک گئی وہیں اٹک پڑی۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ ڈل بھر میں یہ کستور اچھلی کی مانند لہر لہر موج موج ٹوٹتی پھرتی۔ سونا گھاتے مغل کارڈن پولا اور شہنشاہی حضرت علی اور دیکھائی دیتی پولا اور سب سب ہی مغل خاندان کے گھات گھات کا پانی اور مائی بیٹی اور چاقی رہتی۔ نہ کبھی کسی نے اس کا شکر ادا کیا نہ کسی نے اسے کہیں گھونٹے پہ بندھلا دیکھا اور نہ کسی کھو جو یا جھانکھنے اندر جھانکھنے کر یہ چہ لگایا کہ اس کے اندر ریشم کپڑے کے خول کی مانند بندھے ہیں کچھ اسیٹا ہے یا کوئی خوش۔ دیکھو وہ ہے یا نہ جھک چکا ہے۔ اسے خوش کہتے ہیں کہ اسے کھتے ہیں۔ اس کا انسان تو انسان کوئی کلام نہ مانی سکتا۔ اس کا یہ چہ لگتا ہے۔ اس کا یہ لہجہ کیا ہے۔ اس کے کلاموں میں کتنی باتیں ہیں۔ اس کے ہاتھوں پہ کتنی باتیں ہیں۔ اس کے منہ سے کتنی باتیں نکلتی ہیں۔ اس کی نشست اور اٹھنا بیٹھنا سے ایسا جان بوجھتا ہے ادھر کشتی میں کوئی برکزیہ و سافٹویر ایچ ایس او بیس اس کی قیادت پر آئے ہوئے ہوں۔

یہ سب کچھ مجھے جانتا تھا۔ صاحب کشتیوں والوں کے منہ سے معلوم ہوا تھا۔

کشتی کو زیادہ گھنٹے سے اس پناہ گاہ کشتی کے بارے میں مجھے معلومات بہم پہنچا رہا تھا اور میں اپنی برعادت سے مجبور اس کی داستان طرزی پر پھرے پھرے بیان دہیان دہرے آنکھیں پھیلائے سن رہا تھا کیونکہ اس کے علاوہ میرے پاس وقت گزاری کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اس کے کارندے چھتر گام کے گھات گورام سے یہ نادرہ کار کشتی پھینکے گئے ہوئے تھے۔ کشتی کو دارا ورمہ نے بیٹے کی خاطر میں نے پونہ پوچھ لیا۔

”کشتی ان عامل صاحب کا کیا ہو گیا الہوں نے یہ کشتی کچھ ہی دنوں کا دیہانت ہو گیا۔“

”عالم صاحب نے کشمیری کوئی بھٹے کے ایک بھر پور کس کا ذوالاں اٹکنے کے بعد کھالتے ہوئے بھٹلی کہا۔“

”خان صاحب ایہ سا صاحب سنئے عامل جا مل قبیل کی چیزیں دیہانت دیہانت سے بیچتا کہیں چھوڑتیں۔ مرگ فوت تو خود ان سے شکل بچھپاتی پھرتی ہے۔ بس یہ لوگ اچانک کہیں ایسے غم مضم ہو جاتے

تھیں کہ ان کے ہاتھ میں کھنکھناتے ہوئے پتھر یا آکاش کی سیدھا اڑ جاتے ہیں بس ایسا ہی کچھ
 ہوتا تھا کہ اس کے حامل صاحب کے ساتھ بھی ہوا۔ دو چار ہی لوگ ہوں گے جنہوں نے اس حامل صاحب کی صورت یا
 شکل دیکھی ہوگی۔ بس سب یہی قیاس کریں کہ کوئی تھنوی ہے جو کسی قیسیا جو کھم میں جکڑا ہوا تھا۔ اسی کارن کوئی
 صاحب نے اسے دیا تھا۔۔۔ اتنا کہہ چکے کے بعد شیخ صاحب اپنی حسب عادت یا ضرورت پھر نچنے پہ ٹھک

پھر ان اور خیمہ یوں میں یہ عادت یا ہلت ہے کہ وہ نونی نچنے یا سوار کے بغیر قھوک بھی نہیں
 سکتے۔ اسے گئے کی توضیح ہو شاوی مرگ یا گھر یو دریلو مشاورت بھٹو فیصلہ یا مصالحت۔۔۔ ان کی نچنے
 کی عادت نہیں بنتی۔

میں نے ان کے خیمہ طوقان سے اپنی طلب کرتے ہوئے میں نے پھر قہرأت کرتے ہوئے پوچھا۔

”صاحب پھر۔۔۔“

”اب نے اپنی دھنلی رحالی آستیں سے نکلیں اور ناک بیک وقت صاف کر کے ہوئے کہا۔

وہی پھر یہی چڑیا اڑی ہوئی تھی۔ کئی برس سے ناک پر کچھ نہ کچھ لگے تھے۔

”اب نے اپنی دھنلی رحالی آستیں سے نکلیں اور ناک بیک وقت صاف کر کے ہوئے کہا۔

وہی پھر یہی چڑیا اڑی ہوئی تھی۔ کئی برس سے ناک پر کچھ نہ کچھ لگے تھے۔

”اب نے اپنی دھنلی رحالی آستیں سے نکلیں اور ناک بیک وقت صاف کر کے ہوئے کہا۔

وہی پھر یہی چڑیا اڑی ہوئی تھی۔ کئی برس سے ناک پر کچھ نہ کچھ لگے تھے۔

”اب نے اپنی دھنلی رحالی آستیں سے نکلیں اور ناک بیک وقت صاف کر کے ہوئے کہا۔

وہی پھر یہی چڑیا اڑی ہوئی تھی۔ کئی برس سے ناک پر کچھ نہ کچھ لگے تھے۔

”اب نے اپنی دھنلی رحالی آستیں سے نکلیں اور ناک بیک وقت صاف کر کے ہوئے کہا۔

وہی پھر یہی چڑیا اڑی ہوئی تھی۔ کئی برس سے ناک پر کچھ نہ کچھ لگے تھے۔

”اب نے اپنی دھنلی رحالی آستیں سے نکلیں اور ناک بیک وقت صاف کر کے ہوئے کہا۔

وہی پھر یہی چڑیا اڑی ہوئی تھی۔ کئی برس سے ناک پر کچھ نہ کچھ لگے تھے۔

”اب نے اپنی دھنلی رحالی آستیں سے نکلیں اور ناک بیک وقت صاف کر کے ہوئے کہا۔

وہی پھر یہی چڑیا اڑی ہوئی تھی۔ کئی برس سے ناک پر کچھ نہ کچھ لگے تھے۔

میری بد قسمتی کہ حافظ صاحب مجھے بھی کچھ ایسی قبیل کی چیز سمجھتے تھے اور جانتے بھی تھے کہ میں اس
اللہ ماری قسم کی کوئی کشتی لے کر غصوں وال میں پڑا رہتا ہوں۔ میری صورت میں انہیں اس سبب دودھ نہ تھا
بے شک وہ نام کشتی کا ایک معقول گراہ دار دوسرے لفظوں میں ایک کاغذ کا ٹوٹل گیا۔ جو پلے سے پیسے خرچ کر
اس پاپن کے پاپ دھونے خود ہی نکلی آیا تھا اور ابھر میں دلی ہی دلی میں خوشی کہ قسمت سے مجھے اس
نادر روزگار کشتی مل گئی جس کے قریب کوئی نہیں پہنکتا اور جو ٹوٹل کوڑاں کا مسکن ہے۔ جس کا قہر ناقہ
سے نکالا اور اندر کالا اثاثہ کالا ہے اور جس پر کسی چٹائی کا انتہ ہوا ہے۔ سبحان اللہ ایسی بھاگوان کشتی اس کے
لئے مجھے اگر ہزار روپے روز بھی کمرانے کی مد میں ادا کونسے پڑتے تو میں بخوشی ادا کرتا۔ لیکن یہ مجھے قریب
قریب مفت پڑی تھی یعنی کل پچیس روپے چاہے میں دو دن استعمال میں لاؤں یا دو ہفتے۔

ان ہی باتوں میں دو اڑھائی گھنٹے گزر گئے تب کہیں جا کر اس کشتی کی حکومت دکھائی دی۔ کشتی و کجور
میرا ہی ہاتھ کرنے لگا۔ جب سوختہ سڑکی کی کشتی تھی اور جہاز ہوا تو رفتی روپ رہتا ہے کل ہالے تو ہے
ہوئے کچھ دیکھ کر کشتی چلنے والی بدلتی ہے۔ یہ کشتی ہالے ہالے ہوتی ہے۔ یہ کشتی ہالے ہالے ہوتی ہے۔ یہ کشتی
دیکھنے سے میں نے ایسی ہی بدلتی دیکھی ہے۔ ہالے ہالے ہوتی ہے۔ یہ کشتی ہالے ہالے ہوتی ہے۔ یہ کشتی
دیکھ کر کشتی کے حسیٹ کر سندھ سے باہر کرتے ہیں۔ وہ اسے ہلکا فاسٹ پر رکھتے ہوئے تھے۔ کشتی
اسے تھلا دیا اور ٹوہیکہ کر لائے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اس پر سوار نہ ہوئے بلکہ اسے ایک پائٹ کشتی
کے جیکے ہاتھ کر لائے تھے۔ یہ کشتی ہالے ہالے ہوتی ہے۔ یہ کشتی ہالے ہالے ہوتی ہے۔ یہ کشتی
مجھے اس کے نمبر ہاون کی پرستی اور پیمائش کا یہ لگے ہاتھوں سامان اٹھائے جب میں اس پر سوار ہونے کا
وہ دہائی گھنٹوں کی ماحول میں مہمانے لگے۔ مجھے احساس ہوا کہ انہیں اس کشتی پر سوار ہونے میں تاخیر ہے۔
کچھ مچے تھے اندر سے سمجھ گئے ہیں۔ میں نے انہیں ہلکا ہلکا جاری سے کہہ دیا کہ دیکھو انہی کو کھینچو
جھپٹتے ہوئے میں اس پر سوار ہو گیا پھر ہارون صاحب کھات کے چوٹی ستون کو دھکا دے کشتی کو ڈال کے حوالے
دیا۔ پوٹھی کنارے پر نظر پڑی تو دیکھ کہ وہ کشتی مجھے دم بھری ٹکروں سے رنج و بے تھے جیسے کالے پانی جو بے
دالوں کے بہاؤ کو پہنچی ہی پورے پہنچی وہاں کے فنی خدا بھی دیکھ کر تے تھے۔ کنارے کی جانب سے کشتی
ہوئی لہروں نے جست کی جست مجھے غاصا اور گروا تھا۔ کنارے دیکھ کر اسے کھارے کو اس وقت تک کہ
کرتے ہیں جب تک وہ ان کی لگا ہوں سے اگھل نہ ہو جائے۔ یہ شعوری طور پر پھر جو میری نگاہ کھارے
جانب انہیں تو شیخ صاحب اپنے پہلی منزل والے دفتر کی کھڑکی سے سنوٹی لہجے کا ڈھواں باہر خارج کرتے

میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی آواز پہ جھپک کہتے ہوئے باقی کونوں نے بھی کانیں کانیں کا شور شروع کر دیا تھا۔ کانوں کے پردے پہننے لگے تو میں نے اپنا تھپا گھسیٹے ہوئے بھیلے پت کو دھکیل کر فٹے کے اندر چھلانگ لگا دی۔ ٹھپ اندھیرے میں میں نے ہاتھوں سے اپنے ارد گرد ڈھونڈنا شروع کیا۔ کھردرے پتھوں کی چٹائی میرے نیچے تھی یا پھر چوٹی پہنچے جن پہ نمی اور ٹھنکن کی وجہ سے نرم نرم بدبودار کچھوندی سی جلی محسوس ہوتی۔ قبر نما یہ چھوٹا سا قلعہ میں کشتی کے درمیان بنا ہوا تھا۔ اونچائی ایسی کہ عام قدم کا آدمی بھی سیدھا کھڑا نہ ہو پائے۔ لیکن تو پورے پاؤں پہاڑ سے نہ جاوے تو وزن اور نہ کوئی درپچ کھڑکی۔ ہاں اوپر فٹے کے ایک دودھسلا ہوا تھا ایسا کہ قدم سے ہوا داخل ہونا چاہئے تو داخل ہو جائے پر روشنی کی کوئی کرن ٹھہرنے نہ پائے۔

پہنچا اچھی طرح سمجھنے سے کوئوں کی کاں کاں سے قدرے نجات ملی..... میں بھی آنکھیں منوٹے سے پڑھا گیا کہ اس کے علاوہ اندھ کوئی چارہ نہ تھا۔ طبیعت بوجھل پیٹ ستانی باہر باد و باران، خونخاک قسم کے پڑا سراسر کوئوں کی بلخاں اور پھر رات سر پہ آس پاس بندہ بندے کی ذات قسم والا نے قسم کہ باہر ارد گرد منظر اور جگہ پیکشن کی کہ جو پہلے دل کے حوالے سے کسی دیکھی نہ تھی۔ جیسے کشتی خود بخود بہتے بہتے کسی نہ پڑا سراسر جگہ کی کہ جو کسی کی نظر میں نہیں تھی۔

UrduPhoto.com

ہر ایک کے لئے اسے میں فوجوں کی کمرچ جو پہنچا ہوتے ہیں۔ ان میں جنگ کے اور پانچ بخش آئے ہیں۔
پانچویں حالات میں اللہ ضرورت کی ہر تباہیہ چیز مناسب مقدار میں موجود ہوتی ہے۔ ایسے ہی حال مست سیر
آوارہ گرد جن کی زندگی صبح کھٹکنا، شام کھٹکنا، پتہ نہ ملنے کا غم، غم کی بجائے اندر ایک چٹخا
ہے۔ جس میں نور اک، اوالاں، انم، نظم کی بجائے صبر، برداشت، بے غوفی، معاملات و حالات سے بے
اور اک، خیال، سہی اور فصل میں توانائی و توازن اور یہ جزو ایمان کو اللہ کے سوا کوئی غالب نہیں۔ آگ
پانی، آتش، ہونٹے، تاریکی، مویا، روشنی، دشمن، مویا، دوست، امن، ہو یا جنگ۔ درویش تک نہیں ہوتا۔ گھنٹہ
آزاد گیوں، چاروں، تکیوں، مخالفتوں میں وہ اور سوا ہو جاتا ہے۔ بدتر سے بدترین حالات میں
آسودہ نظر اور کشادہ خاطر رہتا ہے۔ گھنا، لوپ، اندھیرا، تو اس کی پیشانی کا چراغ ہو، دینے لگتا ہے اس
آنکھوں سے شے کی جواا، پست پاتی ہے۔ درویش کے پاس شش بہت کی مانند چھ مسکین تو ہوتی ہی ہیں
گھر ایک ساتویں بھی ہوتی ہے۔ صحرانوں و شہروں، گز، اریالوں کے لئے کسی طرح پہ پہ تیار کی گئی کار یاں فوج
دارانیو ہوتی ہیں۔ ان کے پیچھے بھاری کاخ، مضبوط چوڑے اور گہرے کھانچوں والے ہوتے ہیں۔
گلزوں میں رچوڑیں اور فارورڈ کے لئے کشش گیر ہوتے ہیں۔ ان کے آگے پیچھے قاضی پانی اور ایندھن

سوچا نہیں اور آج بھی رستوں کی چرخیاں لگی ہوئی ہیں۔

حیروہ فرودیش کے ساتھ بھی اسی نوع کا بہت سا سامان لگا ہوتا ہے۔ یہ بھی فور وائیل ڈرائیو کی طرح
فرار سے فرادائیو ہوتا ہے۔ اس کے بھی پاؤں پکے مضبوط اور نیچے کی مٹی نہ چھوڑنے والے ہوتے ہیں۔
کے پیچھے رکھنے کی تیز نگاہ آنکھوں میں فاضل پانی کی ٹنکیاں اللہ کے خوف کا ایہد صحن اور ازلی وابدگی جانب
حق کے پیش گیر ہوتے ہیں۔ انہیں بھی صبر و جہر کے دشت تجمل و زرد باری کے سحر آؤں حق و حقیقت کے
سچے سچے پہاڑوں اور غم و اندوہ مصائب و آلام طینے و تشنیع کی والدوں سے سرخروئی کے ساتھ گزرنے کے
بے حس و محسوس طور پر تیار کیا جاتا ہے۔

ہاں! افسوس کی مانند لہر اگر دوڑی ہے۔۔۔ کہنا مقصود تھا کہ اس جگہ دس ایک تینے سے سر دست نجات
لائی۔ سارے سامنے نہیں تھا۔ مگر ایسے موقعوں پہ آگے کے لئے میرے پاس ایک پشیل گیسر موجود ہوتا ہے۔
اس کا کچھ ڈاکر میں نے اندر کی جگہ کا گیسر بدل دیا۔

UrduPhoto.com

یہ تحریرات اور توفیق کی رحمت

[illegible]

ایسے ہی ممکن کے طور و سندر میں سکوت اور آواز تو سحر و سستی کا ہوا، نیم ہاراں کے چھینٹے، جھلکے جھلکے
 جتنی ہوئی کشتیاں پر غلوں کی جھلکیں سیٹیاں ٹکرائیں سب یکساں ہوا گیا۔ آقا و عاشق کے خیمے اور
 سحر کی بات و قات نے مجھے چاروں آواز اپنی اصحاب میں لے لیا تھا۔ بے خبری کی ایک ساعت ہو
 سہمی فی الجملہ ایک ہی مستوں میں ہی ہے۔ سنے کچھ انگڑائیاں توڑی ہوں گی کہ وحش سے کوئی
 پتھر لہاسی پتھر ہانگوں سے پھینکتی ہوئی میرے قریب آگئی۔ گئی آنکھ الگ ہوئی جبکہ کچھ اندھیرے سے
 کچھ نکلا سالی بڑھ گئی تھی۔ نیم اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر ٹٹا تو آواز چھ ہاتھ لہائی چڑائی میں کلڑی کا کوئی

وہ اڑھائی انچ موٹا گھڑا جس کے درمیان اچھا والا ملائم سا پتھر سجھائی پڑا۔ کچھ کچھ نہ آیا تو مزید جاننے کی خاطر اس کے قریب کرنا چاہا تو کھٹ سے میرے گتے میں پڑی ہوئی پتھروں کی مالا اس سے چمٹ گئی۔ وہ گتے یوں کہ سلجھ دے گرتے ہوئے بھی نہ بنی۔ فوراً جو بات کچھ میں آئی کہ مالا میں سنگ حدید کا لاکٹ کھڑی کے بازے پتھر سے منجھوا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ یہ پتھر بھی آہن زبا نوع ہے اس کی قسم معلوم کرنے کے لئے میں نے اس سے مزید ذرا آزمائی کی اس سے ظاہر ہوا کہ یہ طوبی سنگ حدید ہے جو دنیا کا سب سے معتبر اور زبردست توجہ کی کشش رکھنے والا پتھر ہوتا ہے اور جس کو آپ از قسم آہن بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ اپنے حجم کے مطابق قریب اور بہت دور تک اپنی جانب کھینچنے اور توجہ کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ اس بات کو اس طرح سے سمجھا جاسکتا ہے کہ رات کے وقت کسی تالاب کے کنارے طوبی سنگ حدید کا ایک ٹکڑا کھودیں اور دوسرے کنارے ایک خالی ماچس کی ڈال چھائی پتھر سے کچھ دھڑکا لیں۔ چھوٹا ٹکڑا چپکا کر پانی میں پھول دیں سوچ دیکھیں کہ وہ دنیا دوسرے کنارے طوبی سنگ حدید کے سامنے کھڑی ہوگی۔ میرا مشاہدہ اور تجربہ بتاتا ہے کہ اس طبعی پتھر کے متعلق بہت سی باتیں کی ترتیب انہیں سے آپ یہ سب قریب و غریب کام لے سکتے ہیں جو اساطیر الاہمیں ہیں اس کی قوت کشش کے بارے میں واقعات براہین ہیں۔ ان باتوں میں جس میں آپ کو اور میں اور دوسرے عالموں کی باتیں ہیں ان کے بارے میں اور کئی باتیں ہیں۔ اس پتھر کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے جو کچھ چاہیں گے وہ اس کے پاس ہوتا ہے۔ آج کی سائنس انیلانوی بھی اسے صحیح طرح سے سمجھنے سے قاصر ہے۔

یہ پتھر ابھی تک میرے گتے میں ہی ہے۔ اس کے بارے میں کچھ باتیں یہاں تک کہ انہیں میں کو کشش کے باوجود بھی آپ سے مجھو نہ کرے گا تھا۔ اسی دوران میں کہ انہیں بھی کی کڑک سانی دی۔ گتے کے پتے کو ہلکا کرنا کہ باہر تھپکا تو بھی ملکی ہادش بھی ہو۔ یہ بھی تھا کہ تھپی آتا تھپی آتا کہ بھی کی کڑک کے دوران اگر کسی دھڑکے لاکٹ کو پتھر سے الگ کرنا چاہوں تو کر سکتا ہوں اپنے پیٹ میں سے ایسا ہی کیا اور بھی کڑا کڑا کی اور میں نے چلے سے ہاتھ سے لاکٹ کو سنگ آہن کی سے الگ کر دیا۔ یہاں اسی ہاتھوں میں سنگ آہن کا آسانی رہا۔ سے وہی بنیادی تحقق ہے جو مانت ہے کی سنی بڑھائی کا سمندر کی پانی کی شوریدگی اور آفتاب کی تھارت کا معدنیات و نباتات سے ہے۔

فدائیات اور ضیائے سے دلچسپی رکھنے والے اور ہر اسرارِ نبوتِ علوم کے عالم جانتے ہیں کہ نباتات کے کڑکے چاند سورج گرہن ستاروں کے ٹوٹ کر گرنے کے وقت رات کے دوران اور ستارے

”مہاراج! باہر نکلنا چاہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

یوگی کشمکشیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے تھوڑا سا اپنے پاؤں کی جانب کھسک لیا۔ اب ہاتھ اُپر کرتے ہوئے شاید باہر نکلنے کا اشارہ دے رہا تھا۔ میں نے اس کا استخوانی ہاتھ تھام کر اٹھانا چاہا۔

میرے مالک! ایسے ٹھنڈے ہاتھ جیسے برف میں لگے ہوئے ہوں۔ میرے ہاتھوں پہ اُس کی گرفت ایسی پڑی کہ مجھے اپنے ہاتھ جھٹکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ سوکھے سڑے ہاتھ جیسے آہنی پنچے ہوں۔ میں انہیں چھڑوانا بھی چاہتا تو شاید ایسا نہ کر سکتا۔ اپنی ٹانگوں اور کمر پہ زور ڈالتے ہوئے میں نے اُسے باہر یوں کھینچ نکالا جیسے کفن چور پوری قبر کھولے بغیر توڑی گردن جتنے سوراخ سے مُردے کا پورا کفن کھینچ باہر کرتے ہیں۔ اِس دوران باہر کا موسم بھی جیسے کچھ معتدل سا ہو گیا تھا۔ صبح کے طلحے سے آجائے میں اب اندر باہر کچھ کچھ واضح غیر واضح سا دکھائی دینے لگا تھا۔

میرے اُٹھانے کیا؟ کالا بھنگ مرلے سا یوگی سر تا پا الف نگا آکے پیچھے کے ستر پہ پرانے چھترے سے نئی ہوئی پانی کے بالشت بھر کپڑے کی تھعلکی۔ پورا جسم بہ ہمدرد کالے چمکے کپڑے سے لپیٹا ہوا۔ یوں لگا جیسے پانڈوں کے ہتھوڑوں کے دریافت ہونے والے انھسی شہر کے ننگے۔ میں نے کئی چھترے گام سے پکڑ کر باہر نکال دیا۔ پھر یہ دیکھ کر کہ کپڑے کے اندر میں فریٹ چھترے اور ہاتھ اُٹھانے والے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بابائے سُر سے لیتے ہوئے مجھے بڑی دُعا مان سے کہا۔

”بچو! نیچے چھاگل میں گج کل پڑا ہے کچھ بوندیں میرے مُنہ میں نکل رہی ہیں۔“
پن نارنج سے نیچے چھاگل میں تیرتی ہوئی نھرا آئی۔ ہاتھ جو حاکر باہر نکالی خشک اونچا کدو کی چھاگل کا مُنہ بھیجی کے نیچے سے بند تھا۔ ڈاٹ نکال کر چند قطرے پانی یوگی کے مُنہ میں پکاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے ادھر سے نکل لینا چاہئے۔ بدبو سے میرا داغ خراب ہو رہا تھا۔ پانی پیا کر یوگی نے جیسے آندھے آنکھیں بھیجی تھیں۔ اب میں نے تھوڑا جس میں ملوثی تھا لیٹیں کا کدو اُسے جو دھوا آئی کہ باہر نکلنے کا سوچا ہی تھا کہ یوگی نے جیسے ارادہ بھانپ لیا۔ ”اب آکھیں کھولے اس نے میرے پاؤں پہ اچھا لڑونا سا ہاتھ دھر دیا۔“

”بچو! اب جب تم نے میری تیریا میں ٹھنڈت ڈال دیا ہے تو اب مجھے یہاں سے نکال کر باہر بھیج دیا۔“
میں تیریا کا کام ہے۔ ڈال چلی سے مجھے نشان کراؤ۔ پھر چل پان کراؤ۔ یہی ہے کامان ہے۔“
مرتا کیا نہ کرتا۔ شتم پشتم بابا کے نیچے سریر کو چٹائی پہ کروت کے مل ڈال کر تھوٹ باہر بٹھنے کے چوڑے پہ رکھ دیا۔ موسم اچھا خاصا کھل چکا تھا۔ بلکہ بلکہ آجائے میں قریب و جوار کچھ دیکھا جا سکتا تھا۔

پانی میں ڈوبا ہوا تھا لہذا دیا۔ اب میں وہی یکن کا ڈبا اٹھائے پھر کشتی میں کود گیا۔ جہاں تیس وہاں ستیا تیس نہیں نے دستی طور پر خود کو لہرے ہونے یوگی کے اشنان کے لئے تیار کر لیا تھا۔ غرووں کو غسلائے کفنانے سر قبر میں ڈبانے کا مجھے ویسے بھی بڑا تجربہ تھا کئی قبریں کھودی تیار کیا۔ اندر لیٹ کر اوپر زور دکھائی دینے والے آسمان کو دیکھا۔ خود کو مرنے تصور کر کے قبر میں فرشتوں سے سوال و جواب کے لئے یعنی مراقبہ الموت اور مراقبہ القبر کے بہت سے تجربے مشاہدے کئے۔ بچوں انسانوں نیکو لوں خوارہشتوں اور الودن سے کئی بار واسطہ پڑا۔ یہ یوگی کیا چیز تھا جو میں کسی تذبذب میں پڑتا باقی رہی گندگی ہیرا اور کراہت تو یہ سب کچھ انسان کے اندر بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ فرق صرف ایسا کہ یہ کچھ دوسرے کا تو دکھائی دیتا ہے خود میں نظر نہیں آتا۔ اگر نظر آتا بھی ہے تو اس پر دھیان نہیں دیا جاتا۔

صبح کا آجالا کچھ اور اٹھا آ تھا میں یوگی پختہ تھا یہ عوام میں بیوسیدہ سامنے عالم سے ہاتھ پر پڑا تھا کہ جیسے ارحمی سجانے سے پہلے پہلے اپنے غرووں کو مرن تھتے پہ کو کر کرم کر لے ہیں۔ غیب میں ڈبے میں پانی بھر کر لاد رہا ہوں یوگی آگے بڑھتی ہے خوب اشنان کے مزے لوٹ رہا ہے۔ نہیں فرما لے ہوئے جب کچھ صاف ہوا تو انکشاف ہوا کہ اس کی کمر بیٹھ چڑیاں اور ہارو ہاتھ کشتی کے کچھ میں ڈبے سے پڑے ہوئے ہیں۔ کمال یہ کہ میں کی مانند ہوں۔ یہ یوگی بڑا ہی دلچسپ ہے۔ اس کے لئے اپنی ایک علی یوگی پہ اہلی تو میں نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا کہتے ہوئے اٹھنے میں دیکھنے کا اشارہ کیا۔ جب دوسری سے بیٹھ چکا اور قدرے کھستہ ہونے کے قابل ہوا تو میں نے کہا۔

”مہاراج! اگر چاہو تو کرم کافی اور خستہ ہونے لگیں، جیسے ہر کسے کسے کر دوں۔“

یوگی نے غور کھٹے کی بجائے کھٹا ہوا چھ کدو سر اٹھات میں ہلایا۔ ”خیر دو دو چھٹی کی تیج کوئی نے کچھ حرویا ہو یا نہیں لیکن اس کے ساتھ لیکن ہسکوں نے اس کے اندر جیسے غوگی کی حرارت پیدا کر دی تھی۔“ محل پاؤں کے بعد یوگی نے خستہ ہونے غروں سے مجھے قہقہے ہونے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ دیا۔ جب میں پاس پہنچا تو کہنے لگا۔

”کچھ اٹھنے میرے دھیان کیوں میں ادیشہ علت ذاتی۔ یہ تو خواہش ہے تیرا کوئی دوش نہیں تیرا حرم دھیان کچھ بھی ہو نہ تو تیرے کام کرم میں دھیرج کدو م ہے۔ پھر آ تیر ہاؤ کے لئے میرے غریب ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے بولا۔

”کلیان ہو پیچھے..... اپنا شیڈ نام بولو.....؟“

”مہاراج! میرا نام گندگی خان ہے۔ میں بہت زور سے یہاں کچھ کھوجنے اور بھونچنے آتا ہوں

یہ سب کچھ کہہ کر مہاراج! اگر مجھے پتہ ہوگا کہ اس چھوٹے پاپ آپ پر حیران نہ اچھڑت ہیں تو میں کبھی اس پاپ کو
 نہ دیکھے گا۔ ”

یونگی نے میرے سر پر پیاز سے ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

”ہلکے ہلکے کام نہ کرنا ہے۔ تراش نہ ہو اور ناچیں نہیں پڑا کر لینا۔ تو نرویش ہے۔
 جیہاڑ میں ایسے ہی پراہیدہ تھا۔ اسی کا زین تو میرے چھوٹے پاپ بچا۔ اچھا اب بولی تو یہ پیام بدن چلا گا ہے
 عرصت ہو“

اُس نے میرے کالے لباس کی طرف کی جانب اشارہ کر کے پوچھا۔

”یہ میرے بابائے پربیا۔ تم تو بات ہو پھر کا ہے کو پچھت ہو۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا ان ہو کیا ان ہو۔“ مجھے ہوئے اس کے پیرا کیسے ہو گئے تھے۔

بابائے پربیا کے موانہ پیاز سے۔

UrduPhoto.com

انہیں سب کچھ کہہ کر میں باؤں میں اتر جاتے ہیں جیسے جگہ خان کر گئے ہوں۔ پاس بیٹھے ہو چکی کے دلی میں
 سوت پیدا ہوئے تھے۔ وہ ان کے ہاتھوں تھنوں کی پھر پڑاوت پڑاوت تھے وہ ان کے سینے پہلی میں
 آتے جاتے سانس کے ذریعہ اس کی نگاہوں سے دیکھتے رہتے ہیں۔ ساتھ ساتھ دل میں ان کی آسانی
 کے لئے آگاہی بھی دیتے رہتے ہیں۔ ”اگر یہ کیا ہے کہ موانہ پاپ اسی قسم کی آگاہی میں کہیں پہاڑی نہ
 بیٹھ جاتے ہیں کہ پھر وہی بھی نہیں آئے مگر یہ بابائے گلی تھنوں والے ہوتے ہیں۔ بہت کچھ دیکھیں
 سوت سوت بابائے پربیا کیسے بیٹھ گئے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کبھی بیٹھنے لگیں گے ہیں۔ بلکہ یہ تو میں
 کہہ کر دیکھ رہی میں نکالتے ہوئے موانہ پیاز کے ذریعہ کیسے کے لئے بھانکا لگاتے ہیں۔“

جس جگہ کنارے دار اچھا تھا۔ خدا جانے یہ کون سا مقام تھا۔ میں جمیل کے بچے سے واقف
 تھو یہ جگہ کچھ بڑی دیکھی تھی۔ کنارے پہ اور اور نہ تو کوئی بہت چھوٹا ٹکڑا اور نہ ہی کوئی سرکاری ٹور ازم
 اس کا کوئی بوسہ یا ٹولس دکھائی دیا اور نہ ہی اس کوئی شے تھی جی تو گھائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے
 کچھ بڑے جیسے کسی اور ٹکڑے سے ملتی رہتی تھی۔ سب میری نگاہیں اور آخر پھر پھر نگاہوں اور ان کے
 لئے کھلے مینوں کو کھو جتے لگیں جو شہر یوں کا شہر شوق اور ان کی مصیبت میں رنج و کد ہی کی حیثیت رکھتے

ہیں۔ جن کے بغیر ان کی مرغزار نہ تھی۔ میدان گھمراہ آگنیں اور سورے ہیں۔ مگر یہاں ان کا وجود تک نہ تھا۔ یعنی ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی بظاہر موجود نہیں تھا۔

اپنی ان سوچوں سے دامن چھڑا کر میں نے پلٹ کر یوگی کی طرف دھیان دیا۔ اب یہ آنکھیں کھولے میٹھی میٹھی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“

”بچہ! یہ سنساں مایا ہے سب مالک کے چنکار ہیں۔ تو منش کا یا پرتو کا گالچنا یا ہے۔ چھوٹے واسے جتنی مان غلے کو خیموں سے نکال کے اپنے ہاتھ میں تمام اور مجھے یہیں چھوڑ کر آگے بڑھ چکا ہے۔ امان چاہے نکل۔ پرتو غلے (سنگ آہن ربا) پر نظر رکھ۔ جدھر کا گاڑتے دکھائی پڑیں اور چل پڑ۔“

یہ کچھ کہنے کے بعد وہ پھر کئی کنوین باؤلی میں اتر چکا تھا۔ اس کی بات کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے میں نے جگہ سے ایک دو بار ”مہاراج“ ”مہاراج“ کہتے ہوئے کچھ پوچھنا چاہا۔ مگر وہ تو جیسے پڑا چھوڑ چکا تھا۔ مایا چارہ کچھ چارہ کرنے کے لئے وہاں سے کہیں اور اور نہ ہی مناسب نظر تھا۔

UrduPhoto.com

چھوٹ رہے تھے۔ جیل وال کی سونائیاں اور روپائی ٹاپیاں میری دکان سے جھینٹ لانی کر رہی تھیں۔ کناروں پر قدرتی پھیلنے والی جھالوں کے سرخ پتوں کے ٹپوں کا رنگیں آواز قدرے پرانے کی کا باعث بنا ہوا تھا۔ اس سے مجھے لگتی ہے۔ تاک نہ تھیں وہاں تو کام کی شکایت ہو جاتی ہے۔ پھر دھوپ کے پہلے دھنکے سے یہ نہیں دفع ہو جاتی ہے۔

گھمراہی تو سورج نے منہ ہاتھ بھی نہیں دھو پاتا تھا۔ میں نہ تاک ڈھانچتے ہوئے اپنی عادت کے مطابق دائیں جانب چل دیا۔ غلے یعنی وہ سنساں جیسی پتھر جو کھڑی کے فریم میں جڑا ہوا تھا۔ قہقہے سے نکال کر اپنے سیدھے ہاتھ میں لے لیا۔ پس اسی لمحہ مجھے یاد آیا کہ یوگی نے شاہ کسی کا گوں جانوں کا ذکر بھی کیا تھا کہ جدھر وہ آتے ہوئے دکھائی دے اور نہ ہو لیتا۔ یوگی اچھٹی سی نگاہ اور آسمان کی طرف االی۔ زور اور نیلی پیازتی ہوئی تھروں کی ایک آواز نظر دکھائی پڑی۔ کوئی نہ کوئی کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ چل سچل آگے سامنے ایک اٹھی ہوئی پیازتی پڑ گئی۔ چند جھینے نہکت لینے کے بعد پھر میں حسب عادت دائیں طرف ہ لیا۔ جبکہ بائیں جانب راہ راست بہتر دکھائی دے رہا تھا۔

یہ دائیں طرف والی میری عادت یا میرا طریق بھی اک عجیب سی منطق پر مبنی ہے۔ ویسے بھی تو

سیدہ سلیم بی بی دائیں جانب ہوتی ہے۔ کھانا پینا علیک علیک مصافحہ انگشت شہادت لکھنا لکھنا پڑھنا
 کھانے کے لئے کتاب کے اوراق کھولنا رزق حلال کمانے کے لئے اسی دائیں ہاتھ کا زیادہ استعمال دایاں
 ہاتھ سے بڑھانا نماز میں دائیں جانب اسلام علیکم کہنا۔ نیکیوں لکھنے والا دائیں طرف والا فرشتہ۔ انسانی جسم
 میں دائیں جانب کے اعضاء اعصاب کو بائیں جانب سے بدرجہ فوقیت حاصل ہے۔ سیدہ دائیں ہاتھ بازو اور
 آنکھ پاؤں میں طاقت ہوتی ہے وہ بائیں جانب کو غصہ تک نہیں۔ جو دائیں آنکھ دیکھ سکتی ہے وہ کچھ دوسری
 آنکھ کے سامنے نہیں۔ بھست بھی یہی آنکھ ہاندھتی ہے۔ نکل و نگی کی برداشت کی اہل بھی یہی آنکھ ہو سکتی
 ہے۔ حرکت کو بھی پہلے یہی آنکھ دیکھے گی۔ اس کا پھر کچھ بھی سدور حرکت ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے سب سے پہلے
 دائیں آنکھ فوکس ہوتی ہے۔ سوتے سے بیدار بائیں اور بیدار ہوتے ہوئے پہلے دائیں بھی بائیں آنکھ ہوتی
 ہے۔ لہذا کے لئے قہر دکر اہستہ بائیں آنکھ سے آؤتی ہے اور بائیں آنکھ سے لئے مہر و محبت دائیں میں نہیں کے
 لئے میں سے کی نکل کی مانند فٹکلیں مارتی ہے۔ دھن کے دائیں پاؤں کا گھٹن اور دھن کے دائیں ہاتھ کا
 سب سے دائیں دائیں اور بائیں بازو۔ دائیں چڑکی مٹی۔ خود سے دیکھیں ہر ای کسی چھ حرکت کر سکتا
 ہے۔ سیدہ دائیں جانب ہچکولا کھاتا ہے۔ لہذا دائیں کے ہاتھ دائیں جانب ہچکولا کھاتا ہے۔ دو مقررین
 شہادت دہرائے گئے ہیں۔ سیدہ دائیں ہاتھ کی حرکت دیکھیں۔ سیدہ دائیں ہاتھ کی حرکت دیکھیں۔ سیدہ دائیں ہاتھ کی حرکت دیکھیں۔
 دائیں ہاتھ کی حرکت کو ہمیشہ سیدہ کی طرف کہا جاتا ہے۔ گھڑی کی سوئیوں دائیں جانب حرکت کرتی ہیں۔ فوٹو گراف کے
 شاتر میں دائیں دائیں ہوتی ہے۔ یوم صواب سرکار دہلائے سلم کی شہادت مبارک کرے اے اہل زمین
 سیدہ کی جانب ہوگی۔ پہلی طرف کے دائیں جانب بائیں جتنے ہو گئے ہیں خدا تعالیٰ اس دائیں جانب
 نسبت راقی اور سلاقی ہونے کا ایک قدرتی تصور ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں کے پاس بھی یہی طریقہ دیکھا۔ خصوصاً طور پہ میرے بابا جی نے کمال
 شخصیت سے مجھے ایک بار نصیحت کی تھی کہ کسی بھی شہید و شہیدوار و غیر الجھٹ معاملہ یا کسی دوسرے پہ توقف
 کرنا ہے تو کھڑے آجائے تو دائیں دلو پہ اللہ پہ ہمارے کرتے ہوئے چل پڑو۔ اسی لئے شاید دائیں
 جانب سیدہ ہاتھ کہتے ہیں۔ پھر مجھے میرے بزرگ نے بتایا کہ راقی یعنی دائیں جانب چلنے والے سرخروئی
 سے تھوڑا سا لپٹ کر چلتے ہیں۔ میں نے اپنی ذاتی صحرائوں پہاڑوں پہاڑوں ویاہوں اور ہاتھ بھائی نے
 اپنے دائیں سرخروں میں یہی طریقہ استعمال کیا۔ شہاد یہ ہے کہ انسان دائیں جانب بڑھنے سے پہلے شور
 مٹا کر سیر و زاری میں بھی دے دے۔

سامنے والی چھوٹی سی سرسبز پہاڑی کے نیچے پہنچ کر میں دکھا آنکھیں میچ کر خالی الذہن ہو گیا۔

چند ٹائیٹلز دے ہوں گے کہ مارا غ میں دائیں جانب مراجعت کرنے کا لڑائی نہیں جلتے بھنے لگے۔
جانب کچھ قدم ہی بڑھائے ہوں گے کہ دو پہاڑی کوڑے "کہاں کہاں؟" کہتے ہوئے میرے سر پر سے گزرتے
گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں تنگ سست پہ ہوں۔ خیر جی میزگی راہ والے اس نیم پہاڑی میدان میں یہ
جانب گزار کھلے ہوئے تھے۔ صبح کی ابرا خوشیوں اور ایلینگی نگاہوں نے اصرار میں چٹائی ہوئی تھیں۔... ٹھیکس کھان
میں چاہا خود تروہٹھے اور سٹیل کے مسکراتے ہوئے پھول جنوں نے ابھی ابھی شبنم سے ٹھکڑے دم سے لگے
لہلہاتے شرماتے مجھ سے ہانپیں کرنے لگے۔ اسی سست غزائی میں میں بھٹکتا بھٹکتا کافی آگے نکل گیا۔
راہ پگھلندی جیسے ٹھیلے کی رپ کی مانند فوہ پہ غور ٹھکتی چارہ تھی۔ اب سامنے ایک سیب کا جھار کھڑا تھا۔...
ام نیچے رگ لیا۔ "کہاں کہاں" کی آواز پہ کان کی نوکیں تھر تھرائیں۔ جھیل کی جانب سے تین چار جھول
کوڑے میری جانب پرواز کرتے۔ اسے لکھا تھا "پیر"۔ پھر وہ دیر سے دیکھتے ہی دیکھتے اوپر سے گزر گئے۔
تھیں اور تھلے پھر کو لکھا ہے "میں ابھی اسی جانب چل رہا ہوں۔ ایک دو کوڑی کی ٹکڑیاں اور ابھی میرے
سے گزر گئیں۔" بالکل وہی صورت تھی جیسے صبح صبح کا گھڑ مزدور کسی کارخانے میں آگے بڑھتا جا رہا ہے۔
جی۔... اور سامنے کوئی کارخانہ یا ٹیکری تو نہ تھی البتہ۔... وہی ایسی ہی ہٹان دیکھائی دیتی ہوئی تھی۔

UrduPhoto.com

کا جب تک کہ... فرض میں آگئی کی ٹھکتی ہوئی رپ کے ٹھٹھنے کے ساتھ ساتھ آگے ٹھٹھ رہا تھا۔ ایسے دھڑلے اور ایسی جوش
ابھی کیسے دہستے اور ایسی ہی ہوتی ہیں انہیں تو اختیار کیا جاتا ہے اور نہ ہی مطلب کیا جاتا ہے۔ زبان وہاں
کی قیود نہ اندیشہ نہ وہاں... ہٹان کا یہ رخ اسے اختیار کی شہائی... ہٹان کی طرف سے ہاں اور...
کی مانند سداغ اور وہ... ہٹانوں کی طرف سے شام و صبح۔

ایسے بے اختیار راستوں اور بے طلب مناظروں کے درمیان وہاں مجھے ایسے آئینے سر پہ لگا
اوت پٹا لگایاں ہوتے سکتے ہیں۔

میں کا دھڑلے یہ اٹھتے ہاتھ سورج کی چمکی ٹھکڑے مجھے ہوشیار کیا۔... شرقی کی پہاڑیوں سے
نور کے ڈگنے کا ایک دھارا ماحولیت پر اتھا۔ چشم زباں میں سارا منظر یکسر بدل گیا۔... لہاں کا جیسے...
کی بالائی ہی... دیکھتے ہی دیکھتے اراخیار بن فی سب۔... آسمان کے نیچے دھڑلے پہ بادلوں کی ڈانگیں
و عجب ہنک نے تھارتوں کے سارے رنگ رنگ آجول دیتے تھے۔... ہرقی کو ارگنل کی ہی خوشبو میں...
تھی تھی۔... کہاں کہاں "کہاں کہاں" کی کہانی تھی میرے اوپر سے گزرتی تھی۔...
پرواز کے رخ پہ دیکھا تو ستواں چٹان کے نیچے جھار نہند دکھائی دیتے جس کا درمیانی فاصلہ اب کچھ زیادہ نہیں

گلدھے سواری اور اونٹ اتاری کر لی 'کاڑی' بھانڈا 'سوغند' وغیرہ پہ کوئی مسافر راگیکر جانور 'جن' ہوا اور
 دھوپ بھوک وغیرہ مجھے بلا جلا کر اٹھا دیکھ دیتے ہیں۔ یہاں تو میں کچھلی رات کا دنگا ہوا تھا۔ گت منہ
 میں ایسا لڑھکا کہ کچھ خیر نہ رہی۔ کشمیری ڈل میں ہوں یا دیکھتے ہیں کہ خیر میں خوب گھوڑے بچ کر سویا اور آپ
 جانتے ہیں کہ سویا مرا برابر ہوتا ہے۔

جب دیدوں کے ذرا ہوئے تو دریائے جہلم میں ڈل جھیل کا بہت سا دھوپانی بہہ چکا تھا۔
 "جاگو منو بہن پیارے بہت سو لیئے....."

آواز کی سمت گھومتے ہوئے اٹھ کر دیکھا تو اک زجال سیاہ پوش کشمیری عیا پہنے یوں کھڑا
 جیسے وقت کے سینے پہ گڑا ہوا امر ہو۔ جھکاواں شانوں پہ تسلیم کی تعلیم سے آراستہ دراز گیسو..... کسی اعلیٰ طرف
 کی مانند کشادہ پیشانی جس پہ ہندی کی کمر بزم ہالیاں کی مانند جھمکے روشن زمریدہ آنکھیں۔
 مثل دوشوار برنگ لعل بدکشائیں اس میں گل کون کہ خون بہک کے چھینٹے لیئے ہوں۔ یہ تو بعد میں معلوم
 ہوا کہ اکثر شب زندہ دوار بزرگ حیدر خان سے چمکے رو حاصل کر کے لے ایک خاص کا جمل استعمال کرتے
 ہیں جس کے مکمل استعمال سے آنکھ کے چمکے کھارے سے سرخ رگت ہفتیاں کھاتے ہیں۔ دیکھے
 ماں کو کہیں جانتے ہیں کہ ان کیسے پاس میں

UrduPhoto.com

ان کے نظریں بنائے خیر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ کے اشارے سے سلام بخش کیا۔ ابھی تک
 میری تیرت اور جینے اس کے خواہ چوری طرح بیدار نہیں ہوئے تھے۔ میں جوتھوں کی مانند آنکھیں پھاڑے
 منہ کھولے "تک تک دیرم" کیا ہوا تھا۔ مجھے بالکل حیرت ہوئی کہ اس نے ہاتھ سے میرے پاس آئے۔
 "خوب سوئے..... ہاتھ منہ دھوا..... میں نے تمہارے لئے ناشتہ تیار کیا ہے۔" کہتے ہوئے
 پنہن کی ایک جانب ہو لیئے۔

میں وہیں کھڑا انہیں باتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ ناگاہ مجھے اپنے اوپر سے کیوں کیوں کی آواز
 سنائی دی۔ اوپر دیکھا تو جھانڈوں پہ بہت سے سراوگ کڑے دکھائی دیئے۔ جھٹکے جھٹکے سب دم سے جیسے ہلکے
 پینے جا رہے ہوں۔ مجھے اپنی سواری کی کا احساس دلا کہ وہ پھر جیسے کسی مراقبے میں اتر گئے ہوں۔ یہاں
 قمریاں 'عندرب' 'کوئیں' 'فن' یا پتھر سے چند در ہوں تو ہوں یہ کالے گلوڑوں بے ڈھولوں بے سراوگ کا
 کیا مقام۔ پہلے کشمیری کے گرد بھی جی جی سیاہ زرد رنگ اب ادھر بھی یہ بابائے یوم و سنگ۔ انکا کا ایک
 استہزاسا پھینک کر 'میں' پانی کی ڈاب کی جانب بڑھ آیا۔..... حاجات سے فارغ ہو کر واپس پہنچا تو سیاہ پوش
 نماز والے چوڑے پہ ناشتہ رکھے میزے انتظار میں تھے..... سلام کر کے ادب سے پاس بیٹھ گیا۔

میں نے دیکھا اچانا اور سمجھا کہ ریشمیوں اچالوں اور دھنگ رنگوں کی کوئی الف ہائے شناخت نہیں ہے اور نہ کوئی خوش و خوش اچانا اور تھیرگی سیاہی اور سیاہ بختی کے راستے بند ہوتے ہیں۔ کوچہ قافلہ کے سوا۔ سیاہ بختوں کی صبح امید بھی شام یاس ہوتی ہے۔ گاہے سیاہ پوشوں کے لئے سارے دھنگ رنگ شہ تار کے سنگ ہوتے ہیں۔ تیرہ طراجوں سوچوں والے روشن وقتوں میں بھی شب خیز ہوتے ہیں۔ سائنس نے تو آج اندھیرے اچانے والی بینکین دریافت کی ہیں سائنس تو اپنے لچوٹے دیدوں سے دیکھتے تو اندھروں میں ہیں۔ ان اندھیر اندھوں کو اندھروں میں بہت دور کی سوجھتی ہے۔ یہ دن مردہ دار اور شب زندہ دار ہوتے ہیں۔ ان کی فہمیں منظر و منظر اور دن بھگدن و محسوس۔

”قبوہ کیسا لگا۔۔۔؟“ بابا نے اچانک پوچھا۔

میں تو کہیں اور ہی لوہا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہاتھیاں بالکیاں سوچ رہا تھا۔ اپنے اندر سے ابھر کر بچ کر جواب دیا۔

”بابا! کیا یہ قبوہ ہی تھا؟۔۔۔ ایسی تشفی تسکین اور طمانیت حاصل ہوئی جس کو بچپن کرنا میرے لئے سے باہر ہے مجھے تو یوں محسوس ہوا ہے جیسے میرے جسم و جان اور دل و دماغ کے بخاری بند کھڑکیوں پر دروازے کھل گئے ہوں۔ اور میرے اندر کے ہر شے کی روشنی کی تابانی کی تابانی کی تابانی ہوئی ہوگی۔“

بابا نے بڑی غور و خفا سے جواب دیا۔

”ہاں! کچھ ایسا ہے۔ قبوہ ہے۔ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔“

”کچھ ایسا قبوہ؟۔۔۔ میں نے زریب ڈھرایا۔“ ایسا قبوہ تو میں نے بھی دیکھا تھا یا بیانا تھا۔

بابا نے جیسے میرا دماغ پڑا لیا تھا بولے۔

”دماغ پہ ہاتھ ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ میرے کاجل کوٹھے میں کاجل کل کے اوپر یہ قبوہ ہے۔ کچھ کچھ دھری رات ہی ہے۔ ضرورت سے گھونٹ گھونٹ چٹا رہتا ہوں۔“ وہ میرا ہاتھ کھاتے ہوئے بولے۔

”آہ میں تمہیں اپنا کاجل کوٹھا دکھاتا ہوں۔“ وہ مجھے لینے پٹان کی دائیں جانب بٹختی گئے۔ ایک کچے کچے لچرے کمرے کے ذرا زور پہ کھڑے ہو کے بتانے لگے۔

”یہ ہے میرا کاجل کوٹھا۔“ مٹی پتروں اور گلابی سے تعمیر اک کوٹھا سا میرے ذرا بڑھا۔ پانی کان ٹکڑی کے سہنے ہوئے بے ڈھچے سے دروازے کا پتہ بناتے ہوئے مجھے اندر لے آئے۔ نیم اندھیرے میں کچھ دکھائی دھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں کسی اندھے کی مانند پگ پگ ٹوٹا ہوا جب کچھ ذرا اندر آ گیا تو

میں تھا کہ میں جیسے کسی اندھی قبر میں آ پہنچا ہوں۔ کالام ٹھپ اندھیرا کسی قدر گھٹن اور گرمی۔ ہاتھ کو
 دھو لے کر نہیں دے رہا تھا۔ درود یار پہ کالے گھنٹہ اندھیرے پڑتے ہوئے۔ عجیب کیلے سواد والے روغنی
 پتھر سے احوال کا اک خمد راجل سا بنا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اک خوشگوار سی تپتی اور خوشبو میرے منہ اور
 گھٹن میں اتر چکی تھی۔ اندھیرے سے آنکھیں مانوس ہوئیں تو دیکھا غار کے درمیان اک بڑے سیاہ پتھر پہ
 جھلے چھوٹے پتھروں سے ایک چولہا سا بنا ہوا ہے۔ جس پہ سیاہ رنگت کی مٹی سے بنا ہوا ایک طباق الٹا چڑا
 ہے۔ نیچے ریا نما مٹی کے کٹورے میں تیل اور اس میں پڑی روٹی کی موٹی سی جلی کے ہونٹ سر رہے تھے۔
 بڑے نمونے کی کیتلی میں مزید کچھ پانی اور قبوے کی پٹیاں ڈال کر کابل والی کنالی کے اوپر رکھ دی۔ دروازہ
 سے بھڑکتے ہوئے کونے میں پچھلی پھونس کی اک چٹائی پہ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ابھی تم نے کچھ جیت لیا اب یہاں کھل کر پاؤں پیار سے دوام دھیرج کرو۔ میں کچھ سے
 کے لئے یہاں سے تھوڑی اور پر سے باجو گھاٹ پہ جا رہا ہوں۔ تمہارے کھانے پینے کے لئے کچھ سامان لیتا
 آؤں گا۔ اتنی جلدی نہ کرو کہ کھو جاؤ اور سمجھو۔“

میں نے ہکا سنا سو نہ سنے ہوئے کہا۔
 ”ابھی پاؤں پیار سے کیلے پاتے پاتے یہاں پہنچے۔ یہاں سے تھوڑی سی سامان لے کر چلتا دور ہو گئی
 ہے۔ کچھ سامان اوپر لگوں پھر ہے آپ کے ساتھ ہی چلا چلوں۔“
 بابائے جگت کے ہنر نشانہ چھپتے ہوئے کہا۔

”تم نے اوپر کی ابھی غصہ کیا تھا۔ تمہارے گھٹن کی دھکیلی کہتے ہیں کہ میان دھیان کی
 ترس ہو کر گھاٹ کے لئے زمین کے نیچے کی کوئی بانجھ باؤلی یا زمین کے اوپر بلندی پہ کوئی بے نور روشنی کا بیڑا ہی
 مطلب کے استھان ہوتے ہیں۔ ہر امر اتارنے چڑھنے کے لئے سیر دھیان سرائیں ہوتی ہیں کوئی منزل اتر کر سر
 پہ نہ کوئی اوپر چڑھ کر پاؤں پڑتی ہے۔ اور ہاں، دھیان کی دھیر پھٹا کی جانکاری کے لئے زمین
 پر ہی اک استھان ہوتا ہے وہ ہے کوئی کابل۔ کولہا یہاں پاؤں سے چڑھا اتر تو نہیں جاتا البتہ پاؤں
 پہ سے ضرور جاتے سکتے ہیں۔ کابل منڈپ کی جانب پاؤں پیاریں تو دھم کی دھمکی سے دھمکی کی دھانسا
 کی حالت پھیر ہوتی ہے تو روم روم میں کلارنسا کے رینگے سے چل اٹھتے ہیں۔ ہر روم روم کا دیوار پیک اپنی
 کتب گن گن لوپ کالائی وال ہوتا ہے۔“

تم اور دھیان جہاں کابل دھپ کی آرتی اتار دھیں کچھ لے کر چلتا ہوں۔

سینے میں ارمان سنگ رہے ہوں یا کسی کی یاد کا دھپک روشن ہو تو ظاہر ہے کہ دھواں دھواں تو اٹھے گا جو خلق سے اٹھتے اٹھتے آ کر ادا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ہر وہ شے جو جل سکتی ہے گرمی روشنی اور دھواں پیدا کرتی ہے۔ ان میں روشنی ایک چند گرمی دو چند اور دھواں کئی چند رہتا ہے۔

اول بھی اور آخر بھی یہی دھواں پٹے پٹے لہرے جھلکے اور پٹکے لے لے کر ماتم کھاں یا قصبہ بن رہتا ہے۔ خصوصی مراقبوں تحلیل نفسی ترکیب نفس کی مشقوں تسخیر ذات و ہم زاوی کی ریاضتوں جلسوں چیلوں میں ایسی دہرائیاں تہیا یاں جھونپڑیاں اور قبریں کُجے کُجے چلے کنوئیں باولیاں گھپائیں غاریں وغیرہ بڑے مددگار و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

اردنی سے طالب علم کی حیثیت سے ان سے مناسب سی راہ و رسم بھی سنی۔ گاہے کابل کوٹھری یا کوٹھے کے بارے میں سنا پڑھا بھی تھا۔ ملازمین پر ہوا تھا۔ بابا بھگتے شعوری طور پر بگاڑ دھڑکا کھینے دروازہ بھینٹے۔ چل دیئے تھے۔ باہر کی روشنی چھوٹے ہی اندر کے اندھیرے اُچلنے لگے۔ شاید یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں پکا چمڑی کی مچھانٹا نوپ اندھیرے میں تبدیل ہو جاتی ہے پھر یہی اندھیروں کی گھٹائیں کے باطن سے آگئی اور اچھانٹا کا قلبی تار اساعروج ہوتا ہے جس کی تابنگی سے ظاہر و باطن کی آنکھ پھنسی نہیں بلکہ بیکار پڑتی ہے۔

UrduPhoto.com

باہر کھانوں پر منڈیاں ڈالے ہوئے پڑے والے بازوؤں کا سرائو کوٹھری میں بے کسی ہے۔ ”کیوں کیوں“ کی ہلک لکائی یا ٹھٹھے تاز یا لٹکا یا کہ میں دائیں جانب گھوم رہا ہوں۔ آنکھیں کھلی تھیں یا بند۔ یہ تو نہ سوچا لیکن سمجھا ہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ سائے کا جل جھلک سے سیاہ سورج ابھرا ہوا ٹھٹھے چل پل کر رہا تھا۔ کل گونہ ہوتا تو اسے کیا بتیال جان کر جان بوجھ کر لیتا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ اندھیرے اور کالے ہجرت کا بلبلہ ہے اور ویسے کے تیل کی دھواں ہے جو دماغ میں دھماجہ نری بنائے تھی ہے اور دھواں کا رنگ کی شیشیل سی دھول دھند ہے جو تھنوں سواری چڑھا گئی ہے۔ دھیانی کیانی کہتے ہیں۔ دھیان کے لئے دھواں اور گیان کے لئے گھا (غار کھوٹا لیٹھ دی بگ) لازم ملزوم ہیں۔ دھواں اول سے اٹھے یا پان سے۔ اگر کے نہ اڑے یا چند دن کے چوب سے ہرل سے ہرل سے۔ عود کے کاٹھ سے یا لوبان کے صوم سے اٹھے۔ سلیہ گھوں کی دھوپیت ہو یا کالی گھونٹی کی دھواں۔ نیم کی مولیوں یا کسی کی پٹیوں کی دھواں۔ تہہ کو کے دھواں یا شیش کے اڈوں کا دھواں، فلفل امرا اور زرد پوہ کا دھواں۔ تمہہ جنگ یا مار خور کے سینک کا دھواں۔ شوک وانی غاری کے زریں بالوں کا دھواں یا اٹکا ختم لینے والے بچے کے ناز و کا دھواں یعنی دھیان کسی بھی دم ذکر کا جو اس کے لئے دھواں دھواں جزو لاینفک ہے۔

سوجھ سمیٹ ہی رہا تھا کہ بابا اپنی کافی چادر میں کچھ سامان باندھے اندر داخل ہوئے۔

”اسلام پیغمبرؐ کا حق اور جلا کردہ و میرے سامنے چمائی یہ پیشہ گئے۔

”کہو بچہ“ کیسے گزر رہی؟“ میں نے تو اپنی طرف سے کچھ دیر نہیں کی۔ چاہا آنا ہی کیا ہے۔

چادر کھول کر مجھے سامان دکھاتے گئے۔ ”تمہارے لئے نرم نرم گلیو گوشے تازے تازے مرغ خوشبو

ہنسنے ہنسنے سیب، کھیر نے سبز مرچیں آلو اور مچھلی بھی لایا ہوں۔ چاول، گزن، لکڑی کا آٹا یہاں موجود ہے۔

ہم پکا نہیں کئے اور خوب کھا نہیں گئے۔“

میں نے سامان سے نظریں ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

”ابا! آج مجھے کیا ہوا، پہلے صرف کافی چیز ہی کافی دکھائی دیتی تھی اور اب ہر رنگ سیاہ نظر آتا ہے۔“

یوں لگتا ہے جیسے میں باہر کے عالم میں رہ رہے ہوں۔ کچھ کاٹھیا ہو گیا ہوں۔ جسم میرے خون کا رنگ میرا دل

اماغ انک انک پور پور ہو گیا ہوا ہے گئی ہیں..... اور تو اور مجھے تو ایسا محسوس ہو گیا ہے کہ میرا ہمارا نفس، ذہن

کی مہین ہی اک لڑکی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ بابا! مجھے اک عجیب سی خوشبو نے سرمست کر رکھا ہے۔ میں نہیں

جان کما ہے۔ کچھ کما ہے۔ یہ اس امر کی تیزوی کہ ہمیں دشمن دشمن اور یہی آفاقی ہے

www.rduPhoto.com

میں، امن ہے۔ اعلیٰ کوئی لافانی گناہ ہے۔ سب کے ملک میں جی کا نسو کی پائل سے چھڑی ہوئی کسی

جنگل کی سرکائی ہے۔

ایمان آج کو مل سانا تھا۔ چنانچہ انہی مومنوں ہی پر وہوں سے میرے ہونے کی خبر گزرتی ہوئے کہنے لگے۔

”ایسی بیماری ادنیٰ ہی باتیں تھیں۔ سبھی میں تم نے؟“ لگتا جیسے کوئی کو چاٹتا رہتا ہو۔

اور ہاں میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے تمہارا کسی کا جل کوٹھے سے دھوئے نہیں بن اور نہ تم ایسی باتیں نہ کرتے۔

کاہل کو جھپکی اچی اک الگ سی ذرا ہوتی ہے۔ اس کا ظاہر زمانے کی زو میں اور باطن وقت کی قید سے

نہ ہوتا ہے۔ کاکھو و دھواں کی تیسرا کچھ ایسی آسمان و سماں بھی نہیں ہوتی اور نہ ہر کوئی منش اسے سمجھنے

شخص کے رافق ہوتا ہے۔ دو دو کی دھما، تو ہر کوئی فی پلٹ سے برکات لے، بس کا یہ حال ہے تاہم کسی کے بس کی بات

نہیں ہوتی۔ نہیں جس کی سر داگ کڑے پنہانی اور زخمی گریں وہی چالکو و دھماں میں دھماں وے گئے

ہے اور تمہیں اور اس کا جملہ کوٹھے تک یہی ماجہ دکھاؤں۔ بیٹھے ہوئے سراک ہی تو لے جسے کہتے ہیں

یہاں بھرتے اُٹھا اور روشن تو کاشی اور گھونچن سے ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دکانداروں اور چور سے گھر اور قلم رکھیں

”کچھ ایسا آسان بھی نہیں۔“

میں آیا کہ یہ بڑے بڑے کوائے۔ جو کوڑوں سے زیادہ کوڑوں کے رویوت نکلتے تھے کیوں میرے پیچھے لے ہوئے ہیں۔ کشتی اور کشتی والا پڑھ رہا رہا بابا۔ یہ ان دیکھا جمیل کا کنارہ مٹھنا طیسی پتھر۔ جو ای کاجل کوٹھا والے کا ہو شکو کے زیر اثر تھا اور کوڑوں کی رہنمائی وغیرہ وغیرہ۔ جب ہر چیز اچھی طرح واضح ہو گئی تو میں نے بابا کے چرن ٹھوکتے ہوئے عرض کی۔

”آپ میرے لئے کیا حکم ہے۔“

”آج رات میں تمہاری رہنمائی کے لئے یہاں ڈکوں کا۔ تمہارا کشتی والا غلام یہاں پرانے شکو کی جگہ لے لے گا۔ وہ پ سے وہ پ جے گا نیا تیل کی باقی پڑے گی اور پھر تم سے ہماری اللہ بیل ہو جائے گی۔“ میں نے اپنے کشتی والے خٹے مٹھنا طیسی پتھر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”بابا یہ غلام؟ مجھے تو یہیں ملتا ہے جیسے یہ اور اسٹان والا شکو ایک ہی چیز ہیں۔“

”ہاں۔ تمہارا والا غلام بھی کا ہو شکو ہی ہے۔ جو پچھلے برس اسی اسٹان پر جڑا پڑا تھا۔ اس کا لگو دھیان ہو چکی ہے۔ اس کو تراش تراش کر شواہ دیا گیا ہے جو اس کا انت ہے۔“

میں نے اسٹان والے شکو یعنی کا ہو کا ٹھ کے ٹھکانے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں اس کو بھی تراش تراش کر تمہارے خٹے کی مانند بنا دیا جائے گا۔ یعنی گول کا پتھر! جو کہ اس سے اٹھایا اور سنبھالا جائے گا اور جان لو کہ جو فالتو لکڑی کے ٹکڑے اترتے ہیں وہ بھی ہوتے کام کے کیڑائی ہوتے ہیں۔ اس سے خاص اٹامس کا خٹہ کوٹے اور نرم داناں بنتی ہیں۔ ان کو سبوں کے مٹکے۔ دھپکے۔ روٹے اتھ چیزوں کے موٹے۔ گنے میں ڈالنے والی لومیں۔ گتیاں۔ پٹے۔ کولہ۔ جو گیوں کے کانوں میں ڈالنے والے بالے وغیرہ بھی تیار ہوتے ہیں۔ اور یہ چیزیں صرف سادہ موٹیر کی اٹھیاؤ۔ دھپوں۔ سنتوں کے کام کی ہی ہوتی ہیں۔“

میں نے جب بابا سے پوچھا کہ اس شکو میں کون سا ایسا چمکا ہوا ہے کہ اسے صرف کہانی دھیان وغیرہ ذرا دیش ہی اہمیت دیتے ہیں تو وہ کہنے لگے۔

”اگر میں صرف تمہیں اس کا ٹھ کی شرمہ دانی اور کاجل کوٹے کا پتھر داری بنا دوں تو تم میرا روپہ آگے۔ ایسی شرمہ دانی میں کبھی شرمہ یا کاجل کوٹے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اگر وہ زمانہ اس میں سے صرف ملانی کھینچ کر آٹھوں میں پھیر لو تو دیکھو کہ کتنی گتیاں آٹھوں میں اٹھ آتی ہیں۔ اندھروں میں بھی دکھائی اور دُور دُور تک بھائی دینے لگا ہے۔ دیدوں میں دیدہ وری ڈر آگئی ہے۔ آنکھیں نہیں اور

یہی مشکوک ہو کر رہ جاتی تھی۔ مگر حویلی حرم میں پڑی ہوئی باقاعدہ منکوحہ بیویاں بھی شوہروں کے انہی پر جتنیں بہ چھیں نہ ہوتی تھیں۔ یعنی مردوں کا یہ چلن ان کے نزدیک کوئی خاص اخلاق باختہ سی چیز نہ تھی بلکہ اسے روزمرہ سمجھا جاتا۔ یہاں تک کہ چھوٹے بڑے بچے بھی یہ اوراگ رکھتے تھے کہ ان کے بچے کے فلاں فلاں رنڈی ڈالے ہوئے ہیں۔ انہیں یہاں تک خبر ہوتی کہ موصوف آج کس کے کوٹھے پہ قیلولہ فرما رہے ہیں۔ ایسا بھی تھا کہ ادھیر غمراہ باپ اور جوان بیٹا ایک ہی کوٹھے پہ موجود ہوتے۔ یا پھر ابانے بڑی دھڑکی ہوئی ہے اور بیٹے نے اس کی بیٹی بٹھائی ہوئی ہے۔ بات کھٹنے پہ بھی کوئی ہنگامہ کوئی قیامت نہیں ٹوٹتی تھی۔ آنے جانے کے اوقات تبدیل ہو جاتے تھے۔ اگر اتفاقاً کہیں آمناسا مناسا ہو بھی جاتا تو سر سے دوپٹہ لٹکا کر منہ پہ ڈال کر طرح دے دی جاتی اس پہ کہیں عاق یا قتل کی نوبت نہ آتی تھی۔

ایسے وقتوں کے ایسے لوگوں میں کالے خان کے آبا بھی شامل تھے۔ خاندانی کاروباری معاشی تھے۔ جسم جوانی میں چارے ذوق شوق بھی اعلیٰ۔ روپے پیسے میں بھی خشک نہیں تھے اور پھر کاروباری سہ میں قریب درکار کا آنا جانا بھی لگا رہتا تھا۔ جسم میں خون کیسے میں پیسہ عزاز میں رنگینی اور طبیعت میں توفیق و فکر کی کمی نہیں بڑی رسانی سے رسانی ہو جاتی۔ محبت کی گلیوں، کلاہیں، شکرانے، پھول توڑنے باہر کے مالداروں اور مالداروں کی اداکاری میں کام لگتی تھیں۔ یہ سب سب کے سب ان کے کام ہوتے تھے۔

UrduPhoto.com

• بسکیوں کی جتنی !

ایسے ہی سہرے دنوں کی ایک سرمنشی سی شام کالے خان کا باپ ایک کوٹھے کی سیڑھیوں پہ گیا تھا۔ صرف ایک دو پہلے وہ اپنے فرنیچر کے کاروبار کا جائزہ لینے کی خاطر پنجاب پہنچا تھا۔ خیال تو تھا تھا کہ وہ یہاں مقیم اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں قیام کرنے کا کمرہ چاں اترتے ہی اس نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ اب وہ کسی مناسب محفوظ اور آرام دہ ہوٹل کی تلاش میں شہر میں گھوم رہا تھا۔ یکے والا اسے ایک چھوٹے صاف ستھرے سے ہوٹل پہ لے آیا۔

"بڑے صاحب! اس ہوٹل سے بہتر پورا شہر میں کوئی اور جگہ نہیں۔" پھر وہ اس کی خیر خواہی سے کہنے لگا۔ "مستحسن اور گارنٹوں کا ادارہ ایک سہارے اہم ہوتا، انجمن کے نیچے۔" بائیسکوپ وہ سامنے کے ڈال خانے کے پاس۔ جامع مسجد دائیں جانب کچھ باغ کے سامنے۔ ہسپتال، بینک اور پولیس تھانہ۔

نزدیک.....

مشہور گانے والیوں، ایکٹروں کی پھولوں سے لگی ہوئی تصویریں۔ معروف ہانگوں، پہلوانوں اور بڑے نامور بادشاہوں، فاقوں کے فوٹو پوسٹر بڑے اہتمام سے آویزاں ہوتے تھے۔ ہر دوکان پر باہتمام سترے تو بے واسے گراموفون کا ہونا ضروری ہوتا تھا۔ ایک خاص کارندہ صرف لوگ بھرنے، سوتیاں تبدیل کرنے، ٹرانسکریپشن پر ریکارڈ بجانے کے لئے مضمون ہوتا۔ کسی دوکان پر چندتہ پرانے ناچنے و حریت گارے ہیں تو بڑے غلام علی خان نے داد اور چھیر رکھا ہے۔ کوئی نصیاً صرف روشن آراء، عظیم کے شریہار سے روشن ہے تو نصیاً اختر بانی فیض آبادی کی قزاقوں کے دم سے لودے رہا ہے۔ اور ملکہ چنگراج گوجری میں پہاڑی۔ الاپ رہی ہے تو اور مرانے استاد احمد خان قمر کو لے ملہیت میں لے گاڑی ہوئی ہے۔ تماشاخیوں، گمن کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوتے۔ شرم پہ سہل رہے ہیں، کہیں تال تھاپ پہ پاؤں نصیاً دے رہے ہیں۔ منہ میں لکھنؤ کا خاص لوانی زعفرانی زرد و حیدر آبادی شامی قوام اور سائیکس کے پان کی گوری۔ پان کا چکر کر آ رہے تھے کہ ہاتھ کے چھوڑ تو زمین پر پڑتے ہی حیا اور نزاکت سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔ ہر ایک ایک خرچ سے کن چرچا کی محفل ہوتی۔ ایک سے ایک جانو گمن رسپا، سنگیت و ڈیا لو موسیقہ ساز کا نام یہاں پہنچتا۔ ان کی اکثر ہمشیر ہوتی ہیں۔ ان کے سوا کسی اور کو نہیں جانتے۔ کہیں جات جات ہو رہی ہے ہاتھ پہ ہاتھ مار رہے ہیں۔ سارے کال کر دیا جا رہا ہے۔ ان کی جال اور ایک تال۔ یہ اور یہ نواز و سارے تلواریں یہ وہ ایک۔ ہاتھ گویاں اور سدا رنگ قسمت خاں صاحب کہ جگہ تھیں پہ بات رہی ہے۔ عہد انگریز میں حال اور چندتہ اوم کارنا تھ کے گمن کا موزن ہو رہا ہے۔ سلطان پانی اور حریت پانی والی کے درمیان کی بارکیاں بیاں۔ جیسی جیسی ہوتی ہیں۔ موسیقی کے گمن ہانوں پہ بات چل رہی ہے۔ کوئی ہے گمرانے کی ہے سید کارگر۔ ہا ہے تو کوئی گویا گمرانے کے گمن کار رہا ہے۔ شام پورای کی شان ہو رہی ہے تو کوئی اندہ اور پچا کرانے کے انداز بتا رہا ہے۔ موسیقی کے گمنوں پہ گفتگو چھ جاتی ہے تو کہنیا پہ آ رہی ہے۔ پھر کوئی رانگی راگنی پہ اٹھی دھرتا ہے وہاں سے جوی مارو اسے ہمدانی تک ساتھ ہے۔ ایسا سلسلہ اس وقت تک چلتا رہتا جب تک بازار کھلتا ہے دوکان زبان اور گراموفون تیار رہے ہیں۔

ایسی ہی ایک دکان کے سامنے جب پہنچے تو اتر اٹھا کہ دوکاندار نے بیچنے سے تار لیا۔

فجیر: کہیں باہر سے آیا ہے جسم میں تازہ خون، کھوپڑی میں مغز اور کھجکے میں زہریلی ہے۔

انجیل کے طبیعت کا قدرے مزید

صاحب اہل و عیال ہے۔۔۔۔۔

پوچھنے لگا۔ "آپ کو کبھی پہلے اس کوچہ درمختی دہلی ہائی میں نہیں دیکھا؟"

"یہاں تو کیا ہم آپ کے اس شہر میں بھی کبھی بار آئے ہیں میاں! دو چار روز کا قیام تھا۔ آخری روز سوچا چلو ذرا اس خوبصورت شہر کے خوبصورت لوگوں کو بھی اک نظر دیکھتے چلیں۔" اس نے پہلے جوئی پان پرات پڑھتے ہوئے مزید کہا۔

"میاں تھیو! اس بازار میں اترتے ہی تمہارے منھے بولوں اس غزل کے نکل خروں اور تمہارے گھوڑی کی مہکتی ٹانگوں نے بڑا سر درد دیا ہے۔" پھر آستین کے رومال سے ہاتھ کا کوند صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ "اس بازار کے منہرے مکینوں میں بھی کوئی ایسا رتن داند ہے جس کے ہاں یہ تینوں خاصے موجود ہوں۔" بیواڑی آواز دیدگی سے مسکراتے ہوئے ہاتھ سے آداب عرض کرتے ہوئے بولا۔

"مختور! ایک سے لیکھ تا بدار داند پڑا ہے جس پہ نگاہ نہ کیں وہی دل و نگاہ کو خیرہ کر دے گا۔ تب حکم کریں۔"

"کیا اس بازار میں دھرا تھا مال عام ظہر پہ غنیا اور نظر بد ہوتا ہے جو چھپا باندھا نہیں ملے گا۔ اس کی خبر۔" رام پور کے کچرے ہیں بڑی کھلی غنیمت۔ بھاری نہیں کرتے۔ اور اس بازار میں غزل پھر سے ملو اور پھر اس کی ساریاں کی پیسے۔" مختور غزل کا صحت فرمائیں۔ میں گھوڑیاں باندھے دیتا ہوں۔"

تب اس کے منہ میں ہنس پٹ کر "قادریاں" کا بانگ لگا۔ "کچھ لوگوں میں ایک سماجی پالی کر رہا تھا۔ کھوسٹ کھوسٹ اچھکے لے لیتا ہوا۔" مختور غزل کے منہ سے نکلتے ہوئے غزل کے منہ سے نکلتی آواز میں مختور آداب عرض کرتا ہوا سر نہوڑ پان کھڑا ہو گیا اور یقیناً وہ اچھا بھی سنتا ہوگا کہ بغاوی جنگ کر اس کے کان سے قریب ہو کر ذرا بلند آواز کہنے لگا۔

"خان صاحب خاص مہمان قہر و دان ہیں انہیں جی تو قہر سے گلابی جان کے ذریعے پہ پہنچاؤ۔" پھر پان کی ایک ٹکڑی پہ چوہا اور چھالپا چوہا پکا اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے تاکید کرنے لگا۔ "لوگوں کو کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے۔ سیدھے وہیں لے جائیو۔ جب تک خان صاحب وہاں قیام کریں تو وہیں ہوتے ہیں۔" میں چائے پیو۔ اگر مختور کا پتہ وہاں نہ لگے۔ تو درجن پیاسی آگرے وہاں کے ہاں لے کر بچھا آئیو۔

وہ پند و لم کی داند سر بلاتا ہوا پیچھے پیچھے اور یہ بڑے تکان میں ساتھ ساتھ آگے آگے۔ دو ایک گلی تین چار سبز اور ایک چوک نر لینے کے بعد جب مطلوبہ مکان پہ پہنچے تو شامزد بگلی اور شب اپنی جیبیں پہ کھنڈر کاڑھ چکی تھی غنا کشتری اور جامنی رنگوں کی بھرمار تھی۔ ماحول میں اک عجیب سی آوازی کھلی ہوئی۔ جیسے کچھ

میں آنسو آ گئے۔ سب ادھر ہی دھڑکتے ہیں۔“

”اوہو۔۔۔ اچانک اس کے منہ سے نکلا۔“ بڑی بیانیہ داب آئی یا سرخ لہو پکا؟“

وہ منہ جا کر بولی۔ ”رام جانے شو رامیں نے کچھ نہیں دیکھا۔ بس سنا ہی ہے۔“

ایسے میں ایک اور نوپتی چلی آئی۔ وہ بھری ہو کر آداب عرض کیا۔ مسکرا کر بولی۔

”آپ ادھر تشریف رکھیں۔۔۔ بانی جی آیا ہی چاہتی ہیں۔“

عجب گوگو کی کیفیت میں وہ ادھر سرخ غالیچے پی بیٹھ گیا۔ اب پیچھے سے ایک اور بھری آئی تھیں۔

بڑھا کر چلی گئی۔ شربت اور پھر پان آئے۔ عجیب سی حالت یہاں نہ کئے کوئی چاہے اور نہ اٹھنے کا یاراں۔

پہلے خوشبو آئی پھر اس کی جلو میں گلابی جان آئی۔

رنگیوں میں ایسا نام پہلی بار سنا تھا۔۔۔ گلابی جان؟ یہ کیا نام تھا؟

یہ سنا تھا عام سناٹا کاشفتہ لباس لسا بھی سادہ سا۔ کنگھی پٹی اور بنا کونجی بھی گھریلو۔۔۔ جیسے کوئی

سہانگی رسوائی سے اٹھ کر چلی آ رہی ہو۔ اس کے دائیں ہاتھ کی پکلی انگلی پہ پتی سی بندھی ہوئی تھی۔

ہاتھ سے اس نے قدرے جھک کر سلام کیا۔

UrduPhoto.com

اور سامنے ہی بیٹھ گئی۔ ہاتھ بڑھا کر گھوڑی پیش کرتی ہوئی بولی۔

”آپ کوئی کے ہاں پہلی بار تشریف لائے ہیں۔ صدق دل سے کہہ دوں گی اس کو تانی سے

صرف نظر فرمائیے۔ میری سزا تھی کہ میں لاڈ لار میں مٹھو کی بھل میں گوگو کی کرشمی اس پہ اس بے غرض

نے میری انگلی پر جھج میں آ بلی۔ جی کہا بڑوں نے کہ طوطے سا طوطا چشم اور کوئی نہیں ہوتا۔ بوٹی ہی پت

کو تانن پہ پادام دکھا دکھا کر کھلائے۔ اسکی تکی کی پتھری ہا دام پٹے چٹوڑے کشمش امردو۔ اس مریہ

تھیں قولے اردو ہی امر ہی تھک یاد ہو گئے۔ چونکہ پادری وہ فاداری۔ صاحب طوطا بڑا ہی بے مروت

بے دیدہ اور بد لحاظ، کبھیرو ہے۔ ایسا خوبصورت اور ایسا کورے رام۔۔۔“

خان صاحب بڑی دلچسپی سے اس کی معصوم معصوم باتیں سن رہے تھے اور نہ ہیں کاٹے اسکی آنسو

دیکھ رہے تھے کہ جس کا تصور تم از کم ہاں بازار میں نہیں کیا جاسکتا۔ جی تو یہ تھا کہ اسے یہ سب کچھ بڑا اسکی

بیٹھ دھوا پھاگا۔ اب ایک ایک کر کے سنا دے اسکی بیٹھ چکے۔ تو گلابی جان نے جو سے ادب سے طوطے

اور مشروبات کی پسندیدگی دریافت کی۔ خان صاحب بولے۔

”نی الحال کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ آپ صرف یونہی مجھ سے باتیں کرتی رہیں۔ آپ کی باتیں

”کچھ کپ ہیں۔“

”کیا آپ بندی سے صرف اس کی پوچھ باتیں ہی سنیے گا۔ گانا نہیں سنیں گے؟ میرے آس پاس کے ملک کہتے ہیں کہ مجھے باتیں کرنی نہیں آتیں اور آپ کہتے ہیں میری باتیں بڑی دلچسپ ہیں۔ اچھا یونہی کہ آپ سے ہی باتیں سننا چاہتے ہیں تو باتیں ہی سنیں۔ فرمائیں کبھی باتیں ہوں۔۔۔؟“

وہ تہذیب سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”آپ کی باتوں کے ساتھ اگر سازوں کی شرکت کی ضرورت نہ ہو تو انہیں سازندوں کو بھی یہاں بیٹھنے کی ہمت نہ دیں۔ ضرورت پہ بعد میں بلا لیجئے گا اور اس لئے بھی کہ آپ کی باتیں سچی اور سُر ملی ہونے کے ساتھ ساتھ رنگ میں بھی ہیں۔“

وہ بے ساختہ کھل کھلا ہنس پڑی۔ ”بھئی کا جیسے جیسے تھا تو وہی تھا جب بولے۔“

”سچین کریں آپ کی کسی بھی سچی اور نرمل ہے۔ ہنسے اور رونے میں ملتی کی بھی منافقت ہو تو شیشے میں نظر آئے۔“

”یہ آپ کی باتوں اور دماغی مستراہٹ کا یہ حال ہے تو گا لگیں گا کیا کلام ہو گا۔؟“

یہ ایک خان صاحب نے قادیان میں کوآرا والی جڑ کے پانی پر آدھ سے شیشہ اٹھا کر

”قادیان میں اس جھلے سے نمونی کو بھاری طرف سے شکر یہ کہنا اور کہنا تم نے ہمیں کچھ ملے پہ بھیجا۔“

دونوں کی عمروں میں ہلکا سا فرق تھا جبکہ مزاج ”مرتبہ“ اور حسبِ غلبہ میں تو بہت ہی فرق تھا لیکن جیسے جیسے ہیں کہ انسان کی قسمت میں جو خواہاں یا خوب آوریوں بھی ہوتی ہیں وہ ہو کر رہتیں ہیں۔

خان صاحب ’سفیدیاں پانی کی اماں کی باتوں کھاتوں اور تان پائوں میں ایسے پھنسے کہ مرتے دم تک نہ بڑھ سکتے تھے۔ چھوڑا مریضی یہ کہ کبھی بیوی اور بچوں کو زندگی بھر اس تعلیق کی بھٹک تک نہ پڑنے کے لئے جان سے نکالے تو نہ کیا البتہ ہاتھ دیا نہ گری تھی۔ ہر دو چندوں کے لئے آتے تھے اور چرچہ تھے۔ وہ گروہ پس پلے جاتے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ غلطی کی فریبی اور دیکھوں کا خرچہ شیشی ہی اور گرا چکا ہے۔ اس طرح ان دونوں بھی انسانوں کے درمیان نہ تو کبھی کوئی پیشکش پیدا ہوئی اور نہ کبھی کوئی جگہ شکوہ تھا۔ سب کچھ بولے خوب باتیں ہوتیں۔ گانا گانا ہوتا خوب وقت لگتا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خان صاحب نے ایک نیا ہی نہیں طبع تھا۔ اور گلابی جان بھی ایک اچھی قسم دار وضع اور طوائف تھی۔ جو طوائف ہونے کے بعد خواہ شرافت ’عزت‘ اعتماد اور وفا کے معنوں سے بھی خوب واقف تھی۔ خان صاحب کبھی کبھی اسے

خیر خیریت یا آنے جانے کے بارے میں خط بھی لکھا کرتے تھے۔ بہت سے پارچاٹ زیورات اور ہتھکڑے تھکے تھکے بھی دے رکھے تھے۔ کیسی بات کہ اس اللہ کی بندی نے کبھی کچھ از خود طلب نہ کیا تھا۔

تعلقی کے وہ برس بعد جب سفید اس پیدا ہوئی تو گلابی جان کی خواہش پہ قانونی طور پہ خان صاحب نے اسے اپنی بیٹی تسلیم کر لیا تھا۔ کچھ خرچہ بھی بڑھا دیا اور گلابی جان کو پابند کیا کہ وہ سفید اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر باقی اٹھانہ رکھے۔ بلکہ کئی ایک بار خان صاحب نے کوشش کی کہ اس کو وہاں کے ماحول سے نکال کر کسی اور جگہ رکھ کر پرورش کی جائے مگر شاید طوائفوں میں بیٹیاں باپوں کے سپرد کرنے کا رواج نہیں ہوتا۔ ان گلیوں کو گھوٹوں پہ باقاعدہ آنے جانے والے کہتے ہیں کہ جو ننھی 'عمیاشی' یا اس بازار کی پیداوار ہو وہ طوائف ہی بنے گی اور اسے طوائف ہی بننا پڑے گا کیونکہ وہ تمام عمر اپنے معاش باپ کے گناہ کا پرائیڈ کرتی رہے۔ بھگت مان بھگت مان کہتے رہے۔

گلابی جان کا پیشہ ہم فروشی نہیں لگتا تھا۔ مگر کہا کرتے کہ ان کو بڑے بازاروں کی گھنٹی کے درمیان ہر مرد ہوتا ہے۔ وہاں کی ہر عورت طوائف ہی سمجھتی ہے۔ ناپتنے گانے والی ہو یا کسی عصمت فروش۔ سب ایک ہی کھاتے میں ہوتی ہیں۔ کسی صرف جسم فروش ہوتی ہے ناجتنی گاتی نہیں۔ لیکن گانے بچنے والیاں بھی اکثر دام لگنے پہ اور پرواہ نہ ہوتی ہیں کسی گانے کے شوقین رئیس اسے کہہ رہا ہو یا پرواہ پر ہی رہتی ہیں۔ یہ بھی ایک باضابطہ شریکانہ اور باوقار جسم کی عصمت فروشی ہی ہوتی ہے۔

پرانے روز سادہ اور شرافت میں یہ بچن بچن تھا۔ تعلقات کی پاداش میں جو ناولوں میں معروض و جود میں آتیں۔ وہ قریب قریب انہی فیصلہ لڑکیاں ہوتی ہیں جو اپنے طویل القدر باپ اور زمیل القدر ماں کی مشغلی ہوئی ہیں۔ چند سے آفتاب چند سے اجتاب چھٹے نہیں لگتیں والے سیمائی ہو کر۔

پہلے اور آج بھی بازار فحش میں اکثر بے شمار طوائفیں نظم و انضباط میں اور خور و لز کے جو دکھائی دیتے ہیں وہ کسی غریب کا چپ بیٹھا نہیں بلکہ وہ کسی اونچے گھرانے کے ذیلی و قار کسی قبلہ و کعبہ مخدوم نہیں سیاست دان و رور کرے کسی عیاشی ہاکیر واد یا دوسرے کے قیمتی خون کا جو ہر ہوتے ہیں۔ طوائفوں میں ایک خاموش اور مضبوط معاہدے کے تحت باپ کا خانہ کثر خالی رکھا جاتا ہے۔ مکافات عمل کی اس سے زیادہ بولناک جگہ نہیں ہو گی ہو سکتی ہے کہ ایک بد بخت اندھی جوانی اور دولت کے جوش میں کسی کی باڑی میں گناہ کے چند جج و باکر خاموش

ہو جاتا ہے۔ مگر اس باڑی میں جو خوبصورت پھولوں والی زہریلیاں گائے دارتھوڑیاں ہنسی لیتی ہیں وہ اپنے باپ کے سامنے کی ہاموں کو ساری عمر کچوکے لگا کر ٹونہار کرتی رہتی ہیں۔

جانی صاحب نے بھی بیٹوں اور جوانی کے جوش میں یہ نہ سوچا کہ ایک گائے والی سے افتخار کی صورت میں اپنی بھی ہنسی لے سکتی ہے اور وہ بھی حرام الولد بنا جائے۔ گو بعد میں حالات کی تنگمی کا اور ایک ہونے یہ ہنسنے والی جان سے ایک شریفانہ معاہدہ کیا۔ جس کے تحت سفید ادا اپنی ماں کی زیر کفالت و تربیت رہی۔ باپ کا نام ملے گا مگر کبھی ظاہر نہ ہوگا۔ ایک مخصوص رقم ادا کر دی گئی اور ہر ماہ خرچہ الگ ہاندھا گیا۔ یہ سونے سونے تحائف میں وہ ایک انگوٹھی بھی شامل تھی۔ جس کے ساتھ کی دوسری انگوٹھی کا لے خان کی چھت میں تھی۔ یہی انگوٹھی نال سے سرے سے بعد گائے خان کے پاس تھی اور دوسری گلابی جان کی گھبراہٹ سے پھیلان کی انگشت میں پڑی۔

تصویر بنانے اور غلطو ملائکہ کرنے کے بعد ساری حقیقت روز روشن کی مانند سامنے آ گئی۔ اس کی جان میں سب کچھ آیا کہ سفید ادا ہالی کے چہرے پر ہے۔ ایک خاص سی انیسیت لٹا ہے۔ وہ اپنے آنکھوں اور ہاتھوں کی تصویر اور معاہدے کی تصویر پر غور کرنے کے بعد وہ اس راز سے آگاہ ہو گیا تھا کہ سفید ادا ہالی کے باپ کی تاباں تر تھی۔ اس کی بیٹی کا تو رشتہ ہی ایسا ہے کہ وہ جائز ہو گیا جائز نہیں ہی ہوتی ہے۔ جب کہ اس کے باپ کا ہی تھا کہ تصویر اور کاغذات کا شے ہوتے ہاتھ میں آئے آنکھوں میں ہلری لگ گئی۔ اس نے ہاتھ دیا۔ آگئی۔ غصت گیم مگر ہر طرف کی آسودگیوں فراہم کرنے والے باپ کا چہرہ آنکھوں کے آگے آ گیا۔ غرت کا ایک پھر یہ اس کے قہقہے میں ابھرا اٹھا گیا۔ وہ تک وہ اپنے باپ کے کرم یا خرم پہ لڑھکتا تھا۔ اسے اچانک اپنا آپ بھی دکھائی دیا کہ وہ بھی اپنے باپ کے نقش قدم پہ ہی تو چل نکلا ہے۔ پھر اس نے یہ دنا دیا کہ سب کچھ تیاگ کر پڑا بھی تو نہیں کے پاؤں پہ۔ باپ نے کم از کم اپنے بیٹی بچے تو گن گناتے تھے انھیں ہے آسودگیوں کیا تھا۔ باپ مگر اس کی تو اپنے گھر۔ جن دنوں میں تو کم از کم عوام کے سامنے کھڑا ہے تو موجود تھے اور نہ ہی کسی کو اس کے ہاتھ مگر اس کی جھٹ پڑی تھی اور نہ اس کی ہاتھ نہ تھی

شیر تک وہ اسی ڈوب آواز میں غصاں رہا۔ بالآخر اس نے جی کڑا کر کے تصویر اور غلطو ملائکہ کے خلاف چار کرنا آتش کر دیئے۔ اپنے تئیں اس نے ماضی کے اس اندوہناک ایسے کا قضا تمام کر دیا تھا مگر

کاش لاکھ نکل لے پر نہیں تو اپنے وقت پہی جان چھوڑتی ہے۔ کئی شب و روز وہ جان کنی کے عذاب میں مبتلا رہا تھا۔

● نوریہ و قون' شریخ ہشتی مہون۔۔۔۔۔!

[illegible]

یہاں امیر و دون میں کشمیرے گھر کے خاندان کا کچھ کاروباری سلسلہ تو رہتا تھا۔ جس میں چڑھتی روٹ پہ ایک بڑی سی کالج اور دفتر اس کے ایک عریض کے صراف میں تھے۔ اس کے باوجود کشمیرے نے بہت پرے ایک پیلاڑی کے واسطے میں جہاں نور و خوش رنگ چھوٹوں کے سلسلے اور قدرتی ناشتے تھے ایک الگ تھلک فریڈز کا گھر بنا دیا تھا۔ یہاں سے ہاتھ اور ایک چھوٹی سی جھیل اور بھرنے بھی تھے۔ آبی پرندوں کی ڈاریاں پیلاڑی کو گھسیں اس کالج کے اوپر سے گزر کر آتی تھیں انوش رنگ تھیں پھر تیلی باگی نور چنے پاں اور راستے کی درختوں میں جھنڈوں کی جھلکائی لٹھائی کھنکھاتی تھیں۔ جھرنوں اور جھیل کے پانی کی بو چار سے اڑتے ہوئے شکاریار نم کاغذ اور فضا میں بکھری ہوتی ہوئی اتھاہ خامشی کا ایسا چادر۔ جو سر پہ چڑھ کر بولتا تھا۔

سے گھبرائے۔ شکر کے پہلو میں پڑی کیدار نے کے انگ میں ایک مدھری استھائی گھٹن ماری تھی۔ بھیکے ہوئے
 بے رحم کے انگ لگی ہوئی کوئی خشک سی لہر کہیں سے اندر ٹھس آئی ہوگی۔ سفید اس ہائی نے دو شالہ اوپر کھینچا
 جس سے شکر مہوے کی شراب کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے اٹار کر سفید اس ہائی کے انگ لگ گیا۔

رات کے آخری پہر سفید اس ہائی کو یوں لگا جیسے اس کے پہلو میں کوئی بہت دھکا ہوا دھرا ہے۔ جب
 پہلی توبان پڑا کہ کشمیر سے شکر کو تیز چپ نے تپایا ہوا ہے۔ سانس کی دھوکھی دھب دھب مار رہی
 تھی۔ آنکھیں دیکھیں تو آل یونی۔ لب کہ لہو سے ابھی پھلے۔ گالوں پہ آثار ترے ہوئے۔ سفید اس ہائی
 سے بے ساری نہائی دیتے ہوئے دوہری تو خشک ڈالتے ہوئے اسے سینے سے لپٹا لیا۔ گال سے گال جوڑ
 لے۔ چپ کے تپائے ڈانڈ کے ڈکھائے پچھو کے ڈھولائے اور چند گرہن کے جانے کو کہاں چین پڑتا ہے۔
 تو ناؤ کا گنڈا لے لگا۔ مینا کی کوڑ پورو کا پٹاؤ مینوں کا رانہ۔ انگ سب کچھ بھی تو بھائی
 تھا۔ ہر اینا غیباور بعد رو بے درد سا لگتا ہے۔ کشمیر سے شکر کی حالت لہو پہ لہو دھوکوں ہوتی جا رہی تھی۔
 اسے انگ تھکے کے تاری طرح اڑنے لگے تھے۔ جات لگے ہمارے سر۔ بخش کی کیفیت ہائی سب دھرب
 ہر جہاں سے ڈرمان بکے لگتا ہے تو کبھی ہائے شہوانہ۔ سانس یوں نہیں کرتا ہے جیسے
 ہر جہاں سے ڈرمان بکے لگتا ہے تو کبھی ہائے شہوانہ۔ سانس یوں نہیں کرتا ہے جیسے
 ہر جہاں سے ڈرمان بکے لگتا ہے تو کبھی ہائے شہوانہ۔ سانس یوں نہیں کرتا ہے جیسے

UrduPhoto.com

ہر جہاں سے ڈرمان بکے لگتا ہے تو کبھی ہائے شہوانہ۔ سانس یوں نہیں کرتا ہے جیسے
 ہر جہاں سے ڈرمان بکے لگتا ہے تو کبھی ہائے شہوانہ۔ سانس یوں نہیں کرتا ہے جیسے
 ہر جہاں سے ڈرمان بکے لگتا ہے تو کبھی ہائے شہوانہ۔ سانس یوں نہیں کرتا ہے جیسے

رات کا آخری پہر آہائی سے انگ تھکے۔ لیلے بے دھواں میں ایک چہرہ کشمیر کا کشمیری ہاتھ
 چلا کر آیا۔ اس کی کنیا آنکھیں باہر گھوڑے کے گھوڑے کے ساتھ تھیں۔ گھوڑا گھوڑا اور اس سے سر
 گھٹتے چھڑائی سر ہوا میں جو بندھنوں خواب گاہ میں بھی گاتی ہوئی تھیں۔ اسے میں سے
 ان کو پکے۔ کیا کرے۔ کہاں جائے؟ سب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بکھل کشمیر سے شکر کو خود سے ملے
 سے کرے پہلو کرتے ہوئے بادل ٹوڑتے تھی۔ دواؤں کے لپے سے جائے شکر کی گویاں لال کر
 کے شکر کے لب میں رکھیں۔ پانی کے دھوکھت حلق سے اترے تو اس نے پہرے آنکھیں کھولیں کچھ
 جدوجہد کر کے بہت سے چہرے نکلیں نمودار ہوئے پڑ گیا۔ سرور اور سر پڑی رات کا بقایا سفید اس ہائی نے جیسے
 جیسے سر کیا۔ پک سے پک نہ جزی تھی نہ سے بڑے خیالات دھو سے انگ جان کا آزار ہے رہے۔ خدا خدا

پچھلے کے پھندے گاڑے ہوئے ہیں۔ یہاں نہیں وہاں۔۔۔ اس گلی میں نہیں اگلی گلی میں صید و ام میں پھنس ہی جاتا ہے۔ سابق شاہ فاروق کی حماقتوں اور رعیتوں جبری زندگی اور ام کلثوم کے غنائیہ زحموں کے پس منظر میں مصر کے مزاج و مذاق کو خوب سمجھا جاسکتا ہے۔

میں نے جانا کہ مصر کو جانے کے لئے شاہ فاروقی ام کلثوم مغزوہ کے اہرامین اور نیل کے ڈیلٹا کو بہت سمجھنا بہت ضروری ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ دریا میں اترے بنا دریا کو اصلاً نہیں جانا جاسکتا۔ اصل کو جاننے کی غرض سے میں مصر سے باہر اس مسافر کی مانند چڑھا ہوا تھا جو رات فسیل شہر کا دروازہ بند ہونے پر صبح کے انتظار میں جاگا سو بیا ہوتا ہے۔

● دُرویشی و چٹے صحرائی خرید اور خرچنگ بیکری

پچھلی صدی کی ساتویں دہائی کے آخر موسم سرما کے ابتدائی سرخی سے دن تھے میں چرانے سے کے باہر سمندر پار صحرا کے درمیان ایک قدیم قشتی میں تھیں۔ اب اسے بھرا خاندان کی کھڑکتے ہیں یہ سیدوں کے لئے پھر رہا تھا۔ اس کے لئے یہاں کی جانے والی چیزیں تھیں۔ یہاں کی بھری کی بھری کے میری تفریح تھی۔

”فدق ابھرتا ہے بھیر خانے کا کوئی سرج نہ تھا بڑھت تھا وہ ان کہنے سے ہے سم پتروں کی ہر دوں میں پھنسے ہوئے ہیں انہوں نے اپنی زندگی بھر یہی سمجھا تھا کہ یہاں کی چیزیں کا نام تھا اور فرقی نہ ہوتا کہ یہی سرخ ریت پر اترے ہوئے پرانے قالین اور انٹ، بھیر بھیر کے بالوں کی دریدہ رہا جس پر جا بجا میل چیل کے دھبے اندھا چاک نمایاں تھے۔ ان پہلے ہوئے چاکوں سوراخوں سے مٹا اٹے لگے کیڑے کا کر وچ پھولے چھوٹے چھوٹے نیکر سے ننھی ننھی رینگ، یہاں اڑتے ہوئے بلی کی موٹلیں والے چنے گئی چنے گھوٹے اور دلی کاڑی کی مانند نم بھرتے چھوٹے نکل کر آواز دھمکتے چنے رتے تھے۔ ادھر رہنے والوں میں جسے دیکھتے وہ ہاتھوں نہ خوں سے اپنے جسم کے کسی نہ کسی حصہ کو کھینچ کر یا پھانسیا ہی دکھائی پڑتا۔ کسی جگہ رہنے یا کسی جا پر سے رہنے میں اک لمبائی فرق ہے۔ لیکن یہ غریب اللہ یا مفلوک اللہ! آخر میں اللہ سے لے کر پائے تک سب چنے ہوئے ہی تھے۔ میری طرف سے دعا صحت اور حبیب پاکت سے بے نیاز۔ کوئی بھگوانا حاصل یہ اتنا تو ناک کی سیدہ سیدھا اور تھکی کر چلتا۔ کوئی صحرا نوردی سے فارغ ہوتا تو ادھر کمر سیدھی کرنے پہنچ جاتا۔ جیل بیکار سے پلٹنے والے بھی ادھر کھینچ

جاتا ہے۔ اس جو میں نکلتا تھا اور پھوٹا پھلکا کر زیادہ ہوتا ہے۔ اس سراسے کی مخصوص و عام ڈش تھی۔ یہ واحد شریہ تھا۔ جو میں کھیتے اس کے دیکھنے پر ہرے رہتے۔ جسے بھوک محسوس ہوتی وہ خود باورپی خانے آتے اپنی ضرورت کا شریہ حاصل کر لیتا۔ یہ شریہ آتش کی مانند پتلا اور پانکا ہوتا۔ جسے ہر کوئی آسانی سے استعمال کرتا۔ شریہ کے دیکھوں میں جو تو چرتے ہی تھے اس کے علاوہ لمبیاتی ضرورت کے تحت اس میں سحرانی کیڑے بھی چھوٹے جاتے تھے۔

لیجیو اردن اور مصر کے صحراؤں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال حکمت و مصلحت سے ایک ٹیکڑا پیدا کیا ہے۔ جو سمندری دریائی ٹیکڑوں سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ سمندری ٹیکڑے چھوٹے چھوٹے بھی ہوتے ہیں اور ناقابل یقین حد تک بڑے بڑے بھی۔ جنہیں دیکھ کر خوف محسوس ہوتا ہے۔ مگر یہ مخصوص صحرائی ٹیکڑے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے میڈک کی پامد ایک ہی سانپ اور یکساں رنگ و رنگ انسان پر پھر تیل اور پوست و جالاک۔ خدا جانے ان کے پاس کون سی قوت و خاصیت ہے کہ وہ انسان کے اوروں اور نیت سے واقف ہو جاتے ہیں۔ آپ مجھے یا لینے ہیں او خدا کا اسایہ انسانی کو کچھ سے واقف ہو کر سرائے انبیاء بیان تو کرتے ہوئے آجاتے کہیں ریت نہ ہو تو گھاس پھوس۔ اسے چاروں طرف کی بنیوں کے لیے کھا پھر اسے اپنے پیروں پر رکھ لیا جائے گا۔ اس کا دل نہیں ڈرے گا۔ اس کا دل نہیں ڈرے گا۔ اس کا دل نہیں ڈرے گا۔ نظر انداز کر لیجئے اور بے خوف و خطر آپ کے جسم پر دیکھتے چلیں گے۔ پاؤں کی انگلیوں کی درمیانی خدایت ناموں اور کھٹنے کے جھنجھ کے پیچھے کی سیل سیل۔ ناک منہ کی آتش لباس ہاتھ پاؤں کے ہر حصے ہر ناخنوں میں رہائش پذیر غریب موجود ہیں۔ کتنے قبیلے۔ کان کی ٹنگڑی کی سختیوں جو دیں وغیرہ ان کے سر پر کھا ہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ چیزیں انہیں دنیا میں صرف اسی سلامتی آگے پہنچانے یا ہندوستان میں داخل ہونا سکتی ہیں۔ حیرت ہے کہ وہ کمال ذمہ داری سے آپ کو اپنا تحفظ مشفق بناتے ہیں آپ کے جسم میں ایسی ایسی چیزیں دریافت کریں گے کہ ان سے آپ خود بھی ابھی تک واقف نہیں ہو سکے ہوں گے۔

اس عالم بے غاری میں اگر آپ نے کسی مضموم انداز میں بھی یہ سوچ لیا کہ ان تمام باتوں سے کیا جائے تو یقیناً اگلے ہی لمحہ وہ یوں غائب یا چھپ جائیں گے جیسے ان کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ آپ اپنے نہیں ششدر رہ جائیں گے کہ ابھی تو میں نے مشکل سے ارادہ ہی باندھا تھا انہیں کیونکر فرماؤ گی؟ اسی کو اگر آپ نے اپنی لیلائی مہمان کی غرض سے ہشیار بننے کی کوشش یا کوئی ٹپ بھپک کی تو یاد رہے کہ وہ کبھی آپ کے ہاتھ نہیں آئیں گے۔ وہ ماہر انوں باز غمروں کی طرح آپ کو دماغیں بائیں جھوٹے بھانگے دیتے ہوں۔ یہ ہا وہ جا۔ یا کبھی کوئی مقدّر کا پٹا یا تربیت کا کچا آپ کے ہتھے چڑھ نہ بھی گیا تو وہ مالِ شیشہ بطور من و سلو

گود میں چھوڑنے کے لائق نہیں۔۔۔ ترکاریوں میں تری کی تر تار بہت ختم ہو گئی ہے اور اوسر دیکھوں کے چلے
خٹک لوکیوں کی تری مڑی ٹیلیں مصری تریوں کے اوسر خٹک چھلے۔۔۔ پرانے ریزسول اور سیاحوں کے
سفر ناموں کے بیکار مسودے جل بجھ چکے تو جانیں کہ ایسا شریہ محض چاہی جاسکتا ہے۔ جو بے انتہا مصلحت
نوب خواب آور ہے۔ ایسا شریہ پینے کے بعد میں نے سلیمان ایڈمز نو چار پرانے رہنے والوں کے ساتھ
اور کو آرام سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہر بندہ پانچامہ تھا ہے باہر بھانٹا دکھائی دیا۔۔۔ جن میں میں نے
شامل ہوتا۔۔۔ گو میں بھی اسی قبیلہ بیکاراں نادرد و زکاراں میں شامل تھا جن کا کام ہی رنگ یا بوسیدہ تو
چرے رہنا تھا کیونکہ نہ تو اوسر آنے کی دعوت تھی اور نہ ہی یہاں سے جانے کا تھا نہ تھا۔

بنی اسرائیل کے لئے من و سلوئی خاص طور پر آسمان سے اتارتا تھا لیکن یہاں اس قبیلہ آورہ
کا من و سلوئی جیسے شش بہت عالم سے بھرا دیا جاتا تھا۔ خود رو اور قسم کرکھیاں انہیں اور اوسر سحر سے مل جاتا
تھیں۔ آسمان سے پانی کی بجائے بھار ہا انداز بارش ان کے قدیمی حوض نماتا آب تک پہنچ جاتا۔ ہر صبح پانچاں
کھنے مل کر خائے کو رسا مل تک جاتے اور جو کچھ بھی مادی گیر سمگلر اور سمندر ساحل پہ انڈیا جاتے یہ
اسے گزیر لیں یا کھالٹے۔

UrduPhoto.com

اندھروں میں انسانوں کو سنگسار کرنے والوں اور غیر قانونی مادی گیری کرنے والوں کی کھچیاں اور
بازے اپنی کاروائیاں کھلا کرتے تھے۔ انکی ہارنوں میں ہوا کدوں بنے یہاں پہاڑوں کے۔ اور
آنے پا آئندہ گئے اٹھارہ آگے۔۔۔ جسے واری کی بات۔۔۔ کہ کوئی کسی کے بدلے یا آلے کی بات دریافت کرے
کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ کبھی کبھی مڑی بدو دار چھلیاں بھی مل جاتیں۔ جن کی سزا اندازہ
ہذا اتنی گزرتوں کے بار بار استعمال ہونے والے تیل میں بھون کر نور کیا جاتا۔ ساحل سے اٹھا کر
جائے والے مال غیر خیرات سے بعض اوقات بڑے کام کی بیج بن بھی دستیاب ہو جاتیں۔ پرانے
پتھر سے کیتھن کی ٹھیکیں اڑتے اور دیوں کے ٹھکڑے۔ شراب پیہ کی خالی بوتلیں، سگریٹ سگار کے اوسر
ٹھکڑے کھانے پینے کا فضل اور باسی سامان۔ ٹھیکیں بکڑنے کے پرانے جال، نوچیاں، لکڑی کوٹے اور
کاٹھ کھال اور کبھی کبھی توان لوگوں کے دار سے نیارے بھی ہو جاتے۔ روپے پیسے گزریاں اور سونے یا
کے لئے نوچیاں بھی ہاتھ لگ جاتیں۔ پہلی چھپوٹے جھلی کرنی سرے سرے لوگ بھی۔ پیسے پائے جاتے۔
وہاں سے لے جانے والے سامان کو سن و سن سلیمان افی کے پھر کر دیا جاتا۔ وہ کمال مراد
سے اس سامان سے ایک ایک چیز الگ کرتا۔ شریہ کا سامان الگ، ایڈمن کے لئے استعمال ہونے والا الگ

تھا کہ وہ دونوں سروں کو غم کئے نکالیں اور برور کئے دایاں ہاتھ وال پہ لگائے ان بزرگ کے ہر جنبش طیب طیب طیب مہر جہا مہر جہا کہے جا رہے ہیں۔

ظاہر ہے اب میری باری تھی۔ میں گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ مجھے نیچے اترتے دیکھ کر وہ تینوں کا دل نہ جان بآگئے۔ میں نے آگے بڑھ کر بڑی عاجزی سے سلام کیا۔ حسب رواج و روایات انہوں نے سجدہ فرمایا میرے گال پہ بوسہ دیتے کیا اور میرا حال احوال پوچھا۔ اب میرے لنگھی ڈرائیور نے مجھ سے کہا کہ میں اجازت دوں تو ان بزرگ کو ساتھ بٹھالیں۔ ان کا گواں کہیں قریب ہی تھا۔ مجھے کیا انکار ہو سکتا تھا۔ بلکہ میں نے فوراً انکار و ردہ کھول کر انہیں سیٹ پہ بیٹھنے میں مدد دی۔ ان بزرگ نے بڑی شفقت اور مہربانی مسکراہٹ سے مجھے آفرین کہا۔

گاڑی چل دی تو انہوں نے گلیوں کے وسیلے سے مجھ سے بات چیت شروع کر دی۔ وہ عربی میں مخاطب تھے۔ گائیڈ انگریزی میں ترجمہ کر کے ہم دونوں کی مشکل حل کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے متعلق جب آگاہ ہوتے تو بہ وقت پلٹ کر میری جانب قسین و آفرین بھری نظر میں سے نکلتے۔ خاص طور پر پاکستان اور میرا یہ صحت کا شوق۔ اس سب سے علوم حکمت کا جنون، جسے جان سب باتوں انہوں نے بیان کیا۔ ان کا بیان تھا کہ ان کا بھائی جی ہال ہیڈ میں یوں تھیں کہ پتا بھی نہ تھا ان کے گاؤں پہنچ گئے۔ گاؤں کیا تھا چند معمولی سے گھر چھوٹی سی مسجد اور پتھر ایک مدرسہ ہی تھا۔ بیٹا بڑی شاہراہ کے کنارے پہ چند گھر وٹے پرانے کھجوروں کے درخت ایک ٹھہر والی سے رہ رہا تھا۔ چھوٹی سی مسجد۔ چند مصیوم کے لئے بھی دکھائی دے گئے۔ لنگھوں تک اتنی چھوٹی جگہیں اور سروں پہ کپڑے گول گول ٹوپیاں۔

شام کے ساتے اب غاصے ہو چکے تھے۔ گاڑی رکتے ہی مجھے تیز تیز کلام کرتے ہوئے قریب آ کر خوشی کا اظہار کرتے گئے۔ ان بزرگ سے پہلے ہم تینوں بیٹے اتر چکے تھے۔ آرائیور نے وہاں کھوا۔ دو اپنی مہا اور قبا منہ دے دوئے بیٹے اترے دکھائی دیتا تھا وہ اب عمر اور فطرت و تدبیر کے اس قدر کئی چکے ہیں جہاں موجود ستر تو ہم بولے کو اور ان کے سر کے مشورے ہو رہے ہوتے ہیں۔ تھکاوٹ اور شہتہ صاف پیرے پہ مریں تھی۔ مگر کیا بول بول مزاح کی فطرت اور طبیعت کی بڑائی میں کہیں محسوس نہ ہو دکھائی دے کہیں سب سے پیچھے سر دے لے گا تھا میری جانب لو کر دیکھ پھر میرے قریب آئے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سامنے سجدہ کی جانب ہونے لگے۔ آرائیور اور گائیڈ بھی پیچھے پیچھے سایوں کی طرح بڑے ہونے پہنچے رہے تھے۔ چلتے چلتے اچانک بزرگ نے تیز تیز عربی میں کچھ بچوں سے کہا بچے طیب طیب کہتے بٹھاتے ہوئے

کہ وہ اب بھی وہیں بیٹھے ہیں۔ گاڑی کے اندر اب بھی وہی بیچیدہ ماحول، وہی مہلک خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ کہتے ہیں عورتیں اور عربی کہیں بھی بیٹھے ہوں وہ خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔ عورتیں کٹر کٹر اپنے کے سرہ تلے سے ہاتوں، پتیلیوں کی چھالیاں کا قتی رہتی ہیں۔ اسی طرح عربی النسل کہیں بھی ہوں اپنے ہیرا پیر شروع ہی رکھتے ہیں۔ موضوعات کی ان کے پاس کی نہیں ہوتی۔ گھوڑے، گائے، امریکی، نئی نئی شادیاں، تیراکی کے تالاب، بھینا، لالو، صوفی اورین، نام بکثرت رکھنا، تیلان، پانڈا، شکرے، موسم، موسم، موقع کوئی بھی ہو وہ بلا مکان بولتے چلے جائیں گے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اعتراب نکالتے وقت جس طرح مہارت سے وہ اپنے حلقوم اور زبان تالو کا استعمال کرتے ہیں ایسا اگر کوئی بھی کرنا چاہے تو یا اس کے منہ میں بیٹھ جائے گا۔ تالو پہ چھکا گئے گا یا پھر اس کی زبان لوٹ جائے گی۔ حیرت کا مقام تھا کہ پورے عربی النسل خاموش تھے اور میں بھی ان کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پوری ایک سو فی صد سے ان کے بارے میں اپنے آنسو باہر کے سارے اندازے، قیاسے، قیاسے ٹٹول رہا تھا۔ خاص طور پر ان کی خاموشی، کئی بار یہی کہتی ہوئی یہ بات بڑی تسکین افروز تھی کہ ”تمہارے پند یہ وہ موضوع پر گھٹکا نہیں ہوگی“ میرا ان سے ملنے کا اشتیاق دوپندر ہو چکا تھا۔ جاگت، خاموشی کے پر سکون، ہلاکت میں ایک نئی قسم کی تسکین ہو رہی تھی۔

UrduPhoto.com

”قاسم! مجھے کچھ ان بزرگ کے بارے بتاؤ؟“

میرے سامنے سوا میرا گائیڈ جسے میں پاکی، شلنگ، موڈ، لباس، انگلیش، سوجن اور ضرورت کے لحاظ سے کھانے پینے کے معاملہ پر مشورہ دیتا تھا، مجھے سوا کے ایک ایک گوشہ کا نقشہ دیتے ہوئے نے پوچھا: ”مجھے کچھ اپنی بیوی کے بارے میں بتاؤ۔ وہ عوام بھاڑ کیسے میری آواز خالی خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کس نے انکھیں پٹی پٹی ہوئے کہا۔“

”بھائی! میری طرف یوں کیوں دیکھ رہے ہیں۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ مجھے ان بزرگ کے بارے میں کچھ معلومات بہم پہنچاؤ۔۔۔۔۔ ان کا نام کام اور اگر کوئی کاروبار ہو تو وہ بھی۔۔۔۔۔“

اس کی بھالے آراہج، نے جواب دیا۔

”ان بزرگ کا کام پولنگ، لیائی ہے۔ ان کا تعلق اس خاندان سے ہے جو صدیوں سے حضرت کے قبائل کے عداوت کی مہارت سے سنبھلے ہوئے ہے۔ یہ بزرگ یہاں کے کلید بردار بھی ہیں۔۔۔۔۔ تم آگے جانتے ہو گے کہ کلید بردار جو بڑے فرد ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ حکومت کی جانب بڑی خاص مراعات دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ اپنی ذاتی حیثیت میں بھی بڑی قابل قدر اور پختی ہوتی شخصیت ہیں۔“

میں نے فرمایا کہ یہ تو قوی تبلیغ و تدریس اور مراقبات و عبادات میں گزری ہے۔ اس علاقے میں
میں نے یہ ان کی دینی عزت و تکریم کی جاتی ہے۔ اور کچھ پوچھنا چاہتا ہوں تو پوچھ سکتے ہوں۔“

نیکہ قسمت سے موڑ پڑا اور نے گاڑی کی رتی رستہ سے گرتے ہوئے پھر خود ہی کہنا شروع کیا۔
کہ بزدل کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ یہ صاحب کشف ہیں۔ مراقبہ القہر بھی کرتے

میں کان کھڑے کئے آنکھیں پھیلانے اس کی ایک ایک بات پر وہ بیان دیئے ہوئے تھا۔ لیکن
سہرا گایا گویا ہوں۔

کہ ہے کہ پیغمبروں کے وقتوں کے کئی جنات بھی ان کے پاس آتے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں وہ
بزدل بزرگ مہربان سے جن ہی رکھائی دیتے ہیں۔ یہ میں نے کئی بیان دیکھے ہیں اور بیان لے کر آتا ہوں۔ ان
جنات اور صحبت سے فیضیاب ہوتا رہتا ہوں مگر آج ان کی ایک عجیب سی کیفیت دیکھی جو اس سے قبل
میں نے نہ دیکھی تھی۔ انہوں نے آج تک کسی کی ایسی پے پرائی کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے
کہا کہ میں تو ابھی تک ان بات پر حیران ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ کبھی شفقت و درگزر سے پیش آ
تے تھے۔ اب تو انہوں نے یہ بات کہہ دی کہ اب ان کے ساتھ اس قدر سختی ہو گئی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے
کہہ رہا ہے کہ اس کے ساتھ اس قدر سختی ہو گئی ہے کہ تم بھی کوئی جتنی جتنی سستی ہو۔ تب ہی تو انہوں نے تمہیں
اس قدر سختی سے مارا کہ تمہاری ہڈیاں پڑھنے کے لئے بلایا ہے۔ اور پھر یہ کہ کل وہ اپنے ہاتھ سے کو خاص طور پر
میں نے اس کے لئے بھیجے۔“

اس سے پہلے کہ میں اس کی ان باتوں کا کوئی جواب دیتا تھا مگر شہر کی حدود میں داخل ہو چکے تھے اور
میں نے جگہ جگہ پرست پر رک بٹکی تھی۔ اگلے چند روز میں میرے خدق تک پہنچنے میں صرف دو دن
کا وقت تھا۔ میرے لئے ان دونوں نے بڑی عقیدت سے میرے ہاتھوں پر بوسہ دیا تھا۔

بڑی رات بھی میرے لئے جا بجا بات لے ہوئے تھی۔ کہا ہاتھ میں کہا کرتا تھا۔ ہر
دن سے خوشتر میں نے توبہ منلوایا۔ تیر روز کے بیٹھے ہوئے۔ سچ لکھتی تھی ہر سامنے رکھ لئے۔ یہ تو بڑا اور
میں نے کہنے ہوئے سچ کہا تھا بھی بڑا اور دل مشغول ہے۔ اور کھلے چلنے سے جاکسٹری میں نہیں چلے چکے۔
میں نے اس سے سچ کے ساتھ رہنمائی نہ تھی میں نے کہا ہے۔ اس طرح یہ بے حد عریض اور سخت اور سخت بخش ہو
تے ہیں۔ عریضوں میں بے کاری وقت گزاری ہو اور افراتفری تو قیہ انتظار یا غم اور خوشی کے لحاظ میں تمہارا کوئی

میر نے فاضل بھلاؤن کے کس کاغذ میں سوپنے لکے یہاں تو بڑے بڑے اجل فاضل حاضری لکھتے تھے۔ فاضل قاتل کے مزارات کے متوفی جو ٹھہرے کیا کلام ہو جاتا تو فی قلب بھی آتے ہوں۔

میر نے ایک اور جہان و بجزار کی حالت و صورت سے میر کی ظاہری باطنی حالت متراش تھی۔ آخر اس نے کسی اہستہ و محبت دینے کی کوئی وجہ؟ اس سرکش کی دوسر گروی میں رات کے کسی پہر آخر کہیں آنکھ بڑھ گئی۔

صبح کو بیچے کے آس پاس ٹیلیفون کی کرخت اور مسلسل ٹھنکی نے مجھے گہری نیند سے اچاٹ کر دیا تھا۔

میر نے انگریزی فی میں گڈ مارنگ کہہ کر اس وقت شرب کرنے پر معذرت چاہنے لگا۔ آنکھوں میں آنسو تھا۔ کچھ سو یا ہوا کچھ جاگا ہوا ایسے میں کچھ جان نہ پایا کہ ایسی شست انگریزی بولنے والا میرا دوست ہو سکتا ہے جبکہ اس بول کا بھرپور میں نے کسی کو نہیں دیا تھا۔ بیشتر کہ میں پتھر وان سیدھا جواب دے پھر سلسلہ کلام شروع ہو گیا۔

میر کا نام ٹیلی فانی ہے مجھے اپنے وقت آپ دادا سے ہدایت ملی تھی کہ میں آپ سے رابطہ کرے کہ میرا دل کو بظاہر دیکھتا ہوں کہ میرا دل آپ کے دل سے کتنا دور ہے۔

میر نے کہا کہ میں یہ پھانی ہوتی دیکھتا ہوں۔ چلی تھی میری کہانی کو داسا پکا انگریزی بولنے کا بزرگ کا

میر نے کہا کہ میں نے سب سے بڑا کچھ نہیں اپنی بولکھا اس پر قابو پاتے ہوئے یہ شکل کہہ سکا۔

میر نے کہا کہ میں نے سب سے بڑا کچھ نہیں اپنی بولکھا اس پر قابو پاتے ہوئے یہ شکل کہہ سکا۔

میر نے کہا کہ میں نے سب سے بڑا کچھ نہیں اپنی بولکھا اس پر قابو پاتے ہوئے یہ شکل کہہ سکا۔

میر نے کہا کہ میں نے سب سے بڑا کچھ نہیں اپنی بولکھا اس پر قابو پاتے ہوئے یہ شکل کہہ سکا۔

عربی پٹھان اور سکھ بچا ہے ساری زندگی میاں بیچرں لندن فراتو یا نیو یارک میں بسر کر دی ہے۔
وہی عربی پٹھان اور سکھ ہی ہیں۔ اپنا نمونہ لٹی لب دلچ اور طرز حیات نہیں بدلتے۔ ٹیبل پرانی نظام سے کھانا
فصلیات آب بزرگ کا پوتا تھا اور وہ بزرگ سوائے عربی کسی اور زبان سے نا بلد تھے۔ اب اس نا دیو وادھو
لہجہ سچ کہیں بھی اس کے شامی ہونے کی چٹائی نہیں کھاتا تھا۔ میرے دل میں آیا ممکن ہے ان بزرگ کسی
کسی غیر ملکی ماں کے بطن سے ہو اور اس کی تعلیم و تربیت کسی یورپ وغیرہ ہوئی ہو۔ بہر حال اب میں
تقدس کے چٹکل سے نکل کر پوتے کی پُر لطف شخصیت کے منگل میں گم ہو چکا تھا۔

ہوٹل کی تیسری منزل پہ میرا کمرہ اس کے عین صدر دروازے کے اوپر تھا۔ کمرے کی دونوں کھڑکیاں
باہر سڑک کی جانب نکلتی تھیں۔ نہایا دھویا کپڑے تبدیل کئے لگا سا شیشہ لیا۔ بارہ بجنے میں پانچ منٹ سے
تھے کہ میں نے کمر کی کھول کھینچنے بھاگا۔ اگر عجیب و غریب موٹر سائیکل وہاں نہ ہوتی تو سمجھتا کہ کوئی اب
ڈیٹ نوٹر باز قسم کا دوغیر کھڑیاں پر فحشاء و فحشیں پان بیچنے والا مجمع لگائے دوکاندار کی کمر بابا ہے۔ موٹر سائیکل
جھاڑی سیٹ سے کٹی ہمارے کھٹے پہ کھنچا چڑھائے وہاں کھڑا تھا جیسے کونڈے ہاتھی وغیرہ کا کارکر لے کر
مستند یا شیشہ کے شیشے کے ساتھ تصویر ہوا۔ اس قدر کہ اس قدر لگا لگا تھا۔ انہیں یہاں
کو اس ناچا کو جو دیکھ کر میرے کمرے کے جیسے دو موٹر سائیکل نے کوئی انسان شستری ہو اور اس کی بجائے
سے گر کر اڑھت پڑی ہو۔ امریکن ہیرو کی طرح لامبا قد پھیرا بدن مضبوط ہتھکڑیاں۔ اس کی حالت عجیب
ہوئے تھے۔ شرت بھی کھینچ رہی تھی۔ آنکھوں پہ گالگل چڑھی ہوئی تھی۔ اس کے منہ میں اوپر سے آنکھیں
ان کا رنگ نہ دیکھ سکا۔

یہ شخص صلی طور پہ بی بی ہوئی موٹر شیشیں جو زیادہ تر چند میل ہوتی ہیں یا ہر صدمہ و جدوجہد میں قتل
صورت میں انصوم آردار پہ شوقین لوگوں کے لئے تیار ہوتی ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں ان کا بڑا کر جیتے
ان مالک کے بڑے بڑے موٹر بڑا چہ اگر آپ سفر کر رہے ہوں دیکھیں گے کہ آپ کی بغل سے شوق
اک ازن شستری ہی نمودار ہوتی اور دیکھتے ہی دیکھتے آپ کی آنکھوں کے سامنے پیش منظر میں نقطہ نظر
ہو گئی ہے۔ جس طرح ٹلی سپورٹس کا رہیں راہجو و قریب قریب لپٹ کر ذرا نیو کرتا ہے اسی طرح اس سپورٹس
بھی قریب قریب رانچ کی حالت میں پہنچ کر ذرا نیو کیا جاتا ہے۔ ذرا نیو رکھا اس اگر آپ ملاحظہ کر لیں تو
ستے ہیں یہ بندہ کسی خلائی بہانہ پہ جانے کی تیاری میں نکلا ہوا ہے۔ اس کا ارانچور بھی گوشت پرست نہ ہے
زیوی و یوی مشین کی مانند ہی ہوتا ہے۔ اس مشین کو اہل ملی میں ذرا نیو کرنے والے زیادہ تر نیو پیسے اور
ہوتے ہیں ان کے جس میں ہوتو وہ اس مشین کو ازن شستری سمجھتے ہوئے اگلا پیہ اٹھا کر افلاک کی جانب

سے سر پہ وہ خفائی خول پہنا جسے انگریزی میں ہلمٹ کہتے ہیں۔ صورتی کے نیچے قسمہ باندھ کر اس سے کھمبے کے آگے براؤن رنگ کی ٹیک کی سکرین گرائی اور کمال بے اعتنائی و بے پناہی سے خیر و مار کیا۔

”میرے پیارے دوست! فوراً سنبھل کر بیٹھنا۔ رفتار اور کردار کے معاملہ میں یہ اصل حق ہی ہے۔ زیادہ قابلِ تخر و سد نہیں ہے۔“

میں نے کچھ زیادہ نہ سمجھتے ہوئے یونگی پوچھ لیا۔

”کیا مطلب...؟“

اُس نے مشین ”سکرین“ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

”رفتار اور کردار کا مطلب سمجھانے کے لئے مجھے تمہیں ایک واقعہ یا قصہ سنانا پڑے گا۔“

عمر و عیار کے وقتیں میں کہیں ایک بدولت کی تحریک و سر و حرکت کے تحت گدھا خریدنا چاہا تو وہ گدھا کے تاجر کے پاس پہنچا اور اپنا منہ یہ ظاہر کرتے ہوئے کیا۔

”مجھے کوئی ایسا نالی اور نہ نامانی شریف بہادر سا گدھا چاہئے کم از کم جس کی رفتار اور کردار...

UrduPhoto.com

گدھا ہے۔ بڑی گہری تحریک سے اپنے گدھوں کے رویہ کو دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

”معتز! یہ ارادہ سنا سے حاضر مال کا بی گدھوں کا ہے۔ ان میں کوئی ایسا گدھا دکھائی نہیں دے گا۔“

آپ کی صلابت کے مطابق گدھا ایسا ہی تھا جس کا نام ہی تھا۔ ایک نامور گدھا جو سو...

ہے گدھا کہنا اس کی تو جین کے صداق ہے۔ اگر آپ چاہیں اور اس کی شاہ شاہ قیمت ادا کرنے کا...

رکھتے ہوں تو حاضر کرتا ہوں۔“

فریاد اس کی تاجرانہ جذب زبانی سے خاصا متاثر ہوا اور جانور کے ملاحظہ کا ارادہ ظاہر کیا۔

کشاں کشاں اپنے گدھا پہنچا کچھ دیر بعد ایک منزل سے گدھے پہ سوار ہوا پس آیا۔ گدھا پہ مشکل اُس...

ادبے لڑکچڑاتا ہوا مھسوس ہو رہا تھا۔

”تمہیں تو غریب مارا یہ خاص الکاس فراموشی جانور ہے آپ نے گدھا کہہ کر اپنی مادی کی کاوش...

آپ کو کبھی نہ نامانی اور شریف قسم کے جانور کی خواہش ہے جو رفتار اور کردار کا بھی معاذی ہو یہ...

اوصاف حمیدہ صرف اور صرف اسی میں موجود ہیں... اتنی لئے تو یہ الگ باندھ کر دکھا ہے کہ مال ایسا...

مزید بتانے لگا۔ ”آپ کے نصیبوں میں اگر یہ نامور گدھا موجود ہے تو سبحان اللہ۔ ورنہ وہیں ہونا...

بنا تھا۔ میرے اوپر بیٹھتے ہی وہ نیچے بیٹھنے لگا۔ یہاں تک کہ میرے نیچے زمین پر لگ گئے۔ یہ تو ہوائی آنے کی چال کی حالت اب اس کے چلن کا آنکھوں دیکھا حال سنو۔ میری اور میرے نصیبوں کی بربادی کے سوتے سے کہیں ایک ایڑ باگی سی گدھی چنداں بوجھ اٹھائے اٹھایاں توڑتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ اس پر نظر آتے ہی اسے جنوں پڑ گیا۔ جسم اٹھنے لگا۔ گردار کے اندر جیسے ہاتھی کی قوت اٹھ آئی تھی۔ وہ ڈھیلچکوں ڈھیلچکوں کی دھماکیوں لگا کر ہوا گدھی کی جانب بھاگا۔ میں اوپر سوار کہاں تک سمجھتا۔ ہاتھ بھارنے جو ایک ٹھوکہ لگا اور میں نیچے۔ میری حالت دیکھو بڑی مشکل سے گرنا پڑتا یہاں تک پہنچے ہوں۔ اب میری بات غور سے سنو۔ جا تو رہیں بلکہ سو فیصد گدھا ہے اور میں یہ بھی دھوئی کرتا ہوں کہ خراسانی ہونا تو زور کی بات یہ لڑسیا دیکھائی گئی نہیں۔ یا تو یہ بیکانی یا پھر صومالی ہے تمہارا۔ چال اور چلن کے دونوں دعوے غلط ثابت ہوئے اب تم میرے رقم واپس کرو۔

نہیل مجھے رفتہ رفتہ اور کردار کی کہانی سنار ہاتھ اور میں اس کپڑے ہتھوڑے کے لٹنے کی طرف دیکھتا تھا کہ کس منہ سے ایسی گل گفتاریاں کر رہا ہے۔ اس ایڑی عمر میں ایسی بلکہ سی باتیں کہیں نے کہاں سے کہیں۔ پانچ گھنٹے کہنے کا ایسا من مہرنا اٹھ کر کہاں۔ چلا۔ مجھے اس طرح کھینکے گئے کہ مجھے حتم طریقہ کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اچھا اچھا میرا خیال ہے کہ میں کچھ زیادہ سی بلی رہا ہوں۔ پھر کلائی کی گھڑی پر غور ڈالتے جاتے ہوں۔ "اوہ اسم لیت ہے ہیں۔ چلو بیٹھو۔"

● نہیں ہاتھ اور قاتل۔

گولان کی پہاڑیوں کی باپ بڑھنے والی سرک ایسی کچھ کٹھنہ بھی نہ تھی کہ یارپ کی بڑکوں کے طرح اس پہاڑی چارگان لڑیاں برابر بھاگ سکیں۔ پھر یہاں ہی ملاقات خلیب و فراد چھوٹے بڑے موڑ۔ اس صبر سادگی پہ درانیر کے پیچھے بیٹھا ہوا ساتھی عجیب سی گولکوں کیفیت میں پھنسا ہوتا ہے۔ بات و ات قاتل باطل ہی نہیں کر سکتا۔ تیز رفتاری ہوا کا وہاں درانیر کے ہلے وغیرہ کی وجہ سے وہ مظلوم درانیر سے ہاتھ کٹا ہوا ہوتا ہے۔ ہاتھ کٹنے کا اشارہ ہوا کا انھیں لڑھکتے میں چٹکی وغیرہ کا درانیر کو کچھ احساس نہیں ہوتا۔ حتم طریقہ نے اتنا کچھ اور ایسا کچھ پہنا اوڑھا ہوتا ہے کہ اسے برف والے سوتے یا چھوٹا موٹا لٹاڑھوک کہہ سکتا ہے کیا جاسکتا ہے۔ اس مولر سائیل کے آگے راستے سننے ہی نہیں سکتے بھی جاتے ہیں۔ لگتا ہے

جسٹس کی کھڑکی سے سڑک روٹی ہو رہی ہے۔ کسی شہر خوشیاں یا کسی ملک غم و فحشت میں پہنچنے کے لئے اس سے گزرنے والے مسافر ساری ایجاؤٹیں ہوتی ہیں۔ میں تو ویسے بھی جب کہیں باہر جانے کا قصد کرتا ہوں تو انہیں احوال پیش پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یعنی سفر آخری سفر سمجھ کر ہی شروع کرتا ہوں۔ اس کے باوجود میں پیچھے سہا سہا کرتا ہوں۔ اُسے ہونے چاہیے کی طرح سنا پچا کر بٹو بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی کافی آنکھ سے اپنے دائیں بائیں کی طرف متوجہ ہوتا تھا۔ مگر اس کی طرف سے ہرگز کوئی اشارہ نہ ملتا تھا۔ اس کے سامنے کے اشارے کے اوپر سے سامنے دیکھا تو سڑک سے ٹکراتے کر پانچ سات گھنٹے پہلے گھر گھر دھڑے اٹھنے والے چھوٹی سی مسجد اور ایک دو دو گھنٹے پہلے ایک قبوہ خانے کے سامنے پہنچ کر روک گئے۔

”پاپے کافی قبوہ دیا کوئی حالت ڈر نہیں“

اس نے جھٹکھڑکاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

”بھئی کون مجھے ضرور سے نہیں“

”الطاف! لیکن میں ایک حد تک ریسٹ کر رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو اسے کیا پتا ہے؟“ اس نے کہا۔ ”میں نے اسے کہا ہے کہ اس کا دل بڑا بڑا ہے۔“

”میں نے اسے کہا ہے کہ اس کا دل بڑا بڑا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے اسے کہا ہے کہ اس کا دل بڑا بڑا ہے۔“

”میں نے اسے کہا ہے کہ اس کا دل بڑا بڑا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے اسے کہا ہے کہ اس کا دل بڑا بڑا ہے۔“

”پاپے میٹ.....“

اس نے السلام علیکم کی دعا سے یہی کہا۔ اکیڈمی کے ملائے یا زائرین میں متوسط طبقہ کے لوگ آپس میں مل جل رہے تھے۔ یہاں شراف میں ایسا لب و لہجہ اور طرزِ خطاب و گفتگو نہیں آتا۔

میں پھر ایک بار سوچوں کی دلدل میں اتر چکا تھا۔ یہ یقیناً مائیسٹر لیزہ زیا پر یڈ فوراً کی کسی یونیورسٹی میں رہا ہے یا زیادہ وقت اُدھری گزرا ہے۔

اس نے بے تکلفی کا ہاتھ بڑھا کر مجھے سوچوں کی دلدل سے باہر کیا پھر خود ہی بتانے لگا۔
 ”جانتے ہو میں کہاں گیا؟“

میں نے جواب میں جھوٹوں کی طرح ٹکی میں سر ہلا دیا۔۔۔ بتائیں؟
 وہ بانگیں آنکھ دبا کر بتانے لگا۔

”میں اپنی گرل فرینڈ سے ڈراما سٹ سٹاپلو کہنے گیا تھا۔۔۔ یہ قبوہ خانہ اور سنسور و کچر ہے جو۔۔۔
 یہ میرے ہونے والے قادر ان لاگا ہے۔۔۔ جو رشتے میں میرے قریب کے انکل بھی لگتے ہیں۔“

موسٹر سائیکل کو ٹک مارے ہوئے مزید بتانے لگا۔
 ”اس قبوہ خانے کا نام کلثوم ہے، میں اسے پیار سے ٹوی کہتا ہوں۔ بڑی ٹریس فل سمارٹ ہے۔

میرے ساتھ ہی پڑھتی رہتی ہے۔ آئے والے تجربہ اس کی باتھ روم ہے اور اسی دن ہماری بھی سو باغی کی انٹال انڈا“

UrduPhoto.com

انہیں اپنا سگریٹ اس کو دے آیا ہوں اور یہ سگریٹ اس کی ناک سے نکال کر لایا ہوں جسے
 سگریٹ کے فلیمر پر کڑی غصہ کا نشان نظر آ رہا ہے۔ ”وہ سگریٹ کی راکھ کونہ ہاں پہ بھاڑتے ہوئے رہا تھا۔

”آئی کوئی ٹوی۔۔۔ آئی کوئی۔۔۔ ڈھنچو جلدی کرو۔ ہم پہلے ہی لیٹ ہیں۔“

پیاز کی اونچائی پہ حزار پہ پینچے تو مسجد نما گھر کے ساتھ تھہرے، ہموار جگہ چٹائیوں اور تپاؤں۔
 پھر لوگ بیٹھے ہوئے دکھائی دیے۔ یہ قریب قریب سارے ہی فوجی تھے۔ وردیوں میں ملبوس۔ یہ کہیں

ان کا اسلحہ بھی چاہوا تھا۔ تقدس نامہ بزرگ سیاہ جواڑے سر پہ ستار ہاتھ میں مصداغ خطبہ ارشاد کرتے
 تھے۔ غبار ہے کہ ہم دیر سے پینچے تھے۔ دارے سب سے اہم دونوں المنظرے چنبھے چٹائی کے کونے پہ جی ٹھہرے

تھے۔ نماز کے بعد فوجیوں نے فرد افراد بزرگ بابا سے مصافحہ اور مصافحہ کیا اور اپنے اپنے راستوں پہ چلے
 ہو گئے۔ کچھ اور مقامی لوگ بھی تھے بعد میں حضرات کی آواز سے کچھ بزرگی جوان خواتین اور بچے بھی آئے۔

آئے۔۔۔ جو بزرگ بابا کے گرو صلتہ بنا کر بیٹھ گئے۔ ہر ایک کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان تھا۔
 انہوں نے درمیان بچھے ہوئے دسترخوان پہ سجا کر دکھوایا۔ پھر کھجوریں، زیتون کا پھل، دودھ، دہی۔۔۔

تھیں۔ انہیں سر کے مٹا دیا ہوا اچار خشک میوے اور حلویات بھی تھے۔ کھانے سے پہلے بابا
 سے ایک سلیک کی حال احوال دریافت کیا۔ پھر بسم اللہ کہہ کر کھانے کا اذن دیا۔ عربی تھوری
 ان تینوں کا اکٹھا استعمال بھی اکٹھا ہی تھوڑا سا تھا۔ اور ڈاکٹر ہے۔ ساتھ دو چار کھجوریں
 اس سے بہتر مکمل اور سادہ غذا لایا میں اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ بالکی پھلکی باتیں اور
 کتے سے بھی ساتھ ساتھ چیتے رہے۔ قہوے کے فحجان بھی تھے آدھا آدھا گھونٹ قہوہ بھی نصیب ہوا۔
 کھانے کا خیر لایٹنگ ہے۔ کھانے سے فراغت ہوئی تو بزرگ بابا ہاتھ منہ دھوا کر بیوڑے پہ تشریف
 لے کر سب باری باری ایک ایک فرود ہاں پہنچ کر بزرگ بابا سے اپنی بات کرنا۔ میں نیل کے ساتھ دور
 بڑا بڑا ہر اک کی بات غور سے کان لگا کر سننے کسی کو مشورہ دیتے کسی کے سر پہ ہاتھ
 رکھتے۔ کچھ پڑھتے۔ پھر پڑھتے۔ کسی سے لیتے کسی کی آکھوں پر دم کر کے
 نے جوان بھروسے غور میں لڑکیاں سب ہی اپنی اپنی باری جاتیں۔ مصلحتی مصلحتیں سی ہو کر واپس

کسی سے کئی سے مجھے متوجہ کیا۔ مجھے خراب کیا۔ کبھی بہت دور سے خاموش چلا جاتا۔ اب میرے

UrduPhoto.com

کے لئے بڑا ہوشیاری سے جواب دیا کہ شاید میں ہمارے مہرہ ایسی چٹنی مٹی کی کوئی تھاکہ جس پہ پانی
 نہ لگے۔ آسواؤں شہر میں کسی بھی چیز کی کوئی نہیں ہوتی تھی۔
 میں نے ہاتھ سے میرے کھنے کو دہاتے ہوئے کہا۔

میں نے اور کچھ رہا۔ یہ خوش عقیدہ خوش فہم اور خوش خواب۔ سیدھے سادھے کیر کے فقیر
 یاں تو کہ ہم تیسری دنیا کے مسلمان ذہنی اور فکری طور پر نائے عمر نہ ہی خوش عقیدگی اور خوش فہمی
 میں۔ میں نے اور فریب انسان کبھی بھی اپنے ہم عصروں کے ساتھ قدم سے قدم مار نہیں چل سکتا اور نہ
 اس کے ساتھ ساتھ کھانے کا ساتھ دے سکتا ہے۔

مجھے نے بی بی ناکواری سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

میں نے اس کی ضرورت اور وقت کا انتخاب سے دعا میں کر دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں چومنا یا تعویذ
 میں نے کرنا نہیں۔ جدید ٹیکنالوجی ایڈوانس سائنس کو پڑھنا سیکھنا اور حاصل کرنا ہے۔ تم نے میری

سید مشین دیکھی۔ یہ کس نے بنائی کیجاوکی۔ تم اس کے میکینزم کو دیکھو تو حیران رہ جاؤ یہ ذور اس مشین کے
 کہیں اوپر خلاؤں میں گردش کرتی ہوئی مشینوں کا ہے۔ کیا کبھی ان ساواہ لوح انسانوں نے غور کیا کہ یہ کس
 کس نے بنائی ہیں کس کی ہیں ان سے کون فائدہ حاصل کر رہا ہے؟ سفر کے لئے تہیاری تیل کے
 اور گھوڑا چڑیاں کیا اس دور کی بدلتی ہوئی سفری ضروریات کا ساتھ دے سکتی ہیں۔ یہ وہ خلاؤں ہے کہ یہ
 واجب الاحترام دادا میرے اصرار کے باوجود کبھی اس سید مشین پہ نہیں بیٹھتے کہ وہ اسے شیطانی کہہ
 ہیں۔ لیکن موزکاز جیپ پائس پہ شوق سے بیٹھ جاتے ہیں۔ میں اس شیطانی چرٹے پہ یہاں سے ملنے
 تک میں منت میں کھنچ جاتا ہوں وہ دیزل جو گھنٹہ لگا دیتے ہیں۔ میں تو اپنے محترم دادا کو مشورہ دیتا رہتا ہوں
 کے لئے یہ جتنے عبا کیں دستاریں اتاریں اور جین جینٹ پنی کیپ پہنیں۔ دین کو صدیوں پرانی ایسی دھڑک
 نہ جائیں جو محض لڑنے جھگڑنے کی خاطر لڑنے کو بہانہ بن کر عبا کو ہارنے کے لئے ہی ہو۔ چلیں اس
 جگہ نہ سہی کہیں اور ایک جگہ یہ سیونیورٹی کا تصور کریں۔ جہاں عہد حاضر کے جملہ علوم سے آگاہی حاصل
 سکے۔ خدا جل جلالہ قرآن اورین مسک اشراط الہی ہاں۔ اس سے انکار و فرار ممکن نہیں۔ وقت کے
 کو بھی تو ڈیا کرتے ہیں کہ اس موجود اور آنے والا کل آپ نے کیا جانتا ہے اس وقت تک مکمل ہوتا ہی ہوگا
 کی ضرورت ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ ہی یہاں تک
 ہو تم بھی اسی سے کوئی علم حاصل نہ کر سکو گے۔ آنکھوں میں بے پناہ احترام بھرتی کے ساتھ
 گے۔ ان کے پاؤں کی خاک تم کا حاصل کر دو گے۔ ان صدیوں پرانے مزاروں کی بابت پوچھو گے
 ان کے قبر سے میں ہانکے گا کہ یہ کسے ہوئے تیرا کتہ و نیمو گے۔ دانتی پہ میرے دادا تمہیں کچھ نہ کہیں
 دفعہ ہوں گے۔ سرکار مال شیعہ منی منڈیا کوئی تھوہل کوں دے گا۔ ادا دنی کاڈا۔ دنیا کہاں سے
 دنیائی مٹی اور اہم ابھی تک شجروں سے باہر نہیں نکل پائے۔“

ایک اکی وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہوا جیسے اسے کچھ چاہئے یاد آ گیا بولیں بی سائیں کہتے ہوئے
 کہنے لگا۔

”معاف کرنا دوست! مجھے اس وقت شدت سے سگریٹ کی طلب محسوس ہو رہی ہے اور کھٹوم گئی
 رہی ہے۔ ہاتھ ہومیری منگتیر کھٹوم رقیانوسی خیالات کی کوئی پناہ نہیں یا صرف تھیر تھار میں پڑھنے والی
 نہیں۔ وہ یہ شکل سائیں میں گر جھکاویت ہے۔ مثبت سوچ رکھتی ہے۔ فرمودہ سم کوہ راج اور غیر ضروری
 بدعتی حد بندوں کی قائل نہیں جبکہ وہ ضرور متددوں کی مدد کرتی ہے۔ تاخرا تھوں کو فری پڑھاتی ہے۔
 باغ بانی ڈرا نیوٹک تھلک شوق سے کرتی ہے اور سنیما بھی دیکھتی ہے۔ جین سگریٹ سگریٹ نوشی میں کھ

میدان میں کوئی کارنامہ ہائے سرانجام دینا چاہتا تھا۔ ایک لمبا عرصہ گزارنے کے بعد جب واپس آیا تو سب سے پہلے بدلا ہوا تعلیم یافتہ مضبوط انسان تھا۔ وطن چھوٹے ہی اسے فوج میں کمیشن مل گیا۔ اپنی مسکری قابلیت سے تربیت کی بنا پر بہت جلد اعلیٰ عہدے پر پہنچ گیا۔ پھر کچھ مدت کے بعد وہ مزید ایک کورس کے لئے انگلستان گیا۔ لگ بھگ تین سال بعد جب وہ واپس لوٹا تو اس کے ساتھ ایک بیوی اور بچہ بھی تھا۔ وہ بچہ سولہ ٹھیل یمانی ہے۔ ٹھیل یمانی کا باپ یعنی میرا مجاہد بیٹا عین اپنی خواہش کے مطابق اسرائیل کے ساتھ یہ جہازپ میں شہید ہو گیا۔ خوش قسمتی سے میری بہو بہت اچھی تھی، مگر تو وہ مگر یہ مگر اس نے میرے شہید بننے کے لئے اسلام قبول نہیں کیا تھا بلکہ وہ تو شادی سے بہت پہلے ہی مسلمان ہو چکی تھی۔ اس نے مشرقی حبس مذہب اسلام پر باقاعدہ ڈگریاں حاصل کی ہوئی تھیں۔ پانچ نماز قرآن کی تلاوت اور حد تو یہ کہ عیدوں عریوں کی طرح بولتی تھی۔ اسے مسلمانوں کی طرح سے میں اور بہو بہو بیٹا جیسا لگتا تھا۔ ٹھیل یمانی جب زندہ ہوا تو میری بہو نے محسوس کیا کہ یہ یہاں افراتفری کے عالم اور جنگ زدہ ماحول میں خاطر خواہ تعلیم حاصل کر سکے گا تو نہ پیرے مشورے اور اجازت سے اس کو لے کر انگلینڈ چلی گئی۔ وہاں خود تو اس نے ایک پرائمری میں ملازمت کر لی اور اسے ایک میڈیاری سکول میں داخل کر دیا۔ اس مسلمان کا بے گناہ بچہ وہاں بھی رہا۔ رہتی۔ گرمیوں میں وہاں سے واپس آئے۔ پھر ایک دن اس نے اپنے والدین کو اطلاع دی کہ اس طرح ٹھیل یمانی وہ متحارب معاشرہ کے درمیان ایک ٹپ کی مانند محسوس رہا۔ پھر ایک وقت آپ ٹھیل یمانی پڑھ کر دیا۔ تعلیم ہوئی تو میری بہو اسے لے کر یہاں میرے پاس آ گئی میں بھی بڑا حبا ہو گیا ہوں اب بنی دونوں بڑا خدمت اور کچھ بھال کرتے ہیں صاحب ہم ٹھیل یمانی کی شادی کا سوچ رہے ہیں۔ اس کے لئے لڑکی بھی بھائی ہے۔ اس بکھری عرصے میں اس کی شادی بھی ہو چکے گی۔

میں بڑے اٹھاک سے ان کی ٹپ پاتیں سن رہا تھا۔ اور وہ بھی کچھ اس طرح سے بیان فرماتے تھے جیسے میں ان کے خاندان کا کوئی اہم فرد ہوں۔ جبکہ میری اور ان کی آشنائی کا دورانیہ پوچھیں گھٹنے سے لگم تھا۔ پانی کے چند ٹھونٹ پینے کے بعد وہ پھر فرماتے لگے۔

”تم سوچتے تو رہے ہو گے کہ میں کیا کہانی لے کر بیٹھ گیا۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ تم ان کی سب سے سمجھ کر اچھی ہوئی کہ ہوں اس کے اشغال و اعمال میں پڑی ہوئی ہاپنہ یہ وہ کانٹوں کو اپنے ناخن سے کھینچنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔“

پھر وہ زور دیدہ لگائی سے مجھے تولتے ہوئے فرماتے لگے۔

”مجھے یقین ہے کہ تم میری ضرورت دکر دو گے۔“

تی مہک میرے لئے فیک جداگانہ تہہ چلی۔ خود غافل کو اگر بچی کستوری اور برگِ سناہ کے معطر میں کیسی حسرت
 ڈھنگ سے ہم آمیز کیا جائے اور جو شکل بنے یہ شاید ایسی ہی کوئی مہک تھی۔ ہر برگ و گل کی اپنی۔ حسرت
 پہچان خوشبو ہوتی ہے۔ ہلکی مدھم تیز خاموش ایسی آواز اور چونکا دینے والی نکلا دینے والی۔ حسرت
 اور زلزلہ دینے والی غور و غوض کچھ سوچنے اور محسوس پہ آواز دے دینے والی۔ بھونے ہر صاحبِ طراز کی حسرت
 درجات و مقامات کے مطابق اپنی ایک پہچان خوشبو پہنچاتی ہوتی ہے۔ ایسی خوشبوؤں کو صرف حسرت
 لوگ ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ خوشبو ان کے معطر و معطر اجسام و وجود سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ ان کی حسرت
 ارد گرد کی مٹی بھی اکسیر ہوتی ہے یہاں تک کہ وہاں سے گزرنے والی ہوائیں بھی معطر پیر ہو جاتی ہیں۔ حسرت
 قدموں میں بیٹھ کر لیوں کی چھتریوں اور سینوں کی کاکوں سے اڑنے والے دھواؤں کے بریکی کیوتاؤں سے
 جن جاتے ہیں۔ ان کے آستانوں پہ ہوائیں معطر بہت ہی محترم اور چلی جاتی ہیں۔ وقت بڑے وقار سے قطر و قند
 ہوتا ہے۔ یہاں نظام کی انتظام بندوں کے پاس اور فطرت نظام قدمیوں کے پاس ہوتا ہے۔

UrduPhoto.com

وقت کے ہاتھوں سیاہی سے آہنی بھاری دھات کے دھبے میں غصے کا جھٹکا بہت
 تھا۔ بھاری بھاری چیلن پر ہاتھوں کی آواز سننے میں آتی تھی۔ ہر دھبہ ایک نیا ہیرو تھا۔ ہر
 اکے جہان بہت کا درگھا ہے۔ غلامِ گردش کی مانند ایک طویل چنگی چست والا جھروٹا کمرہ۔ اسی میں
 بہت لمبی سی پتلی قیر لکڑی اور لدھی ایک ایک کہ ان گنت صدیوں کا زمانہ ہے۔ قیر و لکڑی کے
 بے ٹھانی اور مرگے کی بالادستی کی بھائی پر ہر ایک کی زندگی کا غلام ہے۔ وہاں کایاں دے رہی تھی کہ انہوں نے
 ادنیٰ آقا ہو یا غلام شہنشاہ ہو یا درویش ہر ایک نے اک دن اسی طرح مذاق خاک ہونا ہے۔ لیکن
 برگزیدہ انسانوں میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو عام انسانوں کی طرح مٹی سے بنی نہیں ہوتے بلکہ آسمان
 ہوتے ہیں۔ ایسے عالی مرتبت انسانوں کی پہچان ہی الگ ہوتی ہے۔ ان کی گدیں سانس لیتی ہیں
 سے لابلاب دنوں کی مانند چمکتی ہیں۔ ان کے پندہ نور قلوب کی سورش محسوس کی جا سکتی ہے۔ ایسی ہیرو
 کی مہک ہی الگ اور رنگ ہی جدا ہوتا ہے۔ سچ و شہادت ان کا کوئی چہرہ نہیں ہے وہاں فرقانِ حقیقت
 حلاوت اور ذکر و انکار ہوتا ہوا۔ رجالِ خدہ ہر جانب قطار در قطار تسبیح و تہلیل میں مشغول ہوتے ہیں
 حق میں مقامات پہ ہر لمحہ مالک کی رفعت پر ترقوں اور تجلیات کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ اللہ کے
 نامانیوں اور صلہ و اقرباؤں کے مقامات مرقد و منازل مستحضر رہتے ہیں۔ چراغِ نو نے انہیں تقدیر سے
 روشن و درخشاں کر رہے ہیں۔ آندھیاں چلیں طوفان آئیں بھونچال و سیلاب اور ارضی سماوی آفات

والی روایات کو نبھائے گا۔ قرآن حدیث کے علاوہ کوئی روایات سند نہیں بن سکتی۔ شرعی سمجھ و فہم
اختراع میں افتراق کا احتمال بہر طور موجود رہتا ہے۔ دو شاید میری گوگلوں ہی کیفیت جان گئے تھے اور میں نے
مجھے خاموش پا کر کمال شفقت سے میرا تھوڑا سا کمر میری بہت بڑھاتے ہوئے ہوئے۔

”جو بھی دل میں آئے ضرور پوچھو۔ سوال کرنے کے لئے اور جواب دینے کے لئے ہوتا ہے
میں نے اپنا خشک حلق تر کرتے ہوئے پوچھا۔

”نشفیق بابا! کیا واقعی یہ مزارات بائبل و قاتل علیہ السلام کے ہیں جو آدم علیہ السلام کی اولاد
میں سے تھے اور ایک بھائی دوسرے سے بھائی کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ کفن دفن کے طریقے میں ایسا
نے راہنمائی کی تھی۔ اور کیا یہ واقعہ اسی جگہ پیش آیا تھا جہاں آج یہ مزار ہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو خاص سے
حضرت آدم علیہ السلام کی لہر و بال بھی میں نہیں قریب ہی رہی ہوگی۔“

میں نے ایک ہی سانس میں کئی ایک سوالات کی پوری میگزین خالی کر دی تھی۔ خاموش ہو کر
تاک سے اپنے ہی احوال نگاہ رکھا جیسے پورا میگزین فائر کرنے پر گن کے نقوش سے خارج ہو رہا ہو۔
میں نے سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھا۔ اس کی طرف سے ایک نیا منظر دکھائی دیا۔
میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی طرف سے ایک نیا منظر دکھائی دیا۔

”نصفیق بابا! کیا واقعی یہ مزارات بائبل و قاتل علیہ السلام کے ہیں جو آدم علیہ السلام کی اولاد
میں سے تھے اور ایک بھائی دوسرے سے بھائی کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ کفن دفن کے طریقے میں ایسا
نے راہنمائی کی تھی۔ اور کیا یہ واقعہ اسی جگہ پیش آیا تھا جہاں آج یہ مزار ہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو خاص سے
حضرت آدم علیہ السلام کی لہر و بال بھی میں نہیں قریب ہی رہی ہوگی۔“

میں نے ایک ہی سانس میں کئی ایک سوالات کی پوری میگزین خالی کر دی تھی۔ خاموش ہو کر
تاک سے اپنے ہی احوال نگاہ رکھا جیسے پورا میگزین فائر کرنے پر گن کے نقوش سے خارج ہو رہا ہو۔
میں نے سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھا۔ اس کی طرف سے ایک نیا منظر دکھائی دیا۔
میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی طرف سے ایک نیا منظر دکھائی دیا۔

”نصفیق بابا! کیا واقعی یہ مزارات بائبل و قاتل علیہ السلام کے ہیں جو آدم علیہ السلام کی اولاد
میں سے تھے اور ایک بھائی دوسرے سے بھائی کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ کفن دفن کے طریقے میں ایسا
نے راہنمائی کی تھی۔ اور کیا یہ واقعہ اسی جگہ پیش آیا تھا جہاں آج یہ مزار ہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو خاص سے
حضرت آدم علیہ السلام کی لہر و بال بھی میں نہیں قریب ہی رہی ہوگی۔“

میں۔ چند ساقس دکھاتی ہے۔ اس کے باطن بھیڑ تک کاچھٹانا اس کے بس کی بات نہیں۔ اندھیرے میں
 سب کچھ دیکھنے والے جیتکیں! کبیرے 'مثل دیکھو! انرا سا ڈنڈ لیز رگن' کبیرے 'کائیڈا حراکلی وغیرہ اسی نوع کی
 تصدیق میں اس کی ادنیٰ سی مثالیں ہیں۔ باقی رہی بات کہ یہ واقعی ہاتھل کانٹیل کا حزار ہے یا نہیں؟ سمجھ لو کہ آج
 کتبہ قریشی جیسے الفاظ کی معنوی لحاظ سے تصدیق یا توشیح نہیں کی جاسکتی۔ مسلمان تو محض سنی سنائی پر بھی
 حسد نہیں رکھتا! سینہ بہ سینہ صدیوں کا سفر کرتی ہوئی ہاتھوں دیکھتوں اور زبانتوں پہ آمنا صدقہا کہتا ہوا
 چلا کرتے۔ ہم ایمان بالغیب پہ کار بند لوگ ہیں۔ آخر مان لینے میں حرج ہی کتنا ہے۔ یہاں پہ
 حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وہ حکایت یاد آتی ہے۔ ایک اورین شخص حاضر ہوا کہنے لگا۔

یا علی ابن ابیطالب! میں اللہ کو واحد لا شریک نہیں مانتا۔ جبکہ آپؐ مانتے ہیں۔ اب آپؐ یہ
 تسلیم نہ کرنا کہ آپؐ میں کیا فرق ہے۔ کھانا پیو پینا آپؐ کیسے کرتے تھے؟ اور میرے ساتھ بھی
 کتے گل خرش ہوں آپؐ بھی۔ پھر مجھے آپؐ کے اللہ کو ماننے پا کر پڑھنے کی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی؟
 آپؐ ہنسا دیئے بیڑی نرمی سے فرمایا۔

خرش کر، کہ میدان حشر پاپا ہے۔ اللہ اور اس کی خدائی وہاں پہنچتا ہے۔ وہاں تو جنم
 سے ہوتا ہے۔ اللہ کو ماننے والے ہاں۔ اللہ کو ماننے والے ہاں۔ اللہ کو ماننے والے ہاں۔

UrduPhoto.com

یہ سن کر وہ بولے۔
 یہ سن کر میں کھائے میں نہیں کر سکتا تو نہیں مانتا۔
 اب آپؐ پھر فرماتے تھے۔

اب فرض کرو کہ بقول تمہارے کہ اللہ کا وجود نہیں تو پھر کیا صورت ہوئی۔ یعنی کوئی نہ تمہیں
 اللہ سے لکھوائی کھاتا۔
 وہ بولے۔

وہاں نہ ہوتا۔
 یہ مسکرائے اور فرماتے گئے۔

یہی صورت میں تم کھاتے میں تھے۔ دوسری صورت میں ہم دونوں برابر۔ تو کیا یہ نفع کا سودا
 کرتے کہ یہاں نہیں کہ اللہ واحد لا شریک ہے۔ تاکہ کسی کو بھی اللہ مان گھانے کا احتمال ہی نہ ہے۔

وہ شریک یہ کھلی دلیل نہیں کہ ایمان لے آیا۔ مقصد بیان کرنے کا یہ تھا کہ ہوائے صورت کے کسی اور

امر کے لئے "واقعی" کا صیغہ استعمال کرنا بڑا مشکل ہے۔ موت بھی اس لئے کہ یہ ظاہری آنکھوں کے سامنے "واقعی" واقع ہوتی ہے۔ "دیکھو دیر آنکھیں بند کرنے کے بعد پھر فرمانے لگے۔

"اب ہمارے سامنے صرف ایک ہی سلامتی اور نجاتی کا راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ ہم ایمان باریک دامن مضبوطی سے تھام لیں۔ عقلی دلائل نہ مانگیں۔ نجات نہ چش کر یں یعنی جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا آئے ہیں اسی کو درست جانیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ کیا ہمارے اسلاف رام حق پہ تھے؟... آخر کسی نے آدمیوں کے گروہ نے یہ مزار تعمیر کئے ہوں گے۔ انہیں کفن یا دفن کیا ہوگا۔ ان کی اگلی نسل۔ پھر اس نسل کی نسل۔ یہاں تک کہ تم اور مجھ تک کا زمانہ آگے۔ اسی طرح یہ سلسلہ آگے بھی روز حشر تک جاری رہا۔ رہے گا۔ یاد رکھو تسلیم و رضا یعنی حق خبر کی بات کو مان لینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ مانو کہ ہمیشہ حق حق کا پورا حق یہی طرح پروان چڑھتا ہے۔ اس کا پھل عین اور خوشیوں کا ہوتا ہے۔" انہیں افسر اور باطل کو دوام نہیں۔

بزرگ بابا اب میرے چہرے پہ نگاہیں گاڑے کچھ لمحوں کے لئے خاموش ہو گئے جیسے وہ حیرت کرانے کے لئے اپنی توانائی جمع کرنے کے لئے زکے ہوں پھر بڑی کج سے بولے۔

"جانتا میں تمہیں کہ بابا ہوں کہ تم میرے جواب سے کچھ مشغول سے ہو گئے۔ اور مجھے کچھ اندازہ ہے کہ تم نے کیا کیا سوچا ہو گا۔" انہوں نے اشارے سے میری بات کو بیچ میں ہی قطع کر دیا۔

"بابا بابا۔ سنئے جانتا ہوں کہ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے اور آپ یوں زیادہ دیر بیٹھ کر بیٹھ سکتے۔ صرف آخری سو گھنٹوں مزارات پانیسی اور سی بے روٹی اور ویرانی ہی کیوں ہے۔ میں بے شمار پتھر و تعمیرات کو لیں قطعاً کے خراب سے کئی بار سے یہاں شرف پہنچا ہوں۔ لیکن ایسی بے سربساز مزارات اور دل کو بھڑوائی محسوس نہیں اور جس دیکھی۔ یہاں پہنچ کر کچھ۔"

انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے میری بات کو بیچ میں ہی قطع کر دیا۔

"میرے صاحب مزار کا اپنا حراج اور ماحول ہوتا ہے۔ پھر اور بھی کچھ عمر نکات ہوتے ہیں جو ان کے پاس یا غیر دانستہ طور پہ سرزد ہو جانے والے اعمال یا کسی نبی کا شاخسانہ ہوتے ہیں۔ بہت سی مثالوں میں سے یہ مثال باروت و دروت فرشتوں کی دی جا سکتی ہے۔ شیطان کے ہکاؤ سے میں آکر جن سے گن و سوز و گداز میں کی پاداش میں انہیں قیامت تک کنوئیں میں ڈال دیا گیا۔ انسان روشنی کے لئے دیا تو جاسکتا ہے کہ اس کو جلانے رکھنا اس کے اچانک سے حکمت کے اندر ہے اور کہ تو اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ یہ تو قدرت کا قدر مطلق کا کام ہے۔ اور قبر کے اندر کا حال وہی جانتا ہے۔ تمہیں تو پتہ ہوگا کہ کسی مزار پہ پہنچ کر کنول کی مانند کھل اٹھتا ہے۔ کہیں طبیعت ملول ہو جاتی ہے۔ اور کہیں رونے آہ و بکا سیز کوئی کرتے ہوئے

کا مہول سامانگ جو اس کا شیجر میرا پنے کیدار باور پتی اور نہ جانے کیا کیو تھا میرا ثوب آٹھا تھا۔ اسے اس موقع ملتا شامی سائل انگریزی میں وہ مجھ سے خوب مزے مزے کی باتیں کرتا رہتا۔ اس ہونٹ کے سامنے دمشق بلند یہ کا دفتر اس کے پیچھے کی جانب جامع اونیہ ساتھ ہی سوق خمیدہ۔ اور گردونوں میں اور جدید بازار گھیاں کو پنے قلعہ دمشق، بس سٹیشن، چوک، نواریں، ستون، چبوترے، جھروکے، چھوٹی ہوئی انکوروں کی جلیں آڑوں شہنلوں سے منڈھی ہوئی تکی دیواریں۔ پانی کے تنگی حوض ان میں سے ہوئے گل دیحان اور منوگرے کی گھیاں۔

بعد اذ دمشق، قاہرہ اور استنبول دنیا بھر میں یہ چارہاریں بلند ایسے ہیں جن کے بازار گھئی کو پے اور پھاڑ۔ ان کی جہدیں ہم داروان پر اسراریت یہاں کے لوگ ملک یہاں کی روایات، قدامت انسان کو پوائہ بنا رہی ہے۔ شرط فقط یہ ہے کہ بندہ ذرا کھسکا ہوا ہونا چاہئے۔ اس پرانے دمشق کے گلی بازاروں کی بکولی جلیوں اور خوب صورتوں میں کھو یا ہوا انسان بڑی مشکل سے باہر نکلتا ہے۔ میں قریب پانچوں نمازیں جامع امیر میں ہی ادا کرتا تھا۔ باقی وقت جاتے شہر اوی بی بی ندیم کے گھر پر چہرہ ہوتا۔ کو پوں کے جواب میں ان کی ساری باتیں چلتی رہتی تھیں۔ ان کی باتوں کے ساتھ ساتھ لوگ ہونٹوں کی گھٹی جاتے۔

اگلے روز دھوپ کے کچھ پہلے بھائی نے ہونٹ میں ڈال دیا۔ اس نے مجھے علم دیا۔
”بھئی! فوراً تیار ہو جاؤ۔ آتی تھے میری پانچواں سے ملنا ہے۔“

میں بڑا شہنایا۔

”بھائی! مجھے وہاں مت لے جاؤ۔۔۔ وہاں میرا کیا کام۔۔۔؟“

وہ حسب عادت آنکھ دبا کر بولا۔

”وہ سب اذرا میری پھیلجڑی تو دیکھو۔۔۔ میں نے کل اس سے تمہارا ذکر کیا تھا کہ انگلیتہ۔۔۔“

ایک دوست سیاحت کے لئے یہاں آیا ہے۔ وہ خوشی سے چپکتے ہوئے کہنے لگی۔ اس سے ضرور علم

لے آئی لٹی پہ تمہارے لئے خصوصی طور پر فیش ایڈ نہیں گارنٹ کر دیا۔ مشرہ سوپ اور شیم برنس

کا اہتمام کیا ہے۔ اور رات کو ہم تینوں فلم دیکھنے چلیں گے۔ سیلو دس دس۔ اونچ

صوفی اورین اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اس فلم میں جلوہ آ رہا ہے۔“

وہاں لپٹیں اٹھیوں کی پوروں کو اکٹھا کرتے ہوئے چوم کر کچھ مزید کہنے لگا تو میں نے ہاتھ جوڑ دیئے۔
 "یہ بڑے بھائی! کل کی جھگڑا ابھی تک زور نہیں رات صبح سے سو بھی نہیں سکا۔ سر میں جھوڑے سے
 جھک رہے ہیں۔ خدا کے مجھے آج معاف کر دو۔" انشاء اللہ! کل بچے اور قلم دونوں پہ چھلپیں گے۔"
 وہ میری التجا بھری درخواست پہ خاک ڈالتے ہوئے گویا ہوا۔

"دوست امیری کلثوم سے ملو گے تو درود و رومب بھول جاؤ گے ایسی الزا اسہارت اور روشن خیال و خواب
 دوست لڑکی تم نے زندگی بھر نہ دیکھی ہوگی۔ اگر پھر بھی کوئی کسر رہ گئی ہوگی تو سیلو رومس راکس میں
 سونے والی چوری کروے گی۔"

میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ شروع ہو چکا تھا۔
 "سنو یہ تمہیں معلوم ہو کہ صوفیہ نورین کو چھپائی کے عالم حضرت علی کلا یرقان ہو گیا تھا۔۔۔ باقاعدہ
 وہ تو کوئی تھوڑی سی مسکین ماں علاج کروانے سے عاجز تھی۔۔۔ صوفیہ پہلے ہی پہلی چھپائی تھی یرقان نے مزید
 بڑھ کر بھاری ہو چکا تھا ابھی تک پہلی مینڈ کی سی ہے۔ سیلو راکس اس کی مناسبت سے ہاتھ بڑست نام
 یہ کہ مینڈ ان گنت بارہ کچہ چکا ہوں یہاں تو غیر عربی شہر ہے کہ کے بھائی جاری ہے جس سے اس کا
 ہر روز ایک سو روپے کا ہوتا ہے۔ یہاں تو ایک سو روپے کا ہوتا ہے۔ یہاں تو ایک سو روپے کا ہوتا ہے۔

خدا کے صوفیہ بھائی الخیر بناتا جاؤں گا۔"

میں نے اس کی زبان تو لی سے ترقی ہو کر کہا۔

"بھائی! میں نے بھی اچھوتی سے یہ قلم دیکھ رکھی ہے۔ اب میں اسے مزید عربی میں لکھوں دیکھ سکتا

اور میرے نزدیک بڑی مقدس اور پرہیزگار زبان ہے۔ آئی لو جو والی زبان لکھتا۔"

اس نے فوراً بات اٹھتے ہوئے کہا۔

"عمریاں! میں نے یہ قلم تمہیں عربی زبان کے حوالے سے دکھائیں رہا ہوں میں تو صرف تمہیں اس قلم کی
 اصل ملاحظہ کرنے کے لئے دکھا رہا ہوں۔ سن ۲۰۰۷ کے سال کی سپر ٹیگز پبلیکیشن ۱ سلسلہ دیت سیلو فٹر
 کا نام ہے۔ ہائے ہائے اس کے لیے ہے انجمن سے لگ کر وہ ہب مل گا رہا اپنی کہنی لگا کر کھڑی ہوتی
 ہے۔ بیٹا ہاں اپنی چھتری بیٹا پس۔۔۔ کا پوچھنا شیلے ہالوں میں اڑسی ہوئی پہلی جڑی کی کیاں اپنے
 جس۔۔۔ اس قلم کا یہ فریم بنایا کاسب سے خواہد قلمی فریم ہے۔"

میں نے جھنجھٹا کر پوچھا۔

"آخر تمہیں بیٹا رنگ اس قدر کیوں پسند ہے؟"

کھٹ سے اُس کا جواب آیا۔

”اُس نے کہ میری منگیتر کٹھن کو رکان ہے۔ اُس کی آنکھوں میں سرسوں پھوٹی رہتی ہے۔ چہ بہت بہت بہار کا سماں رہتا ہے۔۔۔ گالوں، ہونٹوں اور ناخنوں میں خون کی رقی نہیں۔ دانت حد سے زیادہ سیاہ۔ دامن سی اور کیلشیم کی بے انتہا کمی۔ وزن ساٹھ پونڈ سے کم، کمر ستر وانچ اور سینہ۔۔۔؟“

میں ہاتھ جوڑے روٹی سی صورت بنا کر سامنے کھڑا ہو گیا۔

”عقل، بیجانی یا بھیل بیانی! اگر تم میں رقی بھر بھی جس ایمانی موجود ہے تو میرے اگلے پچھلے گناہ بخش اور مجھے آج نہ لے جاؤ۔ دیکھو میرے سر میں بلا کا درد ہے۔۔۔“

وہ انتہائی ڈھٹائی سے گھسیٹ کر مجھے کمرے سے باہر کرتے ہوئے بولا۔

”تم میرے ساتھ تو چلو۔۔۔ میرے پاس سب دروازوں کے علاوہ موجود ہیں۔۔۔“

یہاں میں نے امدادہ کر لیا کہ اس پاگل کے آگے میری کچھ ہاں ناں چٹنے کی نہیں۔ یہاں تو اس کے قابل قدر دلہا بانی نے بھی ہتھیار ڈال دیئے ہوئے ہیں، بھلا میں کس باغ کی مولی ہوں جس میں جب بھی کچھ کہنے کے لئے اب کھولتا وہ میری ہانت اُچک کر مجھے کسی اور سالن پہ ڈال دیتا۔ اس صبح کے حال کا اصرار کرتے ہوئے یہاں تک کہ اس نے اپنے سر پر ہاتھ مار کر کہا کہ اس نے اس کا

UrduPhoto.com

ہوس جاتا ہوں

ایک دریائی سفر کے دوران مجھے ایک ڈر پاریدہ علاقے نے بہت کام کا نوک دیا تھا۔ غریب ہونے والے کو اگر یہ احساس ہو جائے کہ پھر سے تند دریا کے سامنے اس کی ایک ٹیس چلے گی تو اس کے لئے لازم ہے کہ خود کو بڑا سالانہ چھوڑ کر بہاؤ کے رحم و کرم پہ ڈال دے۔ ہاتھ پاؤں ہلانا چکانا بالکل بند کر دے اور جو اس پر قرار دیتے ہوئے اپنی توانائی کو ضائع نہ ہونے دے۔ سانس روکنے اور بھرنے پہ دھیان رکھے۔ جب دریا سے پیچھے لے جائے تو فوراً پیچھے ہٹوں میں ہوا بھر کر بڑا کسی مزاحمت کے نیچے چلا جائے۔ بیٹے میں ہوگی تو پانی پھر سے اوپر کٹاں پہ لے آئے گا اور چپٹے ہی فوراً ہوا بخاری کر دے۔ پھر نیا سانس بھرے۔ اگر پھر نیچے لے جائے تو پھر کسی مزاحمت کے پھر پیچھے چلا جائے۔ یہی عمل دہراتا رہے گا وقت کوئی عرصہ نہ آئے کہ وہ معمولی سی کوشش سے کسی کنارے لگ جائے۔ اس نوک نے پہ صاف کرتے ہوئے میں نے خود کو اس بلانے کا گہائی نیل بیانی کے سپرد کر دیا تھا۔

کم و بیش گھنٹہ بھر کے طوفانی سفر کے بعد ہم خیر خیریت سے اس کے سرسالی گاؤں (جو محض چند

سلنڈر رئیس کا چولہا۔۔۔ ادھر ادھر بے ترتیب سے رکھے کھانے پینے کے برتن۔۔۔ بے غلغمل سی فریج، جو باوجود
جھٹکے لے رہی تھی۔ پانی کے لئے پلاسٹک کا ایک ڈوم۔ ٹشنگ پیاز الہسن کے ٹکڑے ہوئے ہار۔۔۔ اور
کے پارچے جو جھنڈیوں کی طرح اس دیوار سے اُس دیوار تک پلاسٹک کی رسیوں پہ لٹکے شوگر رہتے
اب سمجھ میں آیا کہ مچھلی کی بو باس کہاں سے آرہی تھی۔ کشموش نے انگریزی میں ہائے کرنے کے بعد گے
بوٹیو پیلر پکڑاتے ہوئے کہا۔

”تم آلوچیلو عتیں سیریاں کاٹتی ہوں۔“

اور اندازہ کریں کہ کیا خوبصورت ہے تکلفی تھی۔ ۶۔ یہی ہیں منوں میں انہوں نے مجھے
 جھینکے یہ لگا دیا۔ اور وہ خود کیرم تھیلے میں مکی۔ !

اس سے پہلے کہیں رکے ہیں؟“

اور انہوں نے بھی بڑی نفیس انگریزی میں بات کر رہی تھی۔

میں نے خوش قسمت ہیں کہ ان کے مہربان ہوتے ہیں۔ یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔
 کہ تم ان کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔
 داخل ہیں کہ تم ان کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔
 کہیں شام نہیں تیار کی ہو گی ہے۔ یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔
 تاکید کی تھی کہ وہ تمہیں یہاں نہ لے جائے۔ یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔

وہ سمجھتے ہیں کہ سحریت کے ساتھ یا سحریت کا کہنا کہ سحریت کی طرح مجھے لکھ لکھا کر رکھ لیں۔

ہم دونوں بھی تمہاری طرح ہیں یعنی ہماری تمہاری ایک ہی برادری ہے لیکن تجھ ہے کہ تم سب سے پہلے دیکھ کر اپنے لیے سڑا طرح طرح کے لوگ میرا مطلب ہے تم اپنی بریت کیسے ڈھونڈ رہے ہو؟ وہ مقامی سرپرست کا پگھلا رہا ہے۔

”خواب کی سحرین دنیا کو اگر کچھ ایسا حیران کنے والا بتائیے تو آپ کو اسے پسند آئیں

”شکرہ (میں) تمہارے لیے ہے اور تم سے الگ رہا ہوں۔“ تمہیں کبھی موزہ موقعہ عورتوں کی بھی ملتا ہے۔

اسٹاٹس ماہر لاٹیک کے سیکرٹری انچارج پروفیسر شامی معصری تبا کو پناہ فراہم کرتے ہوئے ہے۔

وہ پہرےاں جو گر تھکے ہیں رات ہی ہوئی ہوئی۔

”گولی مارو تو تباہ کو کو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں پیر انارمل سائنٹسز سے کس حد تک دلچسپی ہے۔۔۔۔۔“

جسے یہی راستوں کے مسافر ہو لیکن میں صرف اتنا جاننا چاہتی ہوں کہ تم اب تک اس منزل کا کتنا راستہ طے کر چکے ہو۔؟

مجھے خاصی توقع نہیں تھی کہ ایسی اٹھارہ ماہوں کا دور پورا زادگی کی اپنا تک ایسا سوال داغ دے گی کہ جس کا جواب اب تک میری اس کی ذات صفات سے نہیں ملتا۔ جب فوراً کچھ جواب بن نہ پڑا تو میں نے انٹرنیٹ پر تلاش کر لیا۔

میدیم اوشیخ کہہ دوں کہ میں نہیں بل اور تمہاری طرح کوئی پڑھا لکھا ہو گری ہو تو نہیں۔۔۔ ان پڑھ جانیں۔ آپ نے ابھی جو مشکل سا لفظ بولا ہے میں تو اس کے معنی تک نہیں جانتا۔ بس مجھے درجہ دار کے لئے درخواست ہونے کا شوق ہے۔ باقی رہا کہ مجھے مزاروں قبرستانوں سے دلچسپی ہے اور بزرگوں بابوں سے دلچسپی ہے۔ میں تو یہ سب کچھ مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں خود کو جاننے پہنچنے کے راستہ پہ ہوں۔ خوش نصیبی سے مجھے لگتا ہے کہ یہ نور شہید کی تک تو میری دسائی نہ ہو سکی لہذا میں ٹھہروں اٹھانچا ہوں، منجھڑوں، معبدوں اور بابوں کی زندگی کی جستجو میں ہوں جو میری غیر ضروری ظاہریت، تاریک سلاحتی کی حد تک جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون سے کون سے مسائل پر خرد کو نیچے دے اور سوچ و سمجھ کو سنبھالے۔ اب تک خوب سے بہتر ہے۔ ابھی ایک بار کسی

UrduPhoto.com

پڑھ کر اذہ کے تو سے ارض و سما کو گئے۔ روشنی بن کر جیلو کے تو سے زمانہ و دہائی کی جستجو سے۔۔۔ ابھی ابھی کے تو سے شرم و جہنم کو گئے۔ پانچ سے کا کام اٹھانا روشنی کا کام پھیلنا اور خوشبو کا کام پھیلنا۔۔۔ ابھی ابھی کے تو سے روشنی اور خوشبو کی بات نہ ہوتی ہے۔ جن لوگوں اور سی گاہوں کی تجنی اس نہیں ہے۔۔۔ ان لوگوں کی شاہراہوں پہ نکل جاتیں۔ کہتے ہیں کہ سوار سے زیادہ پیادہ حاصل کرتا ہے۔ راستوں کے مسافر کی منزل کا شرم بھی۔۔۔

میں نے یہ فلو میں کبے جا رہا تھا اور وہ بہت بہت مجھے تنکے جا رہی تھی۔ سٹریٹ اس کی انگلیوں میں۔۔۔ وہ شاید اپنی روئین کا کش کا کش کا بھی بھول گئی تھی۔ وہ آنکھیں جھپکے بنا کہنے لگی۔

میں نے ان روشنیوں اور خوشبوؤں کے بارے میں میرے انداز سے تجزیے تھرے اکثر درست تھے۔۔۔ اور اگر اس میں کچھ کوئے لے لے اور گھومتے۔۔۔ بھی شامل کر لو تو یہ بھی صحیح ہو گا۔ شاید تم جانتے ہو گے کہ میں نے روشنی اور خوشبو ایک طرح سے مختلف سوچے اور سوچے ہیں۔ یہ کتابیں آپ اس طرح سے سمجھا رہی ہیں کہ ان کی کوئی ایک دو ہے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہی علامتی استعارے ہی انارمل سائنس کی اصل بنیاد

جس کے لئے انہوں کوئی آفاقی مخلوق ہوں جو بشری تھاظوں انسانی حد بند یوں سے ماورا — یا پھر جاپانی
جس کے لئے مہیا کیئے ہوئے طے شدہ نظام کے تحت بے مکان و محدود برسرِ عمل رہتے ہیں۔ کیسے کیسے فضول
تھوڑے تھوڑے چیز سے چمکتے چمکتے اڑی آوارہ گرد پیدا ہوتی بد حرام۔ جنم جنم کے گھٹن اور رستے معذور
جس کے لئے جاتے رہتے ہیں۔ اکثر اپنے گریہ کریم تک نہیں پڑے رہتے۔ کسی کا کوئی انداز اور نہ
کس سے کوئی پوچھ گچھ۔ کالا ہے یا گورا۔ ٹھکانا ہے یا لم ٹینگ۔ ہندی ہے یا اعرابی۔ افریقی ہے یا
عراقی۔ سنگری یا بھگوا۔ یہاں کوئی تخصیص نہیں۔ اس صحرائی مدام میں سب ایک سے نکلے تلنگے ہیں۔

لطف یہ کہ کسی کی کوئی اجارہ داری نہیں۔ نہ لڑائی بھڑائی یا تو تکرار۔ جیسے یہاں آسما کرنے
کے لئے اپنے دماغ، زبانیں، سوچیں اور فزٹیں کھینچیں گریہ کر دی رکھ آتے ہیں۔ وہ یہاں صرف وہ آنکھیں دو
ہیں۔ ایک پیٹ والے کیکڑے سے بڑا ہے۔ میں جنہیں باری باری پکڑ کر کھانا اٹھی اپنے مشہور زمانہ ٹرید میں
یک جا کرتا رہتا ہے۔ ان بہت سے کیکڑوں میں ایک میں بھی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ کیکڑے ضرور نا
کے پڑے۔ لہذا اپنے پھیر چھو اور میں صرف کیکڑوں والے کی ٹیکڑی کیکڑی ملاحظہ کر کے اٹھیں پہنچا تھا۔

UrduPhoto.com

میں شاید ایک جہاں گرو تھا۔ اور جہاں گرو کی صرف فقیرانہ پیش کی ایک پہچان ہے۔ جس کے
لئے یہ اڑھائی قدم اور دیگر جہاں اڑھائی اڑھائی چاک کی سڑکیں ہوتی ہیں۔ جہاں گرو کے پاس ایک مختص
کونہ ایک بنی۔ سیلابی سا نقش۔ سیلابی سا لگاؤ اور ایک آوارہ گرد کی تیسری آنکھ ہوتی ہے۔

دیکھا جائے تو سب شخص اس لئے فخر ناک نہیں کہ اس کے لگے دانتوں کے ٹھوڑوں میں مہلک
ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ مہلک نہ تو انسان کے علاوہ کئی ایک نباتات معدنیات اور جمادات میں
ہو سکتا ہے۔ سناپ اس لئے خوں کا اور پتہ اسرار ہے کہ اس کے پاس دلی مسوئیت والی سرسراہٹ
ہوتی ہے۔ زبان دو شاخی۔ جو کہ خود کار و یار کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ آنکھ کے پچھلے ہی
کس جگہ سے کہ سوئے جانے کا پتہ لگ سکے۔ اپنی تلوس میں ساخت و ذمیت کا پتہ اسرار و حشرات الارض کے جس
کے آنکھ پاؤں کان پچھلے نہیں ہوتے۔ مگر وہ رفتار میں اسپ تازی کو جیسے ذال دیتا ہے۔ میوں
سناپ کسی جاندار کے قدموں کی چاپ تک نہیں سکتا ہے اور جس کو پکڑ بکڑ لے ہڈی ہلکی کر دیتا
ہے۔ سناپ کوئے ملنے، بلی، آلو، شاہین اور شیر کی آنکھوں میں ایک ایسی مہتابینت ہوتی ہے جو مقابل کے

ہو جائے جو اچھے بُروں سب پہ برابر برستا ہے۔ بادل جو سب پہ یکساں سایہ ٹپکن ہوتے ہیں۔ خوشی کی مانند جس سے ادنیٰ و اعلیٰ خوب فیض یاب ہوتے۔ زمین کی طرح جو سب کے نیچے بڑی عاجزی سے رہتی ہے۔ ماہتاب و آفتاب نجوم و پرورین۔ قوس و قزح شفق چہرہ ہویں کا چاند کھکشا چہرہ۔ بلال عید نقلی چارا۔ یہ سب چراغ یہ سارے گلاب یہ نگارے نعمتیں عنایتیں یہ سب کچھ اللہ کی طرف اپنی مخلوق کے لئے ہیں۔

درویش ثواب و اجر کے چکر میں نہیں پڑتا وہ تو مالک کے آگے مالک۔ مالک کے آگے مالک۔ مالک کے آگے نوکر۔ نوکر کے آگے چاکر اور پھر چاکر کے آگے احقر بن کر اپنی ڈیوٹی پوری کرتا ہے۔ یہ مقام مالک کی ڈیوٹی کے باہر دروازے سے ہٹ کر دم ہلانے کا ہونا ہے اور یہ دروازے کی بجلی سیرجی بھی ہوتی ہے۔ دروازہ باہر سے بے ہوش اور اندر سے ہوش ہوتا ہے۔ درویش باہر سے ہوش اور اندر سے بے ہوش ہوتا ہے۔ یہی الگھ جگانا اور الگھ گھلانا ہے۔

طریقہ کے دفتر خویش بکشا مگر درد مارا دوا لئے آید۔۔۔۔۔
UrduPhoto.com

سلمان انجی بھی باہر سے ہوش اور اندر سے بے ہوش قسم کا درویش تھا۔ دیکھو تو باہر کوٹھا ہوتا ہے۔ اور اندر سے روبرو اندر کا اکھاڑا ہے۔ یہ گونا گونا ہر وقت لنگوٹ کے اپنے پنجوں سے لٹکے انوکھے چٹوڑے کی خاطر استغناء میں رہتا تھا۔

ایک دوپہر دوشنبہ کا بڑا بچہ سحرانی بھر بھرتی ریت سے رگڑ رہا تھا۔ جن دیکھوں برتنوں کی گلی تیل کے داغ دھبے لہو مانند پاتے ہوئے چٹوان کی کار تلچھٹ چٹوانی ہو اس کے لئے ریت سے کچھ چیز نہیں گو اس قصد کے لئے آگ لڑا کچھ چٹوانی کو بھی استعمال کیا جاسکتا ہے مگر صفائی کے ساتھ۔ تاب و چمک صرف راکھ اور رینگ سے پیدا ہوتی ہے مگر اس میں تھوڑی سی قہاحت ہے کہ یہ برتنوں کے ہاتھوں کو بھی رگڑا لگا ہاتی ہے۔ ناخن اور ہاتھوں کی جلد کڑور اور بدلتا ہو جاتی ہے۔ سلمان انجی کے ہاتھوں کو ایسے ہی تھے۔ وہ انسانی ہاتھوں کی بجائے کسی آدمی کے پاؤں لگتے تھے۔ چھپے ہوئے بھٹکے ہوئے جیسے تھے ہی نہیں اور انھیں اگر تمہیں تو ایسی کڑھیلی کے ساتھ چھلکی اور ک۔ کی پیوند کاری کی گئی ہو۔ بازو بھی چھت کی پتلی کڑیوں کی طرح کڑیل۔ سیخ وادی بینا کی مانند فراخ۔ اور بچے صراٹے سے بیٹھا ہوتا تو کوہ سلیمان لگتا کھڑا ہوتا تو کوہ ادراس۔!

ہمیں اسے مختلف زاویوں، قرب و جوار کے فاصلوں، اندھیروں، آجائوں، ٹھنڈیوں اور مختلف سمتوں سے دیکھنا پڑتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جتنے وقت کی ہر جنبش، گروٹے کے ساتھ اس کے ساتھ جلی تھریل ہوتے رہتے ہیں۔ یوں کہ خود کچھ بھی نہ ہو۔ دوسرے وقت ہوا زمانہ ہو۔ جو ہر پل پر صحت، رفتار اور رفتار بدلتا رہتا ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا وہ ریت سے دریچہ گرنے میں لگا ہوا تھا۔ یہ عظیم اثر یہ ہے ہر میرا اور شب و عینک یا
میں چہرہ کرنے والے دیکھے برتن اکثر بھلوے ہوئے سڑے ہلے ہلے برکتے سے دکھائی دیتے ہیں۔ وجہ یہ کہ
میں نے خود کوئی بہت بُری ہے۔ ہجر فراق کے مارے آشفتہ حال عاشقِ دہق کے بوڑھے مریض یا کسی
کے راجحان بیوہ کی طرح یہ ساری رات زندہ در آگ چولہا رہتے ہیں۔ دیکھوں میں اگر مسلسل گھونٹنا نہ گھوٹا
تو میرے تھلے میں گاد لگ کر مڑنا شروع ہو جاتی ہے جو کچھ در کے بعد عمل کر کوئی کی ماحند سیاہ اور سخت
ہو جاتا ہے۔ پھر زائنت علی خراب نہیں ہوتا۔ کھانے کا رنگ بھی سیاہ ہو جاتا ہے، جھلکے مڑنے کی دھانس الگ
ہوتی ہے اور ساتھ دیکھنے کا بھی مستیاناں ہو جاتا ہے۔ پھر ایسے گے سڑے برتن دیکھنے کو حائف کرنا ایک
مستحق ہے۔ جس کے لئے وقت لڑکے نہ مٹھی اکھٹا تھلے میں رکھ کر رکھ دے اور ان کی ایک طرف خواہ جو صلہ
میں سے اس مقام پر یہ بیکار کی تاس دیت اور یہ ساری یہ جات سے یہ جات سے یہ جات سے یہ جات سے یہ جات سے
کے دیکھنے دیکھنے۔ ان کو مانجھنا، اچھنا، برتن لپکا، پھر پکانا اور کھانا کسی باورچی خاتون کی طرح کسی
میں ہاتھ کے استعمال سے اظہار میں ہوں۔

[illegible]

موت کو نہ دیکھنے میں آنا گنہگار ہوتا یا اس کے چہرے پر بھی ہونی کا ذکر بیت کی روشنی سے اٹھ رہا ہے۔ اور سے دیکھنے والا کوئی انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کے نیم گئے سر اور ہاتھوں سے پہنچا اپنی تمارت کی چوٹی توجہ سے اُس کی کارکردگی ملاحظہ کر رہا تھا اور سب سے بہت ادھر اونٹ کی سڑی کی جھین کے سائے میں اُس کی مشقت اور ٹھنک کو خوب ہی غور سے دیکھ رہا تھا۔ شاید یہی کچھ

دیکھنے جانے کے لئے ہاتل قاتل والے بزرگ بابائے مجھے ادھر اس اق ووق عرا میں بھیجا تھا۔ سوچا کہ میں اور کتنے روز یونہی یہاں پارہوں گا۔ بس یہ کچھ دیکھنے کے لئے ودا رہا ہے وہ جا رہا ہے۔
بے بظاہر بابا دھور رہا ہے بگور رہا ہے۔ بس سچی کچھ تو تھا جو ایک بار دیکھا یا سو بار دیکھا۔

میں بلا ارادہ اُنھ کو اس کے پاس چلا آیا۔ ”اسلام علیکم یا سلیمان آخ“۔ کہو کیسے ہو؟
اُنہوں نے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ مگر یہ حال جو اس نے اک نظر اُنھا کر بھی مجھے دیکھا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ
زیر لب سلام کا جواب بھی دیا ہو جسے میں واضح طور پہ سن نہیں سکا ہوں گا۔ میرا پاس بیٹھنا شاید فضل
کہ وہ تو اسی اٹھاک سے رگزار گڑی میں جتا ہوا تھا۔ اس کے پاس کون ہے اُسے کچھ خبر نہ تھی۔
جرات کر کے اک کھنگورے سے اُسے متوجہ کیا اور ہاتھ سے دوسرے دیکھنے کی جانب اشارے کرتے ہوئے
یہ کہنا چاہا۔ اگر اجازت دو تو میں اس کندے دیکھنے کی صفائی کر کے تمہاری مدد کروں؟
میری اس مخلصانہ پیشکش کو کسی بھی طور پر رخصت نہ سمجھا بلکہ ہاں یا نہ کا کوئی اشارہ دینے کی بجائے اپنے
میں مزید اٹھانے لگا۔ جیسے اسے میری یہ مداخلت پسند نہ آئی ہو۔

سلیمان آخ کو ہمارے مسافر تو اک طرف اُسے اپنے جہاں سے بھی کسی قسم کی کوئی مدد دینا
شاید یہی وجہ تھی وہی سے بے شک ہوا اور کہہ سید کے منہ ہاتھ میں پتھر رکھ کر دیکھ کر
کے سنبھالے ہوئے کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ابھرتا کہ وہ کانوں سے بہرہ اور اُنھوں نے
ہی ہے۔ انہوں نے جسے نہ کہ جو جسم بیٹے اور بظاہر ہمدانی کی بنا پہ لوگ پاک اپنی سے کوئی پہلی فری بات
ہوئے خاص کر کہ تھے۔ اُنھ اپنی پیش قدمی کو قبول نہ کیا کہ خاص کر خاص کر خاص کر خاص کر خاص کر خاص کر
بندہ تو پچھے پہ ہاتھ رکھنے نہیں دیتا۔ سوچنے لگا کوئی ایسی ترکیب ہو کہ یہ تاجین دام میں آئے۔
دماغ کی کوئی بند کڑی نکلی۔ کیوں نہ میں ہاتل قاتل والے بزرگ بابا کے حوالے سے بات کر کے
لے ہوتے ہوتے ہوئے کوئی چھوٹی عربی اور آسان سی انگریزی میں بزرگ بابا کا حوالہ دیتے ہوئے
تعارف کرایا اور استدعا کی کہ میں ڈرویشی کی راہ کا کمزور مسافر ہوں اور ارادہ ہے کہ جی جنت دست
بھگ رہا ہوں۔ ظہور کرنا زحائیاں اتے تیکے جوں ماریاں میرا نصیب ہیں۔ مجھے یہی حکم ہے کہ چلے
پاک اللہ کی زمین آستان پیرا اور یا مسخرانگل دیانے نگل خائے تمہارے منتظر ہیں۔ جاؤ ان سے
پیدا کرو۔ پیرا اور جانو۔ ہاں کی جوتھے پہ جوے چھوئے کوئی پیچوں والی مشینوں پہ۔ آجی پروں والے
پرنڈوں پہ سمندروں کے سمندوں پہ تیرتے ہوئے ران منوں پہ یاد رکھوں یہ ڈرویشی اور پوزہ کرنی نہیں ہے
ڈریدہ ڈری اور رفو گری ہے۔“

سید انہی کو یوں بریک لگی جیسے انہی خاص چلتی کام کرتی مشین بجلی بند ہو جانے سے پڑاں چھوڑ دیتے ہیں۔ ہاتھ ساکت، موٹی سی گردن موڑے۔۔۔ موٹے موٹے ڈیلے لٹکائے، مجھے خفیہ والوں کی طرح اچھٹے کانٹے جیسے میں نے انجانے میں کوئی انتہائی حساسی بات کہہ دی ہو۔ اس کے اچانک بھونچکانے پر گھر سے کہیں بھی ٹیٹا سا گیا تھا۔ یوں چند منظر ہی سامنے ہمارے درمیان خاموشی سے گزر گئیں۔

کہہ رہی تھی آنکھوں سے اپنی آنکھیں لٹکائے بغیر ہی پاس پڑے ہوئے ان ڈھلے پڑے سے دیکھنے کو نصیحت کرتے کرتے گردیا، دو منٹھیاں ریت ڈھکے میں ڈالیں پھر اپنی پچھلتی عربی اور لڑکھائی انگریزی میں کہا۔

”سندہ کرنا ایسا مشکل نہیں جتنا مشکل پاک صاف کرنا ہوتا ہے۔ چلتی ہوئی ہوا کی مانند مست خرابی نہیں لگتا، سوہن روح نہیں ہوتی جیسی حالت قید و قیام روح فرسا ہوتی ہے۔ کہہ بول لینا بھی اتنا دکھ درد کا باعث نہیں ہوتا جتنا کہ چپ کلم جان چلاتی ہے۔“ پتلی کا کھلب کو کو کو دھڑکا، کھڑا کھڑا اور پڑا رہتا ہے مگر مدار کے آگے بڑھنے والوں کو ہٹانے چلانے، بھگانے رکھتا ہے۔ آسمان ستاروں سے۔۔۔ زمین فزوں سے۔۔۔ سمندر سے اور غمت و دامن اُشجار و اثمار سے جل نکل ہوتے ہیں۔“

UrduPhoto.com

وہ چلتی ریت کی ایک اور ٹھنی کند لے کر کچے میں اسی طرح لٹکائے۔

”اور اب اس کا نام دیکھو، اس کی ایک ہی بات کہہ رہی ہے، یہ تو اب خدمتِ خدا ہے۔“

”خدمتِ خدا؟“ ان گنت اربوں کمریوں فزوں کا شلک سمندر نما صحرانہوتا ہے۔۔۔ کچھ چاند اچالے کچھ آسمان پر گھٹا نوپ، صبح سے میں قطبی تارا۔۔۔ حاصل کھاٹ تو کبھی بکڑے بیل کا بات۔۔۔ لائق اولین تو گویا سرخس۔ یہ نغان بختو بے شک ہے اور کبھی میرا بے شک۔ یہ لڑائی کا اپنی بھی ہے اور عسائے سلیمانی کا۔ یہ لڑائی آذری بھی ہے اور عمر سامری بھی ہے۔“

خدا حیرت سے میری آنکھیں شق تھیں۔ الٹی ایسے ٹکر کے دکھ ہوتے ہیں۔ ہوتے چکر۔۔۔

”میں نے کچھ اور دیتے ہیں۔“ کلم ظہم، گونگا گونگا کیسے گونگا گون گون گون کا گویا برآب دار لٹکا۔۔۔ کلام میں ایسی بات کہ جس سے دل اور بڑبڑی کہ معانی و مطالب سمجھنے جانے میں شہر بھر بھی دھت نہ ہوئی۔۔۔ لیکن المیہاں سے میری آنکھیں کی مانند پتک پتک کرسٹ اوراک پہ منتقم ہوتا رہا۔ معلوم ہوا کہ عشق و شغف کا خود تصوف کی آنکھیں کھلنے پہنک بھی لٹکائے چھپائے نہیں رہتی اور من و مطلب کی بات چیت کسی عربی فارسی اور ڈاکٹر یزی بات نہ تھی۔ جس لیے اور ٹی جلی زبانوں میں اس نے گفتگو کی تھی اگر اسے لکھ کر میرے سامنے سمجھنے کے لیے لکھا جاتا۔ سمجھا تو درکنار میں شاید اسے کچھ سے پڑھ بھی نہ سکتا مگر بھلا ہو میری خانہ خرابی شوق و مطلب کا کہ صاحب اسرار و صفات کی زبان سے لکھا ہوا ہر لفظ میرے باطنی شعور پہ میرے لئے قابل فہم صورت میں

اتھا ہوا۔ اور شاید اسی طریق نظم سے وہ بھی میرے سوال و طلب کے مافی الضمیر سے آشنا ہوا تھا۔

جب عربی تجنی درمیان سے بٹے تو اب وہ طالب و مطلوب عاشق و معشوق... معشوق... معشوق... آئے سامنے تھے۔ پانچویں انگلیوں والی ریت بھری منگھنی نوکچے میں ڈال کر بولا۔

”لو... تم بھی اپنا شوق پورا کر لو... لیکن یہ یاد رکھنا کہ تمہیں خوب معلوم اور محسوس ہونا چاہیے کہ کیا کر رہے ہو اور کیوں کر رہے ہو...“

میں ان الفاظ کے اندر جھانکتا ہی رہ گیا اور وہ پھر اپنے رگڑائی صفائی میں بٹ گیا۔ دیکھ کر میرے چہرے پر پینہ سے میں بھری ہوئی سفید موتی بھر بھری ہی ریت میری توجہ کی منتظر تھی... آستینیں چڑھا کر اس نے بھی ہلہ بول دیا۔ مگر چند ابتدائی رگڑوں سے ہی میری جھیں بول گئی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ صفائی ستھرائی کے کام کو میں نے جتنا آسان سمجھا تھا حقیقت میں یہ ایسا آسان بھی نہیں۔ عملی طور پر اس کے لئے محض جسمانی ہمت و طاقت کی ہی ضرورت نہیں بلکہ مہر، ہنر اور روحانی بردباری کی بھی ضرورت ہے۔ جبکہ ہنر میرا اپنے ثانی تھا۔

میں نے ہلکی سے سرکائی لیتے ہوئے کافی آنکھ سے اس کی ساری دیکھا۔ کتنی ہی بگڑی ہوئی شش بہشت کے جادو کے پیرائے میں اس کی ہر بات میں ایسی ہی جادو کا لہجہ تھا۔ وہ اپنے ہر کام میں یا گفت کے انداز کے پہلوی گدو کا پون چہٹ۔ کمرہ ارض کا تھوٹا فرش۔ وہ اپنے ہر کام کے ساتھ ہادیہ کے آؤج کا وہ بھا ہوا تھا جبکہ میرے ہاتھ انگلیاں ریت کی رگڑ سے سفید کی گئی تھیں۔ اشتیاق اور استغراق دیکھ کر مجھے سمجھنے کی بات ہی محسوس ہوئی۔ چنانچہ اٹھائے بلکے بلکے ہاتھوں سے وہ ریت میرے نرم نرم ہاتھوں انگلیوں کو چاٹ رہی تھی۔ پردوں، پردوں سے خون رستے درختوں ہی چلنے لگیں مگر میں راتوں کے جیب دہانے ڈار ہا۔ ہاتھ پھرتی اور پھر پھرتی کی حالت میں تھی۔ معاہدہ نظر پڑی تو میرے دھچکے میں پینہ سے کی پھلت میں اب شرفی بھی شامل ہو چکی تھی۔ اس نے وہ کچھ انسان پر محسوس ہوا جیسا کہ وہ اشعوری طور پر پناہ رستہ کی محسوس کرنے لگتا ہے... ہاتھ کھینچنے کی ہاتھ خیر نے لکھے۔ رگڑ کھائی ہوئی تہوں سے خون رستے ہاتھ۔ شاید اس رات میں میرے دیکھ کر وہ نگاہ اٹھائے اور ہاتھ رگڑ کے بغیر وہ بولا۔

ہاتھ ہاتھ سے لگتے لگتے جب تک ہر طرف نہ پہنچے اور روشنی کے دائرہ راستے جگر مگر نہیں ہوتے۔ تمہاری اتنی رگڑائی ہی کافی ہے۔“

اگلے کئی روز میرے ہاتھ شرفی ہوئی چمکیے چمکیے اور سو بے سو بے رہے۔ ہاتھ ہاتھ ہاتھ ہاتھ

... کہ کسی چیز کو چھو نہ تک دھیر نہ ہو گیا۔ موٹی موٹی باسی روئیاں توڑنا تو کجا۔ گنگڑوں والے
... کے مزے چھپے کو منہ تک لے جاتا بھی کاردار وہ بن گیا۔ زیتون کے تیل چڑے چھتڑے لپٹے ہاتھ
... تک بہت بہت رکھتا رہا کہ ہوا تک چھوٹے سے بھی ٹپسیں اٹلے لگتیں اور جی بے حال ہو جاتا۔

... یہ امر کی کوئی فلم کبھی تھی۔ بلیک اینڈ وائٹ فلموں کا دور دورہ تھا۔ فلم کے شروع ٹائٹل میں
... کے جہازی ٹل پہ ایک قد آور پہلوان نما آدمی رنگ و رنگ سے چومیں لگاتا۔ اُن اُن اُن!
... میں بیٹھا ہر تماشا شافی یہ آہنگ و رنگ اپنے زماں و سماعت میں بُری طرح محسوس کرتا۔ لہذا فلم کے
... کے ہم جنوں پہ ایک نا محسوس سا ردِ پد یا خوف سا طاری ہو جاتا تھا اور فلم جتنی بھی بھلی بُری ہوتی بڑی
... سے دیکھی جاتی۔

... یہ طبعان آئی کی زبانی یہ دیکھوں کے چندوں کی جلس سڑن تجیش اور ہاتھوں کے بُرے حالی کا سن
... کے تو طے لے کر گئے۔ اور میرے ہاتھوں کا فی الواقع یہ حال کہ جیسے ابھی ابھی دکاتی کھالی
... کے ہوں۔ ریت کی رنگینی اور بھٹی لے آئی ہوا تھوٹھا ہوا تھا۔ لیکن انکیاں کا فوری
... کے ہاتھوں میں۔ بہت اچھے اچھے ہاتھوں کے ایسے ہاتھوں کا ہوا ایسے ہی ہاتھوں اور انکیوں

... ان فرنگی زبیر رحیل کو بھٹی

... سمجھتی اور پھنسی کی اگلی جانب رہنے والے ہر باشندے کو پھان گھستے ہیں بنوہ حقیقت میں ایسا
... کے ہاتھوں میں مانجھی چھانچھی پٹاوری کا بی پھان افغانی وغیرہ یہ سب مختلف قومیں ہیں۔ ان کی
... کے ہر طور طریق ایک دوسرے سے جدا گانہ ہیں۔ ان ملاؤں کے اچھوتوں کے ہاتھوں سے میں برا
... کے ہاتھوں پر علاقہ پار اور پڑے کے اچھوتوں سے کہ یہ بلا کے ہوز مغزے ہوتے ہیں۔
... کے ہاتھوں میں بڑے اچھا پسند اور محبت میرے۔ پولیس والوں کی طرح نہ ان کی دہائی ابھی
... کے ہاتھوں

... کے ہاتھوں میں ہندو ان علاقوں کے باسی ہیں۔ ان میں خالص پھان بھی ہیں اور اچھوت افغانی
... کے ہاتھوں میں جو یہ کچھ نہیں ہیں۔ میں عام طور پہ کسی عقیدت مند کے گھر نہیں جاتا کہ میرا طریق اور

چلنی کچھ اور ہے لیکن خاص طور پر پنڈی کے اس پار تو بالکل نہیں جانتا کہ پنٹھانوں اور افغانیوں کا بیروں نقشے میں
 یا درویشوں کے معاملے میں "انداز عقیدت" کچھ دیگر قسم کا ہوتا ہے۔ یہ عالمی اور مغربی بھی کلاشکوف کے
 ذریعے زیر دستی حاصل کرتے ہیں۔ ادھر شمالی علاقہ جات بھی ہیں۔ یہاں کے باسیوں میں پنٹھانوں اور
 توٹمیں لیکن بے علمی اور توہم پرستی عروج پر ہے۔ سر بلنگ سر بھر پناؤ شوریدہ دریا اور اس چشمے اور بھرنے سے
 کھلی فضا میں اور وسیلی ہوائیں پھیل پھول خوشبو میں نگارے۔ غرضیکہ قدرت کی بے پناہ فیاضیوں نے ان
 علاقوں کو جنتِ نظیر بنا رکھا ہے۔ یہاں کے باشندے صحت مند قانع و مجسم مزاج والے اخلاقی اور جفاکش ہیں۔
 تعلیم و تہذیب سے قریب قریب بے بہرہ۔ دور دراز اور دشوار گزار ہونے کی بنا پر ترقی پذیر دنیا سے الگ
 ہوئے۔ یہاں کے مسلمانوں کی اکثریت میں نام نہاد زیادہ ہیں۔ بیشتر مختلف فرقوں کے پیرو اور بہت سے
 لادین اور کافر۔ گو بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ ان علاقوں میں بے شمار بہت تبدیلیاں ہوتی ہوئی تھرتھ
 ہیں مگر ناخواندگی قدامت پسندی اور توہم پرستی کے سبب یہاں کے باشندے صحت مند تبدیلیوں کو قبول کرنے
 سے قدرے محتاط رہتے ہیں۔ وہ اسی پرانے ماحول اور اپنے آباء و اجداد کی کہنہ رو الیا کے مطابق
 بسر کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ سے وقت اور راتوں کی مشقی ترقی سماجی جدید نہایت و ایجادات
 ناراض رہتا ہے۔ یہاں کے لوگ اور قبیلے ایسے بھی ہیں جو خود کو پہاڑوں اور پاتاؤں کی اولاد جانتے ہیں۔
 سمجھتے ہیں کہ ان جنتی علاقوں اور سر بلنگ چاندنی کی برف سے سر پوش پہاڑوں میں صدیوں سے ان کی
 کشمیریوں اور ان بھرتوں اور غلوں میں رہتے ہوئے ان کی آبیاریوں کے وہی مالک و امین ہیں۔ یہ ان کے
 اور وہ ان کے بن اوصاف ہیں۔ غیر ملکوں و زمینوں کا کوئی خاص چاہت و گرم جوشی سے سوا کچھ
 کرتے۔ یہاں پیادہ لاچار ہونے کا تصور بھی ناپید ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کا اکثر اعلیٰ ترین نوکیل سکول تک
 کسی محل کے افسروں کو وہ عجیب سی نظروں سے تو لیتے ہیں۔ اس جہان چھوٹے لوگوں کے چوکھٹے اور کالی ڈور پر
 فروں پر چڑھ کر گانے لگانے والوں کو پہاڑوں کے دراستے آسمان سے اترنے والا تصور کرتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ
 کے بیٹے یہاں کے حکمران ہوتے ہیں۔ صدیوں سے یونہی ہوتا چلا آیا ہے اور شاید ایسے ہی ہوتا رہے گا۔
 میں ان ذہن داران کی مانند ہوں کہ ان علاقوں میں خوب خوار و شراب ہوا ہوں۔ وہ
 جو بشریوں کے قرب و بزار میں ہیں ان میں آپ کو کسی طرح کا کوئی ایذا نہ چھوٹے گا۔ اصل امر
 جلال و جمال تو بہت پڑے ہے۔ دشوار و تنگ رو گزاروں خوفناک دزدوں کھائیوں۔ آرائیوں چڑھ
 اور موسم کی چیرہ دستیوں سے آگے۔ جہاں پہنچ کر محسوس ہوتا ہے کہ انسان بالکل غفلت کے آگاہ میں

جسم و جان اور سوچ و فکر کی ساری کٹافٹیں — ڈنیا داری کے سارے جھپٹے کھینچ ڈال رہے تھے۔ یہاں تک کہ مذہب و مسلک بھی کھینچ آسودہ ہو جاتا ہے کہ یہاں انسان جیسے نیا جنم لیتا ہے اور اس نیا جنم سے سلیم یہ پیدا ہوتا ہے۔

پھر کا ایک آسودہ حال تا جرحۃ جو کارہ باری سلسلے میں لاہور آتا جاتا رہتا تھا میرے ساتھ ملکی سی حالت سے بہت تھا۔ شجر چلفوز وہی اٹھان والا اچھا خاصا پڑھا لکھا اور خوش خیال و خواب جواں کہ جسے دیکھ کر دل سے سوسائے آجائے۔ ... مزید برآں یہ شکرور کے قدیمی اہل ثروت و حشمت خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کا ہاں صاحب اختیار سمجھا جاتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر جو حیرت کا مقام کہ یہ خاندان اہل سنن و احناف سے تھیں۔ جبکہ وہاں کٹر قسم کے اہل حدیث اور اسماعیلیوں کا تقاسب زیادہ ہے۔ یہ اللہ کا وہی اپنا سلسلہ تھا کہ کچھ عرصے سے جوڑتا تھا۔ تمام مشہور اکرین کیلانی۔ اس کے ساتھ پہلی ملاقات داتا جھویری کے ہاں ہوئی تھی۔ شجر و ادب کی اوس میں ترہرچہ و احیاء کھائی ہوئی گولیاں نکلیں۔ اس کا ہاتھ نکلتا تھا جسے ایک نفیس سا بھنگا لگا کہ اس کا قلب جاری تھا۔ شجر و حافیستہ اور یافتہ گھرنے کے بعد اس کا دل بھی جاری تھا۔ اسی شجر میں ان کا تعلق تھا کہ کچھ دنوں پہلے وہی سلسلوں سے ملے تھے۔ یہاں پہلے سے ایک شجر تھا۔ اس کے ساتھ میں سے یہی تھیں کہ وہاں ایک یہاں کسی جوہری شجر کا شجر بھی آچکا ہے۔

وہ شجر پہلے ہی شجر جمہرات کو داتا دربار پہنچتا تھا جسے نو چندی جمہرات کہتے ہیں۔ مجھ سے ایک عرصے کے بعد وہ شجر کی ایک شاخ سے جو کہ پتھر جیسا تھا کھینچ لیا گیا اور اس کی شکستہ سی کی شکایت کی گئی۔ ایک شاخ سے وہ سر نہوڑے جیسے کسی مرا تھے کے تھے میں اتر جاتا۔ میں بھی نقل ہونا پسند نہ کرتا۔ شجر پہلے کرتا اور نشست کے برعکس ہونے سے مجھ سے بھری بوتل پانی دام کہ داتا اور نکلتے ہو جاتا۔ یہ شجر جب وہ معمول کے مطابق نہ پہنچتا تو میں نے اس کی گئی کو غیر معمولی طور پر محسوس کیا۔

سب کوئی بھی ہو وہ اپنی شکل و صورت و حالت و حشمت لباس و لباس ترانی کی بناء پر کم ہی پہنچتا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جنات و خیروں کہ در و قدش اور ادب و اخلاص سے زیادہ نمایاں و ظہور ہوتا ہے۔ یہاں بھی شاید یہی حال تھا کہ اس کا آویز سامنے یا سر اتر لگات و صحت اور حفاظت مراتب کا ایک ٹکس سامون تھا۔ جیسے کہ اس کے پہلے ہی سب عرش کر چکا ہوں کہ ہر انسان اپنا ایک جہلی جانور اور اپنی نفسوں کو رکھتا ہے۔ یہ جانور اس کے ساتھ ہو سکتا ہے چرندہ پرندہ اور خزندہ بھی۔ اسی طرح اس کے بدن بھون کی ہو۔ خوشبو بھی ہو سکتی ہے۔ یہ کچھ قسم ازل کی طرف سے بھی ہوتا ہے اور زیادہ کچھ انسان کی اپنی سوچ طینت اور

کرم و کرامات کا شاخسانہ بھی۔ اگر آپ صاحب جس روزگار ہیں تو محسوس کیا ہوگا کہ آپ سے ہاتھ ملنے والا معائنہ کرنے والا یا قریب نشست اختیار کرنے والا آپ کو محسوس ہی علمائیت یا انجانی سی سمجھتے ہیں۔ اگر گیا ہے۔ لیکن یہی خواب آگئیں ہی مہک نے آپ کا احاطہ کر لیا ہے۔ آپ اس شخص سے صرف بات نہ کر ہی نہیں بلکہ اس کی قربت کے خواہش مند بھی ہوتے ہیں۔ اسے اپنی نگاہ کا محور بنالیتے ہیں۔ جبکہ وہ آپ کا کوئی قرابت دار یا جاننے والا بھی نہیں ہوتا۔

اسی طرح بہت سے ملنے والے قریبی رشتہ دار یا آس پاس کے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ صرف تصور بھی آپ کے لئے سوالیہ روح ہوتا ہے۔ ان کی قربت سے طبیعت میں غلجان پیدا ہوتا ہے اور فی الحقیقت آپ کو بدبو کا احساس ہونے لگتا ہے۔

کچھ مخصوص ہستیوں کے ہاں یہ صلاحیتیں چنداں نریا دیتی ہوتی ہیں۔ ان کی ظاہری باطنی صفات اتنی شارب اور شاہد ہوتی ہیں کہ سادہ سراپا سرورپ سماعت سناج اور ساز کیسے بڑھنے دیکھنے اور سمجھنے میں انہیں عجز محسوس نہیں ہوتی۔ انہیں نہ دیکھنا چاہتا کہ انسان پرشور ان کے سامنے کھلی کتاب ہے اور بولنے والے کی مانند ہوتا ہے۔ ان کے لئے محسوس کے حوالہ دیا کہ ان کی کلمہ کی کلمہ حقیقتیں ان کی طبیعت کے لیے ہر لمحہ سارگروں سے زیادہ ہیں۔ ان کے محسوس کے اعتبار سے ان کے احکامات ہوتے ہیں۔ ان کی برکتیں و ہستیاں ہوتی ہیں۔ ان کے حوالہ دیتی کے ہاں غایتہ الارض ہیں۔ لیکن ہیں وہ لوگ جن کی بات میرے لئے حکم حکیم الامت ہے۔ فرمایا ہے۔

”پوچھو کہ جو شخص اپنے لیے نیچے نہیں اپنی آستینوں میں مشورہ و امرین کیلالی لٹا لے غیر حاضری کے بعد جب دانا سرگاز پہنچا تو میں نے انہوں ہی لگا ہوں۔ اس سے غیر حاضری کی وجہ دریافت کی تو وہ کہہ جواب اپنے کی بجائے حسب معمول سرخیکا کر کہیں مرا قہر سے ہر گز نہ لشت کیسے سے پہلے اسے اپنے پاس بلایا۔ حال احوال پوچھا حسب معمول وہ سر اور ہاتھ جو کالے الحمد للہ الحمد للہ کہتا رہا۔ یہ واحد میرا اختیار تھا جو تمام شیعوں کی زبان سے مجھ سے منتقل تھا۔ میں نے خود ہی کہا۔“

”لاؤ مجھے پانی کی بوتل دو دم کروں۔“ وہ اسی انداز میں پیٹھے پیٹھے بولا۔ ”شادی نے کہا تھا اب میرے لئے پانی لانا چھوڑ دو۔“ اگلے ہی کی کوئی صورت نہیں اتنی دور سے بوجھا اٹھا کر لانے کا کیا فائدہ؟“

میں نے چند ثانیے اس کی بات پہ غور کرنے کے بعد پوچھا۔

”شہابی کون ہیں اور افاقے قائد سے والی کیا بات ہے؟“

”جو ساتھیس ہیں وچیش کرنے کے بعد ایک لفاقہ میرے پاؤں کے پاس دھرتے ہوئے کہنے لگا۔

”باقی امیں نے اپنی غیر حاضری کی وجہ بتا دی ہے۔ بھائی مسعود الرحمن گیلانی کی پریشانی تفصیل

کے لئے غور کر رہی ہے۔ آپ بڑے مہربانی اس مہمل ہی غور کو جاننے کی رحمت فرما لیجئے گا۔“

میں نے اس مولے سے افاقے کو ہاتھ سے تولتے ہوئے کہا۔

”میرے بچے! پڑھنے لکھنے سے تو میں پہلے ہی بہت عاجز ہوں اور نہ ہی میرے پاس اتنی فرصت

ہے۔ سب کچھ تو مختصر الفاظ میں اپنا مافی الضمیر بیان کر دو۔“ وہ قہقہہ سا کہنے لگا۔

”وہی ایمان کرنا بھی چاہوں تو بھیج سے تمام حالات و واقعات بیان نہ کر سکوں“ آپ کے زور و

جوش و خروش سے شہابی کھٹکتی ہے اور آپ کے قیمتی وقت کا بھی احساس.....“

”کہہ دیجئے اسے از رحمت دیتے ہوئے کہا۔

”جس سے درست کہا ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ میں نے کچھ کچھ غلط بھی

UrduPhoto.com

کے امور دیکھنے میں ابھی تیس روز باقی پڑے تھے کہ اس نے ٹیلیفون پر تمام کام کے بعد ڈرتے

ہوئے دریافت کیا کہ میں کتنے دن کے کاغذات دیکھ چکے ہوں؟ ظاہر ہے میں نے اس کا کہا

”جس میں جسمی تجربوں والی فائل میں بن پڑے تھے اور کو دیا تھا کہ میں نے ہر کا وقت ہے کسی وقت فرصت میں

دیکھوں گا۔ میں نے مصروفیت کا بتا کر کہا کہ ابھی میں اسے نہیں دیکھ رہا۔“

”اور ان کا بتاؤ وہ اب کیسا ہے؟“ وہ بے میں نے اس کے لئے دعا کروائی تھی۔

”اب؟“ میں پتھری سے بول رہا ہوں۔ صورت حال بڑی آزمائش کن ہے۔ ہم سب یہاں

پر شہابی کے دور پریشانی کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ سے دست برداری کا کیا ہے؟“

”میں اس کی گفتگو کے اندر نہچے ہوئے گرب کو بڑی اچھی طرف محسوس کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا وہ

بے سرگرمی سے بچتا ہے۔ یہی تھا کہ اس میں گھرا ہوا ہے۔ وہیں صورت و حال اس انداز میں دیکھا

تھیں۔“

میں نے قدرے وقفہ لینے کے بعد بڑے سچ سے پوچھا۔

”بچے! اللہ رحم کرے، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ جب معاملہ امکانی تدابیر سے آگے نکل جائے۔ پھر مشیتِ ایزدی پہ توکل کرنا چاہئے۔ یقیناً اللہ کریم کبھی کسی کو اس کی جسمانی و روحانی استطاعت سے آزمائش میں ڈالنا پسند نہیں فرماتا۔ مختصر الفاظ میں اپنی پریشانی بتاؤ۔“

جواب میں وہی ہنچکا بہت مہیا ہٹ.....!

میں نے رُجھ ہوتے ہوئے جھلا کر کہا۔

”سیدھی طرح بات کرنی ہے تو کرو ورنہ صورتِ ٹیلیفون بند کر دو۔“

وہ جیسے بغل میں منہ ڈالے بات کر رہا تھا۔

”باباجی! اگر آپ سے بات کرنے کا یارا ہوتا تو کھو کر کیوں پیش کرتا۔۔۔ اور یہ قسط تو دیتے ہیں۔

بتانے لگائے لاکھ نہیں۔۔۔ باباجی! صبحِ قریشی کی معافی چاہتا ہوں۔۔۔ اللہ حافظ کہہ کر اس نے ٹیلیفون بند

دیا۔ میں کئی بوجھل سے سے ہند ٹیلیفون کان سے لگائے اس کی بات کی ٹیکنی پہ کوئی تیار رہا۔

اس دن میں نے پہلی فرصت میں اس کے دینے ہوئے ورق مطالعہ کے لئے کھینچ لئے۔

نتیجہ: ایک ہی تجربہ تھی۔ ایسی تجربہ میں منجھی عالم فاضل قسم کے تھے جس بہتیم و غیرہ کہتے ہیں۔ معمولی

پڑھے لکھوں کے میں میں یہ کی سی نہیں آتا۔۔۔

”ختمِ القام باباجی! السلام علیکم“

اللہ پاک! آپ کے درجات بلند فرمائے۔ گزشتہ ماہ معمول کے مطابق میں سرکارِ جہیز کے قدموں

میں بیجوہ حاضر نہ ہو سکا۔ اس طرح آپ کی خدمت میں پہنچا ہوا یہاں تک کہ یقین فرمائیں کہ میں غیر حاضری

کے باوجود باطنی طور پر یہ سوچ رہا تھا۔ باباجی! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اس اپنی گھریلو پرچہ

کس طرح بیان کروں۔۔۔ گویا کائنات میں میرے بڑے بھائی مسعود الرحمن کیلانی کی ذات سے ہے جس کے

کے بہت گہرے اثرات بالواسطہ میری ذات پہ بھی مرتب ہیں۔ میں تو کسی نہ کسی طور برداشت کر لیتا ہوں۔

نارے ضعیف المرء الدین اور بھائی صاحب کے نبوی بچوں کے لئے یہ الہاتِ مسلسل کا قابلِ برداشت ہے۔

بھائی صاحب ایک ایسے نگہبانی اور ناقابلِ فہم و شنید ادارے میں جتنا ہیں کہ وہ نہ تو جیتوں میں ہیں نہ مر جاتے

ہیں۔ ہم انہیں دن رات کے کسی لمحے اکیلا نہیں چھوڑے کہ وہ ہنسی میں کئی بار خودکشی کی کام کوشش کریں۔

چکے ہیں۔ اب بھی وہ اسی جتو میں رہتے ہیں کہ کہیں موقع ملے اور وہ اپنے منہ پاک کر جائیں۔“

یہاں تک کہ مضمون صرف ایک قراٹاں پہ تھا۔ اس سے آگے اسی طرح کے کی سٹے تھے جنہیں

اب میرے لئے بہت مشکل تھا کہ میں کسی کے اندوہناک حالات مسلسل ایک نشست میں سننے پڑھنے کا مقصد

تھی۔ جتنا کچھ میں پڑھ چکا اسی پہ کڑھتے ہوئے ٹھوکر مارنے لگا۔ بیٹھ اور اوراق میری گود میں دھرے۔
 کھانسی حالت میں پڑے پڑے نہ جانے کس اوٹک ٹوٹک میں بھر کے لٹو بیٹھ لگا۔

بڑی لمبی چوڑی زمینیں۔ جہاں مٹی 'جو' جو۔ پھل پھول اور خوب ہری پھری سبزیاں اُگا کرتی
 تھیں۔ پاک اور بھیڑ بکریاں دودھ گھٹی مکھن کی فراوانی۔ گھریلو ملازم جوٹیاں اور بڑے بڑے باڑے۔
 ان کے مرغزاروں میں کھلیا رہے۔ ادھر کے قدرتی متول صاحب حیثیت گیلانی سادات سے تعلق
 تھا۔ ان دشوار گزار پہاڑوں کی وادیوں وادیوں گھائیوں اور نباتات سے آسودہ آڑھے تر چھ
 موٹی برساتے بھرنوں اور کڑوں کے جھالے جھالے آبشاروں کی جلو میں ساوگی اور نا آشیانی
 کے ساتھ ہی زندگی بسر کر رہے تھے۔ گیلانیوں کا یہ طرز آتشاید محمد و محمدؐ چند گھرانوں میں سے ایک تھا جو
 تعلیم و تربیت کے علاوہ عصری تعلیم کے تقاضوں کو بھی سمجھتا تھا۔ چنانچہ سید غلام قادر گیلانی
 نے اپنے دو بیٹوں مسعود الرحمن گیلانی اور مشہور الرحمن گیلانی کی دینی اور دنیوی تعلیم کی نگرانی کی تعلیم یہ
 مسعود نے دارمشفق اور جان ماروں کے بعد ان کے ساتھ ساتھ ان کے تعلیمی کاموں میں بھی حصہ لیا۔ ان کے
 کے ساتھ ساتھ ہی ایک اور صاحب زمیندار اور سیاست دان تھے۔ ان کے بیٹے تھے اور جنہوں
 کے ساتھ ساتھ ہی ایک اور صاحب زمیندار اور سیاست دان تھے۔ ان کے بیٹے تھے اور جنہوں

دارم صاحب بہت عملی طور پر وظائف زندگی سے سبک دے دیے تھے۔ ان کی تمام ذمہ داریاں
 مسعود گیلانی کے کندھوں پہ آئیں۔ مسعود گیلانی نے اپنے علاقائی روحانی طرز معاش
 سے مل کر جدید انداز طریق سے کاروبار کی تھی۔ چاروں پسپا ہوا تھا۔ اسی لیے ان کی ایکسیس حاصل
 تھی۔ مسعود الرحمن گیلانی چونکہ کوٹا و قلعہ میرپانے کا تعلق اور کاروباری سوچو بوجھ بھی بدلتا تھا۔
 کہتے تھے کہ میں دین اور خرید و فروخت کے سلسلے میں بیشتر وقت شکرور سے باہر ہی رہتا۔ اس نے اپنا
 گھر دینی پر کام کچھ اس طور وضع کیا ہوا تھا کہ سنے چاند کی چوکی جھراے وہ بہر صورت داتا گھڑی
 اور دینی کی چوکھٹے انداز پر عارضی دینا فائدہ عداوت اور تسبیح و تہلیل کے بعد کچھ وقت میری طبیعت میں
 آتا تھا۔

دارم صاحب فقیروں، مہذبوں اور بالوں کے ارد گرد بیٹھے کھڑے ہونے والے لوگ بھی عجیب و غریب
 کرتے ہیں۔ اکثر ناڑوں یعنی از قلم کرید و مرید ہوتے ہیں۔ کھڑے بیٹھے کھڑے رہیں گے پاس نہیں چھلکتے کہ
 سے بخارہ کرتے ہیں۔ جیسے سینما ہال کے باہر غریب غریب ایکسپوز کے ٹھکرے پڑے پڑے بیڑا اور

فوٹو سٹدی دیکھ کر اپنا رانگھا رانھی کر لیتے ہیں۔ اسی طرح یہ زردھانی بھونٹ بھی ہوتے ہیں۔ یہ وہاں سے مقامات کے انداز سے لگاتے رہتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا 'شیشا شریف' یا گنبد کی چو پال بھی پڑھنے سے اصل کھلاڑی تو دو چار ہوتے ہیں مگر ملاٹھین اور مشیر و مندوب زیادہ ہوتے ہیں۔ بابوں کی چو پال شیشا یا ارب و با امر دو چار والے ہی ہوتے ہیں۔ باقی اکثر شہر اچھے راضیاہے یا عید و قسم ہوتے ہیں جو وہاں کیسیٹیوں، لائبریریوں کے نمبروں کی تلاش میں ہوتے ہیں یا پھر وینوں، امیگریشن کے چکروں، ٹریکیوں سے ملک کے انڈر چلانے والے۔ کچھ قرضوں اور کاروباری انجنوں میں جکڑے ہوئے۔ یہ سب برسرِ حال کی طرح ہوتے ہیں کہ حالات کے موسم میں کہیں بلکی سی گرہی سردی آئی تو یہ چڑھ دڑے سردیوں سے فقیروں کے ڈیروں پر۔ اور جو نئی حالات میں بہتری آئی تو پھر وہی پہلی سی بیٹھا گئی۔

جیسے کہ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ یہ چھوٹا مشہور بازار گیلانی کم از کم ایسا نہیں تھا۔ اس کے کوئی نے تو کبھی مجھ سے انصافی انھروں سے زیادہ بات ہی نہیں کی تھی۔ اتنا کچھ جھپک سے اہم نہیں سمجھتا تھا۔ بن پہلو بدلے دیوں تبہ دوئے عقدے میں جڑا رہتا جیسے یہ دنیا و مافیہا سے پرست و حسنی کیا تھی۔

UrduPhoto.com

میں اور ان گیلانی واسطے پھولے بھالی سے زیادہ اتھوڑی ادب و کرداروں کے معاملہ میں انھیں آگے ہونا چاہیے تھا مگر بد قسمتی سے ایسا نہیں تھا۔ کارکن اور بڑا ہونے کے زعم اس میں کچھ خیر نہیں خور پندی آئی تھی۔ انھیں شہریت باپ کے بارہو لے کے بعد خاندانی زردھانی سلسلہ کی باگ و تاب کے ہاتھ آئی تو قدر و قدر میں مزید غلطی ہوئی۔ انھوں نے ہر حال میں جو تخت و تہو لے بھی لی تھی سیاست و قیادت نے بھی طاقت و جمع میں ایک چمک چاند پیدا کر دی تھی۔ بس یہیں توازن مگر کیا یہی کمر عیش پسند حجاب نے چوری کر دی۔ مشہور الزمن گیلانی راہ راست سے ان کے عزت و عزالت کی جگہ کھائیوں کی جانب پڑھا شرمناک ہو گئے۔ شراب و کباب کے ساتھ طاقت و زباب اور نہیں سے حسن و عجب یعنی ان سب کے اندر سے آپس میں ملتے تھے۔ خاندان سے بھی ایک قبول صورت سادہ سی وہی بڑی جڑ کی جس کی گود میں دیکھول سے بچے باپ کی صورت اور شفقت کے لئے ترستے ہوئے تھے۔ اپنی دلی خواہش اور کاروباری مصروفیات کی آڑ میں کئی کئی شب و روز مگر سے غائب رہنا ایک معمول بن چکا تھا۔ کاروبار اچھے نہ سے کاروباروں کے سپرد تھے۔ جو مالک کی پیش کشی اور عدم توجہ کی وجہ سے وہاں واقعہ کوٹ رہے تھے۔ مشہور الزمن گیلانی باپ کی جگہ کھڑے ہوئے بھائی کی ہر حرکت سے واقف تھا۔ یہی ہم ادب میں رہتے ہوئے بھائی کی خیر اخلاقی اور غیر ذمہ دارانہ مصروفیات پر تشویش کا اظہار بھی کر چکا تھا۔

ہوئے تھے۔ عام آبادی سے زور پیمائشوں کی محفوظ غاروں میں ہر ممکن آسائش و سہولت سے آراستہ
طرح کے کوٹھی خانے تھے۔ معزز مہمانوں اور سیاحوں کے گروپ میں یہاں بڑے بڑے شہروں سے
نجرے والی طوائفوں اور گانے بجانے والوں کا آنا چانا لگا رہتا۔۔۔ چنی چنی کے منتھل نعل جوڑوں
کی عاری میموں کی چہرے کی ضروریات پوری کر کے انہیں عنایت و فحاشی کے لئے استعمال کیا جاتا
ہے یہاں منشیات کا ہلکا پھلکا ذہن بھی ہوتا تھا۔

آج کل دنیا میں عجیب و غریب فلمیں بن رہی ہیں۔ ان کا کوئی سرچ نظر نہیں آتا۔ دیکھنے والے بھانڈے دیدے لگائے، دھک دھک دل دھڑکانے، دہشت و وحشت زدہ فلم دیکھتے رہتے ہیں۔ بھوت بھوت سے بے یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ یہ کیا تھا۔ کہ مر تھا اور کیوں تھا؟ یہ سوچتے سوچتے فلم کا ایک کردار محسوس کرنے لگتے ہیں وہ ایک دو تین چار پچاس سا خاصہ اس طرح کی مافوق العقل و ماورائے فطرت وجہات غیر منطقی آغاز و انجام والی بیجان خیر فلمیں دیکھنے کے بعد بندہ بندے کا پتہ نہیں دے سکتا۔ ایک شے بالائی خیر خیر سامن جاتا ہے۔ انسانیت اور خود انسانیت تو کہیں غائب ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ان کی جگہ انسانیت اور وحشت اور آتی ہے۔ پھر ذہنی، تکنیکی، جسمانی، جنسی اور زوہادی مواباش اس کے لئے اپنی آمادہ جاتی ہے۔ ان کی ہر ایک حرکت، ہر ایک سانس، ہر ایک اشارہ، ہر ایک لہجہ، ہر ایک حرکت کا شخص کو نئے بارانی۔ بارانی قسم کی جنسی قوت بڑھانے والی اشتہاری دوا میں اور دودھ کی خشکیت اور کھانسی کا مقدمہ بن جاتی ہیں۔ ان کی طرح یہ بال اختیار صاحب حیثیت مشہور لوگ جب تن آسانی اور پیش کشی میں ہیں تو پھر کوئی سہ اشتہاری ہے۔ ان کی اور سہ حیاتی ہے غیر تنی ان کی آخری حد نہیں ہوتی وہ پہلا ٹک ہے۔ پہلا ٹک ہی پہلے جاتے ہیں۔ پھر اسکی ہی کوئی پہلا ٹک ان کی آخری پہلا ٹک ٹھہرتی ہے۔ جس سے ان کو سہ رہتے ہیں اور نہ لگتے۔ یہی کچھ چھوٹا آسودہ اور اندھے لمحوں میں ٹھہر پڑا ہو گیا تھا۔

مارتھ مرسلہ: ایوانِ ترجمانی کی رہنے والی جیس بائیس برس کی لمبی آنکھوں والی چھیلی سی لڑکی تھی۔ یوں پونیورسٹی سے اس نے مشرقی اقدار و علوم میں تحصیل کرنے کی غافی پتہ نہیں کیا تھا۔ اس نے پایا کہ اس نے اپنا ملک پاکستان خاص طور پر شمالی علاقہ جات کی تعلیمی مصلحتاتی سیاست کو فیصلہ یوں میں پاکستانیوں کی ایک خاصی تعداد موجود ہے۔ ہر نوع کے لوگ پڑھ لکھے۔ لیبر مرسلہ کارروائی مصلحتی بحث نہیں بھی۔ کچھ جیس لوگ تعلیم و تحقیق کے میدان میں بھی تھے۔ تعلیم کے زمانے میں اس نے پونیورسٹی فیلو اورنگ زریہ تھا۔ جو ایبٹ آباد کے ایک مضمون آسودہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اورنگ

تھیں۔ آنگھان کا حیا دار، جامد، زریب اور جاؤب نظر۔ انہی آوصاف کی بناء پر وہ مارتھا۔ مگر وہ یہاں صرف تحصیل علم کے لئے آیا ہوا تھا۔ اس کے پیش نظر صرف اپنا علم ہی کمال سمجھ کر یہاں کی شہریت حاصل کرتا۔ وہ خاصا عمدہ قریب رو کر یہ محسوس کر چکا تھا کہ یہاں کی شہریت کی لڑکی نہیں۔

جب کہتے پیتے اور روشن خیال گھرانے کی چشم و چراغ تھی۔ ٹھڈا چانے وہ کیوں اور کس طرح کھاتا تھا۔ ان سے متاثر ہوئی تھی۔ خاص طور پر شاہی علاقہ جات یہاں کا رہن سہن رسم و رواج موسیقی، ان علاقوں کے متعلق اس نے دھیروں لٹریچر اکٹھا کر رکھا تھا۔ اور شاید ان سے غیر معمولی دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ اس کا تعلق بھی اسی خطہ ارض سے تھا۔ ویسے تو یہاں کے رسم و رواج کو اس نے پہلے ہی لکھن کا زبوج اسلام کی طرف تھا۔ دیگر ادیان و مذاہب کی الہامی لٹریچر کتابوں کی اس کا مطالعہ بھی مکمل کر لیا ہوا تھا۔ نماز روزہ اور دیگر مناسب و ارکان جنت بھی خاص ہی اس کو کوئی کسر تھی تو وہ باضابطہ مسلمان نہ بنے کی روٹی تھی۔ اورنگ زیب خان کے زہب سے اس کا تعلق تھا۔ اس نے اپنے دل اور اس کے قریب محسوس ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے دل میں اس طرح محسوس کی تھی۔

اورنگ زیب خان کا تعلق خیریت پورہ تھا۔ وہ اپنے لیے میں رہتے والا تھا۔ اس نے اپنے کام سے منسوب رکھنے والا۔ دیکھا ہے کہ ایسے سہید و طبع لوگوں کی آٹا بڑی چٹکی ہوتی ہے۔ اس کی زکیمیت یا اظہار سے غرور کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ کیا کہنے کہ اس کی یہ خامی بھی اس کی ایک خوبی تھی۔

اورنگ زیب خان اس کی آنکھوں میں تیرنے والے اجڑے کے ترموں کو محسوس کرتا تھا۔ اس نے اس کے سر پر اس کا تھا۔ بحیثیت ایک مارتھی، خود رو و دشمن کے بھی وہ قصد قبول تھی۔ اس نے اس کا بھڑکی ماوات۔ پاکستان اور یوں اس سے محبت بھی قابل ستائش تھی۔ مگر اس نے اپنے اور اس کے درمیان ایک سد خرمیت و احترام اٹھار کی تھی۔ اس نے اس سے پیش قدمی کا ہاتھ نہیں دیا تھا اور نہ ہی اس کے سامنے خود کو ایک ماوراء انسان کے طور پر جلوہ کا پابند کٹر مسلمان بننے کا سوا لنگ دیا تھا۔ نہ اشارے کنا سے بھی کبھی کوئی ایسی

آس امید دلائی تھی جس سے مار تھا۔ ”جواب آس غزل“ سمجھ لیتی۔

کمال کا کمال کہ چار سال کا عرصہ دیکھتے ہی دیکھتے بیت گیا اور دونوں اپنی اپنی جگہ پہ قلم اٹھائی ہوتی تو کم از کم چار بچے اور کئی ہار طلاق بھی ہو چکی ہوتی۔ جیسے گیا تھا ویسے کا ویسا ڈگری۔ لوٹ آیا۔ ایئر پورٹ پہ رخصت ہوتے ہوئے نہ کوئی وعدہ نہ کوئی آئندہ بچل۔ اور الوداعی بوسے کا بھی پیرا نہیں ہوتا تھا۔ جگہ سی مینسٹ بھری مسکراہٹ کے تھالے کے بعد دونوں اپنی اپنی جگہ گئے۔ ایسے کہ کسی نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

وہ دونوں شاید اپنی اپنی انا کے غلام تھے۔ عورت اندر سے بڑی نازک سی چیز ہوتی ہے۔ پھر ہر ذات کا بڑا ادھیان ہوتا ہے وہاں شعوری طور پہ اس امر پر ایمان رکھتی ہے کہ کائنات کا سب سے قیمتی اور اعلیٰ اثاثہ اس کے پاس محفوظ ہے۔ اس لیے اسے بہت پرست کر رکھتی ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ عورت کی سنبھالی ہوئی اسی دولت کو آپ اس کی عزت نفس کی لپٹوں یا پاپتوں کا پیار وغیرہ۔ یہ بھی افشا ہوا کہ عورت کی سب سے قیمتی چیز بھی کا پاپت احساس یا فوجش ہے۔ وہ سب کچھ سہ لینے کا بھرا رکھتی ہے مگر کوئی اس کی محبت یا وفا کا پھر اندازہ نہ کرے اس کی برداشت نہ ہو۔ ہر وقت اس کی زندگی کو سب سے زیادہ قیمتی اور فخر بخشی وقت ہے جب کوئی اس سے یہ احساس دلا دے کہ وہ اس کی نظر میں خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ عورت اپنے اس سبب وصال سبب اہمیت کو چند ہی ایسا اہم نہیں گردانتی۔ وہ تو اپنی جنس کے حوالے والی اہمیت سمجھتی ہے۔ حسن و جمال، اچھوتی اور چلی فوٹی، کس و کمال، محبت و سب و غیرہ تو اس قدر ان کے رگوں کی چھل ملی۔ مکمل عورت تو نہایت (جنس) کے کچے رنگوں سے رنگی چھوٹی ہوتی ہے۔ اپنی نہایت کی توجہ برداشت نہیں۔

یہاں اور تک نازب خان اور مار تھا مرید خاں والے قصبے میں بھی شاید یہی کہہ سکتے۔ وہ ایئر پورٹ سے نکل کر اور وہ بھی اپنی ازل سے اٹھانی سے پورا ٹکے لاؤنج کی جانب بڑھ گیا تھا۔ لکھنؤ دونوں جانب رہی ہوگی۔ انسان یا آخر انسان ہی ہوتا ہے پھر تو نہیں۔ چند دن ہی سہی اس کی رفاقت تو تھی۔

راستے میں گاڑی ڈرائیج کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ خان نے رخصت ہوتے سے کوئی برس پہلے ہی تکی تک نہ چھوڑی۔ یوں ہاتھ پھرا گیا جیسے کوئی انجینی تھا۔ کیا مسلمان پاکستانی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اپنے کام سے کام رہنے والے یا مطلب پرست۔ اس نے ایک نظر شکر یہ تک کا منہ سے نہ نکالا۔

نے حضرت اوست نہایت ہر چیز کو اپنی پھیلائی آگے بڑھایا۔

عجب جنسوں کے درمیان کوئی بھی رشتہ یا تعلق ہو کہیں نہ کہیں جنس ضرور کارفرما ہوتی ہے اور یہ ہے کہ کسی سچے پہ پہنچ کر ہونے بغیر نہیں رہتے۔ اور اگر کہیں نہیں ہوتے تو وہ یقیناً کوئی عورت کے۔ عورت ہی اور مرد مرد ہی ہوتے ہیں۔ خواہ ان کا تعلق کسی بھی رنگ نسل، قوم یا مشرق و مغرب سے ہو۔ جذبات و احساسات جنسی جلی زو کیے۔ غم، غصہ، پیارا، اظہار تو سب جنس ہی ہوتے ہیں۔

میں نے اس کا دریاغ مختلف نوع کی باتوں، سوچوں اور خیالات کی آماجگاہ بنایا ہوا تھا۔ ایسے ہی اُس کی
کلیں، خانہ کی اس طواریکا نگاہی اور سرد مہری پہ اک نئے زاویہ نگاہ سے غور کرنے لگی۔ دریاغ اک
جنگل کی مانند ترواں وقت کے ہار لین گئے ہاتھوں کی طرح پڑھا تھا۔ گمان گزارا شاید یہ انداز بھی
میں نے شخصیت کا کوئی انوکھا سا زاویہ ہو۔ انسان بھی شاید کسی تراشیدہ یا ناقص شدہ گوہر کی مانند ہوتا
ہو جائے تو کہیں مغز میں مسرت ہے۔ ظاہر باطن کی کئی رنگ آمیز مختلف صراحت اثرات
پتے پتے چٹکتے اور قرعے شطاب اور داغ و خیر و بد نہیں کہہ سکتے اور کہاں دیکھنا
اور بھی وہی کی جگہ کی جگہ۔ اور سرخی کی جگہ کی جگہ۔ جب کہ جو اپنے
نظر سے اُپر بال پر نہلا۔

ان کے روزِ خلافت کے موقعِ خان کا ٹیلیفون آ گیا کہ وہ خوجہ رست سے گھر پہنچ گیا ہے۔ اس نے شکر یہ بھی ادا کیا کہ آج کوئی مرتبہ یہ اس کا گھر آیا ہے۔ وہ تو کبھی تو کبھی اس کے مکان میں اپنے خیالی رکنِ اسیلیوں سے گفتگو کر رہا ہوتا تھا۔

یہ کہ قلعہ دیا سرت کا زور بڑھتا رہے اس کے معمولی اور غیر اہم دکھائی دیتے ہیں۔ مگر اس واسطے جان بدلو اور
 جان دے گا اور وہ خود سے یہاں نہیں جاتے ہیں۔ چند ساعتوں کی اونٹ کے بعد آگے کو لو تو وقت کا کچھو آگے
 کیے پھرا چکا ہوتا ہے۔ اسی طرح کئی گھنٹوں بعد کی شاہ میں جیتا ہے وہ برس آگے تھے۔ ٹیلیفون یہ
 ہے کہ وہ بھی چند رہی تھے۔ ”کسی ہو“ پر چالی کر رہی یا کوئی جا ب ”اپنا خیال رکھنا“ یہ بھی کوئی
 نہیں تھیں؟ آخر ایک دن اس نے ”مڑو“ سنایا کہ پیچھے غصے اس کی شادی ہو چکی ہے۔ ماں غصے
 سے کہ کوئی اس پر نہیں تھی۔ اس کی آخری خواہش کے استراہ میں میرا نکاح چھوڑ دیا گیا۔ ٹیلیفون
 یہ بھی کہ اب تم بھی شادی کر کے گھر بسا لو۔ اس نے یہ سب کچھ یوں کہہ دیا جیسے جتا رہا ہو۔
 اس نے گرمی کی فوج سے میرے چہرے پر گرمی دانے لگائے آئے تھے۔ میں نے فلاں کریم استعمال کی جس

سے مجھے افاتہ ہوا تمہارے چہرے پہ بھی دانے نکلتے رہتے ہیں۔ تم بھی یہ کریم استعمال کر کے دیکھو۔
 حسب معمول خان کی یہ اطلاع بھی معمول کی ایک واردات گردان کر دل میں "داخل دفتر" کر دی۔
 ایک دن اس نے بھی اسے اطلاع کر دی کہ ہفتہ کی صبح بے بیگ اسلام آباد پہنچ رہی ہے۔ ہاتھ
 موسم بہار اتر ا ہوا ہے۔۔۔ تیز زو شور بیدہ دریا خوب دھومیں مچا رہے ہوں گے۔ ٹھمرنوں اور آجڑے
 نو چھاریں اڑائی ہوں گی۔ خوش نوا پرندوں کی چہکاروں نے اک سماں باندھا ہوگا۔۔۔۔۔ جگنوؤں نے
 اترے ہوں گے۔ خوش رنگ ٹگلوں کی ٹکٹ پڑیاں عروج پہ ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔ اور میں
 لے کر آ رہی ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے تم مجھے اپنے زور پر پا کر پھولے نہیں سناؤ گے۔ میں تمہارے
 کینڈہ بری اور سٹائٹ چاکلیٹ اور تمہاری پسندیدہ کافی کا دافرنسٹاک لے کر آ رہی ہوں۔

ایکٹریشن اور سسٹم سے فارغ ہو کر وہاں باہر نکلی تو ایک بے فکر انسانوں کا جھوم جیسے اسی ہی
 شور غوغا، بھانٹ بھانٹ کی آوازیں، آنکھوں میں ٹنڈیگی۔ ہر کوئی اس کی جانب لپک رہا ہے۔
 رستے اور بنگلوں والوں نے اسے اپنے دھار میں لے لیا تھا۔ عجیب و غریب قسم کی انگریزی میں اسے
 خدمات پیش کر رہے تھے۔ ایک آدمی نے اس کے سامان والی دکان پر بھی ہاتھ رکھا تھا۔ وہ شاید
 کہہ کر نہیں سکتی کہ یہ کیا ہے۔ اس کی نگاہیں اس پاس خلی گئیں اور وہی جیسے
 وہاں ہوتا تھا کہیں دکھائی دیتا۔ اسی شد و مد میں جب کچھ وقت گزر گیا تو اس نے صورت حال کو گت
 کی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ خان یا تو لیت ہو گیا ہے یا پھر کوئی ایسی ناگہانی واقعہ ہوئی ہے کہ وہاں سے
 جتنی دکان۔ ایماٹ اسے برس میں پہنچنے کی کچھ امید نہ ہو سکتی تھی۔ دکھائی دیا۔ اس نے فوراً اسے
 انکس اپٹی پریشانی سے آگاہ کیا۔۔۔ انہوں نے اس ایگنی ٹرکی کو ایسے دیہات لوگوں کے ٹرنے میں
 فوراً اس کے پاس پہنچے۔ صورت حال کو جان کر اسے اپنے ساتھ ہی ہوئی لے گئے۔ مشورہ دیا کہ
 ایک ایگنی ٹرکی کا پاکستان آنا کچھ مناسب اقدام نہیں۔ یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ زبان کا مسر
 یہاں کا ٹھہر بہت مختصہ و رد قیامی ہے۔ مزید مشورہ دیا کہ یہاں کسی پہ بھی اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ اگر
 روز رنے کا ارادہ ہے تو فوری طور پر ہوٹل کے علاوہ کہیں اور نہ ٹھہرنا۔ ہوٹل کی یکسیاں اور فوراً
 استعمال کرنا اور کسی بھی اجنبی کے ساتھ بے تکلف ہونے سے احتراز کرنا۔ کسی بھی ناپسندیدہ صورت
 بننے کے لئے پولیس اور اپنے سفارت خانے سے رابطہ کرنا بلکہ ابھی اسی وقت انہیں اپنے بارے میں
 یقیناً وہ تمہارا خیال رکھیں گے بلکہ یہاں تمہارے ٹھہرنے کے انتظامات بھی کرویں گے۔

فوری ضروریات سے فارغ ہوتے ہی اس نے خان سے رابطہ کیا۔ خان ایئر پورٹ پہنچے

تھیں گاڑی خراب ہوگئی تھی چنانچہ وہ ایئر پورٹ پہ واپس پہنچا اسی دوران مارٹن ایئر پورٹ سے
واپس لوٹ گیا۔

تھکے تھکے زیب ہوئی پہنچا تو اس کے ساتھ بھائی اور ایک سالہ تھا۔ کمرے کی بجائے یہ ملاقات
خانہ کھانا میں ہوئی۔ خانہ کھانا پر اوپر اسما جان پڑا۔ بڑے بڑے روکے روکے انداز میں اس نے
کھانا کھا کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ طومار کو کھا رہا ہو۔ اس کے چہرے پر بڑے بڑے تھکے تھکے
کے تنگم میں کسی گرم جوشی کا شائبہ تھا۔ وہ ایک روٹ کی مانند سامنے پڑا تھا۔ روٹ میں
کچھ نہ تھا مگر اس کے پاس احساسات اور جذبات نہیں ہو سکتے۔ درد اور سوز نہیں ہوتا۔ وہ اسے
کھانے کے باوجود اس وقت متعجب تھی کہ یہ ویسا ہی پتھر کا پتھر ہے۔ گنگو کے درمیان وہ بار بار اپنی
کھانسی کو روکتا تھا۔ کھانسی کو روکتا تھا پتھر کی۔

خانہ کھانا پر اوپر اسما جان پڑا۔ بڑے بڑے روکے روکے انداز میں اس نے
کھانا کھا کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ طومار کو کھا رہا ہو۔ اس کے چہرے پر بڑے بڑے تھکے تھکے
کے تنگم میں کسی گرم جوشی کا شائبہ تھا۔ وہ ایک روٹ کی مانند سامنے پڑا تھا۔ روٹ میں
کچھ نہ تھا مگر اس کے پاس احساسات اور جذبات نہیں ہو سکتے۔ درد اور سوز نہیں ہوتا۔ وہ اسے
کھانے کے باوجود اس وقت متعجب تھی کہ یہ ویسا ہی پتھر کا پتھر ہے۔ گنگو کے درمیان وہ بار بار اپنی
کھانسی کو روکتا تھا۔ کھانسی کو روکتا تھا پتھر کی۔

UrduPhoto.com
خانہ کھانا پر اوپر اسما جان پڑا۔ بڑے بڑے روکے روکے انداز میں اس نے
کھانا کھا کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ طومار کو کھا رہا ہو۔ اس کے چہرے پر بڑے بڑے تھکے تھکے
کے تنگم میں کسی گرم جوشی کا شائبہ تھا۔ وہ ایک روٹ کی مانند سامنے پڑا تھا۔ روٹ میں
کچھ نہ تھا مگر اس کے پاس احساسات اور جذبات نہیں ہو سکتے۔ درد اور سوز نہیں ہوتا۔ وہ اسے
کھانے کے باوجود اس وقت متعجب تھی کہ یہ ویسا ہی پتھر کا پتھر ہے۔ گنگو کے درمیان وہ بار بار اپنی
کھانسی کو روکتا تھا۔ کھانسی کو روکتا تھا پتھر کی۔

خانہ کھانا پر اوپر اسما جان پڑا۔ بڑے بڑے روکے روکے انداز میں اس نے
کھانا کھا کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ طومار کو کھا رہا ہو۔ اس کے چہرے پر بڑے بڑے تھکے تھکے
کے تنگم میں کسی گرم جوشی کا شائبہ تھا۔ وہ ایک روٹ کی مانند سامنے پڑا تھا۔ روٹ میں
کچھ نہ تھا مگر اس کے پاس احساسات اور جذبات نہیں ہو سکتے۔ درد اور سوز نہیں ہوتا۔ وہ اسے
کھانے کے باوجود اس وقت متعجب تھی کہ یہ ویسا ہی پتھر کا پتھر ہے۔ گنگو کے درمیان وہ بار بار اپنی
کھانسی کو روکتا تھا۔ کھانسی کو روکتا تھا پتھر کی۔

خانہ کھانا پر اوپر اسما جان پڑا۔ بڑے بڑے روکے روکے انداز میں اس نے
کھانا کھا کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ طومار کو کھا رہا ہو۔ اس کے چہرے پر بڑے بڑے تھکے تھکے
کے تنگم میں کسی گرم جوشی کا شائبہ تھا۔ وہ ایک روٹ کی مانند سامنے پڑا تھا۔ روٹ میں
کچھ نہ تھا مگر اس کے پاس احساسات اور جذبات نہیں ہو سکتے۔ درد اور سوز نہیں ہوتا۔ وہ اسے
کھانے کے باوجود اس وقت متعجب تھی کہ یہ ویسا ہی پتھر کا پتھر ہے۔ گنگو کے درمیان وہ بار بار اپنی
کھانسی کو روکتا تھا۔ کھانسی کو روکتا تھا پتھر کی۔

خانہ کھانا پر اوپر اسما جان پڑا۔ بڑے بڑے روکے روکے انداز میں اس نے
کھانا کھا کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ طومار کو کھا رہا ہو۔ اس کے چہرے پر بڑے بڑے تھکے تھکے
کے تنگم میں کسی گرم جوشی کا شائبہ تھا۔ وہ ایک روٹ کی مانند سامنے پڑا تھا۔ روٹ میں
کچھ نہ تھا مگر اس کے پاس احساسات اور جذبات نہیں ہو سکتے۔ درد اور سوز نہیں ہوتا۔ وہ اسے
کھانے کے باوجود اس وقت متعجب تھی کہ یہ ویسا ہی پتھر کا پتھر ہے۔ گنگو کے درمیان وہ بار بار اپنی
کھانسی کو روکتا تھا۔ کھانسی کو روکتا تھا پتھر کی۔

وہ پرس سنبھالنے ہوئے اٹھی۔ خان کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”میرے ساتھ کمرے تک آؤ اور سامان لانے میں میری مدد کرو۔“

خان اپنے ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر مار تھا کے ساتھ لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔

مار تھا نے کمرے میں داخل ہوئے خان سے سوال کیا۔

”خان! تم وہی تو ہو جو جرمنی میں میرا بچہ پھونسیا ہوا کرتے تھے۔ جو لگ بھگ چار سو

صبح و شام میرے ساتھ رہے۔ تم سے میں نے اسلام اور مشرق کے بارے میں بہت کچھ جانا۔ قرآن

پڑھنا سیکھا۔ میں نے تمہارے وسیلے سے پاکستان کے پھر زرا دیات یہاں کے لوگوں کی ثقافتی سرگرمیوں

دیکھنا چاہتی ہوں۔ محسوس کرتا ہے جی ہاں۔“ جرمنی سے آکر آئے کیا مقصد ہے؟ ذرا سوچا میرے

ہوں اور غیر ملکی۔ تم مجھے یہاں ہوٹل میں اکیلی اور بغیر کسی تحفظ کے چار رہنے دو گے؟“

جہاں کڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مار تھا! پلیز“ میں اس وقت سوال و جواب کی پڑیشن میں

ہوں۔ تم میری ضروریات اور ادھر پاکستان کی زرا دیات اور اس بارے میں کچھ یادوں کو

اور یہ بھی کہ وہاں کون کون سے ایسے ایسے لوگ رہتے ہیں اور ان کے بارے میں

کتاب میں لکھا ہے۔“

”یہ سب کچھ میں جانتی ہوں اور جیسا مجھے اچھا لگتا ہے۔ اگر میں کتاب لے لوں تو پھر

میرا دل نہیں ہونا چاہیے۔“

اور آج ہوتے ہوئے کہنے لگا۔

”پلیز! مار تھا! اس کی ڈانڈ رہی۔ میں پھر بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ تم جانتی ہو۔“

خدا کی اسپینا خاندان میں ہو چکی ہے۔ میں تمہیں بہت عرصہ پہلے جرمنی میں واضح طور پر بتا چکا تھا کہ

خاندان میں خاندانیاں قرابت داروں میں ملے پاتی ہیں۔ یہ تمہارے قبیلے کی پرانی ریت ہے۔

بہترین دوست اور گمن ہو کر تمہارے اور میرے مابین نامحرم مشرقی اور مغربی ہونے کی بھی ایک

ہے۔“

وہ اس کی بات کاٹے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کیا تمہارے میربانی کی روایات جن پہ آپ مازاں رہتے ہیں اور فخر یہ بیان کرتے ہیں۔

کسی خاتون کے لئے بھی کوئی گھٹیا کنش ہوتی ہے یا نہیں۔“

یقین ہوئی ہے۔ اگر وہ اپنے محرم کے ساتھ اور حجاب میں ہو۔ تم میری بات اور سمجھو رہی ہو۔ تم سے غور کرنا۔ تم اسی ہوٹل میں رہو۔ ایک دو روز خوب ریسٹ کرو۔ میں تم سے خود رابطہ

اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی۔ خان نے بڑھ کر دروازہ کھولا تو باہر خوشگوار نظروں سے ٹکراتا ہوا ایک شخص تھا۔ وہ اسے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

تم اس کے ساتھ دروازہ بند کر کے کیا باتیں کر رہے ہو۔ جلدی نیچے پہنچو دیر ہو رہی ہے۔
مارتھانے اس شخص کے معاندانہ رویے کو محسوس کرتے ہوئے خان سے پوچھا۔
”یہ اجنبی آدمی کون ہے؟“

خان نے جرمن زبان میں جواب دیا۔
”یہ آدمی اجنبی نہیں۔ لیکن ایک ایسی عین کا بھائی ہے جو اتفاق سے میری عین ہے اور ہمارے ہاں
میں اپنی بھئی کے شوہر کو کسی نامحرم عورت کے ساتھ بے تکلف ہوتے دیکھ لے تو فوراً غصے میں آ جاتا ہے۔“

UrduPhoto.com

مارتھانے یہ سب کچھ کہہ کر چلے گئے۔ خان نے اس شخص کی باتوں سے ہلکا سا ہنسیا اور جہم.....
کے لئے اور کچھ لیز اور پیکر کا استعمال کرنے کے لئے۔ وہ جسے اپنے لئے جسم کی قیاسی اس کو پیش پیش کر رہا
تھا۔ اپنی باتیں یاد آئیں وہ جیسے خود کو یہاں غیر محفوظ سمجھنے لگی تھی۔ اس کے دماغ کی گراہیاں حرکت میں آ
گئیں۔ وہ جیسے لگی کہ لمبا وقت اور زرخیز خرچ کر کے یہ اپنی ممالک کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں ڈگریاں
کے ساتھ لے گا کیا فائدہ کہ انسان اپنی ذاتی گراہیت اور فحری پس ماندگی سے نجات حاصل نہ کر سکے۔ اپنی
حالت بہ بدویوں سے مستکاری نہ پاسکے۔ ایسی تعلیم سے تو کہیں فائدہ ہے کہ ایسے فائدہ امت پرست اور تیرگی پسند
انسان کے جنکلات میں چلے جائیں جہاں آئی بھی ایسے قبائل موجود ہیں جو حسین و جمیل مناسب اسطوار
تعلیم یافتہ عورت کو چڑیل سمجھتے ہیں۔ سوسائٹی کی ترجیحی کمزوریوں کو اپنے بھونچاؤں میں اترتے نہیں دیتے
بلکہ ان کے ساتھ دشمن قبیلوں کی جادو کمزوریوں کی رو میں پیشی ہوئی محسوس آتی ہیں۔ غیر قبیلے کی کوئی عورت ہاتھ
نہیں دے تو اس کی ناک کے اندر دھوپ ہانسنے میں ہنگامی نوری کی دھم کے چڑے کی تانت بٹ کر تھکن کی صورت
میں آ جاتے ہیں۔ تاکہ اس کے جسم کی لذت سے تو فائدہ اٹھایا جائے مگر اس کے شر سے محفوظ رہا جائے۔

ایسے ہی سوچتے سوچتے جب وہ اپنی لگی بندھی حد تک آ کچلی تو سوچ کا دھارا اُلٹے رانے لگا۔
 یہ اس کی فطرت کا عجیب خاصا تھا کہ وہ ہر مسئلہ کے دونوں زخموں پہ خوب سر کھپائی کرتی تھی۔ اسے یہ خیال
 ذاتی رائے تجربے مشاہدے کی کسوٹی پہ چمکتی بلکہ انسانی دہشت و سرشت کے تناظر میں بھی اس کا موافق نہ تھا۔
 اچھا خاصا بیڑہ ریسٹ لینے اور خیال و خواہیوں کے جنگل جزیروں میں خوب آوارہ گردی کرنے کے بعد
 نتیجے پہ پہنچی کہ اگر وہ خان کی جگہ ہوتی تو یہی کچھ ظہور پذیر ہوتا۔ اس میں خان کا کوئی دوش نہیں۔
 مزاج اور معاشرہ ہی کچھ ایسا ہے کہ فرد انفرادی طور پہ نہیں بلکہ دوسروں سے جڑ کر جیتا ہے۔ وہ غارت
 ہوئے بھی اپنے ارد گرد سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ انسانی رشتے سماجی رویے۔ طبقاتی حد بندیاں اور
 مذہبی چہرہ و ستیاں اسے اسی راہ پہ گامزن رہنے پہ مجبور کر دیتے ہیں جس پہ سب چل رہے ہوتے ہیں۔
 وہ سوچ رہی تھی کہ جب اس کے گھر والوں کو یہ معلوم ہو جو گا کہ جرمنی سے کوئی لڑکی اسے
 کے لئے پاکستان آئی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی بیوی کے کان کھڑے ہو گئے ہوں گے۔ دل و دماغ
 شک و شبہ اس کی گرد کا بیٹہ جاتا بھی ایک فطری امر ہے۔ خان نے تاکہ تو جیسے جیسے اس کی بیوی کی نگاہیں
 سالہ صاحبہ اور ایک دوست سمیت نو افراد بطور حاضری کا ایک گھر آئے۔ اب اس کا عجیب و غریب
 خان کے لئے یہ سب ایک عجیب و غریب شایہ رہا۔
 سوچتیں بھی نہیں جو کسی غیر ملکی کو اس میں بستر آ سکتی ہے۔ اس کی بیوی بھی برداشت نہیں کرے گی کہ
 کے ساتھ کی ایک دوسری عورت اس کے گھر میں قیام کرے۔ ایسی ہی طرح بے طرح کی باتیں سوچتے سوچتے
 جیسے مطمئن ہی ہوئی۔

پاکستان میں پہلی نماز اور جرمن ترانے والے قرآن کی تلاوت کی سعادت اسے اسی ہوئی کے گھر
 میں نصیب ہوئی۔ دوسرا ایک اہم کام جو اس سے ہوا۔ ہوئی کی بوتلیک سے لیا تھا جناب چند روپے کا
 جوتے اور شلوار قمیضوں کے چند جوتے خریدے اور کھوپ کے لئے ایک گہرا پتھر بھی۔ اب وہ بھی
 غیر ملکی کھائی کسک رہی تھی۔ گلاب نے اس کے حسن و چہرے کو جیسے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ ہوئی سے اس کا
 گاڑی کے گرد وہ اسلام آباد اور گرد و نواح کی بہت سی جگہیں گھوم آئی تھی۔ ٹیکسلا کا میوزیم فیصل
 شکر پڑیاں سرکاری غیر سرکاری عمارت چمن باغ باطنیے وغیرہ۔ اب وہ مری اور بھوون دیکھنے کا بھی پل
 بنارہی تھی۔ ان دو تین روز کے درمیان اسے خان کی جانب ایک پیغام اور ایک آدھ ٹیلیفون کال بھی
 ہوئے تھے۔ میں ابھی سرورف ہوئی پہلی فرصت میں تم سے ملے آؤں گا۔ اندر پڑی پورمت ہونا کھانا

میں یہ خواہش ضرورتاً شہر ہے یہاں اچھے اچھے گلاب 'جم' کورٹ ہوئی اور سیر گاہیں ہیں۔ یہ ایک
 شہر ہے جس میں طبعاً پھر ملکوں کے لئے۔ فارن انجینئرنگ کی ضرورت ہو تو تانا وغیرہ وغیرہ۔

کتنے ہیں اگر کسی کو پانی میں تیرنا سیکھنا ہو تو اسے اٹھا کر کسی ندی دریا میں پھینک دو اور خود کانوں میں
 پانی بھر کر آنکھیں بند کر لو۔ ایک سو پچھتر تک گنتی گنو پھر پانی یا قیوم کی تسبیح شروع کر دو اگر اس
 سے پہلے پانی بھرا پیچھے سے پھینچ کر آپ کی تواضع 'لاتوں' 'ملوں' اور گالیوں سے شروع کر دے تو سمجھ لینا
 کہ اس نے آپ کے لئے تیرنا سیکھ چکا ہے۔ دس صورت اگر وہ برا مد نہیں ہوتا تو جان لینا چاہئے کہ "خس
 ہاں" کا معاملہ ہو چکا ہے۔ کسی کو تیرنا یا جینا سیکھانے کی اس سے بہتر کوئی اور ترکیب نہیں۔ غور
 سے آپ کو یہ چلے گا کہ اس ترکیب کے ہر دو انجام میں آخر کار سیکھنے والے کا ہی فائدہ ہوتا ہے یعنی سر
 کے نیچے کے کونے غازی۔ ڈوب کر مڑنے سے پہلے اس نے کوئی حربہ ترکیب استعمال کر لی
 ہو گی۔ اور اس بل بال حال رکھے تو کسی نہ کسی طور گنارے پہ آگے گا اور اگر وہ عقل و خرد سچی و جستجو کا
 مالک ہے تو خود اپنی دیر میں تیر میں بائیں گے۔

اس وقت اسے فراموش نہ کرنا کہ کوئی من نہیں جو اپنی آواز کی مدد کی ضرورت سے محبت غرض اور اپنی جتن
 سے اس کے لئے کوشش کرے گا۔ اس کے لئے خود کو دوسروں اور مظلوم نہیں ہونے دیا۔ اس کی تعلیم یا تربیت کا اثر
 اس کے لئے ہے۔ اس نے اس کا مقام ہے۔

معاشرہ کی صورت حال سے وقت کے ساتھ میں اٹھا کر ہینک رہا تھا اور کوشش کرتی ہے اسے حالات کی
 تبدیلی سے بہت جلد ہو گیا تھا۔ اس نے خود کو دوسروں اور مظلوم نہیں ہونے دیا۔ اس کی تعلیم یا تربیت کا اثر
 اس کے لئے ہے۔ اس نے اس کا مقام ہے۔

اس نے ہر من اس کی اور تھک میر سیاست سے رابطہ کر کے اپنے مطلب اور ضرورت کی قیام
 حاصل حاصل نہیں۔ اس کی ضرورت سے اس نے ہوش چھوڑ کر اسلام آباد کے ولی آئی پی ہاؤس
 میں ایک بے گیسٹ ہاؤس میں سکونت اختیار کی جو ہر من اس کی میں رہتا تھا اور خاص طور پہ فارنز کے لئے
 یہاں بھی فانیوسٹار ہوئی والی سہولیات مینر تھیں۔ پوش علاقہ اعلیٰ درجہ کے ریسٹوران 'کلب'

شاہجہاں مالِ مگواف کلب کارڈن اور سب سے بڑی نعمت فیصل مسجد بھی بہت قریب۔ اُس کی پاکیزہ مسجد کا پاکیزہ سا نظارہ۔ مارگلہ کی خوبصورت سرسبز پہاڑیاں۔ نیلا آسمان منہکتے ہوئے درختوں کے جنگل۔ یہاں پہنچ کر وہ جیسے نہال سی ہو گئی۔ ٹیلی فون سے اُس نے خان کو اپنی نئی اقامت گاہ سے آگاہ دیا تھا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اسے اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جرمن انکمکسی اور پاکستان کے درمیان وساطت سے میں نے اپنا سارا پرہیزگارام ترتیب دے لیا ہے۔ وہ بلا تردد و تکاؤ اپنی مصروفیات سے رستے کسی قسم کی ضرورت یا پریشانی کی صورت میں میں میں از خود رابطہ کر لوں گی۔ اور ہاں اپنے سارے میرے ہاں کبھی نہ لانا۔ اس کو یقین دلاؤ کہ اس کی بہن کو کم از کم مجھ سے کوئی اندیشہ لاحق نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام آباد میں قریب قریب ایک عشرہ قیام کے دوران فیصل مسجد میں ہر روز پہنچنا اُس کا معمول بن گیا تھا۔ اذان کا سننا یہاں تھا اور چڑھنا اور یہاں تھا اور برکت کے لئے رکھے گئے عظیم الشان اور پاک دیکھنا اور پڑھنے کی کوشش کرنا اسے خوب اچھا لگتا تھا۔ اسلامی لباس و تجاہد میں وہ کسی عرب ریاست کی کوئی مغلہ پیر و سیاست پہنچی ہوئی کوئی بڑا و قادر خاتون دکھائی دیتی تھی۔ اتفاق سے میں اس کے ساتھ ملاعاتی سفر پہنچی ہوئی چند لڑکیوں سے ہوئی جو کراچی کی چند عورتوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ گروپ میں ان لڑکیوں میں صاحب کی سہیلی بھی تھیں۔ ان لڑکیوں نے یہاں پر اپنی زندگی کی کافی ہوئی روزہ قیام کے دوران ان کی آہٹ میں خوب گاڑھی چھنے لگی۔ پھر انہی کے اصرار پر وہ ان کے ساتھ ساتھ لڑین کراچی نکل گئی۔ ان کے گراچی اسے بہت پسند آیا۔ اس دوران وہ خان سے بھی رابطہ میں رہی۔ وہاں سے باقی اہل کوئٹہ بلوچستان کی جانب نکلی۔ یہاں سے اسلام آباد پہنچی اور وہاں کی وقت کی نماز اس کی محاذات تھی اور سخاوت اُس کی بکلی۔ اندر سے مسلمان تو وہ پہلے ہی تھی مگر باقاعدہ مسلمان وہ کراچی میں رہتے رہے ایک عالم دین کے ہاتھوں ہوئی۔ کراچی والی سہیلیوں میں ایک سہیلی کے وہ فیصل دوست تھے۔ کراچی کی سہیلی یونیورسٹی میں اسلامیات اور تاریخ کے پروفیسر بھی۔ ایک کھریلو نشست میں جو ان کی توجہ نصیب ہوئی اس سہیلی سے کھایا جانی ہو گئی۔ یہ حضرت صاحب کوئی روایتی طرز کے سچے موموں کی مولانا نہیں تھے بلکہ وہ ان کے علوم کے جید روشن خیال عالم تھے۔ انہوں نے دین و فطرت کے کچھ ایسے انداز سے سمجھایا کہ اُس کی پہلے سے ہم ٹھکی ہوئی گردنیں اک مسموئی سے جھٹکتے سے کھل گئی تھیں۔ اُس کے ظاہر و باطن کے ملنے سے اندر سے یقین اور ایمان کی چٹا پوندہ تہوں سے جھلکا اٹھے۔ وہ کائنات خالق کائنات حیات مقصد حیات مہمات مفرح مہمات کے معنوں اور باریکیوں سے آشنا ہو گئی۔ چھوٹا سا حائل شریف اُس کے لئے کاروبار بنادیا تھا۔ سے فارغ ہوئی تو اُس کے چہرے پہ قدسیوں سی پاکیزگی اور نور اتر آ رہا۔

مستقل دستور کو اسلام آباد کا ایسی گیسٹ ہاؤس تھا لیکن وہ یہاں تصویر کی بہت کم تھی اس کی پوسٹ
 کے لیے میٹرزین پارسل وغیرہ میٹریں پہنچنے سے زیادہ تر وقت اس کا تاریکی نو مینٹ کے قدیم شہر قلعہ
 کے کمرے میں اور حجاب خانے دیکھنے میں گزر رہا تھا۔ باقی وقت آخری لکھنے عبادات اور مطالعہ میں

اب وہ شمالی علاقہ جات کا تفصیلی دورہ کرنے کی پلاننگ کر رہی تھی۔ اس کے لئے ضروری سامان جمع کرنا شروع کیا۔ کچھ دوست کرنے میں لگتی ہوئی تھی۔ پہلے وہ پشاور، پھر ٹم جلال آباد اور کابل قندھار چین کے گوشہ چاہتی تھی۔ مگر بمبئی اور راولپنڈی کے مشورہ پر اس نے اوجھڑ جانے کا پروگرام منسوخ کر دیا کہ اسے یہاں ہی فضا تک اکیلی غیر ملکی عورت کے سفر کے لئے مناسب نہیں۔

اس دوران خان بھی آیا مگر اس دفعہ وہ ایلا تھا اور اگر کوئی ساتھ بھی ہوگا تو اُسے ساتھ نہیں لایا
 گی۔ یہی تبدیلی دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ با وضعت و رضا اسلام قبول کر
 سے تو وہ کئی گنے نہایت سار ہا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ دینِ شریعت اسلام کی جانب رجحیت رکھتی ہے مگر یہ اس
 کے سامنے کھڑی بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی وہ دینِ اسلام کی طرف رجحان کی۔ لہٰذا تو آپس اپنا اسلامی
 عقیدے کی تائید کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی آپس میں پہلی آغوش پہنچیں۔ اور ہاتھ دے کر ایسا پڑا کہ چہرہ
 ہنس رہا ہے۔ نیل نیل نہیں کمر تک اترتی ہوئی سہرے ہاتھوں کی چوٹی اور اسلامی عطر و عطران سے
 خوشبو کی شخصیت میں ایک ملوثی و آمیزی پیدا کر دی تھی۔

تو ان کے آگے آئے ایک شخص نے ہاتھ دیکھا تو وہ بولا کہ وہاں سے دور ہو جاؤ، یہاں تو بچے کی قبر ہے۔
اس کی گونہ کتہ کرنے کی غرض سے اس کی آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ پڑاتے ہوئے پوچھنے لگی۔
”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ مجھے اس طرح ٹھور ٹھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟“
وہ اسی طرح غم خیز ہوا ہوا۔

”وہ کچھ رہا ہوں کہ تمہیں پاکستان خوب راس آیا ہے۔“
 ”جی ہاں، میں بھی ساتھ کروں۔“ وہ اسے گونگتے ہوئے بولی۔

”اے شاہ! شاہ! اللہ! چشم بد اور...“ اسے تھوڑی دیر کے بعد واپس گئی کی حفاظت فرمائے۔ فوراً ہی وہیں سے کسی نے منظر نہ لگ جائے، لاؤ میں ذرا تنہا اٹھی ہے ورنہ تم کو کادوں۔“

اسی طرح مذاق مذاق میں مومنہ نے بتایا وہ حقیر یہ شمالی علاقہ جات کی جانب مراجعت کرنے والی
 کاغان، نارائن، جھیل سیف، سلوک، شہابراہ، ریشم، کوہ ہندو کش کے نو گھیشیر، وادی ہنزہ، چترال،

گلگت، سکروڈا کا فرستان۔

وہ حیرانی سے ڈیلے نکالتے ہوئے گویا ہوا۔

”اتنی ساری جگہیں! جھیلیں، گولیاں، خوشوار گز، ارگھائیاں، پتھر پٹے، بریلے راستے..... مہربان موسم اور پھر عجیب و غریب لوگ۔۔۔ آسانسوں اور سیدلوں کا فقدان اتم یہ سب کچھ برداشت نہ کر پاتا تھا۔ بیمار پڑنے کا اندیشہ بھی موجود ہے۔ وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

”مائی ڈیئر پاکستانی! میں جرمن ہوں اور مسلمان ہوں۔۔۔ میرا عزم شوق اور حالات کے مطابق کوڑھالنے کی صلاحیت میرے ہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔“

وہ اپنے گلے میں تعویذ کی شکل کا ایک قرآن پاک دکھا کر معذرت کہنے لگی۔

”یہ خدا کا وہ مہر کلام میرے پاس موجود رہتا ہے۔ یہ میرا نبوت بھی ہے۔ دن میں روشن رات کو قحطی کا رگ نماز میری حفاظت اور ایمان میری جرأت اور طاقت ہے۔ جبکہ میری حفاظت بیوی اور تمہارا اسالہ کرتا ہے۔“

UrduPhoto.com

”میں ایسی کوئی بات نہیں۔ ہمارے ہاں عورت کا قصور کچھ اور طرح کا ہے۔ عورت کو یہ سمجھ لینے پھرنا بتا رہی تھ کہ عجب درواج کے خلاف ہے۔ اب تم دیکھ کہ یہ ہاں کیسا بے حریم نامحرم کا مسئلہ تھا۔ لے لے قحطی مشکلات پیدا کرتا ہے۔“

موسم جان کا یہ عجیب و غریب طریقہ تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ روز سیر و سیاحت پر نکلتا پھر واپس اسلام آباد بسپے میں سٹیشن پہنچ جاتی۔ دو تین روز آرام اور اپنی ڈائری لکھنے ڈاک چمکتے گزرتی۔ نئے سفر کا حزم نمودار جاتی۔ پلاننگ کرتی اور دیگر انتظامات میں مصروف ہوتی۔

ایک خاصا مختصر تاک اور طریق سفر سے کر کے وہ شکر در پختی تھی۔ کراچی والے شاہ بابائے کراچی ہاتھوں پہ اسلام قبول کیا تھا اسے یہ علاقہ دیکھنے کی ترغیب دی تھی اور خاص طور پہ ایک ہزار گ کے علاقہ تک نہ ہی کرتے ہوئے تاکید کی تھی کہ وہاں پہنچے فاتحہ شریف چمکتے اور اپنے لئے خیر و برکت دینے کی استطاعت طلب کرے۔ ایک آدھ ٹھکانا رہائش گاہ نیم سرکاری اور پرائیویٹ قسم کی اقامت گاہوں کی فہرست اس کے پاس تھی۔ چٹنگی بنگلہ کی اگر کوئی سہولت ہوتی تو وہ شاید اسلام آباد سے ہی انتظام کر لیتا۔

مست نہیں تھا۔

جڑب اس نے شراب نہیں پی۔ تاش اور رقص و موسیقی سے جی کو بہلاتا اور دھیرے دھیرے
 اس کو جاتا رہا۔ ٹھیک وہ ہلکی سی غنڈ لینے کے لئے وہیں فرشی بستر پہ پڑ گیا تھا۔ دن چڑھے نہادھو خود کو
 غسل کیا۔ گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کی راتیں رقصیں ہوتی ہیں ان کی آنکھیں
 اٹھتے جاتے ہیں۔ طوائف کی صحبت رقص و سرور کی سگت شراب کباب کی محفل اور تاش جوئے کی
 صحبت کے بعد صبح طلوع ہوتی ہے وہ بھی رات والے بندے پر بڑی بھاری ہوتی ہے۔ اس کا ضمیر نہ ہن
 اور نہ اس کا باغ اور ذوق تک ہر چیز اک ہولناک لذت میں مبتلا ہوتی ہے۔ وہ دوسرے سے کیا خور اپنے
 کھانے کو تر مندہ سا ہوتا ہے۔ وہ اپنوں کی چٹختی سی نظروں اور بہت سے سوالات اٹھائے ہوئی زبانوں کا
 سامنا کر سکتا۔ وہ بیماری آور و مریض اور غریب و محتاج سے بڑی ہلکی کا آسرا لے کر کسی گوشہ تنہائی میں
 چھپنے میں ہی عافیت محسوس کرتا ہے۔

اسی چلن اس وقت اس کا تھا۔ اگر اس غیر ملکی اور غیر معمولی سی لڑکی کو دیکھتے کاوشاں نہ کرتا ہوتا
 تو کجبت بھی بہت سے گھر نہ لوتا۔ دیکھا ہی ہو گا کہ اسے کتنی عوامی اشیائے قابل ہانسی اور عورت بازی
 میں لے کر لے جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو بے پروا سمجھتا ہے۔ دیکھتے رہے
 گھر کے والد صاحب حسب معمول سکول چلے گئے ہوئے تھے۔ والدہ اور چھوٹی بھائی دو پہر کے
 کھانے کے لیے بیٹھی تھیں۔ بڑی بہن اور مومنہ جان باورچی خانے کے باہر دالیاں میں چار پانی پینٹھی اپنا
 کھانا کھاتے ہوئے تھیں۔ اپنے گھر میں داخل ہونے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت تو ہوتی نہیں۔ یہ
 کھانا کھانے کے بعد چلا آیا۔ غیر متوجہ اچانک جب کوئی حرکت نہ کرتا ہو جاتی ہے تو انسان چند لمحوں کے لئے
 غافل رہتا ہے۔ اس غفلت میں ہوا میں گھل جاتے ہیں۔ بعد ازاں وہ جب کچھ قدر دے کر وہ ایسی اپنے آپ میں آتا
 ہے کہ اپنے اپنے پاؤں سے زمین کا اٹھار کرتا ہے۔ بھینہ بھی کچھ یہاں بھی ہوا۔ اور انہی قدموں پہ
 اس کا کیا تھا؟ زمین نے جیسے اس کے پاؤں پکڑ لئے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑے بے حیاؤں کی طرح
 اٹھ کھڑا ہوا۔ اور وہ باہیا سر کا سرکارف زریست سر نصرت کی طرف متوجہ ہو گئی۔ بھائی کے اس طرح
 اٹھنے پر نصرت نے غصہ نہ کیا۔ غصہ ہی ہو گئی۔ اسے اپنے اس آوارہ بھائی کے اس وقت گھر پہنچنے
 سے شک کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی آنکھوں اور غصے سے صاف عیاں تھا کہ وہ کس حال میں ہے۔
 نصرت کو بے ساختہ اندازہ ہوتا کہ وہ اس وقت بھی آسکتا ہے تو وہ یقیناً اندر نہیں جاتی۔ وہ تو کئی دن گھر سے
 غائب رہا تھا۔ شراب جو ہوا تھا وہ ہو چکا تھا۔ نصرت نے آہستہ سے مومنہ جان کو بتایا کہ اس کا بھائی کل نواز

ہے۔ اب وہ بھائی سے مخاطب ہوئی۔

”بھائی! یہ میری بہن ہے، مومنہ جان۔۔۔ بڑھئی سے پاکستان دیکھنے آئی ہے۔ ماشاء اللہ اس سے تھکاپ میں رہتی ہے۔ تمہیں دروازہ کھلکنا کر آمد داخل ہونا چاہئے تھا۔“

گل نواز تو جیسے کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ اس نے کچھ سنا یا نہیں۔ منہ سے صرف ”جی“ بھٹکی۔
کے وہ باورچی خانے میں گھس گیا۔ نصرت نے سواری کہتے ہوئے مومنہ جان کو بتایا۔

”اکھوتا بھائی ہے والدہ کے لاؤ پیارے اسے بگاڑ کر رکھ دیا ہوا ہے۔ پڑھائی بھی مکمل نہیں کی۔ اور بد قماش دوستوں میں اٹھنا بیٹھتا ہے۔ والد صاحب اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اسے رابو راستہ لاسکے۔ جگہ آ کر انہوں نے اس سے قطع تعلیق کر کے گھر بدر کر دیا ہوا ہے۔۔۔ ان کی غیر موجودگی میں کچھ

ماں سے ملنے آ جاتا ہے۔۔۔ ماں اسے بڑا پیارا کرتی ہے۔ اسے بھی دیر کر دے تو زور کر پکارتی ہے۔ اور ستم یہ کہ وہ اسے محسوس سا بچہ سمجھتی ہے۔ جبکہ والد صاحب کو وہ الگ ظالم اور اولاد کی محبت سے

انسان کہتی ہیں۔“

مومنہ جان بولی۔

”ہاں یہی جگہ ہمارا گھر ہے۔۔۔ یہاں ہی والد صاحب کی قبر ہے۔۔۔ والدہ تو پھر خداوند کو اپنے آپ سے بھی جھگڑاتی ہیں۔“

”ہاں یہی جگہ ہمارا گھر ہے۔۔۔ یہاں ہی والد صاحب کی قبر ہے۔۔۔ والدہ تو پھر خداوند کو اپنے آپ سے بھی جھگڑاتی ہیں۔“

قابل رست اندازنی پائیس اخلاق اور شریعت ہے۔ لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے کن پارٹیل ٹھانے لگی ہے۔ والد صاحب کا شیر کے معزز ترین اور بڑے سے لکھے لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ چورے جاتے ہیں ان کی حالت مگر غیرت اور شرم کے مارے وہ لوگوں سے نہٹ چھپاتے پھرتے ہیں۔“

مومنہ جان نصرت کے کان کے پاس سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”اکھوتا بھائی ہے اس کی شادی کر دینے تو شاید ایسی حرکتیں نہ کرے۔ بیوی اچھی ہو تو نکو سے خداوند بھی گھر سے ریچکی لینے لگتا ہے۔“

و آ نکھیں پھیلا کر کان کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

”توبہ توبہ۔۔۔ اس کی شادی کا تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ کسی معصوم کی زندگی خراب کر دینا کیا ہے؟ ایسے جگڑے ہوؤں کو گھر یلو بیویاں اچھی نہیں لگتیں۔ جن کو باہر کے چسکے پڑے ہوں ان کے صلق

ہوتے ہیں۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ غدر اور ان کی ماں بھی باور پتی خانے سے فارغ ہو کر ان کے پاس پہنچیں۔ گل نواز بھی تھوٹھا سا اوھر اوھر ڈولے بڈولے رہا تھا اس کی بدنگاہی اس کا ساتھ نہیں دے گی۔ نصرت کا ماتھا خوکا وہ اس کی بچن تھی۔ اس سے زیادہ اسے اور کون جانتا تھا۔ اس کے لئے گل نواز۔ نصرت تیرے بھائی کی نیت لھیک نہیں تو اسے گھر پہ زیادہ دیر نہ رکھ۔ اس کی ماں پوچھنے لگی۔

جی! تمہیں ہم غریبوں کا کھانا پسند آیا کہ نہیں؟

ہم نے ماں کی بات کا ترجمہ کر کے مومنہ جان کو بتایا۔ مومنہ جان نے اظہارِ تشکر کے طور پر آگے کے ہاتھوں کو پیوم کر ٹھکر یہ کہا اور کھانے کی تحریف کی۔ نصرت نے ماں کو بتایا کہ مومنہ جان اب سے اجازت چاہ رہی ہے۔ ماں نے نصرت کو اشارے سے انداز کر کے بیٹھنے کو کہا۔ وہ عذرا کو کے پاس بیٹھ کر معذرت کر کے اندر چلی آئی۔ وہاں گل نواز خان بھی موجود تھا۔ ماں نے اپنے

UrduPhoto.com

[illegible]

تھیں۔ پٹر پٹر ماں کو دیکھ رہی تھی۔ اسی دوران اس نے ایک اچھٹکتی سی نظر نکل کر نواز کو بھی دیکھا جو سر سے پاؤں تک ہلکا سا سرخ رنگ کا تھا جیسے وہ تھوڑی سی حالت نماز کی بیٹ ہوئے ہوئے ہو۔ اس کی اور بھائی کی سگاری پہ ایک وقت اس کا ہنسنے اور سر ہلنے کوئی چاہا۔ اس نے ماں کی طرف سے سر ہلچاؤ کرتے ہوئے گلے بواڑتے کہا۔

کھڑی تھوڑی دیر کے لئے ذرا باہر چلے جاؤ اور موسمِ جان کے لئے کسی دیکھنے سے ہوٹل میں
کھڑے ہو جاؤ اور وہ ہوٹل غیر ملکیوں کے لئے نہیں بلکہ پاکستانیوں، مسلمانوں کے رہنے کے قابل ہو جا
ئے۔

سمجھتے ہوئے 'بیچ میں ہی اس کی بات کاٹتے ہوئے کہنے لگا۔

”منصو! اچھی جملی بات کو ہکا بکا کرنا تمہاری پڑائی عادت ہے۔ اتنی نیک اور اچھی لڑکی جسے ابا خود اس سے گھرا لے۔ تم اسے ہونٹوں میں در بدر ہونے کے لئے بھیج رہی ہو۔۔۔ ماں بیٹا رہی تھی کہ ایسی کھڑی نیک سلیقہ شعار لڑکی تو اس نے مسلمانوں میں بھی نہیں دیکھی۔ ایک ہی دن میں وہ ایسی مکمل بل گئی ہے کہ اسی گھر میں پیدا ہوئی ہو۔“

نصرت نے فی الفور جواب دیا۔

”اگر وہ اسی گھر میں پیدا ہوئی ہو تو اس حساب سے وہ تمہاری بہن برابر ہے۔ اب تم بتاؤ کہ اس کا کون سا گھر ہے۔“

اس کا لہجہ دیدنی تھا۔ اس کے پس میں نہیں در نہ وہ اس بات پہ نصرت کو قتل کر دیتا

ضبط و جبر سے وہ ماں کی جانب متوجہ ہوا۔

”ماں! تم نے سنا اس نے کیا بکواس کی ہے۔ بہن نہ ہوتی تو میں اس کی زبان کاٹ دیتا

وہ انور کریم اس طرح بھی آئی وہ خود اپنی مرضی سے چل کر ہمارے گھر پہنچی۔۔۔ اس کا نام ہے ہاں؟

کا اکلید رکھتا ہے۔ خود اور مجھ سے ہمارے دلوں میں گھر گیا۔ کیا سب کچھ اس شخصیت کا ہے؟

کہ ہمیں پسند کرتی ہے۔ یہاں رہنا چاہتی ہے۔ آخر اس کے دل میں یہ عجیب و غریب باتیں کیا کر رہی ہیں؟

ایک اور بات جسے سب گھر میں داخل ہوا تھا تو اس نے شرمناک کر اپنا منہ چھپایا تھا۔۔۔“

نصرت کے پاس کی بکواس پہ چھا کر کہا۔

”تم اپنی بکواس بند کرو۔۔۔ گواہی دے کہ یہ لڑکی کتنی بڑی بکواس کرتی ہے۔ معلوم ہو جائے تو کیا ہوگا؟

میں نے ایک رات پناہ دی اور صبح پانچ بجے جاگ گیا۔“

”کیا کسی لڑکی سے شادی کی خواہش رکھنا یا پوچھنا ہی بات ہے؟“

”نہیں میری بات نہیں لیکن یہ ساری کارروائی موقع کن بہت اور بہت لحاظ سے برابری کا ہے۔

وہ جرمی کی اعلیٰ ترین عینودہنی سے تعظیم یافتہ ہے۔ ایک معزز صاحب حیثیت خاندان سے ہے۔

ہے۔ کھلے صاف اور روشن خیالات اور فکر و شعور کی حامل ہے اور اس کے مقابل تم؟۔۔۔ اگر ایک شخص

رکھنے کے علاوہ تم میں کوئی اور غم و غمناک ہو تو بتاؤ؟۔۔۔ بھائی! شخص چاہ لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔

اصل یہ وہ بھی ضروری ہے۔“

وہ سچے چھٹاڑتے ہوئے چٹکاڑا۔

”شکر ہے کہ تم نے مجھے انسان کا کلبوت تو تسلیم کیا۔“

دیکھ رہی تھی مگر اسے ادھر کسی قسم کی کوئی تہذیبی دکھائی نہ دی۔ فحش استعجاب یا کوئی بھی ایسا تاثر کہ جس سے اس کے رد عمل کی کیفیات کا کوئی اندازہ لگایا جاسکتا۔ اس کے لئے یہ ذریعہ مافی و قفے بڑے اذیت ناک سے اسے اندر ساری گفتگو مومنہ کے متعلق تھی۔ اور یہاں وہ یوں مطمئن سی بیٹھی ہے کہ جیسے گفتگو اس کی شہرت کے متعلق نہیں اسے عمرے پہ بھیجنے کے بارے ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کیا بات کرنے کس طرح سے اسے کرے؟ لا شعوری طور پہ منہ سے نکل گیا۔

”مومنہ! سن لی تم نے اس کاہل کی گفتگو اس پاگل کی خواہش کا اندازہ کر لیا۔۔۔ اس کی ایسی حرکتوں کی وجہ سے ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں۔ پلیز مومنہ! اس کی ان فضول باتوں کو یہ سن کر لیں۔۔۔ اس کی جانب سے ہمیں معذرت خواہ ہوں۔“

مومنہ نے فرشتوں کی ہی منگواہٹ کے ساتھ اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”دیکھو! جن جن کو خواب دیکھنے کا حق ہے اسی طرح خواہشیں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ

بار آور بھی ہوں۔ ایک شخص کی خواہش ہے کہ وہ ایک بڑا ایکڑ بے یا ایک کامیاب برنس بن جائے۔

خواہش وہ کر سکتا ہے مگر آسانی سے ایسا ہی نہیں ملتا کیونکہ اس کے پاس محنت، اہلیت اور شخصیات کا احساس

و موقع شاید نہیں۔ اس کے آپ کے بارے میں تو اس کا ہرگز احساس ہی نہیں ہے۔ اس کا ہرگز ایک حیات

خواہش کرنا نہیں مل سکتی ہے مگر اس میں بڑا لی نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک مثبت ذہن کی علامت ہوتی ہے۔

ہاں ایک لڑکی سے کہیں زیادہ اچھی کر بیٹ ہے کہ اس نے دل میں جو بھی قرار دیا ہے اسے ظاہر کر دیا۔“

ان کا کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔ بہت سی باتیں کہیں سے کہیں مل گئیں۔ جن پہ بڑی سہولت

صدیوں سے اترے ہوئے کسی امر کی طرح ہے۔ ظلم میں تہذیب آ سکتی ہے مگر امر تو اس سے ہونے

کی مانند ہوتا ہے۔ اس کے پیروں پہ بھی جیسے رقب سی سیویہ کی گھٹلے لگی تھی۔ نصرت واقف سے

خاموشی اور چہرے کے گوند ہوئے خود غافل دیکھتے ہوئے شاید پریشانی ہو گئی تھی۔ اس کے شانے مومنہ

ہوئے پوچھ بیٹھی۔

”مومنہ! تم لچک تو ہونا بات کرتے کرتے اچانک تعجبیں کیا ہو گیا ہے۔“

مومنہ جیسے چوہے نکلے ہوئے بولی۔

”ہاں! مومنہ! اب لچک ہوں جبکہ پہلے نہیں تھی۔“

”کیا مطلب میں سمجھ بھی نہیں؟“

مومنہ اس کی توجہ پہاڑوں کی جانب مبذول کر دیتے ہوئے بولی۔

کھلی لیر پچر میں مریض کے سر پہ برف کی تھیلی اس لئے رکھتے ہیں کہ اس کا ٹیبر پچر کنٹرول کیا جا سکے۔ اس برف پوش پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ شاید ان پہاڑوں کا ٹیبر پچر کنٹرول کرنے کے لئے سب سے بڑے حکیم نے ان کے سروں پہ ازل سے ہی برف کے پوتے رکھ دیئے ہوں گے۔ یہ دیکھتے کو بہت سے پہاڑ برف کے بغیر بھی ہوتے ہیں کہ یہ نادرل ہوتے ہیں یا اپنی جغرافیائی حالت کی وجہ سے۔ اور مزاحیہ اعتبار سے مائٹھے ٹھن۔ اسی طرح شاید انسانوں میں بھی کچھ مائٹھے اور کچھ ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ کچھ جو اپنے اندر کے لاوے اندر ہی اندر رکھتے ہیں اور کچھ یوں بھی کہ اپنے اندر کی آگ کو باہر نکال رکھتے ہیں۔ اب میں تمہیں کسی پہاڑ کا تو نہیں البتہ ایک چھوٹی سی پہاڑی کا مختصر سا خاکہ دے گا جس نے اپنے اندر ایک پہاڑی بے وفائی بے فسی کا کھولنا ہوا اور اچھپا رکھا ہے۔“

پھر اس نے ساری بریم کھائی بغیر نام و مقام سنا ڈالی۔ چند ساتھیوں کا موش رہنے کے بعد تھکی تھکی

کھجکھج کر نے خواہشیں انسان کو کیسے کیسے دلاتی ہیں۔ اپنی نظر سے گزرتی ہیں۔ یہ خواہشوں اور

UrduPhoto.com

تجربے سے سوسنی شہب جتنی بڑی نرم نرم سی ہو کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ عظیم لڑکی ہے۔ کئی کئی کو اپنے جسم سے لٹکتے ہوئے شہب کے نزدیک نہیں گئی پھر اس کا دھیرا نہ لیا۔ کی یہ تب ہوا کیا یہ نصیب اور بے وفائی چار سال تک اس سے بدلتا رہا۔ لٹلا تھی میں جتنا کہ اس سے چوں اور جذبات سے کھلتا رہا۔ پھر اچانک اپنا مقصد پورا ہونے پہ اس سے یوں علیحدہ ہو گیا کہ وہ لڑکی نہ تھا۔ پاکستان میں بھی اس نے ایسا ہی انہیوں سا سلوک دیا رکھا۔ شادی کرنی لھیک

بہتے بھی کوئی چیز ہے۔ انسان کو اتنا خود غرض اور کمیہ بھی نہیں ہونا چاہئے۔

میں نے اسے چُپ چاپ دیکھتے ہوئے پوچھا لیا۔

”کس سوچ میں ہو۔۔۔“

”چونکہ کیا ہے انہی انسانوں کی اقسام پہ غور کر رہی تھی۔“

”کچھ نئے پڑا یا محض غور ہی کرتی رہی ہو۔“ مائی ڈیڈا یہ زندگی اور یہ دوپایہ جانور یعنی

دونوں اک چیتا کی طرح ہیں۔۔۔ ان دونوں کے مضمون، کبھی، کہیں اور کسی کے لئے بھی

ہمیشہ ایک سے نہیں رہے۔ ہنسی مسکراتی خوش و خوشحال زندگی، کبھی کیسی خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ سوہانہ روح ہو کر جہنم کی آگ بن جاتی ہے۔ اسی طرح بظاہر خوبصورت اور بااخلاق تعلیم یافتہ انسان میں خدا کے پاک کا تھمہ محسوس ہوتا ہے اور یہی کبھی ایسا جینٹر ابدل ہے کہ انسان کے نام سے نفرت کی ہے۔ راجھے میں بُرا اور بُرے میں اچھا نیکی دینا یہ کلاںک عی فطرت زندگی اور فطرت انسان ہے۔ کبھی کبھی دیکھ کر غوری ایمان نہ لے آؤ اور نہ کبھی کسی کو بُری حالت میں پا کر اس کے خلاف فتویٰ صادر کرو۔ انسان ہر کروٹ اور ہر سالس کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ کون جانے کس بُرے کا انت اچھا ہے۔ راجھے کا آئینہ دلّت و رسوائی سے مملو ہے۔“

مومن جیسے مفکر کو مٹے ہوئے ہوں۔

”بہت ہوئیں باتیں اب اجازت دو اور بھائی کو پوچھا کہ وہ کسی اچھے سے محلہ رہائش اور کسی خوب کے ساتھ آؤ تنگ کا بندوبست کرے۔“

”خیرم کوئی کچھ افسار کی غلط فہمی کے تحت غلط سمجھتی ہے۔“

”اور خیرم نے جانی لوہا ہے ہی میں بہت ہی سب کچھ سے اور ہاتھ سے ہاں ہوا کھام اور یہ کہ کرنا چاہتی ہو جا رہے آنا آئیں گے وہی تمہارے ہرے میں کوئی فیصلہ کریں گے۔ ان کی غیر موجودگی اجازت کے بغیر اکر جائیں تو جتنی دقتو جاوے۔۔۔۔۔!“

مومن کو پہلے ہی کھڑک کی چوٹی پر لٹا دیا گیا تھا۔ وہاں سے اس نے ایک عجیب سے شکل ضرور ہے
جیسے کی کوئی نہ سنا ہی ہو اس کے منہ سے نکلتا تھا اور وہ کہتا تھا۔

نصرت کے والد صاحب نے صوفیہ کو ایک روز مزید اپنا مہمان رکھا۔ اپنی وادیا پر یہ سوار ہو کر
کچھ کتابوں کے تحفے اور اجیر سہاری ڈکائیں بھی لے آئیں۔ صوفیہ نے نصرت اور عذرا سے خاص
استدعا کی تھی کہ وہ والد صاحب کو بھی نوازی گھر پہ آج اور اس کے رہنے کے متعلق کچھ بھی نہ بتائیں۔
کے بعد اسے اس گھر کے باہر قدم نہ رکھنا نصیب ہوا اور وہ شہر سے قدرے ہٹ کر ایک نیم سرکاری ہسپتال
ہو گئی۔ اس کا انتظام نصرت کے والد صاحب نے کیا تھا۔ یہاں قریب قریب بنے ہوئے دیگر خانوں میں
اور غیر ملکی سیاح پہلے سے ہی مقیم تھے۔ انگریزیوں، فرانسیسیوں اور دیگر خیریت پسندوں کی (میں نے
سہو تیش بھی میسر نہیں۔ یہاں اسے یہ آسانی ہو گئی کہ وہ دوسرے غیر ملکیوں کے گروپ میں شامل
سیاحت کے لئے جاسکتی تھی۔ اگلے چار پانچ روز وہ چیدہ چیدہ جگہوں پہ ہوا آئی تھی۔ بس سبکی ایک تو

میں نے کہا: "میرا پیڑا اور دیگر مشاغل اپنے ساتھیوں سے لگا نہیں کھاتے تھے۔ وہ اس کے سر سے
 اپنے عجب نماز و روزہ کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ شراب خنزر اور سگریٹ تو ذرا کی چیزیں
 تھیں۔ لیکن ایک کوئی چھلکی اینٹ اور سوپ ٹب استعمال نہ کرتی جو یورپ سے منگوایا گیا ہو۔ مصحف پاک اور مصلیٰ
 کے ساتھ رہتا۔

• میں نے نفس و نبوی کا دم کٹا ہوا گھ اور پتیل بکری !

ایک نکل سی دو پہر وہ اپنے کالج کے برآمدے میں پائیں کرسی پر بڑی جھکوٹے لے رہی تھی۔ ہلکی صاحب میں بڑی شیشی سی قمار ہے جو سرور کی اور سرور کی کا آگ اٹوٹھا سا امتحان پیش کر رہی تھی۔ اپنے نجی ڈیڈی کے خطوط جو کچھ لکھتے ہیں اسے اسلام آباد موصول ہوئے تھے اس کے سامنے بھیجی تھی تاکہ یہ کھلے دھر سے مل سکیں۔ ان کا تفصیل سے مطالعہ کر کے ہی سی تھی کہ ضلع قلع سے نہایت شریف دکھائی دینے والا ایک شخص اس کے پاس "اسلام علیکم" کہتا ہوا آکر بیٹھا تھا۔ وہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چاٹپ بول

UrduPhoto.com

میں اکثریت خواتین کی ہے لیکن نو عمر بچے بھی ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ آپ باخدا و اللہ مسلمان

آپ خوش ہوں گی کہ گروپ میں اکثریت باخدا و اللہ خواتین کی ہے۔ یہ یونٹ کراچی سے آئے

ہے جسے جی۔

سیر کی تو غرور بھرائی تھی وہ انہی ہی کوئی شکست چاہتی تھی جس میں اسے کسی طور بھی انتہائیت کا
 احساس نہ ہو۔ وہ لکھے روشن خیالی و روشن ضمیر تانہ و دان سے نکل ڈالی کہ ہر طرح کی بات چیت کر
 سکتے ہیں اس کا پیکر قسم کے شخص سے لو کہیشن قیام و عیال کے علاوہ دیگر امور کے متعلق بھی تنبیہاے
 کرتے ہیں۔ ان کا لائنس چمک کرتے ہوئے اگلی صبح چار گھنٹے کا مندرجہ ہے دیا۔

گناہ کو تو جیسے بھجوں جو چاہتا۔ مومن کو کوئی ایسی حسین دنیا مل کر کی بھی نہیں تھی کہ اس جیسی کہیں اور نہ ملے۔ پر اہل آسمان کے ذہن تک نہ اسے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی کسی کی خیریت کوئی اور حرکت اہل کو نہ ملتی ہے کہ اچھا بھلا آدمی کھن چکر بن کر رو جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے گل نواز بھی کسی غیر ملکی لڑکی سے کوئی شادی کر لے، ہم مشربوں یا تعلقہ داروں میں اپنی بہن چاہیہ چاہنا نا چاہتا ہو۔ اسے اسی دن معلوم ہو گیا تھا

میں نے یہ سوچا کہ دنیا کے چند بیسٹ لوگوں کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کے پتھن میں چھٹے والی کوئی
 شے ہے۔ سب سے پہلے اس شخص کے تصرف میں آتی ہے۔ اس کا ذہن و بہت ہی الگ تھلگ پہاڑ کے اندر
 ایک قلعہ نما میں تھا۔ جس کے باہر ایک برائے نام سا ہوٹل بنا ہوا تھا۔ دراصل پہاڑ کی جانب بڑھتے
 جاتے جاتے یہ جگہ پہلے زمینی پڑاؤ کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان لوگوں کی یہ کہیں گاہ ہر طرح کی سہولتوں سے
 آراستہ تھی۔ شاہ صاحب کے خاص اہل خاص گماشتے ہی اس راستے سے واقف تھے جو اس کے پیش کدے کی
 جانب بڑھتا تھا۔ چونکہ یہ با اختیار شخص سیاست کے کاروبار میں بھی ایک ریزہ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس
 کے حوالے سے جانے والوں کی تعداد جنس اور قومیت کی تفصیل اس تک پہنچ جاتی تھی۔

مومن کے شکر در میں قدم رکھنے کے ایک گھنٹہ بعد اس کی رپورٹ اس تک پہنچ چکی تھی اور یہ بھی کہ
 کسی صاحب قیام کی سہولت نہ ملنے کی وجہ سے گل نواز کے والد صاحب اسے اپنے گھر مہمان کی حیثیت سے
 رکھ گئے تھے۔ دو روز بعد وہ جب ایس این ایچ کے ہٹ میں پہنچی تو بھی اسے اطلاع پہنچ گئی۔ اسے تو اپنے
 گھر سے یہ بھی شک معلوم ہو چکا تھا کہ گل نواز اس غیر ملکی مسلمان لڑکی پر فریفت ہو گیا ہے اور بھادی کر لے چکا
 ہے۔ اس سے پہلے چند ایک غیر معمولی اطلاعات تھیں جن کی وجہ سے اس کے اندر ایک عجیب سی حساسیت پیدا ہو چکا تھا۔
 اس کے بعد اسے معلوم ہوا کہ یہ لڑکی اس کے والد صاحب کی چالیس سالہ بیٹی ہے۔ والد صاحب اپنی زبان بٹا کر
 یہ کہہ رہے تھے کہ گل نواز کی جرأت پہنچے تھے ہی تھی اور بھادی بھی۔ کیونکہ یہاں تو مل جائے کر کھانے والا
 حاصل تھا۔ انہوں نے والد صاحب کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ اس نے سنے کیا پہلے وہ اس سیم کو دیکھتا اور پھر وہ گل نواز سے
 ملتا ہے گا۔ اس مقصد کے تحت وہ سب کچھ کر رہی تھی۔ کیا یہ ممکن ہو گا کہ وہ اس کو بھادی نہیں تھی۔ کچھ دیر
 بعد کچھ کے بعد وہ اس کے ہٹ کی کچھلی جانب ہوا۔ وہ ایک سائینڈ جگہ کے نیچے کوئی کتاب پڑھ رہی تھی
 اور وہ جوت کر رہی تھی اور وہ کچھ یوں اپنے آپ میں گن گناتی تھی کہ یہ اسے دیکھتا ہی رو گیا۔ سب کچھ ہی نور کا اچھا
 تھا۔ ایک گلاب کی مانند دھک رہا تھا۔ وہ اسے محسوس کرتا ہی رو گیا۔ ایسا کھوئی حسن خنسن موہنا والا وہ
 اس سے جڑ کر کہاں کسی نے بھلا دیکھا نہ ہو گا؟ گل نواز کا اس پر فریفت ہونا اور بھادی کا سوچنا اس کی
 فکرت آچکا تھا۔

یہی اس کے دل میں ہوئی اسے کانٹے کی مانند اتر ہی گئی تھی۔

گل نواز کی تلاش ہوئی تو وہ گھر پہ اپنی ماں کو موت کے سلسلے میں اپنا سہارا بنا تھا۔ شادی کا پیغام ملنے
 کے ذریعے پہنچ گیا۔ شادی نے بلا تمہید و تہلف سیدھی سیدھی موت کی بات شروع کر دی اور اپنا یہ فیصلہ
 کھینچ کر کر دیا کہ یہ غیر ملکی عورت دیر بذر ان کے ٹھکانے پہ پہنچی چاہئے۔ دراصل یہ بات کہہ کر وہ گل نواز کا

عند یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ مومنہ کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ انسان جبلی طور پر انتہائی خود غرض واقع ہے۔ خاص طور پر عورت، دولت اور شہرت کے معاملہ میں تو وہ اخلاقی، انسانی اور قانونی حدوں کو بھی سمجھ سفاکی سے پار کر جاتا ہے۔

شاہجی کی زبان اور آنکھوں سے مومنہ کی بات سن اور جان کر وہ کسی کروٹ بیٹے سانپ کی مانند کسمساتے ہوئے کہنے لگا۔

”شاہجی! ذرا اصل مومنہ ہمارے ہاں ابا کے جانتے والے ایک دوست کی وساطت سے آئی ہے۔ وہ دوست پاکستانی ہے مگر جرمنی میں رہائش پذیر ہے۔ مومنہ ایک نو مسلم ہے، وہ ابا سے اسلام کے بارے میں بہت کچھ جانتا چاہتی ہے اور ساتھ ساتھ میری سیاحت بھی۔ آپ چونکہ ان ذاتی باتوں کا یہاں کسی کو کوئی علم نہ اس لئے اسے محض ایک لورسٹ ہی سمجھا جا رہا ہے۔“

شاہجی جانتا تھا یہ سراسیمہ بھوت بول رہا ہے پھر اس نے اتمام بحث کے طور پر کہہ دیا۔
 ”ابا کے ابا سے دین سیکھنے آئی ہے اور تم اس سے شادی کا چکر چلا رہا ہے۔ کیا یہ دین اسلام ہے؟“
 ”وہاں تو یہ آسم خود اکیلے اکیلے ہی ہو رہا ہے۔ ہر نئے اور یہی کچھ سب کچھ کے لئے جو یہاں ایک نئی دنیا ہے۔“
 ”بھول جاؤ گے، مومنہ یہی کوئی لڑکی تمہارے گھر رہی تھی اور تم نے اس سے شادی کا کوئی خیاب نہ کیا تھا۔“
 ”شاہجی تم نے سنا خاص کماٹ بکچ کر مومنہ کو اپنے گروپ میں شامل کر لیا تھا۔“
 ”اٹھا رہا تھی یہ گروپ سات روز کے لئے برقی پہاڑوں، ڈارہ، بھیلوں کی سیاحت پر رہا تھا۔“
 ”نہیں، گروپ وہی پہاڑ کا دارا ہے۔ بعد میں ان کا بول اور پہاڑ کے اندر خیر عارف۔ اس میں ایکپ میں چند جٹ سنے ہوئے اور گودام بھی۔ جس میں ایندھن، تیل، جلانے کی لکڑی، گیس، سلنڈر، میسین، سٹیپنگ، بیک اور گھوڑوں، خچروں، ٹوکوں کے لئے اسٹیل اور ٹیلوں، خلاصوں کے واسطے جھوپڑے بنے ہوئے تھے۔ پہلے پانچ گروپ نے ہشت کرنا تھا۔ ساتھ ساتھ بھی تھی۔ پہلے روز کا ہمارا سفر محض چند کوس پیدل داک تھی۔ راستے میں ایک ٹھکانہ بنے بھی۔ مومنہ نے گروہ باروں میں ملیاں، سردوں پر گرم لوہیاں، ہاتھوں پر ستارے، پیدل اور کچھ غیروں کو اپنے چوہرے ساتھ ساتھ رہا اور کئی اجڑا روٹ کاٹری سامان ٹٹھوں پر اڑے، سیاحوں کی مصاحبت میں تھے۔ مگر ان میں کل نو افراد نہ شامل نہیں کیا گیا تھا۔“

پہاڑوں میں کیا ہوتا ہے جو لوگ انہیں ذہر ذہر سے دیکھنے آتے ہیں۔ میرے اپنے خیال میں

کھانے کے حصول سہانے کی طرح۔۔۔ ”پہاڑوں سے ہی اچھے“ بھی ہونا چاہئے۔ پہاڑوں میں آوارہ گردی کرنا
 دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ بندہ ایک آدھ دن پہاڑوں میں گزار لے تو خود کو بندے سے زیادہ بندہ سمجھنے پہ مجبور
 ہو جاتا ہے۔ یہ گنڈیوں اور ریتوں کی مدد سے جان جو تھم میں ڈالے ہوئے سر پہرے جو معمول سے پہاڑوں پہ
 چڑھتے ہیں۔ بندہ خدا پھر اوپر ہی رہو وہیں سے کچھ اور اوپر اوپر ہی اوپر اس سے بھی اوپر چلے جاؤ۔ نیچے کی
 بات سوجھو۔ آخر اگر نیچے ہی اترتا ہے تو اوپر کی مت لے نو۔ یہ پاگل سیاح جو پہاڑوں پہ بڑے شوق سے
 چڑھتے ہیں نیچے اترتے ہی چار پانچوں پہ پڑ جاتے ہیں پھر کئی کئی روز ان کی ہانگوں کی تھکیاں نرم نہیں
 رہتی۔ خدا اور بے طرح کی تھکاوٹ ان کی جان ضیق میں ڈالے ہوئے ہوتی ہے۔

پہلے دن یہ لوگ اتنا زیادہ تھکتے تھے کہ دوسرے روز کو سنے پر فطری کام کمنسل کرنا پڑے۔ وہاں کے
 پہاڑوں میں گزار کو بھی بہت بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ آخرت تو وہ پورے دنوں کی لے لیتے مگر اُسے فعال بہت کم
 ہوتا ہے۔ دو پہلے اور دوسرے روز سیاحوں کو اتنا تھکا دیتا ہے کہ اگلے ایک دو روز وہ بیچارے ایک
 کھانے کا شوق بھی نہیں رہتے ہیں یا سردی تو کھاؤت کھا کر جا رہے ہوتے ہیں۔
 UrduPhoto.com
 تھکاتے کر پڑ جاتے تھے۔ مگر مومن کا معاملہ دیکھو۔ ان کے روزمرہ کے معمولات میں کوئی فرق بھی نہیں
 آتا۔ کج کی یہ روزانہ مشقہ عبادت اور ناشت کے ساتھ جاکا سنا کا مطالعہ۔

دو تیرے ان ہوئی جب انکی سچی لوکیشن کی سہاقت کے لئے ان کے علاوہ صرف دو دوسرے جالے کے
 لئے پیچھے پانی سب گھولائے ٹو پیچھے سونے پڑے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر ان دونوں نے بھی آج کا پروگرام ملتوی
 کر دیا۔ انفرادی طور پہ ادھر ادھر نکل گئے۔ اپنے بہت کی جانب لوٹ رہی تھی کہ سامنے سے عبید اللہ گائیڈ
 آگیا۔ اگلی دیکھ۔ یہ وہی شخص تھا جس سے پہلے روز سیاحت کے سلسلہ میں بات ہوئی تھی۔ سلام کے بعد
 نے آج کا پروگرام موخر ہونے پہ معذرت چاہی۔ بلی پھلکی گپ شپ کرتے ہوئے وہ اس کے بہت تھک
 رہا تھا۔

”میں ۱۱ اگر آپ پسند کریں تو میں صرف آپ کی خاطر ایک خاص لوکیشن دکھانے کی سعادت
 حاصل کر سکتا ہوں۔“ یہ سن کر غلوں اور ادب کی چاشنی میں لپکتی ہوئی آفر تھی جیسے وہ قول کر رہی تھی۔
 کئی ہی تیاری کے بعد وہ اسے دم دہی کے پڑا سہارا عمارتی جانب لے گیا۔ اس قدیمی عمار کے اندر
 کچھ گرم نیلے پانی کا چشمہ رواں تھا۔۔۔۔۔ بلی بلی گندھکی دھانس اور سفید جھاگ اڑاتا ہوا شفا بار پانی جلدی

اور سحری امراض کے لئے آکسیر ماہ جاتا تھا۔ راستہ دشوار گزار کٹنا پھٹنا اور چڑھائی کا تھا۔ عام لوگ اور سیدھے ادھر آتے ہوئے کھڑا تھے۔ صرف بیمار حاجتمند اور اس پانی کا کاروبار کرنے والے ہی ادھر کا اہل کرتے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس شفا آمیز پانی کی اجارہ داری بھی شاہ صاحب کے پاس ہے۔ یہ فلسفہ معجزاتی پانی کی حیثیت سے دور دور تک بھیجا جاتا تھا۔ یعنی یہ قدرتی پانی بھی اک اچھا خاصا کاروبار بن چکا تھا۔

ایک معتدد دگاز گائید عید اللہ اور میڈم موسومہ جان جو فخر ٹٹوں پہ سوار تھے دم دسی کے یہ سلسلہ کی جانب روانہ ہوئے۔ موسم زریلا اور چمکیلا تھا۔ کھانے پینے کا سامان اور کچھ ضروری اشیاء معتدد دگاز ٹٹو پہ بندھی ہوئی تھیں۔ وہاں پہنچتے پہنچتے وہ اتر حائی گھسنے لگ گئے۔ راستہ چونکہ بے اثر انیوں چڑھائیوں اور گہری کھائیوں کے اچھا بھلا تھا اس وجہ سے معتدد دگاز اور وقت درود پر ہستی رہی۔ یہ صدیوں پرانا کاروبار شروع وہاں پہ قدرے تنگ گرانندہ سے دور تک ایک وسیع منظر پیش کرتا تھا۔ آمد کچھ غیر معمولی تھی تبدیلیاں بھی تھیں۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کچھ انسانی عمل فاضل بھی ہے۔ نیلے اور فیروزگی رنگت کے خوبصورت خانم پتھروں سے اٹھا لیان کرتا ہوا زرداں پانی جاتے کہاں سے کہاں کہ ہر جانب یہاں کی فضا کی طرف سے ایک عجیب سی آواز آتی تھی۔ یہاں لگتا تھا کہ یہ جگہ غسل کے لئے خاص ہے۔ پانی کے پانچ پتھروں پہ ایک دیواری اتحادی گئی تھی۔ یہاں لگتا تھا کہ یہ جگہ غسل کے لئے خاص ہے۔ پانی کے گول گول چمکیلے سے پتھر تھے شاید ان پہ بیٹھ کر غسل کیا جاتا ہوگا۔ دگاز باہر قہقہے ہنسا رہی تھی۔ یہاں کے کھانے پینے کے انتظام میں نہایت کیا۔ عید اللہ کا میڈم موسومہ کو لے کر باہر کی طرف آ گیا۔ ناراضہ کہ ہاتھ میں اور تھیا اس کے کام سے پہنکا ہوا تھا۔ وہاں سے داخل ہوئے ہی اس نے مارچ روٹ کر ہٹے ہوئے کہا۔

”صرف چند قدم مارنے کی ضرورت ہے پھر آگے اندر ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ قدرتی علاج غار کے اندر روشنی ہوتی ہے۔“

دوران سفر اس نے اس ہزاراد غار کے بارے میں کافی حد تک جھوٹی عجیب معلومات ہم پہنچا کر ہمیں کے شوق و تجسس کو بھاری تھی۔۔۔۔۔ اب اس نے مزید بتانا شروع کیا۔

”میڈم اب یہ غار بلا امتداد بنا جاتا ہے ہم نے تو اپنے بزرگوں لیکن انہوں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ غار حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور حکومت میں جنوں اور پری زادوں کے لئے ایک خاص جگہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جھیل سیف الملوک کی مانند یہ بھی فوری فوری کی ارضی تربت کی آماجگاہ تھی۔

تسکے زخمی چوٹیوں پہ ہوتی تھی اور یہاں برقی چوٹیوں والے پتھروں کی پراسرار غاروں اور گھپاؤں
 انسان کے پاس سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ ہوتی آج بھی اس مقدس غار میں پری زادوں کے
 گھسٹوں کی سرسراہٹ ان پاکیزہ حلقوں کی خوشبو اور بے حد و خالی شہسبوں والے سراپے لہراتے سے محسوس
 ہوتے ہیں۔

دو ذرا سی ذرا سانس درست کرنے کی خاطر رکا تو سروشی یا خوف سے شکوئی ہوئی مومنہ بادل ٹھوس
 ہو چکی۔

”کیا اب بھی یہاں جنوں اور پری زادوں کا قتل و قتل ہے؟“

”قتل و قتل کے بارے میں تو میں واثق سے کچھ نہیں جانتا۔ ہاں البتہ کچھ اثرات ضرور موجود

ہیں۔ گائیڈ نے بات بتاتے ہوئے جواب دیا۔
 مومنہ مزید گریہ کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کیا یہ اثرات یہاں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں؟“

”جیسے جیسے اثرات کسی نوعیت کے ہوتے ہیں؟“

”اس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔“

”اس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔“

”مثلاً چند ایک نے کس قسم کے اثرات محسوس کیے؟“

”وہ تو جیسے ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے برقی قوت۔ گائیڈ بولتا ہوا۔

”یہی کہ کوئی اچانک ڈپ سارے گیتا کیس جیڑا لی سے کوئی ٹھیل جاتیں پھر۔۔۔“

”ایک آدمی کو بے ہوش ہوتے

”پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔“

”جیسے انہوں نے یہاں پہنچ کر کوئی خزانہ پالیا ہو یا کوئی ایسی چیز مل گئی جس کی

”میں دوسرے لوگوں کو دکھا کر چھان رہے تھے۔“

”میں دوسرے لوگوں کو دکھا کر چھان رہے تھے۔“

”میں دوسرے لوگوں کو دکھا کر چھان رہے تھے۔“

”میں دوسرے لوگوں کو دکھا کر چھان رہے تھے۔“

”بھی..... کیسے کیس تھے یہ؟..... سکون سے بتاؤ۔“

ایک بڑا سا گھونٹ لے کر دو بولا۔

”تھیم! ایسی دراصل پانی کہ چوبارہ ہاتھ دھو کر کسی ایسے بچے کو ملے کہ ہڈی کاٹ کر دے۔“

وہ غار کے اندر وہی حصے کو زور تک نیم ہار کی میں ڈوبا دیکھتے ہوئے مزید گویا ہوا۔

”وہ غار کے اس تاریک فطرت تک حصے کی جانب یوں بڑھتے ہوئے چلے گئے تھے جیسے کسی نے کسی

ادھر چپکنے پر مجبور کر دیا ہو۔ میری وارنگل پہ بھی انہوں نے کان نہیں دھرے آگے بڑھ کر دیکھا بھی۔“

سحر زدہ سے آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔“

وہ فطرت تک پہنچ کر باقی ماندہ پانی پینے لگا تو مومنہ نے ایک اور سوال چھوڑ دیا۔

”بتا سکتے ہو کہ یہ غار کہاں پر ختم ہوتا ہے؟“ وہی حصے آگے کیا ہے اور کیا تم یا کوئی اور..... اس نے

اندرا بھجنا تک گیا ہے؟“

وہ غار کے اندر وہی تاریکی میں آگے بڑھتے ہوئے راستے سے نظر میں آئے حصے کے قاتل کا

تھیم! یہ آپ دیکھ رہی ہیں کہ اندر کہیں سے نکلتے ہوئے خشک کا پانی یہاں ختم ہونے دو حصے سے

تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ اس کے اوپر اور ایک حصہ اس کے نیچے۔ یہاں پہلی اسرار سے

شفایابی کی خاطر پایاں حصہ عورتوں اور دایاں حصہ مردوں کے غسل کے لئے مخصوص ہے مگر شاید ہی کوئی ایسا

آیا ہو کہ مرد اور عورتیں اسٹیل غسل کے لئے موجود ہوں۔ اگر ایسا بھی ہو بھی جائے گا پہلے صرف مرد

عورتوں کو موصول جاتا ہے مگر ختم ہونے کے ساتھ باطنی غسل فوراً کار ہو جاتا ہے۔ وہ یہاں سے فارغ ہو کر آتے

بڑھ جاتے ہیں۔ بعد میں ظاہر اندھیرے مگر بیاکن آجائے آجائے ہی ہوتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کا

موصول ہوتا ہے۔ انہیں اب کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں رہتی وہ اپنی راہوں کے خود ہی راہی اور اپنی منزل کے

آپ ہی متاثر ہوتے ہیں۔“

”یہ باطنی غسل کیا ہوتا ہے؟“

مومنہ پاس ہی ایک بلا سے تھرپے ٹھنڈی ہوئے پر چھو رہی تھی۔

”مزید ماسیں ایک ٹکڑا سا گائیڈ ہوں۔ میری معلومات سید بہ سیدنی سنائی باتوں پہ مبنی ہیں۔ یہی

سنائی باتیں میں آگے بھی سناتا ہوں۔“ جی کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے اس کی بابت اللہ جانتا ہے۔

ایک بات بالکل جی ہے کہ ادھر گیساروں اور نہ ہاروں میں رہنے والے کم از کم دروغ گو نہیں ہوتے۔

کے اور گرد آؤ پر نیچے خود یک و دو در سچائیاں ہی سچائیاں اور قدرت و فطرت کی بے باکیاں ہوتی ہیں۔ ایسے

میں ٹم لوگوں کو دروغ کی جرأت کہاں ہوتی ہوگی۔ ویسے میرے ذاتی تجربے اور مشاہدہ میں ابھی
 یہ واقعہ جانی غمسل کا اور اک نہیں آیا۔“

و اپنی چھتری سے غار کے اندر ڈرا ڈور ایک ابھری چٹان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”سب اس جگہ سے آگے کبھی گیا ہی نہیں۔“

”کیا اس غار کے اندر چنگا ذریں یا اسی نوع کے پرندے جانور رہی ہیں؟“

”میںم! میں آپ کو بتاتا ہوں ایسے مکروہ پرندے جانور وہاں ہوتے ہیں جہاں نجات پرست یا
 کسی حد تک ان کی آماجگاہیں ہوں۔ ہمارے ان برفانی علاقوں پہاڑوں میں ایسے ایسی لٹکی لٹکی کی گنجائش
 ہے۔ ان برف زاروں میں پری زاد اور بھناتے تو رہتے ہیں مکروہ جو دائرہ اسلام میں ہوں۔“

”یہ سب کہ یہاں چرند پرند یا درخت کبھی ٹھوٹے ٹھیم والے ہوتے ہیں۔“
 ”یہ تو جانور چنگا ذریں! انہیں سناپ
 کے ٹھوٹے، بھو وغیرہ کہا جاتا ہے۔ آپ اس غار کو ہی دیکھیں یہاں آپ کو کسی جانور یا
 کسی درخت کی نشان دہی کی اور نہ کوئی مکروہ عوام جانور نظر آئے گا۔ یہاں گندھک میزرواں
 اور کچھ دھندلے پتے کی لکڑی بھی نہیں رہے گی۔ گندھک اور کچھ دھندلے پتے کی لکڑی اور دیگر درخت وغیرہ تو
 یہاں ہی ہیں۔“

”میں نے یہ سب سنا ہے۔“

”اس غار میں یہ سب کچھ پانی بھی ہے۔“

”ہاں! تو وہاں سے تین چار آدمی مل کر جانور کے کھانے کی بو ڈالنے سے قطرہ قطرہ پانی پھٹتا رہتا
 ہے۔ پھر کبھی کبھار کسی ایک حوضی یا ندی کی ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے میرا امرت سہا پانی۔“
 ”یہ تو اندر
 سے جانور پھٹتی ہوئی ہے۔“
 ”جسم ختم کی جیساں کھج جاتی ہے۔“
 ”یہ تو دور سے لوگ آتے ہیں۔ اپنی
 کھج کے آگے قطار میں رکھ جاتے ہیں۔“
 ”کچھلے دو مہینے پہلے تک یہاں ایک مجذوب سا چارہ رہتا تھا۔ خدا
 کے واسطے اس وقت کہاں سے کرتا تھا۔ جب دیکھو وہ بلا دھندلے پتے کی لکڑی کی جیسے کسی سے جھڑا کر رہا ہو۔
 اس کے ہاتھ لگ رہا ہو۔“
 ”جڑواں کرا تو کبھی آنکھیں دکھا کر۔“
 ”کبھی نہیں اپنے سوا میں ہوتا تو کبھی یاں
 اس کے ہاتھ لگ رہی اپنی جگہ رکھ دیتا جب لوگ دوبارہ ادھر کا پھر لگتے تو ایسا پانی اٹھا کر لے
 لے جاتے۔“
 ”کچھ نہ کھانے کو اپنی کھج یا نقدی کی صورت اس کو لے جاتے۔“
 ”وہاں وہ لے وہاں سے
 لے لے۔“
 ”لوگ عجیب عجیب تاویلیں گھڑتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اس کی یہاں ذیوبی ختم ہو گئی ہے۔ کوئی کہتا
 ہے کہ یہ لکھ گیا ہے۔ کچھ کہتے ہیں وہ غار کے اس پار کہیں نکل گیا۔“
 ”غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔“

تروڑا وہ جگہ تھی جہاں سے شیشے کا پانی وہ علیحدہ آب حوضوں میں تقسیم ہوتا تھا۔۔۔ بڑا سا چمکیلا درمیان میں تھا جس پہ سفید رنگ سے تر وڈا شریف لکھا تھا۔۔۔ آگے آگے عبید اللہ کا بیڑا اور پیچھے پیچھے مومن کے گیلے چمکیلے بے اچھے پتھروں پہ مضبوطی سے پاؤں بھاتے ہوئے پانی کے حوض کے پاس پہنچ گئے۔۔۔ حوض کے اندر سبز رنگ کی کائی کی شاخیں ادھر ادھر لیر اور ہی تھیں۔ اوپر اُدھائی سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا۔ حوض پانی میں جب مونا سا قطرہ گرنا تو ایک خاصا گرواب سا لہرا اٹھتا اور پ کا آجنگ عجیب سردی سی مونس اور تعارش پیدا کر دیتا۔ وہ جھک کر متع شدہ پانی کو دیکھنے لگی پھر ہاتھ کا چلو بنا کر پانی ہونٹوں کے قریب سے نوک زباں تر ہوئی تو پانی انگلیوں سے اتر گیا۔ اب دونوں ہاتھوں کے اوک سے پانی اٹھایا سیر ہو کر کھلا سبک میں بھر کر کھینچے لگی۔

”شہان اللہ! ایسا مقرر اور مقرر پانی دہاتی ہیں۔ پہلی بار دیکھتے۔ شکر یہ عبید اللہ! تم نے مجھے عجیب نعمت سے مستفید کروایا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جب تک میرا قیام یہاں پہنچے پینے کے لئے مجھے پانی دستیاب نہ ہو کیا تم میرے لئے اس کا انتظام کر سکتے ہو؟“

”اسی کے لئے مجھے شادی سے رخصت کرنا پڑے گا کہ تک یہاں کے دونوں پانیوں اور غار کا پانی جمع ہاں ہی ہے۔ پانی اور پینے کے لئے اس پانی اور پانی کا پانی پہنچا دے گا۔“

”اب“ یہاں پہنچ میں کہاں سے آچکا۔۔۔“

”میدم! یہ سمجھ لیں کہ اس دونوں پانیوں کی تائید اور حاصل اٹھانہ مگرہاں ہی غار میں ہے۔ میں بند کر کے گھر لے جانے میں شاید یہ اپنی کراستہ برکت کھو بیٹھتے ہیں۔ مگر کاج جنگل میں لحد ہے۔ گھر یا چاہے گھر میں نہیں۔“

”شاید تم نے ٹھیک کہا ہے۔ اچھا اب یہ بھی بتاؤ کہ شاہ صاحب کون ہیں؟“

”شاہ صاحب کوئی بوڑھے سے بزرگ باجی خلیفہ نہیں ہیں۔ یہ تو نو بردہ جوان آدمی ہیں۔ اس علاقے میں ان کی بڑی عزت و شہرت ہے۔ کاروباری اور سیاسی آدمی ہیں۔ یہاں ارد گرد اکثر ایسے پہاڑوں کی غلٹ سے ہیں۔ یہاں یا کہیں اور سیاہوں کو لاسنے لے جانے کے لئے پرچی ان ہی کے کٹوالی چرتی ہے۔ چڑھے لکھے ہیں بہت سی زبانیں جانتے سمجھتے ہیں اور یہاں کے چنے چنے کی ہسٹری واقف۔ اس علاقے میں سوچو و تمام مزارات شاہزادے قلعے پہاڑ غاریں ٹیلے وغیرہ کے متعلق معلومات مصدقہ اور مکمل ہوتی ہیں۔ اس غار کے بارے میں جو کچھ دوتا سکتے ہیں میں بھی نہیں جانتا۔“

وہ اپنے بھیکے ہوئے گینوس کے جوتے اتارنے کی جانب متوجہ ہوئی تو وہ جواب میں گویا ہوا۔
 ”آپ نے درست کہا کوئی زیادہ کچھ وقت تو اس قسم کی جگہوں پر گزار سکتا ہے لیکن دن گذر
 مینے نہیں رہ سکتا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس سے چند شہر کوئی موقع ایسا آیا ہو کہ میں کسی ایسی جگہ مسلسل دن رات رہ سکے
 ہوں۔ ہاں چند ایک خاص کیفیات میں نے یہاں بطور خاص محسوس کی ہیں ایک تو یہ کہ یہاں وقت ٹھہرنا ٹھہرنا
 رک رک کھٹکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دوسری بات یہاں بھوک پیاس یا دہی نہیں رہتی۔ قطرہ قطرہ خوش
 جمع ہونے والے پانی کے دو چار ٹرے بھوک پیاس خفیدہ کمزوری اور ہر قسم کے فکر و فساد کو ختم کر دیتے ہیں۔
 اندیشہ خود زیاں ملتا ہو جاتا ہے۔۔۔۔ انسان اک عجیب سی سرشاری اور سر مستی میں مگن رہتا ہے اور اس حالت میں
 صبح و شام کی گردش کا کچھ احساس ہی نہیں ہوتا۔“

”ماں باپ بیوی بچہ۔۔۔۔ کاروبار دنیا داری کے کامیوں میں بھٹسا ہوا انسان شاید ان زوہد
 علیا شیعوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ غاروں پہاڑوں اور اندھیروں کے راستے زنجبانت کی جانب سرکتے ہیں
 اور آپ کی ہوا میں ایسی نہیں جو تھکائوں اور پرانوں کی جانب راغب ہوں۔“

”جنگ تو کوئی ایسی غریب نہیں جو دل کی جگہ نہیں چھوڑے اور نہ ہی اس کی جنگ کروڑوں
 خراب ہوتی ہے۔ یہ گرم گرم ہوائی میں آپ سبے بے پروا ہو سکتے ہو۔“

یہ کافی سے کہیں زیادہ کوئی جڑی بوٹیوں کا جو شانہ و ساقہ لیکن جو بھی تھا وہ فرحت اور مسرت نہیں
 تھا۔ ہر گھونٹ پر اسے محسوس ہوا جیسے آہستہ آہستہ اس کے اندر کی گرد تپہ بہ تپہ چھوڑ رہی ہو۔ پھر کچھ دیر بعد
 لایزال ہونے والی اس جگہ کی مانتا تھا۔ یہ جگہ کی جگہ کی چاندی کی کوکریاں تقصیر نہیں ہوتا بلکہ تہی
 صرف اندرون خانہ ہوتی ہے۔ جسم اور ہوش و خرد کی دیواریں قائم۔ لیکن قوت و امانت اور عمل کرنے کی
 صلاحیت نہیں رہی۔ دیکھ رہی ہے سن اور سمجھ رہی ہے لیکن اس کے حق و خلاف کچھ کہنے کرنے سے
 عاجز۔ عجیب سی کیفیت دار آئی تھی۔ ہوش میں بے ہوشی اور بے بسی۔ کوئی پر لکھ اس کے اندر سے جھنجھکا
 ادارہ مار مار کر نکلا اور خار کے سنگاں کی پتلی چٹانوں سے گرا جاتا ہوا کہیں غائب ہو گیا۔ یعنی احتجاجا ہوا
 چلائی۔

وہ دیکھ رہی تھی اس شخص نے اسے بچے چٹروں پر لایا۔ اس کی جیکٹ کی زپ بیلچی۔ اس نے
 مدافعت میں ہاتھ پاؤں چلانے چاہے مگر وہ انہیں نہیں سمجھتی ہی تھی حرکت نہ دے سکی۔ البتہ زبان اس کے سر سے
 تھی۔ وہ تھکاتہ انداز میں اس سے مخاطب ہوئی۔

”تم یہ کیا کر رہے ہو؟ میں غیر ملکی ضرور ہوں مگر مسلمان ہوں اور تمہاری علاقے میں مہمان

”و تو جیسے سماعت سے محروم ہو گیا تھا۔ کئی ان سنی کرتے ہوئے اس نے جیکٹ اتار کر پہلے سے پھینک دیا۔ وہ اس کی شرٹ اتارنے کے ذریعے ہو گیا تھا۔ سبیل و منیت سماجیت پا آئی۔“

”تو کچھ نہیں وضو سے ہوں۔ کچھ دیر قبل میں نے ظہر کی نماز ادا کی ہے۔ مجھے آج تک کسی مرد نے میرا نام نہیں پوچھا ہے۔ خدا کے فضل سے دارو۔ میں نے عمرہ کرنے کی نیت کی ہوئی ہے۔“

وہ اس کی شرٹ اتار چکا تھا مومن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اس نے ہنگامی آنکھوں سے اپنے نگلے آنسو دھو لیے۔ وہ شخص جیسے بے حس ہو گیا تھا۔ جنسی وحشیوں کی طرح نہیں بلکہ بڑے اطمینان و سکون سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ مٹا ہوا تھا جیسے وہ کوئی اہم فریضہ ادا کر رہا ہو۔ جب اس نے اس کے سناری پا جاسے پ باتھ ڈالا تب تک زخمی شیرنی کی مانند ہارنی۔ باتھ پاؤں جسم نے تو ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس نے جیسے اپنی تمام توانائی بیکار میں اکٹھی کر لی تھی۔

”خدا رسول مکان صحر فقیر جسے بھی تم مانتے ہو مجھے بے آبرو نہ کرو۔“

وہ کچھ پارسی تھی۔ یہ شاید اس کی بے بسی کی انتہا تھی۔ اسٹک والا پا جامہ اور ریشم جامہ اتارنے سے تھک کر وہ بیٹھ گئی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ اس مرد نے اسے اپنے کپڑے اتارنے شروع کر دیے۔ ہر طرح کی باتیں کر رہا تھا۔ سناری پا جاسے پ باتھ ڈالا۔

وہ نرمی سے کوزہ نبات کا شفاف جسم کی صورت پا رہی تھی۔ وہ کچھ جب اپنے آپ کو اس کی قید سے آزاد کرنے کے لیے اس کی جانب بڑھا تو وہ بڑے سکون سے لپٹنے لگی۔

”جو تم کرنے چاہے ہو اگر یہی ہو تو تمہارا منہ مجھے سے ملے گا۔ تو پہلے ایک کام کرو۔“

وہ اپنے گتے میں پڑے ہوئے ایک بڑے سے تھوڑے کے متعلقہ تھوڑے کے متعلقہ تھوڑے لگی۔

”یہ میرے گتے میں نہیں رہا کر رہی دالے کا پرنا یا ہوا چھوٹا سا قرآن شریف موجود ہے۔ چمکے۔“

وہ ہاتھ ساتھ نہیں دے رہا تھا اس نے تم اسے میرے گتے سے اتار دو۔ ویسے بھی شاید مجھے اس کی اب ضرورت نہیں رہی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ خدا شہرگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ میں نے اسی خدا کے حکم کو

تک پہنچنے سے انکار کیا کہ میں ایک عورت ہوں یہ میری حفاظت کرے گا۔ مگر شاید میں نے خدا اور اس کے رسول سے کچھ زیادہ ہی توقع رکھی تھی۔ ہر حال اہم دونوں کے لئے بہتر یہی ہو گا کہ تم اس قرآنی تھوڑے کو

میرے گتے سے علیحدہ کر دو۔“

وہ انسان ہوتا تو یہ حرکت ہی نہ کرتا۔ وہ تو ایک بے حس جنسی دارندہ بنا ہوا تھا۔ جھٹ آگے بڑھا

جھپٹا مار کر قرآنی تعویذ کو گلے سے طبلہ کر لیا۔ بس یہی ایک قیامت ٹوٹ گئی۔ ایک ایسی دلدوز چیخ کہہ
 گی چٹانوں کے ٹیلے بھی دھل اٹھے۔ قرآنی تعویذ ہاتھوں سے کسی کروڑے سانپ کی مانند لپٹا ہوا تھا۔ وہ اسے
 جھٹک جھٹک کر پڑے پھینکنے کی کوشش میں تھا مگر تعویذ تو جیسے اپنے زہریلے دانت اس کے ہاتھوں میں گاڑ چکا
 تھا۔ وہ کسی زخمی سانپ کی طرح بے طرح اڑتا پٹکتا رہتا۔ اونٹیاں لپٹا کسی جانب ہولیا۔ اس اچانک لہجہ
 ہونے والے واقعہ نے مومن کو اک سکت کی حالت میں ڈال دیا تھا۔ وہ اسی طرح بے سندھ و جس پڑی رہی۔
 غار کے اندر چیخ کی اودھم ابھی تک ایک ایک پیدا کیے ہوئے تھی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ غاروں میں
 گنبدوں میناروں اور گہرے کنوؤں باؤلیوں میں بازگشت و رینگ گونجا کرتی ہے۔ یہ کچھ دیر اسی طرح سب حسب
 سی پڑی رہی۔ آنکھیں دماغ روشن تھے۔ اسے قیامت کی آنکھ سے گزرنے والے ہر اذیت آمیز لمحے کا
 ادراک تھا۔ یہیں اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کا بے جس جسم اور زندگی آہستہ آہستہ بیدار ہو رہے ہیں۔
 تعویذی دیر بھلی سی جنت سے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لباس زیب تن کیا خواں اور علیہ درخت کرتے ہوئے اس سے
 اوپن پتھروں پر پڑے ہوئے اس شخص کے سامان پر اپنی جتنی سی نظر ڈالی۔ یہیں اسے وہ چاندی کا کپڑا
 دیا جس میں انہی نے کافی بی تھی۔ اس میں ابھی ایک آدمی گھومتا تھا۔ اس نے سر پھٹ کپڑے
 پہنے ہوئے تھا۔ اس نے کہا کہ یہ وہی ہے جو اس نے دیکھا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ وہی ہے جو اس نے دیکھا تھا۔
 ایک لمحہ فتنے نے وہ ہر گوسہ ہر کی منزل پر پہنچایا تھا۔ غار سے بارہ گچے و حلوں کی ایک آہٹ
 عبید اللہ کا بیٹا اور اس کے اچھی خاصی فینڈ توڑی تھی۔ گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے عبید اللہ غار کی جانب
 آیا۔ اس کے حساب میں میدان پہلے ہی بھر غار کے فوٹو اور اس کے ہاتھوں کے۔ غار کی نواز پر بھی
 فکر و فکر دھنسنے والے پانی سے خوب بھلا۔ بھلائی ہوئی۔

مومن نے سلام بکیر اور سعادت ماننے کو کرا تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے کہنے لگا۔

”سعید! سچی بات یہ ہے کہ میں باہر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ آپ کو نہیں میری غیر حاضری سے
 پریشانی تو نہیں ہوئی؟“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”نہیں نہیں میں نے تو تمہاری غیر حاضری میں خوب انجانے کیا۔
 نہیں، ہے میں کیسی ہشاش بشاش ہوں۔ چلو آپ والیں لے چلو بہت دیر ہو گئی ہے۔“

اس رات یہ غروب سوئی انکی گہری فینڈ بیچوں پہ اترتی ہے یا پھر ان خوش نصیب بوزسوں پہ نہیں آتی۔
 فینڈ کا احسان مسجدوں کے لاڈلوں پر ہوتا ہے اور کچھ سائے عمارتوں کے سہانے پہنوں والی فینڈوں کے
 ہیں اور کچھ خوشنویاں کامیا بیاں فینڈیں اُڑا دینے والی راتوں کا سندھیں بھی بن جاتی ہیں۔ چاہے تو یہ تھا کہ

بادل ٹخو استودہ جواب میں کہنے لگا۔

”میں آگے تعمیلی موزیک تو کئی مرتبہ گایا ہوں وہاں خشے کا پانی کافی گہرا ہے اور خوب گرم ہوتا ہے۔ کھانے کے پتھروں پر ایک گہرے نیلے رنگ کی کھٹی بھی ہوتی ہے جو عربوں کے استعمال کی ایک خاص قسم میں استعمال ہوتی ہے۔ ہم لوگ کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر وہاں سے یہ کھٹی کھرج لاتے ہیں۔“

”تم بھی یہ وہ استعمال کرتے ہو.....؟“

وہ کانوں کی لویں پکڑتے ہوئے بولا۔

”تو بہت ہی! یہ انسانوں کی کھانے کی چیز تھوڑی ہے۔ اس استعمال کر کے بندہ بندہ بن جاتا ہے۔ اب میں یہ گناہ ضرور کرتا ہوں کہ سینے میں ایک آدھ بار وہاں جا کر یہ کھٹی ضرور کھرج لاتا ہوں اور آگے بچھڑتا ہوں۔“

”کسے بچھڑتے ہو.....؟“

”میں نام بھی لوں تو کیا فائدہ آپ تو کسی کو جانتی نہیں۔“

وہ بچھڑنے پر قہقہہ کر کے کہنے لگی۔

”چاہے اس مقام تک سے چاہیں تکم جاتے ہو۔“

جیسے ہی گولگوں کیفیت میں ہلکاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”میں ہم آپ وہاں جا کر کیا کریں گی؟“

”میں اس خصوصیت کے ساتھ تھوڑے تھوڑے کھانے کے ساتھ ساتھ گہرا پانی سے نہس کے کنارے کے پتھروں پر ایسی قیمتی ہلی بھگت کافی پانی پاتی ہے۔ جو عربوں کے کسی استعمال میں آتی ہے۔ میں اس پر یہ تحقیق کروں گی کہ یہ اور کس کس مرض کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔“

سو ری میڈم! میں یہ خدمت بجالانے سے معذور ہوں۔ میرے رزاق روزی کا معاملہ ہے۔

یہ انداز سنس ضبط ہو جائے گا۔ شاہ صاحب کی جانب سے ہمیں کسی کو بھی آگے سے جاننے کی اجازت نہیں۔“

وہ سر جھکا کر مزید گویا ہوا۔

”آپ چاہیں تو مجھے میری خدمات سے فارغ کر سکتی ہیں۔“

وہ چپے ہوئے کہنے لگی۔

”نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ تم بہت اچھے آدمی ہو۔ تم کوہ نور دوں کی خصلت عادت سے واقف ہو۔ ہم لوگوں میں بال کی کھال اٹارنے کی بیماری ہوتی ہے۔ تم کل کی طرح باہر جا کر آرام کرو اور مجھے

میرے حال پہ تھوڑو۔“

وہ غار سے باہر نکلتے ہوئے کہنے لگا۔

”میزم! آپ کے مفاد میں یہ بہتر ہو گا کہ آپ اس مقررہ حد سے آگے نہ بڑھیں کیونکہ.....؟“

وہ اُسے گھورتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کیونکہ کے آگے بھی کچھ کہو.....؟“

”میں شاید یہ کہنا چاہ رہا تھا۔ آپ بہت اچھی اور مہربان ہیں مسلمان ہیں۔ میں آپ کو کسی بھی ممکنہ نقصان سے آگاہ کرنا اور بچانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔ ماضی میں دو چار ایسے واقعات ہو گزرے ہیں کہ کبھی ایڈونچر پسند گوہر نوذ غار کے اسرار کو دیکھنے کی خاطر اندر چلے گئے۔ پھر دوبارہ وہ کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ کبھی کہتا ہے یہ غار اندر ہی اندر ڈوبی ہوئی ہوئی جیل سیف املوک میں جا چکتی ہے۔ پرانے لوگ یہ بھی کہتے ہیں یہ غار کسی یونوں کے ملک تک جاتی ہے۔ یہاں اندر کچھ لوگوں کو بوسے بھی نظر آئے ہیں۔ میں نے ہونوہر کو کئی نشانیاں دکھوا چکی تھیں۔ دیکھی ہیں۔ جنات اور پتی زادوں کے توبہ اسے لٹکانے یہاں موجود ہیں۔“

ان کی بستیانی پر ان کے ہاں شادیوں میں لگنے والی آواز سنائی دیتی تھی۔
میں نے مجید احمد کی باتوں کو ایک کان سے لگا کر دوسرے سے باہر نکال دیا۔ شاید وہ ایسے

غار کے اسرار میں سے متعلق کچھ حقائق سے کچھ زیادہ ہی آشنا ہو چکی تھی۔ آج پھر اندر اس وقت پہنچ کر۔ لیکن آج وہ خوب پوچھ چکی۔ سنبھل سنبھل کر کہتے سمجھتے قدم بہ قدم اسی واقعہ کی طرف پہنچ گئی۔ وہاں ہی قدرتی روشنی موجود اس کے ہاتھوں میں بنے تار کی مانند دکھائی دینے لگی تھی۔ وہاں اس کل والے شخص کا سامنا ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس واقعے کے بعد اس سامان کو اٹھالیا گیا تھا۔ اچانک اس کو ایک پتھر کی آٹ میں کسی چمکتی ہوئی چیز پہ پڑی۔ وہ ایک قیمتی گھڑی تھی۔ جس کے سڑپ کی ایک پین ٹوٹ ہوئی تھی۔ ہاتھ سمجھ میں آتی تھی کہ ہاتھوں پہ پہنچنے کے بعد وہ ویلا کے دوران گھڑی کی پین نکل گئی۔ گھڑی وہ پتھروں کے بیچ میں گر پڑی۔ جو بعد میں سامان اٹھانے والے کی نظر میں نہیں آئی۔۔۔۔۔ مومن نے گھڑی کو اپنے بیک میں چھتو کر لیا۔ وہ تاریخ کی روشنی میں اس جگہ کا ہر ایک جہی سے جائزہ لیتی رہی۔۔۔۔۔ اور پتھر جن پہ وہ رہ رہ کر پڑی رہی تھی۔ اچانک وہ کی لہرائی۔ اس کی پیچھے اور کوئیوں پہ دھڑکوں کے نشان نظر نہ نظر واقعہ یاد کرتے ہی احوال دینے لگے تھے۔ یہیں کہیں اس کے دماغ کی کوئی ویرید نہ ہو کر رہنے لگی۔ وہ شخص ہاتھوں پہ قیامت ٹوٹنے کے بعد اذیت اور درد کو اسی کے عالم میں ڈال دیا کرتا ہوا چشمے کے اگلے اگلے لوگوں کو اتنا سا بھانکتا کہیں اوجھل ہو گیا تھا۔

ہاتھوں میں خاما ارتعاش تھا جیسے انہیں بجلی کے تاروں سے جوڑ دیا گیا ہو۔ جواب کیا دینا تو جیسے کدو
عذاب مسلسل میں مبتلا تھا۔

مومنہ ہارچ روشن کر کے اس کے سر پہ پہنچ گئی۔ اب چہرہ دیکھا تو اس کی چیخ طلق میں ٹھٹھ کی۔ یہ تو وہی کل والا شخص تھا۔ اسے اور تو پہچو نہ جہاں ہاتھ گئے کا سارا سامان نیچے پھینک کر اسے پانی سے باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔ خاص تک و دو کے بعد اسے ایک معقول سی جگہ پہ کھینچ لائی۔ اس کی ہنسنے والی ٹیپر پیچ چپک گیا۔ بوقت نکال ایک آدھ گھنٹہ پانی اس کے حلق میں اٹھ گیا۔ وہ بیہوش نہیں تھا ہاتھوں کے سے نکل چکا تھا۔ نہیں چو نہیں گھٹنے بن کچھ کھاتے پیتے اس آزار میں مبتلا رہا۔ نتیجے میں وہ خاصا بد حال چکا تھا۔ مومنہ نے اس کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے فوراً بسکٹ نکالے۔ گرم گرم کافی کپ میں اٹھیلی بسکٹ بھگو بھگو کر اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔ اس دوران اس نے محسوس کیا کہ اس کی سب سے بڑی مشکل اس کے ہاتھوں کا درو ہے۔ دو تین پین کمر ٹیبلٹ دینے کے بعد مومنہ نے اپنی زبان کھولی۔

”میں آپ کی نکل والی دوست ہوں! آپ گھبرا نہیں نہیں۔ میں نے آپ کو دوا کے لیے سب کچھ

پھر میں نے اس کی طرف اشارہ کیا اور کہا: "یہ تو تمہاری طرف سے ہے۔"

وہ بھی اڑیگا۔ جیسے ہوئے تھے۔

”میرے ہاتھ چھو کر تم کو سب سے پہلے جہنم میں بھیج دیتا ہوں۔“ خدا کے لئے مجھے سزا
 کروں اور مجھے اس عذاب سے نجات دلائیں۔“

آجیہ جیوا! ایسی ہی سرفری سونجی کچھ بھی تو نہ تھا۔

”تمہارے ہاتھوں پہ جتنا ہوا تو کچھ دکھائی نہیں دے گا جو تکلیف کا باعث ہو۔ کچھ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ
اوہ کراتے ہوئے پہلو بدل کر پڑے۔“

میں نے صرف ان کا ہاتھوں جب تمہارے مجھے کے قرآنی تعویذ کو پڑھنے کے لئے ہاتھ

اسی وقت مجھے ایسا جھوٹا تھا۔ جیسے کوئی آتشیں ہتھیار کا میرے ہاتھ پر چاٹ گیا ہو۔ میں وہاں دوپہر کے وقت تک ایک لکڑے کے تختے پر بیٹھ کر بیٹھ رہا تھا۔ میرے ہاتھوں کے اندر ایک گلی ہوئی ہے۔"

”وہ قرآنی تعویذ کہاں ہے؟ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کوئی تعویذ نہیں بلکہ انتہائی مختصر سادہ اور مفید ہے۔“

کے پاس ہے جو میرے کراچی والے بابا نے اپنے ہاتھوں میرے گھر میں رکھتے اور حفاظت کے لئے ڈالا

”مجھے کچھ معلوم نہیں وہ کہاں ہے مجھے تو اپنی خبر نہیں۔ میں کون ہوں کہاں ہوں۔ خدا کے لئے
 مجھے اس طبیب سے نجات دلاؤ۔ میں تم سے معافی چاہتا ہوں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔“
 وہ لیٹے لیٹے مومن کے پاؤں کی جانب بڑھا۔
 وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

”تمہیں نے مجھے معاف کیا۔ اب یہ تیرے اور قرآن کے درمیان معاملہ ہے۔ فی الحال تم مجھے
 تم کون ہو اور کہاں رہتے ہو؟ تاکہ میں تمہیں یہاں سے نکالنے ہسپتال یا تمہارے گھر خبر کرنے کی کوئی
 ذمہ داری کیمانڈر تو چتے ہوئے کھلے پایا۔“

”میں نہیں ایسا مت کرنا۔ اگر تم مجھے یہ کوئی اصرار کہ یہ اتنی بد تو مجھے صدق ال کے معاف کر دو
 میں اس کو اپنی موش کے کسی سے انکرت کرنے کا وعدہ کرتا ہوں یہاں سے جانے کو میں خود
 میں سے چاہتا ہوں۔“
 میں صدق ال سے معاف کر چکی ہوں بلکہ میں تو تمہاری بڑھاپہ شہزادہ ہوں۔ تم نے مجھے
 اپنے بے پرواہی سے کوئی دیا ہے بلکہ اس واقعے نے قرآن کی عظمت اور حفاظت کے بارے میں میری
 فہم فہم کی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تمہیں معاف کرے۔ تمہاری تکلیف سے نجات دے۔ کیا
 مجھے یہ سہجہ نہ پند کر کے اور یہ بھی کہ اگر میں تمہاری خبر نہ معلوم کرنے کے لئے بھی ماننا چاہوں تو میں
 مجھے تم مجھے اپنا ایک دوست سمجھو۔ با اعتماد اور شخص ا۔“

”میں نے آنکھ اٹھا کر چند لمحے اس کی جانب دیکھا۔ فرماتے ہوئے ہونٹوں پہ بھی سی مسکراہٹ
 اٹھ رہی تھی ایسے ہی جیسے سورج کی چمکی کرن کا ظہور ہوتا ہے۔“

”میں یہاں ”شاہ قی“ کے نام سے مشہور ہوں۔ یہاں کو ہر مردہ زن بچہ بڑا کھاتے جاتا ہے۔
 میں ایک دفعہ با عزت خاندان کا پڑھا کھاتا ہوں۔ لیکن میرے اہل اچھے نہیں ہیں۔ دولت شہرت اور
 میرے لئے ہرے اہل پروردگار ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آج میں خدا کی پکڑ میں آ گیا ہوں میں نے
 اپنے پاک کے تقدس کو پامال کیا ہے۔ میں آج تمہارے زور و اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہوں اور تمہاری
 معافی کا طلبگار ہوں۔“

میں نے سوچا کہ اگر وہ سوشل سٹریٹجی کو اپناتا تو اس کی مدد سے وہ اپنے ملک کی معیشت کو ترقی دے سکتا تھا۔ یہ بھی ایک سوشل سٹریٹجی ہوتا ہے جس سے وہ

دوسرے دن وہ نصرت کو اپنے رابطہ فیسر لکھوا کر اسلام آباد چلی آئی تھی..... گل نواز کو بھی اس نے اپنے محفل اور بیٹنوں جیسی محبت سے سیرھا کر لیا ہوا تھا جبکہ شاہ صاحب کا ٹیلیفون فیسر بھی اس کی ڈائری میں

انہی دنوں شاہ صاحب کو ایسے آباد سے ایک دوست نے اطلاع کجوائی کہ اسلام آباد کے ایک
ہسپتال میں جرنی سے الرجنی اور امراض جلد کا ایک سپیشلسٹ ڈاکٹر عین الاقوامی سطح کے ایک سیمینار میں
شرکت کی غرض سے آیا ہوا ہے۔ اسلام آباد میں یہ سیاسی اور پندرہواں تعلق دہری کے چند رابطے کام آگئے اور
سب سب شتم پشتم ڈاکٹر صاحب سے معاملہ کے لئے اسلام آباد پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے ان کی مہیہ مکمل فائل
تسلیم کر لی۔ اس شخص سے بات کو انکے معلوم کرنے کے بعد چند ایک نمبر بھی لینے۔ ان کے تعلق کے بعد
انہوں نے دوبارہ الرجنی سے اور نہ ہی فریڈنکون یا کوئی شخص کی رہائی بلکہ کوئی نہ کوئی شہرستان
پہنچا۔ یہ سب کچھ ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب کچھ ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب کچھ ان کے سامنے
پیش کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب کچھ ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب کچھ ان کے سامنے پیش کیا گیا۔

مجھے یقین تھا کہ تم بھی کسی نیکو بیانی سے کام لے رہے ہو۔ یاد رکھو! اکثر اور پولیس کے
کے ساتھ بیانی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہ شخص وقت بہ ہمارے ہاتھ سے ہوتی ہے۔ اب غور سے سنا
میں اس تکلیف کا جان لیا کہ کبھی اکثر کے پاس نہیں ہے۔ اب صرف اللہ یا پھر اس خاتون کی اعلیٰ معافی
پر کسی شامل ہو سکتی ہے۔"

کرم کی بات تو جیسے اس کے دلی کی بات تھی وہ جانتا تھا اس تکلیف کی شفا اللہ یا پھر اس خاتون ہی سے لیگی۔ یہ کافر اس مومن کو منظر پہ بھی نہیں لانا چاہتا تھا کہ اس سے دونوں اطراف کی ارموائی لگتی رہے۔ حریت کی شاہد اسے اتنی پروا نہیں تھی لیکن وہ اس حالت میں آپ کو یہ آپ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے سوچا کہ بعد بھی وہ اس واقعے کے دن کے کسی منظر ہی سے۔ مابین کشمکش کے کسی لفظ اپنی

کشمکش اور اس کے ایمان و ایتان۔ صولت و سہور کے کسی مرحلے کو ایک پل کے لئے بھی اپنے آپ

میں نہیں کر سکا تھا۔ یہ سب کچھ ایک ایسے طویل سین کی طرح تھا جو کسی خرابی کی وجہ سے بار بار شروع اور

ختم ہوتا ہو۔ شاید یہ ایک عذاب مسلسل تھا جو دل خراش ٹیسوں اور دل پاش چیخوں میں وحل کر رہا تھا۔ شاہ صاحب نے کسی رنگ، صفت سے گل نواز کے ذریعے مومن کا رابطہ ٹیسر اور ہوٹل کا پیسہ حاصل کر کے اسے اپنی حالت زار بتاتے ہوئے پھر معافی اور دعا کی درخواست کیا اور ساتھ ہی جرمنی کے اس ڈاکٹر کو باتوں کا انکی حوالہ دیا۔ یہ شخص اتفاق ہی تھا کہ مومن اس ڈاکٹر کو جانتی تھی جو کچھ روز قبل واپس جا چکا تھا۔ مومن نے شاہ صاحب کو بھرپور تسلی دی اور کہا میں نے اسی روز سے آپ کو معاف کر دیا ہوا ہے اور اپنا عہدہ سنبھال رہا ہے یعنی کسی سے اس واقعے کا ذکر نہیں ہوا۔ بلکہ میں تو آپ سے معافی چاہتی ہوں کہ میری وجہ سے آپ اس مشکل میں پڑے۔ میں اس مشکل میں ہر طرح سے مدد کرنے کے لئے حاضر ہوں۔ فرط جہد سے شاہ صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آواز بھر آگئی اور انہوں نے ٹیلیفون بند کر دیا۔

شاہ صاحب کی تو جیسے نہ جی بھری ہوئی تھی۔ پھر انکی ہاتھوں پرانی چوٹ تو تھی ہی اب ایک نئی چوٹ دل پہ بھی لگ گئی تھی۔ حال یہ کہ اب کچھ پتہ نہیں چلتا تھا وہ پرانی چوٹ سے نرپے رہے ہیں یا نئی چوٹ انکی فز حال کہتے ہوئے ہے۔

وقت کا پتہ انا چکرا چیسے تیسے کسی نے معلوم کر لیا۔ شاہ صاحب کی جانب سے کوئی خبر نہ تھی۔ شایاں شاہ صاحب نے اس وقت کوئی کام کر لیا ہوگا۔ ان چیزوں میں شاہ صاحب کا آزاد بھی شامل تھا۔ ان کا لہجہ سننے کے بعد ہی کچھ تھا جو پہلے نہ تھا۔ کوئی دن اور کوئی شب اسی نہیں گزری ہوگی جب کھر میں لگی سے ٹکھ کا سانس ہو۔ آدھ کا ہڈیہ تھن۔ شاہ صاحب نے یہ سب سہجی اور بے سہجی۔ کوئی کئی کا برداشت نہیں کرتا تھا۔ جسے رشتہ کا تقدس ختم ہو چکا ہو۔ یہاں تک کہ بیوی بچے تک شاہ صاحب کے پاس پہنچنے آئے۔ سے گریزاں رہے۔ یہاں بیوی والے تعلقات تو بدلتے۔ سے دم توڑے ہوئے تھے۔ بیوی اب برائے نام بیوی اور خاندان سہجہ دکھاوے اور بٹھاوے کا رہ گیا تھا۔

اس کے برعکس اسلام آباد اور خوب آباد اور ٹیلیفون پر رابطہ بحال۔ بیان بہانی شاہ صاحب خود کر جاتے۔ ملازم معالج بھی چلتا تھا اور مومن کی زیارت بھی ہو جاتی۔ ہاتھ کا چراغ اور الزمی کا سہاگ کھر جاتے ہو چکے تھے۔ شاہ صاحب کو ایک مصرعیت مل گئی تھی ویسے بھی وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح مومن کا دل ٹھوس ہو جائے۔ اور وہ دل کی کھر انہوں سے لڑا ہوا لگ کر اسے اس لکھ سے بچانے والا ہے۔ اور مومن کے دل میں تھا کہ سب کچھ اس کی وجہ سے ہوا ہے لہذا اسے شاہ صاحب کی مدد کرنا چاہئے۔

اس دوران مومن جرمنی بھی گئی۔ اس کے ادھر کچھ ضروری کام تھے۔ وہاں وہ اسلام آباد

میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ بھی ملی۔ ڈاکٹر سے مل کر اس نے شاہ جی کی بیماری کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی، مزید
 جاننے والی تھی۔ وہ چندی ہو میوٹیوٹی کی ادویات بھی لیتی آئی۔ ادھر پہاڑوں اور دیووں میں برف نے
 سال بھر کے تھے۔ سردی عروج پہ اور موسم انتہائی ناگفت بہ۔ یہ تیور دیکھتے ہوئے شاہ جی نے عارضی طور
 پر اسلام آباد کر لیا۔۔۔ بڑی اہم کے قدموں کے قریب ایک چھوٹی سی پہاڑی پہ ایک مناسب سی
 جگہ تھی جو ایک قریبی جاننے والے کی وساطت سے اگلے گھر میں مبارک مل گئی تھی۔ چوٹی بچے تو بھلا
 کیسے تھا۔ جس دو معتد جن میں ایک باور پٹی ڈو جاؤرا نیور اور ایک نو عمر سا بچہ گھر کے چھوٹے موٹے کام
 کرنے کے لئے ساتھ تھے۔ اس طرح شاید وہ کاروبار اور قبیل داری کا سارا بوجھ چھوٹے بھائی پہ ڈال کے
 صاحب ایک طرح سے آسودہ ہو گئے تھے۔

• ضمیر بھی اور منہ بھی.....!

یہ چھوٹا بھائی بھی ٹیپس کی کارروائی میں شامل تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بے حد بھدار
 اور شہسوار بھی تھا۔ اس کے بھائی کو باپ سے برا دیکھتا تھا۔ اس کے برعکس کی میل اپنا لیں۔ یہ کسی
 شخص سے کسی پر جان نہیں رکھتا تھا۔ ضرور رکھتا تھا مگر شہسوار کا بہت اس کا شیعہ تھا۔ بھائی کی ہر حرکت اور
 ہر بات کی سروریت کا اسے بھی علم تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ بھائی کن راستوں پر چلے گا ہوا ہے اور یہ موجودہ
 حالت میں اس کی کسی غیر اخلاقی حرکت سے کتنے کتنے لوگوں کی زندگیوں سے واقف نہیں تھا اور شاید اسے
 اس کے کوئی خواہش بھی نہیں تھی۔ ویسے بھی یہ کوئی خواہشوں آرزوؤں اور تمنوں کا مسئلہ نہیں تھا۔
 اس کی سبھی تسلی سے تھرا تھا۔ اپنے بڑا بھائی تو تھا، اور وہیوں فقیروں کی سارا لیتا رہتا۔ حزاروں
 میں حاضری دیتا۔ مطالعہ کا بھی شوقین، کشف الکجب اور تذکرہ نوحیہ اس کی پسندیدہ کتابیں
 تھیں۔ قدرت اللہ شہاب سے لے کر اشفاق احمد خان ہالو قدسیر اور ممتاز مفتی تک سب کو پڑھا کھانا
 تھا۔ ان کے لکھنے کے راستے کا راجی تھا۔ اب کسی ذریعہ سے میری کتاب ”پیارنگ کا لا“ اس کے اچھے چھپ
 کے اس کو کچھ ہونگے لینے کے بعد جب وہ اپنی پہلی فرصت میں جب مجھ سے ملا تو میں نے پہلی نظر میں ہی اس
 کے اندام اور آئندہ کا اندازہ کر لیا تھا۔

کوئی پڑھنے والا ایسا بھی ہوتا ہے جس کے لئے پوری کتاب کا مطالعہ کرنا ضروری نہیں ہوتا جس ایک

آدھ صفحہ شروع کا۔۔۔ دو چار جملے درمیان اور آخری سطر تہمت پائیر ایوں پوری کتاب اپنے نفس مضمون کے ساتھ ان کے سامنے ہوتی ہے۔ اور دیکھا ایسے بھی کہ خالی جلد یا استری کو چھو لیں تو کتاب الف لہ ہو کر ان کے زور ہو جاتی ہے اور ایسے بھی کچھ بند کا "صواب و کتاب" بھی دیکھے کہ مصنف کو جی محض اک نظر ٹٹول کر اپنے پوری کتاب کھجول پیتے ہیں۔ دیکھا ہوگا کچھ ان پڑھ عاشق و معشوق قسم کے لوگ اپنے محبوب کی چھٹیاں کرتے وغیرہ ڈاکینے یا اپنے اعتماد والے کسی پڑھ لکھے سے پڑھواتے لکھواتے ہیں۔ لیکن اس کا روبرو قلب و نظر میں کوئی مقام ایسا بھی آتا ہے کہ طالب و مطلوب کو باہمی بیضا مہری کی ضرورت نہیں رہتی اور اگر کوئی بے رنگ ہو جائے تو صرف لفاظی دیکھ کر ہی محبوب کی جیب اور اندر کے مضمون کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ تحریر تو پڑھنے سمجھنے کے لئے ہوتی ہے۔ وہ خط کی ہو کتاب یا چہرے کی۔

میں بھی شاید ایسی تحریر میں پڑھنے سمجھنے کے قدر کے لائق ہوں لیکن ایک بڑی عادت کہ میں جب نشست میں کبھی کوئی تحریر تمام نہیں کرتا۔ چند لائنیں کہیں سے بھی پڑھ کر مزید پیش کر دیتا ہوں کہ "اپنے صحبت باقی اٹھ لیں" کہ اس سچے کے دیے ہوئے تحریر پر پسند کے ساتھ بھی سبکی کچھ ہوا کہ میں نے چاروں ان کے چہرے کے بارے میں تھے اور کچھ ابتدائی سہریں اس کے کھیلنے کی۔ اگر میں اپنے ہی انہیں بولنے سے پڑھ لیتا شاید اس کے سبب وہ کبھی پڑھ لیں یا نہ لیں۔ یہ سب میں کہ بولنا سہل ہے لیکن اک جگہ آتا ہے۔

"بیا رنگ کا" میری غور کیوں آئے تھے میرے اندر جلتیوں کی ایک ایسی بے سرو پا سرگزشت تھی۔ ہماری کے حال و حسب اس کی مٹی بستی تھی اور وہی طلب کے مطابق اپنے پر تھی اور معنی آجاتی ہے۔ اس کے کج نامے کم نہ رہے اور سوک کی نہ ہر سلامتی کے سونپیلے اگر اسے چھو بھی لیں تو راندہ ادب نہ ہو جائے اسے وہی شخص اور دیکھتا ہے جسے کار تک بھاتا ہو۔ اور یہ متاثر ہے جسے کسی "کالے" کا نام ہو۔

عاشق بھورا فقیر تے ناگ کالے
بناس غنٹروں مول تے کھینے نی

یہ چاروں ہی اندر ہا ج سے کالے ہوتے ہیں۔ بابا وارث شاہ فرماتے ہیں کہ ان چاروں میں سے ہر ایک سمجھتا ہے کہ ایک مشکل امر ہے یہ کسی کے متر نہیں ہوتے۔ اگر ان کی قربت کا حصول نہ ہو ضرورت ان جالے تو ایسا رنگ "ڈھنگ" اور وہ یہ اختیار کرنا چاہتے کہ ان کی فطری بھوریوں سے کھڑے ہوئے صرف خیر سے مستفید ہوا جاسکے۔

اس بچے نے بھی اپنے ادب، اخلاق، اخلاص اور پاکیزہ رویے سے مجھ ایسے کالے کو کھیل لیا ہوا تھا۔ حواقات سے مشترکہ ”پیارنگ کالا“ کے چند ابواب چاٹ چکا تھا۔ شروع کے ان ایڑھ سو صفحات کی کتاب میں نے اسے اس حد تک مجبور کر دیا کہ مجھے کھوجتا ہوا سرکار علی جھوڑی کے در پہ پہنچ آیا۔ میری مجلس میں تجلی سے پہلے ہی اس نے اپنی بستر کی شیٹ چہرے پہ اوڑھ لیا اور وہی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی عادت کے لئے کھس دیا اور اگھر ہی دیکھنے پہ اکتفا کیا تھا کہ باقی کا اللہ باقی !

مسلمانہ دلفا دھیا اور ادب و اداس کا دروازہ ہوتے ہوتے وہ اپنے تئیں آدھی کتاب چاٹ چکا تھا۔ لیکن میں جب اس نے کتاب کے مندرجات یا فہرست و فہرست کے حوالے سے اک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ کتاب تو رہی کتاب اس نے تو کوئی آدھا سا لفظ بھی اپنی ذات اوقات کی بابت نہیں کہا تھا۔ اور نہ ہی اپنے بھائی کی

تائید یا گھر پر پریشانیوں پہ کبھی زبان کھولی۔
 اللہ اجانے کیا سوچ بچ کر اس نے ساگر و ”پیارنگ کالا“ کی ایک جلد بھائی کو بخشنے کے طور پر پیش کر دی۔ اس کی یہ سوچ رہی ہو کہ اس کتاب سے بھائی کا دھیان بٹا رہے گا۔ کتاب کا تھکا لیتے کے بعد

بھائی نے مجھ سے کہا۔
 ”تو بچا بھائی، یہ تو اس کتاب کا دھیان بٹا رہے گا۔ شاید تم نے

اسے میں مجھ سے مذاق کیا ہے۔“

بھائی کے اس جواب سے بے ساختہ اٹھ گیا۔
 ”شادی ایہ کتاب آپ نے بھائی یا تمہیں میں تمہیں کر سکتے ہیں کہ چاہیں گے۔ اللہ اللہ“
 رات کا درمیانی پہر زور اور جھنجھکاوت کا مارا ہوا یہ بے چارہ بلب سے جسمانی اور ذہنی تھکنے میں مبتلا تھا۔ اسی گھر میں اس کے سوا سب گہری پائے سکون فینڈ کے طرف لوٹ رہے ہیں۔ اور یہ بھائی زور سے کھانا کھا رہا ہے۔ اب یہ عالم کہ زور زور کرنے کی گولیاں پائیند قریب لانے والی اور بات بھی نہ کر رہا ہے۔ تھوڑا بہت ہوا اثر تھا وہ دی کا طوطہ تھا کہ جس میں اگر اس کے ہاتھ اور بازو نہ گھسوں تب تک یہ نہیں تو دیکھن میں قدرے اونٹ رہتا۔ لیکن دھن سے ٹھنوں کی کیڑیاں جاری رہیں جو رنگ جان کو

اس سے بھی اس کے ہاتھ لٹا سکتے تھائی پہ دھرتی کے پتیلے میں روپے ہوئے تھے۔ ان لوگوں پہ بڑا
 سناٹا چڑھا جس پہ جا بجا دھن کے دھبے تھے۔ ناگاہ اس کی نظر دائیں جانب میز پہ رکھی کتاب کے ایک کوزہ پہ
 پڑی۔ دو ہاتھ نمایاں تھے ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرا اونٹنی کتاب پہ اٹھکیاں نکالے ہوئے۔ بھوکے کو برتن

ہے اور اس کا علاقہ بھی اسی حدود و زمرہ میں ہے۔ اس بقیہ رات شام صاحب نے ہی کے پاس بیٹھ کر بات کی۔ باب بار بار پڑھتے اور وہ تے رہے۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے صبح کو سامنے بٹھایا اور اس کتاب اور مصنف کے بارے میں پوچھا۔ کتاب پر ذریعہ نیلغون کے بارے میں کہا کہ یہ خواہش ظاہر کی مشہور الرحمن ان کی موجودہ حالت کی بہتری دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ کہ جسے بھائی کو تسلی دی کہ وہ بہت جلد باپا ہی سے رابطہ کرے گا اور ان سے دعا کے لئے کہے گا۔ نیلغون نے کرنی اس نے کچھ مناسب نہیں سمجھا تھا۔

مومن نے یہ بیچ کا عرصہ مختلف عجائب خانوں اور سندھ کے کنھل رات مقام پر قلعہ وغیرہ کو گھگھائے میں
 لے کر شہلی علاقہ جات کی سرحد پر بارہی نے اس کی سیاحت کی راہیں مستعد کر دی ہوئی تھیں۔ پاکستان
 میں موجودگی کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اسی طور اٹھا سکتی تھی کہ وہ گرم اور میدانی علاقوں کی جانب رجوع کر لے۔
 اس سے وہ لکھنوت اور وغیرہ سے رابطے میں رہی۔ شاد صاحب کے بارے میں اسے منگولات سے حاصل
 کی تھی۔

تو یہاں ملازمتوں میں جہیز کی کمی کی وجہ سے خواہش مند رہنے والے تھے۔ اس کی وجہ سے ان کی بہنوں کی بھی گھر سے
موجودہ حالت کی سہولتوں کے باوجود وہاں کوئی فرق نہیں پڑا۔ شاہ صاحب کے خاندان میں بھی چند
مہینے ضرور موجود تھے۔ خواتین اور بزرگوں کے لئے تعلیم حاصل کرنا مشکل بنی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ یہ تعلیم
میں کرنا لازمی تھا۔ اور خلائی جہیز ضرور مل سکتا تھا۔ شاہ صاحب کی بیوی کی جو کہ خاندان سے تھی، گواہ
اس کا احساس تھا کہ اس کا شوہر اسے دل سے پسند نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ غریب و سوت اور سکھ
تھی بلکہ اس کی وجہ اس کی بے علمی اور توہم پرستی بھی تھی۔ وہ قدرے اعتدال پر بھی چلتی تھی۔ شاہ صاحب نے
شوہر سے پیدا کرنے کے باوجود کبھی اسے خلس مستراہٹ کا تجربہ بھی نہیں دیا تھا۔ ایک ستم اور بھی ہوا کہ کہیں سے
یہاں بھی ان کی کہ شاہ صاحب نے کہیں کسی بہن یا اس کی بیوی کی بے حرمتی کی ہے اور پتہ نہیں لے ان کے ہاتھوں
پر لگا دیا ہے۔ یہ بھی کہ اس کا اثر آئندہ نسلوں تک چلے گا۔ خاندان کے متعلق افراد بھی کچھ دیکھ دیکھ کر
بے حد شرم کا شکار ہو جائیں گے۔ کسی نے اسے معتدی بیماری بھی کہہ دیا تھا اور ان کی اسلام آباد قلعہ کی بانی
ہو۔ انہیں کی بھوٹی چلی افوازیں بھی تھیں۔ ان کے سارے بھی کاروباری اور سیاسی لوگ تھے۔ ان کی
بہنوں کو تو توں سے کسی حد تک واقف بھی۔ شاہ صاحب کی ایسی حالت گھریلو معاملات میں ہے تو انہیں
پسند نہ آئے انہوں نے اپنی بہن کی علیحدگی کا مطالبہ کر دیا۔ اک بیوی ہی پر کیا موقوف یہ تو زندگی بلکہ اپنے

آپ سے بھی بڑا رشتے ہوئے تھے۔ جھٹ ایک اچھی خاصی جائیداد اور رقم دے دلا کر اپنی گلو خلاصی کروائی۔
تج تو تھا کہ ایسی بلندی اور ایسی بلندی دیکھ کر وہ خود کو کسی کے سامنے منہ دھرنے کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔

اسلام آباد میں ان کی زندگی کا اک نیا دور شروع ہوا۔ حضرت برکی امام کے قدموں کی جانب ایک
مذہب ہی پہاڑی پہ جس مکان میں اقامت تھی ان کے ایک دوست نے عرس کے دنوں میں اپنی اور ازرائین
کی رہائش کے لئے ہوا کیا تھا۔ برکی سرکار کا یہ عقیدت مند عمارتی نگری کا چار تھا۔ یہ جگہ سارا سال خالی رہتی
تھی۔ چوکی داری کے لئے ایک نگہدار یہاں پہ موجود رہتا۔ یہ نگہدار بھی عجیب شخص تھا۔ اپنے شوق اور وقت
گزاری کی خاطر چند بھیر بکریاں پال رکھی تھیں۔ عارف کفری شریف میاں محمد بخش رحمتہ اللہ علیہ سے روحانی
ارادت رکھتا تھا۔ ان کا کلام دلپذیر انتہائی سوز و عقیدت سے پڑھا کرتا تھا۔ اور ایسا پڑھتا کہ آس پاس کا
سارا ماحول اک ملکوتی سی کیفیت میں ڈوب جاتا۔ شاہ صاحب کے یہاں آنے سے جیسے یہ پہاڑ جگہ کچھ آباد
سے اور رونق والی ہو گئی تھی۔ شاہ صاحب کے اپنے ذاتی ملازم بھی تھے۔ باورچی خیرا خیر اور ایک نو عمر عتیقہ
لڑکا جو ان کے اپنے خاندان سے تھا۔ نیلیون پہلے سویرہ نمس تھا چند دنوں میں یہ کی بھی زور ہو گئی
مشہور دارچمن میں کاروباری دوروں کے بعد سکون قاسم بن گیا۔ عارف کفری شریف میاں محمد بخش رحمتہ اللہ علیہ اور
شغل و محبت کے لیے یہاں پہلے پہلے آئے۔ عارف کفری شریف میاں محمد بخش رحمتہ اللہ علیہ اور
میر محمد بخش رحمتہ اللہ علیہ کے کام کے سوز و گداز نے ایسی تڑپیں پیدا کر دی کہ جہاں جہاں اکھیاں
چھلکے تھیں۔ کلمہ کو کچھ خان نے اپنی لے بندی سے اسے جیسے ہاندھ لیا تو اچھا بھر بھ "پیارا رنگ کا"
کے کالے نے اسے شاہ صاحب کے اندر کی بند کے اندر لگا دیا۔ عارف کفری شریف میاں محمد بخش رحمتہ اللہ علیہ اور
بچھوئے کا ڈانگا روئے اور کالے کا کانا سوئے

سوئے جان کی دنوں تک اپنی دہی۔ سندھ اور بلوچستان کی لمبی سیاحت کے بعد اب تھکی ہار چکی
اسلام آباد پہنچنے پر انہیں گیسٹ ہاؤس میں پڑی تھی۔ دور واز ملک محض آرام بخشا کتابت اور ڈائری لکھنے میں
گزار دیتے تھے۔ جب ذرا دل ڈھانچا اور تھکے صاحب نے سرت پکڑی تو پہلا رابطہ نصرت گھڑا کی خیر خیریت سے
کے کیا۔ وہیں سے دیگر معلومات، شمول شاہ صاحب کی خیریت، عارف کفری شریف میاں محمد بخش رحمتہ اللہ علیہ اور
محض اس لئے نہ ہوئی کہ وہ جس "مقام مراد بود" پہ تھے وہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ نیلیون بھر بھی وہیں سے
دستیاب ہوا تھا۔ نورابو رابطہ کیا تو تھاہ کر کے بھر لیا۔ رگی گفتگو کے بعد شاہ صاحب نے اک ضروری
ملاقات کے لئے درخواست کی۔

”میں پورے واقف سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ نوشتہ مضامین تصویف پہ مبنی ہے اور مجھے پورا پورا یقین ہے کہ تمہیں اس آزار سے نکالنے میں بڑی مددگار ثابت ہوگی۔“

یہیں اُس نے کتاب کو کھولا۔ ٹیپ پہ انگشت شہادت رکھ کر یوں سطر سطر پھیرنے لگی جیسے اُن پر ہے قرآن شریف کی سطروں پہ انگلی پھیرتے جیسا گویا کہ وہ اسے پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب اسے غریب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ چاہیں تو میں پڑھ کر لٹا سکتا ہوں۔“

”میں اس وقت صرف اس کتاب کو مس کر کے محسوس کرنا چاہوں گی۔ جب تک یہ کتاب مجھے چھ پڑھنے کے لئے نہ کہے۔ میں اسے صرف دیکھنے اور محسوس کرنے پہ ہی اکتفا کروں گی۔“

شاہنی نے مزید جاننے کے لیے ایک اور سوال کیا۔

”یہ کتاب انجیل ہے اور ارزاؤ آپ نہیں جانتی۔ لیکن یہ جو آپ سطر سطر انگلی پھیر رہی ہیں ان کا کیا مطلب ہے؟“

شاہنی کوشتہ میں ہنسی۔

UrduPhoto.com

”یہ کتاب ہے میرا مستند کا کسی حد تک اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میں بھی ٹیپ سے کسی مضمون حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہاتھ پری زبان کی بات۔ تو کتاب پڑھنے کے لئے کتاب کی زبان جاننا ضروری نہیں۔ خاص طور پہ تصویف۔“

”میں آپ کی یہ بات قطعی سمجھ نہیں پایا۔ کیا آپ کوئی مثال دے سکتی ہیں؟“

”اُس سے بہتر اور کون سی مثال ہو سکتی ہے کہ میں قرآن پاک ہر روز پڑھتی ہوں لیکن میں عربی سے

تعلیمی دیکھ ہوں۔ میں اسی طرح اُس کی ہر سطر پہ انگلی پھیرتی جاتی ہوں اور قرآن پاک کا متن میرے دماغ پر اتارتا جاتا ہے۔ تم نے کبھی کسی بیٹے یا باپ کو دیکھا ہے؟ یہ کبھی کسی سکول کتب میں نہیں گئے ہوتے۔ نہ ہی کسی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اصل علم ان ہی کے ہاں ہوتا ہے۔ ان کے ظاہری دماغ و زبان سے کچھ زیادہ ان کا بطن اور بعد ان فیض آشیا ہوتا ہے۔ یہ کتاب کہیں بھی دھڑلے ہو لگی ہوئی آج دے رہی ہے۔ بھنی بھنی اور مٹی مہک سے ماحول کو بہکانے دیکھتی ہے۔ تصوف کا نام لگے۔ صحیحے شکم بھی ہوتے ہیں۔ حرف و الفاظ اور دبا نہیں تو کھل ظاہری استعاراتی مصنوعی امثالی اشکال اور دھڑلے ہوتے ہیں جبکہ اصل مآخذ و مغز ان کا محتاج نہیں ہوتا۔“

شاہ صاحب ہٹ ہٹ اس کی جانب دیکھتے ہوئے ایسی کھلی آڑی گفتگو کو سمجھنے کی اپنی ہی کوشش کر رہے تھے۔ اور حیران ہو رہے تھے کہ ایک فرنگی جو بڑی ہی مسلمان ہوئی ہے۔ تصوف کی کیسی کیسی شکلیں سمجھ کر اسے جیسے نام نہاد دین و مذہب کے، الٹی شاید تمام عمر نہیں سمجھ پاتے۔ پھر وہ کتاب پہ اک باپ کی تصویر کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”یہ بابا موجود ہیں یا لا موجود ہیں؟“

”لاہور میں واسطی جیویری کے مزار اقدس پہ فردوس ہیں۔“ شاہ صاحب نے جواب دیا۔

وہ کتاب کو باہر اندر غور سے دیکھتے ہوئے پھر پوچھنے لگی۔ ”تم ان سے ملے ہو؟“

”مجھے ابھی تک یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔ البتہ میرا چھوٹا بھائی مشید الرحمن ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا ہے۔“

وہ کتاب پر دیکھنے کے لیٹینون نیر کو اپنی آڑی میں لکھ کر کتاب واپس اپنی جگہ پر رکھتے ہوئے مشورہ دے لگی۔

”میرے بھائی، تم اپنی پہلی فرصت میں ان بزرگ سے ملنے آؤ۔ ان سے آپ کی فون ضرور ملے گی۔“

مجھے دو چار روز غور و فکر اور پہلی میں غامبی کی واقعی ہو گئی تھی لیکن دوسری طرف ہاتھوں بازوؤں کی وجہ سے میں اٹھ نہ ہو گیا تھا۔ یوں کچھ تو کچھ غور و فکر کا حال ہو گیا تھا۔ ہاتھوں کی ہڑوؤں میں دھاریں پڑنے لگی تھیں۔ جیسے کچھ دنوں میں ٹیبلٹ ہو جائیں گے۔ یہ صورت حال انتہائی تشویش ناک تھی۔

مجھے پھر وہی ادکلوں پہنچانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نئے مہنگے مہنگے پیڑ شستے، بیکاری اور شعاؤں سے کھڑکے والے۔ کھال کے ٹکڑے فون بول و برانڈ ٹھوک وغیرہ سب پھر کے سرے سے نیست۔ حیرت یہ تھا کہ سب ایک نلکے پہ متعلق ہوئے کہ بازار کھینچوں تک کات دے جیسے جا رہی اس صورت میں کسی سرے باز نہ ہو سکتے ہیں ورنہ آہستہ آہستہ پورے بچے کا یہی حال ہو سکتا ہے۔ اس پوری ششیں و تہہ میں سہارا بھائی نے پورا چار ساٹھ دیا۔ اس دوران ٹومٹا لاہور والے بابے سے رابطہ کر چکی تھی لیکن صرف اتنی خدمت کی حد تک۔ شاہ صاحب ان کی بیماری یا اس کیس میں اس کے اپنے کردار کا کوئی ذکر نہ تھا۔ دوسرے صاحب نے کئی بار مشہور دارسیں سے کہا کہ بابا کی سے رابطہ کیا جائے لیکن ہر بار وہ طرح وے جاتا۔ شاید اس کے عجب یہ رہی ہو کہ وہ نہیں چاہتا تھا بابا کی اس کے بھائی کی کرتوتوں سے واقف ہوں مگر اب پانی آنکھوں

تک آچکا تھا۔ آخری چارے کے طور اب بابا جی ہی رکھائی دیتے تھے۔

ایک ڈیڑھ دن لگا کر مشہور الرحمن نے آلف تاپاے ساری کھانا من و عنان داکر دتھری میں لا کر بابا جی کے آگے دھردی تھی کہ اس زوداد ٹالفت یہ کوچہ کر پکھو دھگیری کریں گے۔ لیکن انہوں نے تو اپنی عادت کے مطابق شروع تصدید چند لائیں پڑھ کر بقیہ صفحات کو نوٹرات کی نوکری میں ڈال دیا تھا۔ اس دوران راکھ پتھر کی کشل چوٹی پہ کئی فٹ برف کی تہہ چڑھ چکی تھی اور شاہ صاحب کے ہاتھ بازوؤں پہ گوشت کھال کے کٹی ہوئے سڑکراتر پکے تھے۔ آخری ٹیلیفون پہ سنائی گئی کیفیت کی عکاسی کو محسوس کرتے ہوئے لاہور والے بابے نے بد وقت مشہور الرحمن کو اجازت دی کہ وہ بیمار بھائی کو لے کر تین دن بعد بدھ کے روز سہون شریف چلا جائے۔ اس دوران جو خوراک دی جائے وہ صرف بھڑی کے نرم پخت نرم پتوں پہ مشتمل ہو۔ شہزادہ سہون شریف کے سپتہ پاک ٹیٹھی ذہن پابو بیہوش وغیرہ جہوں میں قطع کسی مریض حالہ یا شک کی آمیزش نہ ہو۔ نمبر کے پتوں کو پانی میں ابال کر پانی سے ہاتھ بازوؤں کو اچھی طرح دھویا جائے۔ کسی پیر سے تو لینے سے خشک کیے گئے ان پودوں کی تھالہ کے بجائے ہوئے نرم پتہ چرچا کر نوتی کپڑے کی بنیاں لپیٹ دی جائیں اور پتوں بازوؤں پہ موم جاسے کے تھیلے چڑھا کر بچائی جائیں۔ لیکن ایک ہارڈ آلہ بند ہے اور تھیلے چڑھانے کے بعد انہیں کھانا نہ جائے۔

UrduPhoto.com

بابا کے سہون شریف پہنچنے کے اگلے روز یہ لوگ بھی پہنچ گئے۔ شاہ صاحب نے چھوٹے سہون مشہور الرحمن ایک دھنپہ لازم اور سرتا پا کالے حباب میں اوپی ہوئی ایک خاتون بھی لائے کے مراوغی۔ خاں نے یہ مومن جان تھی۔ جب یہ پاچیس افران بابے کے گیسٹ ہاؤس کے گھر کے میں داخل ہوئے تو اک باکرہ سرائی ہی ہر گویا ان کے جلو میں تھی۔ بابے کو مرض اور اس کی نوعیت کو سمجھنے میں عرصہ بھر بھی وقت نہ ہوا۔ شاہ صاحب کی ظاہری دماغی حالت ان کے چہرے سے عکس تھی۔ ذعا سلام کے بعد ہاتھ پھوسا اور دیکھ کر عقیدہ مندانہ حرکات کرنے کی کوشش کی جو بیچوں سے طاقت پہ عقیدہ مند یا غریبہ میں سے سرزد ہوتی ہے۔ بابا نے مناسب ہی ٹہرا کش کرتے ہوئے کہا۔

”یہ گھر اور یہ وقت ایسی خصوصیات کے لئے نہیں اور نہ ہی میں انہم ہی ہوں۔ آپ ہمارے رچیں اور مجھے بھی بندہ ہی رہے ہیں۔ جس مقصد کے لئے آئے ہیں اسے حاصل کرنے کے لئے میرے ساتھ تعاون کریں۔“

بابا نے خاتون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ مجھے بتائے بغیر اس بی بی کو ساتھ لائے ہیں۔ اگر ان کا ساتھ آنا گزیر تھا تو مجھے احسان نہ

”جواب یہ: ”موت تھا۔“

”اب بابا راجہ راست خاتون سے مخاطب ہوئے۔

”خاتون! آپ کا مریض سے کیا رشتہ ہے؟“

”موت نے فی الفور ملی جلی اردو انگریزی میں بڑی شائستگی سے جواب دیا۔

”ابا! نہیں ان کی ہونے والی بیوی ہوں اور کوئی بیوا یا نکاح“ اس وقت تک سراج نام نہیں پاتا جب

”موت نے موقع پر موجودہ ہوں۔“

”موت کی یہ بات اک گریڈ کی مانند پھٹی ہر کوئی اس کا مزہ دیکھنے لگا۔

بابا باری باری سب کی جانب حیرانگی سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”آپ لوگوں کا مقصد علاج ہے یا آپ شادی نکاح کر کے آئے ہیں۔“

”موت نے پھر جھٹکتے گفتاری۔

”ابا! کھانے سے پہلے ہاتھ دھوئے اور نماز سے پہلے نیت۔۔۔ اس لئے بھی ضروری ہے کہ طعام

موت نے خود تمام کی برکات سے مستفید ہوا جاتے۔ آپ کے قہقہوں میں موت نے کا مسکراتے ہوئے کئی باتوں کا

UrduPhoto.com

”ابا! چنانچہ اس سے لئے موت جان کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے بولے۔

”موت نے کھانے سے ابھرا پیدا ہوتا ہے۔ اپنا مافی الخمر بیان کرنے میں اکتفا اور آسانی سے کام

لی گشت کا احسن طریقہ ہے۔“

اس سے پیشتر کہ موت اپنی بات مکمل کر لی۔ شاہ صاحب نے کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔ بابا بولے

”ابا! مر رہے ہوئے کہا۔

”آپ فرمائیے کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ خیالی رہے کہ نماز کا وقت بھی ہوا چاہتا ہے۔ لہذا افسوس

”موت۔“

”ابا! اسی خاتون نے جو کچھ کہا ہے وہ درست ہے۔ یہ خاتون آپ سے اس کے علاوہ بھی بہت

کچھ کہتی ہے۔ میں خاموش رہتا اگر انہوں نے یہ نہ کہا ہوتا کہ میں ان کی ہونے والی بیوی ہوں۔ ہاتھ

موت نے پہلے ہی جمل بھن رہے ہیں۔ اب ان کی اس بات نے میرے دماغ کے اندر کی اک جھنجھٹ دبا دیا

”اب میں آپ کے کردار و اعتراف کو ناچاہتا ہوں کہ میں ان کا قرآن پاک کا اور اپنے ضمیر کا جرم

میں انسان سے ایک جنسی بھیل یا بن گیا ہوا تھا۔ میں اپنی دانست میں سمجھتا تھا کہ پورے سے آنے

والی گوریاں ہمیں آہ و بابت ہوتی ہیں انہیں جس گاجا اور پاؤں کے عوض عیاشی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح بے شمار ملکی اور غیر ملکی عورتوں کو ہم اوہاٹوں نے مشیات کے عوض ہلکے میل کیا۔ یہ سب بھی بد قسمتی سے میرے بچھائے ہوئے دام میں پھنس گئی۔ یہ دام میں نے ایک چٹخ کو قبول کرتے ہوئے بڑی پلانگ سے بچھایا تھا۔ اس خاتون کے شکر درخت چٹے ہی ہم اوہاٹوں میں اک غلطہ سا جگایا تھا۔ سیاہ حجاب میں تھی کسی نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ یہ نو مسلم ہے۔ اس کے باوجود خوں بصورتی کی باتیں ہونے لگیں۔ ہمارے لئے اس کا حجاب اور نو مسلم ہونا اس لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ کما کثر یہاں خٹنے والی یہاں عورتوں کی دیکھا دیکھی بطور فیشن حجاب اوڑھ لیتی ہیں اور اکثر اسلام بھی قبول کر لیتی ہیں کہ انہیں یہاں سبوتیں اور بد رویاں حاصل ہوں۔ ہم نے بہت سی ایسی برائے نام مسلمانوں کا حجاب والی میوں کو مشیات کا مادی دیکھا۔ اسی روشی میں ہم سب نے اپنے اپنے طریقے استعمال کرنا شروع کر دیے۔ لیکن طرح کا مقابلہ شروع ہو گیا کہ کون 'السورما' سے پھنسا گیا ہے۔ ایک روز گئے کہ کاندھ سے کلاں لٹی کہ یہ خٹنے والی غار میں خٹنے والی ہے۔ میں اس کے پیچھے سے پیچھے ہاں کمر کے ساتھ پہنچی اور غار کے اندر ایسے کاموں کے لئے منتظر کیا۔ اس کا انتظار کرتے ہوئے ایک کہ یہ خود غار میں بیٹے پہنے ہوئے ہیں اس پہننے کے لئے پہننے کوئی طاقت اسے اس کے کمر پر سے ہاتھ پہنچ گئی تھی۔ بہتے خٹنے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہوئے ایک چلنے پھرنے کو روک کر اچانک سامنے پھٹی کیا اسے گرنے سے بچا دیا۔ پھر اسے اپنی کچھی جی ہاتوں میں اٹھا کر یقین دلاؤ کہ میری ہالی ہے۔ ارد گرد کا علاقہ دیکھنے کے بعد وہاں ایک مسجد کا دروازہ کھلنے کے لئے یہاں سے بات چیت کے دوران جب ذرا اجنبیت دور ہوئی تو میں نے آزار و خاطر داری کرنا کرم کافی بڑی ایک ایسی وہاں تھی جو انسان کے ہاتھی نظام کو بگڑانے کے لئے بے حس کر دیتی ہے مگر دیکھنے کے لئے سمجھنے کی صلاحیت کو متاثر نہیں کرتی۔ کافی پیٹنے کے چند لمحوں بعد جب یہ بے بس ہو گئی تو میں نے اسے اس کے کہنے سے آزار دیا۔ یہ چٹختی چٹاتی احتجاج کرتی رہی مگر میں نے کسی ان سنی کرتے ہوئے اسے بھی اتار دیا۔ جب اس نے محسوس کیا وہ کافی میں شامل کسی دوا کے ذریعے اسے بے حس کر دی گئی ہے تو اس کی یہ ظاہر کوئی صورت بھی نہیں تو اس نے بڑے دکھ بھرے لہجہ میں اپنے گلے میں پات قرآنی تمویذ کرنے کی درخواست کی۔ میرے سر پہ خٹائیں سوا کرتا تھا۔ شہوت اور شیطنت نے کچھ خوب چٹنے سمجھنے کی قسم کھنکھ کر دی ہوئی تھی آگے ٹھٹھ کر میں نے اک جھٹکے سے تمویذ اتار پھینکا۔ بس اس میں سے

داستان بریادی کی شروع اور اخیر ہوتی ہے....."

تاکہ ٹھکنے کے بعد اس نے اپنے سر کا "شاہ" یوں نیچے لڑکھا دیا جیسے اپنی ہی غلط چال میں پھنسا ہوا ہے۔ دوسرے پا کر خود ہی اپنا بادشاہ ہساط پر گر ادیتا ہے۔ میں چند اچھلتے سے لمبے اسے ٹھوکر مارا۔

اس کے لوگوں کے لئے ساتھ والے دو کمرے مناسب سی سہولتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ آپ وہاں پہلے کمرے میں یہ خاتون اور یہ ملازم سچے ٹھہریں دوسرے میں آپ حضرات اضطررت اور کمرے میں آپ کو اپنے کمروں میں میسر ہوگی۔ اشد ضرورت کے بغیر آپ لوگ اپنے کمروں سے باہر نہیں گئے۔ مریض کی چٹیاں بند بھی رہیں اور باقی سب کچھ اگلی ملاقات پر۔"

میرے جان بوجھ سے کچھ روز پہلے کتاب کے حوالے سے کئی بار رابطہ کر چکی تھی لیکن اس نے کبھی بھی جواب نہیں دیا۔ وہ کتاب کے مقدّمات پر انارکلی، سائمنز اور تصوف پس منظر میں ایک خوب کرتی رہتی۔ ایک الگ سی خاص چیز جو میں نے اس کی گفتگو سے اٹھنے کی تھی وہ فطرت اور اس کے زیادہ دلچسپی اور تجسس تھا۔ وہ بھی علوم کی حامل بھی دکھائی دی۔ انسانی چھٹی زبانوں پر غور خودی، خود شناسی، صرف نظر کی بے پناہ قوت و طاقت سے آشفتگی تھی۔ میرے مرشد نے کہا کہ یہ کتاب اس کے لئے خودی کی کتاب ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی اپنی تصوف کے ساتھ ساتھ ان کی تجسس ظہری۔ یہ ذرا نیکو پ بھی اپنے آپ و آفاقیت میں بڑا لگتا تھا۔

میرے ارشد کی معروف شادی کی داستان شہادت و نہایت سن کر یہ کہوں گا کہ وہ اب تو میرے کوئی نجب یا چاٹھل نہ سمجھتی تھیں۔ میرے سب کچھ میرے اپنے اندر رکھ رکھاؤ میں تھا۔ یہ عام کچھ نہیں تھا۔ میں ایسی ہی مقدمہ ہوتی ہیں جو بالآخر خوش الحانی پہنچتی ہیں اور کئی سہولتوں کے اختتام میں اپنے اپنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اکثر دیکھا کہ اسم اللہ کے نطق و مذاہن و جسم کے اور پھیلی کے نطق و مذاہن کے۔ وہی کہ اچھے بڑے کسی فعل کا رائل توقع کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ جو مقدمہ مقدمہ سے

میرے جان کا ملا کہا۔ میں ان کی اونے والی زبانی میں وقت کا امر تھا۔ آگے نکھولتے سورج کے لئے اس کی پکپکاتے چڑیا کے چپے چپاتی ہے جس کی ماں صبح دم اس کی حضرتی ہوئی بھوک مٹانے کے لئے کہ وہ گریہ و جھونے کی عمارت میں تھی۔ آج آپ یہ یوں بہہ کرے والی مرغالی پانی میں اندھے نہیں رہتی۔ میری سمجھ میں "سومنہ" کا یہ فیصلہ پوری طرح بیٹھنا تھا۔ ہاتھ کی پٹیاں لٹھنے سے لے کر اس بندھن کا ٹوٹا کر اس کی اچھٹ سی آتما کو آگ و حار سے دے دی تھی۔ میرے ارشد

سب کچھ ہو جائے گی۔ یہ تصور ہی ان کے لئے سوبانِ رُوح ہوتا ہے۔ تن کوری ناری کا ایک اور المیہ یہ ہے کہ کبھی حکیم ذاکٹر ذریٰ چوڑیاں چڑھانے والے کے قریب بھی نہیں پہنچتی کہ وہ اپنے جسم یا کسی عضو کے لئے جھوٹا پسند نہیں کرتی۔ لیکن مقامِ حیرت ہے کہیں کسی مقام پر وہ کبھی ایک ایسا فیصلہ بھی کر لیتی ہے کہ اصل اور ضد پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اس طرح نت نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ آگے سے جتنی بات زیرِ غور رہے کہ ”تن کوری“ کوئی ذاتِ گوت نہیں ہے۔ یہ ایسی ہی ہے جیسے کوئی جنم کی نگاہ سے مری ہوئی ہے۔ تاہم اس کے مسائل، خصائص، ذرا مختلف اور انتہائی حساس قسم کے ہوتے ہیں۔

— ہاں ایک جاننے والے ایسا ہی ایک نیرِ حاسنہ لے کر آئے۔ ان کی ایک عزیزہ جوانمہائی نے ایک ایسے ہی سنگٹ میں پھنسی ہوئی تھی۔ انکوئی اولاد۔ اسی لئے سر پر بھی بلکہ تک چڑھی بھی تھی۔ بعد کر دکھا تھا۔ پرائیویٹ لی اے کرنے کے بعد گھر میں جاری چین کی جھڑکی بھاری کر کے اس کا قلم سنبھالتی ماں باپ کی خدمت میں آکر بیٹھ کر کہنے لگی تھی کہ ”میں نے یہ ہے کہ جبراً اور غوراً کر کے اس کو رہنے دے گا۔ جو ان کواری لیا میں سانس کی اور وہ جو خوش بھالی تھی، پھر شامت اعمالی لڑکی اپنے کس کے عارضہ میں مبتلا ہو کر جان بہا رہی تھی۔ آپریشن میں لے کر جاتی تو کبھی کبھار پناہ حال تھا۔ یہ وقت علاجِ معالجہ سے لڑکی کی کئی اور چند ہی روز میں یہ ظاہر ہوا کہ اس کی زندگی بسر کرنے کی سببوں میں کچھ بچاؤ نہیں رہا ہے۔ وہ مزید خطرناک حد تک بیمار ہو گئی۔ لڑکی کی کیا کئی دماغ میں کہیں شادی کی نازی ابھر آئی۔ کہاں پہلے شادی کے نام پر کات ہے۔ اب یہ عالم کہ شادی منہ سے مانگے۔ گھر والے خوش چلو پلٹی نازی کا کن بستر ہی ہوا کہ وہ نہ دھو نہ نہ کا قصد کیا تو صاحبزادی نے آنکھ دکھائی کہ باؤلی اترے چاند کا آسمان پر۔ تاہم پتہ بتا کر اپنی طرف سے کام آسان کر دیا۔ والدین اس کا منہ تھپتے رہ گئے۔ لڑکی نے یہ کہہ دی شادی ہوگی تو بیسویں اور نہ ساری زندگی گھر بیٹھی رہے گی۔ لڑکی کا خواہر یا گھٹا تین مہینے تک بچہ کر مال گئے۔ چچان کو باریا بڑ کا اتا پتا بھی کر دیا گیا۔ تھکے بارے میں جان کر گئے۔ یہ وہی ذاکٹر صاحب تھے جنہوں نے اپنے کس کا آپریشن کیا تھا۔ بال بچہ ہی سانس لے رہا تھا۔ لڑکی کے باپ۔ بیٹی کو بستر اسبھا یا کوچہ کوچہ عمر کا فرق اور یہ کہ ان کی بیٹی اس سے بڑی تھی۔ لڑکی نے جو اپنے جسم کو چھونے والے کے علاوہ کسی کو اپنا لے۔ لڑکی نے ماں باپ کی ہر لُخت پر

یہی جواب دیا۔

”اس نے میرے جسم کو ٹھوس ہے دیکھا ہے محسوس کیا ہے۔ میرا شوہر ہونے کا حق اب صرف اس کا ہے۔ وہ کیا ہے کون ہے کیسا ہے؟ مجھے اس سے کچھ غرض نہیں۔“

ماں باپ نے اس نئی افتاد سے بولکھلا کر کسی ذریعہ سے ڈاکٹر صاحب تک اپنی پریشانی پہنچائی۔ انہوں نے اسے پاگل خانہ پہنچانے کا مشورہ دے کر اپنا پنڈا اٹھڑالیا۔ والدین کی خوب سبکی ہو رہی تھی۔ لے ہسپتال پہنچ کر ڈاکٹر سے ملنے کی کوشش کی۔ ٹیلیفون اور خط و کتابت کا ایک طرف سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ آ کر والدین نے اسے سختی سے گھر میں پابند کر دیا مگر تاکہ الڑکی ایک دن کسی طرح پھر ہسپتال پہنچ گئی۔ پھر آ کر آپریشن تھیسٹر میں ٹھس گئی۔ وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ اس نے فستق اٹھا کر خود کو زخمی کر لیا۔ نیچے میں ڈاکٹر سے اسے وہیں سے پاگل خانے پہنچا دیا۔ اس مفت کی بدنامی سے گھبرا کر وہ کھڑے ہسپتال ہی چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کی کہانی خاصی طویل ہے جس کا یہاں محل نہیں۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ تن کو دہری ماری کون ہوتی ہے۔

سیاہ بھائی نے پشیمانی کے ساتھ ساتھ رام جی کے اوٹھے اور ٹھس کا بھی چر باروں سے درمیان ایک تالاب ہے اس سے گزرا کر دیکھیں ہیں جہاں سے ایسے تالاب کی طرف جاتی ہیں۔ نہیں لے اس تالاب کو اکثر پانی سے خالی ہی دیکھا۔ یقیناً اس میں کبھی پانی رہتا ہوگا اور وہ مکان پارٹیشن کے پہلے کا ہوگا۔ چاروں اطراف مختلف رنگات نما کارخانے تھے۔ یہاں چھوڑیں کا سامان چھڑا ہوا تھا۔ گیند بٹے، بول ٹینس اور فٹ بال وغیرہ۔ ان کے علاوہ کچھ دکانیں تھیں۔ مگر کام کرنے والے نہ تھے۔ مسلمان ہوا کرتے تھے۔ اس سامان تالاب کا پانی بڑا عفاف ہوتا۔ کنول ٹھس کے پھول اور نیم کی نمونے لگے ہوئی بڑی جب بہار دکھایا کرتی تھیں۔ یہاں بہار دیکھ کر عورت اشیاں بھی کرتے تھے۔ ان کے ساتھ زیادہ مرد اور شام سے عورتیں اشیاں کرتیں۔ اس کی وہ شاید پرہیز ہوئی کہ شام کے وقت کارخانوں میں بھی جاتی تھی۔ چاروں داخلی راستوں کے چھاتے مام آمد و رفت کے لئے بند کر دیے جاتے اور عورتیں اور آسانی سے تالاب میں نہاتیں۔ یہیں نہال بنگو آکر تو ایسے کا کارخانہ بڑا مشہور تھا۔ اگر وہاں سے کارخانے کی یہ شاندار چار مندرہ عمارت تھیں تالاب کے کنارے پہنچتی تھی۔ نیچے کی تین منزلوں میں ایک ایک چار مندرہ منزل پر اس کی اپنی رہائش تھی۔ اولاد میں صرف ایک ٹھوس ٹھوس سی جوان بیٹی تھی۔ خوبصورت اور حان پان گرجب تالاب میں اشیاں کے لئے آرتی تو سرتے ہوئے پھول پتے لے لے کرتے۔ چھان بھرے لمبے بالوں کا گھمبیر بادل پائینوں پہ اتر آتا۔ وہ تیرتی کہاتی ہوئی اک بھر

تھیں۔ باپ نہال سنگھ اپنی بیٹی لورہاوی کو محبت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا نہال ہوتا رہتا۔

یہ نہال سنگھ بھی عجیب بوٹی تھا۔ انسانی جسم میں کچھ اعضاء و عضلات ایسے بھی ہیں جو گوشت ہیں اور نہ ہڈی کے ساتھ ہیں۔ یہ بھی کہ وہ زندہ ہیں نہ مردہ۔ لیکن جسم و جان کا ایک ضروری حصہ ہیں۔ مثلاً یہ ہاں بھی کوئی لکڑی کی چیز تھا جس کے بارے میں قطعی طور پر چکو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ اصل میں ہے کیا؟ اس کا مرشد ان کے ہم جنس و نسب مسلمان تھا۔ برسوں اس کا نگہ موت اپنے ہاتھوں سے اٹھایا تب کہیں مرشد نے اولاد کی بات کہتے ہوئے کہا۔ یہ بچی تیرہ سے بیٹے کی طرح ہوگی اسی سے تیری نسل میں نور اچالا پھولے گا۔ مرشد نے اس سے یہ کہہ دیا کہ ابھی تو تیری نسل کا نام اسی نسبت سے نور ہادی رکھا گیا۔ عجیب سی لڑکی تھیں کوہ سے دلچسپی نہ لیں۔ انہوں نے کوئی نہ کوئی شہت۔ بس جب دیکھو کھیتی پڑھتی دکھائی دیتی یا پھر گھر کے کام کاج۔ دھن دھن کی کوئی کمی نہ تھی لیکن طبیعت میں سادگی اور صدق تھا۔ وہ جوش و خروش سے رہنے کرنے میں سکون ملتا۔

جس نے انہیں بچوں جوں جوں ہوتی تھی ان کی کڑی تکان ہوتی تھی انسانی و زنیائی کی بنا پر اسے آپ پارا کی مانند محسوس کرنا پڑتا تھا۔ بس اک ہی قباحت تھی کہ اسے صاف سمجھا دینے کا وہ لپکا رہتا تھا۔ اس نے ہاتھ نہ دیا۔ پتا چلتا تھا اسے اپنے کا خیر۔ کیا حال جو جسم کہیں سے نہ کا کھلی رہے جائے۔ بس وہ ان کے چھایا ہی تھی۔

UrduPhoto.com

شام ڈھلتے ہی دو بکنی کے کپے سے کی مانند چوڑی کی چادر میں مختلف سی مین اپنے کارخانے کے سامنے کھڑے کھڑے پہنچان کے لئے اتر آتی۔ اس کے تنگ وہ چادر بھائی لڑکیاں بھی ہوتیں جو ارد گرد میں چلیں کہ اس کے لئے کھڑے رہا کرتیں۔ یہ سب بچے تھے جو ان کے لئے مخصوص ہوتا لہذا حتی الوسع مردانہ اس طرف جانے سے اجتناب کرتے۔ اور لڑکے کو ان کی چادر کی کڑیاں ڈروازے بھی دے دیتے۔ لیکن نہال سنگھ کے کارخانے کی پہلی منزل پر ایک کڑی کی برسوں سے بھی پوری بند نہیں تھی۔ اس کے پیچھے وہ بے قرار دیکھ رہے تھے کہ انہیں مین کڑی کے نیچے نور ہادی کو اٹھان کر رہے تھے۔ یہ سب مین چادر پہنچے ہوئے تھے۔ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے انہیں اور نہال کی طرف سے ہنس لڑکیاں کہہ رہے تھیں۔ پانی کے چھپا کے مارتے تھے شام کے آگے ان میں رات کا سایہ پڑتے ہی وہ گھر کے قریب آگے آتی۔

یہ رات جن کے کرفٹ تینوں والا یہ لڑکا شہر کے قریب ایک ذاتی دیہہ پر چڑھ چڑھ کے ایک مغلوک الحال رہتا تھا۔ یہ دیہاتی تھا جیسے دیہاتی ماحول میں پلے بڑھے عام دیہاتی لڑکے کو نہ ملے ہوتے ہیں۔ لڑکا لڑکھ پادوں کا ٹھٹھا ڈھلا۔ مردانہ جڑا اور فٹ بال گراؤنڈ جیسا فراخ تھا جس پر برسوں کے تیل کی

تکارت میں بچری نہی ایک آوارہ سی لت چری رہتی تھی۔ چونے گنے کی آدھی گنڈیری کی مانند موٹے سرے
 زبیلے ہوئے ساندھی گردن تلے جھکاویں پر گوشت شانے ساتھ ہی بیٹے کا سحر جس میں جا بجا کہیں
 بالوں کی جھانریاں۔ جو یہ پتہ دیں کہ پریم پر کھا ہر سے کچھ زیادہ سے نہیں جیتا۔

اس کا نام نور علی تھا لیکن اسے سب نور کہتے تھے۔ دیہاتی باپ نے اپنی پینڈ و قتل و آکھ سے
 کے ماتھے اور دھو کاٹھے کو دیکھتے ہوئے اسے شہر بھیج دیا کہ بھتی باڑی اور گاؤں کا ماحول اسے اس شہر
 وہ اس فوج میں بھرتی کروانا چاہتا تھا۔ سیالکوٹ چھاوٹی بھرتی کے لئے پہنچا بھی اپنے ذیل ذیل اور قلعہ
 کی رعایت سے منتخب بھی ہو گیا لیکن میڈیکل ٹیسٹ سے بھگور ہو گیا۔ ہندو اکثر نے اسے کپڑے اتارنے سے
 لئے کہا۔ اس نے کڑیا اتار دیا۔ ڈاکٹر نے شہوار بھی طہرہ کرنے کا حکم دیا کہ فوج میں بھرتی ہونے کے لئے
 مکمل معائنہ ضروری ہے۔ اس نے پورے پورے پورے جسم کی گلیوں سے ڈاکٹر اور فوج کو ٹوڑتے ہوئے
 پہن کر وہاں سے نکل آیا مناسب سمجھا۔

سیالکوٹ ایک صنعتی شہر ہے اور محنت کرنے والوں اور مجتہدوں کے لئے روزگار کی گنجائش
 نہیں۔ گریجویٹ کے تمام ماحول دیہاتوں کے اکثر لوگوں کا پرید معاش میں سیالکوٹ آکر رہی ہے۔
 کاروبار ہے۔ ان کے لئے یہاں ایک بڑا بازار ہے۔ یہاں ایک بڑا بازار ہے۔ یہاں ایک بڑا بازار ہے۔
 اصل پاپ فیس سالی اور کلزی کی چوٹی کی مشینیں وغیرہ۔ یہاں کا ایک قریبی قصبہ گجڑی لوہاں
 مرام خیزی میں بلا آگیا ہے۔ یہاں فن و ہنر میں یکساں روزگار اور تاریخ ساز کارہی ہوئے کہ جنوں
 الجھتہ رنگ میں بین الاقوامی قدر ماحول کی۔

نورے کے گاؤں کے کی نو جوان یہاں کی فیکٹریوں کا رخاؤں میں کام کرتے تھے۔ اس کے
 طبیعت کو جاننے والے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ سیالکوٹ میں صرف ایک ہی ایسا کارخانہ ہے جس
 برداشت کر سکتا ہے لہذا اگر تم چاہو تو میں تمہیں وہاں لے جا سکتا ہوں۔ جب اسے پتہ چلا کہ یہ
 کارخانہ ہے تو وہ بھڑک اٹھا کہ میرے لئے یہی کافروں کا کارخانہ دیا ہے۔ اس کے دوست نے کوئی
 دینے کی بجائے اس کا ہاتھ پکڑ کر اگر ایلوں کے کارخانے رام سٹائی لے گیا۔ گرمیوں کے دن تھے
 سبیاں آچھا اور ہاتھ پٹنے پانی میں پاؤں دکانے کا اب کی بیڑیوں پہ بیٹھا تھا۔ جھانریاں اٹھتے
 کیس۔ تو اندھلی ہوئی بربہ جانکوں میں سا کھائی دے رہا تھا۔ اس کی ایسی حالت دیکھ کر نورے کی مٹی
 گئی اور ایسی آواز لگی جیسے بدبشمی کی صورت میں کسی کے شکم سے خارج ہوتی ہے۔ نہالے نے پٹ کسے
 یہ دونوں پینڈ و اپنی مٹی ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نہالا بڑے غضب سے انہیں گھورتا رہا۔

ہوئے غبارے کی مانند پھنسا۔

”اُوئے تم دونوں مجھ پہ مِس رہے ہو؟“

”اُوئے کے دوست کو جاننا تھا وہ بہت عرصہ اس کے ہاں کام کر چکا تھا۔

”وہ نے حمید یا انٹوں شکر و دیپہری کھنوں چپک پیاں ایں۔ تے اے کھوتا ہوا یا ترے ہال کھلوتا

بہت سیدے نے اس کا نام ٹورا بتایا تو نہالا ایک اور سچے ہی پانی میں اتر گیا وہیں ایک ڈبھی لے کر باہر

گیا یا پانی کی مشک جیسے جسم سے پانی صاف کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”کیا کرتے ہو.....؟“

”نور نے جواب دیا۔“ کچھ کرتے کے لئے ہی یہاں آیا ہوں۔“

”اور پھر نور نے جو کچھ کر دیا۔“ وہ کوئی نور والا ہی کر سکتا ہے۔ اس نے تجوزے ہی عرصہ میں

سب سے اچھا چمک بانی تھی۔ یہاں ہونے والے مارے کاموں کا وہ ہر شاہنشاہ تھا۔ بہت عرصہ ہی کی ضرورت

تھی۔ لیکن اصل بات تو یہ تھی کہ وہ نہالا کے سکون کو جس حد تک پہنچا دیتا تھا۔

”اس نے مجھے دیکھا کہ اس کے پاس اس کی زبانوں کی مانند چمک رہی تھیں۔

”نور نے اسے اچھی خبر دینا چاہی تھی لیکن اس اچھی تھنے میں اس کا ہم نام ہونا نہالا کی جگہ پر ہونا

بہت ہی اچھا تھا اور اپنی صحبت کی حد وہ میں رہتا ہی اصل وجہ تھی۔ دل و نگاہ کی کئی مثالیں تھیں۔ ایسی

تھا کہ بہت محض حسیات کی انتہا پہنچتی ہے۔ یہ وہ تھا کہ اس نے نہالا کی صحبت میں کی لیکن اس کے باوجود اس نے

بہت ہی اچھی خبر دینا تھا۔ پھر دیکھی دھمکائی۔ بننے کی عادت نے اسے ایک بڑا سراہا کرتی بنا دیا تھا

”نور نے اس کے لئے ہزاروں سے ضرورت کی اشیاء بھی لاتا اس کے ساتھ نور نے دوا لے اور کافی بھی جاتا

تھا۔ لیکن نور نے وہ ہوتا۔ غیر ضروری بات اور سوال، جواب کرنے کی اس کی عادت بھی نہیں تھی

”نور نے وہ سب پایا اور نہالا نے یہاں نے اپنے ہاں شاگرد کو لیا تو اسے صرف ایک ہی نصیحت کی

”نور نے! پیارا تھا ماہ اور سیر میں بھی اٹھتی تے مارنا سونا بن جاوے اور کبھی تم نے ان چیزوں میں

”نور نے! آؤ پھیل پھری کی قیمت کے بھی نہیں رہو گے۔“ بیٹے یا بچے برسوں کی محنت خدمت اور اجازت سے

”نور نے! صحت کر دیا تھا کہ وہ ان اکھروں کی کسوٹی پہ کھڑا آتا ہے۔ وہی کہ نہ وہ ہو جاتا ہے جو کسی کے دل میں

”نور نے! اور مردہ اسے کہتے ہیں جو کسی کے دل سے اتر جاتا ہے۔ نور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ“ میں“ اور

"سے" کے حجاب میں زندگی اور موت کن اور کیسے کیسے معنوں میں اپنے ہر ت کھوتی ہے۔ جب بیمار اختیار ہو یہاں کی صلاحتی اپنے نکتہ عروج پہ پہنچ جاتی ہے تو پھر مقابل اپنی ذات کا پرتو تو ہیں جاتا ہے۔ اور نئی نئی بات بات ارحمن ورحیم بہت اور دو جاتے ہیں۔ انہاے یہاں نے سارا کارخانہ اس کے حوالے کر دیا ہوا تھا۔

وقت کا چکھنا چاہتا ہوا تو آہستہ آہستہ دکھائی دیتا ہے مگر اکثر و بیشتر برقی رفتار خرگوش سے بہت بے منزل پہنچ جاتا ہے۔ وقت کا ٹکڑا بھی ہوتا ہے اور اجر بھی اور سبھی وقت بھی صبر اور جبر بھی ہوتا ہے۔

مقدور اور وقت آپس میں لگے جوڑ بھی کر لیتے ہیں یا یونہی پاؤں پانسہ نہیں صبرِ بھر کے ایسے خانے میں پڑ جاتا۔
 جو کہ گزر و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ یہاں بھی جس یوں ہی کچھ سرزد ہو گیا۔ فوراً باوی اپنی سکھویوں سے

گھر کے سامنے تالاب کی سرحدوں پہ اٹھان کر رہی تھی جو چکر آیا تو لہا کر پانی میں گھر

وہ چھٹی کی مانند چھلکتی رہی اور اپنی کھانسی۔۔۔ اور ابھی۔۔۔ نوراً حسب معمول کھڑی کی اور کھڑا یہ سب پتھر کے راقعہ آؤں کے ساتھ ساتھ کھڑی کھڑی آؤں سے ہی آؤں جیسے لگ جو لگا کی جائے تو اس کے منہ میں آؤں کے

UrduPhoto.com

پھلی لاپرواہی سے اور سچ چٹواؤں کے سچ نہراٹھا۔ بعض میں لٹی کی مانند دے رہے ہو۔ آقا خانہ اور

نچو کوڑا۔ نور سے نور ہو کر نور بن گیا اور رکشا تھا جسے جیل کو ڈھار کے بعد گھڑے پا لیا۔

پانی خارج کر دیتے ہیں اور وہی کی ہڈی کن بھی کشید ہوتی ہے۔ اس دوران شاید کوئی ڈاکٹر کو بھی

کوئی چور نہ تھے ہاتھوں قابو میں آ گیا ہوا اور وہ اس کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ بلکہ اس طرح اس نے

تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ اپنے گھر واپس آئے۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ اس لڑکی کی عمر تقریباً پندرہ سال تھی۔ اس لڑکی کے نام سے وہ ایک لڑکی کو جنم دے گا۔ اس لڑکی کے نام سے وہ ایک لڑکی کو جنم دے گا۔

لورے نے کچھ سکوت چڑتے ہوئے بڑے آرام سے فور باؤی کو نیچے وری پہ لگا دیا۔ نہالا سیہا

صاحب کے منہ سے یہ سادہ سی نکلتی ہوئی کراہیں۔۔۔ گلتا تھا میں گمراہیوں جہان میں کے بیچ خود ایک انجام
 پہنچا تھا امی ہوں۔۔۔ میں گندہ پنیاں سمیٹ رہا تھا کہ مومن اسلام تکمیل پہنچتی ہوئی اندر داخل ہوئی
 صاحب آ رہا ہوا اور چہرہ ٹکنا دسا۔۔۔ آتے ہی معذرت خواہانہ لہجہ میں کہنے لگی۔

”اُمّی! خدا کے لئے اب مجھے اندر جانے کا نہ کہنے دو۔۔۔ میں ایسی بھی کمزور نہیں جتنا آپ مجھے
 سمجھتے ہیں۔۔۔ ان کی بیوی کے علاوہ ایک انسان ہونے کے ناطے بھی میرا فرض بنتا ہے کہ میں کم از کم آپ کا ہاتھ

اس دوران مشہود الرحمن بھی پہنچی گیا جس نے آتے ہی بڑے بھائی کو پیچھے سے اپنے حصار میں لے
 لیا۔ وہ کڑی جہم فروغ کرب سے تھر تھرا کر رہا اور پیشانی ضبط و برداشت سے عرق آلود تھی۔ یہ دیکھ کر
 صاحب نے انگوٹھوں میں آنسو بھر آئے وہ آگے بڑھا کہ مشہود الرحمن کی جگہ آگے نہ بڑھتی ہوئی اور شاہ صاحب کا سر تمام
 اسی جگہ کا پسینہ صاف کرنے لگی۔ میں نگاہ اوجھڑاٹھائے بغیر خوب دیکھا کہ شاہ صاحب کے چہرے پر
 کتنے کتنے لہجے کا اظہار ایسا اُجالا جو نا آسودہ زندگی کی ہر ایک تنگناؤں کو ”امیدِ فصل بہار“ کے منور کر دیتا ہے۔

UrduPhoto.com

رنگین تہ کرکٹ پر فخر تو اتنی راہ پر گیا۔۔۔ اصل بات تو اس اور ویش سمراتی پھیلان اُمّی کے درجہ
 پر تھی جس کی سادہ سی مہلت دیکھ کر میرا دل رمل گیا تھا۔

جب کہ روز تک صبح بے حال رہا تو سلیمان اُمّی کے اصرار سے منے کا مشورہ دیتے کہ۔
 ”مجھے نے اور ویش بھائی! اُمّی تو روکشی کی کہانی میں گرے نہیں۔۔۔ اوپر کنارے پر ہی ہاتھ لگا کر
 نیچے گرو گئے تو بازو نہ تھیں بھی تو دھیمو گئے۔ اب تم مصر کی بابہ عزم سفر کرو۔
 میں کے راستے سکھو۔ یہ پانچو دہائے میں آپ نیل سے ہاتھ باز دوس کو دھرتے اُڑتے رہو
 ہاتھوں کو، ہیں تسکین ملے گی۔“ پھر نہ راہ مجھے ٹھہرتے ہوئے گویا ہوا۔

تو یہی دھم دھم سے بل بھن رہا ہوا اس کی سوز بھن سے چھوٹے واسے ہاتھ ایسی آسانی سے
 چھوٹے پاتے۔۔۔ اور چہرہ ابھی ایک ڈرویش دیکھنے کا۔۔۔

”ڈرویش دیکھیے۔۔۔“ میں منہ میں بازو لیا۔ ”سپاہر جن دیکھیے اُمّی اور ویش ہوتے ہیں۔۔۔“
 ”ہاں یہی تو ڈرویش ہوتے ہیں۔ ان کی کارکردگی بھی غور سے ملاحظہ کی ہے! مجھے آگے اوپر

”تھینک یو جنٹلمین سر جی۔“

ایک بار پھر سر جھکا کر بولا۔

”آئی ایم یور سر وینٹ۔“

مجھے اس کے اس انداز و عنائی سے قطعی کوئی تعجب نہیں ہوا تھا بلکہ یہ یقین ہو گیا کہ یہ کوئی میرا بھی
کس سے جیسا یہ مجھے کسی نہ کسی مقدار میں چونا لگانے کا۔ کبھی کبھی تو میں جان بوجھ کر بھی چونا لگوا لیتا ہوں کہ
مجھے اس کچھ نہ کچھ واپس لوٹا دینا چاہئے۔

خیر! چند لمحے اس کے چہرے پر نگاہیں لگانے کے بعد میں نے اس سے کہا۔

”تم نے شاید مجھے غلطی سے جنٹلمین کہہ دیا ہے کیونکہ چند ساتھیوں پہلے میں تمہاری نظر میں جیل سے

بھاگ کر پناہ اور چوراہا چکا تھا۔“

وہ بڑے بڑے اور گندے دانتوں کی لہرائش کرتے ہوئے کھل کھلا کر قہقہہ لگا کر میرے کندھے پر اپنا

بھدرا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”جنٹلمین! ابھی اب تک میری نظر تم پر اتنی تھی۔“

پھر وہ کچھ دیر کے بعد میں نے اس کے پاس سر پہنچا کر پتہ چلا کہ اس کی زبان پر کتنی باتیں

تھیں۔ تم سے مخاطب ہونے کی جرأت کر مینا۔ اب وہی بات جیل اور پورا پچھانے کی۔ تو میں نے

کے روبرو سے نہیں اٹھای اور اکیلے پن کے حصار سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔ تم نے دیکھا کہ میں اپنی کوشش

کیا کر رہا۔“

اب وہ اپنی قبیلی و صحابی سی مہار کی جیب ٹٹولنے لگا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ مزید سرگرم

ہو رہا تھا۔ میں فوراً بول اٹھا۔

”میں گھنیا تمہا کوئی نو اور گندے دانتوں پر منہ رکھنے سے بچنے کے لئے کہہ چکے ہوئے قول سے الگ

سیا کہہ کر میں نے ٹوک سیک اٹھایا اور عرض کی دوسری جانب بڑھ گیا۔

یہاں جیل کا پاتہ کچھ ایسا لمبا چوڑا تھا۔ دوسرے کنارے کے زور و زور تک نظر جاتی تھی۔ چھوٹی بڑی

کھڑکیاں، منہروں کا اک جمہ بازار لگا ہوا تھا۔ اصل میں میں اس حروف کے بنے ہوئے خزانے سے

کچھ نہ چاہ رہا تھا۔ اسی کوشش میں میں دریا کی کنارے میں سنبھک ہو گیا۔ جہاز ابھی اپنی حصول کی رفتار

پر تھا اور نہ ہی ابھی بندرگاہ کی حدود سے باہر نکالنے والے رہبر لک نے سے آ کر لگا گیا تھا۔ سینوں اور

تخصیص اشاروں والے مسلوں کے تبادلوں نے غریب سماں باندھا ہوا تھا۔ اسی دیکھا دیکھی میں مٹی میں شام کی
 فطی مہری کو فراموش کر چکا تھا اور ایک معصوم بچے کی طرح جس نے پہلی بار یہ سب کچھ دیکھا ہو میں بھی
 دیکھنے اور محسوس کرنے میں مگن تھا کہ وہ بکا رہا ہے احنائی سے پھر میرے قریب آگیا۔ اب وہی کہ خوشیوں
 کا میانیوں کی کوئی سرحد نہیں نہ کہیں واقع ہوتی ہے مگر ذرا کچھ اور سہجہش ہے کنار ہوتی ہیں۔ عقل کہیں نہ کہیں
 نیکی لے لیتی ہے لیکن حق کا کوئی انت نہیں ہوتا۔ اسی طرح گفتگو کی کوئی حد ہوتی ہے مگر کواں و بحث کی کوئی
 اخیر نہیں ہوتی۔

دنیا جہاں کی کھے مٹی چالے ہوئے کھوپل جہاں نور کہتے ہیں۔ موت کے فرشتے سے چار
 چھڑائی جا سکتی ہے مگر گائیڈ سے نہیں۔ وہ کسی نہ کسی حیلے بہانے کو تو ویلے آپ سے کچھ نہ کچھ ہوا رہی۔
 بنیاد اور دور اندیش قسم کے نو بہت اپنے کاغذ کے آزار و عذاب سے بچنے کی خاطر خواہ حق خدا
 اسی شرط پر پیش کرتے ہیں کہ وہ ساتھ چلے مگر اپنی چرب اور گندب سے آلودہ ذرا نہ بان و انتوں کے
 رکھے۔

کتاب و لے ب کے قیاس سے تعلق رکھنے والے ایک تہی پیش و مٹی کا خط وکیل اور اشاروں
 وغیرہ کو میں نے دیکھا ہے۔ ان کے پاس ایک اور قسم کا خط وکیل بھی ہے۔ وہ ایک ایسا
 چمکتا نہیں دیکھا۔ یقین فرمائیں ان میں اکثر انجمن چل اور دیکھ رہی ہوتے ہیں انہیں اسے فکا کی بھی نہیں
 نہیں ہوتی۔ ان کے چمکتے اگر کچھ ہوتا ہے تو وہ عزا و عذاب اور فراموشی سے بچاؤ۔ ان کے پاس
 ہی ان وہ علم ہمیشہ سے اٹھا ہوا ہے۔ گائیڈ کا کچھ بھی تو معلوم ہے کہ یہ حضرت فرما میں مصر کے
 کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے ان کا بھوپڑ اور کوچ ان کی دھانی بہن ہوتی تھی
 تمام اہم امور مسجدوں و دیوبندوں اور مسجدوں کے بنیادی نقشے ان کے دماغوں کی اختراع تھے
 کے تمام عجائب خالوں کے نوادرات کی تاریخ و ترتیب ان کی مشاورت سے تشکیل ہوتی ہے۔
 وہ وہ کہہ لیا ہے غلطی سے اور جھوٹ کو بچانے میں مسند کے اب کے بھی باپ ہوتے ہیں۔ یہ آواز
 دیکھتے ہی اس کے سیاہ و سفید سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ دنیا کی ہر زبان بھی جانتے ہیں جو بھی معقول
 اور منظر شہور پہ نہیں آتی۔

میں ایک بار تاجپوٹن گواں کے قریب وچار بھن پہ مندرشت کر رہا تھا۔ میری طرح اور کچھ
 سے جہاں کرو موجود تھے۔ تاجپوٹن گواں ایک ایسا سہا ہے جہاں دیوار بھن اپنی پوری جلالت و
 اور قد و طوالت کا وسیع مظہر پیش کرتی ہے۔ آمد و رفت کے خاطر خواہ وسائل بھی سہا حوں کے لئے کشش

کرتے ہیں۔ یہیں ایک لکھنا سا گائیڈ میرے ذوالے ہو گیا۔ میری شکل و صورت اور حال خلیے سے اس نے
 جاننا لگا یا تھا کہ میں ایشین ہوں اور میرا تعلق پاکستان یا انڈیا ہے۔ اس نے مجھے مزید ٹٹولنے کی خاطر بڑی
 محنت سے اور پچھلے گت سے سلام کیا پھر انگریزی میں بات بڑھاتے ہوئے اپنی خدمات پیش کیں اب چونکہ میں
 اس کی عمر کی نیت جان گیا تھا اس لئے مکہ بند ٹکے رہا۔ گوگنوں کی طرح اشارے سے میں نے تاثر دیا کہ میں
 گنوں کی نہیں سمجھتا۔ مگر وہ گائیڈ ہی کیا جو ایسی آسانی سے چچا چھوڑ دے۔ میں آگے بڑھا تو وہ پیچھے پیچھے
 بدحواس چلا آ رہا ہے۔ قریب آ کر وہ اب عربی میں اپنا تذکرہ پیش کرنے لگا۔ یہاں بھی میں نے اپنی نااہلی کا
 تذکرہ کیا۔ میں آگے بڑھتا رہا وہ میرے ساتھ ساتھ ترکی فارسی اردی۔ اپنے ترکش کا ہر تیر آزار با تھا کہ کہیں
 تو سمجھ کرے گا۔ مگر ہر بار اس کے پھینکے ہوئے تیر کا زخا اس کی جانب پھیر دیتا تھا کہ میں ان میں سے کوئی
 زبان بھی نہیں جانتا۔ آخر میں آگے بڑھتے ہوئے دوپٹے لٹا دے پٹا کھڑا ہوا یہاں پہلے بہت گہری کھائی
 تھی۔ میں نے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر کھائی میں پھینکا۔ اس فعل سے میں اُسے یہ پیغام دینا چاہتا تھا کہ بندہ
 ان کے لیے بچہ تھوڑا۔ اور میں تمہیں اس پتھر کی طرح کھائی میں ترستا ہوں گا۔ میرے اس فعل سے شاید وہ بھی
 کھانہ نہ کر پکا تھا کہ یہ چٹنی پھنی ہاتھ آئے گی نہیں۔ اس کی بات میں آغوش کھانے کے طور پر اس
 سے کار بھاڑا۔

UrduPhoto.com

”آخر تم کون سی زبان سمجھتے ہو؟“

میں نے اس کی طرف سے اور کلمات پہ لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

”اگر کوئی دہا پڑا تو اس کو کھینچ لو اور اس کا پیچھا کرنا۔“

مجھے ہنسنے کا ہنسنے ہوئے اس نے کہا۔

”چل مداری یہ پیچھا کرنا۔“

اور وہ انگریزیش مداری۔ اس انگریزیش کھولے پیٹے کو سلام کر کے واپس کسی کھڑے جگہ کی تلاش میں

نہیں۔

میں بات کر رہا تھا گائیڈوں و گائیڈوں انشورنس ایجنٹوں کی۔ کبھی کبھار بات ہے کہ گائیڈ سب انہوں

سے کی پیدائش سے بہت پہلے کی باتیں کرتا ہے اور یقین دلاتا ہے کہ وہ من و عنان درست بتا رہا ہے اور وہ

ان کی ضرورت کے مطابق کے بارے میں مفید دیتا ہے اور ان کی رہنمائی میں ان کی مشکلات کو ان سے

پرکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے اور انشورنس ایجنٹ یہ تو پیدائش سے پہلے کی باتوں پہ

بہت بحث کرتا ہے اور زمانہ حال کی بے حالی پہ انگشت اٹھاتا ہے بلکہ اس کا سارا زور موت اور ماحولیات

پہ ہوتا ہے۔ وہ آپ کے انتقال پر محال کے بعد کے زمانے کو آپ اور آپ کے اہل و عیال کے لئے ستمی زمانے سے تعبیر کرتا ہے۔ آپ کے مرنے کے بعد کی خوشحالی کی ایسی تصویر کشی کرتا ہے کہ بیوی بچے باپ کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ چشم تصور سے جب وہ ان لاکھوں روپوں کے ہڈیوں کو دیکھتے ہیں تو ان کی نظروں میں باپ کی چند روزہ زندگی کی اہمیت وہ چند ہو جاتی ہے۔ بیوی خاوند کی خدمت و عارت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں رکھتی۔ بچے باپ کی شفقت کے حصول کے لئے سراپا اولاد بن جاتے ہیں۔ بندہ بچہ راہ انشورنس ایجنٹ کی مساعی جمیل سے مرنے کے بعد کی خوشحالی اور خوشحالی اور آسودہ حالی کی جنت کے مزے اس چند روزہ زندگی میں ہی لوٹنے لگتا ہے۔

مجھے یقین تھا یہ بڑا بک نشہ و بھری بھی ہی قیاس کا کوئی فرو تھا۔ دیوار چین پہ ٹکرانے والے گائیڈ کی طرح یہ بھی مجھ سے انہی ملاقات کھلانے کے ذریعے دکھائی دیتا تھا۔ وہ ایک بار پھر میرے پاس آکر ہوا۔ "چٹلین ایسی ٹکری گرا کر اس نے میری محنت کی پے سکون تالاب میں ہلکی سی لچل پیدا کر دی تھی۔ اب میں نے اس کے کسمسا کر اس کی جاب دیکھا اس نے پھرتی سے ہاتھ اٹھا کر مجھے نہ سکھائی۔ بے کاغذ اور بے جیسے وہ بچہ

UrduPhoto.com

"چٹلین اصول گفتگو یہ کہ ایک سوال کرے تو دوسرا جواب دے۔ تم نے کہا کوئی بچہ اور سولے کے خول والے انگوٹھی بات تو کر دی لیکن میرا کوئی جواب نہ لیا۔ ہاں سے ہٹ کر لہجہ آئے۔ جیسے میں کوئی گندہ کچ اور تھیری آؤنگ سے خود کو بچا لیا ہوں۔ بچوں کا سلی انداز سے جتنا کون جان سکتا ہے۔ میرا مقصد قفس تھاری اُداسی اور اکیلے پن کو اُور کرنا تھا۔ باقی یہ بات کہ تمہیں میرے گھیا تھا کو اور اس کے دانت سے الٹی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے بھی کسی کو اُداسی پریشان نہ دیکھ سکے کی الٹی ہو۔"

اس نے اپنے سٹریٹ کا پکٹ توڑ مزہ کر دیا میں بھیکتے ہوئے کہا۔

"چٹلین ایس اب سٹریٹ نوٹھی نہیں کروں گا۔" پھر اندر کھولتے ہوئے کہنے لگا۔

"میرا انت حاضر ہے اسے اٹھا زچھو لو لیکن خدا را اپنی اُداسی ڈھونڈ کر دیا پھر اس کی بہ بتاؤ۔ ہم سب

جے کہ میں تمہاری اُداسی پریشانی دور کرنے میں چکوتی دن پیش کر سکوں۔"

اس کی ایسی گفتگو اور جاہری شخصیت سے ہٹ کر اس کے باطن کا یہ انکھاسا روپ دیکھ کر مجھے غری

بھی ہوئی اور تعجب بھی۔ پھر یک دم خیال آیا کہ وہ سکتا ہے کہ یہ بھی چھانسنے کا ایک انداز ہو۔ میں نے اسے

خوشی کی تصدیق کے لئے اسے مزید کریدنا چاہا۔

”دیکھو برا اور! ایک تو مجھے اجنبیوں سے بے تکلف ہوئے گا کوئی شوق نہیں۔ دوسرے مجھے کسی کا نڈیا یا کسی کی جی ضرورت نہیں پڑتی کہ میرا پس بڑا ہکا پھکا ہوتا ہے اور میری ایک بڑی عادت کہ کسی شے کو جاننے کے لئے میں حتی الوسع اپنے وسائل استعمال کرتا ہوں۔ قہامت اتفاق کہ مجھے نام پاس کرنے کے لئے کسی کی طلب ہے اور نہ ہی مجھے کوئی نوادہ لوح تعویذ یا تصویر چاہئے۔ میں تو درویشی فقیری کی راہوں کا مستخرج ہوں اور یہاں کسی کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔“

یہی ناودہ طور سے میری باتیں سن رہا ہو گا لیکن رشتہ ہوا ایک خستہ کھردرے پتھر سے اپنے بن مانس کی صورت میں مجھے ہونے ناخنوں کو رگڑ رہا تھا۔ اپنی بات ختم کئے ہوئے چند طویل سے لمبے گزر چکے تھے۔ مگر وہ غصہ بے نیازی سے اپنی رگڑائی والے کام میں لگن تھا لیوں کہ میری بات اس کے نزدیک قابلِ سماعت ہی نہ تھی۔ میں نے جھنجھٹا کر اس کی جانب دیکھا۔ محال کہ کوئی اس کا لپکا لپکا سلیمان افغانی ریت سے دلچسپی کی بات کرتا تھا اور یہ پتھر کے ناخنوں کی۔ کوئی دم دیتا تو اچانک اس نے پوچھا۔

”تم مجھارے ہاتھوں کا کیا حال ہے؟ جھنجھٹیں۔“ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں وہاں کی باتیں کی باتیں کی گئی تھیں۔ اس کی باتیں میں چھپے ہوئے تھے اور میں نے اس کو نہ جاننا تھا۔ یہ ریت کی باتیں سے لڑنے لگے ہیں۔ اپنے ہاتھوں کے بارے میں اس نے اس قدر وہ کیا کہ اسے پتھر کے ہاتھوں کے بارے میں خبر ہو گئی۔ ”میری جانب، تجھے خبر ہو پتھر کے قاتل ہوں۔“

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ جھنجھٹیں۔“

”تم نے میرے ہاتھوں کے بارے میں کیا کہا؟“

”جی ہاں وہاں میں اس نے میری جانب بن دیکھے ترکیب ترکیب جواب دیا۔“

”اگر میں جاننا تو تم سے کیوں پوچھتا۔ تم نے اپنے ہاتھوں کو چھو پیا ہوا ہے۔ اب سہمی جاؤ تو“

”یہ کون جوتہ نہیں؟“ اس نے کہا۔ ”اب کیا ہے تمہارا۔ ہاتھوں کو کوئی آکھڑ رہی ہو گی۔“

”جواب نہ لیں۔ مگر میں مطمئن نہیں ہوا تھا۔ ایک چھینٹی مسوں ہونے کی جیسے ذہن میں ایک غارش“

”یہ کونسی ہوا؟ وہ بیروت والے فندق و گھر کے سلیمان افغانی کے دلچسپوں والی ریت اور قابو کے اس دریائی“

”اس کے خلاف نائیل کے تیسرے درجے کے طوفانے پہ اس عجیب و غریب مصری کے ہاتھ کے پتھر میں پتھر نہ“

”یہ کونسی ضرورت موجود ہے۔ سلیمان افغانی اور اس مصری کے حال خیر میں بھی بے پناہ ممانعت موجود تھی۔“

”جسے صرف ایسا کہ وہ نیپ چا پو تھا اور یہ کھڑکڑ کانٹے والا ہاتھ کا کالڑ۔ اس سے بات نکھوانا مرنے کے“

”مگر پینڈے والے مرجان سے گاڑے شیرے میں ڈوبا ہوا آنولہ نکالنے کی طرح تھا جبکہ اس کی ہاتھوں کی“

سے آزاد کر دیتا ہے۔ شب گیا ہے اس کے اسرار گیا ہیں۔ وقت کیا ہے۔ یہ گزرتا ہے یا کتنا ہے۔ غصہ ہوتا ہے یا غصہ نہ ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ کسی بیش و مشرت کے دلدادہ کے شہستان میں نہیں ہو سکتا۔ یہ تو کوئی شب و روز۔ شب گزریدہ شب زندہ دار ہی جانتا ہوگا۔

ہم دونوں کے درمیان بھی وقت شاید غنچہ کرجم سا گیا تھا۔ عرشے کے آئنی اور چوہا رینگے سے لگے ہم کھڑے کھڑے کھڑے سے گئے تھے۔ آگے دریائے آہستہ سے کروٹ بدلی تھی اور جہاز ہمارا جانب بکے بکے جھکولے لینے لگا تھا۔ سہ پہر کی نرم نرم ہڈی دوائی نے گدگدانا شروع کر دیا تھا۔ جہاز نے تیسری لمبی سیٹیاں بھا کر شاید شہر سے نکل کر کھلے دریا میں اترنے کا اعلان کیا تھا۔ وہ جیسے مہری میند سے گئے ہوئے بڑبڑایا۔

وہ چٹلیں اس کے ہمارا اصل سفر شروع ہو رہا ہے۔ آؤ ہم دونوں مل کر اس سہانے سفر کے کام لیں۔ ایک جام مصری قہوے کا خوش جان کرتے ہیں۔

عرشے کی طعنا گاہ کے اندر دو تین شرفا تا بنے ہوئے تھے۔ ان قہوے کے چوبک سے چائے پانی اپنی اپنی ضرورت پر پانی پانی کر رہے تھے۔ انہوں نے قہوے کو اپنے گونے میں ہر نشستوں پر بیٹھ گئے۔ غلامی کی ڈھنڈلی ہی ایک ہلکی سی تہہ انھی تک ہمارے درمیان مسلط تھی۔ سچ تو ہے کہ ہلکی بھی ٹپکیوں کی آواز میں اس کی ریت اور چھڑ والی پتہ بیچ باتوں پر غور کر رہا تھا۔ کاجیال کی مہر کی ایک ایک بات ویش کی طرح روشن ہوتی تھی۔ سمجھ آئی کہ اس نے اسرار میں کسی کا بیروت والے سلیمان کی سے کوئی نہ کوئی تعلق حاصل ضرور ہے۔ اور ریت نہ رانی اور زخمی ہاتھوں کے حوالوں سے یہ بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ غرق المراسم والے تمام واقعات سے نہ صرف واقف ہے بلکہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں یہاں نیل کے کنارے کس مقصد کے لئے پہنچا ہوں۔

”قہوے کا ایک اور پیالہ لو، چٹلیں!“ اسی نے اپنی نشست سے فٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں اگویہ بہت کچھ ہے پھر بھی میں اس سے تسکین حاصل کر رہا ہوں۔“

”گرم گرم قہوے کا پیالہ میرے سامنے ڈھرتے ہوئے آئے گا۔“

”تسکین اور طمانیت ہمیشہ کتنی سے حاصل ہوتی ہے۔“

”اور شیرینی سے؟“ میں فوراً پوچھ گیا۔

”وقتی اور جزوی تسکین۔۔۔ جو کچھ دیر بعد ملتا ہو جاتی ہے۔ اور فٹ میں کیلپا پن چھوڑ جاتی ہے۔“

سے شادی خون اور حراق صاف کرتی ہیں۔ شیرینی شکر اور شربت قساوت۔ چینیوں جاپانیوں کو دیکھیں وہ
 بے پانی بھی ابال کر پیتے ہیں۔ اور اگر اس ابلتے ہوئے پانی میں چند چٹاں قہوے اور گل سرین کی
 ملا کر جائیں تو یہ مشروب صحت، نضرت اور ہمسائی باطنی صالحیت کے لئے اکسیر ہوتا ہے۔ چنگیسین!“
 میں نظریں گازے اس کے حلق سے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ یہ فشتہ حال سامعہ فی اصل میں کیا چیز
 ہے۔ اب میں نے سوال کی صورت میں ایک اندھا تیر چھوڑا۔

”تم سلیمان آغی کو جانتے ہو.....؟“

وہ اسی پُر سکون انداز میں گویا دیا۔

”وہی سلیمان آغی جس نے تمہیں اس سفر کا مشورہ دیا۔ ہاں! میں اسے خوب جانتا ہوں۔ اس
 نے مجھے بھی یہاں آنکھی تمہاری طرح بھیجا تھا۔ وہ جس سے بھی اپنا پنڈا لٹا جاتا ہے۔ اسے ٹیل کے
 پتے لگاتے ہیں۔ وہ بے کسی جیسے بھی گویا پیرا اپنے وصل یافتہ عاشقوں کو ٹیل کے آدمیوں کو گناہوں کے سپرد کر دیا
 کرتی تھی۔ چنگیسین!“

مجھے کچھ نہیں سی آر گی۔ میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ کبھی کبھی شہر کے خارجہ علاقوں میں سرنگیل
 کے قریب ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ وہاں اس کا ایک بڑا سا مکان تھا۔ اس کے آگے ایک بڑا سا باغ تھا۔ مجھے یوں لگا
 جیسے ایک تم کوئی غریب ملا ٹیل پی رہا ہوں۔

”سلیمان آغی نے تم کو کسی سے ملنے کے لئے یہاں بھیجا تھا یا یونہی ٹیل کے سفر کے لئے؟“ میں نے
 اس کے حے سے یہ نگاہیں گازتے ہوئے پوچھا تھا۔
 اس نے اپنے موٹے ہنجدے ہاتھ میرے سامنے میز پر پھیلا کر جواب دیا۔

”میرے یہ ہاتھ کبھی تمہارے ہاتھوں کی طرح نرم اور نہل نہلا کرتے تھے۔ اور وہی کی چٹنگ
 سے گریہ کی منہ بھی سلیمان آغی سے کرا دی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں آج زمانہ اس کے چند اہل و عیال
 سے گزرا ہوا ہاتھ شاید جانتے ہو گے کہ ٹریہ اور ٹریہ جس کو لگے اور وہ بے پانی میں پکتے اور تربیت پاتے
 جہاں وہ غریبی دیکھ کر پختا اور جاتا ہے۔ سوزن، بھلی، کھوٹا اور کھلے کی سیاہ سخت چھت اور قاش تریہ
 ہے۔ چنگیسین!“

”اب تم کہاں جا رہے ہو؟“

”تمہارے ساتھ ہی ہوں۔ دیکھئے کہاں تک تم میرے ساتھ ہو اور میں تمہارے ساتھ؟“
 دیکھئے ہم دونوں اس بجرے پہ ہیں جس کی پہلی منزل سکندر یہ۔ اور پھر ایسی قاہرہ۔“

”تم کیا کرتے ہو۔۔۔ کینیڈا ہو یا کوئی اور کام دھندا؟“ میں نے بڑی ہوشیاری سے جیسے بیاز سے نپرت اُتارتے ہوئے پوچھا۔

اس نے بھی اسی بے نیازی سے جواب دیا۔

”کوئی بھی کام نہیں کر سکتوں وہ میں کر لیتا ہوں ایسے میں بطور گائیڈ بھی کام کرتا رہا ہوں جنٹلمین“ اور آج کل؟“ قبوے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے میں نے پوچھ لیا۔

”اس ہجرے پہ ملازم ہوں۔۔۔ اقول درجہ کے مسافروں کے لئے رات کو مخیر و اعتقول تماشے پیش کرتا ہوں جنٹلمین! یعنی نہیں شہدہ گر ہوں۔ تم مجھے مداری بھی کہہ سکتے ہو۔“

اس کے منہ سے تماشے کا لفظ سن کر میں اسے یوں ٹکنے لگا جیسے وہ بھی اک تماشہ ہی ہو۔

”تم اس ہجرے پہ تماشے دکھاتے ہو۔۔۔ میرا مطلب ہے کھانڈل درجے کے مہمانوں کے لئے تماشے پیش کرتے ہو؟“

”یہاں اگر تم اس قدر حجت کا اظہار کیوں کر رہے ہو۔ کھیل تماشہ دکھانا کوئی آسان یا اچھے کام

UrduPhoto.com

”تم تو ضرور مجھے بھی اسے تماشے دکھاؤ گے۔“

وہ عیب کی نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

”اس کے لئے مجھے کچھ پڑا ہے گا۔ اور بدست ہو جا تو یہ کونسی سی بات بھی نہیں

سگنا میرا بدن اُٹ رہا ہے اور جو اس قفل سے ہو رہے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں جنٹلمین نہ

بھی بھولنے لگا ہوں جنٹلمین۔۔۔!“

میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”خیریت۔۔۔ کیا تم بیمار ہو یا بچا کف طبیعت خراب ہو گئی ہے؟“

”نہیں۔۔۔ میں بیمار ہمارا بالکل نہیں۔ صرف سگریٹ نہ پینے کی عہد سے ہر طرح سے

اگر تم جنٹلمین ہونے کی حیثیت سے مجھے ایک حد سگریٹ پینے کی اجازت دو تو میں شاید تمہارے لئے کوئی ترکیب نکال سکوں۔ دریں صہرت میں شاید آج رات خود بھی کوئی تماشہ دکھانے کے قابل رہوں گا جنٹلمین!“

میں اس کی چالاکي کو سمجھ گیا تھا۔۔۔ مگر مجبور تھا کہ تماشہ دیکھنے کا اس کا ملاوہ کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔

”لھیک ہے، تمہیں کوئی ترکیب سوچنے کی خاطر صرف ایک سگریٹ پینے کی اجازت ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس کا دھواں حلق کے نیچے نہ جائے اور نہ ہی اس کی گھنیا بدبو ارد گرد پھیلے۔“
وہ خواہش سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”منظور مگر تمہیں مجھے وہ ترکیب بھی بتانی ہوگی کہ دھواں پیٹ میں بھی نہ جائے اور ارد گرد بھی نہ پھیلے۔“

”میرے پاس تو کوئی ایسی سبب ہو وہ ترکیب نہیں۔ یہ تو تیری سرورزی ہے کہ ان شرائط کے ساتھ کیسے سگریٹ پیا جاسکتا ہے۔“ میں نے بظاہر بے نیازی سے جواب دیا۔

میری اجازت ملتے ہی اس نے اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا، بڑی جلدت سے سگریٹ سلا کر ایک لمبا سا شش کھینچا۔ اب میں دیکھ رہا ہوں کہ کتنے سے دھواں خارج ہو نہیں پاتا۔ مگر کیا حال جو لوگ ناک کے ذریعے دھواں کی کوئی بھی لہر تک برداشت نہ کر سکتے ہیں۔ اس کی نشست کے نیچے بھی بھانپا دیا گیا تھا۔
”یہ تو تمہیں کی بڑی تنگ خاطر نہ ہوئی، اس کا چہرہ قدرے تھما اٹھا تھا۔ تو وہ لینے کی خاطر میں چھو بیٹھا۔“

”یہ یاد رکھو اور پہلے تم نے سگریٹ کا پیکٹ درج کر دیا تھا کہ سگریٹ کہاں سے نکالو اور اس کے ذریعے دھواں نہ پھیلے۔“ وہ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
وہ کھینچ رہی تھی سگریٹ پھیلاتے ہوئے بچھوٹا۔

”جنگلیں اور کھیتیں۔“ دھواں اٹھنے لگا تو میں نے دیکھا کہ سگریٹ کے دھواں نے اس کی جانب اشارہ کیا۔
”یہ تو کون سا مشکل کام ہے۔“ وہ نے کہا۔
”یہ تو کون سا مشکل کام ہے۔“ وہ نے کہا۔
”یہ تو کون سا مشکل کام ہے۔“ وہ نے کہا۔

”جنگلیں اور کھیتیں۔“ وہ نے کہا۔
”یہ تو کون سا مشکل کام ہے۔“ وہ نے کہا۔
”یہ تو کون سا مشکل کام ہے۔“ وہ نے کہا۔

”جنگلیں اور کھیتیں۔“ وہ نے کہا۔
”یہ تو کون سا مشکل کام ہے۔“ وہ نے کہا۔
”یہ تو کون سا مشکل کام ہے۔“ وہ نے کہا۔

وہ میری خیرانی اور پریشانی سے خوب محفوظ ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بمشکل پائے چھ جھکے دار کشوں سے اس نے سلاگ لے ہوئے سگریٹ کو فارغ کر دیا تھا۔ باقی بچا ہوا سلا سلا سگریٹ دریا زور کرتے ہوئے وہ خود بخود بہہ پڑا۔

”مصری سگریٹوں اور عورتوں میں بھی ایک خرابی مشترک ہے کہ دونوں لاسٹ لاگرمیں ہوتے۔ بے وقار اور جلد یا بدیر ساتھ چھوڑ جانے والے جنٹلمین!“

بن سوچے میرے منہ سے نکل گیا۔

”یہ تمہارا ذاتی تجربہ ہے یا کچھ ہے ہی ایسا۔؟“

”جنٹلمین اس معاملہ میں میرا ذاتی تجربہ کچھ زیادہ ہے۔ لیکن ہے بھی ایسے ہی۔“

اس نے مجھے خوشگلیں نظروں سے گزرتے ہوئے جواب دیا تھا۔ میں نے بھی اسی لہجہ میں جواب دیا۔

”میرا ذاتی خیال ہے کہ ان دونوں مکروہات اور مشروعات کا استعمال اگر قدرے احتیاط اور خدا خوفی

سے کیا جائے تو شاید ایسا کہنے کی قیمت نہ آئے۔“

وہ چنانچہ چھڑاتے ہوئے بولا۔

”میں تو قلعہ کربلا میں تم کوئی کام کی بات کر کے جنٹلمین!“

”کام کی بات تو میں بتا چکا ہوں! میں آپ والے حشرے پہ ہونے والے پروگرام دیکھ چکا ہوں۔ ہاؤس فل ہو جانے اور سوتے سوتے کی تنگی کی وجہ سے مجھے وہاں شہت نہ مل سکی۔ تم نے سگریٹ

پینے کی اجازت کے بدلے میری مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ سو تم نے سگریٹوں کا کورس پورا کر لیا ہے نہ؟“

تم ایک جنٹلمین کے وعدے کی طرز اپنا عہد بھٹاؤ۔“

اس کی گدلی موٹی موٹی آنکھوں میں بڑی تیزی سے دکھائی دی پر چھایاں ہوائیں۔ مجھے غصے کا

اب یہ یہاں اپنا ٹرپ کا بچہ پھینکے گا۔ وہ جہاز کے اوپر والے حشرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا تم جانتے ہو جہاز کا یہ سفر کتنے روز جاری رہے گا جنٹلمین!“

”یہ بھی تم ہی بہتر جانتے ہو۔“

”ہوں۔“ فی دن بھی ایک پیلے کا یا جاسے تمہیں کم از کم چھ سات ہینکوں کے پینے کی اجازت

بہر حال دینی ہی پڑے گی اور وہ بھی ایلڈ وائس جنٹلمین۔“

”کوئی تو تم اپنے جنٹلمین پر اس میں زبردستی کی گنجائش پیدا کر رہے ہو۔“

سوچو اگر میں حقیقت میں ایسا کر سکتا ہوتا تو آج یہ گھٹیا سگریٹے۔۔۔ اس گھٹیا جہاز کی گھٹیا نوکری اور اس گھٹیا عمر کے پتہ ایسے گھٹیا شخص کے پاس کھڑا ہونا، جینٹلمین۔۔۔ امیری اٹھویں میں ہونا یا مراکش کا بڑا سیار کچر ہونا میں انہی کی قیمتی ترین پڑھتیش پر مانی کشتی ”سمندر کی جل پری“ کے دیوان خاص میں برفانی چھتے کی سفید کھال والے صوفے میں دھنسا ہوتا۔ میرے سامنے پلیٹیم کے قیمتی کرسٹل کے جام دینا پڑے ہوتے، جن کے شغاف جیت باز اور سینے۔۔۔ جزیرہ ہوائی کی مہنگی اور اعلیٰ ترین سفید شراب سے شرابور ہوتے۔ اور میرے پہلو میں تمہاری بچائے لہان کی صمیں ترین مغیرہ دقاہہ سمعیہ ڈرویشٹک ہوتی۔ جس کے صوتی زمرموں کے ارتعاش سے مراد حیات میں گزرا کھل اٹھتے ہیں۔ جس کی جنمیش اعضاء سے کائنات وجود میں آ جاتی ہے اور جس کے کُسن جہاں سوز سے۔۔۔۔۔“

میرے جسم میں آگ سی گئی تھی۔۔۔ میں بجلی کی سرکٹ سے لڑنے کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔
”گڑ گڑاتے ہوئے کہا۔

”جینٹلمین کو پڑا کا واسطہ۔۔۔ یہ لہن ترانی نہیں بند کر دو آگے ایک لفظ بھی مت کہنا۔۔۔۔۔ اور نہ میں سمجھتا ہوں کہ۔۔۔۔۔“

UrduPhoto.com

”تجربہ کار کے پائلوں کی ہولناکی اور اس کے اندر دھنسنے والے خوف کا آدمی گڑ گڑایا۔۔۔۔۔ خوش خوراکی سے ڈانٹا نہیں ہو۔۔۔۔۔ یہ گڑیال مصری جاوگرتی یعنی کھوپڑا کے پاتھ گلیا لوں کی اس نسل سے ہیں جنہیں دو ہر نی صبح کاغذ۔۔۔۔۔ ایک شب کا عاشق صادق بطور ناشیہ پیش کیا کرتی تھی۔۔۔۔۔ جینٹلمین!۔۔۔۔۔ ہلے سے جزا سخت کوئی بلور شیشی کر لے۔۔۔۔۔ اس نسل میں گودے والے طریقت خود شیشی کو خوش دلی سے قبول کر لیتا۔۔۔۔۔ اس سے تو کاکہ درجہ بلور خود شیشی یہ ہے کہ انسان اس کو لے لے گا نہ شراب میں چند برس اور زخم و زحمت ترجیح دے لے۔۔۔۔۔ بلور جینٹلمین!“

میں خاک کچھ بولا۔۔۔۔۔ مجھے اپنی ہانگی ہانگی پہ ہزار تھک کر جب سے میں اس مصری آدمی کے لیے آیا تھا میری پوٹنی بند ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ میں نے اپنی کڑ بھری پوٹ ڈانٹوں کے دے کر اپنے کان پر دے کھول دیے۔۔۔۔۔ تھے۔۔۔۔۔ نسل کے گڑیالوں سے جان بچانے کا درست میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

شام کے بچپنے میں گھٹیا کی میز کے گرد بیٹھے کروٹے کسے قہوے اور شیری خوش ذائقہ ترہیز سے منہ ماری کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ وہ مجھے اوپر والے درجے کے متعلق معلومات بھی بجم پہنچا رہا تھا کہ وہ۔۔۔۔۔

پہنچے واقعی ملازم ہے یعنی مینیجے میں وہ دو بار جہاز کے سفر کے ساتھ شامل ہوتا۔ باقی کے دن وہ اپنے گاؤں میں رہتا یا پھر قایمہ میں آوارہ گردی کرتا رہتا۔ اپنے بارے میں بھی بتا رہا تھا کہ جہاز پہ حیرت میں مبتلا کر دیتے۔ لے تھائے پیش کرتا ہے۔ تو حیرت بٹانے میں دوتا ہم گریزاں تھا۔ اس نے اول درجے کے اس عرے پہ بھری شرکت یعنی چینی بنانے کے لئے یہ راستہ نکالا تھا کہ میں اس کے معمول یعنی معاون ساتھی کی حیثیت سے شہریت کروں۔ اس کے مستقل معاونوں میں ایک جوان خوبصورت سی لڑکی۔ ایک اڈیٹر مرنس اور دو خاتون تھیں۔ اتفاق کہ ان میں سے ایک مرد ساتھی کسی وجہ سے اس سفر میں شامل نہ ہو سکا تھا۔ جہاز کے قبو خانہ میں تھے اپنے کیمین میں لے آیا تھا۔ جو اسی تھراؤ کلاس کے عرش پہ انجن کے دو کوش والے جھکاؤ کے نیچے ایک لہریٹ نامہ مقول سی جگہ پہ واقع تھا۔ انجن کی گھڑ گھڑاہٹ اور گرمی نے اسے جنم کی جانب کھٹکے والی ایک گھبراہٹ مٹی بنا رکھا تھا۔ کیمین میں داخل ہوتے ہی مجھے اہٹائی سی آئے تھیں۔ ایک تھکے تھکے ضد و خال والی عورت سی پتلی ڈبلی لڑکی اور ایک چھٹا اقسام کی اودھلاؤ سی عورت وہاں پہلے سے ہی موجود تھیں۔ وہی عورت چوڑا سٹیکٹے اور مقامی گھٹیا بیڑ کی ہڈی ڈالی سی ہوتھیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی آپس میں ہنسنے پھسنے لگیں۔

UrduPhoto.com

میں نے انہیں سلام علیکم کہا۔ انہیں نے ولیم کی جگہ مراعات میں بلا کر اشارے سے دیکھا اور حیرت منشی کی دعوت دی۔ مصری مداری نے غیر مانوس سے الخافہ میں دیکھ کر کہا تو انہوں نے سہم کر اپنی دعوت کو قبول کیا۔ ایک تھکین کھڑی کے صندوق پہ پہلی بدبودار چھینے کی کھال بچھا کر میرے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی گئی۔ شب اور پھوٹے سے کیمین میں جہاں ڈھنگ سے بیٹھنے کے لئے بھی جگہ کم تھی۔ الم غم سے انا پڑا تھا۔

میں نے انہیں سلام علیکم کہا۔ انہیں نے ولیم کی جگہ مراعات میں بلا کر اشارے سے دیکھا اور حیرت منشی کی دعوت دی۔ مصری مداری نے غیر مانوس سے الخافہ میں دیکھ کر کہا تو انہوں نے سہم کر اپنی دعوت کو قبول کیا۔ ایک تھکین کھڑی کے صندوق پہ پہلی بدبودار چھینے کی کھال بچھا کر میرے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی گئی۔ شب اور پھوٹے سے کیمین میں جہاں ڈھنگ سے بیٹھنے کے لئے بھی جگہ کم تھی۔ الم غم سے انا پڑا تھا۔

میں نے انہیں سلام علیکم کہا۔ انہیں نے ولیم کی جگہ مراعات میں بلا کر اشارے سے دیکھا اور حیرت منشی کی دعوت دی۔ مصری مداری نے غیر مانوس سے الخافہ میں دیکھ کر کہا تو انہوں نے سہم کر اپنی دعوت کو قبول کیا۔ ایک تھکین کھڑی کے صندوق پہ پہلی بدبودار چھینے کی کھال بچھا کر میرے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی گئی۔ شب اور پھوٹے سے کیمین میں جہاں ڈھنگ سے بیٹھنے کے لئے بھی جگہ کم تھی۔ الم غم سے انا پڑا تھا۔

میں نے انہیں سلام علیکم کہا۔ انہیں نے ولیم کی جگہ مراعات میں بلا کر اشارے سے دیکھا اور حیرت منشی کی دعوت دی۔ مصری مداری نے غیر مانوس سے الخافہ میں دیکھ کر کہا تو انہوں نے سہم کر اپنی دعوت کو قبول کیا۔ ایک تھکین کھڑی کے صندوق پہ پہلی بدبودار چھینے کی کھال بچھا کر میرے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی گئی۔ شب اور پھوٹے سے کیمین میں جہاں ڈھنگ سے بیٹھنے کے لئے بھی جگہ کم تھی۔ الم غم سے انا پڑا تھا۔

میں نے انہیں سلام علیکم کہا۔ انہیں نے ولیم کی جگہ مراعات میں بلا کر اشارے سے دیکھا اور حیرت منشی کی دعوت دی۔ مصری مداری نے غیر مانوس سے الخافہ میں دیکھ کر کہا تو انہوں نے سہم کر اپنی دعوت کو قبول کیا۔ ایک تھکین کھڑی کے صندوق پہ پہلی بدبودار چھینے کی کھال بچھا کر میرے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی گئی۔ شب اور پھوٹے سے کیمین میں جہاں ڈھنگ سے بیٹھنے کے لئے بھی جگہ کم تھی۔ الم غم سے انا پڑا تھا۔

مصری بغلول کے تصرف میں آ گئے تھے۔

وہ سگریٹ سٹگاتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔

”جنٹلمین! تم اوپر والے عرصے میں صرف ایک ہی ترکیب سے پہنچ سکتے ہو وہ یہ کہ میرے کھیل

تماشے میں میرے معاون بن جاؤ۔ اس طرح تم بلا کسی روک ٹوک اور پیچاس پھٹاؤ ادا کئے بغیر اوپر پہنچ سکتے ہو۔ میرے کھیل کے بعد بھی میں تمہارا وہاں نکلنے کا بندوبست کر دوں گا۔ اس طرح تم پارے سفر کے

دوران اول درجے کے پروگراموں سے لطف اندوز ہو سکتے ہو۔ البتہ آرام اور سونے کی خاطر تمہیں میرے اسی عرصے پر اپنے مکین میں آنا پڑے گا۔ یوں کیا کہتے ہو؟۔ ارادہ ہو تو میں تمہیں تمہارے کام کی رہبر مل کر وادوں جنٹلمین“

میں اپنا خشک حلق تر کھولتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”کیا تم کرنا پڑے گا؟“ وہ بڑی آسانی سے بتائے لگا۔

”میں پہلے انسان اور پھر چیتا اور پھر ایک بار انسان بننا چاہے گا۔ بہت آسان اور دلچسپ ہے۔“

UrduPhoto.com

”کیا تم کوئی پہلے تو آدمی سے انسان بننا مشکل ہے پھر انسان سے چیتا بننا بھی نہ کہ آسان کام نہیں ہے۔ پھر دوبارہ پیسے سے انسان کے قلب میں ڈھانا تو اور بھی کاردار ہے۔ میں تمہارے انداز میں کئے گا۔ یہ کام مجھے مشکل دکھائی دیتا ہے۔ کوئی اور آسان کام تو نہیں ہے۔ میں تو بلی کی میاؤں سے باتوں ہوں اور تم مجھے چیتا بنانے جارہے ہو۔“ ایسے آپس کی بات ہے کیا انسان چیتا بن سکتا ہے اور اگر بن سکتا ہے تو کیا پھر انسان کے قلب میں دوبارہ بھی ڈھل سکتا ہے اور مجھے یوں گھورنے کا جیسے نہیں نے کیا ہے۔ پوچھ لیا ہوا تمہارا آپ انسان تھا یا کوئی چیتا؟

وہ کھسمساتے ہوئے بولا۔

”کیا تم کو وہ یاد آ رہی ہے انسان کے قلب میں نہیں ڈھلے۔ اور تم پھر کیا دوبارہ پھر بھری گئی تھی۔“ تھوڑی دیر گزرے بارہ صبح کتاب کے لئے زندہ نہیں کیئے جاؤ گے۔ جنٹلمین! میں نے تو تمہیں یہ سب کچھ کے لئے میوان دیا ہے کہ تمہیں کچھ نہ ہو۔ کچھ چند قہر خراٹے ہوئے عرصے تم دہارتے ہوئے پیسے کئے گئے۔ کچھ نہیں ہوئے۔ یہ شخص لڑ رہا تھا کہ کھیل ہے۔

”مجھے شاید فریب فکر کے کھیل تماشے دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہاں کسی اللہ والے مفتی تو رہا کرتے

یہ سب کچھ نہ صرف حاصل ہو جائے تو خوش قسمتی سمجھوں گا۔“

جینٹلمین ادا کیا جانے کا اصل مقصد اگر روشنی کا حصول ہی ہوتا تو صوفی فقیر کا روشنی سوز دروں کی جگہ نہ ہوتے۔ وہ شخص دینوں پہ بیٹے ہی جلاتے چلے جاتے اور پھر ہر مقام پر جا کر بیٹے ہی دیتے روشن کرتے۔ یہ تو محض سمجھانے کے لئے روشنی کئے جاتے ہیں کہ ہدایت کی روشنی حاصل کرنے کے لئے۔ یہ ممکن کیا کچھ لوازمات بطور طریق اور ضرورت احتیاط کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جو نگاہ نظر دیئے کی لو یہ سب سمجھ گئے۔ وہ نور کی چمکی کو کیونکر برداشت کر سکتی ہے، جینٹلمین!“

اس کی پہلی کون سی باتیں تھیں جو میرے چنے چنے تھیں جو اب یہ بھی میری سمجھ میں آتی تھیں۔ میں نے ان باتوں کی دیا سنا کی جگہ پر دو دروازے پارکھاؤں میں کھڑے ہونے بتائے لگا۔

”تمہیں وقتی طور پر چھوٹا ہونا پسند نہیں ہمیں تو سلیمان اُٹی نے بارہ برس گناہ کرنا بند کرنا دیکھا۔ شریہ کے تحت ان کا سزا دیکھ کر چن کر نہ ان کا بی بی لگی تھی۔ آئیں جا کر ان کا بی بی تھیں۔ پھر چھوٹے سے چھوٹے کا۔“

”اب وہ کچھ چھوٹا اور کچھ جینٹلمین!“

”یہ کتنا بھی اسی سلیمان اُٹی کے قتلے کا گھر چن چاتی رہی ہے۔ یہ یہ سب بات کے ٹھکانے میں ایک ایک آگن کا روپ دھارتی ہے جو کھڑا مومن کی فہم چینی کچھ ہوتی ہے جسے کئی موت کے بعد دیگر کچھ ہوں۔ یہ جو قبر سے میں زندہ دفن کر دیا جاتا ہے۔ لیکن صدیاں اُن رہنے کے باوجود اس کے دل سے اپنے گھر کے یہ نہیں لگتی اور یہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک ناگن کا راپا اختیار کرتی ہے اور نہ سے آگ کے لئے جگہ دیتی ہوتی کسی نہ کسی طرح مقبرے سے باہر نکل آتی ہے۔ اپنے محبوب کی کمی کی تلاش میں وہ جہوں نے گھر سے مقبرے کو نکال دیتی ہے مگر اسے سامنے ناگن کے اور ہاتھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ جہوں کے غضب میں ہر انسان کو اپنے ہوانا کے شعلوں سے جو کرنا کھتر کر دیتی ہے جو اس کے سامنے آتا ہے۔ اس عالم میں اس کی نہ کچھ بھیڑ مصلحت کے ایک ایسے چوہے سر سے ہوتی ہے جو ایک عالمی ادارہ کی طرف سے زمین میں دفن مقبروں کی تحقیق پر مامور ہوتا ہے۔ سوائے اس کی فکر اور سب اس کے محبوب سے ہوتی ہے۔ وہ اسے بھی جلا کر رکھ کر دینا چاہتی ہے مگر نہ جانے کیوں وہ ایسا نہیں کر پاتی شاید محبوب کی محبت سے ایسا کرنے سے باز رکھتی ہے۔ پھر ایک رات جب چاندنی اپنے تجوہن پہ ہوتی ہے وہ اپنے اصل

عورت کے جیکر میں اس کے خیمے میں داخل ہوتی ہے۔ پروفیسر اس کے اُتھیں خُسن۔ وہی صدیوں پرانے لباس کی راتوں کی خوبرو کثیروں والی کافرانہ ادائیں دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ پھر جو کچھ چاہتا ہے منزل پہ پہنچتا ہے تو یہ کثیر عالم وارثی میں اُڑے ہوئے اس پروفیسر کو اپنے محبوب کا نعم البدل سمجھتے ہوئے ساتھ لے کر اپنے مقبرے کی جانب بڑھ جاتی ہے۔۔۔۔۔

دوسرے شلکانے کی خاطر لڑکا تو میں نے خوراسی سوال دروغ دیا۔

”یہ تم کوئی داستان سنار ہے ہو یا اپنے کھیل کا کوئی ذورانیہ؟“

”یہ میرے کھیل کا ایک حصہ ہے جو تمہارے چیتے والے کھیل کے بعد شروع ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ہاں! اچھی

ابھی میرے رمان میں آیا ہے کہ اگر تم چیتا بنے میں کوئی دشواری سمجھتے ہو تو اس کثیر کے محبوب پروفیسر کا کردار کو چیتے والا پارٹ میرا دوسرا معاون ٹھہرتے گا۔

بات کرتے کرتے وہ لڑک سا گیا پھر راجھی کھیلاتے ہوئے بولا۔

”لیکن یاد آئے کہ اس پروفیسر والے کردار میں بھی ایک قیامت مومچ ہے ایسا ہے جو کہ تمہاری کھیل

سوانی کہیں یہ بھی اچھا ہے۔۔۔۔۔

UrduPhoto.com

وہ کہانا سنا۔

”دراصل مجھے سند سے قیامت غلط لفظ ادا ہو گیا ہے۔ مجھے کہنا چاہیے تھا کہ یہ ذرا مشکل ہے۔ قدرے تکلیف دہ کردار ہے لیکن میرے بار بار وہانی اور کشادہ دلی سے سننے کیلئے چونکہ مقبرے سے انسانی ہونے کے ساتھ نکل نہیں سکتی تھی۔ اس لئے ضرور دانا اس نے ناگن کا روپ لیا۔ مقبرے میں داخل ہونے پر چونکہ اس کے محبوب کے روپ میں پروفیسر بھی ساتھ تھا۔ اسی لئے اس نے پروفیسر کو بھی ایک تاک کا روپ دینے کے لئے پہلے تو اس کا لباس لہذا کیا اچھا تھا۔ میں اسے یاد آئے کہ اس کے محبوب کے سینے پر نکلے بالوں کا ایک دائرہ تھا جسے وہ کبھی غلط محنت سے چوما کرتی تھی۔ اب وہ ہاتھ زبان بھیر بھیر کرتے سینے پر وہ بالوں کا گچھا تلاش کرتے ہوئے جو اُسے نہیں ملتا۔۔۔۔۔ اسی دوران وہ غلط فیض سے ایک بار پھر ناگن من کر شیطے پہنکا رمان شروع کر دیتا ہے۔ پروفیسر اس کا یہ دشمنی کا روپ دیکھ کر بھاگ نکلتا ہے۔ ناگن وہیں سے زبان کا پھل نکال کر ایک پکٹا ہوا شعلہ مگر قتی ہے اور بے سند حد بھاگتا ہوا پروفیسر ایک خاشاک کی مانند آگ کے پتھر کی طرح راکھ ہو جاتا ہے۔ یہیں زوردار ہوا چلنا شروع ہو جاتی ہے۔ خاکستر پروفیسر کی پوتین اور انگوٹوں کی شعلہ راکھ کی باقیات تیز ہوا کے ساتھ نابود ہو جاتی ہیں۔ تم نے دیکھا کہ اس کردار میں کتنا سسپنس ہے۔

کنہ ساسی نے بٹکے سے بلایا۔ ”نگلیں کھولیں... دیکھا وہ مصری مداری خوشگلیں نظروں سے مجھے تو م رہا ہے۔“
 ”السلام علیکم یا اہل القہر! نماز ہو چکی ہے اللہ تبارک و تعالیٰ کی پاکجو اور بھی مصروفیات ہیں۔“
 محض رب الجہی ہی نہیں رب العالمین بھی ہے۔ تھرہ ورلڈ کے مسلمانوں میں اک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ اور دوسروں کا وقت بہت ضائع کرتے ہیں۔ اٹھو مسجد خالی کرنا جنٹلمین۔“
 ایک کارڈ مجھے تھماتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک آٹھ بجے اوپر ڈیک پہ پہنچ جانا۔ کپڑے اگر ہوں تو ذرا معقولیت سے پہننا۔ یہ خاص کی گندی بد بودار بیویوں کو درپارہ کرتے آتا۔ اوپر پہنچو گے تو دربان تمہیں میرے پاس پہنچا دے گا۔“
 وہ مسجد سے نکلے نکلے کہہ رہا تھا۔ ”کھانا کھوٹ کر آنا جنٹلمین!“

یہ جاو جا۔ وہ اک چھلکاؤسے کی مانند مسجد سے باہر تھا۔ میں نے چونکہ دعاچ میں ہی تھیں تھیں لہذا باقی ماندہ دعاچ میں خاندان کے جملہ متوفیاں کے لئے مغفرت کی اکھلی ہوئی ہے پوری کی عرض خصوصی کے طور پر اس مصری مداری کے لئے ملتوس ہوا کہ الہی! اس کی گڑگڑانی باتیں آج پوری نہیں کچھ تو میری پہنچی میں آجائیں۔

UrduPhoto.com

اوپر پہنچتے ہی مجھے چوں گا جیسے میں کوٹ کھیت سے سیدھا کھنسن کے پلے لینڈ میں لینڈ نوں بنوں حائل پانڈہ راہی سے ڈاکٹ جی کے لانی لینڈ میں آگرا ہوں۔ رنگ بڑی روشنیوں کی بھڑک سی شب بہار دھار رہی تھی۔ اس شب کے ایک چڑے جیسے جیسے کی طرح سے ایک سے ایک سے رو صیا رنگت کی کو پی تی ہوئی تھی۔ جس کے اندر وہ اندر کا اکھاڑہ جما ہوا تھا۔

بکاش یہ ایک سرک کے پھیلاؤ جیسا ماحول تھا جبکہ باہر سے اندر کچھ دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ اس کی مانند صرف سائے ہی باہر سے دکھائی دیتے تھے۔ لائے لائے تانبہ رنگت ”تومند ہا ہا رہا ہا“ تھے۔ لمبی لمبی مہا اسی سروں پہ سیاہ مہاے جن پہ سہری خیموں پہ لٹکتے ہوئے گندم پھندے مصر اور اندر کمر بندوں میں لٹکے ہوئے تھہر اور خیر اور اسی طرح طرح دیکھیں بدن خیم ہر ہر۔ شاید نگاہوں سے اٹھاتی ہوئی جام بکف ساقیں۔ ”الہی الخیر۔“ ”میرے منہ سے آپ آپ ہی نکل گیا۔“

رات کا پہلا پیرا سلسلہ جام و سوسو شروع ہو چکا تھا۔ میرے نیچے یعنی کو پی کے اندر کا ماحول لگاؤں سے اوٹھل ہی رہا۔ یہ سب کچھ کھلے عرصے کا تھا تھا۔ ریلک کے ساتھ ساتھ عربی انداز کی آرام دوستیوں کا اہتمام تھا۔ دینے قالینوں عالیچوں پہ چھوٹے بڑے طباقوں میں سامان خور و نوش۔

تھے۔ ان چہرہ ان خُفّے اور اگلا لہان دھڑکتے تھے۔ کہیں والٹکن والا اپنی ذہن بجا رہا ہے۔ نصیری اور دونوں نے اپنے راک چھیڑے ہوئے ہیں۔ الخوز نے مجھ سے خطوطیاں گھسیٹیں گھیریاں لیتی تھرتکی انگ انگ تھکتی ہوئی سیاہ چشم و گیسور کا صائیں۔ ان سے اٹھکیاں لیتے چھینر خانی کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے کرتے۔

میں ایک کونے میں ابھی "خوفا شائے لب بام" تھا کہ پیچھے سے مجھے کسی نے یوں جھپٹ کر کھینچا کہ تھک گیا ہوا اپنے بوجھ سے ہی گر پڑا۔۔۔۔۔ یہ وہی مصری مداری تھا۔

"میں تمہارا اپنے کہیں میں انتظار کر رہا ہوں اور تم یہاں دھڑکتے کھڑے ہو۔ جٹلیں!"

میں بھی یہاں تمہارا یا کسی کارندے کا منتظر تھا۔۔۔۔۔ جو مجھے تمہاری ٹھکانے پہ پہنچاتا۔۔۔۔۔ میں نے

سناٹے سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔

و مجھے تھی سے ٹھارتے ہوئے کہنے لگا۔

"جان ایک تو تم میں بحث کرنے کی بڑی عادت ہے۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ گے۔"

و مجھے اپنے عارشی سے اٹھانے سے لگا۔

میں نے اپنے عارشی سے اٹھانے سے لگا۔

میں نے اپنے عارشی سے اٹھانے سے لگا۔

میں نے اپنے عارشی سے اٹھانے سے لگا۔

میں نے اپنے عارشی سے اٹھانے سے لگا۔

میں نے اپنے عارشی سے اٹھانے سے لگا۔

میں نے اپنے عارشی سے اٹھانے سے لگا۔

میں نے اپنے عارشی سے اٹھانے سے لگا۔

میں نے اپنے عارشی سے اٹھانے سے لگا۔

میں نے اپنے عارشی سے اٹھانے سے لگا۔

میں نے اپنے عارشی سے اٹھانے سے لگا۔

میں نے اپنے عارشی سے اٹھانے سے لگا۔

اُف اُف! میں کہاں پھر پھنسی گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ کنپٹیوں پر رکھ لئے۔

”میں یہ باتیں تم سے کئی بار سن چکا ہوں۔ بات وہ کیا کرو جو سیدھی کانوں سے اُتر کر دل میں ترانوہ ہو جائے۔ مجھے ناک کو بازو پیچھے ٹھکا کر کلانا نہ بتاؤ“ میں اُلجھ جاتا ہوں کیوں اور آسان لفظوں میں کہنے کی یہاں اس کباڑ خانے میں کیوں لائے ہو؟“

کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہنے لگا۔

”میں بات کو چھوڑ سکتا ہوں۔ اگر تمہارا جواب آں جواب۔“ ”جواب آں جواب“

شدید متقاضی نہ ہو۔ باتوں کی ریت سے رگڑ میں بھی لگا جاتا ہوں۔ جبکہ تم بھی ایسا ہی کرتے ہو مگر وہ جس سے پٹیاں باندھ کر بھاگ بھی لیتے ہو۔ وہاں اُس کی پُپ سے دوڑ لگا دی اب یہاں میری بک بک سے ہلے ہو۔ بہر کیف میں نے ایک بھلے آدمی سے پہلو اُترتے ہیں یہاں کھیل کود دیکھنے کی اجازت دلوادی تھی۔ اس کے بدلے میں تمہیں غبار۔ پھلانے والے اہلکار کی مدد کرنا پڑے گی۔ ایک سٹنڈر کے ذریعے غبار میں گھس بھر کر ٹیک پلا سٹک کے کپڑے چھیر میں جمع کیتے جاتے ہیں۔ ان قبایروں کے ہوا آتش بھڑکے مسالا ہوتا ہے۔ ایک روگرام کے اختتام پر ان غباروں کو کپڑوں کے ذریعے بلندی پر پھونکا جاتا ہے۔ یہ ایک خاص طریقہ ہے۔ اس سے پہلے اس کو دیکھنا ہی نہیں تھا۔ اب دیکھنا بھی آسان ہے۔ اس میں غبار کا نام نہیں لکھا جاتا ہے۔ قیر تمہیں اس سے کیا مطلب کہ غبار میں کس کا نام لکھا جاتا ہے۔ اس قسم کے غبار جہازوں کے غباروں والے کی مدد کرتے ہیں۔ پھر آرام آگئی سے ادھر ہی بیٹھ کر شب بھر تماشے دیکھتے رہو۔ یہ خیال سے کام میں کوئی نہ ہو۔

جہاز پر پہلی شب کے ابتدائی ایک دوڑا ہ نہیں بلکہ تین گھنٹے میرے مختلف رنگوں والے غباروں کی گیس بھرے اور ان پر دروازے کے چھلے باندھنے چل جانے میں گزارے۔ اس دوران کیا کچھ نہ لکھے۔ نہیں۔ کیونکہ میں ایک ممکنہ لاپلا سٹک کے جیسے میں ایک مصری نوجوان کے ساتھ غباروں کی گیس بھر رہا ہوں تھا۔ شکر ہے کہ یہ نوجوان تمام مصریوں کی طرح گہرا اور سلی سوج و فخر کا حامل نہیں تھا بلکہ وہ ایک سلی آنکھوں کے نکلنے والے ایک عالم تھا۔ مصر کے کسی نو اسی نہیں ماندا علاقے کا رہنے والا اپنی تعلیم کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ایسے اضافی جزوقتی کام تلاش کرتا رہتا تھا۔ اس کام میں دلچسپی نہ تھی۔ وہ جہاز دور یا کی منت میرے علاوہ غیر ملکیتوں سے ملاقاتوں کے مواقع بھی تھے۔ یہ اس کی سوچ و راستہ تھی۔ غیر ملکیتوں سے دوستی پیدا کرنا۔ اُن سے اُن کے ملک، کلچر، تہذیب اور دیگر مختلف موضوعات پر میرا حاصل

”یہ پتہ ہمارا پروفیسر کے روپ میں جل کر خاکستر ہو جانا۔ ان کھیلوں میں حصہ لے کر تم نے

میں نے کہا: "ہاں، میں نے یہ سنا ہے۔"

وہ ایک وٹھریب معصوم سی ہنس رہا۔..... سننے لگا۔

”سب نظر بندی کے تخیل ہیں۔ ہمارے استاد کا اصل کمال الفاظ کا جادو ہے۔ سب سے پہلے

ماحول بناتا ہے۔ یہ ماحول بنانے میں موسیقی کے ذریعہ بوم روٹنی کے اثر اور چڑھاؤ سسائے چھبھائے کے سیلاب کیلئے

ہوئے ٹھیکہ منیما پر ویکیشن کے ذریعے سلائیڈ اور پیش رفتی مانی ٹی فلم کا استعمال ہوتا ہے کہ وہ ٹیکہ خانہ والوں کو محسوس کرے۔

نہیں، ہوتا کہ جو پہلا دکھائی دیا تھا وہ چیتا نہیں ایک نوجوان لڑکا تھا جس نے چیتے کی کھال اوزھ رکھی تھی

چیتا جب ہوا میں بلند ہوتا ہے تو ہارنگا کر قاب ہوتا ہے تو وہ قسم کا سین ہوتا ہے جو چھپے ہوئے ہارنگ پر ہے۔

دکھایا جاتا ہے۔ یہ سب ایسی خفّی اور اندھیرے آجائے کے پتھر ایسے چھپتے ہوئے لمحات میں یوں

انداز میں پیش کیا جا چکے کہ دیکھنے والوں کی بصارت، سماعت اور عقل و دماغ کو یہ موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ

نقل یا ہمارے اور حقیقت کے درمیان کسی فرق کو محسوس کر لیں۔ اسی کو ہی غریب نظری کہتے ہیں۔

فقیہ علوم کا اہلی نام ہے۔ مسمر ہرگز ارتقا و خیال انتقال خیال سے صحیح ہوا کا مراد ہے۔

UrduPhoto.com

انھیں تو سائنس ہے علم اور ہنر ہے تفصیل اور نمائندگی کو ہی کہتے ہیں۔

حقیقت میں ایسا نہیں ہے جیسے فلم دیکھتے ہیں جانتے ہیں کہ یہ سب اداکار کی طور بناوٹ ہے۔

کہتے ہیں۔ تفریح حاصل کر کے چھوٹے چھوٹے کام بھی کرنا چاہئے۔

نقل: "وَلَا يَكُنْ مِنَ الْهَالِكِينَ"

میں نے آپ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”افسوس ہے کہ اس ترقی یافتہ دور کا انسان سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے بھی خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے۔“

— $\frac{1}{2} \frac{d}{dt} \left(\frac{1}{2} \frac{d}{dt} \right)$

”یہ اس کی مجبوری ہے۔“ اس کا نام نے جس کا نام شارق اٹھل تھا یہ سائنس کی سے جواب دیا۔

”خفیہ تیس ایسی تھیں جو زور دے کر سنے کی مجبوریاں آتی ہے وہ کہتی ہیں کہ انسان یہ باتیں دیکھ کر کرا لے۔“

بائیں ہاتھ کی انگلیوں نوک پر لیتا ہے۔ چپے پر بھولے کھیل توڑنے چھٹم پوشیاں مچھولی تسلیاں

خوشاں اور کھوکھلے فقیصے... بے شک وقتی ہی کیوں نہ ہوں کچھ نہ کچھ تو جینے کی سکت تو دیتے ہیں...

کے لئے ہی اسی انسان کے لئے ہی اسی انسان کے چہرے کا جھڑاؤ تو بدل جاتا ہے۔۔۔۔۔ جیسے کہتے ہیں :

تھے۔ تھوٹے بہتر۔ جو فساد پیدا نہیں کرتا، لہذا نہیں کرتا انسان سے زندگی سے نفرت پیدا نہیں ہونے

میں نے گفتگو کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے۔ گفتگو کا ڈر ناہ لےنے کی خاطر بچھا۔

”میں نے تمہیں تمباکو نوشی کرتے ہوئے نہیں دیکھا؟“

”میں تمباکو نوشی پہ اذیت بھیجتا ہوں۔ تمباکو نوشی کرنے والے مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ مجھے

اس سے ذلی جہالت کی یو آتی ہے۔ ہاں تمہیں شاید اچھا لگے کہ میں کبھی کبھی یا میسر آئے پہ شراب ضرور
لیکھیں بڑھیا اور ولایتی۔“

میں اس کا منہ ہنسنے لگا۔

”یعنی تم چھوٹی خباثت پہ سچے ہو اور بڑی ام الخباہت سے رعبت فرماتے ہو کیا یہ تمہاری ذلی اور

جہالت کی نشانی نہیں؟ تم تو اپنے استاد سے بھی دو جوتے آگے لگے۔ تم ان کے لیے غصے و جھیل نہ
تھے تم میں کبھی تین حرف بھیج کر یہاں سے نکل لیتا۔“

”تمہیں وہ جھیل کے ساتھ ساتھ تمہیں رعبت غیبی تو بھی تو ذلی سے آتی ہے۔ جہالت کو تم بھی
لگتے ہو۔ اب ان باتوں کو چھوڑ دو۔ اسے یہاں شربتوں ہوتے ہیں اور اسی کافی اوقات ہے۔ اب بھی نہیں

یہ تمہارے کی جھلی ہلد سے جلد مکمل کر لیتی چاہئے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم دونوں تسلی سے اپنے گھر کو دوسرے
گھر پہنچنے کی بجائیں گے۔“

”اچھے پان گھنٹے میں ہم اپنے گھر سے غلطی سے کو لو پہنچ سکتے ہیں۔ اب ہر جہت سے تھے۔ شارق مہتری
گھر میں نکال کر چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں قبو ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔

”یہ مہتری رقصاؤں کا رقص دیکھ رہے ہو۔ یہ طائفہ یہاں کا مشہور اور مزہ کا ترین طائفہ ہے۔

پتہ پہناتی ہے۔ سیر احوالی کے ہوشیار رقص دیکھنے کا اصل لطیفہ اسی گھر سے پہنچتا ہے۔ دریا کا
پانی بہت تیل کے ساعلوں کی مودہ کن ہوا۔ شب کا پہلا پہر۔ یہ سب جاوہل کر ایک عینا سحر آگئیں

”رہتے ہیں جو کسی زمینی رقص گاہ میں ممکن نہیں ہو سکتا۔“

”یہ ہی آنکھیں تو پہلے ہی اس ”قدنہ مہتری“ پہ لگی ہوئی تھیں۔ شارق کی اس جاوہلیانی پر مزید فعل کر

تے ہیں۔ میں دیکھ رہا تھا اس کا فریب لگام اور نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا جسم جس میں شاید بڑیوں کا کوئی
تھکا تھا۔ اس میں پارے کی مانند تحرک جس کی یہی تھی اور چٹائی کی گلابا ہٹ انسانیت جسم میں پیدا کرنا
تھیں۔ لیکن عربی انسل رقصاؤں کی یہی اک وجہ شہرت ہے۔ جس طرح پشتو فلموں میں رقص کا محور

بھر پور قسم کی کمرانچہ اور پیٹھ ہوتی ہے بالکل ایسے ہی یہاں کے رقص کا مرکزی خیال یا نقطہ اتصال بھی خوب گندرا لے ہوئے پیٹ کے سچ گہری نغمی سی موتی جڑی ناف اور بار آور سیٹ ہوتا ہے۔ یہ سامان داد و دہش تراکیب استعمال جس رقصہ کے ہاں وافر پائے جاتے ہیں وہی وقت کی آرزو اور مس آرزو رہتی ہے۔

دنیا کے ہر خطے ملک میں حسن و جمال کے اپنے اپنے انداز و معیار ہیں۔ جس طرح ہر شخص
 اک جدا گانہ انداز قرار رکھتا ہے اسی طرح جو ہر جمال کے پر کھتے دیکھنے کے لئے بھی ہر قوم ملک اور فرد کے
 اپنی اپنی پسندیدہ کسوٹیاں ہیں۔ کہیں کہیں تو انہی نکل جاتی ہے اور بات سمجھ سے بالا ہو جاتی ہے۔

پاؤ پاؤ بھر نکلے ہوئے ہونٹ ناک ایسی بیٹھی ہوئی کہ اسے بیٹھنا نہیں لینا کہتے ہیں۔ گردن
ویراجہ فٹ لمبی جس میں او بے اور چھریوں کے گزے پڑے ہوں۔ شوکت کہ شب و دیور بھی شرمائے
چھاتیاں پورے سپکے ہوئے چھیتوں کی مانند نیچے گھٹوں تک اٹکی ہوئی۔ بال ایسا کھنڈلا جس میں سرخاب میں
سنی پانخوں کا انجم ہوا ہو۔ جسے تو آدھیں چھیں، قہقہے لگائے تو بھیاں کڑکیں۔ ایسی ہوتی ہے جیسا افریقہ

[illegible]

مافیا، گرو اور گروہی، گھنٹھڑت کو گورت نہیں بلکہ گورو دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہر سے جلتے ہاتھ پاؤں افراس ج
جسٹیا ہوا چہرہ موم کے مو کے خدو خدو، گورو دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کی شکل گورت بھی جاتی ہے گورو
فرانسیسی اور انگریزوں امریکیوں کے اس گورت کا تصور ہوا نہیں متوازن اور مثیل ہوتا ہے۔ عام طور پر دیکھ

کے پاس عورت کا یا نا کاٹا ہوا بالوں اور بال بچوں تک محدود ہوتا ہے یا پھر وہ عورت جو دوسرے لیٹی بیٹی کی سرسبز کھیتی باڑی سے۔ جس کے منہ سے کچے کاروں کے تیل اور جسم سے سڑی ہوئی مچھلی کی پانی آئے۔ جس کی آنکھیں کھلنے کی طرح پھٹی اور بالوں کے جڑے میں بڑے قبولی آئے ہوں۔ لیکن 'جاپان' فنانس 'جاپان' کی

دوست نام و نمبر وہیں محاورے گفتگو کرتے ہیں۔ کوئی فیکوریشن پیش یا دینا دیکھو نہیں دیتا۔ اس وہ بانی مشین کی صورت
 ہوتی چاہئے۔ ان کے ہاں بالی آنکلیں ناک قد اعضا وغیرہ سب کا ریتو اور بے کار چیزیں ہیں۔ ان میں کلمہ
 محاوروں کو اکٹھا کر کر لیا جاتی ہے جو معلوم ہوئے اپنی کون سی ہے جو ان کون نہ ہو مگر تو وہاں کوئی ہوتی نہیں

ہاں کی صورت کے چٹے ہاتھ ہوتا ہی نہیں جسے کوئی زوال آئے۔ آٹھ سے کچھ کچھ نظر آتا ہو اور تاکہ۔۔۔

حضرت کا معیارِ حسن یہ کہ اس کی نفس چلتی ہو یا وہ پھر دوسرے کی بیٹی بسین بیوی ہو۔ ایسا بھی ہوا کہ جسے حسین نے جانا کیا تحقیق سے وہ بچھا نکلا۔ کہتا ہے تھا کہ مصر لینا اردن شام یا اسی قبیل کے "بھانویں" ملکوں کی تھیں کہیں "نانت" ملکوں وغیرہ میں جو در قاصد اور حسین عورت کا تصور ہے وہ اک تحرکتی ہوئی "زلزلہ زردہ گوشت" سے کی زرخیز پہاڑی کا نام ہے۔ جیسے ہمارے ہاں کوہساروں کی ملکہ "حسن مری" ہے اور اس کا بیٹا "حسن" کی "مال روڈ" والے چرچ کی ناف میں بعد قدرے اس کے پوسٹ آفس کے سیڑھیاں دار سینے اور باقی "غیر پوسٹ" پنڈی پوسٹ کی ناگموں اور سیسل ہوٹل کی بیٹانی وغیرہ میں ہے۔

ان عربی الفلز رتقا صاؤں میں کسی سختی پیمائشی سختی کی گنجائش بالکل نہیں ہوتی۔ کئی پکڑوڑاوتے ہوئے خوبانی کی مانند جس کا رسیا اس نظر کی معمولی چوب سے ہی ٹپک ٹپک پڑے۔ بھرپور اور بے حد جسے چار سو چالیس دولت کے ہنگامہ چھوڑ دینے کے لیے مسلسل بیخ کے دورے جاتے ہوں۔ کے پیٹ میں میں ناف کے نیچے لہرے دار قونچ کا گولا لٹکھوتا ہوں۔ گرمی کے احساس سے سرسری ہونے کے نامہ کمال بھی تہمت کی طرح دھرا ہوتا ہے۔

[illegible]

حیرا جلوانی بھی ایک ایسی ہی جسم بننے اور داؤ پیچ والی پہلوان رہا۔ مگر جس کی وجہ شہرت 'مندرہ' صاف انحصار تھی۔ انہی کی بنا پر ہمیں نے اسے پوٹھی حیرا پہلوانی کہا، یا تو شہر کی بگڑ بیٹھا۔

"تم جلوانی کی بجائے پہلوانی کہہ کر مہر بکھڑا دینا ہے عرب کی مایہ ناز اور قیمتی ترین فنکاروں کی توہین نہ کرنا چاہیے۔ شوگر کہہ کر تم اس وقت یہ نازیبا الفاظ ہر ادب سے ہو جب شاہ فاروق زندہ نہیں تھے۔ آجے نیکل نہ دکر نے سے خوشتر بھاری بھر کم فریب اندام حسینوں کے بارے میں ایسا لفظ نظر نہ دے اور انصاف اور بتا کر نام کشتہ سکی ہر دلعزیزی اور شہرت و نام میں کائنات کی نسبت اسی کی قدر نہیں کاڑیا وہ ختمہ تھا۔

یہاں کے دور میں مددشان تہران و تہریز نے نازک اندامی اور سبک تپی کی خاطر فاقے نغماں اور جسموں پہ گئے تھے شروع کر دیے تھے کہ شاہ شاہ بلوچ ہی کشیدہ فاقہ تپی پہند کرتا ہے شمشاد شیشم کی فروتنی نہیں۔ ایسے ہی

شاہ فاروق کے دور ”ذریعہ دروں“ میں۔ زمانہ مصر بازاری نے اپنی ہلکی کشتیوں کے ساتھ ہماری بھاری فکریں باندھنے شروع کر دیئے تھے۔ بیٹوں اور چھڑکیوں پر موٹی موٹی پٹیاں چھاتریوں پر آفتاب کے خلاف کھینچے۔ پتوں نے کپڑے کے استر اور شانوں کی ہڈیوں پر روئی کے ٹکڑے رکھتیں کہ مبادا شاہ کی نظر ان پر پڑے۔ محروم القات رہ جائیں۔

عمر کے وی آئی پی مہمان اور اولیٰ و اعلیٰ ترین توجہ کے اہل مسافر درجہ بدرجہ اپنی اپنی نشست پر فروکش تھے۔ شیشے خفّے چھپا ان سلگ رہے تھے۔ دنیا بھر کی اعلیٰ سے اعلیٰ شراب پیش کی جا رہی تھی۔ بڑے بڑے تاجے اور چوبلی طباقوں میں سامان خوردونوش سجایا ہوا تھا۔ سالم ڈبے نیل کی مچھلی ترکی وغیرہ کے مرغ زریں، مع رنگین پروکشی، دھنکیاں اور پانی کی ٹھیں، میٹھا کٹی شیرے بڑی بڑی جہاز کی روایت پر ظہیری منافقان بننے لگے تو اور خشک و تر میوؤں کا اک جہان طعام سجایا ہوا تھا۔ ذوق برق رواکتی بات میں موزب و محوک غلام سیاہ چشم چوکریاں بھرتی کر دی گئیں کوگرانی عیش و عشرت پہ اسسانی ہو جائیں۔ سارے سپرست "میرا بلاوائی" کا بیان خبر قصص گذشتہ تمام ہے۔ نام و نہاد نکستی شبابِ فدا ہے خدا ہی نے جسے پیدا کیا۔ وہ اپنے دل میں ایسا رمل جو میل جول کرتے ہیں جنہیں وہ جنگ بھنگ جلّا کہ ملاک نکال دیتا چانتی ہے۔ شاید ایسے ہی قصص لو کسی اور صورت میں سنائے جاسے تو قصص نکلتے ہیں اب کہہ سکتے ہیں کہ قصص درویش کی تو کوئی اور سی کیفیت ہوتی ہوگی۔ شامق اہل کے لئے کنفی سے منبوگا رہے گر گرم گرم قبوے کی بہالی دکھاتے ہوئے کہا۔

UrduPhoto.com

”آٹھ گھنٹوں کے ساتھ ساتھ تھوڑے اور زبان کو صبر و فہم رکھنا چاہیے۔ اس طرح اعضا و اجزاء کا اعتدال قائم رہتا ہے۔ کیا دیکھ نہیں رہے کہ سب لوگ کھاپی اور دیکھ بھی رہے ہیں۔ تو اسے کی ہلکی جھلک بھر۔ اس طرح صبر و استقامت کے رقص کی عشرت انگیز چٹکیوں کا اثر نہیں ہوگا۔ اور نہ اسے تو ہلکی جھلک ہی بیت کا سلسلہ بھی جاری رکھو..... وحیاً بننا رہتا ہے۔“

”شمارتو! مجھے یقین ہے کہ تم نے ابھی شادی نہ کی کا تھیں بھٹ نہیں پالے۔“

”تم غریب بچہ ہو۔“ اُس نے ”نمبر ایلوہانی“ سے تقریریں سنائے بغیر جواب دیا۔

”تجہاڑی صحت“ شہیت اور موجودہ کام کی نوعیت جاتی ہے کہ جنس لطیفہ کی چاندی نا چاندی ہے۔

”میں نے تمہیں کوئی راز نہیں۔“

اُس نے بغیر کسی ہتھیار کے اُس بے نیاز مئی کی حالت میں جواب دیا۔

”بالکل نہیں۔ تم نے جنس لطیف کا لفظ استعمال کیا ہے۔۔۔ میں جنس لطیف کو کشیف بنانے کے حق میں نہیں ہوں۔“

”ایسے شہوانی پہچان پیدا کرنے والے رقص اور مناظر تو تم روز ہی دیکھتے ہو گے۔ اس کا کچھ نہ کچھ تم بھی تو ہوتا ہوگا؟ جوان ہو، خوبصورت ہو، جبکہ پیر اور فنون۔۔۔ جیب و جسم میں ہو تو ضرور کھٹکتا ہے بولتا ہے۔۔۔ بلکہ پورا پورا توتا ہے۔“

میری جانب توجہ دیتے بغیر اس نے جواب دیا۔

”یہ بھی تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔“

معا مجھے محسوس ہوا جیسے وہ غنودگی یا جگے سے نشے کی کیفیت میں ہے۔

”شارق!۔۔۔ تم میرے سوالوں کا ٹھیک سے جواب نہیں دیتے ہو۔۔۔ معلوم ہوتا ہے جیسے تم نشے کی حالت میں ہو۔۔۔؟“

وہ اچھتی سی نظر مجھ پر ڈال کر بولا۔

”نشے میں تو نہیں بہت جگے سے غرور میں کہہ سکتے ہو۔۔۔“

UrduPhoto.com

”اگلی کے بندے اس میں ہمیشہ اس کام کے دوران اپنے قبوے میں مسرتی لیشکر کی رسم پڑھا کر بیٹھا ہوں۔

میں نے مجھے حوصلہ دیا کہ جی جی جی۔ تم بھی تو دو تین بیالیاں چڑھا گئے ہو۔ کیا تمہیں کچھ محسوس نہیں ہوا؟“

میں نے اس قبوے کے پچھلے دنگھوٹے کی کافی ہوتے ہیں مگر یہاں آجنا کہ تمہیں رسم ملا ہوا قبوہ چھو

مجھے نہیں گزرا۔“

میری قوسنی ٹم ہو گئی۔

”کیا میں قبوے میں شراب پی گیا۔۔۔؟“

”قبوہ کم بہت چیز ہی ایسی ہے کہ ہر بھی ملا کر پی جاؤ تو محسوس نہیں ہوتا۔ اس کی تخی میں ہر چیز کا سوا

تھا رہا جاتا ہے۔“

”تم نے میرے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔“

”جی ہاں پینے پے میں نے بھی اپنے وہ سست سے ایسے ہی شکوہ کیا تھا۔ پھر میں اپنے استاد سے

کہا کہ وہ مجھے قبوے میں مسلسل رسم پلاتا رہا جس پر میرے استاد نے بتایا کہ وہ بھی کبھی اپنے

استاد سے یہ حد خفا ہوا تھا کہ وہ اسے مسلسل تکی پر پلاتا رہا ہے۔ لہذا برا اور! گولان کی

پھاڑی والے بزرگ بابا کی لڑی لڑی سے ہر کوئی دانہ ایسے ہی جڑتا ہے۔ لو ایک پیالی قبوہ اور پیچہ کوشش کرو کہ سیرا حلوائی کی ناق سے نظر نہ پڑے۔۔۔۔۔

”یا اللہ۔۔۔“

میرے منہ سے بیساختہ نکلا اور میں عقل و فکر سے بیگانہ ہو گیا۔۔۔۔۔ باقی بعید جو کچھ ہوا وہ میرے فہم سے ماورا تھا۔

● نوین فقیری داد حوالاں تے سچی یاری کا بھانبر.....!

سات راتوں اور چھ دن کا معرکہ میرے دل کے جنوں پہ چھا رہی تھا۔ میںیں مجھے معلوم ہوا کہ خود کو بچا کر چھپانا۔ کتنا ٹھن ہے اس کی مثل یوں کہ کسی مفلس و نادار کے ہاتھ اگر کہیں سے کوئی خزانہ ہاتھ لگ جائے تو پھر کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ ایسی کہ اگر وہ سیانت سے کام لے کر اسے چھپا جائے۔ کسی کو کاکھوں کا خبر نہ ہو۔ اسے اور پھر میرے دماغ نے اپنی جائز ضرورت کے مطابق فریج کر کے۔ اپنا پہلا بال جلیبی طور پر یہ حال خلیہ نہ بدلا۔ اور وہاں پہلے پہلے اس کی موت ہو گئی اور اس کا دماغ اس کا دماغ لگاؤ میں نہ کر سکا۔ کچھ نہ بچ کر اسے کابھایا پایا اور کبابا۔ انہیں لگا نا چھپانا یہ مشکل کام ہوتا ہے۔

فقیر اپنی جھیلی کاروبار میں اپنی ذرا دیشی۔۔۔ اس طرح چھپاتے ہیں جس طرح کوئی تھواری تیار ہے پرم پریم کا بیٹ چھپاتی نکالی پھر نفی ہے۔ خود کو ملامت کے گڑھے میں کچھ کچھ آسان بھی نہیں۔ کچھ کچھ وہ گویا۔ اور جو ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ وہ دیشی ملاحتی کچھ کچھ میں ملاحتی۔ کیا کچھ کوئی کہ شہر کے حالات جذب میں جام بکھ۔ فی الرقصم وانا بخیر فی کے سامنے؟ مکتوبہ حلاج کا کھلی آنکھوں سے اسے دھندلا کھتے دیکھنا قیصر اور قیصر کو دانا۔ انہی کمال آوازوں کوئی کامسک نہیں۔ کسی فقیر اور دیشی کا منصب ہے۔ شہج بکھ ہوا کچھ۔ جام بکھ ہوا اور۔ فقیری اور دیشی کی راہ تو کوئے رسوائی سے ہو کر نکلتی ہے۔ نف نف نف بکھ بکھ موشام کھٹے ٹھوکر میں ڈھانچاں بکھ بکھانیاں۔ تصویریں سقوت نہیں آتوے۔ سرحدیں کھڑے زنجیریں عقل اور دارودن۔ یہ سب کچھ ان ہی کے لئے تو ایجاد ہوا۔ ولی تو انکھ سے ان جاتا ہے۔ ماں کی دھاتے بن جاتا ہے۔ آنکھ کی حیا سے بن جاتا ہے۔ مگر فقیر اور دیشی تو سرحد سے بکھ اور نقشا سے دھاتا ہے۔ اسے ملامت میں اور ملامت کے لئے بنایا جاتا ہے۔ یہ دیوہیں شیطانی عقل کا نظر بنو ہوتا ہے۔ یہ مخلوق خدا کے لئے پیگار کا ٹو ہوتا ہے۔ یہ چنوروں کے لئے چنو اور اپنے خاندان

جس کی نظر میں کھٹا ٹھٹھو ہوتا ہے۔

یہ صدقے کا کالا بڑ بچہ۔ جو نہ تو صحیح سے مانگوں پہ کھڑا ہو سکتا ہے اور جس کے منہ سے ”میں“ تو
کب سے نکلتی ہی نہیں۔ جو چھری تو کیا محض قصائی کی نوپاتے ہی خود بخود داغ ہو جاتا ہے۔

میں نے جانا کہ بچے میں جو کچھ رہ جائے تو کبھی پختہ نہیں ہوتا۔ بچے میں کچھ اس وقت تک نہیں اٹھتا
تک سنگ میل ہیں۔ ہر سنگ میل اپنی گزشتہ سے مختلف اور سخت آزمائش کا حامل۔ کوئی بے یقینی اور
تکلیف کے جنگل کے پاس گزرا ہے۔ کوئی بدعت و شرک کی دلدل کے قریب ایسا رہا ہے۔ کوئی سنگ
میل کچھ بے راہ و ابہام کے صحرا میں سراب کی مانند ہے۔ غرضیکہ مجازی اصل چیز ہے یہی بھگی سی تبدیلی سے
جستہ دل میں بدل جاتا ہے۔ یہ انوار انوارِ حیدر کی قوتِ جبرِ تراشہ جاتی جاتی ہے تو مجاز اور حقیقت کا مسئلہ ہی
نہیں رہتا۔ بس حق حق ہی ہوتا ہے۔ کوئی ڈوٹی ڈوٹی باقی نہیں بچتی۔ کوئی کھوکھلا نہیں رہنا چاہئے کہ
اس کی کھوکھلی گھنٹا بوندی کے چکر لگا رہتا ہے۔ لوگ اسے دھند دھند نہیں مانا کرتے کہتے ہیں

کہ وہ چلے تو خیر نہ جاتا ہے۔ پھر کھارو جائے تو کھانہ نہ جاتا ہے نہ لڑکھا۔ تو زندگی کے
سب سے بڑے مسائل اس کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اس کی ساری خواہشات کی دودھ جاری
ہو جاتی ہے۔ کیا پھل انسانوں سے زیادہ پختہ ہوں گے نہ ہوں گے کام آتا ہے۔ کیا طبعِ جاہلیت میں لسان
کھلتا ہے۔ کشتہ کھانے تو جوں میں بیٹھ کر ہینا طراب بنا دیتا ہے۔ تھوٹتی ہوئی خواہشِ خواب یا
بائے باقی یا محنت۔

”بھئی رو گئی جہانِ دی یاری اور چٹاں سے رونا کھڑیاں“

نئی کانٹھ بات اور کھات۔ بھئی رو جائیں تو وقت پہ بڑا بچہ نہا دیتی ہیں۔ ذرا سی سستی منسوب اور
بھول کر بچے ہوں تو بڑی مصیبت ڈالتے ہیں۔ بھئی آکھ کینڈو کھڑے میدان میں اُدھر وا دیتی ہے۔
بچے کھٹے کھٹے دیتے ہیں اور بھئی زبانِ بھری پر لوری میں ٹاک کھڑا دیتی ہے۔ کیا لوہا کپالہ کے مول
کپالہ کے تیرہ ر کے بول کا۔ کیا پتھر کھج کے بول کا اور کیا مٹیا پھولے کا نہ پھپھول کا۔

ان سب باتوں میں سب سے زیادہ نقصان دہ فقیر کی کاٹی ہے۔ کہا گیا کہ ”لوہیں فقیری تے او پھری
سیا کپا فقیر اپنے اور لوہوں کے لئے ہر پاروں کی اک لکیر ہوتا ہے۔ وہ راندہ درگاہ اور بے سما
مذہب۔ شوقِ خدا کے لئے اک طراب کا درجہ رکھتا ہے۔ دیکھے ہوں گے کہ بڑے بڑے چرمولے
کے ساتھ بیٹے نام نہاد و رویش و فقیر۔۔۔ دن رات چرس بھگ کے نشے میں ڈوبے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں

جس وقت اور دستِ عال ہوتی ہے۔ غضبِ خدا کا قبروں، آستانوں، مسجدوں کی دیواروں، صحنوں اور حجرے میں تحریرت بھرے جاتے ہیں اور ہر کسی حیا و حجاب کے نخلِ کھلا سونے لگائے جاتے ہیں۔ ہنگامہ نام نہا میں جنگ اور مُرشد اس کا رعبیت میں شامل ہوتے ہیں اور اسے فقیر کی زحویں کا نام دیتے ہوئے نہیں کہتے۔ الحفیظ والامان !

[illegible]

”بابا جی اگر پہنچ کر کچھ آرام فرمائیں پھر گوش گزار کریں گے۔“

مجھے کھڑک گئی کہ جس کام کے لئے آیا ہوں وہ کچھ مزید جگہ چکا ہے۔ تینوں افراد گم صمم نہ ہو سکتے تھے۔ میری طبیعت آہستہ سی گئی میں نے دوبارہ دریافت کیا۔

”سائیں! زندگی موت، دیکھ سیکھ تو ساتھ ساتھ یونہی چلتے رہیں گے ان سے تو مضر ممکن نہیں۔“

بولو تم لوگوں کے مُتہ کیوں بنے ہوئے ہیں؟“

ایک بڑے نے بادل تو آستہ زبان کھولی۔

”بابا جی! ہم تو جیتے ہی بردہا ہو رہے ہیں۔ کوئی مر جائے تو صبر آ جاتا ہے لیکن اگر کوئی گھر

سبک سبک کر مرے تو کسی طور پہچن آتا ہے نہ صبر.....“

وہ ہلکی ہلکی سسکیوں کی گرجیں لگاتے لگاتے چلا۔

”بشارت کہاں ہے۔ گھریا کہیں۔؟“ میں نے معاملہ کی ضمنی سن لینے کی خاطر پوچھا۔

”جی ہاں آپ کے آنے کی خبر پاتے ہی کل رات گھر سے بھاگ گیا تھا..... ہم پہنچے تو مرنے ہوئے

کے مُرشد کے پاس پہنچے تو وہ اپنے باپ کے قدموں میں بے ہوش سا چلا ہوا تھا۔ ہم جو ٹکی جاتے

کو اٹھانے کے لئے کھڑے ہوئے تو وہ بے ہوش ہی رہا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ہمارے دل میں

مشاہدہ مُرشد چلی ہو رہی تھی کہ اس کی محنت میں ضللہ انداز ہو گا وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ ہم وہاں

دیر اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتے رہے مگر وہ شاید لہا ہی نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔

”خدا ہو گی۔ وہ جتنی بھی حالت میں تھا آپ اسے اٹھا کر گھر لے آئے۔“

”ہیہا بھی کئی بار کر چکے ہیں۔ مگر جان کے لانے پڑ جاتے ہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد

طرح طرح اوروں اور اوروں سے سر پچکتا ہے۔ خود کو کتوں کی طرح نوپتے کھسوٹے لگتا ہے۔ اول فر

ہے۔ مگر والے سنی کہ ہمسائے اور گلی محلے والے بھی عاجز آ جاتے ہیں۔“

”یہ بابا کیا چیز ہیں.....؟“ میں نے مزید دیکھنی لینے ہوئے پوچھا۔

”جی! دراصل وہ کوئی عمر کے لحاظ سے بابا نہیں بلکہ ایک بارہ تیرہ برس کا بچہ ہے۔ کسی سے

بیرت نہیں کرتا۔ لوگوں میں چپ شاد سرکار مشہور ہے۔ نیم اندھ ہے۔ کچے سے دالان میں ایک لہجہ

چاندروں سے نہ جانچی ہوئی قبر کے پیلو میں پڑا آئے جانے والوں کو خالی خالی نگاہوں سے تکتا رہتا ہے۔

تو خوش ہو کر لے لینا ہے ہاں پاس پہنچ کر سلام کرنے والوں کو تھپا داتا کہنا نہیں لہجوں۔“

”واہ.....!“ بے ساختہ میرے مُتہ سے نکلا۔ ”وہ قبر کس کی ہے اور چپ شاد سرکار کیا وہاں کا

کسی انتہائی بد بخت و سیاہ قسم کے استاد نشئی نے نوستے اب چرک سے آشنا کر دیا۔ جو کسی نشئی کے لئے آخری نشہ ہوتا ہے کہ اس کے بعد تو زہریلے سانپ سے زبان پڑ سوانا ہی آخری حربہ رہ جاتا ہے۔

بے وقار لوگ واقف ہیں لیکن چرک سے خال خال ہی کوئی آشنا ہوگا۔ کیونکہ یہ خاص ایک خطرناک قسم کے گھس سے معرض وجود میں آتی ہے۔ اسے نہ تو ہر کوئی استعمال کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی عام آدمی اسے بنا سکتا۔ جس سے ملے تو نشئی پریشان ہوتا ہے تر و رک اور کمزوری بے چینی محسوس کرتا مگر عام حالات میں نہ سمجھتا ہے اور نہ ہی مرنے مارنے کی حد تک اترتا ہے۔ مگر سب ہی توجہ محبت اور علاج معالجہ سے چرس کی شدت کم بھی کر سکتا ہے مگر اس ذلیل چرک کا چرکا جسے ایک بار پڑ جائے وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

اس کے علاوہ کوئی رشتہ کوئی نصیحت اور کوئی عقوبت اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ انتہائی طلب کی حالت میں وہ خود کو اپنی کلاہیوں انگلیوں زلفوں کو کاٹتا ہے لہو لہان ہو جاتا ہے پھر سنے کی طرح اپنے ہی خون کا سوا دلے کر اپنے تسکین حاصل کرتا ہے۔ چرس اور چرک خون کی ایک اک بوتل میں اپنی گھسٹ آفریں بدبو کے ساتھ چھپاتی ہے۔ نشئی کے ہاتھ پاؤں ایسے تھوک سانس اپنے زوال۔ گھسٹ اس کے سچ استعمال

UrduPhoto.com

کے لئے بتاوت کے مرتے ہیں اس ہو کر دوا دوا سے ہمارا لیا تھا۔ چونکہ ان کی دیوی بیٹے اپنے گھر سے دور رہتی تھی اس لئے گھر اچھے بالکل خالی رہا۔ گھر سے کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر موجود تھی۔ گھر کے اندر اندر باہر کی طرح تھی۔ میں ہر اک چیز کو بڑے غمزہ دل کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ اس گھر سے کتنی کتنی قسمت لے کر آئے ہیں۔ لیکن جو کچھ میں نے ان کی حالت کی حالت کی حرکت نے کیسے بھرے پر سے لے کر آئی وہ بادی کے دہانے پہلا کر کھڑا کر دیا ہے۔

میں اسی و گروں حالت میں ایک کرسی پر بٹھے سا گیا۔ نیم دلو آنکھوں سے کمرے کی ایک ایک سے دیکھنے لگا۔ قدرے طبیعت ٹھکانے لگی تو میں نے توجہ دینا شروع کی۔ سب سے پہلے میری ناک کے سامنے وہی کہ یہاں چرس نہیں بلکہ چرک پینے والا رہتا ہے۔ اپنی تصدیق کی خاطر میں اٹھا اور سامنے کھڑا ہوئی پہلی ہوئی شلواریں کو نہ ٹھکا کہ ان کپڑوں کا مالگ مجھ سے نہیں چرک پڑا ہوا ہے۔

چرک کیا ہے؟ اس کی دو اقسام ہیں۔ ایک فنی اور دوسری بھگوا۔ خطرناک تو دونوں ہیں مگر فنی زیادہ ہی مہلک ہے۔ اسے فنی اس لئے بھی کہتے ہیں کہ یہ نشئی کو مکمل بامرد کر دیتی ہے۔ اول الذکر میں چرس کے کچھ دھوئے حقے کی شکل کا نور کامل کیا چوبائش کے بیچ اور نشئی مقرب سیاہ ان سب چرکوں کا خاص مقدار میں لے کر ایک جان اور غلیظ ہونے تک کھرل کیا جاتا ہے۔ قطرہ قطرہ روغن ارڈی

بھی شامل کیا جاتا ہے۔ سایہ میں ٹیم شکل کرنے کے بعد کالے پنے کے برابر قرصی باٹ لینے جاتا ہے۔ دوسرے ورے پر ہنگڑی۔ تو اس میں اضافہ صرف خم بھگ پست و طبرہ کا ہوتا ہے۔ جس میں جیتے تی فارغ کرنا ہوا ہے کسی رنگ ڈھنگ سے چرک بھر اسگریٹ پلا دو نوو پھر اپنے آخری ذموں تک موزی سے اپنی جان نہیں چھڑا سکتا۔ ہاں البتہ صرف ایک طریقہ ہے جو آگے چل کر بتاؤں گا۔

بشارت کے کمرے میں ہمیں نے اس کے تن گے کپڑوں کے علاوہ اور کئی ایک روزمرہ کی چیزیں بغور مشاہدہ کیا۔ اس کمرے میں مختلف جگہوں سے بچھے کئی ایک تھوٹے اور کالٹھوں والی ڈوریاں بھی ملیں۔ ان کے تصویریں ابھین سے لے کر شاہی تک اس کی ڈائری اور خوشبوئیں۔ میں اس نتیجے پہ پہنچا کہ وہ ایک عورت و مددگار شخص شوق و ذوق اور صحت مند نوجوان تھا۔ وہ غیر بیرونی فقیروں کی جس دلدلی میں ناک موندھ چکا تھا ماضی میں صورت حال کا کوئی وہ تصویر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو واضح ہو چکا تھا کہ وہ چرک نوشی کرتا تھا جس کی عمر وہ اور نیک ترین بدبو کپڑوں کے علاوہ کمرے میں موجود تھی۔ میں نے ایک فیصلے پہ پہنچتے ہوئے وہ اندر کھول دیا یا ہر سب گھر والے منہ لٹکانے والے پریشان خاطر سے میرا انتظار کر رہے تھے۔

پیشانی اور نا اہلی۔ اسانی۔ کا ہذا اور کمرے میں ہے جس سے ہمیں یہ شعور ہوا کہ نکل آتے ہیں ان کے لیے ہر کمرے میں ایک خاص چارٹ ہے۔ ان کی بات ہے چارٹوں کی تصویر دیکھ کر ہمارے سے ہر دوپہر کے لئے اور حاد لے کر لگا یا ہوا ہے۔ کمرے کی ایک حالت میں سے اندر کے کچے کھانے سے سوچیں کہ پہلے ان سے چاروں کو نا اہلی کی اور ان کی کیفیت سے چاہئے۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو یہ کہہ دیا کہ اب میں میز کے پاس لگے یہ لکھتا ہوں اور انہیں بھی سامنے صوفوں پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب سب بیٹھ گئے تو میں نے بشارت کی ایک صورت سامنے رکھا۔

پاس پڑی ہوئی ٹومٹی اور کریتوں کو جاکر سر پہ ڈر کر چھٹنے لگا۔
 بے کیش بے کیش بے کیش دیا داتا دا کی پارہتی پتا مہا دیو
 پان ہڑے پھول اور چڑھے سیوا لڈوں کا بھوک لگے سہیل تیری سیوا
 تھوڑی دیر خاموشی کے بعد میں نے پلٹ کر ان سب پہ نگاہ کی۔ سب آنکھیں بند کر کے
 استغفار سے لہروں سے میری جانب تک رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ میری یہ حرکت اور شہدائے ان کی کھڑے
 تھے۔ میں نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ پوچھنا چاہیں گے کہ میں یہ کیا کر رہا ہوں۔ دراصل میں بشارت مہاراج کی بات کر رہا ہوں۔ کیونکہ یہاں کوئی پاک کلام اثر کرنے سے رہا اب وہ جس صورت حال اور نقشے میں پہنچا ہے۔“

سب وہ یہی کار کام اُڑ کرے گا۔

جس بیٹے اکھاں لال پھڑے جاؤتے چوترا لال نس جاؤتے ٹھوٹے لال
ان کت کو تو آپ لوگ سمجھ گئے ہوں گے۔ بشارت کو اس حالت میں پہنچانے میں آپ سب
توں کا بھی حصہ ہے۔ پیر فقیر گنڈے تعویذوں اور چرس چوک نے اسے ناک نہ تک فرق کر دیا ہے۔
اب صرف آنکھیں ڈوبنے کو باقی رہ گئی ہیں۔ مطلب یہ کہ صرف پاٹی فیصد چائس ہے۔
انس کی ماں اور بھینس سسکیاں بھر بھر کر رونے لگیں۔ باپ کو تو جیسے ہو گیا تھا۔ بڑا بھائی بولا۔
"بابائی اب کچھ آپ ہی کوئی حل نکالیں۔ ہم تو سب ذہنی طور پہ مفلوج ہو چکے ہیں۔"
میں اک لمبی سی ہنوں کر کے سر ڈال کر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے سر اٹھایا اور کہا۔
"بیوی گناہ ہے۔ کوشش کر کے میں کوئی حرت نکلیں۔"
پھر میں نے بھی کھول کر تعویذ گنڈے دکھاتے ہوئے کہا۔

تعویذ آپ میں سے ہی کسی نے یہاں مختلف جگہوں پہ لپھپھائے۔ وہاں ہوتی ہے بیوی
... اس کے بعد بھائی اور بھتیجی کی آواز سنائی دینی لگی۔
... پھر ان کے گھر اور پھر اسے تک لے کر اسی سرے سے لے آیا اور بے دین اس دوران
... ایک چپ شاہ کے ذریعے جا کر معلوم کرے کہ بشارت وہاں موجود ہے یا نہیں۔ اس سے
... و میری مثال اس بیوی کی کے متعلق جاننے کی ضرورت نہیں۔"

روحانی شاہ کے قبرستان کی دوسری جانب گولان کے بارے سنے۔ کھیت باغات، کچے چڑے اور
... ان کے
... کے رخسوں کے ٹھنڈے میں یہ فیر و تھا۔ مزہ کچلی اور آمد و رفت بھی کافی۔ موٹر کار
... میں آدھ گھنٹہ لگا۔ گاڑی نہ لگ پھی پھور دی تھی کیونکہ آگے کچا ٹھک اور پیدل راست
... پانی پینے چھانے ایک دوسرے کو قہقہے بولے تھے۔ تھوڑا سا دھرم چارہ بنے
... وہاں تو دنیا ہی الگ تھی۔ ٹولیوں ٹھکڑوں کی سورت نشتی دھنوں کے پیچھے پیچھے
... پانی میں مصروف تھے۔ سینیں اگر ساتھ نہ ہوتا تو کوئی بھی ہماری جانب توجہ نہ دیتا۔ لوگوں کا
... وہیے میں کہیں بھی جاؤں لوگوں کا میری جانب متوجہ ہونا لازمی امر
... میرا کالا لباس اچھہ دھبہ لگنے کی مالا نہیں آگوشیاں وغیرہ بددی لوگوں کو متوجہ کرنے کا موجب

ملتی ہیں۔ ایسی صورت حال سے ایسا اوقات میں خود بھی پریشان ہو جاتا ہوں۔ یہاں بھی قریب قریب سب عالم تھا۔ میں آگے آگے دوسرے لوگ پیچھے پیچھے۔ وہاں کے ”نشر نشینوں“ نے مجھے کوئی سیر فرشتہ سمجھ کر ہونے سلام کرنا شروع کر دیے۔ چند آگے آگے اور کچھ پیچھے پیچھے ہو لینے۔ سامنے ہی وہ کچا پکا کوٹھ جس کے دالان میں ایک بڑی سی قبر تھی جس کے پاس مظاہر مسندوں کے آگے چپ شاہ سرکار یعنی وہ کچا پکا ننگا دھڑنگا لونڈا دکھائی دیا۔

سیارہ رنگ لنگھنے کے ہوئے وہ بچہ یوں اکڑوں بیٹھا تھا جیسے حاجت ضرور یہ سے فارغ ہو رہا ہو۔ سر کی جھکیں بڑھی ہوئی سالولی سی رنگت اٹھنے میں نقش سپید و انت اور ڈیلے۔ دوسری نظر میں مجھے دوسرے عالم والا جنگل بوائے صابو دکھائی دیا۔ یقیناً اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا کیونکہ وہ اپنی جگہ پر گھبرایا سا کھڑا ہو گیا۔ اس کے ارد گرد بہت سے چیلے چائے جیسے ٹوٹے لگا رہے تھے۔ ہم قریب پہنچ گئے۔ میں نے دائیں جانب بشارت کے بھائی سے کچا پچھو کی۔

”بھائی میں بشارت دکھائی دے رہا۔“

”نہیں فرما جواب دیا۔“

UrduPhoto.com

میں نے مزید آگے بڑھنا مشکل تھا۔ دالان میں جس کے دھڑکیں کے تھمار اٹے تھے۔ جسے دیکھ کر دھڑکنے والے ریلوے انجن کی طرح دھڑکیں کے باؤں اٹھ رہے تھے۔ میں پاس بشارت کے پیچھے پہنچ کر رک گیا۔ ایک بائیں پیچھے بھی بشارت سے ٹکرائے ہوئے تھے۔ وہ چپ نشین تھا۔ اب مجھے دیکھ رہا ہے اور میں اسے کھور رہا ہوں۔ شاید اس کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں وہاں کھڑا کیا۔ اور کھور کیوں رہا ہوں۔ کچھ سال پہلے اسی کو کوری میں بیت گیا۔ آ کر کارروائی تک دھڑنگ حالت میں کھڑا۔ چاہے نہ آ یا اور اب وہ بالکل میرے دروازے پر کھڑا تھا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ میرے پاؤں پر گیا۔ میں نے اس کو اٹھایا۔ پوچھا۔

”چپ شاہ جی! کیا حال ہے۔“

وہ غم میں غم کر رہا تھا حال بتانے لگا۔ وہ غم میں غم تھا اس کے منہ اور جسم کے سب سے اہم جہز جو اٹھ رہی تھی۔ میں نے قدر سے سمجھا لیا۔

”چپ شاہ جی! ہم اپنے نچے بشارت کو لینے آئے ہیں۔“

اس نے پلٹ کر ڈور پڑے ہوئے بشارت کو دیکھا۔ قدرے توقف کے بعد غموں غاں اور ہاتھ سر کے

... سے کچھ بتانے لگا جو ہماری سمجھ سے بالاتر۔

اب میں نے قدرے دیرینگی سے زور دے کر کہا۔

”خپ شاہی! ہمارا یہ بچہ بڑا قیمتی ہے۔ اسے ہم نے ہر قیمت پر یہاں سے لے کر جانا۔ مجھے شک ہے تم لوگوں نے چرک پہ لگا کر اس سے خاصے پیسے بنو رہے ہیں۔ اب تمہاری بھرتی اسی میں ہے۔ یہ فنی کا عادی ہے یا بھنگڑی کا؟ کہ میں اس کا کوئی آپاٹے کر سکوں۔“

خیریت یہ رہی کہ اس کی قسمت اچھی اور ہمارے بچے کی تقدیر کہ دونوں بچ گئے۔ خپ شاہ واپس اپنے محلے پہنچا۔ وہاں سے ایک پڑا لاکر مجھے تھمائی اور غلوں میں لٹا کرے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے ناک دھرا تو وہ خسی چرک تھی۔ بشارت کو اٹھا کر ہم چلے آئے۔ راتِ مشاء کی نماز کے بعد خپ شاہ اپنے دو تین چیلوں کے ساتھ ہمارے پاس آیا۔ ہاتھ جوڑ کر معافی چاہنے لگا۔ اور ایک پوتلی لٹا کر بولے غلوں میں لٹا کرے لگا۔ اس کے چیلے نے بتایا کہ بشارت نے یہ زیورات اٹھ گھڑی ہمیں دی تھی۔ اب آپ کو واپس کر رہے ہیں۔ خپ شاہ اور اس کے ساتھیوں نے پھر ایک بار پاؤں پڑ کر معافی چاہی۔

میں نے ہر بعد اٹھنے کے لیے ایک لی کھا کر بشارت کو واپس لے کر دیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر معافی چاہی۔ اور ایک پوتلی لٹا کر بولے غلوں میں لٹا کرے لگا۔ اس کے چیلے نے بتایا کہ بشارت نے یہ زیورات اٹھ گھڑی ہمیں دی تھی۔ اب آپ کو واپس کر رہے ہیں۔ خپ شاہ اور اس کے ساتھیوں نے پھر ایک بار پاؤں پڑ کر معافی چاہی۔

یہاں یہ مقصود تھا کہ میں فقیری جمہوری اور ملٹی سکتی خطرناک ہوتی ہے۔ اور غشیات کے عادی اور حالتِ اجست کرنے والے کسی شخص کو کبھی کبھار غشیات کا مشاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ یاد رہے کہ بدستی حالتِ اجست سے جبکہ بدستی مشاہدہ ذات سے اور جذب و کیفیت مشاہدہ ذات سے پیدا ہوتے ہیں۔

پس بدستی اور بدستی و جذب میں فرق محسوس کرنا ہی اصل بات ہے۔ غشیات کا عادی شرع کے خلاف کسی قسمی اور دینی تعلیم سے عادی نہیں بن سکتا۔ بلکہ وہ خود کو تو جو ہو سکتا ہے راہِ فقر کا فقیر اور غلوں کا غلام بن سکتا۔ ہاں میں بعض فقیر اور غلوں سے حالتِ جذب اور عالمِ بدستی میں ایسی حالتیں ہوتی ہیں کہ وہ بدستی میں بہرہ ور اور شریعت سے باہر دکھائی دیتی ہیں۔ چونکہ ہر انسان کے اندر ایسی باتیں ہیں کہ وہ کسی بات یا حرکت و عمل کا مکمل سیاق و سباق کی روشنی میں احاطہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ عادی غشی کا یہ عالم ہو جاتا ہے۔ فقیر اور غلو میں جذب و عام انسان نہیں ہوتے۔ وہ موجود نہیں ہوتے ہیں۔

یہ کہیں اور ہیں۔ وہ کہتے کچھ ہیں مطلب اشارہ کچھ اور ہوتا ہے۔ وہ گھٹک راہوں کے راہی ہوتے ہیں۔ اشارہ کنایہ استعارہ۔ وہ مستور گفتگو کرتے ہیں۔ چنانچہ ابہام قدم قدم پہ موجود ہوتا ہے۔

سات سے دن اور دن سے شام اور چھ رات کا جہنم لینا۔ کیا یہ ثابت نہیں کرتا کہ روشنی کے ساتھ تاریکی
جیسا کہ حقیقت ہے۔ بارے درویش بھی اک مداری ہی ہوتا ہے مگر ایک کے دو اور دو کے چار بنانے والا
نہیں۔ دو چار کے دو۔ دو سے ایک اور پھر وہ ایک کو بھی صفر کر دیتا ہے۔ اب صفر سے نقطہ نکالتا ہے۔
پہلے سے "ا" کا گنت پکڑتا ہے۔ جو ٹٹی کا صیغہ ہے۔ ہر اثبات کو ثابت کرنے کے لئے پہلے نفی کو سمجھنا
ضروری ہے۔ اللہ کو معبود اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسول جانتے کرنے کے لئے پہلے نفی کا صیغہ یعنی
نہیں کا نہ پڑتا ہے۔ "نہیں" کو جان کر ہی "ہاں" سمجھ میں آتا ہے۔ یہ سارے کام جو ہم سے گولان کی
پہچان والے بزرگ بابا اور سلیمان آئی کروارہے ہیں۔ یہ سب نفی کو جاننے کے بغیر ہیج اسباق ہیں۔
انہی نمونے قطب پیدا ہوتے ہیں۔ انصیر درویش امجدوب گھڑے جاتے ہیں تھاپے جاتے ہیں۔ ترانے
سرمیلنے جاتے ہیں اور جس فن پادے کو شیعہ کار بنانا منظور ہوتا ہے کو بے خواہشا خواشا چاہیچا پرکھا اور خلی گرنی
سے گرا رہا جاتا ہے تاکہ اس میں کسی کی خامی کا امکان باقی نہ رہے۔"
وہ اپنی ہی کبے چار ہاتھ اور میں ہٹ ہٹ اُسے تھکے جا رہا تھا۔

UrduPhoto.com

درویش چلی گئی۔ اس نے اپنے چار پروردگاروں کو یاد دلایا۔ اس نے کہا۔ اس نے پتہ بھی
نہیں دیا۔ سورقوں سے واسطہ رہتا ہے۔ یا تو کھالے والے یہ تھا شاہ اور دھرمندہ مارگر بیت مسجد کو اب گریز
نہیں۔ ہر شہر ہاشمی اور سولہ چھوٹی میں رہ چار اٹھے تو اگر بھوکا ہی اٹھ کر آہوتا سے کھانا ملتی اور مریں ہو تو
میت کی پادشہ کا شکار ہو جائے۔ یہ بھی کہہ سکتی ہیں کہ یہ تھکے تھکے ہیں اس کی ایک بات گرو نیلے
پہلے کی سچی کرتا تو پہلے بدھی ہوئی گرجیں ڈھنچیں چ جائیں۔ اب پھر سے لئے جی ایک چارہ رو گیا تھا میں
اگر کھانے کو ملو اپنے کی مانند کھنی کھنی آنکھوں سے اسے بس منہ منہ خدا دیکھتا ہی رہوں۔ اُسے ہکا سا
پہنے کی نہ طر میں نے اپنی ہی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"چاہو تو اپنا دم رازست کرنے کی خاطر قبوے کا ہکا سا گھونٹ لے لو۔"

تیز رفتار گاڑی کو ایک گھنٹہ تک ایک ایکے جا میں تو ایک زوردار بھٹکا ضرور محسوس ہوتا ہے۔ میں تو
لگے کے لئے تیار تھا مگر اسے یہ ای مداخلت سے شاید خاطر خواہ بھٹکا لگا تھا۔ مجھے غصہ لگیں نکالوں سے
کھڑے ہوئے جو اب دیا۔

"سہیں جانا ہوں تم مجھے ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔ پر گیا کروں وقت محدود اور کہنا لامحدود ہو تو
بے حسہ ایسی ہی صورت حال پیدا ہوتی جاتی ہے۔ پانی کا دھارا نہ جوش تندہیز ہو اور گگیا کا حلقہ تنگ

اگلے چھ سات روز میں اسی طرح دن رات کی صحبت و مشقت میں گزارا۔۔۔ دن کا خاصہ حصہ اس صبح بیداری کی صحبت کی گزر رہا تھا جبکہ شام اور شروع رات کا بقیہ خاصہ شائقِ بطل کے ساتھ غبارے بھرنے کی مشقت میں خرچ ہو جاتا۔۔۔ پانچویں چھٹے روز تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں روزِ ازل سے اسی جہاز میں ہوں۔ یہی غبارے بھرنے کی بیچارہ نصیب و موسیقی کے بے گھر گئے اور شعبہ بازیِ نظر بندی کے کھیل قماشے اور کتنی ہی سیری زندگی ہے۔۔۔ واپسی کے آخری روز اگر شائقِ بطل اور اس کا استاد مجھ سے الوداعی بات چیت کرتے تو مجھے محسوس ہی نہ ہوتا کہ سیری کوئی ڈنیا۔۔۔ اسی جہاز اور اسی کے کھیل قماشوں سے بہت کچھ بھی ہے۔

● گپ سلطانی۔۔۔ وگدی ندی واپانی۔۔۔!

جہاز قاہرہ کی چٹنی سے لگا تو میں دوسرے مسافروں کے ساتھ نیچے آکر ایلیپٹس سائے ٹائم ٹاور کے نیچے مار یوں کا پورا "گر وہ" مشروبات سائے دھرے بیٹھے کھائی دیا۔ نگاہیں چار ہو گئیں ہی اس مصری لڑکے نے مجھے آٹھ کے اشارے سے بلایا۔

UrduPhoto.com

وہ ایک ساوہ سا مشروب مجھے چھاتے ہوئے مزید کہنے لگا۔

"کیونیل کا گھنٹہ بازی دلچسپیاں۔ ہماری دوستی گپ شب و غیرہ کیسی لگتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سفر اور نہیں لگیں بھوکو کھیں۔ اور ایک خاص بات۔ یہ کہ یہ کھانا کچھ مٹل ہی نہیں ہوتا سب تک وہ کھانا کھانے سے اپنا تعلق نہ جوڑے۔۔۔ جہاز صبح کا ہو یا کالہ یا پانی کا اپنے مستقر پہ ہی سفر اتمام کرتا ہے۔ اس کے کنارے دلچسپیاں سب جارحی اور ناقابلِ ہوتی ہیں۔ اصل حقیقت منزل اور آتی خوشی ہے۔ آواز سے منتقل ہونے والے حرف انجام سے ہوتی ہے۔ یہیں سے آواز ہوا تھا یہیں انجام لگے۔۔۔ ہو یا ہو کیا اور سمجھا اس کے علاوہ سب کچھ بھول جاؤ۔ جانتے ہیں!"

پھر ایک بوتل پر چھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"جانتے ہیں ایہ دھکی عالی بوتل میں نیل کا پانی ہے۔ بڑی نایاب اور کام کی چیز ہے۔ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ لے کر سفر کیا کرتے ہیں۔ یہ کہاں کہاں اکسیر ہے اس کے کیا کیا شرفا ہے ہیں۔ چاند کے گھناؤ اور سورج کی اس کے آرا پر دیکھنے سے کیا کچھ نظر آتا ہے۔ یہ تمہیں پھر بھی کہیں اور سے معلوم ہوگا۔ اور ہاں یہ جہاز بھی تمہارے لئے اچھے کا باعث ہوگا کہ چند چلو اس پانی کا تعلق محض نیل سے ہی نہیں بلکہ اس آبِ جُو

سے بھی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب کرتی ہوئی فرعون کی فوج کی تباہی کا سبب بنی تھی۔ یعنی اس راستے کا پانی ہے۔۔۔ جو بہتے دریا کو دلتخت کرنے سے واقع ہوا تھا اور۔۔۔

مخامیر سے منہ سے نکلا۔

”مگر دریا تو دلتخت ہونے کے بعد پھر ویسے کا ویسا ہی ہو گیا تھا۔ پھر کسی آپ نبو کا وجود کہاں پیدا ہوا؟ اور یہ بھی کہ اس خاص نخل وقوع کا تعین کیسے ہوا کہ جس کا یہ مخصوص پانی ہے؟“

وہ مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”مائی ڈیئر پینٹلین! ہاں کی کھال اتارنے سے باقی کچھ نہیں بچتا۔ ہم مسلمان مکھی پہ کھیاں مارنے والے شکاری قسم کے لوگ ہیں۔ ہمیں کوئی ایسی کہانی کہاوت روایت چاہئے ہوتی ہے جس کے پیچھے کوئی محیر العقول واقعہ یا کوئی روحانی تبدیلی قسم کی کوئی دلچسپی ہو سکے۔۔۔ جیسے جملہ ذرا جملہ براحتی ہوئی ہماری بے منہ ہانک نقشہ کی تہذیب اور آمد جیسے منہ سے ایمان کا جزدہن جاتی ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں یہ بیڑ اور زم کی تسم میں جو گندہ اس پانی ہے ہمیں دوسرے گھاٹ سے بھر اجاتا ہے۔ جبکہ ان بوتلوں کو انچھی طرح صاف کیا جاتا ہے اور نہ پانی کو نکھارا جاتا ہے۔ بس بھر اجاتا ہے اور مقدس پانی کے نام پر اٹھے واسطے بچا جاتا ہے۔ ان کریں ہم مسلمان۔“

UrduPhoto.com

مقدس پانی کو اور تھوڑے کچھ کر قبول کر لو۔ اور ہاں اگر چاہو تو اس آب نیل کے بارے میں قیامت اور کوئی کچھ سننے چلو کہ تمہیں اس نیل کے گندے پانی کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔ اس مقدس نیل کے پانی سے کھاروں نے بیوں، شمشیروں، سحر دانوں پوسے اور دھو کر پئے ہیں۔ انیسویں صدی کے دوران کربلوں کے جلائے ہوئے ان کی بیاس بھائی ہے۔ تم شاید جانتے ہو کہ جب سرور اسر حضرت یحییٰ علیہ السلام اس دار کافری سے فرما گئے تو ان کی تدفین پہ کچھ ہرمز کی پیدا ہو گئی تھی۔ کعبہ والے انہیں اپنے ہاں دفنانا چاہتے تھے کہ کعبہ والے کے سبب ان کا حق زیادہ بنتا ہے مگر مصر والے اپنے استحقاق کو یوں ثابت کرتے تھے کہ چونکہ آپ نے وہاں سے حرا اہست فرما کر یہاں سکونت اور حکومت اختیار کی تھی اس لئے ان کی تدفین اسی سر زمین پہ چاہئے۔ چنانچہ کسی قابل قبول اور حتمی فیصلے کے لئے ملائے یہود اکٹھے ہوئے۔ بڑی بحث و تھک دلائل و براہین کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ میت کو ایک مضبوط مٹی کا بیت میں محفوظ کر کے دریائے نیل کے کنارے آ کر دیا جائے۔ اس طرح نیل کا مقدس پانی اور بھی باہر گرتا ہو جائے گا مصر اور کعبان دونوں مستحکم رہیں گے۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ مصر اور کعبان کے کھیتوں میں فصلیں سونا نکلتی گئی تھیں۔ ایک ایک کھیت خوشہ بانی اور جنس مرورید اور جوہرات کے قول تھی۔ پھر اک لہجے زمانے کے بعد سینڈ ناموسے علیہ السلام

ہوتے ہیں اور انہی جنگلوں، جھرنوں، پہاڑوں اور جڑی بوٹیوں کے بعض پانی 'زس' جان لیا بھی ہوتے ہیں۔
 زہر کی مانند کڑوے کیلے اور تلخ کے انسانی زبان اور مزاج برداشت میں نہ کر سکیں۔۔۔ یہی از قسم زہر ہوتا
 ہیں۔۔۔ اب آگے بڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پانی انسان کی مادی ضرورتوں کے علاوہ اس کی بنیادوں کے
 مذہبی اور روحانی قدروں میں بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ تمام مذاہب میں "متبرک آبیات" کا تصور ہوتا
 ہے۔ جنم کے بعد اور مرگ سے پہلے یہی متبرک پانی اس کے حلق میں چکائے جاتے ہیں اس پر چھتر کے جھنڈے
 ہیں۔ مذہبی رسوم و عمارتیں، نماز گاہیں و عبادت گاہیں، میں بھی یہی مقدس آبیات استعمال میں لائے جاتے ہیں۔
 ہمارے جڑا مہد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بابرکت ایڑیوں کے صدفے میں پھونکنے والے پانی
 ہزاروں برسوں سے آج تک اور ربی دنیا تک مسلمانوں کے لئے ایک گرانقدر بابرکت نعمت کے طور پر
 استعمال ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اسی طرح پیو دیوں کیسی پیو دیوں، پار پیو دیوں، ہندو سکھوں اور بدھوں کے پاس بھی ان
 نوع کے مقدس پانیوں کی اہمیت موجود ہے۔ اساطیر میں بھی ایسے طلسماتی پانیوں کا خاص طور پر آپ کا ذکر
 آپ اپنا پویشی کا ذکر اپنے پورے دور دورہ وجود سے ملتا ہے۔ ہندوؤں میں گنگا جل سے پانی اور فرانس
 کوئی نہیں اٹھنے تو وہ گائے کے پیشے، گور کو بھی زل ہوتا ہے۔ ان کا پانی پویشی کا پانی ہے۔
 استخوان کا راجہ، ان کے پانی میں پانی کا پانی ہے۔ پانی کا پانی ہے۔ پانی کا پانی ہے۔ پانی کا پانی ہے۔
 ذائقہ، ذائقہ، ذائقہ اور منش کا پیشاب۔۔۔ سر پر کی خلق اور آتما کی تخلیق کے لئے بھی پانی اور چھتر کا پانی
 متعدد بالاکو جل اور منش جل کے ضمن میں چھتر کا پانی برکتیں مل کر وہ درمیان میں آگے و گرتے ذائقہ
 پانیوں کا پانی ہو رہا تھا۔

بادش اور اوس کے پانیوں کو بھی پاک اور منظر سمجھا جاتا ہے۔ جمیل سیف الملک، پیو صاحب
 ابدال، سید میراٹھ شاہ، کافض کراچی، سون شریف کے خوشے، منگو پوچ۔۔۔ دربار صاحب امرتسر کے تارے،
 مارو پوئی دشن پورن کا کھانا، چترال اور جل گاؤں کے خوشے، ہارنگھو، تھو کی باؤلی، ٹیکسلا، تریچ میراٹھ
 پانی پت، گوکھی، فکوریس اور میان اشوہ، میشا پور و غیرہ۔۔۔ محرم میں جگہ جگہ مختلف جیسے پانی کی سمجھ
 رہی ہیں۔ لوگ بڑی عقیدت اور رغبت سے پانی پیتے ہیں۔ اسی طرح کچھ خاص جگہیں ایسی بھی ہیں جہاں
 مینے پانی، شربت، دودھ، غیرہ کا اجنام ہوتا ہے۔ مقامی خلیقیں، خیر لوگ، گھوسے، گھاسے، خلیق
 والے یہ سدا ورت لگاتے ہیں۔

دلی میں خواجہ نظام الدین اولیاء کی چوکھٹ، حضرت معین الدین چشتی، امیر می، حضرت بابا فرید گنج

حضرت سید محمد بن یحییٰ دہلوی، حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی، حضرت لال شہباز قلندر، حضرت سلیم چشتی، حضرت محمد صالح عسکری، حضرت بہاؤ الدین جھولن بخاری، حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ۔

یہ چند ایک اولیاء اللہ کے ایسے حضرات ہیں جن کے قرب و جوار میں ان کے نام کی سیلیں تھیں اور ان کی موجودگی دور دراز سے آنے والے زائرین اپنی پیاس بجھا کر تازہ دم ہو کر حاضری کے لئے آگے بڑھتے۔ پانی بونے بڑے مشکوں، حوضوں میں ہوتا۔ بڑے بڑے نئے معداریت یا مٹی میں دبے ہوتے تھکے مسکین کا جو حوض باہر ہوتا ان پر سرخ رنگ کی صافیاں لپٹی ہوئی ہوتیں۔ مٹی کے سبک پیالے، گلیز، پتھر کے آکر بوزھے پتھر، یا عمر سے اتری ہوئی ایسی عورتیں جو کسی بھی وجہ سے دنیا داری کے گھیر سے آزاد ہوتیں۔ اس طرح پانی یا کوئی ٹھنڈا میٹھا مشروب پلانے والے کسی کاروباری انداز فکر سے نہیں کرتے تھے۔ انہیں صرف مسکراتی مسکراتی اٹھائے ہوئے زیارت زائرین کی پیاس بجھانی مقصود ہوتا تھا۔ اگر کوئی اپنی ہر ضعیف بھاونہ سے پیسہ دھوا ڈال جاتا تو انکار بھی نہ کیا جاتا بلکہ انہی پیسوں کی شکر برف دی جاتی تھی۔

UrduPhoto.com

میں چلیں یہ سب غیور دین و دیار کے زور و پیوں کی جگہوں کا تھا۔ زور و پیوں کا ہوا۔ کبھی کبھی ہاتھ پاؤں چادر پار ہوا سداوت کی کچھ خواہی اور غربانی ایسے میں تھکے یہ بعد باہر کی پیدل پیادہ والی کھنکھاتی لپٹی تھیں پیاس بجھانے کے بعد میں سب عادت مشروب پلانے والے کی ذات کی باؤلی تھی جو ضرور بھانکا لیتا تھا۔ مجھے بھانسی کہہ سکتا تھا کہ یہ پلانے والے کوئی عام سے لوگ نہیں ہوتے۔ یہ محنت سے کیا کوئی کم ہوتا ہوگا۔ یہ ارفع درجات والی ہستیاں ہوتی ہیں۔ دیکھا ہے کہ اللہ کی مخلوق کو کھانے پانے والوں کی بات ہی چکھو اور ہوتی ہے۔ یہ بڑے دڑائی کے آگے چھوٹے چھوٹے رزاق ہیں۔ جبکہ بڑا رزاق ان کے مال گودام بھی خالی نہیں ہونے دیتا۔ اس میں کوئی مسلمان ہندو سکھ، جہاں کی تعلیم نہیں ہے۔ جو بھی کھانے پلانے کا کام کرے گا ایک سا آج ہی پائے گا۔

معدوئی، بھکھوں میں اور کچھ ہونے والا ایک جفت ضرور ہے کہ وہ ان پٹن بہت کرتے ہیں۔ بھراؤن پٹن کا آٹا زہری پراقتنا اور ان پٹن سے ہوتا ہے۔ اللہ کی ہر طرح کی مخلوق کے لئے ان کے پاس دیا اور کھانا ہوتا ہے۔ ہسپتال، تعلیمی ادارے، محرم شائے، کونٹائے، کنوین، پاؤلیاں، نادار بچوں اور مسکینوں کے لئے چوکا ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ آج بھی آپ کو پاکستان کے کونے کونے میں غیر مسلموں کی بھائی بھائی بھائی ہسپتال، لاہریاں، تعلیمی ادارے، عبادت گاہیں، شمس اور آبی غسل خانے

قمریوں کی بغلوں کی جاکستری روئیں اور فلسطینی لکھنؤ کے سینے کے فاختائی اسکر کے رنگوں کے ملاپ سے کوئی تملو یا ہوا تیلکیا تیورنگ تصور میں آتا ہے تو یہی یہاں کی مہاذق ہاریوں کا اصلی رنگ اگک ہوگا۔ آپ سیاہ سلوانا سلوانا گھٹانا، محکمین یا گندمی لمبھی سر کی شیا می کہتی نہیں سکتے۔ یایوں کہ آپ نے جسم بوس رنگوں کو ملا کر جو جو برکشید کریں ہر چند اس میں کچھ صباحت و ملاحت کے چند قطرے پکا دیں تو حاصل عمل ہوگا تو وہ ان کی رنگت رسیا ہوگی۔ بارے ان کی چٹکی آنکھوں کی کارغشی پتلیوں کے گردانے پنڈیا کی ایسی سپید ہوتی ہے کہ اگر کوئی انجانا بے دھیانے میں دیکھے تو پھٹکری کے پھول کی مانند بدلتا پڑے۔ جس طرح سپیراسمانیوں اور چھیرا چھیلیوں کے بیج چوندا رہتا ہے یونہی گرگرکانو بی فقیراجی مسکرا مہلوں کی زگیدوں زگزروں سے چوندا رہتا ہے۔

وہ شاید زندگی اور حالات کے مومنوں کی ماری ہوئی کوئی بڑی عورت تھی۔ بڑھاپے اور تنگ سنی۔
اس کے ارد گرد کوڑی کی طرح کا ایک جال سا بن دیکھا تھا جس میں وہ نیم نرودہ کھڑکی کی مانند بڑی طرح
ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ تاہاں سب بس اور کمرہ کے پاس کچھ اور عورت ہونہاں میں زہر انور کا کوس
سی کاٹ لہر رہی ہے۔ یہی دو حالتیں اسے زندہ رہنے کی شکتی دیتی ہیں۔ ہم وہاں پہنچ
باندھے ایک کھیتوں میں رہے تھے۔ ان کی دیکھ کر سب سے پہلے میں ڈرنا شروع ہو گیا تھا۔
ہے۔ اس چھری زبان میں گفتگو کا ایک انگ ہی سواہ ہوتا ہے۔ جب ہم دونوں کے درمیان ایسا
تھاں ہی انہما ہونے لگے۔ یہاں تو میں اوب کراختہ کھڑا ہوا کرتا تھے۔ عورت فات ہے کہ
نگی لینے شاید اسے چھانے لگے۔ یہاں سے اپنے سونے کی نسل کو آگیا ہے کہ لے جائے یا نہ لے جائے۔
سے اُتری ہوئی مگر پھر پورا آواز ابھری۔

”قوم دُور سے کمرے چھوڑے۔ اچھر چلے ہا۔۔۔ بیاس پڑی ہو کی تھیمو مٹھار پانی پی لو
مجھے اس کی آواز میں اک شب کھر داریں ماحسوس ہوا۔ میں اک قوم کی مانند وہیں پہنچا
سے اٹھا تھا۔ دھیان دینے سے دیکھا کہ اس کے دائیں ہاتھ سرخ گت پہنے سے ٹھٹکا ہوا ایک
ملکا پڑا ہوا ہے جس کا اک تباہی جتنے ریت میں گزرا ہوا ہے۔ اب جو اس نے کپڑا اپنا یا تو میری آنکھوں
سے اٹل پڑیں، مٹکے پہ آرزو اور ہندی میں لکھا تھا۔ ”خواجہ کی جھجھکری“ یعنی یہ عورت مسکراتی
خواجہ غریب نواز سے عقیدت رکھنے والی ہے۔ وہ دھنک اٹھائے جتنی کے کپڑے پانی نکال رہی تھی۔
پھر سے منہ سے خیر ادا وہی طور پہ نکلی گیا۔

”میں مسلمان ہوں، کیا اس گونڈھ میں مسلمان بھی رہتے ہیں۔“

اک کھانکے سے میرے دماغ کا مقصد روشن ہو گیا مجھ پہ واضح ہوا کہ یہ تو اسی "خوارانِ خلد" کے قبیلے کا
 آدمی ہے جو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو بظلمتِ لالہ قطاب اور خواجہ غریب نوازؒ کے زائرین کو ٹھنڈا ایتھیا پانی
 پلاتے ہیں۔ انہی ذام و دہم کی ہمائے ان سے اپنے سہاگن ہونے کی دعاؤں کے طلب گار ہوتے ہیں۔ مگر یہ
 بڑے بڑے لوگ اور حضرات تو ضرور اوتارے ہیں مگر بیاہتا بیٹھتیوں کی مانند کانپ رہا دیا گھونکتے نہیں نکالتے۔ ہو سکتا
 ہے کہ یہ ان راجستھان میں غنچوں کو مونہ کی ذیل میں شمار کیا جاتا ہو۔ ویسے دنیا میں ہر جگہ ان کو ہڈ کر کے
 کھانے میں ہی رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ اپنے مردانہ ذیل و ذول آواز اور رازھی منوچھ کی وجہ سے مردوں کے
 ہونے پر یقین ہوتے ہیں۔ خواجگان کے یہ ساتی دنیاوی ملتوں سے بھی پاک صاف ہوتے ہیں۔ گانا بجانا
 اور گھر گھر بکروں والی بیویاں بھی ان میں نہیں ہوتیں۔ انھوں نے اگر کسی چیز سے نفرت کرتے ہیں یا بیزار
 ہوتے ہیں تو وہ ان کی اپنی مردانہ پاٹ دار آواز اور چہرے کے جسم کے موٹے ہونے کھردرے بال ہوتے ہیں۔
 ان سے جان پھرانے کی طرح سے وہ طرح طرح کے نوٹکے نئے استعمال کرتے ہیں مگر درد و مصرتی جاتا ہے
 اور بڑھتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آواز پیٹنے سے بھی تریا و بھدی اور بال ٹولنا ان کی باریک برائی کی
 علامت ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں ان کو بڑے بڑے کاموں میں بھی لگایا جاتا ہے۔ سر جری کر دیا
 جاتا ہے۔ ان کے پاس کے پاتوں کی طرح ہیں۔ ان کے ہاتھ ان کی ہڈیوں سے یہ سسٹم اور سسٹمیں میسر
 ہیں۔ ان کے ہاتھ مسلسل سے جان پھرانے کی خاطر یہ کسی نوٹکے موٹے سبز اب موسم جاتے وغیرہ یا پھر کسی
 شے کو جان پھرانے کے لیے لیتے ہیں جو شے سویرے ان اہل چروں کے کیٹوں سے تھوہری کاٹھیں
 کھاتے ہیں۔ اسی لئے ان کے ہاتھ بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ ان کی کانٹھیں اگلے یا پھر تھالی
 سے لے کر روز کیڑے کھاتے۔ انہیں میں ایک قسم غریب اور پیش کش یا شغل و اوصاف سے
 بھرپور ہوتے ہیں۔ ان کی بھی ہوتی ہے۔ انہیں ہم پینڈو کہتے ہیں۔ یہ بڑے آخر و پشترنگی
 ہوتے ہیں۔ انہیں میں کھر گھر و انیاں مانگتے پھرتے ہیں۔ آواز دھجھو کرے اور گئے انہیں بڑا رونق کرتے
 ہیں۔ ان کے یہ دیوارہ کر گھرے ہوتے ہیں جو بے حد طرح طرح کے مکمل نہیں ہوتے۔ وہ خود ہی اپنی
 کھانکے سے کھاتے ہیں اور ان سے بھی گئے کرتے ہوتے ہیں یعنی تو فی قوت سے خارج کسی
 جسمانی شے جتنا یا عمر یا کیاں کے ایسے مقام پہ جہاں سے ملک عدم کی منزل فصل و چار کام ہوتی ہے۔
 یہ رازھی جو سارے دنیا پکڑ لیتے ہیں۔ حماروں اور باروں قبرستانوں کے دوواڑوں پہ آوازنی اواز
 دھجھو کرتے ہیں۔ اپنے پرانے آٹھوں سے پرہیز کرتے ہیں یا اپنی کوٹھڑی میں پڑے خشک کاٹھے بیروں کی
 کھانکے سے رہتے ہیں کہیں باہر ضروری نکلتا بھی ہو تو یوں شغل چھپاتے رہتے ہیں جیسے کسی کے مقروض یا کسی

کے کاتے ہوں۔

مگر بزرگوں کے نام کا پانی پلانے والے اور عبادت گزار بھجڑے عاتق اور عاتق دنیاوی سے پائے ہوتے ہیں۔ یہ اپنا سلسلہ نسب ان بزرگ مجرہوں اور بھجڑوں سے جوڑتے ہیں جو بغداد دمشق مصر الجزائر بیت المقدس اور حرمین شریف میں مزارات مقدس جنگبوں کی نگہداشت اور صفائی سحرانی پر مشغول خاص متخصی ہوتے ہیں۔ خاص طور پر سعودیہ حبش یمن اور مصر کے بھجڑے بڑے بڑے اعلیٰ اعزازات کے حامل ہوتے ہیں۔ شاہی خاندانوں کے داخلی انتظامات و معاملات میں ان کے بڑے عمل دخل ہوتے ہیں۔ پاکستان ہندوستان افغانستان اور بنگلہ دیش کے علاوہ انہیں کہیں بھی کم تو قیر نہیں سمجھا جاتا۔ تو انہیں ایک تیسری جنس یا پیکار محض سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی انہیں معاشرے میں بدکاری اور ذلت و نفرت کا توہم لایا جاتا ہے۔ بلکہ ان پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ ان پاکیزہ ٹیک کے سلسلے اور عبادت گزار بھجڑوں کو جنت کی چڑیاں بھی کہا جاتا ہے اور کئی بھان فروش بھی۔ پاکستان سے باہر مقامات مقدسہ پر یہ لوگ مردانہ وضع میں ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھاری عمامے پہنتے اور دستاریں ہاتھ میں تسبیح کہیں ٹھوڑی پہناؤ کی پہچان ایک بال اور کہیں بال وچھ سے خالی سر پہنتے یعنی اصل کے بال ہال نہکتے نہیں۔ یہ بڑے بڑے بھگت عالم و سحر وین و شفا کے استاد ہیں۔ انہیں کئی بڑے بڑے پیرت اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا جاتا ہے اور انہیں ہر سال ہاں پاکیزہ مناظر کے نظارے ہوتے ہیں ملک کے برابر پائے جاتے ہیں اور عورتوں کے لباس اور وضع قطع میں رکھائی دیتے ہیں۔ گنے پاتے اور بارھنکا رنگی کرتے ہیں اور کہیں کئی بھجڑے کی سادے خراہے بھی ہوتے ہیں۔

میں اب اس کی حقیقت جان چکا تھا۔ اچھا جیسے کیسے جی ہاں میرے ہاں اس کے لئے حجاب و چند دونا ہے۔ میں اپنی دانست میں خوب سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ کے لڑیا و نزدیک ہوتے ہیں۔ ان کی بات بڑا قبول ہوتی ہے۔ یہ بہت عزت احترام اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان میں منافقت شریعت ہوتی۔ وہ اور دوا ان میں گوت گوت کر بھری ہوتی ہے۔ باقی رہا سوال کہ یہ مخلوق بد کردار اور بد بخت ہوتے ہیں۔ تو یہ انہی پر کیا موقوف کیا ان کے علاوہ یہ برائیاں کیاں دیگر لوگوں میں نہیں ہوتیں۔ تمنا مجھ سے پوچھو کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیا کھایا کھلایا دوا دی تو دعاوی اور خواہش کا کاروان نہایا۔ اب کیسا پردہ؟ تمہارا تو اپنے اللہ سے بھی پردہ نہیں۔ ایک مسافر بچے سے کیا ہوا۔

گی۔

اور حتی کے چٹے انگلیوں کی چنگی سے آزاد ہوئی تو وہ چہرے کے باوجود بے چہرہ سی مجھہ دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں ہی تو تھیں جن میں وہی سوزش وہی جانش جو خود سے جدا لوگوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ اس کا چہرہ کیا بے چہرہ تھا یا کئی چہروں سے تشکیل و ترجمیم کیا ہوا کوئی انوکھا سا چہرہ تھا۔ کتنی جھسیٹ انسانوں کی کتنی فتنیں کتنے دنیا اور صحرا کیسے کیسے موسم طوفان، بخار بجائے، تھو جڑ۔ کرب اور بھونچال۔ کرب، محرومیاں، نا آسودہ گیاں۔ کیا کچھ نہ تھا۔ میری آنکھوں نے چند بے گل سی جگہوں میں کیا کیا روپ نہ دیکھے۔ اس کا چہرہ جو ایک ایسے فلم کے فریم کی طرح تھا۔ جس پر فلم کے تمام کے تمام فریم ایک دوسرے پر لپ آؤں کر دیتے ہوں۔ ایسے گنگلک و گنجان، حیران و حیران سے چہرے سپاہی میں نے دیکھ رکھے ہیں۔ لگتا ہے کہ کائنات کا ہر خطہ ہر داو جمل منظر ہر ذی حس کے تشکیل کا تاثر۔

جہاں حیران اور تغیر و تبدل کی ہر حقیقت۔ اس کا ایک ہر ذی حس ہر ذی حس کہانی سب کا پھوڑا بنا، ان چہروں کے بھریں چھائیوں اور آنکھوں کی گہرائیوں میں پھنپھنایا گیا ہو۔ خجریوں کے نیلوں نوپوں پر اگر دھڑکی گھنے لگتے بھی ہوں تو پڑا امر اسات اور کھوجی دچند ہو جاتی ہے۔ دیکھو تو صحرا اپنے بے ہوش اور بے ہوش۔ ہر یہاں میں ایک وقت صحرا اور جنگ میں لڑا تھا۔ کس کتنی ہے وہ لڑائی چچ نہیں اور کتب شاہ کی لڑائی کے دوران میں اس کی لڑائی کی لڑائی میں وقت واقعی راستہ میں جاتا ہوگا جبکہ اہم کتاب پر غور کرنے والوں کے لئے وقت۔ تدریس و تکرار، نظام سے تعبیر ہے۔

آہوئے وقت کی بھی جھنجھوٹ ہوئی تھی جھنجھوٹ کی جھنجھوٹ کی مانند کچھ کر بہت پر ہے۔ کھینچے تک دراز روپ کا تھا ایسے میں لگاؤں کی کتاب تمام ہوئی تو میں بکری کے سمجھنے کی مانند مریا ہے۔

”میرا اجازت دو تو میں ٹھنڈے ٹھنڈے آگے جاؤں۔“ میرے انداز کے مطابق قلم پال کی موٹی منڈی اور سے کچھ یاد دہور نہیں۔ وہاں یہ ایک جاننے والا ہے۔ رات وہیں آرام کروں۔

اس نے کچھ جواب دینے کی بجائے گدے سے شیشے کی اک چھوٹی سی بوتل میں مجھے پھر پانی اال دیا اور تاکید کرتے ہوئے کہا۔

”لو! اسے سنبھال کر رکھنا۔ کھوج کی بھجری کا پانی ہے۔ وہاں پہنچو تو میرا سلام۔“
میں نے فوراً اٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں! ہاں مجھے یاد رہے گا۔۔۔۔۔“

پانی کی بوتل احتیاط سے میٹیں لے اپنے تھیلے میں لٹکوس لی تھی۔

دنیا میں اکثر معرکے پانیوں کی وجہ سے بھی ہوئے اور اب تک دنیا میں کچھ تنازعات کی اصل بنیاد ٹھنڈے پٹھے یا سرد گرم پانی ہی ہیں۔ عربوں کی اکثر فوجیں ریڑیاں اٹھتے پانیوں کے کنوؤں اور چشموں کے آس پاس ہوتی تھیں۔ پھر یہی پانی انسانیت اور مختلف مذاہب و ادیان، تہذیبوں و تمدنوں کے احیاء و ارتقاء، تصدیق و قطع میں کارفرما نظر آتا ہے تو کہیں تواریخ و اساطیر میں کھلبلاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ نرم نرم پانی آپ فرات، شعیب علیہ السلام والا کنواں ہو یا موسیٰ علیہ السلام کا دریائے نیل۔ بکیر و مردار کا عذاب یا حضرت نوح علیہ السلام کا سیلاب۔ چچا پٹیل۔ یہ تو کہیں ہو چکے ہیں کابل ہے۔ تحصیل سیف الملوک، شہر زبیدہ۔ گنگا جل یا قندھار، حضرت بل۔ پچھ صاحب کے چشمے یاد رہا کہ یہ کس کے جھرنے۔ قطرہ فیصل یا ابو باران۔ عربی انفعال ہو یا سیل مال ہو۔ آب حیات یا آب زلال۔ دنیا کو پانی کسے پیدا کیا گیا۔ اس کے بعد پانی کس وہ خاص عنصر ہے جو بڑے انسانی جسمانی اور نباتات کے لئے ضروری ہے۔ جانداروں خاص طور پر انسان کے لئے اور انسانی جسم کی فطری طور پر بنی ہوئی ہے۔ انسان کے لئے وہ نہیں طلب ہیں پچھے جو پیش کیا جاتا ہے وہ پانی ہی ہوتا ہے۔

● تو منفق ناز کر خون و عالم میری گروں یہ۔۔۔۔۔!

وہ بات جو خوشہ کی مانند پھیلتے جھستے آگے بڑھی پانی ہی کی تھی کہ سفید اس پانی کے غم پہ راسخا نے بچا وہ بے گل کشمیر سے سنگھ کی تسکین کی خاطر اس کی مائاتی کا دیا ہوا پچھ صاحب اور ابو بار صاحب احمد صاحب خاص پرتھل پیٹے کے لئے دیا مگر اس نے ہاتھ کے ایک اگلے رپٹے سے شیشے کی سراسی پیچھے کرادی۔ پچھ صاحب نے سو ذرا فحشی کر سٹل کی سراسی بھی کر پتی ہو گئی۔ یہ سٹاکا نہ منظور کیج کر سفید اس پانی سے مراد کیا۔ وہ کشمیر سے سنگھ جیسے چڑھے کھٹے روشن خیال اور مد سے زیادہ محبت کرنے والے شخص سے ایسی بات ہوئی اخلاق سے بعید اور سوتیلے حرکت کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ چند لمحے تو سنگھ کی ہی حالت میں رہی کہ زبانی کا امی اس سے اُلجھ پڑی۔ اسی تو سٹاکا میں کشمیر سے سنگھ نے ملازمہ عام بیارمی اور سفید اس پانی کے تھیلے کے بارے میں الفاظ استعمال کرتے ہوئے پستول نکال لیا۔ انہی جاں گسل لمحوں میں دوران کشمیر سے سنگھ

”آپ جھڑے اس سائلے کے سر پر اپنی انگلیاں ناخن گاڑ کر رکھو۔ اس میں بھی اس کے سرے گرو کی مانند چھلن بہت زیادہ ہے۔“

بس ایسے سن کر اس کا ہر ٹیل چل گیا۔ ساری فقیری تپیا، دھرج، پل بھر میں اڑتھو ہو گئی۔ اس کی کایا پلٹ گئی ہو۔ پورے جسم میں بجلی سی کوند گئی۔ اک آنکھائی سی شکلی نمود آئی۔ دانتوں کی جڑوں سر بس کے نمود و مچا تک ٹھس مارتے گئے۔ زبان کو لہرایا اور آنا فانا پانا کھا کر رامو مونٹے کے پڑھے ہوئے ناخن والے انگوٹھے کو جو چاہے تو لخت پٹ ہی دسہ کشی کی بارہیت کا فیصلہ ہو گیا۔ رامو مونٹے منوں میں یہ سوچ ہو کر پروک سدھا گیا۔ یہ ”نواس فقیر“ شہکار کا ہوا اپنے گرو کے چرنوں میں پہنچا۔ بس لو استے ہو کر کہتے گئے۔ ”مہاراج امیرے سر پر کی گندیریاں کات کر چوس لیتے تو انک نہ کرتا۔ مگر میں یہ نہیں بدست کر سکتا کہ کوئی آپ کو بھی انگوٹھا کھائے۔“ یہ سن کر آپ کی دلی ہوئی ”نواس فقیری“ میں ”پرانا سانپ کھ بھلا۔۔۔۔۔“ اور یہ کہل ہوا وہ غار سے باہر چل گیا۔ ”آپ دیکھتا ہوں مجھ اور میرے گرو کی گردن تھے بڑے بڑے گندے گندے خون والا انگوٹھا کون شہرا کھاتا ہے۔“

UrduPhoto.com

نہیں کر سکتے اور جستا دوسرے طرح انسان اگر بکرے مرنے کا بھی دیکھ لے تو اس کی آنکھوں میں سرخ سرخ پتھاریاں آنے لگیں۔ سرخ تر مرنے سے تیرے کہتے ہیں۔ رام پور کے پھان اور جانور دونوں کے بد مغزے ہوتے ہیں۔ مگر پھر بد مغزوں کے معاملہ میں۔ یہی امر اذیتناک ہے اور مونڈھن میں نہایت براہ بھی فرق آ جاتے اور رام پور کا پھان کات مارت کرے تو یہ رام پور کا پھان نہیں کوئی کا پور کا کتہ۔ وہ جاتا جگہ رام پور کی چھوڑ اپنے استر سے کھل جاتے اپنے پھل سیدھا کر لے تو پھر خون کا ٹھک لگاتے۔ یہ بھگت گتہ کا۔ بال بکڑا ستہ کس بد بھونگے لکھنے ہی نیلے کھیسے میں چٹا گیا ہو تو جان واک۔ یہ چھوٹا سی پھار کے ہاتھ میں ہے یا پھر اس کے پھل کا لہو اپنے پچھلے جسم میں کسی موپی کے آگے کیل خوں کئے والا پھرا رہا ہو گا۔ کہتے ہیں کہ چھوٹے کی جیب میں یہ دشمن جال رام پور کی چھوڑ کا۔ وہ بان تمنا ایک شایک دن جیل ضرور جائے گا۔

کالے خان کے ہاں چھوڑ تو کب کا اپنے استر سے باہر نکلا چکا تھا۔ پھل و مرنے بھی دیکھ چکا تھا۔ پھر پھڑا رہا تھا۔۔۔۔۔ ظاہر تھا کہ آپ یہ چھوڑ چھوڑی پھولا چڑھا کے بنا جین نہیں چکرتا۔ چھوڑ کی آواز پھوڑ کی جھکی پہ چوتے ہوئے وہ چوگت پھلا تک آیا۔

سائنس میں تغیر ہے۔ یہ جڑی بوٹی تھیں۔ وہ کچھ دیر اسے غصہ ہانک لگا ہوں سے تو اتار با پھر اچانک چڑھیں۔
ہاتھ میں سرک آیا۔ اسی دوران سفید اس بات کی التجا بھری آواز اس کے کانوں سے نکل رہی۔

”کالے خان! پیچھے ہٹ جا۔ کوئی ایسی حرکت نہ کرنا کہ میں تمہیں کبھی معاف نہ کر سکوں۔“
 گھر کا لے خان تو جیسے پتھر کے قالب میں داخل چکا تھا۔ نوئے شیشے اور کشمیرے کی ہاتھیاں
 ہاتھوں کی نوکیلی کرپیاں اس کے تنوں سے داغ اور ٹھیکے میں چوست ہو چکی تھیں اور سلیڈاں باقی تھیں۔
 بننے کا کہہ رہی تھیں۔ انھیں سرکے سے معذور و ذہنت سماجت ہی کر سکتی تھی۔ پھر بھی وہ کسی طرح انھیں
 کشمیرے سنگھ پہ آگری۔ غراتی ہوئی کالے خان سے گویا ہوئی۔

”میں کہتی ہوں کالے خاں اچھے بہت جا۔“ تمہیر نے میرا آخری پیار ہے اس سے پہلے بھی ایسے
 سٹوک سٹک لے جھکے اسی طرح وہ باقاعدہ اعلیٰ جہان سے چاہا تھا۔ مگر وہ میرے سامنے میری ہانہوں میں
 گر پان سے مجھ پہ قربان نہ کیا۔ کالے خاں اسٹوک کی موت نے شہدہ بنا کر کھو دیا تھا۔ میری
 اس کا سر دھرا تھا۔ اس کی وحشت بھری آنکھوں میں کیسی تماش تھی وہ مجھ میں شاید مجھے ہی کھون
 اسی شمشادہ بہشت زور نکلی گیا۔ بہت دور اور میں جہان کی اسے پھٹ سی گئی۔ مگر سنا تو یہ کہ
 تمہارے زور نکلی گیا۔ یہاں تک کہ میں نے اسے اس کے ساتھ لے کر اس کے ساتھ لے کر اس کے ساتھ
 یہاں چھوڑا اور مجھ اس کی خاطر اپنا سب کچھ تیا کہ کر اس کے ساتھ چلی آئی۔ یہ اس وقت ہوا کہ
 بے غور اس اور بے غور اس میں ہے۔ یقیناً اس نے ایسا چاہا نہیں ہوگا جو کچھ ہو گا۔ اسے چار گئے
 ”ذکر رکھو“

یہ بھانسن بھلا اس پر کیا اثر انداز ہوتا۔ وہ تو چتر کی سہل بنا ہوا کشمیر ہے۔ پہلو تو ان نظریں کے لئے تھا۔ جب آنکھوں کے آگے خون رنگ چٹکن پانی ہوتا کانوں کے پرے دیوار اور گف ہو جاتے ہیں۔ بھلا تو لکھائی ہی نہیں رہا۔ ایک دم چتر والے بارود میں تانا اور ہاتھ میں کسا ہوا جھکا گیا۔ کانوں کے لئے دوائیں لگائیں ہاتھ سے سفید اداں پانی کو ان پر سے ہٹا دیا۔ سہلی حیرت چاہنے والوں کی خیر کا لغو اچھا اور چتر کشمیر کے سنگھ کے بھین والی پہ پہلی دیا۔ نہ نالہ اور سروان نہ اند دھانک چٹکن آگے چھپے بلند ہو گئے۔ تو پھر ہاتھ پر لکھ کر ایک شہید سا بھلا اور سکوت۔ ایک شاید بے عواس ہو چکی تھی اور پالان ہاتھ پر کا تھا۔ دست بنانا تک آتے ہوئے تو کھینچنے میں کاٹے بن کو ہانک سا تڑکڑ کرنا چاہتا تھا۔ اسی طرح سے چتر صاف کر کے بلند کیا اور شلو کے میں رکھ لیا۔

بہ نمدہ سی سفید الہائی کے خوش چمکاں پاؤں میں جنہا کے تپور رنگ پہلے چھوئے ہوئے تھے۔

وہ ایک پُر اسرار سی اسٹورائیہ فلمی اچھالتے ہوئے بولا۔

”میری سڑوں کی سرکار! جس نے مُنہ چھپا کر بھاگنا ہوتا ہے۔ اُس میں کسی کی چھاتی پہ ہنسنے والے کے اوپر چھتو سے پھینک دینے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ ویسے اگر میں کہیں چلا بھی گیا تو تمہاری حفاظت کرے گا؟۔ تم خدا کے بعد پھر کس پہ اعتماد جو رس کر سکو گی..... یہ تو تم نے دیکھ ہی لیا کہ ریکس نے تمہارے امیر لوگوں کی نظر میں اس بازار کے لوگوں کی کتنی عزت تو قیہ ہوتی ہے۔ میری سرکار! میں تمہارا حق نہ کر تمہارے سر پر کا طلبہ گار نہیں میں تو تمہاری نگاہ اور مدد بھری سڑوں کا پرستار ہوں۔ اور میں تمہارے بار بار گزاری کے لئے نہیں آیا۔ حیون کا انت کرنے آیا ہوں۔ اور یہ بھی تم اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں نے پانی خود پیدا کرتا ہوں۔ تمہاری محنت کمائی کا ایک اھیلا بھی مجھ پہ حرام ٹھہرا ہے۔ عورتوں! ماں باپوں! بھتیگوں کی کمائی کھانے والے کیلئے حرام ہے ہوئے ہیں۔ عورت کو ٹھیکے کی کمائی کرے اپنی کوٹھڑی یا چھتہ۔ اس کی کمائی مرد پہ لہو قہم حرام ہے۔“

وہ آتے ہوئے سامنے کو نظر انداز کیے ہوئے اس کی باتوں پہ اصرار دینے لگا۔

UrduPhoto.com

”میری باتیں سن بھی رہی ہو یا نہیں پوچھی کے جا رہا ہوں؟“

”تم تو یوں باتیں کر رہے ہو جیسے خدا کا منہ لٹکا ہوا ہے۔ انیسویں صدی میں ایک شکار کیا ہوا ایران کا شکار اس کے کوہِ جبال کے متعلق گفتگو کر رہے ہو۔“

کاہل خان نے تھمسن کے سروے کو غرت سے دیکھ کر قہقہے ہونے لگا دیے۔

”تم اسے انسان اور نگاہی جیسے مصوم ہانور سے تشبیہ دے رہی ہو۔ یہ تو میری نظر میں شکار کا ہانور ہے بھی زیادہ خبیث تھا۔ وہ انسان اپنے حسبِ نسب اور ملت و مہشت کے ٹھنڈ پہ کسی غریب کا ہاتھ اٹھانے سے بچے کہیں سمجھے وہ انسان کیونکر ہو سکتا ہے؟“

”جسوزاد ان باتوں کو اسے سوچو تو گا کیا۔ یہ نہیں کا معاملہ ہے۔ جان نہ پہچان اور۔“

خانے خان اپنے مضبوط قدموں پہ کھڑے ہوئے ہوئے بولا۔

”تمہیں چمکا کرنے کی ضرورت نہیں ہے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس تم ذرا صبر کرو۔“

”میں نے کسی طرح اسی ڈاکٹر کو بلوالو۔ میں ذرا تھکانے پوچھیں تک جا رہا ہوں۔“

ہے۔ مگر پڑتا ہے۔ چونکہ یہ سب چلنے والے ہیں ایک خاص اہتمام و انتظام اور مقام کے متقاضی ہوتے ہیں۔ ان کے ایک دو معتد خاص قسم کے معاونین کی بھی ضرورت پڑتی ہے جو بشری جملوں سے پاک ہستی پر مبنی کار و عمل کا دل و دماغ کے مالک ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس رشتہ چلنے کے لئے ایک قفل جس میں ریگ ماسی حرکت ہوں ان پر بہار کے دن ہوں یعنی اندھے دینے نہیں کا موسم۔ کہیں قریب و جوار میں گولہ نہیں لوبے کے بھی موجود ہوں۔ جو کچھ جھار یاں اچھل پات ہوں گے تو اونٹ اور اونٹوں کے بچے بھی بغیر اسے ہوں گے۔ کم قہقہے ساربان و حکو و حاسرے بھی ہوں گے۔ یہ سب ہوں گے تو پھر امید کی جا سکتی ہے کہ کہیں سے شہر و شہر کے بلڈ ہڈے آپ کو باقاعدہ ذر دستیاب ہو جائیں۔

فورت عباس کے مضاف میں ریگستانی علاقے کے لیے چنے کوس اندر سرکیوں سرکنڈوں سمجھاڑ جھکاڑ سے بونے چند گھوڑوں پر مشتمل ایک تہذیبی تھی۔ یہاں تھوڑے بڑوں کی آبادی بھی اکثر موسموں سے اور پانی کے رحم و کرم پہ ہوتی ہے۔..... پچھلے برس جہاں آبادی تھی اگلے برس وہاں نیلے بے نظر آئیں گے۔ خانہ بدوشوں کے لئے چار روٹی ہی جھوپڑا ہوتا ہے۔ نیچے ریت کا فرش اور بے آسمان کا چھتہ۔ کچھ موسموں میں دیواریں..... جھکڑوں، طوفانوں، زلزلوں کی کڑکائی، دروازے، کھڑکیاں اور کھڑکیوں کے دروازے۔..... ان کے لئے چھتے کے دن پورے کر لیتے ہیں۔ پھر انہی تھوڑی سی تعداد و مسکنوں میں وہ بھی ایک دن فزوں کے لئے ہو کر رزق و ریح بن جاتے ہیں۔ شاید انہی اذوں سے پھر ایک ماہیاں قائم کی ہیں۔ ان کے لئے جھاک بن کر کھٹے والا اور کھلی لعاب جو فٹ ہو کر برقی کی افشائیں کی مانند اور اوجھ کھرا ہوا کبھی کبھی ان کے لئے ہے شاید انہی "بندگان سحرانی" کے خون پیسے کے کرنے کی نشاندہی کرتا ہے۔

گھروے کوٹھ سے چند فرلانگ شمال کی اور سحرانی رینجرز کی ایک بڑی تھی جہاں نیم پختہ دفتر اور رہائشی کمرے تھے۔ صاف پینے کے پانی کی دیرینہ پختہ ہستی۔ کچھ پیدا کرنے کے لئے ارباب کا طوختہ، خواتین، شہر خاتہ اور پیغام رسانی کا انتظام بھی تھا۔ فورت عباس سے بہت آگے تک ایک بڑی سڑک تھی پھر آگے وہی بجھے میڑھے بجتے مٹنے راستے، پگھلائیوں کا بھی ہیں تھے اور نہیں۔ یہاں ان کے پاس چند سرکاری خیر تھے جن میں کچھ جوان لڑکیاں بھی تھیں۔ ظاہر ہے جہاں کوئی کھانا، دوا، جان اور جوانی بھی ہوگی۔ بہت و غارت کی کوئی کہانی بھی ہوگی۔ بچے من کے بچے بھی ہوں گے۔ رینجرز پوسٹ پہ میرا ایک بلوچ بچہ ایک چھوٹے امریکی شیشیت سے تعینات تھا۔ وہ گا ہے ماہے۔ کھتے مٹا بھی رہتا اور اکثر مجھے فورت عباس آنے کی دعوت دیتا رہتا تھا..... وہ مجھے اپنا علاقہ، قفل اپنی

رہنمہ پرست اور وہاں کی چار بجی اور روحانی اہمیت کی یادگاریں دکھانا چاہتا تھا۔ اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ مجھے اپنے والدین اور دوست احباب سے بھی ملوانے۔ میں اُسے اپنی عظیم الفرستی اور خرابی صحت کے بہانوں سے ناتار رہتا تھا۔ ایک دن اچانک مجھے اس کا پیغام ملا۔

”اگر طبیعت گوارہ کرے تو چند روز کے لئے آ جائیں۔۔۔ موسم معتدل ہے۔ آوارہ بادلوں نے کھڑے فصل پہ سایہ فگن رہتے ہیں۔ گھس گھس بھلا سبز پتوں پڑیوں نے جھانکا جھانکا شروع کر دی ہوئی ہے۔ تنو ز سبوں اچکاروں اور رنگ ماریوں نے نچھکا نچھکی لگائی ہوئی ہے اور سب سے بڑی خوشخبری کہ ہمارے قریب ہی گونجھ میں ایک ڈاپی نے آپ کی طلب ضرورت کے مطابق ایک کالے شاکالے شتر بچے کو جنم دیا ہے اور اس کی آنکھیں بھی کھلی اور شہبانی ہیں۔“

یہ پیغام دفتری کاغذ پر نقد کی صورت میں پہنچا تھا۔ پیغام پڑھتے ہی مجھے ایک روز قبل دیکھا ایک خواب یاد آ گیا۔ دیکھا کہ میں کچھ سامان اٹھائے دو دروازہ حرائیں میں بھٹک رہا ہوں۔ بھوک پیاس سے میرا ز حال ہے۔ اس سے چند فٹ میں سر پہ کھڑے سورت کی تیز قہارت سے جل پھنس گیا جسم ہوا میں لٹا ہوا ہے۔ کئی آگے کر رزق رنگ بن جاؤں۔ مجھے اپنے منہ سے ایک کالے شاکالے شتر بچہ نکلا پانی کمر ہاتھوں پر پانی ڈال کر اس کو دیا۔ وہ بولے ”اگر وہاں سے آؤ تو اس بچے کو خالی ہاتھوں سے دیکھتے ہیں پھر اچانک دلا کر اپنی آنکھوں پہ اک جاب ہو جیتا ہے۔ اگلی چند لمحوں میں پچھلے قدموں پر ہوگا کہ یکدم شتر کرناٹک جاتا ہے اور نوکر میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگتا ہے۔ یوں اگلی جیسے دیکھنے اپنے پیچھے پیچھے آنے کا کہہ رہا ہوں۔ شتر بچہ کچھ سوئے مجھے اس کے ہتھکڑیاں دکھاتا ہوں۔ کچھ اور سامنے ایک ریتا جہ سارکھائی دیتا ہے وہاں آگئی کروہ لٹک جاتا ہے۔ نوکر پھر میری جانب دیکھتا ہے۔ مجھے متوجہ پار اپنے اگلے گھر پار سے ریت جاتا ہے۔ پاس پہنچی کر دیکھتا ہوں کہ یہ ایک چھوٹا سا کمرانا ہوا ہے جس کے اندر سے لٹائی ہو یا پر نقل رہی ہے۔ میں آؤ کر دیکھتا ہوں شتاؤ۔ اک زقند کا کمر اندر کھس جاتا ہوں۔

میرے اندر داخل ہوتے ہی اوپر راستہ بند ہو جاتا ہے۔ کپ اندر چڑھا ہوا تھا کہ ہاتھ جھانک کر دیتا۔ باہر نکلنے کا راستہ مسدود اور اندر نکلنے کا پیرا۔ میں گھبرا ہوا ہوں اچانک جیسے بہت سے ہتھوں کے سے جھکوتے پڑے ہوں۔ کچھ سیاہی میں وہاں ایسی جگہ جگہ جگہ ہوئی کہ مجھے اندر کا ایک آدمی روشن کی مانند دکھائی دے گا۔ میں حیران ہو رہا ہوں کہ اس نے تمہیں کمرے میں ایسی دالوں میں ٹھنڈی ٹھنڈی روٹنی کہاں سے آگئی؟ اب جو رانور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ لا تعداد ٹھنڈی ٹھنڈی روٹنی کی دیوار سے لٹھوٹ رہی ہیں۔ ان کے آدیاں دکھائی دیتے جسم سے مدھم مدھم روٹنی۔ بالکل ایسی

میں جتا رہتا۔ وہ فلم کے ہر شعبے میں وٹیل تھا۔ کاسینوم سٹیوں کی ڈیڑھ انچنگ کہانی مکالمے میوزک سچے ایڈیٹنگ پیروسینگ منسنگ حتیٰ کہ وہ خود اداکاروں کا میک اپ کرنے بیٹھ جاتا تھا۔ شوٹنگ کے دوران وہ دیوی بچوں سے الگ تھلک۔ آدھ کے سٹوڈیو میں پڑا رہتا۔ یہاں ایک کونے میں اس کا ایک "مشیم فلم انڈسٹری" کا بیج تھا جس کے بغلی گیراج میں اس کی اداکار امپلاکار کھڑی رہتی۔ یہ وہی کلی کار تھی جو سپر سٹار فلم "برسات" میں کشیم کے سفر کے دوران کی شوٹنگ میں استعمال ہوئی تھی۔ اس فلم کی ایک اور خوبصورت یادگار چیز بھی کانچ کے اندر بڑی اھیلا سے محفوظ تھی وہ ایک خوبصورت سا والکن تھا جسے اس نے "برسات" میں چھیڑ کر زنگن کو بچھا یا تھا۔ بعد میں یہی والکن اس کی فلموں کا ٹریڈ مارک بن گیا۔ یہ کانچ اس کا آخری مندرجہ ذیل کتاب "آشرم" مشاورت کی جگہ اور پریشانی کے دنوں میں ایک پناہ گاہ بھی تھی۔ اداکارہ زنگن کے مشن میں ہجر و وصال کے زمانے بھی اسی کانچ میں جبر ہوئے۔ جوانی کی ترنگوں اُنکوں کی بہار سے لے کر بڑھاپے کی بیمار یوں 'ناکامیوں اور آرزوئوں کے پتے چھڑ بھی اسی گنج آشیاں میں تھیں۔ ویسے ہر شخص نے کسی نہ کسی انداز میں یہ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی اپنے لئے گوشہِ ماقبت سنبھال رکھا ہوتا ہے۔ وہ بے خانہ بدوش ہے۔ کسی عشق کا کاشانہ ہو یا کسی بے نظ آستان۔ یہ کہہ کر ہوتا ہے۔

UrduPhoto.com

میں نے ایک مرتبہ راج کپور سے اسی کالج میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان دنوں یہ کالج بوجھ کو بھاری
دوسرے دن رات میں ہوا تھا۔ کام کاج اٹھانے کا وقت اور آ کر کے سونا پڑا۔ میں نے اس کی طرف ہاتھ
کے مطابق دفتر اور ان کے کھانے کے کمرے کی طرف ہاتھ پھیرا۔ یہاں پر کاروبار کی کسی بھی چیز کی خبر نہ تھی۔
صاحب سے کہہ گئے یا کوئی مشورہ دے۔ آج بھائی پر تھوکی راج میں یہ ایک ٹوپی تھی کہ وہ جوان اور
نئی معاملات میں پیش نہیں ہوتے تھے۔ اور نہ ہی کبھی کسی سخت گیر باپ کی طرح ذات فہم پر غور
کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ فلم انڈسٹری کے یہ سر بلند تھے باپ کے درہم رومی کے بھیکے بلوٹکروں کی بات نہ
رہتے۔ شیلنگ، انڈیو، سلطان پوری، قنبر، بے تین، پیم، ناتھ، مراد، مراد، ناتھ اور اپنے گرو کیدار شرم، انیسویں
راج کپور کی گاڑی چھٹی تھی۔ مگر یہ ساتھی بھی اس کا سوا در کچھ کرانی، اپنی راوی لیتے۔

راج کپور سے میری کوئی خاص جان پہچان نہیں تھی۔ ایک دوسرے ہی ملاقاتیں عدنان کپور کے پاس
میں اس کی غصوں کے پائینہ شور پہ ہوئی تھیں۔ آدھے سنوویو جس بھی میں پہلی بار آ پاتھا۔ یہاں ایک قصہ
سہرا خیمہ ہی سے ملے مگر بد قسمتی سے عمر و راج کپور ہی سے ہو گیا۔ سنوویو میں چونکہ چھل پھل بائبل میں
میں اونٹ کی طرح غصا اٹھائے دائیں بائیں جھانک تاکہ ہوا کانٹ کی جانب نکل آ پائے۔ گھیراٹ کے پاس پہلے

کھجور کے پھل کے پھلے کر دیے ہوئے تھے۔ اس سے اتر کر میں پاس ہی چائے کے بوتل کے
 کپے اپنے جیسے ڈھیلی چلوں والے میلے کیلے بیچ رہے تھے۔ اس سفر کا فیصلہ ایسی غلت میں ہوا تھا کہ مجھے اپنے
 جاننے والے کوئی انصاف دہ کی اطلاع پہنچانے کا کوئی موقع ملا اور وہ وسیلہ اظہار ہے کہ مجھے یہاں کوئی وصول کرنے
 کی گنجائش نہیں آیا تھا۔ ناشتہ کے بعد میں اک بوڑھے ناکارہ اونٹ کی طرح دنگلی کر رہا تھا کہ میرے زور و زور
 میں سحر جی آ کر بیٹھ گئے وہ آپس میں کچھ بات چیت کر رہے تھے۔ اچانک میرے کانوں سے گھروٹ گونج
 کے کان سے نام کی آواز نکلائی۔ میرے بالوں آلوں بھرے کان گھڑے ہو گئے۔ ان کی بات چیت سے فوہ
 گئی۔ وہ دونوں وہیں کے وہیں ہیں۔ اور ادھر یہاں ہسپتال میں اپنی کسی بیماری کا ٹیسٹ کروانے آئے
 تھے۔ میں نے فوراً ان پہ دھیان دیا تو ایک کی آنکھوں میں مجھے چند دن اتر ہوا نظر آیا۔ ہونٹ رنگت
 میں سب کچھ میں نے اک نظر سے دیکھ لیا۔ میرے اور ان کے پچھلے کے درمیان نیز نما نگاری کا ڈبا پڑا
 تھا۔ کچھ پہاڑی تک میرا چہرہ کا نیم خالی پیالہ دھرا تھا۔ جب ان کے سامنے ناشتہ آیا تو اخلاقا انہوں نے مجھے
 سب سے پہلے کہا یا ہو سکتا ہے میرے ٹھیلے سیاہ لباس، منگے والا گٹھنٹیوں کے حوالے سے کچھ منگ مسافر
 کے لئے فی سیکل اللہ صلاح لے لی ہو؟

UrduPhoto.com

میں نے انداز میں کھاپی رہے تھے اور ساتھ ساتھ فوٹو گرافروں اور سٹاف کے بارے میں گفتگو بھی
 کر رہی تھی۔ سب وہ دیکھ رہے تھے۔ میرے لئے کچھ ہوا جو مجھے کچھ نظر انداز کر چکے تھے۔ میں ان کی جانب
 سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس چاندن اترے۔ ہر طرف بیٹری کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں چیشاب کی حاجت ہوئی
 تھیں۔ ہوش دالے کے پاس آئی کرانی اور ان دونوں کا ٹپ پٹکا۔ یہ تھکا دہکا پوچھتے ہوئے میں
 اس کی کچھ حاجت لکھ گیا۔ وہاں سے نکلا ہی تھا کہ اذان کی آواز کان پڑی۔ سامنے سڑک کی دوسری
 طرف سے سونچے۔ میں اس طرف نکل گیا۔ نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ دونوں باہر دروازے پر میری جانب
 سے کچھ کھڑے تھے۔ مجھے یہیں کھلا لگ گیا تھا کہ اب لمبی ہی سانچہ بڑے گی۔ سیر جیوں سے اترتے ہی
 میرے لئے جیسے جیسے پھاڑ

لیا جائے گی۔ "کہتے ہوئے پہلے تو انہوں نے میرے ہاتھ پکڑے۔ "پہلیے تو ہمیں دینے
 دے تھے تو آپ نے دے دیئے۔" ان میں سے ایک پانچ پانچ کے اونٹ بڑھاتے ہوئے بولا۔
 "ایک ہی بات ہے۔ میں نے دیئے یا آپ نے دیئے آتے تو سب ایک ہی خزانے سے ہیں۔"
 وہ مجھے ساتھ لے کر آہستہ آہستہ ایک جانب بڑھنے لگے۔

”بابا سائیں! آپ کہاں سے آئے ہیں؟“ ایسا روکھائی دینے والے نے پوچھا۔

”بیٹا! میں لاہور سے ابھی کچھ دیر پہلے یہاں پہنچا ہوں۔“ یہاں گھروں کے قریب رہنمائی کی گئی۔

چوکی ہے وہاں میرا ایک بچہ اللہ یار کچھ تعینات ہے۔ میں نے اس سے ملنا ہے۔“

اسے جیسے بچوں نے ٹوک مار دیا ہو۔ وہ اچھلتے ہوئے کہنے لگا۔

”بابا سائیں! ہم دونوں بھائی اسی گونڈے کے رہنے والے ہیں۔ اور اللہ یار تو اپنا بھی یار ہے۔“

تمہاری گونڈے کے بچوں کو پڑھاتا بھی ہے کون ایک نمازی مرد ہے۔“

اب دوسرا پوچھنے لگا۔ ”وہ آپ کو لینے آ رہا ہے یا آپ خود ہی وہاں جائیں گے؟“

”بھائی! میں نے اسے یہاں تک پہنچنے کی اطلاع نہیں دی۔ لہذا مجھے ہی وہاں پہنچنا پڑے گا۔“

”یہ تو بہت ہی بھلا ہوا ہے آپ! اللہ یار سے ملنا بھی چاہیے گا۔“ آپ اللہ یار کے بی بزرگ اور صحت

میں زہار کے بھی ہیں۔“

میں نے ہلکا سا پتہ بولے کہا۔

”اب دیکھو! شاید کچھ دیر سے چار میں۔“

UrduPhoto.com

”اب دیکھو! شاید کچھ دیر سے چار میں۔“

جانوروں کے ہسپتال میں چھوٹا لکڑی کا گھر ہے۔ روز بروز کمزور اور تھوڑے بوجھار ہوتا تھا۔ ہاتھ پیر کاٹنے کا نوٹ

یہ وقت سسٹنٹ اور انکسپیکٹرز میں ہلکی کی کانٹیں لگے۔ آئیں اگلے چند ماہ میں اس کی شادی بھی گئی ہے۔

اب پتہ نہیں اس کو کونسا جی آپ پتہ نہیں لگاؤں آپ نے وہاں سے ہٹا دیا۔ کچھ سہیلیاں بھی رہائے تھے۔

کی تو بھ میں اس کا روک نہ آیا۔ اب کسی چیز سے لکھے نے مشورہ دیا ہے کہ اسے یہاں ہسپتال میں لے جائے۔

کو دکھایا جائے۔ ہم دونوں دونوں سے یہاں نکل نکل رہے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے آج ٹوہنے کی رہ گئی ہے۔

اب پتہ نہیں کہ آ کے کیا ہوتا ہے بڑا ڈاکٹر کیا کہتا ہے! ہسپتال میں داخل ہونا پڑتا ہے یا کوئی

کمرہ پارے کا۔ اللہ جانے کتنا خرچ ہو کر غریب لوگ ہیں۔ اللہ نے آپ سے عطا کیا ہے۔ آپ سے

لے سائیں بابا میں کر آئے ہیں۔ دل کہتا ہے کہ آپ کی اعلا رکت سے غلام عباس مرے پکارے گا۔

اس کی بات ابھی شاید ستم نہ ہوتی کہ ہم ایک سر جہاز سے میدان میں پہنچے تھے۔ یہاں بہت سے

جہازیں بھی تھیں۔ سیر و ریش میں مصروف تھے۔ ہم ایک ہیئر کے بیچ پہنچے گئے۔ غلام عباس کھڑے تھے۔

غلام سب سے مزید بات کے لئے لب کھول ہی رہا تھا کہ میں نے اسے اشارے سے روک دیا۔

”بیٹا! میں نے تمہاری بات سن لی ہے مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ دونوں کے

سے خوش ہوا۔۔۔ آپ لوگ اپنے پروگرام کے مطابق بڑے لڑکھڑ سے ملیں دیکھیں کہ وہ کیا شخصیت کرتا ہے۔ اس سے فارغ ہو کر ہی آپ واپس لوٹیں۔ میں بوڑھا سفر کی تھکن سے ٹوٹا ہوا ہوں مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اللہ یار کے پاس پہنچ کر ہی آرام کروں۔ لہذا آپ لوگ مجھے اجازت دیجئے کہ میں گھر وٹ میں ملاقات ہوگی۔“ میں نے اٹھتے ہوئے مزید کہا۔

آپ اس کا معاذ کروا کر اپنی تسلی کر لیں ویسے میں نے اس کا معاذ ایک نظر میں کر لیا تھا۔ اسے کہہ کر روگ لگ گیا ہے اور اگر اس کا بروقت آپالے نہ کیا جاوے تو یہ جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔“ دونوں میرے ساتھ ہی گھر لے ہو گئے تھے۔ غلام حسین کہنے لگا۔

سرسر میں بابا ابھی کچھ ہمیں ایک بندہ سنیا سی بابا نے بھی بتایا تھا۔ یہ پچھلے دو ماہ پہلے کی بات ہے۔ اب چھوٹا غلام عباس بولہ بولہ سنا لیں بابا! اگر آپ مرنے کا سبب جانیں تو ہم آپ کے ساتھ ابھی واپس آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ میرے روگ کو سمجھتے ہیں تو ادھر خواخو واد وقت اور پیسہ برباد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سنی زبان ۱۰ روز سے غرارہ رہے ہیں۔“ غلام حسین نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور دونوں میرے ساتھ ہی چلے ہوئے۔ میں بھی سوچ کر غامض ہوا۔ بابا نے سب اور لوگ سنی زبان سے کہا۔

UrduPhoto.com

• وہی میں چلے کر رہتی.....!

گھر وٹ پہنچتے پہنچتے ہمیں خبر کا وقت آکا تھا۔ سحرانی رانا داستوں پہ بڑی سہک خرابی اور بھگدانہ مچ چکا ہے۔ ریت یا کھجور کی زمین پہ سلاستی سے پھلے کا واحد طریقہ یہی ہوتا ہے کہ آپ آہستہ ہوئے آہستہ آہستہ ریت کی بجائے کھانے سے پاؤں جسمانی قوت روناں کا ریاں ہوتا ہے۔ گھر کی مانند چھپے پاؤں سے ریت سے ہی جنس بھٹس جاتے ہیں چکر کھینچنے اور ریت بھٹکنے سے رابوہ بانان ہو جاتا ہے۔ سحران میں ریت سے ٹوٹ اور دلدلی زمین پہ چلنے کے لئے تیندوے سے سیکڑا چاہئے۔ ریت میں رگ نہیں ہوتی۔ ریت کے سہارے اور دلدلی زمین میں سچا ہوتا ہے جو اپنے اندر کھینچ ہے باہر نہیں دھکیلتی۔ سندر کا پانی باہر سے نکلتا ہے اور دلدل کا سندر اپنے ہیچر کھینچ ہے۔ ان کی اپنی اپنی راہداری میں سب طرزی کھینچ سکتی ہے۔ یہ اپنے من کی مشا اور من مانی ہوتی ہے۔ ویسے دوبنے کے لئے شاید کسی کوئی اور یا سندر کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ حوصلہ ظرف اور موقع ہونا چاہئے۔ چلو بھر پانی دھکیکرے میں ٹھہرے ہوئے چند قطرے

پیشانی پر چمکتے ہوئے عرقی انفصال کے موتی ٹوک بڑا کاس پہ اٹکا ہوا آنسو۔ انہماک یا کوئی گہرا امراتہ۔
تم سمندر کی بات کرتے ہو لوگ آنکھوں میں ڈوب جاتے ہیں۔

دانت شیر چیتے اور گئے بھڑیے کے بھی ہوتے ہیں مگر گھڑیاں لنگ کے دانتوں کے ٹھوس
تھپوٹے سے ہلاکت کچھ اور ہی نوع کی ہوتی ہے۔ پانی میں ڈوبتا ہوا جاندار نکلی آنکھوں سے بڑے دھمکے سے
خفاقت قیافہ شروب چن ہاتھ پاؤں سے نرت بھاؤ پیش کرتا ہوا۔ نختے نختے لمبل وغباروں سے
بہلاتا ہوا پران ہار جاتا ہے۔ مگر دلدل میں پھنسا ہوا جاندار بڑی حسرت ناک اور کرہ ناک موت سے بچ جاتا
ہے۔ دلدل ٹٹک بھی ہوتی ہے جسے تھنٹھل کہتے ہیں۔ یہ کچڑی دلدل سے بھی کہیں زیادہ اذیت ناک
ہے۔ کچڑی دلدل تو کسی نہ کسی طور پر پانی میں پھنسا ہوا کسی بھی جاندار کی موت سے بڑے دھمکے سے
کسی ہمارا جھکاؤ دے سکتی ہے۔ مگر قتل صحرائی و سموتوں میں کچڑی دلدل کی گھنیری گھنیری
دلدلیں ایسی جھکاؤ اور ظالم ہوتی ہیں کہ کچڑی بے چارہ دیکھنے دھماگے سے بدھا حضور مرگے پیش ہو جاتا ہے
بے آپ و کھانا سب سب ترس گھٹوں کی یہ اندھی مرن کی نشتہ کار کوئی ایسی جاندار سموت سے نشتہ
ہیں کہ مر جاتے ہیں۔ اور ان کی موت کی نشتہ کار کوئی ایسی جاندار سموت سے نشتہ
ریت بھرنی چلی آنکھوں سے دیکھنا اور فہم کرنا ہے۔ مٹی موت کی مٹی ہوتی ہے مردے کی ہڈیاں
گوشت پرست سب کچھ مٹا دیتی ہے۔ کتہہ کوک و غیرہ مرنے والے اسی لئے مٹا دیتے ہیں کہ مٹی تو
مٹی کر مٹ جائے گی تم اگر کم کچھ کچھ نہیں تو مردے کا نام لکھا دکھائی دیتا ہے۔ مگر ریت زار اور ریت
گرا چلا کر ہوا اپنی مٹی آنکھوں سے صدیوں کے لئے ٹھونکا سا ہو جاتا ہے۔ یاد رہے کہ باقاعدہ جسمانی
کا فورایا ٹھونکایا اور دفن یا ہو امر و فہم ریت میں پڑا رہتا ہے کیونکہ یہ سارے اجسام اور تکلفات اپنی یاد
حشرات الاربعہ کو موت عام دے دیتے ہیں۔ مگر تھنٹھل یا برفاب میں اترنے والا مردہ چونکہ ازل سے
تاکہ لے کا فکر ہوتا ہے اس لئے بے چارگی اور حیرت و ہول سے چھٹی ہوتی آنکھیں۔ سانس کی ہار
اور پھیپھڑوں میں پھنسی ہوئی ریت یا برف مردے کو اندر باہر سے محفوظ بنا کر دیتی ہے۔ اعصاب کے
ذریعوں کی گھنٹا خون کے بہاؤ اور دماغ کے سہارا میں چونکہ ایک دم قفل پڑ جاتا ہے۔ ایک سنت
سا لگتا ہے پھر جی کی سارا خون خشک کر دیتی۔ ریت نفث اعصاب اور دماغ کو پتھر بنا کر دیتی ہے۔
بے بسی بے چارگی کی انتہا کی گھنٹا ہر ایک کی بیانی برباس میں تبدیل ہو کر جسم کو ڈیرا اور پتھر
ہیں۔ ایسی ہی بے بسی بے چارگی کی مٹی آنکھوں سے موت کو گھٹے لگانے والوں کی لاشوں کو ریت

اعطشِ اعلیٰ نکار نے کی طرف دھیان بھی نہیں جاتا۔ اس کے باوصف میں مذہب کا سا ہو چکا تھا۔ آگے سے نگاہ و ذراستی تو کہیں کوئی گوشہ گھوٹی دکھائی نہ دی۔ میں نے جاننے کے باوجود پوچھ لیا۔

”بھائی غلام حسین! آپ کیا ارادے ہیں؟“

وہ میرے پاؤں میں بیٹھتے ہوئے مغرب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”بابا! میں اپنا یہ قصہ غلام عباس کو پکڑاؤں اور آپ بسم اللہ پڑھ کر میری کمر پہ سوار ہو جائے۔

انشاء اللہ گھنٹہ سوا گھنٹے میں ہم اپنی گولٹھ میں پہنچیں گے۔“

یہ کمر پہ سواری اور گھنٹہ سوا گھنٹہ کا پیدل سفر کا جان کر میری تو جان نکل گئی۔ میں نے اسے

دکھاتے ہوئے کہا۔

”تم مجھے اپنی کمر پہ لاد کر لے جاؤ گے۔“ متاثر ہے تمہاری گولٹھ تک۔“

اس نے بڑی آسانی سے جواب دیا۔

”سہ تو کوئی خاص نہیں میں کوئی سال سے چار پتے کون ہو گا۔“

بات تو یہ تھی کہ وہ زمر کا کام لے رہے تھے اور وہاں ان کی کمر لگا کر جانا تھا۔ بات

جاتے ہیں۔ چار پتے میری چار اور آپ میری کمر سے پتے جائیں ہاں وہ میری کمر کے گرد چار کمر لگائے

چار کمر آپ کے کمر لیت کر اپنے کمر میں لگا دیں گے اور آپ کی دونوں جاکٹوں کے اندر کمر لگائے

گا۔ آپ بارے میں۔“

میں نے اسے درمیان میں کوئی جواب دینا نہیں دیا۔

”برخودار! اتنے سے پیدانے کرو۔ میں تمہاری کمر پہ سوار نہیں ہوں گا۔“

اپنی گولٹھ چلے جاؤ میں یہاں سے کوئی انتظام کر کے اللہ یاد کے پاس چلا جاؤں گا جسے میں اتنی دیر سے

ہوں۔“

غلام حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بابا! میں لوہاں بچھنے کے لئے پہلے تھاری گولٹھ سے ہی گزرنا پڑتا ہے اور جاتے گا، کوئی

نہیں..... آپ قلم کریں کیا کرنا ہے؟“

آپ میری مسکراتے کی باری تھی۔ میں نے کمر لے دیتے ہوئے کہا۔

”بھائی! یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ چلو آگے لگو میں تمہارے ساتھ اپنی تاگلوں پہ چلوں گا۔“

مگر کی نماز گھر وٹ کی ایک ساوہی مسجد میں ادا کی۔۔۔ منیٰ نے کوشش کی کہ یہاں سے فوراً اللہ یار کے پاس نہ نہ ہو جاؤں۔۔۔ آؤٹ بھی ہو جو صرف آؤہ پونے گھنٹے کا سفر۔۔۔ مگر غلام حسین اور غلام عباس نے کمر باندھ دیا یعنی محبت اور محنت کا اظہار کیا کہ مجھے ان کی بات مانتے ہی نہی۔ وہ مجھے بڑے احترام و چاؤ سے اپنے گھر لے کر لے گئے تھے۔۔۔ بوڑھے شریف انفس باپ نے دل میں کھپ جانے والی محبت و چاہت سے ان کو یہ کہا۔ دیکھا جائے تو اس نفسا نفسی کے دور میں آج بھی اگر کہیں اخلاص و احترام ہو گھٹنے کو دل چاہے تو کتنے شخصیں شہروں سے دُور ساوہ لوگوں اور گھروں دیہوں میں چلے جائیں۔

مفتخری ہستی میں میری آمد کی خبر خوشبو یا بدبو کی مانند پھیل گئی تھی۔۔۔ بوڑھے بوڑھیاں اپنے خاص طور پر بیمار اور تنگ حال لوگوں کے ہرے کے ہرے چلے آ رہے تھے۔ میری محبوب حال خلیہ بیمار دگر بیاں انگشت سے مالا نہیں۔ ان پر مستزاد میری چھ دُور اور یہ چلے بائیں ان سب "عجاibat و ظاہرات" کے طور پر ہے کہ ساوہ لوگوں پر نشان حال اور تو ہم پرست لوگوں کے لئے بڑی کشش ہوگی۔۔۔ کوئی عامل کامل گھر سے نہ کوئی محنت شایاں اور تو اور کئی ایک مجھے جاو دگر اور کالے سٹم والا کوئی بابا بھی سمجھتے ہیں۔ اپنی سوجھ بوجھ سے۔۔۔ کئی ایک جاتر چالاک تو مجھے نہ کہنے بھی دیتے ہیں۔۔۔ ان کے چاروں بیٹوں نے اس کے گھر میں رہنے کی اجازت مانگی تھی۔ ایک گھر میں کئی ایک صاحبان رہتے اور رہائی کا کمال بھی نہیں آتا تھا۔۔۔ چنانچہ کے تھوڑی دیر بعد ہی میری آنکھوں میں اس نے جھادیا تھا کہ اگر میں یہاں سے جلد از جلد نکل نہ جاتا ہوں تو ان کراہتوں اور گھروں کے پرستار میرے ہر کچھ کی کر سکتے ہیں۔ ہمارا بڑا بڑا ہے۔ لیکن ہوئی تو ہوئی رہی ہے۔۔۔ ایسے گھروں میں کہہ سکتے ہیں کہ یہاں کی خیریاں کی خیریاں کوئی کوئی نہیں کہ کسی کے گھر مہمان نہ لگے۔۔۔ اور اگر وہ مہمان کوئی ملتش مہمان ہو تو یہاں پر وہ نہ لگے کوئی وہ یہ سب۔۔۔ تو پھر دیکھئے کہ چاہوں اور سے یہ گھر میں لوگوں کی دیکھا ہر سے لگتی ہے۔

میرے لئے دھرمی ہوئی چائے کی پتیلی میں ابھی اباں تک نہیں آیا تھا کہ چھوٹا سا دالان اور مچھ بنگہ کے عمارتوں کا انبوہ دکھ گیا تھا۔۔۔ بچے بچے کمرے کے وسط میں منیٰ ایک رکتیلوے چڑ کے پہاڑ کی طرح بلند دیں چڑھتا ہوا تھا۔۔۔ غلام حسین کا بوڑھا باپ فریاد حسین میرے دائیں جانب قدم سے قدم لگا کر ان مرا تھے میں زوہا ہوا تھا۔ وہ ایک بوڑھے جوشیہ کوٹھ کے کوئی سرگرد ہوں گے موجود۔۔۔ دُور سے ایک ملّا قسم کے بزرگ انداز داخل ہوئے۔ سلام ڈالا اور ہاتھوں کی بوسہ بازی کے بعد ہمارے گھر کی قرأت سے ملتے ہوئے۔

”باہر کو لوگ زیارت کے لئے بے یمن ہیں۔۔۔ ان میں چند روحانی اور حسانی عوارض بھی ہیں۔
بتلا ہیں۔ میں حتی المقدور ان کی خدمت کرتا رہتا ہوں۔۔۔ آپ چونکہ آپ سائنس شریف کے لئے ہیں۔
انہیں شرف باریابی بخشیں۔“

اس قسم کی ضرورت حال سے میں اکثر دوچار ہوتا رہتا ہوں۔ ظاہر ہے مجھے اب لوگوں سے کچھ
واحد بھی آتا ہے۔ اندر کمرے میں جگہ کی تنگی کے پیش نظر میں دالان میں نکل آیا۔ فردا فردا سب سے
سے علیک ملے۔ دو بار کت ہوئی۔ چائے پیئیں اور خشک نلے باجور کے پیٹھے مرنڈے کھانے کے
میں نے معذرت چاہی کہ مجھے چونکہ ایک ضروری کام کے سلسلہ میں فوری طور پر رہنمائی چوکی پہنچنا ہے۔
لگ بھگ ایک مہینہ یہاں موجود ہوں۔ انشاء اللہ مناسب موقع وقت پر آپ سب سے ملاقاتیں ہوں گی۔
بکا سا کھانا پینا کر کے میں یوپی مسکوں سے نکلے گا مگر اب یہاں ایک باگی سی ڈالنی ہے۔
چوکی کی جانب روانہ ہوا۔ یہاں بھی غلام حسین نہیں تھا۔ آگے آگے اور غلام عباس اور ایک اور جوان
بچے تھے۔ پھر راجہ آگے ایک بچے کے پہلو چند چھوٹے بچے۔ جو بچے اور بچے۔
نہتا گھرائی میں تھی۔ بچوں والی جھانپاں اور قدر سے۔ بچے کی نظر آئی۔ کئے جیسے حال ہی کے
سے کچھ کچھ۔

UrduPhoto.com

قریب پہنچتے ہی دھڑکی ڈالنی کی چال اور ان کے چلن میں چنداں خلل نہ آیا۔
اطراف سے ہکا بکا ہوا۔ میری یاد میں باجیلی ناگوں کے نواری ڈالنی کی صورت کی
یوں طرح اٹنے کے جیسے یکدم آگے۔ کچھ بچے کچھ بچے۔ کچھ بچے کچھ بچے۔ کچھ بچے کچھ بچے۔
ڈالنی بچے کا پیار کا نام پھیلوانی تھا۔ ڈالنی طرح دار ڈالنی تھی۔۔۔ ڈالنی تو وہ شخص نام کی تھی اصل میں
تھی۔ مجھے اپنے پر سو کر رہتے تھے جس ادا سے ڈالنی ہوئی اور جس ملک سے پھر جو خشک۔
گیا یہ باکرہ الفانہ اور کافرہ۔ ایسی ڈالنی ڈالنی پر سواری کا ایک ایسا الگ ہی سوار ہوتا ہے۔
چار سوار کی مانند وہ اپنے بھار کو ایسی ایسی شکل اٹھکایاں اور چتر چلایاں رکھتی ہے کہ بڑے
جان کو شے قربان ہو جاتا ہے۔ اس کے پیٹے میں خود شباب کے ننھے ننھے کپتے سے چھوٹے رہتے ہیں۔
بہت جلد کپتے میں آجائے۔ عاشق کوگ اکثر اپنا وصل وسیلہ ہی کو ہی کیوں بناتے تھے۔ بچہ
نے کہیں کچھ گھوڑا کوئی بیٹھا ہوا ہوا ایسے موقعوں پر استعمال کیا ہوا ایسے ہی یہ پشور بھار ایسے
جذبائی ماحول میں کچھ نیا دو صاحب کردار قرار ثابت نہیں ہوتے۔

یہ اڈنوں کا بازار ہمارے راستے سے کچھ ہٹ کر تھا۔ اسے چھوٹے بغیر محض دیکھتے ہوئے

ہاں سکتا تھا۔ مگر وہاں تو جیسے اونٹوں میں اک ہڑ بونگ لگی تھی۔ خلیفہ تے ہوئے وہ دو دو بیڑے اونٹنی
سے اک اک کیے ہماری جانب متوجہ تھے۔ صورت حال دیکھتے ہوئے غلام حسین مہار کو پوری قوت سے کھینچ کر
محبوب کا دھیان راہ راستے پر رکھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ جبکہ غلام عباس اور اس کا ساتھی حبیب عجیب
کھاتے ہوئے اس کی پیٹلیوں میں ہاتھوں کی منکھیاں کبھ کبھ کر اس کی مدد کر رہے تھے۔ مگر جوانی کی
جوشی ہڑ کے چپک کی پائلیا کی مانند ہوتی ہے۔ لاکھ ہاند حوزہ کو نو حیرت دیا چھم چھم کی پھیکا تو راکے نہ
کے پھل بول ہیں۔

تو لاکھ چٹری گوری، قلم، قلم کے تیری پائل میں گیت ہیں، جسم، جسم کے والی کیفیت تو درآنی ہوتی ہے۔ یہ تینوں جوان اس کی جوانی کی ترنگوں کے رنگوں میں، جنگوں کی آمیزش میں مصروف تھے اور ان پر مٹیوں کی فصل کو شمشیر پہنکر رہا تھا۔ انسان اپنی آزادی منہ افسوس سے کام لے کر اپنی اچھی بُری کیفیاتوں، غیبتوں پہ جو حلیات ہے۔ نیکوان چرندوں، پرندوں، درندوں، خزندوں میں یہ خالی نہ بھرتے کہ برابر ہوتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی طرح پر بھی نہ اعلان ان کے سن میں آتا ہے کہ گزرتے ہیں اور اس طرح وہ سدا خوش بھی

Under Photo

یہ سب کچھ سن کر وہاں کے مزاربان بھی اپنے گھر واپس آئے۔ پھر ان کے لئے۔ علامہ حسین اور اس
 صاحب کو پچھا کہ تم نے ہمارے قریب آگئے۔ میرے بارے میں سب ان کو معلوم ہوتے ہیں انصار ہوا تو
 سب سراپا بچھ گئے۔ انھوں نے کہا بابا صاحب! اب کچھ دیر یہاں ضرور لگیں۔ کچھ دیر میں میری یہاں ایک نہیں
 بلکہ سب انصار و غمراہ آئے ہوتے۔ انھوں نے سب کچھ بتایا کہ انھوں نے علامہ حسین نے مجبوراً ان کو مارے
 ان میں سے قریب باندھ دیا۔

یہ سوڈا کیم کے سارے باپ تھے جو اپنے باپ سے اور چھوٹے سے مقامی لوگوں، بستیوں سے ڈرا رہے تھے۔
 تھے یہ چھوٹے۔ ان کے یہ لڑکے محض مارا جی ہوتے ہیں اس لئے یہ چھوٹے لڑکیوں اور ترپالوں سے ڈانٹتے
 ہیں۔ جیتے ہیں۔ انہوں نے شہر بچوں کی انہوں کی خرید و فروخت ان کا اصل دھندا بن گیا ہے۔ یہ انہوں کا
 محض بیرونی دھندہ بھی فروخت کرتے ہیں۔ ان کے پاس تار سے اونٹ، اونٹیاں اور اٹل بچے تھے۔ ان کا
 گھر خاصا لمبا، وسیع، اور خوب داب والا نظر آیا۔ میں اس کے پاس ہی ریت پر بیٹھ کر انہوں کے بالوں
 سے سوئے سوئے کے یہ بیٹھ گیا۔ انہوں نے سنسی اور پیر سے بنی ہوئی خشک مٹھائی سے ہماری تواضع کی

میں نے کہا کہ وہ جلد ہی مجھے ملنے کے لئے رہنمائی چوکی آ نہیں گے۔ بڑے جسم خیز سے باہر نکلے

تو اسی بزرگ نے مجھے کہا۔

”بابا سائیں! بس نظر ہمارے مال پر ڈال جائیں۔ نیچے بڑا مندار ہے۔ اس برس کے لئے فرماتے جائیں۔“

مجھے وہ لے کر بڑے بازے کی جانب بڑھ گئے۔ بھیلورانی رات میں کڑی تھی میں اسے چھوٹا چھوٹا ہونے بازے کی جانب بڑھ گیا۔ بہت جانور تھے اس بازے کے ساتھ ایک اور بازہ بھی تھا جس پر کچھ گائے اور بچوں والی ساڈنیاں اونٹنیاں تھیں۔ دیکھتے دیکھتے میری نظر ایک ایسے چھلاوے پر پڑی کہ جسے گرتے گرتے چھا۔ اللہ یہ تو وہی میرے خواب والا اکیل شتر ہے جو لڑکھڑائی ناگوں پر میرے آگے کے ہم شکل چلتا ہوا مجھے ایک نیلے کے پاس رتینی قبر تک پہنچاتا ہے اور شاید اسی کی بابت مجھے اللہ یاد بخیر نے بتا دیا تھا کہ فرما پانچویں آپ کے مظلوم چھوٹے لڑکے کو ایک اونٹنی نے جنم دیا ہے۔

وہ اپنی ماں کی انٹوں سے چمکا کھڑا رہتا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھتے ہوئے چھوٹے پہلے دیکھا تھا اپنا خواب یاد کر رہا تھا وہی بھٹی بھٹی سی معصوم سیاہ آنکھیں اونٹنی کی آنکھوں کی طرح تھیں۔ چھوٹے چھوٹے کیلیے کان چمکا رہی تھیں۔ یہ وہی شتر کا بیٹا تھا۔ میری آنکھیں اور تھیں گئے ہوئے وہاں پہنچا۔

UrduPhoto.com

”سائیں بابا! کوئی خاص بات اس شتر بچے میں یا اس کی ماں کو ہے؟“

میں نے پوچھتے ہوئے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

”سائیں! اس کا نام ہے گندہ یا گندہ بول“

وہ بڑا گندہ سے ہنس بھاتے ہوئے ہوا۔

”بسم اللہ سائیں بابا! بسم اللہ“

اسی اثنا اس بچے کی اونٹنی ماں نے بے قراری سے جھک لے کر گردن جھکائی اور تھوکتی سے تھک جانے کو بھیلی ناگوں کی جانب دیکھ لیا۔ کمر بھر کھٹکنا سا بچہ اونٹنی کے گرد بے حد بے ڈھنگ سا چلتا تھا۔ میں بے ساختہ سا آگے بڑھتا رہنے کے پاس بیٹھ گیا۔ شتر بچے یا بھیلورانی برون کے بچے کو تو آپ جانتے ہیں کہ وہیں ہر شے گھوڑے زہیرے اونٹ باغی گیندے کے بچے سے آپ کی طرح بے تکلف نہیں ہو سکتے۔ اس کی وجہ ان کا تعلق بالکل اپنی ہی نہیں ہے بلکہ بے ادبیاں ہیں۔ وہ اپنی عیب سی بے نیازی دکھاتی ہوئی دوسری جانب سرک گئی جیسے وہ بچے کو میری توہین کر رہی ہو۔ اور وہی ہو گئی ہو۔ اونٹنی ہو یا بھیلی کبھی کسی کو اپنے بچوں کے قریب پہنچنے نہیں دیتے۔ مرنے کو کہتے ہیں۔

بس اس کا اللہ ہی والی ہے۔"

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اگر تم چاہو تو اسے مجھے دے دو ہرے کے برکت کے طور پر مجھ سے کچھ پیسے لے لو۔"

وہ میرے کھٹنے پکڑ کر کہنے لگا۔

"سائیکس بابا امیر سے مجھ میں آئی کہ آپ اس کی حالت پر قریں کھا کر مجھ سے لینا چاہتے ہیں۔ اس

کی ماں نے جب آپ کو دیکھا تو اسے آپ کی طرف دھکیل کر دوسری جانب لٹک گئی۔ اس میں ضرور کچھ قدرت کا راز ہے۔ یہ تو ہمارا کمزور بچہ ہے ہونے نہ ہونے کے برابر۔ آپ اس کے ساتھ اس کی ماں پہلو کو لگا ہماری طرف سے اک حقیر نذرانے کے طور پر لے جائیں۔ بس! آپ ہمارے مال اعمال کے لئے ذرا غلامی کریں۔ ہمارے لئے یہی کچھ کافی ہے۔"

میں ریت پر پٹ پڑے ہوئے اس بچے کے پاس سے اٹھ کر بازو سے باہر نکل آیا۔ غلام حسین

اپنی ڈالچی کو ہمارے سوار ہونے کے لئے ٹھاپکا تھا۔ میں نے بزرگ سے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور لوگوں سے فرار و اسلام کا بعد بھیلورانی ڈالچی پر بیٹھنا کاتے رنگ آگے بڑھا۔ سائیکس بابا تھم کر کہنے لگا۔

"بابا! اساتذہ نے یوں کی تھی کہ آپ اس بچے کے بدلے کچھ حق بچے کے لئے لیں۔ مگر آپ نے

شاید مجھے کوئی حق سمجھ کر نذرانہ دینا دیکھ لیا۔ مجھے پیش کرنا چاہا۔ میں فقیر و غنی ہوں، سب اس دین نہیں۔ اس لئے خاموش ہو رہا۔ یہ کہہ کر میں نے غلام حسین کو اشارہ کیا۔ غلام حسین کے مخصوص اشارے پر میں آواز دیا کہ لکھتی ہوئی کمر کے کمرے پر بارہینے والے تین جھٹوں سے پاؤں پر استارہ ہوئی۔ ہمارے پاس دینے پر پھر شاہی بزرگ کو مزید کچھ کہنے کا موقع نہ مل سکا۔

سوار گار کی طرح اُدھ بھی کچھ اپنے "خاص میکینیکل سسٹم" سے چلتے ہیں۔ پہلا دوسرا

تیسرا۔ بتدریج پھر چڑھا اور پانچواں۔ آگے چونکہ قدرے بڑھاتی تھی اس خاطر بھیلورانی اپنے اپنے گھیرنے پر اس تھی اور میں سٹے کے تھے پکڑے پیچھے کی جانب جھولنے لے رہا تھا۔ اونچی نیچے ہلنے پھلنے کے لئے۔ ایک لمبے لمبے ہواؤں ٹھنڈیوں سے اٹھنے والی تو سیں کانڈا اور مختلف تجرباتی آلات تھلوں کے سفر کو دیکھ ہی نہیں پڑا۔ سوار بھی بنا دیتے ہیں۔

یہاں سحر سے پوچھوئے گا ساں اون میں لو کے جھکڑوں میں جھکڑے ہوئے منظر اور سراب شمس کے

اللہ یا ر وہ اس شہر بچے کو مجھے تھے میں پیش کرنا چاہتا تھا جس کا اسے موقع مل سکا۔

یہاں بھی فکٹر خانہ تھا۔ یہ سرکاری فکٹر تھے۔ جن کے چوڑوں پہ ان کے نمبر نشان لگے ہوئے تھے۔ سب سامنے لگائے تھے ان کی اپنی کوئی مصلحت ہوگی کہ ان میں ایک بھی کوئی رزاؤنٹ نہیں تھا۔ اس بیمار کو حلقہ اوڑھے سے فکٹر بچے کا نام میں نے سنایا رکھ دیا۔

اسی شام نماز کے بعد کھانا کھاتے ہوئے ہم سیاسی کی باتیں کر رہے تھے کہ وہی مختصر سوداگر پرانے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ سیاسی میرے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ سیاسی کو اس حالت میں دیکھتے ہی مجھے انہیں ٹھنڈ پڑ گئی۔ بتانے لگے کہ آپ کے رخصت ہونے کے بعد یہ وہیں اپنی جگہ پہ بے سندھ ساچت پنا تھا۔ اسے دیکھا تو لا تو اس میں کوئی سا بہت سے نظر نہ آیا یہی دکھائی دیتا تھا کہ وہ بد پر مر جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو یہ اپنے پاؤں پہ کھڑا تھا اور شاید اپنی مالی کوتاہی کا روبرو ہوا تھا۔ ہم نے اسے اس کی مالی کے پاس بھیج دیا۔ ماں اسے دیکھتے ہی آنکھ بھری ہوئی تھوکتھی سے پردے کرنے لگی۔ یہ کرتا چاہتا ہے حال ہو گیا تو ہم نے اسے وہاں سے ہٹا کر دوسرے کمرے کے ساتھ بالے میں ڈال دیا۔ ہماری نظر چرکی جو اسے کہیں رہے ہو گیا۔ سب کے دیدوں میں ریت ڈال کر کہیں غائب ہو گیا۔ صبح اٹھ کر کہیں دکھائی دے گا۔ کھڑا تھا تو چلا یہ کہیں آئے گا۔ پیچھے پیچھے آئی یہ ہے۔

UrduPhoto.com

”خیر نہیں بابا! حیرانگی کی بات ہے اتفاقاً ہوا خدا آپ کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے کہیں تو کہیے خدا سے کہ وہ بھی اپنے ہاتھ بھی سچ سے نہیں دیکھا تھا۔“

”خیر نہیں بابا! حیرانگی کی بات ہے اتفاقاً مباحثہ آپ کے پیچھے پیچھے چلا آیا جبکہ وہاں تو کچھ
 غصہ ہے نے تو ابھی اس کا ہنر بھی صحیح سے نہیں دیکھا تھا۔“
 میں نے فوراً مزہ سے اس کی خاطر اسے چھوڑا۔

”درگ سائیں! جب یہ بھی آگیا اور آپ بھی چلی گئے تو اب آپ اسے اپنے ساتھ لیں۔“

”درگاہ سائیں آجب یہ بھی آگیا اور آپ بھی چلی گئے تو اب آپ اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔“

اُس نے کانٹوں کی ٹوس پکڑ لیں۔

”توبہ..... توبہ..... ہماری کیا مجال جو اسے چھوڑ بھی جائے اس کی مالی نے خود بخود چھیل کر اسے آپ سے اس بھیجا ہے آپ اس کے مالی یا یہ آپ سے ہی جڑا ہے۔“

اب میں نے اُسے ایک مناسب سی رقم تنھاتے ہوئے کہا۔
 "پھر یہ مدیہ قبول کرو۔ میں جانوں اس کی جان جانے؟"
 اس نے ہنسی چوں چوں کے بعد رقم کو چوما کر آنکھوں ماتھے پہ لگایا۔
 "جو حکم سائیں بابا! غیر برکت کے لئے رکھ لیتا ہوں۔ آپ پہلے بھی اسی بات پہ خفا سے ہو گئے تھے۔"

تو میں کہوں یہ رقم بہت زیادہ ہے آپ.....؟

”نہیں سائیں! یہ معمولی رقم اس قیمتی اور نادر الوجود جانور کی گوبری کی بھی قیمت نہیں۔ تمہاری رقم نے اس حقیر رقم کے عوض مجھے یہ معصوم سا جانور دے دیا ہے۔“

یہی یہ قیمتی اور نادر الوجود جانور دانی بات سن کر وہ سوداگر بوڑھا اپنی ٹھنکریالی گھنٹی سی واڑھی لٹکانے کا جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ توڑی سی خاموشی کے بعد اس نے گریہ۔

”بابا سائیں! عمر میری بھی شتر پالتے بیچے خریدنے میں گزری ہے میں ان کی ہر نسل واصل سے جانتا ہوں۔ اس بچے میں سوا اس کے یہ بہت کمزور اور بہت ہی کالا ہے کوئی اور خوبی دکھائی نہیں دیتی۔ اس کو گولی اور نادر الوجودی ہو تو بتائیں تاکہ میرے بھی کچھ چنپلے پڑے۔“

اس نے اس کی ہوشیاری چالاکی پہ ہلکے آگے ہوئے جواب دیا۔

”سائیں! میری بات شاید تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔ اس بچے کو میں نے اپنے خواب میں دیکھا تھا۔ مجھے لگا کہ ایک قبر یا کمرے تک گیا ہے۔ پھر کچھ ہی دنوں بعد مجھے اپنے اس اللہ یار کا بچہ ملا کہ آپ

میں نے اس کا بچہ یہاں الگ الگ لے آئے ہیں الگ الگ بچے کو منہ سے جو آئے ہیں وہاں سے۔ چنانچہ میں یہاں پہنچے۔ اس کا بچہ میری دعاؤں اور اللہ یار کے پہنچے اس شتر پہ لے ہوئے۔ اور یہ میں کہوں میں یہاں قتل

کئے گئے۔ ایک لڑکے کو قتل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے توفیق طلب کر چکا ہوں۔ کچھ عرصے پہلے میں نے اس کا ایک حصہ کھانا تارا گدھ میں مکھل کیا تھا۔ اب بقیہ حصہ کسی صحیح فلاحی ریت کے کنویر

میں گھر میں لایا۔ دینا ضروری ہے اس کو اس کی دعاؤں اور نصیحتوں کی ایک تو شتر پہ لے جاؤ گا لایا اور باختری اونٹ کے ساتھ یہاں لایا جائیگا۔ اونٹ کھوڑے یا برن کے بارے میں تم جانتے ہی ہو گے کہ ان کی

توڑی گھنٹوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور ایسے جانور کچھ خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ دوسری خصوصیت ان کی توڑی پر ہیز کا رنگ مضبوطی اور گروسے کے مالک ساتھیوں کی ہے جو ہر وقت صاحب و خلیفہ کی جگہ

میں کو چڑا کرتے رہیں۔ میں اپنے اس بچے اللہ یار کو اپنی ساری ضروریات اور انتظامات سے بہت پہلے سے

دیکھ رہا ہوں۔ اب موسم معتدل ہوتے ہی اور شتر بچے کے مل جانے پہ اس نے مجھے فوراً یہاں بلا لیا۔

”اب اس نے اللہ یار کے علاوہ تمام حسین اس کا بھائی اور آپ جیسے اللہ کے نیک بندے مجھے میں

اور درگ فرط ممنونیت سے میرے ہاتھوں پہ بوسہ دیتے ہوئے کہنے لگا۔

”بابا سائیں! آپ کے لئے جان بھی حاضر ہے۔ اللہ یار بھی اپنا بھلی ہے۔ یہ ادھر گشت کرتے

ہوئے ہمارے ڈیرے پہ بھی آتا رہتا ہے۔ اب مجھے یاد آیا کہ اس نے اس شہر پہنچے کو کیوں پسند کیا تھا۔
نے آپ کو یہاں ہم غریبوں کی دیکھ بھال کے لئے بھیجا ہے۔... دارویش فقیر تو آپ ہیں ہی مزید پتہ چاہئے کہ
سنیاسی وید بھی ہیں۔ آپ کے یہاں آنے سے بہتوں کا بھلا ہو گا۔“

وہ ایک بار پھر میرے دیئے ہوئے پیسے نکال کر واپس لوٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے
منجیدگی سے اسے منع کیا۔ تب کہنے لگا۔

”باہا سائیں! مجھے چٹاؤں اور دھنوں کا بہت شوق ہے، میں نے بھی بے شمار چٹے کیئے ہوئے ہیں۔
مگر کچھ بھی فائدہ نہ ہوا اور نہ ہی کچھ پڑ پٹے پڑا۔ بڑے بڑے مرشدوں، سادھوؤں، فقیروں کی ٹہل خدمت کرنے
پے بندہ۔ کہیں میں اوجھڑا رہا اور کہیں دوسرے کھوئے نکلے۔“

میں نے اس کی بات بکھر گئے ہوئے کہا۔
”سائیں! تم نے عجیب سی بات کہی کہ تمہیں چٹے کاٹنے اور دھنیں کر کے کا شوق ہے۔ بھلا یہ کون سا
شوق ہوتا ہے شوق تو شغل سے ملتا ہوتا ہے۔ تم نے چٹے اور دھنیں شغل سے ملے میں کیئے۔ کسی کے شغل سے
فائدہ بھی نہیں ہوا اور نہ ہی تمہیں کوئی دھنیں کا مرشد ملا۔ سائیں! تم دنیا دار کا رہاؤ۔ کسی آدمی کا
دل اس کا شغل میں کسب چکا ہے۔ ہاتھوں سے کام لے کر اس میں ہلاکت ہے۔ اسے جہنم کا راستہ چھوڑنا چاہئے۔

مردوں اور خدمت کرنی پڑتی ہے۔ چڑیا کا چہرہ فائدہ میں اور اپنا نکل کی پوٹ کی کا قہر و لہو ہے۔ اس کا
کچھوٹا پنچر کا نگینہ اور چھوٹا گھڑی کا روٹا۔ غلامتیں، پندکاریں، سواہیاں اور تھاکیاں! شاید تم چٹوں، دھنوں
مجاہدوں، یا خدمتوں کو بھی شغل قرار دیتے ہو۔ شغل سے کس کا شغل ہے۔ کئی ٹہل کھتے ہو اور ہاتھوں مرشدوں کی خدمت
یا سادھو کا۔ جو کہ اپنے گلی بازاروں میں دھڑے ہوئے ملتے ہیں۔ آسمان پہ پھوٹوں کھریوں سے بھر جاتے ہیں۔
شمس و قمر زہرہ مشتری عطارد، مریخ، زحل وغیرہ تو کوئی ایک آدمی ہوتا ہے اور جبکہ ان سب میں آسمان کی
صرف اور صرف ایک ہی ہوتا ہے۔“

میری یہ بچی بچی باتیں سن کر بزرگ شہر سواہر کی عجیب سی حالت ہو گئی۔ بندہ سیدھا اور غریب تھا۔
شاید وہ فائدہ دیکھ کر لاگ گئی ہوگی۔ جبکہ بظاہر تصوف کی آگ میں تھکسا ہوا تو نہیں صرف جھپٹ پٹا
ہوا ضرور دکھائی دیا تھا۔ یہ ان صحرائی تو ویسے ہی اٹھ چھڑے والے ہوتے ہیں۔ صحراؤں، تھکنوں، سواہیوں،
زندگی کی اینٹوں سے انہیں رگڑے دے دے کر پروردگار کو دیا جاتا ہے۔ تب انہیں کبھی صحرائے حجاز کے
ستارے اور امیر تاروں میں اپنے جگر پارے دکھائی دیتے تھے۔ ان کی آہ و فغاں خدی خوائی کے
میں داخل کر فطرت کے صحرائے نجد میں اک و جدی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ یہ قدرت کے رمز و شگنوں کے

ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں شکرے لڑکھڑکیوں میں آہو۔ تن میں تیندوے۔ ڈارووں میں زعفران
جس وقت میں پہاڑوں کی قدیمیں۔ جبکہ ان کی سانسیوں میں گھبرے سانپوں کی سرسراہٹیں ہی ہوتی
ہیں۔ ہر بندھے اور سندھے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔

وہ سر کو نیچے سرکائے، سرک کر رہا تھا۔ منہ خاموش اور وہ تو جیسے مدہوش تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے
اس نے اس کے بھیتر پڑی کوئی گرہ کھول دی تھی۔ جب کسی گھڑی یا بلدی کی گریں کھول اور گھول
اٹھ جائے تو پھر سب رنگ بھٹک سامنے آ جاتے ہیں شب کوئی تیر تیکھ اور جھل نہیں رہتا۔ وہ بچہ سحرانی کسی
نہیں۔ وہ ٹھیک رہا تھا ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”سائیں بابا! میری تو بس! میں نے دیا تیا گی۔ میں شہروں کا سوداگر نہیں! فقیر کی راہ میں گداگر بننا
نہیں۔“ پھر میرے پاؤں پکڑتے ہوئے اچھا کر کے لگا۔
”آپ مجھے اپنے ان قدموں میں رہنے کی اجازت دے دیں۔
میں نے پاؤں چھڑاتے ہوئے کہا۔

”میں نے آپ مجھے فرستادہ کر دیا ہے۔ میں نے آپ کو اپنا چھوڑنے کے لئے کہا اور نہ
اپنے لئے دیکھا۔ میری دیکھ کر دیکھنی ہی چاہیے ہے چاہے وہ دنی یا دوزخ میں! جب دنیا
میں کسی سے ناما تعلق تو توڑا نہیں جاسکتا۔ بس اتنے ہے کہ اس سے اتنا بڑا جتنا ہے حد ضروری
ہے۔ یہ ضرور کا کارہا تو نہیں تو غیروں نے کیا ہے۔ یہ بڑی خیر و برکت والا میلہ روزی ہے! اسے بھی
میں نے اندازہ، باہر کے کارہا مال کی جس اندازہ کی کہ وہ تو اس کی امانت برتو۔ اور ہاں
اسے بڑا کارہا اور باہر کا ہے۔ جیسے ہے بے کے بغیر نہیں لیا جاسکتا اسی طرح بابے کے ہاتھ
میں لکھا یا جاسکتا ہے۔ بے اور بابے میں شخص الف کا فرق ہے۔ اور یہ تم کو کچھ جانتے ہی ہو گے کہ
الف کے لئے سے پہلا حرف جو نکلا تھا وہ الف ہی تھا۔ اسم اعظم کا پہلا حرف! اسم احمد! اسم القاب!
اسم احمد سے اولیٰ اور آخر اللہ کے لئے بھی یہی الف۔ بابا اسی الف سے آمنا و صدق نکلتا
تھا۔ اسم احمد فقر و روزگاری ہے۔ یہی کچھ اگر تم مجھ سے سیکھنا چاہتا چاہتے ہو تو اسم اللہ“
وہ غصے سے ہوتے ہوئے بولا۔

”سائیں! مجھے ابھی بیعت فرمائیے۔“

”کبھی! میں جہ نہیں فقیر ہوں۔ آج کا نام نہاد بیعت لیتا ہے نذر نذرانے وصول کرتا ہے پھر
اس کے ہاتھ لے دیتا ہے اور سب کا دوست ہوتا ہے۔ جبکہ فقیر نور و بخش یہ سارے کام نہیں کرتا۔ کوئی نگاہ و من

میں ٹھک جائے تو ٹھیک سے بات کر لیتا ہے ورنہ وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتا۔

دارت زن فقیر تھوار گھوڑا۔ چارے تھوک دیکھ کسے دے یا رتا ہیں۔

اگلے دو تین دن قدرے آرام سناں کی ٹہل سیدا اور نگہداشت میں گزار گئے۔ اس پاس کے گوٹھ قحط سے پرے کے پرے تو عافوں پر کتوں اور زبانت کے لئے آتے رہے۔ لیکن یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ میں محض ادا پاہ آتھا کرتا ہوں۔ کوئی دھاکا تعویذ گنڈ اور حرکت کیوں نہیں دیتا۔ وہاں تو اللہ والا ہے نہ اسی کو سمجھا جاتا ہے۔ جس نے سر پہ بڑا سا پگڑ پینا ہو۔ کھلی ڈھلی رنگین مہائیں قبائیں لٹکا رکھی ہوں۔ جس پر چیلے چائے منگی چائے والے جلو میں ہوں۔ بٹھانے اٹھانے کے لئے ڈولی اوپر چھتر چھتر تعویذ گئے تو وہ بٹھانے اٹھانے پھوٹیں بھاڑ چھتے۔ بڑی بڑی دعوتیں نیازیں اور لشکر لگا کر آنے جانے والوں نے جب ایک سے سیاد پوش بوڑھے کو جو نہ تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا اور نہ ہی کسی لڑکی کو دم پھونک کے قریب آنے دیتا تھا۔ نذر عیار نہ کوئی پڑھائی و تحفہ۔ از حاکمی تولہ چاندی نہ چاندی نہ چاندی نہ چاندی۔ بلکہ الٹا اپنے کھسب جیب سے اتھنی پیسے نکھاتا ہو۔ بچوں بالوں کو خالی منگی نہ لواتا ہو۔ جو محض دھاکوں دھاکوں سے حاجت سے وقت وروں کی نادری کرتا ہو یقیناً کھلی بار دیکھا تھا۔ بہت سے غریب سی انکھروں سے تو اپنے بچوں کے لئے دالے ہی دیکھتے تھے۔ انکھروں کی سیالیاں انکھروں کی سیالیاں سے ہیں کیا لیں دینا؟

شروع کے ہی دن چار دنوں میں یہ بزرگ جن کا نام بابا حکمت یا قہر سلسل میری جانشینی میں رہا۔ اس بھرچ سٹ پٹن و قحط پٹنوں پر تھی۔ آٹھ آٹھ گھنٹے ساندنی سوار اپنے اپنے محلے کی گشت پہ لگتے تھے۔ قحط کے بچوں بچہ و دوز و زور تک نگہداشت پہ نکل جاتے۔ مجھے انہوں نے ایک بھر جوتی ملیمہ کوٹھڑی میں فولد تک بیٹھا رکھی تھی۔ یہ کوٹھڑی دراصل ان کے واسطائی نظام کے لئے موجود تھی۔ چار جنگ کے لئے تھی۔ ملک کی پانی مملول تیزاب وغیرہ کی علی گلی ٹوکی بنا۔ یہ قدرے بٹ کر وائے تھی۔ اس کے لئے میری ہی پڑ زور و زور خواست پٹنوں نے عارضی طور پہ مجھے یہاں ڈال دیا تھا۔ اس کوٹھڑی کے اوپر پانی جمع کرنے کی ٹھکی بنی ہوئی تھی جو شاید کونھی تھی کیونکہ اس کے بھرے کا انحصار بارشوں پہ ہوتا ہے۔ اگلی بارشوں کے قریب قریب کوئی آٹار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ خیر خانہ و قنارہ ہاشمی میرک اسلحہ خانہ گودام وغیرہ کوٹھڑی سے کافی بہت کر تھے۔ کوٹھڑی کی ایک پھوٹی سی کنز کی مغرب میں کھلی تھی اور ایک طرف کی جانب۔ جہاں دھنڑلے صبح کی درخش اور پرے کے لئے گراؤندسی ہائی ہوئی تھی۔ سرف ایک قبائے کے کہ یہاں کی غری کے لئے جو صحرائی انداز کے بیت اللہ بنے ہوئے تھے وہ کوٹھڑی کے دروازے کے باہر

کی تاریخ لے لو۔ ایکس باکس دنوں میں مسیں اور سرے فارغ ہوں گا۔ اس دوران آتے جاتے ہیں۔
بہاول نگر کون سا یہاں سے دور ہے۔ میری نگہداشت ختم گئی کے لئے یہاں بہت سے اللہ کے بندے ہیں۔

آنے جاتے والوں کی تعداد اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اس میں کچھ میرا بھی سرور تھا۔
زیادہ عقل اس رہنمائی پرست کا تھا جہاں غیر متعلقہ افراد کا آنا جانا ممنوع تھا۔ اکاذ کا آ بھی نکلتا تو میں اسے
فارغ کر دیتا۔ چوتھے روز میں نے اللہ یار بھگوان بابا حکمت یار اور غلام حسین قیوں کو پاس بٹھایا اور بتایا کہ
روز بعد نو چندی جمعرات ہے اسرا الہی ہوا تو میں اپنے چلنے کے لئے ریت میں اتروں گا۔ اللہ یار بھگوان
اپنے گھر چلا جائے گا۔ بابا حکمت یار اور غلام حسین دونوں اپنے اپنے اوقات مقرر کر کے دن رات وہاں چھ
پہنچے جو وہ حاضر اور میری ہدایات کے مطابق چوس و خرد دار رہیں گے۔ یہ دو سانی دو دن مجھ سے قہر
رہتے ہوئے چوبیس گھنٹے مجھ پر نظر نہیں گے۔ بلکہ بارش ضرورت و مجبوری وہ مجھ سے بات چیت کرنے
انتہاب کریں گے۔ میرا کوئی نکل یا بات کچھ میں آنے یا نہ آنے وہ مداخلت نہیں کریں گے۔
ہدایات میں چوبیس گھنٹے کے بعد میں نے اللہ یار بھگوان اور غلام حسین کو اپنے
انتھان بھی پہنچا دیا ہے۔ یہ دو سانی اور اوروں کے ہاتھ سے بھانے کے بعد میں نے کہا دیا کہ
ملاقات نہ تھی سے کہہ رہا ہے۔ اب میں بیٹری چارجنگ والے کمرے میں چارج ہونے کے لئے بیٹھ رہا ہوں
بھی میرے ساتھ اندر چلا آیا تھا۔

چار روز پہلے اس چوکی پہنچے تھے۔ یہاں کھانا دینا تھا۔ کچھ کھانے کے تقریباً شتم ہی کر رہا تھا
میرے محلے کی زمیں لہو اور آلاکٹوں سے خالی ہو چکی تھی۔ میرے تھیلے میں ہکا سا مٹھنیاں تھیں۔
نور ایلا اؤت کی کھال کی ایک چھوٹی سی چھال جس میں آب زم زم اور دنیا بھر کے مقدس پانیوں کا
تھا۔ تقریباً ایک تولیہ کا لے کل اور اتنے ہی تھیلے ہوئے جو۔ اس چلے رہی تھی کا دورانیہ کیا رو دن
ہوتا ہے جبکہ اس سے پہلے کے چوبیس گھنٹے ضروری ہوتے ہیں۔ یہ ساتواں (دو حصوں میں) چلے جا رہا تھا
ہوتا ہے۔ مگر خدا ہا ہے اس کی اجازت و راکم ہی دیتے ہیں۔ اس میں جان کے لئے بھی پڑ سکتے ہیں۔
لطفی! بے احتیاطی سرور ہو جائے تو حامل مہسوف ریت کی قبر سے باہر نہیں نکل پاتا بلکہ اللہ ہی قسم
میں تہہ میں ہو جاتا ہے کسی مرد کی طرح چلے گئے والے کا بھی باہر کی دنیا سے تعلق ختم ہو جاتا ہے۔

عام انسان کے مرنے کے بعد اس کی روح عالم برزخ کی جانب مراجعت کر جاتی ہے۔ اس
بے روح جسم بوسیدہ پر گر گئی مگر رزق خاک بن جاتا ہے جبکہ صاحب چلے کی جان جسم اور روح اپنے

جھلکاتا ہوا شرمیلے ستاروں کا عکس۔ چاندنی کے چھپکے مارتا ہوا پونگ۔ سرکنڈوں کے پیچھے حق کا صبر
 صدرا ابھر رہی ہے تو کہیں کوئی حافظ اپنا دورہ قرآن کرہ رہا ہے۔ سرکار شاد حسین کے سابق مزار والے کمرے
 دھیان گیان والے دھرم نے دیے ہوئے اور شمشان گھاٹ کے قریب کالے اہلم جادو نوٹے والے
 جنت منتر تتر کی لکیاں پانڈیاں دھکاتے پڑے ہیں۔ بابا چنن جہارغ کے ٹکینے کے پاس نوآ موز گوئے گھر
 میں منہ دیئے آواز کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ کہیں راگ بھلیا پھڑا ہوا ہے۔ "بیاتی راگھو چرن دوارے آئی جاگہ
 کہیں بھیروں رنگ بکھرا ہوا ہے۔ کوئی سرگم پہلاپ لے رہا ہے۔ میاں کی نوڑی اور کہیں راگ بہار گنگ
 رہا ہے۔ کوئی دم بھار کی موٹا بہت ہے۔ "کرن کرن اترے اجیار سنگ سنگ آوے پی ہمارا" جسکے
 آگے بڑھتے جاگے تو دریا اپنا دامن پھیلاتا جاتا ہے۔ دریا کی دونوں بگلوں بازوؤں کے چھدرے کھینچے
 نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں یعنی جھار جھکار دریا کی لگاؤ کا لاپڈا کیکر سفید آک پھین پھوڑا چوبیس
 اور دیگر الم غلم جو دریا کھارے نیم ریتی زمین پہ آگ سکتا ہے یہاں موجود۔ وہ کہیں بغل بازو سرداروں
 کا راستہ تو نہیں چاہیے مانی چنداں کی مڑھی اور بہت آگے سکیاں کا وقوع۔ درمیان پہاڑے گھیرے
 جانب جو راگھو بننا تھا اس سے کچھ پہلے ایک پرانا قبرستان تھا سیالی پانی سے سنستہ تھا اور کھنڈ
 تھا۔ یہاں کچھ کھنڈیں تھیں جو دریا کی لگاؤ کا لاپڈا کیکر سفید آک پھین پھوڑا چوبیس
 ناگوار ولی اٹھانے والی بدبو سے لٹکا کھڑ رہتی تھی۔ نازک مڑیاں شاہ قہشاں اور کارلنگ تھیں کھڑے تھے
 ہی بہ کھاؤ کی کڑی ہوائے کھاؤ میں بڑے گھنے کالے مگر لمبی لمبی ٹلوں والے کھڑوں کا ذخیرہ تھا۔
 بھر بھری مٹی جس میں دریا کی گھٹ کے تاسب کھوڑا پارہ ہی ہوتا۔ اس مٹی پر خاڑ کھوپروں کے کھنڈ
 میں بابا تھے شاہ کھوپروں والے کا آستانہ تھا۔ وہ کھوپروں والا شاید ہی سے مشہور تھا کہ کھوپروں کا کھنڈ
 گوشت بڑی رغبت سے کھاتا تھا اور پانی کی جگہ بھنگ بھی کھا۔ کھوپر میں پیتا تھا۔ کچھ لوگ اسے جھنڈ
 بھونوں والا بابا بھی کہتے تھے۔ سر پہ گھمیلے بڑی ہونی لایا نہیں آواز می مو لپھ کے بے تھا شاید سے اس
 اور خاستری بھول میں لٹ جاتے استخوانی جسم بھی اس کی اک ہونی پہچان تھا۔ ہر لمحہ بھنگ کے نشہ میں
 اولی انکارہ آنکھیں۔ کلاک دار آواز حال ٹھیک۔ روبرو دریا کی کھنڈی ٹکڑیوں سے ہمہ وقت ہلکا ہوتا
 تھوڑے تھوڑے وقفے سے دل دہلا دینے والی سنگ کی ٹھونک۔ اور گرد درختوں پہ لٹی ہوئی مٹوں جھنگ
 آگ کی آگ نہیں۔ کھنڈے کالہ گھوڑوں کی دھماچہ ٹریاں بہت بے چہریوں چہوں اور شارکوں غلوں سے
 شور مچا رہے ان سب سے دو جوتے اوپر کھوپروں کے چھتر چھدرے سڑی لٹی بڈیاں۔
 بابا تھے شاہ کے ہاتھ ان کے لئے راوی کے نو نہال کھوپر اور گنڈ سنگھ یا چھانگے کی جنگ کی جگہ

گھر والوں ہمسایوں سے لعن طعن نائینوں بھکاریوں کھسروں امداریوں سے خواخو و خفا کے چنگے اہم غروں سے جان بوجھ کے ڈنگے۔ میلیں ٹھیلوں میں مفت بریاں ذہاندلیاں وغیرہ وغیرہ میرے لئے روز مرہ کی تھیں۔ ہر نو جوان جو عملی، عقلی، علمی اور معاشی طور پر بڑھ کر ام یا از قلم بڑا گوشت ہوتا ہے وہ بابوں فقیروں سے کہتی "گرتی" والے مجذوبوں کے چکروں میں چڑا دیتا ہے ایسے بابے جو کسی کرامت کا پھوک سے اُست نہ ہو دیں۔ تعویذ دھانگوں اور اکھروں کے عمل سے اس کی من کا منائیں پوری کر دیں۔ میرے ساتھ کوئی ایک شخص نہیں تھی لیکن "جانے" کا چپکا لپکا مجھے ذرہ کی خواری دکھاتا تھا۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا کہ میں سیدھے نہیں بلکہ اپنے پانی پیرنے والا بندہ تھا۔ تریاق اور زہر بلا مل نہیں دونوں ہت رہے ہوں تو میں یقیناً ترک کر کے زہر کی خواہش کروں گا۔۔۔۔۔

جو دارا کے تمام پہ زہر دے اس چارو غم کی تلاش ہے

راوی کے کناروں بارہ دری شاید وہ کے شائق باغات جن میں کچھ دھوپ کے درختوں کے حصے پر لطف ماحول پیدا کیے ہوتے۔ وسیع و عریض ذخیرے نیلے شمر ہمایہ بارہ شہزاد اپنی ایک کھجک ہی میں رکھتے تھے۔ سوچی آوارہ گردی کے لئے راوی اور اس کے گرد و اج سے بہتر کوئی جگہ ملاقات سے مل سکتا تھا۔ سوچی آوارہ گردی ایسی ہی تھی جیسے یہ جگہ تھی جہاں ہے۔ ایک اور بارہ دری سے آواز آتی تھی شادی کے شعلے لعل آتا ہے گونجا گونجا اور پتے بھرے کے بوبے باریاں تاکتا بھانکتا تھا کچھ بے شاہی مسجد تک پہنچی جانا صاحب غلام صاحب کے مزار پر فاتحہ اور مسجد کی کھلی جگہ میں نماز ادا کر کے باغ صاحب ہو جاتا ہے تو اسے سوچی گونجا گونجا بھانکتا بھانکتا ہے۔ کھانسی کی بات کہتے ہیں۔ مگر یہ ایک کوئلہ و شاپک کہتے ہیں جس میں دوکان دوکان جھانکا دیکھا جاتا ہے۔ دوکان قیمت کو اتنی بڑے سبب کی سے دیکھی بھائی جاتی ہے۔ دوکاندار باہر کھڑے گا بک کی دلچسپی کو دیکھ کر مخرے ڈو کے تپ۔ کھانسی ایسے سوچی خریداری کا شائق اشیاء میں ایک دو بار سر ہلا کر اگلی دوکان کے آگے جا کھڑا ہوتا ہے۔ سوچی کھانسی پر سالی ارشد داری دوستی عاشقی پیروی فقیری نماز روزہ اور سونگے ج و عمر و مہی ہوتے ہیں۔

میں محض سوچی آوارگی کے لئے راوی پہنچی جاتا تھا یہ کہ سب کچھ میری راہ پہ تھا۔ یہ ایک اور گویا احوال کے بے ٹکوں کے لئے شاید شاید بارہ دری باغ شیشوں سے بہتر اور محفوظ اور کوئی نہ ہو یہاں گاڑی بہت سست ہو جاتی ہے۔ ہم بے ٹکے جتنی گاڑی سے ہی اتر کر غلوں سے نیچے اچھے طرح ہمارے پہلے پڑا وہ شاید وہ مقبرہ اور راوی۔ پھر آگے جدھر دن سوتے اور راتیں جاتی ہیں آگے جاتا صاحب جہاں دن بھی بیدار اور راتیں بھی ڈر بار۔ شاید یہ بھی سب میرے لئے سوکھا سوکھا تھا۔

حقوق کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت انسان تو گزرے کل کی پیدائش ہے۔ اس سے ان گنت فوری مسائل گھبرائے عظیم الشان کا نکالتا اور جہان و دنیا میں معرض وجود میں آچکی تھیں۔ مادی موجودات میں انسانی تخلیق کے جن روشن موجودات کو قدیم تر پایادہ سمندر زمین اور پہاڑ ہیں۔۔۔ پتھروں کھربوں برسوں سے موجود یہ مخلوقات بھی مرقی ہستی نسکرتی سمیٹی اور سوتی جاگتی رہتی ہیں۔ زمینوں آسمانوں بشمول اجرام فلکی موسموں سمندر پہاڑوں صحراؤں کے اپنے طور طریق معمولات اور نظام وضع ہیں جو قادر مطلق کے امر خاص کے تحت ہیں۔ ظاہر ہے یہ انسانی محدود قدرت و پہنچ فہم و ادراک سے کہیں بالا ہیں۔۔۔ انہوں نے ذات بے ہمتا جسے چاہے وہ فہم و فراست عطا بھی کر دیتا ہے۔ جن خوش بختوں کے ہاں اس علم و عرفان کی کچھ خوشبو شہو ہوتی ہے وہ ان کی ظاہری اور باطنی کیفیتوں حالتوں اور اثرات پہ غص نظر ہی نہیں رکھتے بلکہ ان کے مزاج شناس بھی ضرور ہوتے ہیں۔ یہ بھی جان لیا جائے کہ خوشی و غم و غصہ و کینہ و نفرت کے قیام و ختم کے تمام مخلوقات کے جوڑے و ٹکڑے۔۔۔ چند مستحیات کے ساتھ لطیف و کشیف نر و مادہ کی تخصیص برابر رکھی گئی تاکہ ان کے مابین ایک خوبصورت تناسب قائم ہو اور مسائل کا سلسلہ برقرار رہ سکے۔ ہر مخلوق اپنے متعین دائرہ کار محدود حیات اور اپنے حساب و کتاب میں ہماری طرح اک جبر یا زندگی گزارتے ہیں۔۔۔ صرف انسان میں اور جنسیں الگ ہونے لگی ہیں۔ یہ سب کچھ جان اور فہم کے ساتھ سمجھنا پڑتا ہے۔

UrduPhoto.com

انچھے نیچے راہ پا کے بڑھتا ہوا میں گئے درختوں کے ٹہنڈے تک آ پہنچا۔ نیچے سے پہلے ٹہنڈے سے چل پڑا اور اپنے بچاریاں اس جگہ کی اصل دنیا ان درختوں کے ٹہنڈے کے درمیان گھبراہٹا ہوا جیسے شاد کا آواز تھا۔۔۔ کچھ ٹہنڈے پر ٹہم بچاؤ بچھڑے ہیں، جوان بھی دکھائی دے۔۔۔ مختلف درختوں کے عجیب غلیب حال میں کی مٹ لیاں نیچے اپنے غصے میں لگی ہوئی تھیں۔۔۔ میں اک ایک چہرے کا تعریف پڑھتا ہوا استہزاء سے ان کو کھنکھاتا رہا، ہر روز مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔۔۔ جیسے جنگل میں کسی مخصوص جانور کو تلاش کرنا مشکل ہے۔۔۔ یہ بھی غرموں کی کہیں کا ہوں، نشے بازوں کے غور و گمانوں اور شمشان میں بٹے ہوئے مردے کی کسی غصہ و غبار کا پھولی اٹھانا بھی کچھ ایسا آسان نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں۔۔۔

نہ ہو طلب تو کسی در سے کچھ نہیں ملتا

جو ہو طلب تو دونوں جہاں سے ملتا ہے

یہ ہی تو روزی پانی کا سوال تھا۔ میں ایسے ہی استاد کو ہاتھ سے کیسے نکلنے دیکھ سکتا تھا۔۔۔ تھک پائے ہوئے میں نے ایک بھلے سے ملنگ کو ڈھر لیا۔

”مسلمو! میرا استاد جتنا کا میںیں کہیں ہے معلوم ہو تو بتا دو؟“

میں تھڑ تھڑا اٹھا۔ بلکہ ہلکے پگ اٹھاتا ہوا میں باپ کے سامنے حاضر ہو گیا۔ وہ چند لمبے لمبے گہری سانس لے رہا تھا ہوا پوچھتے لگا۔

”کدھر آیاں کا کا؟“

”سہیں جی استاد عنایت کو ملنے آیا ہوں۔“

چند لمبے خاموش رہنے کے بعد دونا گواہی سے بولا۔

”عنایت کا پا پڑاں والا؟“

”جی۔۔۔“

”کا کا اوتے چلے بیاد اے۔۔۔ پنجاں دناں بعد چلے پورا کرے گا تے غیر اوکے نوں ملے گا۔“

”اری سے کہنے لگا۔“

”آ جا یہ جاں کھپا لے۔ پنجاں دناں بعد آویں تے انہوں مل لیں۔“

”جی اچھے اسی سے کچھ ضروری کام تھا۔ مگر حکم ہوا تو میں اسے اک نظر دیکھ لوں اشارے سے

”تے آ جا تے کروں گا۔ اس کی سب سے بڑی بیٹی کے پاس میں کچھ بچھا ہے۔“

”میں نے اس کی بات بہت برا تھا۔“

”اب اس کے خیر سے بے دھیانی میں نہیں گیا یا واقعی اس نے میری بات کو اہم دیکھ لیا تھا۔“

”جی۔۔۔“

”دھر کھلیتے دل چلا چلی تے بے نظریہ آ جانی لگا۔“

”نہی اندر شکر کا گلہ نہ تھے ہونے میں بیچھاڑے کی جانب میں دیا۔ چھوٹی چھوٹی تھیں اپنے

”تک بھاگتیاں اور گھریاں۔ بے شمار نئے لمبیاں کو۔ اور کا کڑو پکھووں کی کھ پڑیاں تھیں بھنھوڑ

”تے۔ بدو بعض کا بھی دہی عالم۔ ہر نے بی کی اوت آرا اور درخت جھاڑ کے تے کوئی نہ کوئی ملنگ

”وہ۔ مریض کھڑا کوئی نہ کوئی چاپ کر رہا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں تھپتھپ تو کسی نے چادر میں منہ چھپایا ہوا ہے۔

”میں تھوٹے کسوٹے ہڈی کی مانند درخت کے ٹہن سے لگا ہوا ہے۔ کوئی نیچے لینا ہے کی پیدا آئی جیسا، حول

”کے ہوئے ہے۔۔۔ نہیں غریبوں کی طرح ایک ایک چھندے نقد دے کو تو مٹا ہوا ادھر سے ادھر غلیٹ ہو

”تھ گھڑا۔ وہ جان بہاراں گل گھڑاں کہیں آنکھوں میں تراوت کی تری گولیاں دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ

”کھمبے مجھے متو کش لگا ہوں سے نکال رہے تھے۔ میں ان کی آج لگا ہوں سے بچنے کی خاطر پرانے

”تھکت کی جانب چھکول لے چکا تھا۔“

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقتوں کا یہ پراگمگھٹ' اب اک زمانے سے متروک ہو چکا تھا۔ راستہ تبدیل ہونے سے کنارے کی آبادی سرکے سرکے اندر کی جانب بڑھ آئی تھی۔ شاید اسی وجہ سے شمشان گھاٹ بہت پرے پڑ گیا تھا۔ اب اس پرانے شمشان پر ماسوائے چند تعزوں۔۔۔ زمین بوس دیواریں جن کی کھسکی ہوئی رنجیت شاہی چھوٹی اینٹیں اب بھی جا بجا بکھری ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ استھان کا شاہی کوئی نشان کھر اباقی رہا ہو۔ شمشان کے پھول کنڈے میں اب خلافت کے اخبار لگے پائے جاتے تھے۔ اس منحوس جہنم جلی جگہ پر اب مسان اٹھانے یا مرن برت کی کانٹا اٹھانے والے آتے تھے۔

میں تو ادھر پوچھی ان نقد روں کی بدنگاہی سے بچنے کی خاطر لو حکم آیا تھا پر کیا پتہ تھا وہ غارت خیز
ان کھنڈروں میں دستیاب ہوگا۔ میں اس بانجھ جھوگن جگہ سے کہیں اور نکلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرے
کانوں میں بندر کی ٹلوں ٹلوں جیسی آواز اڑی وہی بانجھ جھوگن تو کوئی تو میں ہاں دیکھا ہی نہ دیا لیکن وہ بارہ ٹلوں ٹلوں
ٹھپ ٹھپ کا نوں سے ٹکراتے ہی آنکھوں نے خود بخود کھرا اٹھالیا۔ دیکھا تو آک آؤ تو پورے کھڑیلوں کے ٹکڑے
گڑھے میں اچھاں بٹھایا بھی ٹھروں کی انہی ہڈیوں کے ڈوڑے باوئے جاتے ہوئے ٹھکانا سڑا ٹھکانا
یوں کہ حرسہمہ اندر اور تنہا کی مانند نہ تھوکتی باہر۔۔۔ ہادی انٹر میں تو یہ جان نہ پایا ہے ہی یہی والٹر کی
آنکھیں جو ان کے ساتھ تھیں۔۔۔ ہادی انٹر میں تو یہ جان نہ پایا ہے ہی یہی والٹر کی
خستہ حال چہرے پہ غصوں کا جال اڑا رہا وہ منا لگا ہی تھا۔ قریب اقباس کی آستہ کہیں نے حسیلی میں
بیٹھ ہوئے کڑھے میں گر گیا اور کسی کی لگام میں نہ آیا اب کی روڑے وہ ہا ہر نکلنے کے حق میں ہارے
ہوا ہے۔ شاید تاک ٹولہا وہ میرے ساتھ کیا ہو یا کسی شر شرارتے ایوان رکھا ہے۔ میرے اوٹے کا شاید کوئی
تھا۔ ایک ہی سوا بھی کہا گے جو کہ اسٹارٹ لو اس آواز سے نجات والوں۔ نجات دہندہ کے لئے خوب
نجیب الطیفین نہیں تو کم از کم نجیب الطیفین تو ہو۔ نصیحتیں اور اس کے فیض سے کچھ شامایاں رکھا ہے۔
تھا نہیں لیکن باہر میں ہاتھ وال میلے۔

”استاد! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ سمجھاتے استاد نے اپنے ٹھکانے ہوئے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر
 کی آواز نکالی پھر ہاتھ سے نیچے ٹیٹھے کا اشارہ کیا۔۔۔ جنیں پاس بیٹھ گیا۔ وہ مری ہوئی آواز میں میاں
 ”تم یہاں کہاں؟“

میں نے تیرے جواب دیا۔

”او تو نہیں ڈھونڈ رہا ہوں..... مگر تم یہاں! اس گڑھ میں پڑے کیا کرو تے ہو؟“

وہاں اصرار و تکرار کی گئی جو نئے پلان سے

”میں یہاں کچے مسان کا چلہ کھینچ رہا ہوں۔“

”کیا مسان.....؟“ میں نے ذہرا سے پوچھا۔ ”استاد تو تو بڑا اچکا انسان تھا۔ یہ کچے مسانوں کے چکر میں کہاں پڑ گیا؟“ لاہر تھا باہر لگی مجھے بھوک لگی ہے کچھ ناشتہ داشتہ کروا تو یہاں کہاں ہے۔“

”پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے اس کے پی میں کسی کا وار میٹھا ہوا ہو۔“ اوجھتے ہوئے مرغوشی کے منہ سے نکلنے لگا۔

”کوئے خان امیں یہاں بابا تھے شاو کے حکم سے اشہی تک کا چلہ کھینچ رہا ہوں۔“ مجھے کسی بندے سے بات کرنے کی اجازت ہے اور نہ کچھ کھانے پینے کی۔ میں تو خود کچی دونوں سے کاٹھے پیروں اور خشکاش کی خشکاشی پر گزارہ کر رہا ہوں۔ تمہیں ہاں میں کہاں سے کڑواؤں؟“

”مگر تمہیں اس وجہ سے جگہ یہ یہ خطرناک چلہ کھینچنے کی ضرورت کیونکر پیش آتی۔“ استاد تو چڑکا بھلا! اس کی گڑبگڑ کھانے والا اس کچھے کام میں کیسے پڑ گیا؟“

”ایک کیا بتاؤں! ادھر ہنگ کے چٹے تو اسے آ رہا ہے۔“ نے کھڑا کیا اور کہا۔ ”تو کیا امزی و جیلے کھانے کے لیے یہاں آئے۔“ میں نے اس کی بات کو نہ مانا۔ ”اسے تو اس کا بل کھانے کی بات ہے۔“

”گادہ مٹی کی فراو پا کر تجھے دھن دولت سے نہال کر دے گا۔“

”یارا کچھ اور تو اسے سوکھے کڑے اور کچھ باقی رہ گئے ہیں۔ بس ادھر جا کر کھینچ کر آؤ اور کڑی کر دیا۔“

”میں نے اس کی بڑی مشکل پہ غصے سے جھپٹے ہوئے تھا۔“

”ایک تو کاٹھے پیروں اور ہنگ وودہ خشکاش کی خشکاشی نے میری جھان مار کے رکھ دی ہوئی ہے۔ میرے منہ سے نہ پاس بھتی ہے۔ پیروں کی لیس سے اندر کی آشتیں بڑھ گئی ہیں۔“ منہ کا سوا کڑوا اور لیس دار جیسے لگائے والا سلوشن پی رکھا ہو۔ ”نی پیڑ باب بند ہے۔“ وہ سیدھے حورج کی گرمی کھینچاں اور رات چھڑوں! جس سرگرمیوں کی بھرمار کے علاوہ جہاں بودی والے مردوں کے فخر سے بھی ہوتے ہیں۔ کھڑتا لیں! میں فخر سے اور تشکر و چھٹکتے رہتے ہیں۔ اور تو اور! صبح میں اندھیرے سب لوگ ادھر ہی فراغت کے آتے ہیں۔ میں چونکہ گڑھے میں ہوتا ہوں صرف گردان منہ ہی باہر ہوتے ہیں اس لئے کسی کو نظر بھی کم ہی آتا ہے۔ یہ دیکھو گندگی؟ لہنتی میرے سامنے ہی بیٹھ جاتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہارا مکی طلاق ہے۔ یہی تمہارے چلنے کا انعام ہے۔ میرے اندازے کے

مطابق تم ایک آدھ دن اور نکال جاؤ گے۔ پرسوں ترسوں میں ادھر کا ایک اور پتھر لگاؤں گا۔ اگر تم ہو۔
 ورنہ تمہاری بے جان آنکھوں کو بند کر کے۔ اور چھٹی ہوئی گردن کو ٹوٹے میں بھکیل کر زمینی ڈال کر دیکھو۔
 گا اور ہاں واپس لوٹے تک دو چار چٹو پروں کے کاسے اوپر مٹی پر ضرور رکھتا آؤں گا۔۔۔“
 اب میں نے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے مزید کہا۔

”..... اور کوئی آخری خواہش؟“ تنگی مراہیوں والے نمودے پان والے اور سراسر اچھے سری پانے والے
اگر کوئی لیکھا دینا ہو تو بتا دو گا کہ تمہارے نمودے پہ قمر نے کا کوئی بوجھ نہ پڑے اور ویسے تمہارے نمودے کے
خراب ہونے کی فوبت ہی نہیں آئے گی کہ ادھر کے بچوں کیچھ پروں، لڑکوں کی توتوں اور نمودوں کا بھی آخر تک
بنتا ہے..... اچھا! استوا! تمہارا بابا انتھارا رکھا.....“

یہ کہہ کر میں چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ پیچھے سے روئے فوج کے کی آوازیں اُبھریں۔ میں نے ایسا کیا تھا کہ اس کے پاس سوائے پشیمان ہونے کے اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ میں ہلکا سا رککا اور اسے کہا آئی کہ تمہیں بات تمہری کی کوئی آئی۔

انچون کو حرام کی ہولی کہتے ہیں۔ سنی تو سب سے اونچا ہے۔

UrduPhoto.com

آپ کی بہن بھائی ساری دنیا میں ہیں۔

مٹکی نے یہ ظاہر غصے سے انہی قدموں پہ چلا کھایا۔

”اوسے کا قصہ سننے بھابی نال دل پشورہئے انھیں قسمیں آستہ رکھتے ہیں کہ اپنی زبان پہ پلنگہ نہ لگے۔ تا کہ میری پٹی نہ ٹپکے۔ خبردار جو مجھے سنا لگوئی ہوئے کا علم نہ رہا۔ اگر تمہارے احساساتوں کا احساس نہ ہو تو میں یہاں کیوں آتا اور تجھ سے ایسی لڑائی کیسی ہاتھیں کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تیرے رشتہ دار ہاتھ سے میری حالت کا لہنا تو میں بھانکتا ہوا سیہ حبابا دمی بارغ سے ادھر پہنچا۔ بڑی مشکوں سے تجھے تلاش کیا۔ اب تو مجھے سنا لگوئی حرام دی ہوئی کہتا ہے؟“

دوسرے جگہ کر پھسک کر رہے تھے۔ مجھے یہ تھا کہ وہ اس طرح بچوں کی مانند ہنس رہے ہوں گے۔ والی ہڈی ٹٹیں دو تو کچھ مراثیں کا بڑا کایاں میراثی تھا۔ کپاناں کا دینے اس کے تو غور پیسے میں خود غرضی اور مطلب براری رہتی کسی تھی۔ میں بھی دم سادھے اس کے سر سے دو قدم اوپر کھڑا تھا۔ اس نے غصوں کیا کہ میں نے اس کی سیالکوٹی والی بات کو خاصا محسوس کیا ہے تو اس نے بولے تے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا یا ر معاف کر دو غلطی سے منہ سے نکل گیا۔ تجھے پتہ ہونا چاہئے کہ میری کیا حالت ہے۔“

تھے۔ چاندیوں میں میرا ستیاناس ہو گیا ہے۔ تو ایسا کر باپے مجھے شاہ کے پاس جا اور کوئی بہانہ بنا کر میری یہاں سے جان لیوا کر۔“

”تو بابا مجھے شاہ کو چھوڑنا مجھے ہاتھ دے اور باہر نکل میرے ساتھ چل اپنی محنت سے روزی کیا۔۔۔ خدا کے لئے جس دن تیرے گھر والوں کا کیا حال ہوگا؟“
وہ میری بات کو سمجھتے ہوئے کہنے لگا۔

”تو بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ مجھ سے بڑی نادانی ہوئی۔ اب صرف ایک ہی بات ہے کہ تو کسی طرح بابا مجھے شاہ کو راضی کرے کہ وہ مجھے ادھر اور اچانک چھوڑنے کی اجازت دے دے۔ ورنہ مجھے اسے کہہ دینا کہ میں کسی اور مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔“

میں نے سوچا کہ وہ فیصلہ کب رہا ہے۔ جب ایک کام معمولی سی تہہ پیر کرنے سے ہو سکتا ہے تو مجھے کسی بھجال میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے ایک زبردست بہانہ سوچتے ہوئے کہا۔
”ابھی ہم باہر تو نکلو۔ میں باپے کے پاس جاتا ہوں۔“

”ابھی کل یہاں سے باہر بھی تو نہیں نکلا۔ کون سا کام ہو گیا؟“ اس کے پاس سے اس نے ساتھ لے کر لیا۔

”جس کا تعلق ہے۔ آج آج ہوا تھا۔ بلی دھوپ میں دھیرے دھیرے نماز پڑھ رہی تھی۔ جب میں واپس آیا تو مجھے شاہ کے پاس پہنچا تو وہ دیکھ کر کے پیالے میں بھنگ کی بوتلی سے دل تازہ کر رہا تھا۔ اس نے اس میں جلتے ہوئے لٹکے ہوئے کچے چھوٹے پھل تھوڑے تھوڑے کھانے کوشت کا بڑا سا ٹکڑا چڑا کر دیا۔ اس نے اس میں تازہ گوشت کے بھنے کی اشتباہ انگیز مہک زہری ہوئی تھی۔ مجھے دوبارہ سامنے رکھ کر وہ ہلکا سا ٹکڑا اسے اڑتی چڑچڑاتی پنکھریوں اور بل کھاتے دھیری کی آواز میں اس کا تھمنا ہوا ہیرے لینے کے لئے اس کی رکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی بھوت انکی سے اٹھان کر کے چٹا منڈپ سے باہر نکل رہا ہو۔ میں نے یہ حادثہ اسے منظم کرتے ہوئے کہا۔“

”بابا! کھانے کی سب سے بڑی محنت یہاں ہے۔ اس نے مجھے یہاں بھیجا ہے کہ میں اسے اطلاع کر دوں۔ آپ کو پتہ ہوگا کہ اس کا کھانا کتنا بڑا ہے۔ وہ اپنے پیٹ کو دیکھنے کے لئے بڑی بے تاب ہے۔ میں اسے کہتا ہوں کہ یہاں پر وہ میری بات نہیں سنتا۔“

”کیا کہتا ہے۔۔۔؟“ بابا نے پوچھا۔
”وہ کہتا ہے کہ میں اپنے باپے کے حکم کا پابند ہوں۔ بے کے حکم کا نہیں۔ بابا! اس آپ اسے یہ

سلی گھبراہٹ سے۔ دھوئیں کی دھواں نشانی دیکھ کر دیکھنے والا کہہ اٹھنے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔ "ابھی ایہ دھواں
کون سے گھٹا ہے؟"

وہ کش پہ کش کھینچ رہا تھا اور میں کو حیرت۔۔۔ چہرہ بدامیں اور آنکھیں مستانیں کرتے ہوئے وہ
جس بات اپنے بٹے کئے چیلے سے متکلم ہوا۔

"اٹھ اٹھ مہولے امکاوے ترولے۔۔۔"

یہ بھی سن تھا لڑکھڑاتا ہوا خوب لڑکا ہوں سے مجھے تو تھا ہوا اٹھا اور بادل نواستہ میرے آگے آگے چل
چند قدم چلنے کے بعد میں نے جانا کہ یہ بندہ مولا کسی اور رخ پر ہدایت ہے۔ یہ وہ راستہ نہیں جس پر میرا
مولا گزرتا ہے میں ڈھنسا ہوا چلے بھوگ رہا ہے۔ مولا شاید نشے کی پیٹک میں ہو میں نے بہت کر کے اسے
گھستے آواز دیا۔

"سائیں جی اچھا استاد اور نہیں اور ہر پرانی مڑھی کے چوہے کے پاس گولہ بڑا ہے۔"

اس مولا ڈیوٹ نے چیچھے دیکھے یاڑ کے بغیر ہی ہاتھ کے اشارے سے مجھے پیچھے پیچھے آنے کا
نشان دیا۔ میں قدم بے خبر اس گلی تھا کہ یہ مجھے کہہ رہا تھا۔ میں اسے جاننا چاہتی تھی تو دم
میں اسے پکڑنے کے لیے بھاگ پڑی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ کو اپنے گال پر رکھا۔ اس نے کہا کہ
اسے بد گال۔ میں ایک کوئی کوئی کہتا ہے۔ ایک مرد تو قی ہوا جواب فطرت میں پراگشہ تھا۔

اس نے میرے گال پر ہاتھ رکھا۔ اس نے کہا کہ اسے بد گال۔ میں ایک کوئی کوئی کہتا ہے۔ ایک مرد تو قی ہوا جواب فطرت میں پراگشہ تھا۔
اس نے میرے گال پر ہاتھ رکھا۔ اس نے کہا کہ اسے بد گال۔ میں ایک کوئی کوئی کہتا ہے۔ ایک مرد تو قی ہوا جواب فطرت میں پراگشہ تھا۔
اس نے میرے گال پر ہاتھ رکھا۔ اس نے کہا کہ اسے بد گال۔ میں ایک کوئی کوئی کہتا ہے۔ ایک مرد تو قی ہوا جواب فطرت میں پراگشہ تھا۔
اس نے میرے گال پر ہاتھ رکھا۔ اس نے کہا کہ اسے بد گال۔ میں ایک کوئی کوئی کہتا ہے۔ ایک مرد تو قی ہوا جواب فطرت میں پراگشہ تھا۔
اس نے میرے گال پر ہاتھ رکھا۔ اس نے کہا کہ اسے بد گال۔ میں ایک کوئی کوئی کہتا ہے۔ ایک مرد تو قی ہوا جواب فطرت میں پراگشہ تھا۔
اس نے میرے گال پر ہاتھ رکھا۔ اس نے کہا کہ اسے بد گال۔ میں ایک کوئی کوئی کہتا ہے۔ ایک مرد تو قی ہوا جواب فطرت میں پراگشہ تھا۔
اس نے میرے گال پر ہاتھ رکھا۔ اس نے کہا کہ اسے بد گال۔ میں ایک کوئی کوئی کہتا ہے۔ ایک مرد تو قی ہوا جواب فطرت میں پراگشہ تھا۔
اس نے میرے گال پر ہاتھ رکھا۔ اس نے کہا کہ اسے بد گال۔ میں ایک کوئی کوئی کہتا ہے۔ ایک مرد تو قی ہوا جواب فطرت میں پراگشہ تھا۔

میں کھینچنے ہی ہوئے نے کسی بتائی زبان میں اس گورن کو کچھ حکم دیا۔ اس نے آواز دیکھا۔ اس نے
میں میں شکاف والے پہنچت گیا۔ میں حیران کہ یہ کیا وہ رہا ہے۔ اسے اس و فرمان سے نہایت
میں میں شکاف والے پہنچت گیا۔ میں حیران کہ یہ کیا وہ رہا ہے۔ اسے اس و فرمان سے نہایت

میں میں شکاف والے پہنچت گیا۔ میں حیران کہ یہ کیا وہ رہا ہے۔ اسے اس و فرمان سے نہایت
میں میں شکاف والے پہنچت گیا۔ میں حیران کہ یہ کیا وہ رہا ہے۔ اسے اس و فرمان سے نہایت

گئی تھی۔ خون کی گردش ٹرک جانے کے باعث اب کسی حرکت پرکت سے بھی عاری تھے۔ ... عنایت علی کو اس باہر گھسیٹا تو وہ مکمل طور پر بے سندھ تھا اور منٹ بے ہوش ہونے کے قریب۔ وہ دونوں اسے باہر نکال کر پھینک گئے تھے جیسے بدلو میں پھنسا ہوا نکتا کھسٹ نکال کر چو پڑے باہر کرتے ہیں۔ وہ بھینسا نما رنگ ہے سے صرف اتنا کہہ گیا۔

”چھوٹے سے پانی لا کر اس کے منہ پر چھپا کے مارو اور سردائی پلاؤ۔ اس کا ضعف دور ہو جائے۔“

کا۔

خونوں کی سوتلی علیحدہ کرنے میں مجھے خاصی جدوجہد کرنا پڑی اور اس سے زیادہ محنت اس کے بحال کرنے میں لگی۔ مگر ذہنی حالت اب بھی مخدوش ہی تھی یا شاید سردائی کے اثر سے ذہنی طور پر کچھ محنت سر و مہر ہو گیا تھا۔ پانی کے چھپا کوں اور ہاتھوں سے چھپا کوں سے غور کیا کہ سرت پکڑی تو مصیبت کی ایسا چھوٹی بین پریشانی آکھڑی ہوئی کہ استاد کا چلنا تو درکن ز محض کھڑا ہونا ہی محال دکھائی دے رہا تھا۔ تجھ سے اب بھی آپ کی دکانی شروع کر دی تھیں۔ میں نے ہاپتے ہوئے کہا۔

”استاد! انت پکارا اور یہاں سے نکلے کی کر۔“

کا۔

بلکے چک دریا کے رخ پر صحتا شروع کیا۔ یہ ایک نیا راستہ تھا جگہ جگہ ٹوے بنے کھنٹی اور خانہ دار بھانجیوں شہیدوں اور کانٹوں میں آٹھ سے پینے ہوئے ساتھ ورتین جیتھو نے کالی ڈور یاں بھرتے۔ جاچو بھانجیوں کی بوسیدہ ہڈیاں خشک محذور کا ایک حلال بنے والا ماحول۔ پھر کیا دیکھا کہ استاد حنا سے کی گئی کچھ چلنے کھینچنے والے مختلف ٹوے لڑھکیوں میں دبے پڑے ہیں۔ چند ایک درختوں سے بندھے لٹکے ہوئے نظر آئے۔ کوئی سر نیچے اور پاؤں آسمان کی جانب کیئے ہوئے پڑا ہے تو کوئی ایک ٹانگ پر کھڑا کچھ کر رہا ہے۔ کوئی نکا ہے تو کوئی چھڑا ہے۔ میں کسی ٹھکے ہوئے جھوٹے کی طرح کبھی اسے اور کبھی اسے نہیں ہوں مگر یہ سب اپنے اپنے وحیان گیان میں تھے۔ ہم کون ہیں کیوں ہیں کہاں ہیں شاید ان کے کچھ سروکار نہ تھا یا ان کے دماغ ہی الٹ ہوتے تھے کہ یہ کچھ سوچ ہی نہ سکیں۔ میں نے فٹ کے لئے ایک آدھ سے بات کرنے کی بھی کوشش کی مگر انہوں نے جیسے نہیں سنا یا دیکھا ہی نہ تھا۔ مجھے یہاں سے اک عجیب طرح کی کھنٹی آنے لگی تھی۔ اک کھوت کا کہ ابھی استاد دھانے کا درخت میں شتم شتم دھیرے دھیرے دریا کی جانب کھسک رہا تھا۔ کافی آگے پہنچے تو دھوبیوں اور کھنٹوں انگلیاں اور دھوپ پنوں کے ڈانڈے سامنے آگئے جبکہ دھوبی کھات ابھی خاصا ڈور تھا۔ اک فٹ کے

گلابوں میں کڑے۔ انہی اتوپہ۔ میں سوچتا رہ گیا کہ یہ نوجوان کس عذاب میں جکڑا ہوا ہے۔ دو چار چٹکے اترے تو پتہ چلا کہ فہار سے روگردانی ہے اور شادی مناکحت سے منافی۔ لیکن دُش پانچ گروہیں سو کی تنگی پہلی چچی کی پٹنگی مٹنگی اور شاہی قوام کی چٹڑ اوگی کی رضائی ہے۔ جسم کی پائری۔ تھوڑے کی تاروں کی مانند کھنچی ہوئیں۔ وحشیوں کی طرح بڑھے ہوئے غلاظت سے اٹے ہوئے۔ اُجائز چہرے پہ اتری ہوئی ٹوٹتیں دیکھ کر طبیعت مکدر ہوئی جاتی تھی۔ بڑی رومان سے بھجایا دلدل کی کسے پاہں بھجایا۔ اپنے ہاتھوں سے کھایا پلایا کہ عزیز من! یہ کیسا تماشا ہے؟ یہ فقر ہے یا جہالت بے تحاشا ہے۔ سنہیں پوری کرتے ہو مگر فرائض سے فرار اختیار کرتے ہو۔ ابھی تو کاکا ہے اور ایسا بھٹوں سے ملوث ہے۔ خصوص سے خصوصیت۔ یہ رویشی ہے نہ فقیری۔ رہائی ہے نہ اسیری۔ سلامتی نہ کراہتی!

میں نے بڑے پارے کہا۔ بچے یہ ڈرا سے چھوڑ کر کچھ عصری تعلیم حاصل کرو۔ رزق حلال کھاؤ اور ہو سکے تو جلد شادی کرو۔ تمہاری زمین دُنیا کی بھلائی اسی میں ہے۔

دکھائی دیا کہ یہ بے علم سپہ سالار اسانو جوان فقیر رویش بنے کے چکر میں کسی ہی چٹکے ہاں۔ اس نے اپنے استراحت کی خاطر غیر ضروری محامد اسانوں میں ڈال دیا۔ یہ سچ ہے کہ یہ سب کچھ اس چٹوں میں ہے۔ اس کی گراویں پائے اور کوششیں دیکھنے والے کے دلچسپ تھے۔ ان چٹوں کی کراہی عاقبت اور نچا دونوں پر باد کر لیتے ہیں اور سبھی سے وہ منشیات اور ہزاروں کی دھواں داخل ہو جاتے ہیں۔

● سورے سیاں جی اُتریں گے پار.....!

کتنی فقیری اور چٹوں کی بات بہاؤنگر کے تھل میں رجھڑ کی چوکی سے چلی تھی۔ وہاں شہر کے والے کمرے میں شتر چنے سیاں مسیت دو تین دنوں کے لئے بند ہو جاتا ہوں۔ ادھر شتروں کا سوداگر بہاؤنگر کے غلام مسین اور غلام صباں میرے کمرے سے باہر نکلنے کے انتظار میں بیٹھ جاتے ہیں۔ چند ماہ کے تھل کی کالی زمین یعنی شب یکد اور روز بعد تھی جدی تر حیب و تقسیم میں فی الحال سجد ساحت کی صورت میں نہیں تھی۔ اگلے روز سوم وار منگن داد کی درمیانی شب کسی بھی سے چاند نے متھا تھا۔ بس اسی کمرے میں مجھے وظیفہ بھل پا کے چلنے کا چلہ چڑھانا تھا۔ جو اس لمحہ مولود تک برقرار رہتا جب تک نیا چہرہ نہ ملے لیتا۔ میںیں پھر اس مخصوص حیثیت کے حامل شتر چنے کا عمل شروع ہو جاتا جو بالآخر اس خاص مسئلہ

یہ چنے ہوئے جسے دیکھی جتنے طریقہ کی تکمیل کے لئے موزوں یا منتخب پایا جاتا ہے۔

یہ چنے مجاہد سے رہا فتنوں وغیرہ شمشیر کی دھار پہ پا رہے نہ ڈھال ڈالنے کے مترادف ہوتے ہیں۔
 کہہ سکتے ہیں اور رنگ چڑھ جائے تو خیر۔ ورنہ وہ پارہ ہو کر کٹ کر ناک تو ہوتا ہی ہے۔ یہ کھیل کھیلکھن
 سے فارغ تارک کھیلے ہیں جن کے آگے پیچھے کوئی کون سے پٹنے والا نہ ہو یا پھر وہ جن کی پشت پہ کسی
 کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اپنا شوق و ذوق لیئے۔ اپنے بابا کے حکم کے مطابق میں بالآخر دم و بالترتیب یہ
 لئے رکت ہوا آگے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ بلاشبہ مجھے تائید ایزوی اور اپنے بابائی کی بے پناہ
 محنت و جدت حاصل تھی۔

کوئی 'علوی افلاکی' علوم کی تحصیل کا مقصد ہی انسانیت کی خدمت ہوتا ہے جبکہ سفلی 'تاری علوم' شیطانی
 مقاصد کے حصول کے لئے سیکھے جاتے ہیں اور اس کے لئے انیسویں صدی کے استغانت حاصل کی جاتی ہے۔
 'علوی' جس کے لئے چھپنے چھپنے اور جیسے کھنڈل کھنڈل کھینچے جاتے ہیں ان کی اوّل و آخر نجات و نجات
 کی غلط فہم ہی ہوتی ہے۔ انسان جب لباس پہن لیتا ہے تو جانتا ہے کہ اس کا تن ڈھانپا گیا ہے۔
 'علوی' کو جانتا ہے کہ وہ روڈ شوش ہو گا۔ اس طرح اس کا لباس لیتا ہے اور نہیں
 لیتا تو جانتا ہے کہ وہ روڈ شوش ہو گا۔ یہ لباس کھانہ پانی کی ضرورت ہی نہ ہوتے ہیں بلکہ محض حاصل
 کی ہے۔ چپے 'ماں' کی گود میں خود کو محفوظ و مامون رکھتا ہے حتیٰ وہ بھی اتنا ہی آفاقی زاریں ہوتا
 ہے کہ اس کی ماں اسے کافول رحم کی جھلی اور دست لویا اور چیت پیا کرتی تھی 'دلف' پہناتا کہنسلہ
 ہونے والی تصویراتی حفاظتی پردے ہی تو تھے۔

سکھ بھی اپنے تئیں ایک فلول میں بہت کر رہا تھا۔ شتر چڑھیاں تولیوں مجھ سے لگا بیٹھا تھا جیسے اپنی
 سے بہتک کر قیلول کر رہا ہو۔ ستر کو لے گئے کر میں لے اپنے گرد و حصار کھینچ لیا تھا۔ تب ہی جسم نے
 سے بہت سی کا اظہار شروع کر دیا۔ اچھٹکا ہون جگ۔ جگ۔ کر و جو سے ہلکا رہتا ہوتا جا رہا تھا۔ مرنے
 سے ابدان کی وادی کا کافوری سفر شروع ہوا اور کب خاکستری احوال اور فاختی رنگت دھندلے مجھے
 سے پہنچے دینے شروع کر دیئے تھے۔

موت کے بعد سے پہلے عظمیٰ ہوتی پییدہی سحر نے پھر پھر ہی لے کر انجرائی توڑی تو سے کے کا گے
 کے کس کی اذان سے سحر سادق کی نوید سنائی۔ میں نے کہا کہ میں نہیں اٹھا اور تو اس ایک سرسراتی
 سے سلی سلی ہی خوشبو رنج بس گئی تھی۔ قلعے سے اندھیرے میں اچالے کی ٹانگیوں پر گئی تھیں 'آس
 کے کھلنے کے لئے رہا تھا جیسے کسی اندھے کو زور سے سمجھائی دے رہا ہو۔ اب جو جسم جاگا تو سوجھ میں بھی

دھماگہ پڑ گیا۔۔۔ دو دن اور دو راتیں انھوں میں بیت گئی تھیں۔ سہاں یاد آیا تو کمرے میں کہیں گھس دیا۔۔۔ اندھیرے سے آشنا نگھیں جب اسے تلاش کرنے میں ناکام ہو گئیں تو میں بیڑیاں اور کالہ کھڑکے ہوا ادھ بھڑے دروازے سے باہر نکل آیا۔ سامنے جھلملاتے مسکراتے قطبی تارے نے میرا ماتھ رخسار تھل تھل ابھی تک ٹینڈ میں جل تھل تھا۔ عروسہ مشرق کے سرخ یانائی آئینل کی بلکی سی جھلک نے آنکھوں سے چوندی پیدا کر دی۔ اچانک چند سحرانی تیز کہیں سے نمودار ہوئے اور ٹوکاتے ہوئے میرے سامنے سے گزر گئیں اور جھل ہو گئے۔ یہیں دیکھا کہ غسل خانے کی دیوار کے ساتھ ایک سحرانی چار پائیوں پر قطرہ دار بابا حکمت یا غلام حسن اور غلام عباس ابھی تک پڑے اور نگہ رہے ہیں۔

سحرانوں تھلوں جھگوں پہاڑوں میں رات بھی ریگ ریگ اترتی ہے اور صبح بھی کچھ کچھ رہتا ہے۔ ان جگہوں پہ سونا بھی مشکل ہوتا ہے اور سوکر پھر جاگنا تو اس سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ یہاں معاہدہ اور چوکیدار ٹھانڈا کسی ہی کسی مشکل میں پھنسے ہوئے تھے۔ دیکھا جائے تو یہ گنگا جمنی سہاں بھی اور بلوچت کے مابین پھنسی ہوئی کسی ٹیبار کی چاگن جلی کی مانند ہوتا ہے کہ جاگ رہی ہو تو جھنجھوڑ کر گئی ہو تو جھنجھوڑ کر رہی ہو۔ یہاں ان کے سر پر سحرانوں کا راجہ کیا نہیں جاتا اور یہاں کے بارے میں جو مجھے پہاڑی باہر بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن مجھے انہیں دکھانے کا موقع ہی نہ ملا۔ وہاں کا پالو شہنشاہ کی صبح کی فراغیات کے سلسلے میں غسل خانے کے پچھلے کمرے پر کھڑے ہوئے۔ یوہاس پا کر ادھر لپکا۔۔۔۔۔ تیز تیز تھوڑے کے تھوڑے لیکن لپک لپک کر چھٹا تھا جی میں ان پختہ خواہیہ اور خواہد کر گیا تھا۔ یہ کچھ سے چار پائی پا اکثر وہاں بیٹھ چکے تھے۔ وہ اس ابھی تک خواہیدہ تھے۔ اسے وہاں گرتے رہے خوفزدہ سے ہو گئے۔ وہ ابھی ظاہر تھی کہ میں نے انہیں رات کو بارہی بارہی سے لپک لپک کی تھی اور اب وہ دونوں سوتے ہوئے پاتے گئے تھے۔ کچ کے طبقے میں اوورلوں ٹھوٹوں کی سڑن جھنڈ سے لگ رہے تھے اور میں بھی یقیناً انہیں کوئی پریت ہی لگ رہا ہوں گا۔

اوپر آسمان پہ اک نہلوہ سی پر چھا گیا کہ وہی سرخوت نے ہوئے مشرق کی جانب باجھکی ہے۔ میرے اور ٹھلے کے ملاوہ کوئی اور محسوس نہ کر سکا۔ شہنشاہ ابھی سی بھوگی کے ساتھ اپنی ٹانگوں کو سترے سے بچھ سا گیا تھا جیسے کسی نے اک خاصا بوہاس پہ دکھ دیا ہو۔ پھر وہ سوخس سی نگاہوں سے ٹھلے سے ٹھلے جاب کھٹک لیا۔ جگے سے سکوت کے بعد میں نے اپنے معاہدہ میں سے کہا۔

”اوپنا اور میرا سامان لے کر میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ یاد رہے کہ مجھ سے غیر ضرورت

بدلتی جا رہی تھی۔۔۔ ہندوں کی ڈاریں تیز توروں کی ٹیجان تیری قدرت۔۔۔ صحرائی ٹھیریاں اہنڈ یاں کھینچ
چکا رہیں جیسے قتل انگڑائیاں توڑ توڑ کر جاگ رہا ہو۔

طبیعت میں قحطی شادابی سی ڈرائی تھی۔ اٹھا اپنی سست سیدھ کی۔ سامنے دیکھا تو سب سے
دور سے کھڑے تھے۔ میرا قدم اٹھتے ہی وہ آگے لگ گئے۔ چل سو چل کیا مجال جو جھکائی لے کر پیچھے
ہو۔۔۔ کیسے نیلے اور ٹیکریاں اتر چھے راو پڑے ہلا خرا یک آڑی سی ٹیکری سامنے آچکی۔۔۔ جھلک۔۔۔ صحرائی
بھیم سے کی گھٹی گھٹی شاخصیں اٹھنا زیاں اور کچھ چھدری چھدری گھاس اور ریت بھی ہموار اور بھاری۔۔۔
مطلب تھا اس جگہ کے نیچے بہت قریب بیٹھے پانی کا اجتماع موجود ہے۔ سناں تھو قحطی جھائے ریت ریت۔۔۔
جاد ہاتھا۔ ایک آدھ ہمارا جھانڑی پہنڈ بھی مارا۔ آخر اس ٹیکری کی ایک ٹیڑھ میں پہنچ کر رک گیا۔ تھوڑی سی
کچھ سوچتا رہا۔۔۔ دائیں۔۔۔ کئی بائیں جیسے کچھ سناں ٹھہرا ہوا ہو۔ اب جیسے اس نے وہ کچھ پالیا جس کی اسے حسرت
تھی۔ اگلے پاؤں سے اس نے ریت پہ اکھاڑ پھینکا شروع کر دی۔ کمرور سا بچہ لپٹا تھا دیوانہ ہو گیا ہے۔
تھنوں سے عجیب سی آوازوں کے ساتھ زخموں سا خارج ہو رہا تھا۔ مٹی ڈراہٹ کر کھلا اس کی حسرت
جاتو لے رہا تھا۔ اور گرویش سے بے نیاز چلے پانی۔ ریت کے رختے اڑ رہے ہاتھ اس طرح۔۔۔
دوبارہ کھڑا ہوا۔۔۔ یہ کمرور میں۔۔۔ اس نے کھینچ کر لیا۔۔۔ اس نے کھینچ کر لیا۔۔۔ اس نے کھینچ کر لیا۔۔۔
خاصہ گڑھا کھان گیا تھا کمرور اسے مزید گہرا کرنے پہنچا ہوا تھا۔ وقت وقت نہ اٹھا کر سناں کی جانب بھی رہا۔
اور پھر میری جانب بھی۔۔۔
دیکھتا ہے کہ بائیں۔۔۔ کھینچ کر لیا۔۔۔ اس نے کھینچ کر لیا۔۔۔ اس نے کھینچ کر لیا۔۔۔
ہو جاتے ہیں۔ انہیں ہانک کر دیا جاتا ہے اور اگر انہیں ہانک کرنا ممکن نہ ہو تو پھر یہ نظرت کی کسی نہ کسی
میں آ کر خود ہی ہانک ہو جاتے ہیں۔ گویا چپے تھا مگر تھا تو اونت۔ اپنی تمام تر توانائی اور کھسکی کے ساتھ
ایک خبر چرچائی کی مانند کھانکھانے میں مبتلا ہوا تھا۔ مجھے تو شخص دیکھنے سے ہی دائیوں پریدہ آچکا تھا۔
حال ہو گا؟ کو ہے کی فخر دیاں میں پچھلے ہوئے کو ہے کے ساتھ لوہا بنے ہوئے مزدور اینٹوں کے منوں سے
آگ سے رزق کشید کرتے ہوئے حسرت کش تعمیراتی جگہوں پہ سولہ سولہ اینٹیں سر پہ اٹھانے والے۔
دار۔۔۔ فصلوں کی بیجائی کھائی والے دیہان اور بڑے بڑے کاروباری لوگوں کے لئے قالین بچھائے
پارچہ سے پڑا دیوانہ کی طرح کھائی کا کام کرنے والے ہنرمند اگر اپنے قماش میں دنوں طر آری سے کام لیتے
اک لمبا عرصہ تک پیٹ کے انہم کا بعد حسن مہیا کرنے کے اہل نہ رہیں۔۔۔ مگر یہ کم کم شرم چپے تو کسی حد تک
میں نہیں آتا تھا۔

گزشتہ شاید اٹھارہ چار تھا کہ وہ خود اگر اتر کر بیٹھ جائے تو اوپر سڑک سے برابر ہو جائے۔ باز موسم
 گرمی ہوئی ہے۔ مختلف صحراؤں میں یہ مختلف صورتوں میں وارد ہوتی ہے۔ مصر عراق اردن اور
 عرب غلج کے ریاستوں کے چھوٹے بڑے صحراؤں میں یہ بالعموم ایسی خطرناک یا جان لیوا نہیں
 ہیں۔ اس کی آمد پر کاروان فوری طور پر بندہ ناک ڈھانچ کر لیٹ جاتے ہیں۔ اونٹ بھی اپنے چنڈوں میں
 گھس جاتے ہیں لیکن کالا باری صحارا کوئی ٹکڑا مکان سوڈان، شام اور افریقا، لیبیا کے صحراؤں
 میں سردیوں کے وسط اور گرمیوں کی انتہا میں مختلف اوقات باز موسم کے جھکڑ طوفان بڑی خاموشی سے اپنا
 رخ کر جاتے ہیں۔ پرانے تجربہ کار ساربان اور سیانے اونٹ اس کی آمد سے پہلے اس کی گھن گھن پا لیتے
 ہیں۔ اس کی ہولناکی سے بچنے کی خاطر وہ فوری طور پر ریت میں گڑھے کھود کر اندر بک کر بیٹھ جاتے ہیں
 مگر گڑھے کھودنے کا موقع نہ ملے تو انھوں نے کوئی اور طریقہ سوچا ہے۔ کھلے پرانے ڈال دیتے ہیں یا ان کی بھٹوں
 میں لہو ناک دب لیتے ہیں۔ اونٹ بھی ایسے ہی کرتے ہیں۔ کبوتر فاختہ کی بھٹوں کے پردوں، بھیڑ
 کے جھنڈوں کی سانپوں، تیرتیروں، جنگلی کبوتروں، موروں اور اسی طرح کستور، گھیل اور نافہ ہرن
 کے کھنڈوں کی بوسبک بھی اونٹ کی بھٹوں چنڈوں کی پائوں کی مانند ہر شے کھنڈوں اور ہرن
 کے کھنڈوں کے ساتھ لے جاتے ہیں۔

UrduPhoto.com

جنگلی لہو، کے شہرک یہاںوں پہ آسکھن کی کمی اور سردی کے نتیجے میں سنیں غلج پر پڑ گیا تھا۔
 وہاں مقامی سے اہل شہر کیا اور بھیڑوں میں ڈھل کے جانے پڑ گئے۔ نمونہ نے اپنا رنگ دکھایا تو
 ان کے دلے پڑ گئے۔ گزشتہ کوئی باقاعدہ ہسپتال تو تھا نہیں۔ کچھ کاشتکاری مرکز بھی خاصا دور تھا۔
 ان کے دلے ڈھول گز اور کہ صحت مند تندرست انسان کے لئے مشکل پڑے۔ پاس پائے ہنگامی صورت حال
 کے لئے وہ ذیات تھیں وہ ان امراض کے تدارک کے لئے کچھ خاص منہ نہیں تھیں۔ جب اور کوئی چارہ کار
 نہ تھا تو مہتمم نے ایک خود ساختہ اسٹریجک پلانڈ کر مجھے قریب تر شکاری مرکز چنگو ما میں لے جانے کی
 بات کہی۔ قمر سے کوہار سے شاہداد کے معدوق راستے میں ایک یہاں ڈرے میں شب بھری کے لئے پڑا
 تھا۔ اس کو یہاں کسی زہریلے کینڑے سے نکلے لیا۔ اسے سانپ بھی کہا جاسکتا تھا۔ گھر مارتا جگہ پہ کوئی
 گھلے کا ستان وغیرہ نہیں تھا۔ جسم تیار پڑ کر سو جہا شروع ہو گیا۔ یہ حالت دیکھ کر ساتھیوں نے انالہ پڑا دیا
 کہ وہ بار بار میں قندہ پاک کر جانے کا۔ اسی دوران چھڑوں کے منہا نے اور بھٹیوں کی آوازیں سنائی
 ۔ پھر ہمارا کوئی ساتھیانہ ڈرے کی مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ وہ چند زائرین تھے جو کچھ شہر ڈال پتے کا کام کام
 لیتے چیتے ہوئے آ رہے تھے۔ پاس پہنچے تو ساتھیوں نے انہیں میری بیماری اور چٹا بھائی۔ زبان بیان

وہ کیا سمجھتے میری ظاہری حالت دیکھ کر وہ کچھ سمجھ گئے ہوں گے۔ انہوں نے جھٹ پٹ جھاڑ جھکاڑا کٹھ کر کے آگ جلائی کچھ جزی بوٹیاں پانی میں ڈال کر جو شاندار سا تیار کیا پھر چمڑے کی بوسیدہ سی قھٹی سے کوئی موم صبر چیز نکالی ٹکدی کی مانند زبردستی مجھے کھائی اوپر سے نیم گرم ہوشاندرہ پلا دیا۔ جو کھل یا گرم پنیر سے وغیرہ ہوتا ہے تھے آؤڑ حار پنا کر لٹا دیا اس طرح کہ میرا کھانا قدرے نیچے اور ناگوں کی جانب جسم اونچا تھا۔ قافے میں نے بھی شب بسر کی لئے میز پر آؤ ڈال دیا تھا۔ سامان وغیرہ آٹا کر وہ جانوروں کے چارے اور اسے کھانے پینے کے اہتمام میں لگ گئے۔ کھانے پینے میں انہوں نے ہمارے ساتھیوں کو شامل کیا۔ اک، اک، اک کی زبان سے نابلد انسان اکٹھے پیٹھے کھاپی رہے تھے۔ اشاروں کنایوں میں سمجھ سمجھا رہے تھے۔ ویسے خدا کھولنے زبان بلانے کی بھی کوئی ایسی ضرورت نہیں ہوتی۔ آنکھیں اثرا ت ہاتھ انگلیاں جذبات اخلاق اور انسانیت سے بڑھ کر اور کون سی زبانیں ہو سکتی ہیں ان الفاظ و بیانیوں تو عموماً جھوٹ بولتے ہیں یا پھر انسانی مافی الضمیر کی صحیح ترجمانی نہیں کرسکتے۔

جو شاندار اور موم جیسی آؤڑ کھانے پینے کے بعد غنودگی سی طاری ہو گئی تھی۔ کھانا بہت سے تو میں بھی ہی بلکان تھا مجھے میرا دم نکلتے کوہو..... مجھے بھائی دیا کہ زہری راگ اب اپنے انتہائی پہلے پہلے ہے۔ جبکہ میری ازلی ازبانی میں ان الفاظ و بیانیوں کو تو کبھی پہلے پہلے آؤڑ سے خوابی کا بیج ہے جس پہ خوش رنگ شگفتوں کی بہار آتری ہو۔ کسی ایک شاخسار پہ کوئی پھل پڑی تو ال تاجہ ہوا کاں کاں اکہاں کہیں؟ کی رت لگے ہوئے ہو نور میں اس بیج کے بین پہلے پہلوئے بڑے گور سے نوکیلے پتھروں کے زبیری کے پیچھے جا غور کر رہا ہوں کہ میں کون ہوں کیا ہوں اور کیوں ہوں؟ اور یہ کون میں تھا..... جنوں یا جنوں کا؟

اسی دوران مجھے آبکالی سی آئی اور ایک بڑی قے نے مجھے مزید مذ حال کر دیا۔ یوں لگا جیسے میرے پیٹ سے ہر اعضاء آئیں الکر ہا ہر نکل آئے ہوں۔ اوگھتے تو تے جاگتے سب ہی میرا ایسا حال تھا۔ متوجہ ہو گئے۔ اچھا خاصا بدبودار کالا۔ جیسے کسی پہاڑی مادہ خود نکلنے کے لئے ان دھنسی میں چڑھا کر نکال دیا۔ جو نور و اس سے ختم نہ ہو سکا ہو مجھے جو موم جیسی درازی گئی تھی وہ مار غور نکلنے کی چکانی کا کھابہ تھا۔ جو نکلنے کے منہ سے گر کر پتھروں پہ موم کی صورت جم جاتا ہے جو ہر جسم کے ذریعے اثرات کھاتے کرنے کا تہ بہ تہ ترقیاتی ہے۔ کھاہر ہے کہ میں کچھ تک تندہ دست ہو چکا تھا۔

بات شتر نیچے میاں کی ہو رہی تھی کہ وہ اک بوٹی انداز میں اپنی جنت و اوقات اور عمر سے اس کی کر ریت میں گڑھا کھود رہا تھا اور پھر بات بڑھی کچھ جانور غیر معمولی قوت و صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔

خسک سالی کے موسم میں صحرائی حیات ایسے سیموں کو تلاش کر کے اپنی بھاکا اہتمام کر لیتی ہے۔ جہاز جھکا کر گھاس پھوس بھی ان ہی سیموں کی مہربون بنت ہوتی ہے۔ مصنوعی سیمے بھی بنائے جاتے ہیں جو موسم کو جگہوں پہ بوتے ہیں جہاں نیچے زمین پتھر ٹٹی یا سخت ہو۔ تاکہ پانی خاصی مدت تک محفوظ رہ سکے۔ یہ مسطور اور قدرتی سیمے مختلف حدود اور بسے کے ہوتے ہیں۔ بہت بڑے بڑے اور بہت چھوٹے بھی۔ مھل چوہاں کے سائز کے بھی۔ صحرائی طور و طریق کے مطابق یہ سیمے بھی بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ جیسے تھلویں میں بنے اپنے وقوع بدلتے ہیں اس طرح یہ بھی خشک اور تر ہوتے رہتے ہیں اور جو سیمے ایک دو موسم خشک رہا کرے وہ اندر سے ایک پائت کمین گاہ یعنی چھسی ہوئی خندق کی مانند ہو جاتے ہیں۔ اور قیامت کی گرمی ہو تو ان سے ٹھنڈے بن جاتے ہیں اور عجیب بات کہ اندر کسی نے کسی مقدار میں ہوا کا گزر بھی رہتا ہے۔ اکثر زمین پر اٹے اور خشک سیمے صحرائی جانوروں کے مسکن بن جاتے ہیں یا پھر جو بھی بھی نہیں ٹھلے۔ ریک مائی وغیرہ قسم کے رگیتی چلنے کشی کے لئے سو خر الذکر سیمے ہی کار آمد ہوتے ہیں۔ جو ان مخصوص کتب فکر کے حصول اور نمٹوں کے وظیفے کے لئے موزوں ہوتے ہیں۔ مخلوقات میں سب ہی اللہ سبحانہ کی حمد و ذکر کرتے ہیں مگر جانداروں میں یہ پھر مخصوص چیز خدا پر حمد و ثناء ہے خالق و مالک کی تعریف و توصیف کی تبلیغ ان کے ذوق و شوق میں ہے۔ ان کے دل میں یہ باتیں گونجتی ہیں کہ ان کے بارگاہ عالی میں بھی حمد و ثناء ہے۔ مچھلیاں بھی کیاں کہوت ابا نل از غا پلایا بندہ تنہا نہا ریک باہیاں وغیرہ۔ کتابت میں ہے کہ اللہ والوں کے حضور احاروں مسجودوں کے نزدیک و ہزار کیوتہ بلایاں اور نیکے کلمے سے ہوتے ہیں۔ لاکرین ان کے کھانچے بنے اٹے لگنے کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ حرمین شریف اور دیگر نیکو لغویوں کے آستانے اس کی بہتر مثال ہیں۔ اسی طرح نباتات و فواکھات رقیق و خشک شجر اور اللہ کریم کی چکوالی خاص نعمتیں ہیں جو مخصوص روحانی خواص کے ساتھ ساتھ ان کو ذہد بھی ہیں۔ ان کے انوار شہد ذودہ نور کوئی جو نور انشک عشق امر جان نوا کا نغیر و ذہد رنگ مرہب رنگ خارا رنگ مرہب اور سنگ سلیمان وغیرہ پھر خصوصی اشیاء ایسی ہیں جو روحانی اعتبار سے عبادت و ریاضت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ ریاضت و عبادت میں چلایا و غلیظوں کے لئے پیٹ و نمس پہ قابو ضروری امر ہوتا ہے۔ دھیان گیان اور صرف نظر و غم کہنے بغیر ممکن ہی نہیں ہوتا لیکن جسم و جان کا سلسلہ قائم رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ کھانا و پانی ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے علی شہد کھوئی لوتیوں وغیرہ ان نعمتوں سے جسم و جان میں طاقت و تقویت ہوتی ہے لیکن اللہ اور بول و براز پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی نفسانی اور شیطانی وساوس سر اٹھاتے ہیں۔ غلو و تمہر سے بھی نجات مل جاتی ہے یعنی یہ نعمتیں چونکہ خود ذرا کر و شاکر ہوتی ہیں اس لئے طویل و غلیظوں اور ٹھنڈک و ہنس

وسیلے سے مراد منزل پوری ہو جاتی ہے۔ جس کی ایک اعلیٰ مثال صاحب الخوات نوالنون حضرت یونس کی ہے۔
کا پھلی کے شہم میں آیت کریمہ کا چلہ جس سے انہیں نجات ملی۔ مذکورہ چوٹی ریگ مای جو صحراؤں میں
جاتی ہے۔ اس کا مفصل بیان پہلی فصل میں ہو چکا ہے۔ جس طرح ضروری نہیں کہ ہر اجتماع آب میں
ہوں اسی طرح ہر فضاء میں ابا نہیں بھی نہیں ہوتیں اور نہ ہی ہر آتھلہ سے میں آتھی کیڑ اور برقی ذاتی
ریگ مای موجود ہوتی ہے۔ یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے کہ کسے کسے رنگ لگتے ہیں۔

رنگت چلہ کشی میں ریگ مایاں بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں اور اپنی افزائش نسل کے موسم میں
مایاں ارتقی دہلی غاروں۔ تاریک سیلوں اور ملے جنوں کے کسے پھنے کوٹوں کھدروں کا انتخاب کرتی ہیں۔
ان میں خرمادہ کی تخصیص نہیں ہوتی دونوں ہی ایک نثری رنگت کا لعاب خارج کرتے ہیں۔ یہ لہجہ
قریب سے اک خاص قسم کے دھتے ڈنڈوں کو اپنی پیٹ میں لے لیتا ہے اور پھر کچھ ہی دیر میں وہ
ڈنڈے بار آور ہو کر نئے نئے اندوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں پھر ان رات کی گرمی سے یہ ریگ
کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ حیرت ہے کہ ان کی خوراک بھی ریت ہی ہوتی ہے۔ اب رہے وہ ان
نہیں ہوتا۔ ان میں کوئی شیشہ اور کوئی پنجرہ جو سورج کی کرنوں سے منعکس ہوتا ہو اور ان سے
ہوتے ہیں۔ ان میں ڈنڈے ریگ مایاں کی صورت میں ہوتے ہیں۔ ریگ مایاں ایک خاص قسم
کے بعد خشک کر کاٹی کی چوڑی کی مانند ٹوٹ پھوٹ کر شیشے کا رادو بن جاتی ہیں۔ جو ریت میں
ریت ہی بن جاتی ہیں۔ انہیں ریت مچھلیوں کی مانند یہ بھی اوندھے شیشے سا آہ پار نظر آتا ہے۔
دن کے آجائے میں غور سے دیکھ کر کھائی جاتی ہیں۔ چلتے پھرتے ہوئے ریت پہ لہرینے سے
غبار اڑاتی جاتی ہیں۔ اندھیرے میں جگنوؤں کی طرح چمکتی ہیں۔ زیادہ تعداد میں انہیں
کو ختم کر دیا جاتی ہیں۔ یہ صحاب کیا بقتی صحرائی کیڑ اپنے انداز میں دیگر تمام جانوروں سے
ذرا الٹی کرتا ہے۔ لک بھگ اسی شکل و صورت کا ایک اور چمکتی لٹا کیڑا بھی ہوتا ہے مگر یہ
ہوتا ہے۔

یہ قدرتی خشک سیلا جو شاہی صدیوں سے بند تھا ایک لمبی چوڑی سی قبر کی مانند تھا۔ اس کے
ہوتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہاں ریگ مایوں کا بیڑا ہے۔ سبیلے سبیلے تاریک سے ماحول میں
ارواح پرور جبک زریں مٹی کی آب باہر سے ہالے کاٹن گز ارکھ کر بند کر دیا گیا تھا۔ ہلکی ہلکی آواز
چل رہا تھا کہ اب گز حار ریت سے بھرا جا رہا ہے۔ اوپر چلتے پھرنے کی ہلکی ہلکی چاپ بھی سنائی دے
کچھ دیر بعد جب یہ آوازیں بند ہو گئیں تو میں نے جان لیا کہ گز حار بھرا جا چکا ہے جبکہ اوپر پانی بھر گیا

کے چلنے پھینپنے کی اجازت دی تھی جن میں سرفہرست میں خود بھی تھا۔ فرمایا کرتے کہ مجاہدوں کی مشقتیں ضروری نہیں۔ یہ مخصوص راستے کے مسافروں کا تردد ہے اور ایسے لوگوں کی ہڈیاں اور زنجیریں ہی مختلف ہیں۔ اللہ پاک انہیں خوف و غلبان سے محفوظ فرماتا ہے۔ ریاضتوں سے ان کا مقصد جسم و جان کو جود و وجدان کو صدیقی بنا کر مقصود ہوتا ہے تاکہ مادی اور روحانی طور پر مضبوط و مربوط رکھ کر اللہ کی مخلوق کی انداز سے خدمت و رہنمائی کر سکیں نہ کہ ان کا مقصد خرق عادت کرا متوں معجزوں کا فروغ، اعجاز کرنا بہت ہی خاص الخاص بندوں سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے امر سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اللہ کریم جب یہ جس پہ چاہتا ہے ان کا ظہور فرما دیتا ہے۔ سو جو نام نصابِ عالمی ایسے معجزوں کرا متوں کے دعوے دار ہوتے ہیں گھٹن شیطان کے چیلے شعبیدہ باز اور سفلی علت و حکوم کے مقلد ہوتے ہیں جن کے ہاں دین و دنیا دونوں ہوتے ہیں۔ تاریخ بھری پڑی ہے کہ حق کے مقابلے میں باطل نے ہمیشہ مات کھائی۔ استعمار و تسلط سامنے بغاوت و حریت تک سیسہ پلائی ٹھوس دیوار ثابت ہوئی۔ موئنہ کے متعلق خبر دو اور جاوگر بسے سامنے بیوی امر اچھلی انبی کریمؐ کے نور و کفارہ نصار امام عالی مقام کے آگے بڑھا کر ان کے آگے سر ہمتے جائیں تو عمر بن قاسم اور راجد اوپر پھر اولیاء اللہ اور صوفیاء کے نام جنہوں نے حقیقت سے وقت کے بدلے بدلتے بدلتے مجاہدوں اور ان کی باتوں کو پس پا کر ان کی باتوں کا چرچا کرنا اب انیس کے چیلے اور بدلتے بدلتے یہاں نبیوں کو زمین چائے پی مجبور کروایا۔

ہو گئے۔ مگر کن نامیوں کے قدم چھوئے ہوں گے؟ یہاں کے صحراؤں، پہاڑوں، جنگلوں، میدانوں،
 دریاؤں اور کنیوں کے لئے۔ طالع آزمائوں، جنگجوؤں، لٹیروں، قاتلوں نے اپنی تسکین حرص کے
 لئے کیا فوجیں سامان ستم پیدا نہ کئے ہوں گے جبکہ ادھر کی عظیم قیمتی کتب گھروں، درس گاہوں نے
 کتب خانوں کی بے خرمی بے قدری و بربادی کے کیا نہ منظر و تماشے اقام نظر نہ کئے ہوں گے۔ اس بزرگ
 نے شہداء و امراء و سلاطین کی جاہ و جلالت، عظمت و سردری کے کیسے کیسے خوب روشن ادوار ملاحظہ
 کئے، محسوس و خلافت، علم و دانش، تصوف و تعارف، تہذیب و تعلیم کے جیسے اور جیسے منہری زمانے اس
 کے تعارف میں آئے وہ کسی اور ملک و ریاست کے نصیب میں نہ ہوئے اور جیسی خوں ریزی
 ہو چکی۔ بد بخت و بے رحمت طوائف الملوکی بربادی و تباہ کاری اس کے ماتھے لگی اور جو لگ رہی ہے
 ابھی کچھ نہیں اور سرزمین کا مقدر بدی ہوئی۔ مکہ مکرمہ مدینہ منورہ بیت المقدس کے بعد جو کچھ بھی ہے وہ اس
 کے سامنے زمین کے لئے ہے۔

یہاں تک عرض کر چکا کہ قریب قریب آدھ قدیم سے ہی یہ قلعہ آرائش زیبانتی۔ یہاں تک پہنچی کہ اپنی
 اور دنیا پر مبنی گہرے سرگرمیوں کا شہر بنی۔ یہاں تک پہنچی کہ اپنی طاقت اپنی ظاہرہ
 و باطنی سے غار وادی پنداس وادی ایست کے حاکم ہیں۔ اس کا نام سیرکان افلاک ہے۔ یہی شہر ہے
 جس کی دست المرات۔ کچھ دور و منہجون اجرام فلکی کے رہنے کے پسندیدہ ترین مقام و قعود ہیں
 جس کی طاقت و اقامت اور یہاں کشش ثقل کا ایک قدرتی ارتکاز و تحلل کشش ثقلی کرکوں کا ایک خاص
 اثر ہے۔ اس سے افکاس و غیرہ اس کے لئے ایک خاص مقام ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اس قدر سے خاص خاص خارج
 ہیں۔ اس علوم ملوی کے حصول کی بنیادی شکل واضح ہو چکے ہیں وہاں سطح علوم کے سراٹھانے کی بنا پر ہی جاتی
 ہے۔ قدرت قدرت کے مساوی علم و سحر، تحلیل و تکامل کی جو بھی مساعی ہوئیں ان کے ذائقے بجا واسطہ بھی
 ہے۔ اس سے اسے اور بالواسطہ بھی ادھر سے ہی ملے۔ اب و شامری، حکمت و کیمیا گری، نبات و انشوری
 و شامری، صنم گری و آوری، فہرست و مفری، زمین کے سینے میں بلبل و بالابینا کاڑھے گئے۔ پاتال
 کے لئے کوئی اور بخل با دیاں تھیں جس کے اندر تہہ و تہہ شر آجاتے۔ ان ہی کے پہلو سے روشن چاند
 ہے۔ ان کے دوش پہ لٹے جھولتے ہاتھ۔ لرزہ دہش و سرگاہیں تماشائگر اور مشرت کدے اٹھانے
 کے لئے کہ کافوں سے اب جوڑیں آہستہ میں اور چمکے اٹھانے گئے۔ نینا پامل اپنے نام کی مانند
 ہے۔ کا ایک علم کدہ؟ یہاں صدیوں پرانے علوم، طبیعیات و انہیات، ہیئت و ہندسہ، نجوم و نظرات
 و جہان بینی، سنی، مثالی، مطیع و مثالی، کردی، عنصر و نباتات، توحید و تعارف، عالم فلکی و عالم سطحی

یہ نوحہ سننے لڑکوں بالوں کی ضرورت تھی۔ ہم لڑکوں کی چھاپہ مار پاریاں اکثر ادھر بیٹھا کرتی رہتی تھیں۔ بچے نہیں نے مجبوراً اور ضرورتاً اپنا لمبیل بنا رکھا تھا کہ کبھی کبھتوں بانگوں میں پکڑے جانے پہ ہڈیوں سے درد ہوتا۔ نوحہ کرنے کی وجہ سے ہماری گوشائی نہیں ہوتی تھی یا پھر ہم دوڑ بھاگ کر گودام میں پناہ لے لیا کرتے تھے۔ اس طرح یہاں آنے جانے سے ہمارے دماغوں سے ادھر کی دماغ پھاڑ دینے والی سڑاؤ کا آواز ملتا رہتا تھا۔ ہم تحفہ نمزنی ہڈیوں کے چٹائیوں گھوما کرتے جیسے کسی باغیچے میں چھل قدم کر رہے ہیں۔ یہ مختلف نوع کی ہوتی ہیں۔ نیل، گھون، گدھوں، گھوڑوں کے پورے پورے ڈھانچے جن سے کوئی گدھ اور چھتے کھوڑے ٹھسے ہوتے۔ بوجھوں قصاؤں کی دوکانوں سے اکٹھے کیے ہوئے مسیور مسیور پانچ ہڈیوں سے حاصل کیے ہوئے مردار جناوروں کے کلبوتے۔ گلی گلیوں میں پھینکے ہوئے کھڑے۔ بظاہر یہ کام کاروبار پر اٹھایا اور چھلکوں پھلکوں کے کرنے کا ہے مگر خالصتاً ہی نہ دھرم کے لوگوں میں جتنی شرح منافع کی اہمیت ہوتی ہے اتنی شاید عورت عورت اور گھنیا پن کی نہیں ہوگی۔ کیا جاسکتا ہے کہ کاروبار صرف کاروبار ہوتا ہے یا گھنیا پن نہیں ہوتا یا پھر یہی کہ اچھا اور برا کچھ تو سب کر لیں گھنیا اور گنداکارہ بارکون کہہ سکتے ہیں حالانکہ یہ بچوں کے لئے رشتہ دار ہیں۔

UrduPhoto.com

کچھ ہی ہندو خانے میں میں اکثر ایک بڑا بڑا چہرے اور کمان کر رہے ہوتے تھے۔ ان سے خاص کر بچے کو ہراساں کرتے تھے۔ ان میں اس شخص ہندوستان میں ہڈیوں کو اذیت دیتے دیکھا تھا۔ بڑبڑا رہی تھی۔ اپنے آپ میں ہم ان سے بے حد بدگمان اور بدگمانی ہے ایک ایک ہڈی کو معاہدہ کرتا پھر وہ ہڈی کو اس کے منہ کے مطابق ارد گرد کے مختلف آبادیوں کی جانب اچھال دیتا۔ ہاں اس کے پاس ایک بوسیدہ سی بوری تھی۔ اٹھ جانے اس میں وہ کیا دھرتا "میں نے اسے کبھی کبھار اس میں ڈال دیتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے انہیں کبھی نہ دیکھا تھا۔ ان کی کوئی خاص چیز بھی میرے پاس نہیں تھی ایسے ننگے ننگے ہڈیوں کی ایک اکثر ایسی ہی اور ہڈی بے ڈھنگی بیگڑا پھرتے ہوتے ہیں۔ اس نوع کے بچے ذہن کے پتے ٹکرانے سے ایک اکثر آپ کو اپنے آپ میں اٹھائی دیں گے اور یہ ان کام دھندوں میں بیٹے ہوں گے جنہیں ہم سب سے میں کرتا تو کچھ دیکھنا تک پسند نہیں کرتا۔ ان قاتلوں لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ ان کو کچھ کے باوجود کوئی انہیں جانور سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ نہ جانے کیوں نہیں اس میں کچھ غیر معمولی شے ہے۔ گودام کے فشی اور چوکیدار کے لئے صبح دوپہر شام شیٹوں کے ذریعے گھر سے کسی مائیت لکھا ہوا ہے۔ ان تمام میں سوچا کرتا کہ وہ معقول سا بڑا حاشی اور لنگڑا چوکیدار اس کے ہاتھ کاٹ لیا ہوا کھانا کس

طرح صق سے اچر لیتے ہیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں جسم چہرے پہ کیا موقوف وہ تو سراپا کسی فخر یا مہر سے
 بوڑھے مرے ہوئے گدھے کی بوسیدہ ہڈی کی مانند تھا۔ زور سے دیکھو تو لگتا تھا کوئی بڑی سی ہڈی کسی تار سے
 چلی آرہی ہے۔ سامنے مقابل آنے والے اسے دیکھتے ہی راستہ وے دیا کرتے تھے۔ بد قسمتی یا خوش قسمت
 ایک دن اس کی رُو میں آگیا تھا۔ وہ ناشتے کا سامان اٹھنے سے ہڈ خالنے کی جانب رُواں تھا میں اچھی لگی سے
 وہ سامنے تھا۔

”چاہا الالسی کا ڈال مجھے دے۔ میں بھی ادھر کواڑ سے جا رہا ہوں۔“

وہ مجھے یوں غصے اور کھوجنے لگا گویا میں بھی کسی نوع کی کوئی ہڈی ہوں اور وہ سوچ رہا ہو کہ اسے
 ڈھیر کی جانب اچھا لوں۔ میں نے کسی زندہ انسان کے ایسے بڑے بڑے ڈراموں نے دانت نہیں دیکھے۔
 تو پہ لگتا تھا کہ ہڈیوں کے ڈھیر پختہ ہیں کسی پوتے سے مڑوہ کاٹنی گدھے کی تیشی نکال کر اپنے
 میں زبردستی فٹ کر لی ہے۔ اس نے دانت نکلتا تے ہوئے کچھ کہے سنے بغیر واصل میری جانب ہوا۔
 پھل کے لڑاؤ میں اس نے یوں احتیاط سے تھا کہ جیسے اس میں پانی کی بلوٹی ہوئی تھی شہلازار و ہزار ہا
 اٹکی ہوئی مٹاکی ہو۔ مجھے کانپا سا لگ گیا۔ وہ ناشتہ والا ہوا تھا آگے آگے اور میں اس کا اس
 چپے چپے ہر وہ چیز دیکھ رہا تھا جو اس کے پیچھے رہ کر اس کے پیچھے رہ کر اس کے پیچھے رہ کر اس کے
 چلنے میں کچھ احتیاط ضرور ہوتی ہے کہ مقلد آکر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت نہیں اٹھاتا۔ بس تھوڑے
 سے تاوقت کہ میں رہا نہیں خود ہی رک نہ جائے۔ ہم گئے بندھے رہے راہ راستوں پہ گھومتے ہوئے گدھے
 تک آگے تھے جو اب چھال کھڑے درجوں میں ہوتی تھی۔ گھر تک کھائے گھر میں سفید چھتیاں والے
 ہاتھیں چہ۔ مجھے نے آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا۔ چونکہ اڑنے اور کسی پسند اور اوریش سے
 کام آتی ہے۔ پورے ہی کا ناک نہیں کھین پڑتا۔ طلوے اور لسی سے ٹپنے کی گتے نہیں ہوتی۔ جو
 سے رویش کو فرست نہیں ہوتی ایسے میں دھیان و دھان کی سیدھ لگا کر کچھ سیدھ میں ہی رہتا ہے۔ آگے
 کرنا شتہ والے کے گرد ہوا۔ شاید ناشتے کے پالنے میں کچھ اچار پڑھے ہوں گے۔ گوشت پالنے
 سے اسے کچھ رغبت نہیں رہی تھی کہ گودام کے ہڈوں نے اس کے دانتوں پہ ذرا اتنی پھیر دی ہوئی تھی۔
 پھر ڈر کر پھیر دوں تک پھیلا دی تھیں۔ ایسے میں وہ ختم قریب بحالت تجوری خارش سے
 وال دلیئے اور جو جوی پہ لگا ہوا تھا۔ منشی نے لپک کر میرے ہاتھ سے لسی کا ڈال لے لیا تھا اور
 ہاتھ دھو کر دھوئی کے پلوں سے پونچھ رہا تھا۔

اصل میں مجھے اس سے راستے میں بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا۔ وہ واڈ وروا

کے بارہا تھا اور میں اچک اچک لپک لپک دو قدم درمیانی فاصلہ پانے کی تنگ دزد میں ہی لگا رہا۔
 اسے اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اتنا منحوس و مطلقوں کیوں دکھائی دیتا ہے۔ ایسا غلیظ اور ناپسندیدہ کام
 کرتے ہیں اور وہ مرداروں کی سرائی گئی ہڈیوں میں کیسی چھائی کرتا رہتا ہے؟
 میں نے ایک بار ماموں شو کے سے پوچھا تھا۔

ماموں یہ شہابیڑ آپ کا ملازم کیا چیز ہے؟ انھیں ہڈیاں یہ چھانکار رہا ہے ہاتھ منہ دھوتے بھی اس کو
 دیکھنا۔ کائے بھینسوں کے علاوہ وہ آپ کے کتوں کو بھی بھلاتا ہے۔ اس کے چٹکے اپنے کپڑوں بلکہ
 کے تھلے دھسائے سے بھی گھبرا کر مردوں کی بدلتی ہے۔ کیا آپ کو بھی اس سے گھن نہیں آتی؟
 ماموں تلخی میں سگریٹ دبا کر کش لگانے کے مادی تھے۔ بھرپور کش لگانے کے بعد وہ سگریٹ والی
 گھنٹہ سے ہاتھ کی تلخی پہ یوں چھارے گویا بھاری کی مٹی سے منگھ کر اٹھ کرنا چاہ رہے ہوں۔ وہ اک
 دم قہقہہ لگاتے ہوئے کہنے لگے۔

برخلاف ایشیا یو ہمارا ملازم نہیں ہے بلکہ ہم سب اس کے نوکر ہیں۔ وہ ہمارے رزنی چوڑی کو پاک
 کرتا ہے۔ ہم نے بھی کسی کام کے لئے نہیں کیا۔ جوتی وہ ہوتا ہے۔ اس کے من کی چون اور اس
 کے من کی چوڑی۔
 ماموں میرے کال پہ چیت لگاتے ہوئے بولا۔

کا کا دو بارہ چھاپو کے بارے میں کوئی سوال مت کرنا اور نہ ہی اس کی بات دیکھو چننا۔ تمہارا
 من کی چوڑی کی بات کو سمجھنے کی انھیں ہمت نہیں ہے۔
 مگر میں تو بڑا ہوا سی ٹیکنی اور ٹیلی مٹی کا تھا۔ ماموں کے منکرت جواب نے گویا میرے روبرو انجمن کو
 دیا تھا۔ ماموں شو کے کو میں انتہائی گھمڑی کا کاروباری بندہ سمجھتا تھا ایسے ٹکنو لوجسٹم کے لوگ محض وہ
 ہیں جن کی زندگی کا مقصد بھٹے ہیں۔ انھیں زندگی بھر کی بدنامی و کمال و فخر اور رضا قسم کی ہار کیوں ایسی
 سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ مگر کیا کیسے اس وقت اس نے کسی بھی سی بات کی کہ میں حیران رہ
 سکا۔ ہوا گھمڑا اور منکرت کسی کی میراث نہیں ہوتیں کوئی بھی کسی وقت بھی کیجیو گی کہ منکرت ہے کہو کر
 کہیں یہ عین وقت پہ آبدار اور جامد کی بات ہوتی ہے۔

تو میرے اپنے خیال کے مطابق مجھے کسی طور بھی رولو اختیار نہیں کرنا تھا۔ شاہد وہ مجھے بچہ کپا
 گیا۔ یہ وہی کو بھی اس بات نہیں جانتا تھا کہ منکرت جائے۔

پانچے اور اچارہ میں ایک قدر مشتہک ہوتی ہے کہ دونوں اپنی خوشبو مارتے ہیں۔ کھانے کے بعد

• تھکوں اُتے گئے.....!

”کیا! راجب کھا۔“

اپنے لئے یہ سُن کر میری سماعت کی تو آنت پڑھ گئی، میں سُننا ہوں اور راجب کون سا؟ چند لمحوں میں گم خم ہو گیا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں کیا کہوں؟ اسی اثناء میں کھرک کھایا ہوا سُننا اپنی جگہ سے اٹھ کر باغ میں پڑے ہوئے لقمے کو سونگ لگا، تھو تھنی سے آنت پلٹ گیا۔ پھر میری جانب لوہا دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔ مگر راجب راجب ہے۔ یہ تمہارا حصہ ہے میں اپنا کھا چکا میں کبھی گئے کو اور کبھی نوالے کو دیکھنے لگا۔ آنت پلٹ سے خوب مٹی غلا گئی ہڈیوں کی خشک تر آرائش سے آلودہ ہو چکا تھا۔ اسی دوران میرے اندر حیرت کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ ”لو یا میرے اندر ایسے ہی نوالے کھائے ہوئے ہیں آپت نہیں قبول کرنے سے انکاری ہو گیا ہو۔ اب دوسرا سے باہر اُمنڈنے کے لئے حلقوں تک پہنچ چکے ہوں، جب ایک دو اُباکیاں کھا کر باقی بچے اُمتنا کی سے میری جانب متوجہ ہوا۔

”اُبا اور اپنا راجب کھا، اور دوسرا۔“ تمہاری بات سن کر میں بھی ڈوبی، اب بے پناہ چلا نا۔

UrduPhoto.com

یہ سُننے ہی نا کہ میرا تھا اپنی بیوی کی طرف چلا گیا۔ کدو سا سرنگی میں ہلاتے ہوئے میں تڑپا ہوا۔ ”میری پوچھا نہیں ہے۔ میں ڈوبی کی طرح تھا بھی نہیں ہوں..... میں تو بندھوں میرا نام۔“ اس نے ایک بریائے فتنے کا پتھر میری بات پر رکھتے ہوئے تڑپے کہا۔

”لو ہانے ڈوبی کی پوچھل باہر کی جو کسی نے کاٹ دی۔ تیری پوچھل اندر ہے۔ باہر کھینچ کر میں اسے نکالتا ہوں گا۔“

میں آ پے آپ ہی دو قدم پیچھے سرک گیا کہ بھاگنے میں آسانی رہے۔ مگر وہ تو جیسے میرا ذہن میری سماعت پر سے خیالات و خدشات سب کچھ قابو کیے ہوئے تھا۔

”یہاں سے ختم کی منت سوچو۔ تم ہمیشہ میرے بارے میں سوچتے رہتے ہو۔ مجھے عمل دیکھتے ہی تم مجھ سے بات پیٹ کر نا بھی چاہتے ہو مگر تمہیں من سب موقعہ دار الفاظ میں ملے تھے۔ تم جانا چاہتے

تھے یہاں سے ختم کی منت سوچو۔ میں اکا علیہ اور محمد وہ کہوں ہوں۔ میرے ان ترانے نوئے ختم کے تھے۔ بائیں۔ بڑھے ہوئے بالوں کے جھانجھکاؤ۔ تن کے حشش جھترے۔ کمر کی ڈوبیلی

کھینچ۔ دوسری۔ میں کون ہوں کیا ہوں اور کیوں ہوں؟ اور سنو! میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم کوئی عام سے

بچے نہیں ہو۔ تم میں جانے سمجھنے کو کھینچتے محسوس کرنے اور برداشت و جذب کرنے کی بے پناہ صلاحیتیں ہیں۔
یہ سب کچھ کہہ کر وہ کھانے میں لگن ہو گیا۔ نوالہ توڑتا "النا سید صاحبہ دینی پہ جام استرے کو بھیج
ہے۔ وہ نوالے کو پر اٹھے پہ گھما پھرا کر بھارت سے منہ میں رکھ لیتا۔ یہ بھی دیکھا کہ اس نے آدھا نوالہ شکر
بقیہ دلو کے منہ میں ڈال دیا۔ یوں کہ یہ بندہ اور وہ کتنا نہ ہوں ایک ہوں۔

میں اپنی آبکائی اور تنگی پہ بڑی مشکل سے قابو رکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔۔۔ اُف خدا یا ایہ بھگتیاں
بے وقوف علی سائیز! پھر سے کیا نکلا؟ اس کی یہ فلسفیانہ انداز کی گفتگو اس کے معقول پر ہمارے لکھے انسان کے
کا پتہ دیتی ہے۔ فن گفتگو سے بھی آشنا لگتا ہے تعجب کہ وہ میدان اور انسان کے مابین کا واضح فرق اور نفیس پر
کے اعتبار سے ایسی روگردانی برتا ہے۔ کتنا تو نفیس العین بھی ہے جو کبھی پاک نہیں ہوتا۔۔۔ دینی خارش دہہ
کی چپ پڑی کوڑھو کھال جک جک سے آہٹ رہتی ہے جسے دیکھتے ہی بی ملاش کرنے لگتا ہے۔۔۔ اس کا سر گھٹا
میں کیا ہوا نوالہ نہیں کھاؤں۔۔۔؟

"خدا۔۔۔ میں کھا لیتا ہوں۔" وہ ہنسنے لگا۔ "تو بڑے غائب ہوں۔" نوالہ دینی کے ساتھ کرنا
دینی نے بہت نوالہ دیا اور اس کے بارے میں ایک شہرت ہو کر رہی۔ بالکل عام
جیسے شہرتی ہو کر رہی۔ وہ شہرتی کے طور پر اس کے بارے میں ایک شہرت ہو کر رہی۔ بالکل عام
میں جو اپنے اکا انسان کا ارمان تو یہ پڑھتا ہی ہے دنیا انوں پہ بھی اپنا حکم لگا لیتا ہے۔ "خدا یا ایہ
قش کا بندہ ہے؟" دینی سوچنے لگا۔

"میرا آؤ۔" اس نے مجھے بولے حکم دیا جسے میں نے اپنے بارے میں ایک شہرت ہو کر رہی۔ بالکل عام
میں بھی ایک حکم کے بندے کی طرح سر خم کر رہی تھی کہ وہ بڑا جھڑا ہوا۔ وہ سخت استخوان پر پوشیدہ
پھسکا آسن ہمارے بیٹا حاضر جوابی فرما رہا تھا۔ درباری کوڑے کدھ چٹیں ابھی حاضر ہاش نہیں تھے۔
وہ ان ہی کے زور سے تھے یا پھر میں مستحب و مستحق وہ دھارتے ہوئے ہوا۔

"آؤ تم نے میری بات کی مٹی کی کرنی تھی تو پیچھے پیچھے نئے کی مانند آنے کی کیا ضرورت تھی؟
تم نے بہت سے سوالات بھی مع کر رکھے تھے۔ تم سے تو یہ کھرک کھایا ہوا آؤ اچھا ہے جس کے پاس
اطاعت محبت خدمت اور غور پسندی ہے۔ یہ تمہاری طرح عقل ناقص اور تفکیر کا ترہ و تہرا نہیں لگتا۔
رہی بات جس و پاک خوشبودار بدبو اور طہارت و طہارت۔ تو سوچو تم کس چیز سے تعلق ہو گے۔ بدبو
طہارت کی۔ ناپاک قہرے اٹھیں کا گندہ متعفن خون جسے کی مشروں میں یوں تک بطور خدا استعمال کرتے
انگ انگ میں حرام مغز اور حرام خون۔ شرم و سیاہ موہنے والے کیزوں سے بھر پور منڈے۔ بدبو

فرانکس سرانجام دیتے ہیں۔

وہ خاموش ہو کر مجھے گھورنے لگا۔ میری پٹری پٹندی آنکھوں میں اپنی انگلیوں کے بڑے تار تار بندھ گئے۔ اور کچھ گھنٹے اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ انہیں آدھے دھیلے کا کچلا ہوا کھانا دیا جائے۔

شہا بے کی اس آخری بات کے بعد میں بھٹا کر بن کچھ کہے سنے وہاں سے کھسک آیا۔ میری اپنی عقل کھو گئی۔ مطابق اس نے میرے ساتھ انتہائی اہانت آمیز سلوک کیا تھا جبکہ میری اس سے دلچسپی محض یہ جاننے تھی کہ وہ پاک پلید جانوروں کی ہڈیوں سے اتنی گہری دلچسپی کیوں لیتا ہے۔ ان کی بانٹ چھانٹ میں سنجیدہ اور منہمک ہونے میں کیا راز پنہاں ہے۔ وہ گویا ان ہڈیوں پہ مٹی ان مٹی لکیریں تحریریں پڑھنے کی کوشش میں ہو وہ ان کے قلم فیہ سے کھٹکاؤں ابھارا کہاڑھول مرض اور وزن یوں چاٹتا اور نظر سے نکالتا جیسے اس کے دے وقتوں کی کوئی پراسرار تحریریں لکھی ہوں یا ان میں غیروں کی خبریں لکھی ہوں فلاسفروں اور جہاں کھسکی کی رانوں تلے دفن ہوں جانوروں کی مقدس ہڈیاں کہیں سے آئی ہوں۔ وہ کچھ ہڈیوں کو یوں الٹ پلٹ بغور دیکھتا ہے جیسے وہ انہیں جان پہچان چکا ہو۔ اس عالم میں اس کے چہرے کے ہمسایہ غم و غلہ اس کے بدل جاتے ہیں اور وہ علم الامضاء کا سنگی سا کوئی یونانی عالم دکائی دیتا ہے۔ وہ کوئی سنیہ قد کاچا پتھر ہے۔ کوئی ایسا پتھر ہے جس پر سنیہ کی زبان لکھی ہوئی ہے۔ وہ کچھ ہڈیوں کو الٹ پلٹ دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا ستر پھٹی ہوئی ہو۔ مجھے اکثر محسوس ہوتا جیسے اس نے میرا کوئی قرض دینا ہو یا اس کے پاس میری کچھ گرومی چڑی ہو۔ کچھ تو کسی کسی کا طے اس سے کوئی آشنائی ضرور تھی لیکن جب تک منظر واضح نہ ہو کہ کچھ تاظر اپنی بصارت کی محنت پہنچا کر سکتا۔ صرف بصیرت کی ناکہ لگائیاں ہی مارتا رہتا ہے۔ شاید ہی اس کے لئے کوئی راہ نکلتی ہو۔

میں بے دلی سے وہیں گھر کی جانب لوٹ رہا تھا۔ نگاہیں قدم نہیں اور وہ مارغ تو جیسے گھر میں نہیں۔ انسان خالی الذہن وہ صورتوں میں ہی ہو سکتا ہے۔ انتہائی پرتکون لحاظ میں یا پھر سب سے کسی ذاتی ادب میں تواضع اور۔ کچھ کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس کیفیت میں ہوں۔ میں جیسے۔ پیچھے تھا مایا میرے آگے۔ میں فوائداوی راوی کی اصول مٹی میں پاؤں رچا رہا تھا۔ روئے قلم سے۔ ٹھوکر کریں۔ راہ راستے کی ہرج سے بے نیاز۔ آخر یہ کیفیت اس وقت کوئی سب ایک بینڈی کی طرح مار کر مٹانے آگیا۔ بالشت پر لمبی زبان لٹکا لے وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا جیسے میں کچھ ہڈی اٹھا کر بھی گا جا رہا ہوں۔ سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ ذات شریف مجھ سے آخر کیا چاہتے ہیں؟ انہیں میرے اور بھی لوگ آ جا رہے ہیں مجھ ہی پہ یہ نظر کرم کیوں؟ جب کچھ اچھے خاصے لمبے اسی دیکھا دیکھی میں رہے۔

کسی نے اسے اپنا بیٹا بنالیا اور گود بھریا۔ کسی نے اسے اپنا بیٹا بنالیا اور کسی نے اس کا ٹھونٹھا کھایا۔ میرا
 کہنا ہے کہ کھٹے کو چھتا غیر مسلموں نے سمجھا چکا۔ محبت، توجہ، عزت، ہی اور انسانی فلاح و بہبود کے
 کام لیا۔ مسلمانوں نے اس کا حق شہر بھی نہیں کیا۔ مسلمان اپنی پاکی داماں کے زعم میں ہمیشہ
 سے حاکم رہے۔ اسے جس کا پاک کہتے رہے۔ لیکن اس وفادار نے پھر بھی ان کا دامن اور وار نہ
 مسلمان بلکی سے بلکی گالی یا کم سے کم نفرت کا اظہار بھی اگر کسی سے کرے گا تو کتنا ضرور کہے گا۔
 میں نے ایک چیز ہے عقیدت و پھر میں بھی کتنا پند کر لیتا ہے اور کبھی انتہائی غصہ اور نفرت کے عالم میں
 کہتا کہ کتنا چاہتا ہے۔ انتہائی عقیدت و محبت کے عالم میں ملک و رسول صلعم کہتا اپنے لئے اعزاز اور
 کہتا کہ کتنا ہے کسی ولی یا پھر مرشد کی چونکٹ پہ بندھا کتنا کھلوا ہوا بھی اپنے لئے فخر سمجھتا ہے۔ مگر اسے ہاتھ
 ہم سمجھتے نہ نہیں کرتا۔ آج مجھے کسی سے یہ نہیں کہتا کہ میں فلاں در کا نفرت ہوں گھوڑا یا بکریوں میں کہا
 کہ ان کے ذرا کٹائیوں معلوم ہوا کہ کتنا تصوف میں اک خاص مقام رکھتا ہے۔

بھئی غریب امثال اور محاورے کھٹے کے بارے میں ہیں شاید بابہ ہی کسی اور جاؤں گے بارے میں
 کہتا کہ کتنا کھڑا نہ کھاتے کا۔ برتن کا نوک کھٹے کو ہی شرم آتی ہے۔ کھٹے کے بارے
 میں کہتا کہ کتنا کھٹے کا دھڑکا۔ کھٹے کے بارے میں کہتا کہ کتنا کھٹے کا دھڑکا۔ کھٹے کے بارے میں کہتا کہ کتنا کھٹے کا دھڑکا۔
 کھٹے کی کھٹوں کی ایک کی سیا کر رہی پاتی ہے۔ کھٹے سے جو ہوتا نہ جانتے وہ شیر کا دھڑکا۔
 کھٹے کا کھٹے کا دھڑکا۔ کھٹے کا دھڑکا۔ کھٹے کا دھڑکا۔ کھٹے کا دھڑکا۔ کھٹے کا دھڑکا۔ کھٹے کا دھڑکا۔
 کھٹے کی ہر بھی ام۔ کھٹے کے دھڑکا۔ کھٹے کو پہلی ہی شرم نہیں ہوتا۔ کھٹے کا کھٹا بھی نہیں کا
 صبر والا کھٹا ہے بے مہربانی۔ کھٹے کی یاری نہ کرتا۔ کھٹا ہڈی کا نہیں اپنے چمے جڑے
 کھٹے کا مواد لیتا ہے۔ ہڈے شیر دے یار کھٹے گدڑا کرتے بکھارا۔ کھٹا ہابروں پلیدے اندروں پاک۔
 کھٹے کے کھٹے اور چروکوس ہوا کار کے کھٹے سے دوستی فائدہ پہنچاتی ہے۔ آوارہ کٹوں سے راستہ لینا
 کھٹے کو کھٹے شروع کر دینا چاہئے۔ کھٹے کو دراز نہیں کہتا چاہئے یہ تو مان چاہئے۔ اگر یہ چھٹا کھٹا ہوتا
 کھٹے کا کھٹے میں موتی کو کہتے ہیں۔ چمے کھٹے کھٹے اسے موتی موتی کہتے ہیں تو یہ یہ تو کھٹے نام ہوتا ہوتا
 کھٹے میں کھٹیاں لینے لگتا ہے جبکہ فرق صرف عربی اور ہندی کا ہے۔ اسے شاید ہندو اور ہندی پسند ہے جبکہ
 کھٹے کے اس کے چم لے لے بھجورنے کے لئے کوئی ہڈی ہی نہیں موتی۔ دھماں کھٹا پاپ بھٹے ہیں اور
 کھٹے کھٹا ہوا پاپ بھٹے ہیں اور نہ ہی ہندو دھماں میں اس غریب کا کوئی خاص ذکر اور کار ہے

کھٹے کے اسے اس قابل بھی نہیں گردانا کہ سناپ ہندو ہاتھی کی طرح اس بھی کوئی چھوٹا موٹا دیوتا بنا

حق گھوڑا کیا تھا فیض و غضب میں چمکتی ہوئی عزت کہ کسی کو پٹھے پہ ہاتھ نہ دھرنے دے۔ ادا کے گھوڑوں سے چنگاریاں اور تختوں سے ڈھواں پھوڑتا ہوا یہ بدست جب شہنشاہ فیض کے زور و پھیلے پاؤں پہ غلبہ تو بڑھے فیضوں نے اسے تحسین و تہذیب بھری نگاہوں سے توڑا۔ گو اس کے مضبوط زانوؤں کے ملاحظے میں بڑے بڑے خوبصورت پارہ حق آشتی سرگھوڑے آئے تھے مگر جو طعراق، ٹھنڈی و تھوڑی چھیلے میں نظر آئی وہ پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ شادی اصطبل کا یہ بوخیز مایاب گھوڑا پہلی مرتبہ اکھاڑے میں حصہ کے ملاحظے کے لئے لایا گیا تھا۔ شہنشاہ فیض کا کافی دیر تک اس خوبصورت سرکش جانور کی حرکات میں دلچسپی رہا ایک آدھ بار اپنے معتد خاص اور ولیعہد سکندر کے اتالیق ارسلو کی جانب بھی تحسین طلب نگاہوں سے دیکھا۔ جو بڑے پر وقار اہلباک سے اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔ گھوڑے کی سرستیں طراریاں جب حد سے بدستیں اور اس پہ پورے کھل پڑ گیا تو فیض نے غم دیا۔

”بے کوئی دھواں سرکش و سرست کو قابو کر کے لگام ڈالے۔ اس پر سواری کرے اتنا ہلکا اس کی مستی طراری اس کے سینے پہ پسینے کی شکل میں بہہ نکلے۔“

تین پہلوؤں کے بیچ سے گزرا۔ گھوڑوں کی ڈالنے والی سواروں سے عاجز رہا۔ اس نے اس کے آخری اعلان کردہ کہ جو کوئی بہادر اس منہ زور کے حصہ میں لگام لگائے اور اس پہ سواری کرے وہ حصہ دار اور انعام پائے۔ سلاخوں کے جذال میں جب کوئی ایسا شہسوار دریافت نہ ہوا تو فیضوں کے حکم پر جیت ہوا تو سر سکندر امداد میں اس کے لئے پہلے پہلے شہنشاہ باپ نے بڑے جرات سے ایک نظر اپنے ولیعہد کو دیکھا پھر اچھتی سی نگاہ اس کے استاد ارسلو پہ ڈالی جسے سکندر کی اس جرات سے قطعاً کوئی تہ نہ تھا۔ چند استہباب و انیسان آمیز لمحے وہ سکندر کو گھورتا رہا پھر ترو و طاقت کی کیفیت اس کے چہرے پہ نوید ہوئی اور اگلے لمحے اس نے شاہی حصہ کو بند کرتے ہوئے نرمی سے اذان غوثی کی مرامت فرمایا۔ شہنشاہ باپ کے آگے سر خم کرنے کے بعد وہ اپنے منیم المرتبت سے اس کے زور و سرخم کرتے ہوئے اجازت کا طلب گار ہوا۔ بارگاہ حکمت و دانش سے بھی اسے مرخص ہوا۔ انہی لحظات میں حکمت و سیرافش میں فیضوں کے خاندان ”قیاس گن زکھستان من بہار مراد“ کے رجب و نوال گھوڑوں کے پے کے پے اڑے اور نصف کرہ ارضی پہ کھوپ و اڑا کھائی دیئے گئے۔ بلند بخت، غوث مند اور ارسلو کی حکمت و سیرافش سے مرفراز سکندر نے ہاتھ کے اشارے سے اس کے پہلوؤں کی گرفت سے آزاد کروا دیا۔ گھوڑا آزاد ہوتے ہی اڑا کھٹا پھلا کھٹا ہوا میدان میں اڑا کھٹا

وہ سُچی اُن سُچی کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”کہنے وہ جو کہتا ہے تم صرف اپنے محسوسات پہ دھیان رکھا کرو۔ ہڈیوں کے حوالے سے جو کچھ ابھرتی ہے وہی دائمی ثابت ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو بدبو اور کراہت و کراہ سے ایسا مانوس کر لو کہ اس سے جو وجود احساس ہی تھا اُسے لئے انتہی ہو جائے لڈتے بے سواوی سے۔ محبت عداوت سے اور قوت سے تہہ میل ہو جاتی ہے۔ اور یہ جو تم ہڈیوں کی رت لگائے ہوئے ہو پھر اجمہ و جان کو قائم رکھتے۔ ہڈیاں ہی تو اصل کردار ادا کرتی ہیں۔

اگر چند اُس فور کیا جائے تو سمجھ میں آتا ہے کہ گوشت پوسٹ اور دیگر اعضا تو محض کارکر ہیں۔ جیسے کسی مشین کا پہلے وصال پہ تیار ہوتا ہے پھر اس میں کل پڈز سے جوڑے جاتے ہیں۔ انسانی مشین میں ہڈیوں کا ایسا ہی وصال پہ ہوتا ہے جس کی جگہ اور پڈز کی ہڈیوں کا جگہ ہوتا ہے۔ انسانی یا حیوانی جسم میں بھی ہڈی ایک سی مشین ہوتی۔ نہ ہی وہ وزن و حجم اور لمبائی چوڑائی میں یکساں ہوتی ہیں۔ ہڈیوں کی بلندی و اونچائی یا انگوٹھوں کی ہڈیوں کی بلندی نہ ہوں۔ یہ ہڈیاں ہتھکڑوں اور اقسام کی ہوتی ہیں۔

انگوٹھوں کوئی اصل نہیں اور ہتھکڑی کوئی مانعہ کوئی لٹکی طرح ہے جو ہڈیوں کو یکساں رکھتا ہے۔ ہڈیوں کے ساتھ ساتھ ہڈیوں کی بلندی و اونچائی یا انگوٹھوں کی ہڈیوں کی بلندی نہ ہوں۔ یہ ہڈیاں ہتھکڑوں اور اقسام کی ہوتی ہیں۔ ہڈیوں کے ساتھ ساتھ ہڈیوں کی بلندی و اونچائی یا انگوٹھوں کی ہڈیوں کی بلندی نہ ہوں۔ یہ ہڈیاں ہتھکڑوں اور اقسام کی ہوتی ہیں۔ ہڈیوں کے ساتھ ساتھ ہڈیوں کی بلندی و اونچائی یا انگوٹھوں کی ہڈیوں کی بلندی نہ ہوں۔ یہ ہڈیاں ہتھکڑوں اور اقسام کی ہوتی ہیں۔

انسانی ہڈیوں میں مرد و عورت کے درمیان فرق ہے۔ مرد کے ہڈیوں کی بلندی و اونچائی یا انگوٹھوں کی ہڈیوں کی بلندی نہ ہوں۔ یہ ہڈیاں ہتھکڑوں اور اقسام کی ہوتی ہیں۔ ہڈیوں کے ساتھ ساتھ ہڈیوں کی بلندی و اونچائی یا انگوٹھوں کی ہڈیوں کی بلندی نہ ہوں۔ یہ ہڈیاں ہتھکڑوں اور اقسام کی ہوتی ہیں۔ ہڈیوں کے ساتھ ساتھ ہڈیوں کی بلندی و اونچائی یا انگوٹھوں کی ہڈیوں کی بلندی نہ ہوں۔ یہ ہڈیاں ہتھکڑوں اور اقسام کی ہوتی ہیں۔

ہڈیوں کی بلندی و اونچائی یا انگوٹھوں کی ہڈیوں کی بلندی نہ ہوں۔ یہ ہڈیاں ہتھکڑوں اور اقسام کی ہوتی ہیں۔ ہڈیوں کے ساتھ ساتھ ہڈیوں کی بلندی و اونچائی یا انگوٹھوں کی ہڈیوں کی بلندی نہ ہوں۔ یہ ہڈیاں ہتھکڑوں اور اقسام کی ہوتی ہیں۔ ہڈیوں کے ساتھ ساتھ ہڈیوں کی بلندی و اونچائی یا انگوٹھوں کی ہڈیوں کی بلندی نہ ہوں۔ یہ ہڈیاں ہتھکڑوں اور اقسام کی ہوتی ہیں۔

کے لئے ملازم ایسی مظلوم بڑیاں بھاری معاوضوں پر فراہم کر دیتے ہیں۔ عقلی علوم کے عاملوں کے لئے اپنے وسائل ہوتے ہیں۔ بڑیوں کے علاوہ یہ لوگ انسانی ذہن کا ہر پھل و پھول کو دے کھو دے گئے۔ انہیں ہم کر دیتے ہیں۔ اپنے مذہب و مزاہم کی تکمیل کے لئے جاہل لوگ کیسے کیسے جھکھڑے استعمال کرتے ہیں۔ عقلی حکم کرنے والے ظالم فاسق عامل کون کون سے غیر شرعی اور غیر قانونی اخلاقی کام کرتے ہیں سُن اور سمجھ کر انسان کی روح کا تپ اُٹھتی ہے۔ اپنے دشمن کو زہر کر دے۔ کسی کا کاروبار برباد کر دے۔ رشتوں کی بندش کر دے۔ بھائی یا ہو کر مر جانا۔ کسی کو اپنی محبت میں پھانسا کسی کے بھتیجے کو جکڑ لینا۔ کسی کو کسی نوجوان اور دماغی جوان میں جکڑ کر دینا اور خاص طور پر اولاد کے حصول کے لئے ایسے طریقے اختیار کیئے جاتے ہیں جو عقلی طور پر ناک ہونے کے علاوہ مکر و ہد اور شرم ناک بھی ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے کام بھرپور معاونت اور سہارے کے بغیر نہیں ہو سکتے۔ عاملی حضرات ایسے پتے پتے حکمت کرتے ہیں جو مکمل فول پروف ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد انتظام کے وہ خزانوں لاکھوں روپے شہنی وصول کرتے ہیں۔ ان کے مہلکین کے کارندوں میں سے جو کہ گن گنت ہوتے ہیں۔ عمارت کے پتہ کھار اور دیگر بد قسمی حور میں شامل ہوتی ہیں۔

UrduPhoto.com

لہذا نہ کرے آپ کو کبھی کسی قبرستان شمشان گھاٹ نہ جانے یا کسی دریا کے کنارے راست گزرنے کی بات۔ ان جگہوں پر آنے کی اجازت اور گنج کا تپ نہ لیا کہہ دیتا ہے یہ انسانی مذہب دیکھ نہیں سکتی۔ یہ غیر انسانی ہے۔ جیسے کے لئے چتر کا گھبراہٹ اور ہڈی کی آکھ چاہئے۔ دن کی روشنی میں آپ اگر قبرستان یا شمشان گھاٹ پر گئے تو جیسے کے کہ چاہے چالوروں کی ہڈیاں پڑی ہوں گی اور کہیں کہیں انسانی ہڈی بھی دکھائی دے جاتی ہیں۔ چھوٹے چالور اور انسان کی اکثر ہڈیوں میں بے پناہ مماثلت ہوتی ہے۔ عام آدمی ان کے مابین کے فرق نہیں کر سکتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گئے ہڈی سے گورکن اور کارندے سورج نکلنے سے پہلے ہڈیاں اٹھا کر ان میں سے پھر لیتے ہیں پھر بھی دیکھ اور اور پانی کھری رہ جاتی ہیں۔ یہ وہ ہڈیاں ہوتی ہیں جو راست کے کسی ایک لمحہ سورج نکلنے سے بہت پہلے غرضمندانہ لوگوں نے اپنے غلی عاملوں کی ہدایت کے مطابق نونوں پتوں پر استعمال کی ہوئی ہیں۔ ان میں کئی ہڈیاں ایسی ہوتی ہیں جیسے کہ وہ پہلے ہی کسی نے کسی کے جسم سے جدا کی تھیں۔ یہ کہہ دے سیدھے الی کو یا سیدہ یوں کہیں دلی پڑی نکالی گئی ہو۔ کچھ قبریں گیلی ہوں گی۔ آپ سوچیں کہ کتنی قبریں گیلی ہوں گی۔ نہیں ایسا نہیں ہوا بلکہ یہاں کسی اولاد پرندہ کی طالب عورت نے قبر سواری

کر کے بدستون قسمل کیا ہے۔ کسی معصوم مرد بچے کی لپٹی کی ہڈی ناف کے نیچے رکھی ہوگی۔ الٹی لپٹی
دونوں ماتلیں یوں جیسے گھوڑے پہ بیٹھتے ہوئے لٹکاتے ہیں۔ قبر پہ ننگے قسمل کا انتظام قبرستان کا بہشتی گھر
چوکیدار وغیرہ عامل کی ہدایت کے مطابق کرتے ہیں۔ قسمل کے بعد وہ مزید اولاد کی معتمنی خاتون اٹھائے جاتے
لیئے تھیں کچھ شہدوں کا وظیفہ چڑھتی ہے۔ پھر وہ ہڈی ناف کے نیچے سے لگاتی ہے قبر کے درمیان ٹھہرتے
ناف کی جگہ سے کچھ نیکی ٹھہرج کر اپنی ناف سے قسمل کر کے اپنے سر کے اوپر سے وار کر قبر کی پائنتی کی جاتی ہے۔
چھینک دیتی ہے۔ اس کے بعد فوراً اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ہمیں اس کے مقتدا اوپر چادر ڈال دیتے ہیں۔ بعد
نگی بندھی راو سے اپنی سواری کی جانب بڑھ جاتی ہے..... اس خاتون کا مقصد پورا ہونا ہو لیکن عامل کو
بہشتی چوکیدار پولیس والوں کے علاوہ صاحب قبر چوکیدار کی کرم الہی مرحوم عمر ۸۰ سال کا کچھ نہ کچھ مقصد
ضرور پورا ہوتا ہے۔

[illegible]

جن کا حصول کوئی ایسا مشکل بھی نہیں ہوتا۔ جانوروں کے گھر اور بال جلا کر ان کی راکھ میں کسی پرانے قبر میں
کی مٹی ملا کر کھاد بنائی جاتی ہے۔ اب موقوف ہے کہ کس نوعیت کا اگر وہ تیار کرنا ہے۔ مختلف مقاصد کے
لئے مختلف نچ بھی استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ ارغڑی کے بیج کالی سرسوں، سورج مکھی، شیش، مکئی، سمیر
جوہی، ٹنکسی وغیرہ۔ بڈی کی کھاد میں چنگی بھر چ ڈال کر کسی پرانی قبر کے پاؤں کی جانب گھاس پھول کے
درمیان گاڑ دیتے ہیں۔ کچھ ہڈیاں قبر کے سینے پہ بھی گاڑی جاتی ہیں۔ بڈی کا اوپر والا سر اسٹی کے پیرانے
دیتے ہیں کہ نظر نہ آئے۔ جس مقصد کے اگر وہ چاہتے ہوتا ہے وہ وہاں میں رکھا جاتا ہے۔ کچھ اور بھی
ہیں جو نہ ہر اتے ہیں۔ اگر مقصد صل ہونا ہو تو چند ہی روز میں اس بڈی میں گھاس کے پتے اگنے شروع ہو جاتے
ہیں جو مزید ایک دو روز میں کونپلوں اور ذروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ پھول ذوڑے گھاس وغیرہ سے
لینے جاتے ہیں اور وہ کھاد بھی استعمال میں جاتی ہے۔ یہ سب تو ہیں غلی غلیات میں کثیر المقاصد سمجھا جاتا ہے۔

بہت ہی کم لوگ جانتے ہوں گے کہ عام انسانوں کے علاوہ جانوروں کے قبرستان بھی ہوتے
ہیں۔ خاص طور پہ پورچین مسالک میں جلیں، نکول اور گھوڑوں کے علیحدہ قبرستان تو عام ہیں۔ چین میں
سانڈوں کے قبرستان بھی موجود ہیں۔ اسی طرح کوہ ارماہ کے پہاڑوں میں شمال مشرق کی جانب ایک قلعہ نما جگہ
میں ایک ایسا قبرستان ہے جس میں ہزاروں سال پہلے کے انسانوں کے قبر بھی ہیں۔
"پچیس چیس" ٹی بی وی دیکھی۔ اہی ایہ انسان تھے یا جن؟ یہ انسان ہی تھے۔ ہر فرقہ کے بعد انسان
قد ریں قدرت کے آگے قدم نہیں بڑھاتے۔ انسان پہلے کہا تھا اور اب کیا کہتا ہے
یہ یہ سب قدرت و قدرت کی شہین ہیں۔

سکون حال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں

● بونے یونیرے بابائے

شاید ہی کسی نے یونوں کا قبرستان دیکھا ہو یا اپنی آنکھوں سے کسی اصلی بونے کو دیکھا ہو۔ یہاں
میں بوناہ ہے جو اڑھائی تین فٹ کا جواں سے کچھ کم یا قہرے لایا ہو۔ یہ تو پست قامت انسان ہوتے ہیں۔
کسی بھی وجہ پھونے رو جاتے ہیں جبکہ ان کے بہن بھائی عام قہرے و قامت کے ہوتے ہیں۔ ہم نے چوکیا
بونے دیکھے ہی نہیں اس لئے انہیں ہی بونے سمجھتے ہیں۔ اساطیر قدیم بچوں کی کہانیوں اور والٹ ڈزنی کے

[illegible]

ہوتی ہے تو اس کے ٹھگ بندہ کو بے اور بلی ہی ہوتے ہیں۔ یہ تینوں جانور خوب جانتے ہیں کہ اس نے کتنے
کہاں کہاں ہیں۔ ان کے ان سے راپٹے بھی رہتے ہیں۔ وہ ان کے مرنے جینے میں بھی شریک ہوتے ہیں۔

● مہرولی جنت کی گلی۔۔۔!

دہلی کے قدیمی علاقے مہرولی میں خواجہ قطب اللہ قطب کی چوگٹ چنے سنے پہنچا ہوا تھا۔ اس نے
سے میری ملاقات ایک ڈرویش سے ہوئی۔ درگاہ کے قریب بازار میں ایک پتلی سی گلی کی ٹکڑ پان کی تیسری
سڑے کی دوکان تھی۔ تھیں پان لاکھ اور کھل ہیر کی ٹھکیوں کی بنایا کرتے جبکہ مختلف قسم کے سڑمہ جات۔ جب
ٹھکیوں سے بذات خود تیار کرتے۔ کتا ڈھیر سے نماز ظہر تک رزق حلال کی جستجو میں رہتے بعد اودھو
چوگٹ پہ حاضر ہو جاتے جہاں چاروب کشی اور زائرین کی خدمت فی سبیل اللہ کرتے۔ عشاء اور کھانے
بعد ساکسی تھیں لے کر بیٹھ جاتے۔ معمولی مگر صاف ستھرے کپڑے پہنٹی ہر ریش نورانی ہوتا تھا۔
نور بصورت نظر سے بھری ہوئی آنکھیں خدا کی شان میں جھکتے مگر کبھی حال کوئی مان لیتے کہ یہ جنت
قطعی مہرولی میں ہے۔ یہاں سب کی سب کو ان کی لاکھوں ساراں سے کتبہ لکھی کرتے تھے
قریبیہ مصوبہ مستحکم ہڈ لکھی خوش الحانی ان کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ واضح محسوس ہوتا تھا کہ
نے انہیں ظاہری پائلی پہنٹی رہیں سے خوب نواز رکھا ہے۔ جانوروں یا بیویاں کی خدمت و اپنے لیے کتبہ
نہیں رہتے تھے اور نہ ہی ان کی توجہ کتبہ کے لیے تھی بلکہ ان کے پاس پائی جاتی تھی۔ وہ اپنے
ظاہری چٹائی کے بچے نہیں تھے۔ پیسے پرانے کپڑوں پر اپنی مشقی سے لکھی لکھتے کہ کوئی رونا کرے
گا۔ اپنی دوکان کی ستانی سترونی لپی پوتی گلی بازار میں آنا جانا لکھ رہتا مگر کیا مجال کہیں قدم غلط نہ
ایک ایک دوکاندار سے ملےک ہو رہی ہے۔ باپ کی جگہ بیٹا بیٹھا ہے تو پوچھ رہے ہیں۔

”اے غمخوار! آبا کہاں ہے آج انصیب دشمنان طبیعت تو لکھک ہے نا اُس کی؟“

سے الجھ رہے ہیں۔ ”اب کن کے سروے لیا بھڑوس پتا کتہ رہا ہے۔“ جھینک اسے دوسری کے
انھار۔ ”یا پھر درگاہ کے پتہ کے پٹے ہوئے دوسرے ہی زائر کو آواز دے رہے ہیں۔“

”بیٹا! جوتے سستی مڑ جتے آؤ۔ دوسرے پہلے پائیں ان کے نیچے ہی آہرو چھینگو۔“

حد تو یہ کہ کھانا تناول کرتے ہوئے کیا مجال جو رکابی چال ٹولیں یا کہیں چٹائی لگاتے ہوئے
کلہر گھاس لڑھکا دیا ہو۔ درگاہ کی راہداری یا گلی کی ٹکڑ پان سے لکڑے ہوں یا نماز کے لئے کھڑے

”سب تو محض اٹکل لاکھ کی تسبیح، مگر اس کا چھوڑ سوا ہارو کروڑ سے بھی اوپر کا ہے۔ امام کے سامنے مانگی بنا کرو گھوڑ زیارت ہو جائے گی اگر خوب پینا کا امر ملے تو۔“

عجب بے ڈھنگے منکوں والی ادھنی مول کی تسبیح میری پھیلی پہاڑی تھی اور میں اس سوچ میں تھا کہ جواب دوں؟ سنتوں کے اماموں میں خانہ کعبہ اور گنبد خضرا کی زیارتیں تو بچپن سے کرتا چلا آ رہا تھا میں نے ان کی زیارت کی تو مانے کر یہاں پہنچا تھا۔ معاہدہ ٹھیک اور میری پھیلی پہاڑی تسبیح پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہتے تھے۔ ”میاں بھائی! صبح صبح میری بوٹی کا وقت ہے۔ خیر نصیب نیک ہو تو ہدیہ ہلکا کیجئے۔“

میں نے تسبیح پر گرفت کرتے ہوئے کہا۔

”حضرت! آپ نے لاکھ کی تسبیح ہے۔ دو چار سو کی بات ہوگی تو حاضر کرو جتنا پکا ایک لاکھ کیسے سے لاف؟“

میرے ہاتھ پرست اپنا منہک سا ہاتھ بتاتے ہوئے فرمانے لگے۔

”تسبیحیں ہاں ہی دہتی ہیں لے جائیں۔ اللہ آپ کے کارنامے بھی بدستور کرے اور ہمارے۔“

تسبیح لے کر میں نے کچھ عرض کرنا چاہا مگر انہوں نے سر سے کی ایک شمشادی اور لہجہ سناتے ہوئے فرمایا۔

”یہ سے لپٹی گفتگو کا نہیں ہے۔ یہ تو ذرا دلچسپ ہے۔ ان آنکھوں کو زیارت ہوئی ہے۔ جو میرے آقا دو جہاں اور میرے خوجہ قلب الاقطاب کی سنت سر سے اپنی آنکھوں کو نہ جھکے۔“

اب میری آنکھوں میں اپنی من موہتی ہی آنکھیں ڈال کر انکشاف فرمایا۔

”میاں بھائی! اس خاکسار کے چار کروڑ سر سے میں خاک ہو رہا اور خوب کی گھٹیوں کی اصول بھی بتاتی ہے۔ چہ ذرا دیکھئے ہوئے اپنی آنکھوں کے کھول کھولتے ہوئے کہا۔

”میرے ان لچھوئے دیدوں کا تو قصویٰ سر سے سے ہوتا ہے۔“

میں ان کی باتوں کے نور سے جھلک سا گیا۔ دل اور دماغ جیسے سُن سے ہو کر رو گئے تھے۔ تو مجھ میں جرات گفتار تھی اور نہ ہی وہاں کھڑے ہونے کی بہت وسہار۔ تسبیح کھنٹی میں وہاں سے میں نے گاہ کی جانب چل دیا۔ جبکہ میرا پروگرام سارا دن یہیں درگاہ پہ چڑے رہنے کا تھا۔

میری کمر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگے۔

”بہت ساری کالی ریتیاں آنکھوں میں بیٹھیں گی۔ گھبراؤ نہیں ابھی تو ابتدائے عشق ہے صحت

ہے میاں آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا؟“

قاریمن! یاد رہے ابھی تک مجھ پہ یہ حقیقت ٹھکی نہیں تھی کہ میاں جی کی آنکھیں کوری ہیں۔

خوبصورت بڑی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ اچھا اس وقت ہوا جب انہوں نے مجھے ہٹکے سے

ہوئے فرمایا۔

”حضرت! اس جگہ آپ کا بیٹھنا کچھ مناسب نہیں۔ اللہ کی مخلوق کو خواہ مخواہ تکلیف ہوگی

کچھ خاطر خواہ آسودگی بھی حاصل نہیں ہوگی۔ آئیے میں آپ کو اس جگہ بٹھاتا ہوں جہاں خواہ

پاؤں آنا دکر رکھتے تھے۔“

لیجان اللہ! کہنا ہوا میں اٹھا اور دو میٹر ابا تھوڑے ہوئے اسی احاطہ کے ایک کونے میں

ایکہ جگہ پر بیٹھ گیا۔ ہاتھ کندہ باؤ سے بٹھاتے ہوئے کہا۔

”میاں! ابھی لپٹنے اور اپنا فضل جاری رکھنے کے بعد حاضر ہو جائی گا۔“

UrduPhoto.com

میں نے اس کے آگے دیکھا اور وہاں ایک چاروں طرف سے لپٹنے والی ہوا تھی۔

برآمدے کا رخ دیکھتے ہوئے ریمیں کے حصار کی جانب گھٹیں اوجھل ہو گئے تھے۔

پہلی جگہ پہنچے تھے، رولتے ہوئے ایسا کھمبہ میرے ذہن میں میاں جی کے الفاظ گونگے۔

”اس جگہ آپ کا بیٹھنا کچھ مناسب نہیں۔ اللہ کی مخلوق کو خواہ مخواہ تکلیف ہوگی اور آپ کو کچھ نہ خاطر خواہ

حاصل نہ ہوگی۔“ میں نے اسی درخت والی کجائی جانب دیکھا جدھر سے مجھے اٹھنے کا مشورہ دیا تھا۔

جگہ مجھے بڑی ہنسنا آسودہ اور مزار شریف سے کافی نزدیک نظر آئی۔ قدرتی درخت کا تنہا

سی باہر نکلی ہوئی جڑیں بڑا دلکش اور دیو مالائی سامانوں پر پیش کردہ تھیں اور یہ موجودہ جگہ

کافی ہلک تھی اور اسے بڑی میاں اور اس کی کیفیت لینے ہوئے تھی۔ حکم دیا کہ

ہیچر کیا لیکن میری اولیٰ ابھی تک اصرار تھا کہ اچانک مجھے یاد آیا کہ ابھی تک میں نے

آنکھ سے آنکھ نہیں ملائی جس کے پارے میں میاں صاحب نے بتایا تھا کہ اس کے اندر

دوسرے حصے ہی میں نے بائیں بند کر کے اس میں آنکھ سے لہم کے سوراخ پہ نکال دی مگر سوراخ

کچھ نخرہ یاد آت پت بھی لہ حاصل ثابت ہوئی۔ الہی! زیارتیں کہاں گئیں؟ سوراخ کے

دوسرے ایک ٹرانسپیرنٹ تصویر ہوتی ہے۔ آنکھ کی پٹی کے قریب رکھ کر اگر سوراخ کے اندر

سے کھل جاتا ہے۔ امام کے سوراخ میں عدد سوار پیچھے تصویر بھی تھی مگر آدھا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ادھر سے دو لڑکیاں آگ اور دھندلے میں پھنس گیا۔ میرے پیچھے کچھ بیٹ کرانگ درپچوں والی دیواری تھی جس کے ساتھ ساتھ دو راہداری تھی جس سے گزر کر زائرین حجاز شریف تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ چونکہ عورتوں کو ہتھکڑیاں پہنانے کی ضرورت نہیں اس لئے عورتیں اور بچوں والی دیواری کے اس طرف کھڑی ہو کر حجاز شریف کی طرف جاتے ہیں۔ یہاں درپچوں سے لگ کر دوڑنا نہیں مہاجات آواز دہرائی کرتی رہتی ہیں۔ میں نے ہانکا سا دھڑکا دیا اور وہاں کھڑی ہو گئی تھی۔ ان سے بھی دھیان ہٹانے کی کوشش اور حاصل کی۔ میں نے جیسے کوئی شیریں مقال عورت مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پہلو بدلتے ہوئے گردن پھرنے لگی۔ دیکھا کہ میرے سینے پیچھے درپچوں سے لگی گھونگھٹ گرائے کوئی خاتون مجھ سے مخاطب تھی۔

”کھانہ کے پیارے خواجہ کے دل کو دلوں سے لگا کر دلوں کو دیر لگتا ہوا دیکھنا مجھے مل جائے۔“ وہ دھڑکا دیا۔

”سب سے سبکیاں بھر دینی تھی۔“
میں نے کچھ بات کہنے بغیر زما کے لئے اپنے ہاتھ اٹھالئے۔ وہ عورت اب شاید مجھ سے مل چکی ہو۔ وہ میری طرف تھک چکی ہوگی۔ ابھی اس صورت حال سے سننے نہیں پایا تھا کہ پیچھے سے مزید دو لڑکیاں آگ اور دھندلے میں پھنس گیا۔ امام کے سوراخ میں عدد سوار پیچھے تصویر بھی تھی مگر آدھا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ادھر سے دو لڑکیاں آگ اور دھندلے میں پھنس گیا۔ میرے پیچھے کچھ بیٹ کرانگ درپچوں والی دیواری تھی جس کے ساتھ ساتھ دو راہداری تھی جس سے گزر کر زائرین حجاز شریف تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ چونکہ عورتوں کو ہتھکڑیاں پہنانے کی ضرورت نہیں اس لئے عورتیں اور بچوں والی دیواری کے اس طرف کھڑی ہو کر حجاز شریف کی طرف جاتے ہیں۔ یہاں درپچوں سے لگ کر دوڑنا نہیں مہاجات آواز دہرائی کرتی رہتی ہیں۔ میں نے ہانکا سا دھڑکا دیا اور وہاں کھڑی ہو گئی تھی۔ ان سے بھی دھیان ہٹانے کی کوشش اور حاصل کی۔ میں نے جیسے کوئی شیریں مقال عورت مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پہلو بدلتے ہوئے گردن پھرنے لگی۔ دیکھا کہ میرے سینے پیچھے درپچوں سے لگی گھونگھٹ گرائے کوئی خاتون مجھ سے مخاطب تھی۔

”کھانہ کے پیارے خواجہ کے دل کو دلوں سے لگا کر دلوں کو دیر لگتا ہوا دیکھنا مجھے مل جائے۔“ وہ دھڑکا دیا۔
”سب سے سبکیاں بھر دینی تھی۔“
میں نے کچھ بات کہنے بغیر زما کے لئے اپنے ہاتھ اٹھالئے۔ وہ عورت اب شاید مجھ سے مل چکی ہو۔ وہ میری طرف تھک چکی ہوگی۔ ابھی اس صورت حال سے سننے نہیں پایا تھا کہ پیچھے سے مزید دو لڑکیاں آگ اور دھندلے میں پھنس گیا۔ امام کے سوراخ میں عدد سوار پیچھے تصویر بھی تھی مگر آدھا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ادھر سے دو لڑکیاں آگ اور دھندلے میں پھنس گیا۔ میرے پیچھے کچھ بیٹ کرانگ درپچوں والی دیواری تھی جس کے ساتھ ساتھ دو راہداری تھی جس سے گزر کر زائرین حجاز شریف تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ چونکہ عورتوں کو ہتھکڑیاں پہنانے کی ضرورت نہیں اس لئے عورتیں اور بچوں والی دیواری کے اس طرف کھڑی ہو کر حجاز شریف کی طرف جاتے ہیں۔ یہاں درپچوں سے لگ کر دوڑنا نہیں مہاجات آواز دہرائی کرتی رہتی ہیں۔ میں نے ہانکا سا دھڑکا دیا اور وہاں کھڑی ہو گئی تھی۔ ان سے بھی دھیان ہٹانے کی کوشش اور حاصل کی۔ میں نے جیسے کوئی شیریں مقال عورت مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پہلو بدلتے ہوئے گردن پھرنے لگی۔ دیکھا کہ میرے سینے پیچھے درپچوں سے لگی گھونگھٹ گرائے کوئی خاتون مجھ سے مخاطب تھی۔

”کھانہ کے پیارے خواجہ کے دل کو دلوں سے لگا کر دلوں کو دیر لگتا ہوا دیکھنا مجھے مل جائے۔“ وہ دھڑکا دیا۔
”سب سے سبکیاں بھر دینی تھی۔“
میں نے کچھ بات کہنے بغیر زما کے لئے اپنے ہاتھ اٹھالئے۔ وہ عورت اب شاید مجھ سے مل چکی ہو۔ وہ میری طرف تھک چکی ہوگی۔ ابھی اس صورت حال سے سننے نہیں پایا تھا کہ پیچھے سے مزید دو لڑکیاں آگ اور دھندلے میں پھنس گیا۔ امام کے سوراخ میں عدد سوار پیچھے تصویر بھی تھی مگر آدھا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ادھر سے دو لڑکیاں آگ اور دھندلے میں پھنس گیا۔ میرے پیچھے کچھ بیٹ کرانگ درپچوں والی دیواری تھی جس کے ساتھ ساتھ دو راہداری تھی جس سے گزر کر زائرین حجاز شریف تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ چونکہ عورتوں کو ہتھکڑیاں پہنانے کی ضرورت نہیں اس لئے عورتیں اور بچوں والی دیواری کے اس طرف کھڑی ہو کر حجاز شریف کی طرف جاتے ہیں۔ یہاں درپچوں سے لگ کر دوڑنا نہیں مہاجات آواز دہرائی کرتی رہتی ہیں۔ میں نے ہانکا سا دھڑکا دیا اور وہاں کھڑی ہو گئی تھی۔ ان سے بھی دھیان ہٹانے کی کوشش اور حاصل کی۔ میں نے جیسے کوئی شیریں مقال عورت مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پہلو بدلتے ہوئے گردن پھرنے لگی۔ دیکھا کہ میرے سینے پیچھے درپچوں سے لگی گھونگھٹ گرائے کوئی خاتون مجھ سے مخاطب تھی۔

”نصیبوں والے ہو۔ ہر کسی کو یہاں بیٹھنے کا شرف حاصل نہیں ہوتا۔“

”اب میں کیا کہتا۔۔۔۔۔ میں ابھی جی کہتا رہ گیا۔۔۔۔۔ آخر کچھ نہ۔“

”میاں جی! کیا اس دیوار کے پیچھے خواتین اسی طرح آدھ بٹا کرتی رہتی ہیں اور ادھر بیٹھے خوش نصیب کو ڈعا کے لئے منتخب کر لیتی ہیں؟“

وہ میری بات میں غصی ہوئی شکایت سے مزہ لیتے ہوئے مسکرائے پھر فرمایا۔

”معلوم ہوتا ہے کچھ دبیوں نے آپ کو خوب تنگ کیا ہے۔ پیارے میاں! جدھر آپ جیلے

مقام ہی ایسا ہے کہ ہر جائزہ مستجاب ہوتی ہے۔ لیکن یہاں بیٹھنے کی توفیق ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ پہلے براہمان تھے وہاں تو کسی کو بھی بیٹھنے یا کھڑے ہونے کی جرات نہیں ہوتی۔“

”وہ کیوں۔۔۔؟“

”فی الحال تو چائے پیچ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔۔۔ اس بارے میں پھر بھی بات ہوگی۔“

میں نے چائے کے بعد وہ پھر کہیں نائب ہو گئے۔ مغرب کی 12 ان سے کچھ پہلے۔

آئے۔ نماز کے بعد انتہائی عاجزی سے کہنے لگے۔

UrduPhoto.com

فرمائیں۔ پھر بیٹھیں گے اور خوب باتیں کریں گے۔ ”وہ مجھے ساتھ لیتے ہوئے اور گاؤں سے

جیل لے کر آئے ہیں۔ یہاں بھی ایک چھوٹا سا سرائی تھا۔ کہنے لگے۔

”یہاں ایک تھوڑے بچے تھے جن میں میری ان سے بھی خاصی دلدادہ ہے۔“

اور ساتھ شریف بھی۔ اور ہاں اپنے لئے بچہ۔۔۔“

پہلے ان کی کون سی ساری باتیں پہلے پڑتی تھیں جو یہ بھی پڑتی۔ اسی سرائے کے دو چار بچے

اور ایک چان سے تڑپے پچھے بیٹھا تھا۔ ایک مدقوق سے لوندے لے ایک بلا سے تسلی

تنگ چاہتے اور بکری پنکھی والی اچار اور کٹے ہوئے پیاز اور کھانے والے۔ اس معمولی

لے اپنی جگہ دعوت شیراز سا حودہ یا کھانڈیاں چاٹ چاٹ کر کھایا۔ فرمایا۔

”کھانا تو کھانا ہی ہوتا ہے معمولی ہو یا اعلیٰ۔ اصل برکت دلالت و صبر سے ہر لمحہ یہ

ہوئے ہوتی ہے۔“

موقعہ پاتے ہی میں نے صبر اپنی بات لے لی۔

”میاں جی! آپ نے سچ کے بارے میں فرمایا تھا زیارت ہوگی مگر مجھے تو کچھ بھی

ہی ازلی ہی مسکراہٹ اُن کے چہرے پہ کھلی دھوپ کی مانند پھیل گئی جو کسی معصوم بچے کے گلہز سے پہ
کے شہرت پکڑے جانے پہ کھل اٹھتی ہے۔ قدرے ہچکچاہٹ سے فرمایا۔

”میں اب بھائی! دب سے تسلی لی ہے کتنی بار اس پہ درود شریف کا ورد کیا ہے اور کتنے صبح و شام
تلاوتِ قرآن کیا ہے؟“

میں تھل ہو کر بغلیں جھانکنے لگا۔ مجھے خاموشی اور خالی پا کر خود ہی بتانے لگا۔

”سینک کے شیشے خواہ کیسے بھی طاقتور اور قیمتی ہوں اگر دُھند نے اور گندے ہوں گے تو کچھ بھی واضح
نہیں رہے گا جیسے شیشہ لائٹیں کا ہو سینک یا مزد کیلئے والا پہلے ارا کا غذا یا کپڑے سے جھاڑا پونچھا جاتا ہے
پھر اس کی گڑھی نمی دکھلا کر صاف کیا جاتا ہے اور آخر خشک کپڑے سے اسے خوب آب دی جاتی ہے کہ
سورج پھٹش پھٹش کرنے لگے اس کے بعد مزہ دید کی نگار کی اور روشنی حاصل کرنے کا آتا ہے۔ پہلے اچھی
میں سے زیادہ سے تو صاف کر لو۔ ایسے کاموں میں آتا دل اچھی نہیں ہوتی۔“

میں دم سدا رہے اُن کی گہرا فاشی سے مفلوج ہو رہا تھا وہ ارا کی ارا کے تو میں نے پھر سر سے اور
میں نے تکیہ کا سدا ارا اور میں دین طاری کیفیت ارا کی تو میں نے تکیہ کا سدا ارا فرمایا۔

UrduPhoto.com

میں نے جواب دیا۔ ”ہاں ماشاء اللہ پہلے سے بھی خوب دکھائی اسے رہا ہے۔“

ماشاء اللہ ماشاء اللہ کہتے ہوئے میری آنکھوں پہ ہاتھ پھیرا۔

”اب دیکھو امام میں کچھ دکھائی دے رہا ہے؟“

میں نے جھٹ امام پہ آنکھ لٹائی۔ فور سے دیکھا کچھ تھا ضرور مگر واضح اور صاف نہیں تھا۔ وہ
سیر کرنے لگا۔

”صاف نہیں دُھندلا دُھندلا سا دکھائی پا رہا ہے۔ اچھا کچھ دنوں تک صاف دیکھنے لگو گے۔“

میں نے سر ہلاتے سے آنکھوں کے پرست کھلے۔ مجھے دیکھو میں تو بالکل ہی اندھا ہو گیا۔ صرف ایک ایک
دھندلا دُھندلا اور یہ وہ دھندلا نہیں آتی۔ لیکن سر سدا ارا بھی نہ چھو نہ تھو بھی کبھی نہ چھو رہا۔“

یہ پہلا موقع تھا کہ مجھ پہ یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ میں اب نہ جانتا تھا کہ ان کی کسی حرکت

سے مجھے کیا لگے کسی کو بھی کبھی احساس نہیں ہوا ہو گا کہ وہ ان چپکے بولتے ہوئے خواہشات و دیدوں سے
کچھ سمجھتے۔ میں بکا بکا ان کے اس مذاق سے لطف اندوز ہونے کی کوئی راہ تلاش کر رہا تھا۔ وہ پوچھنے

”خوشوں کی مانند کیوں دیکھ رہے ہو کبھی کوئی اندھا نہیں دیکھا؟“

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”آپ جیسا نہیں دیکھا۔“

وہ اٹھے میرے شانے پہ ہاتھ رکھ کر کہنے لگے۔

”مجھے بھی آپ جیسا کوئی نہیں ملا نہیں چلتا ہوں، عشاء کی نماز میں کہیں اور پڑھتا ہوں۔ آپ کیا

شغل میں رہیں انشاء اللہ کل صبح مسجد میں ملاقات ہوگی۔ اور ہاں رات سونے سے پہلے سر مد لگا نا نہ بھرتے اور صبح کا بھی خیال رہے۔“

وہ مجھے مدانی میں تسلی کی مانند روک کر جا چکے تھے۔ کافی دیر تک میں اپنے آپ میں گم غم رہا۔

سوچتا رہا کیا کوئی بن آنکھوں سب کچھ دیکھنے پہ قادر ہو سکتا ہے اور کیا صرف آنکھوں سے ہی دیکھا ہو سکتا ہے یا جسم و وجود کے دیگر اعضاء بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یا پھر کوئی بالکل آندھا؟۔۔۔ جب کوئی جسم

سمجھ میں نہ آتا اور سر میں ٹیسس چکنے لگیں تو وہ اس سے اٹھ لیا۔ درگاہ سے نکل رہا تھا کہ میری طرف سے کچھ

دیکھنے والوں نے مجھے میاں جی کے پاس یہ کہہ کر بھیجا تھا کہ ایک آنکھ میں خواجہ قلیب اللہ علیہ السلام

میں خواجہ گنج شہر کو دیکھ چکے ہیں اور میں اسی وقت دیکھ رہا ہوں۔ اس کی مثال دیکھو۔

”خدا ارم علیکم۔“ قبل اجازت ہو تو ایک وہ باتیں صوفی تسلیم میاں کے بارے میں کہ بات نہ ہو

دہلی کے بزرگوں پروردگار کو چاہا تب مجھ نے دیکھا کہ درگاہ ایک بار شروع ہو جائے گا۔

پھر والی شکل ہو جاتی ہے۔ مگر یہ شاید کسی اور قبیل کے بزرگ تھے۔ چہ و شریف ہی کچھ نہیں تھا کہ دیکھنے

دیکھنے والا اپنا سامنے کر رہا جاتا۔ پہلے تو وہ مجھے ٹھہرتے رہے پھر بڑی تکی سے ہارل خواست رہے۔

”کسی کے بارے میں کوئی سنا کچھ جان سکتا ہے لیکن صوفی تسلیم میاں کے بارے میں کچھ نہ جانتا

میں ہی سہا تھی ہے۔ ویسے میں تم کو ان کے بارے میں قبول اساتذہ چکا ہوا ہوں اب فرمائیے آپ اس پر

چاہتے ہو؟“

میں ان کے فلسفیانہ انداز تکلم سے ہلک سا گیا۔ سوچنے لگا واقعی یہ دہلی والے باتوں کے کاہل

ہیں۔ باتوں میں ایسی ایسی گھمٹیں بیٹھتی ہیں کہ متقابل ہزاری سے اتر جاتا ہے۔ حرفوں، لفظوں کے تحت

مینا کی اڑانا بھی انہیں خوب آتا ہے۔ میں نے غلط انداز میں عرض کی۔

”میاں جی کے بارے میں معلوم ہوا کہ بیٹا ہیں مگر اس کے باوجود وہ سب کچھ دیکھتے ہیں یہ عجیب

”آپ نے یہ بھی فرمایا تھا اُن کی ایک آنکھ میں خواجہ قطب الاقطاب اور دوسری آنکھ میں خواجہ شیخ شکر جتے ہیں لیکن مجھے تو ابھی تک کچھ دکھائی نہیں دیا۔“

”کسمساتے ہوئے بولے۔ ”میاں ابدال میدانی پر موجود ہوتا ہے مگر ہر اک کو دکھائی نہیں دیتا۔ اس کو خاص دیکھنے کے لئے دستور وید اور سماعت سعید ضروری ہوتے ہیں۔ ممکن ہے تمہارے ہاں ایسی کچھ کمی ہو۔“

”مگر وہ تو خروار دیارت رہے باقی رہی نا بجا ہونے کی بات تو بھلا یہ کیا لیا تو؟“

”جس نے یہ حشرات الارض ایسے ہیں جن کے کان آکھیں سرے سے ہی نہیں ہوتے لیکن وہ دوسرے کھلیے۔ لوں سے کہیں زیادہ سننے دیکھنے کا ادراک رکھتے ہیں تو کیا تسلیم میاں! ان سے بھی گئے گزرے۔“

”مگر کچھ میں آیا؟“

”تاکہ سن کر وہ ایسے غم خیز اور بے نیاز ہوتے جیسے میں اُن کے سامنے ایک انسان نہیں کوئی بیکار۔“

”زیادہ کر پھر یہ مناسب نہ سمجھتے ہوئے میں ادھر سے کھسک لیا۔“

عراق کی کھاز کے بعد میں ادھر ادھر گلیوں کو چوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ جب جی بھلا رہا تو مجھ کا

”UrduPhoto.com“

”جس نے یہ حشرات الارض ایسے ہیں جن کے کان آکھیں سرے سے ہی نہیں ہوتے لیکن وہ دوسرے کھلیے۔ لوں سے کہیں زیادہ سننے دیکھنے کا ادراک رکھتے ہیں تو کیا تسلیم میاں! ان سے بھی گئے گزرے۔“

”میں اپنی بوجھ میں پتہ نہیں کہاں سے کہیں نکل آیا تھا۔ گور کی ندی سے نکل کر بڑے گلی تھی۔“

”جس نے یہ حشرات الارض ایسے ہیں جن کے کان آکھیں سرے سے ہی نہیں ہوتے لیکن وہ دوسرے کھلیے۔ لوں سے کہیں زیادہ سننے دیکھنے کا ادراک رکھتے ہیں تو کیا تسلیم میاں! ان سے بھی گئے گزرے۔“

”جس نے یہ حشرات الارض ایسے ہیں جن کے کان آکھیں سرے سے ہی نہیں ہوتے لیکن وہ دوسرے کھلیے۔ لوں سے کہیں زیادہ سننے دیکھنے کا ادراک رکھتے ہیں تو کیا تسلیم میاں! ان سے بھی گئے گزرے۔“

”نچھوڑتے وہیں چھوڑ آئے ہو یا پاؤں کے سنگ نکل آئے؟“

”میں نے یونہی جواب لگا دیا۔“

”شکر ہے بھائی پاؤں نکل آئے۔ ہوتے بہت پر پاؤں تو وہی ہوتے ہیں۔“

”جواب سن کر ہنسنے لگا۔ میرا ہاتھ تھا ہے بولا۔“

”آؤ امیرے سنگ میں تمہارے پاؤں دھلا دیتا ہوں۔“

وہ مجھے قریب قریب گھسیٹتے ہوئے پاس ہی ایک بازے میں نکل آیا۔ یہاں مویشیوں کے پانی کو ایک پختہ ماند تھیڑے سے جو پڑے کے آگڑے میں لٹی لائیں بھی چمک رہی تھی۔ وہ مجھے ایک پتھر پہ کھڑا کرتے میرے پاؤں دھلانے لگا۔

”ادھر کدھر آئے تھے بھیا؟ ابھی دھکت ہو۔۔۔ ادھر کے ہوتے تو جانت ہوتے کہ یہ راجہ سدا جناوروں کا ہے منٹوں کا نہیں۔ اب یہیں رکو میں تمہارے نوٹے کچھ کھاتے سے لگوا دیتا ہوں۔“ میں نے اس کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔

”بھگے مانس! اب مجھے ان چیلوں کی ضرورت نہیں اور نہ ہی وہ اب پہننے کے لائق رہے ہوں۔ تم صرف مجھے درگاہ شریف کی جانب کسی محفوظ راستے پر لے جاؤ۔“

میری بات سن کر وہ اندھی سی لائیں اٹھلا یا امیر سے آگے آگے چلتے ہوئے کہنے لگا۔

”بھیا درگاہ شریف کے کسی محفوظ راستے پہ تو تسلیم میاں ہی ڈالیں گے۔ میں تو کھنگلی گئی تھی۔ راستہ بھی سکتا ہوں۔“

UrduPhoto.com

”تم سو فی تسلیم میاں کو جانتے ہو۔“

وہ مجھے اس طرح اعلان دیکر پرچھے لگا۔

”اس میں حیرانی کی کیا بات ہے بھیا! تسلیم میاں تو منٹوں کی زبان کے جناورے تھیں وہ تو سب جانتے ہیں۔“

”منٹوں! جناورے تھیں اور بوئیر وہ سب جانتے ہیں! انہیں نے تو یہ سب دھراتے ہوئے پرچھا۔“

”یہ بوئیر کیا ہوتے ہیں۔۔۔؟“

لائیں میرے چہرے کے قریب لا کر وہ چند لمحوں کے لیے مجھے گھورنا رہا۔

”تم نہیں جانتے کہ بوئیر کون آتے ہیں؟“

میں نے اسی استعجاب میں لٹی میں سر ہلا دیا۔ اس نے بھی آنکھیں جھپکے بغیر جواب دیا۔

”بوئیر سے مجھے کوئی بہت ہی چھوٹے انسان نما مخلوق ہوتے ہیں اگر تم نے انہیں دیکھا ہو تو ان کے بارے میں سنا تو ہو گا؟“

میں نے حوصلوں کی طرح اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”چھوٹے بچوں کی قدامت کے انسان تو اکثر دیکھتے ہیں لیکن جیسے تم بتا رہے ہو ایسوں سے بھی میرا
 سہارا ہے۔ انہیں تو بونے کہتے ہیں۔“

”تم تسلیم میاں سے کبھی ملے ہو؟“

”ہاں کل بھی ملاقات ہوئی تھی اور آج عصر مغرب کی نماز بھی ہم نے اکٹھے ہی ادا کی۔ عشاء کی نماز
 میں انہوں نے کہا کہ کہیں اور پڑھتے ہیں۔“

”ہاں عشاء کی نماز وہ بونیروں کی مسجد میں ادا کرتے ہیں۔ بلکہ وہاں امامت کرتے ہیں۔“
 بے صبروں کی طرح میں نے صہمت پوچھا۔

”کہا سکتے ہو وہ مسجد کدھر ہے؟“

”وہ کوئی گنبد و میناروں والی مسجد نہیں۔ قطب بنی کی بڑی باؤلی کے نیچے اتری ہوئی کسی کھوٹے
 مکان میں ہے۔ جانتے تو کیا ہم بھی ناہیں پرستا ہے کہ میاں جی عشاء کی نماز وہیں پڑھاتے ہیں۔“

”کھائی تو انہیں دیتا نہیں۔ وہ رات کے اندھیرے مندر میرے میں ایسی مسلمانوں کے ساتھ جگہ پر
 بیٹھے ہوتے ہوں گے؟“ میں نے غور سے سوچا۔ ”میرے دوستوں نے کہا ہے کہ وہاں پڑھتے ہوئے
 کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا۔“

”وہی اجازت بھی یا خدا جانتا ہے۔ چلو میں تمہیں راہ دکھاؤں۔“

رات اک راہ تو اس سے مجھے نہ کوالی تھی۔ کہیں بدل بدل کر میرے جسم کی چوبیس مل گئیں۔ کہیں پل، وہ پل جو آٹھ
 سو سال پہلے عرب منظر آنکھوں کے سامنے ابھرتے ہوئے رہے۔ پاتال میں اتری ہوئی نہ اسرار
 کے گہرے گہرے اندھے کنوئیں۔ گھپ اندھیری نمایاں غاریں نیلے گہرے سمندر پہ نہیں کیا کیا
 کئی بار ایسا بھی لگا جیسے میں غلطی سے یوں کی کسی ہستی میں جا گھسا ہوں اور ان کے قلوب میں آ
 گیا۔ ایسا بھی محسوس ہوا کہ میں ایک صوفی چاند قلعہ ہوں اور وہ دونوں کی مانند نئے نئے یوں کی فوج
 کے سربراہ ہیں۔ چاند شب خون مار رہا ہے۔ میرا گھبراہٹ ان کی نگاہ کی زد میں ہے۔ میرے کانوں کا گھبراہٹ
 کے دروازے تو کدھر میرے دل و دماغ تک پہنچ رہے ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک دوسرے
 پہ پیٹ پہ چڑھ آیا ہے میری ناف میں تھنڈا گاڑ کر شاہی نگارچی نگارہ پیٹ پیٹ پڑے بلند آہنگ سے
 چڑھ چکی کا اعلان کر رہا ہے۔

اس وقت قطعی مسجد میں فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

"خیال و خواب" یہ الفاظ بھی بڑے سحر آگیز ہوتے ہیں محض زبان سے ڈہرائے سے بھی کہہ دیتے ہیں اور جو ان کی کیفیات میں مست رہتا ہو اس کی زندگی کا کیا عالم ہوگا؟ خیال کی طرح وہ روپ بھارتے ہیں جبکہ خواب بھی مختلف نوع انگ کے خیالات کو جنم دیتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی یہ دونوں آپس میں گڈمڈ ہوتے ہیں کہ یہ خواب تو اس کی طرح خیال خواہ سے بن جاتے ہیں۔ میں بھی آخر شب خیال اپنی سنگتی آنکھوں میں مینہ کے چند پتوں کو تلاش کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا جو میرے بیدار ہونے سے کہیں ادھر ادھر روپوش ہو گئے تھے۔

صوفی تسلیم میاں سے ملنے کی تاہم نہ دعوتی تو شاید میں فجر کی نماز اپنے ہوٹل کے کمرے میں ہی لیتا۔ کئی مینہ کے ادبار نے مجھے خاصا مشکل سا کر دیا ہوا تھا پھر بھی کسی مسجد کی طور میں مسجد تک پہنچ ہی گیا۔ پہلی صف میں دکھائی دیے جبکہ مجھے جگہ دوسری صف میں ملی۔ نماز کے بعد امام صاحب سے معذرت والوں کی لائن تک پہنچی مگر میں اپنے امام کے روبرو جا کھڑا ہوا۔ ان سے بھی نمازی سلام چاہا کہ اسے موقع ملے ہی میں نے بھی ہاتھ حرام کر دیا۔ یہی چاہا تو میں اپنی دستکراست خان کے چم سے یہ بھی تھی۔ نرم سے اپنے سر سے حرام کا خواب لایا یہ کہ اسے کوپا دے۔

بے رست جتنے جگر تگر کرنے لگیں تو پھر جان لو میرا کہ چھلی ہو گی۔ دیکھو بھی تھکے آنکھوں سے کئی مینہ کا قطر نہیں پڑتا۔

میں نے کچھ اونکا اونکا جواب نہ دیا بلکہ گمراہی سے چلتے ہوئے مسجد کے دروازے کی جانب بڑھ چکے تھے۔ آج میں اپنے تئیں یہ قہر لے کر ہوئے تھا کہ میاں جی کی برائی کا راز ضرور معلوم کریں گا۔ میں جان بوجہ کر آدھ قدم پیچھے رہا کہ دیکھوں وہ راستے کی رکاوٹوں اور روگردانوں سے کیسے بچا کر چلتے ہیں۔ انعام سے اور مسلسل مشق سے کوئی تابناکسی روٹھی سے قدرے تڑپا سے گزر رہا تھا جیسے عمر کسی رکاوٹ سے بچتا اس کے لئے ناممکن ہوتا ہے جبکہ وہ کسی تڑپنے والی چھتری یا عصا کے بغیر ہو مگر میں نے ایک شخص جو رہا ہے آگے آگے بول کی کانٹے اور جھازوں کو گھسیٹے ہوئے جا رہا تھا چاک کسی وجہ سے کھانے چاہتا تو یہ تھا کہ میاں جی ان جھازوں پہ چڑھ جاتے مگر نہیں اودھ تو اس شخص کے لڑکنے سے پہلے نہ کہ تھے..... بولے۔

"بولی رازم نماز کے لئے یہ جھاز جہاز کا زمین اندھیرے کھینٹ لیا کرو۔۔۔ یہ نئے لوگوں کی آواز کاہوتے ہے۔"

جب میاں جی میرا ہاتھ پکڑے ایک جانب سے ہو لیئے چند قدم آگے اپنی دوکان کے تھڑے پہ اگلا
 قدم ڈالنے ہوئے کہنے لگے۔

”بھیا ارات جب بھیگ جاوے اور پکچہ کھیرہ اپنا ٹھکانا پالیوں تو ہستی سے باہر اُجاڑوں کی جانب
 ہٹ جائے۔ فکر کرو کہ گھنٹے جوتے ہی گوبر میں دھسواؤں اور خود سلاستی سے نکل آؤ گے۔“

پھر دوکان کے کواڑ کھول کر اپنا ٹھپیا جڑاتے ہوئے کہا۔

”جس میں صبح سُر مد لگانا بھی یاد نہ رہا۔ اچھا تم ذرا ان طغروں کی پونچھا پاٹھی کرو اور میں ناشتے پانی کا
 بندھنا دے کر تارہوں۔“

وہ مجھے بٹکا بٹکا چھوڑ کر یہ جاوہ جاسا نے ایک پتلی سی گلی میں غائب ہو چکے تھے۔ عجیب بات تھی کہ
 یہاں تک اور سوالات جو نہیں پوچھنا چاہتا ان کے سامنے پہنچنے کی سبب معلوم جاتا تھا۔ اگر کچھ یاد بھی رہتا تو
 یہاں تک کہ نہ ہوتی۔ وہ مجھے بات کرنے کا موقعہ بھی کب دیتے تھے۔ ایسی ٹٹٹھی ٹٹٹھی میں موہنی نے سبہ ساخت
 کیا تھا۔ شہزادہ شہزادہ شہزادہ اور شہزادہ سا کر دینے والی باتیں شروع کر دیتے کہ مجھے سنتے ہی نہ
 سہی، مقلد کی کوشاں کریں۔

پانی کے پیتے پیتے میں وہ گھر پہنچا کرتے۔ بچیاں اور چائے کی چوبک دھڑکے میں اُڑتے اُڑتے
 آتے۔ اسے تھے کیے کوئی کوئی لونگ اچھ جیتے پہ انعامی کپ تھامے مگر لوثا ہے۔ کیسے ناچنا تھا تو کسی سے
 اسے نہ کہیں اندھ شخص کی طرح ہاتھ ہر اسے بھجک بھجک نہ کوئی اندیشہ۔ میں نے تو یہی جانا کہ وہی
 وہاں رہتی سب ناچنا۔ وہ جانا نہ پتا کہ تھکا تھکا رہتے ہیں نہ جانتے ہیں۔ وہ کوئی شخصوں کی مانند
 نہ تھیں اور غیر مرئی سے ہیں جو ہر شخص کی رقیق و کیف سے ہو کر رہتے ہیں۔

”کیا تمہیں ہنس لہم لہم پڑا کہ شروع ہو جا۔“

وہ تھڑے پہ قدم دھرتے ہی بولے۔

”مجھے نماز کے فوراً بعد کچھ کھانے کو نہ ملے تو میرا بندے کھا جانے کو جی کرتا ہے۔“

وہ میرے پیالے میں کچھ ڈال دالتے ہوئے بتاتے لگے۔

”کچھ اور دھڑکا خاص کھا جا۔“ شہزادہ کی قلمی نہ طر اُصلی گئی کا تو کا کا بھی کرو الا یا ہوں اور ہاں آؤ راہ

یہاں کی کھجی اور زعفرانی مہک تو علاحدہ کرو۔ مہو کھیری سے خاص کر۔ بول کر تھوڑی سی اچھی طرح
 چھلکیں۔“

میں غصوں کر رہا تھا وہ اس قسم کی گنگا جمنی باتیں کر کے مجھے بات کرنے یا کوئی سوال و جواب کا سہارا نہیں دینا چاہتے اور یہ جو کچھ بھی وہ کہہ سُن رہے ہوتے ہیں وہ محض میرے بہلاوے دیکھاوتے کے لئے ہے۔ ان کا اصل رنگ رنک کچھ اور ہے۔ یہ سمجھ جان کر میں بھی بلی چوہے کے کھیل سے لطف اندوز ہونے لگا مگر ایک ماہ ان کیپوستہ سچے بن کر ہاں میں ہاںیں اور جی میں جان ملائے نچنٹے ہو کر بیٹھ گیا۔

کچھرا 'حلیم' نہاری 'شب و یک' گوشہ پہ 'سری پائے' دھیمو 'بومنگ' ہریرہ اور شلہ وغیرہ یہ سب چٹخے اور بھلیاوتے کے کھاتے ہیں۔ شب بھر کی تیاری میں پکھتے ہیں اور منہ نہار ناشتے کی صورت بار غرت کھائے کھینے جاتے ہیں۔ پاکستان میں نام نہاد نہاری اور حلیم سننے دیکھنے اور کھانے کی حد تک دستیاب ہو جاتی ہے۔ دیکھ کر بکوان شاذ ہی کہیں یہ پُرانے امرتسر میں مکھیروں کے کسی گھر میں پکھتے ہوں نئی نسل نے کھانا تو کھا۔ ان کے کبھی نام بھی نہیں ملے ہوں گے لیکن دہلی 'حیدر آباد' لکھنؤ 'منجی' جو پال 'شہری' نگر وغیرہ میں یہ بکوان کھاتے بھی اسی رواج پر انداز میں پکھتے کہیں نہ کہیں جھکنے کو مل جاتے ہیں۔

پاکستان کے بعد چائے پکھتے ہوئے میں نے پونہ کو ڈالا۔
UrduPhoto.com
کہوں۔

وہ چائے کا ٹک لیا سا تھوڑے سے کر مسکراتے ہوئے گویا وہ نے۔
"اے مشاعرہ کی لہار تمہیں کبھی اور نہ مٹتا ہوں" مغرب سے تلک لہک رہے تھے۔
"جہاں آپ چہ سنے ہیں وہاں بھی آپ کی اجازت سے ہیں چلوں گا۔"
وہ مجھے سمجھانے کے انداز میں بولے۔

"میں ان بھائی اتمہارا وہاں جانا کچھ مناسب نہیں۔ ہاں تم یہ بتاؤ آج تمہاری آنکھیں کس سے کیوں خالی ہیں؟ نمرود کے بغیر تو آنکھیں غریب ہی نہیں آتیں۔ تمہیں جو نمرود دیا تھا وہ کوئی معمولی نہیں ہے۔ زیادتی نمرود ہے مسئلہ لکھنے سے آنکھوں کے ٹھکانے پر دے رہے جاتے ہیں۔
کو دیکھنے کا قرینہ آ جاتا ہے۔"

"میاں ہی آپ بھی یہی نمرود استعمال کرتے ہیں؟"
"ہاں بھی کبھی یہی نمرود میں خود لگا تا تھا اور اب تو یہ نمرود مجھے لگا تا ہے۔" بھانجہ سا مسکراتے ہوئے۔

جواب دیا۔

”میاں جی! میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”مطلب یہ کہ آپ میری آنکھیں کا جل کو خرابی مکنی ہیں۔ دیا جلے نہ جلے کوٹھا کا لابی رہتا ہے۔“

”جس سے بھڑو پوچھو کا لک ختم نہیں ہوتی۔“

”کا جل کوٹھا۔“ ”میں نے ذریعہ ذکر کر رکھا۔“

”میں اب یہ کا جل کوٹھے والی بات بھی نہیں سمجھا میاں جی!“

”یہ یہ ہی کے کھیل کی طرح یہ ملی چو ہے کا کھیل بھی عجیب سی معصومیت یا شاید عقید سی کمینگی چینی ہوتا

ہے۔ سب چو ہے کو اپنے گھر او میں لے کر بلکے پھلکے بچوں اور نرم نرم دانتوں کا مناسب استعمال کر لیتی ہے

تو اپنے کی خاطر اسے آزاد کشمیر کی طرح آزاد چھوڑ دیتی ہے۔“ ”کوٹھا کا خست نیم مرورہ چو ہاؤم تو ہائے“

”میں نے یہ سا پڑا رہتا ہے۔“ ”جی کمینگی بظاہر ہے دھیانی اور غرض نسبت سی چ کر اٹھنے لینے لگتی ہے۔“ ”چو ہا

کے کسے چھوٹے چو ہا کھا کر ما جن نماز ہو گئی ہے اس ذرا اپنی غلطی عادت سے بچو چو کر مجھ سے

”میں نے اب بڑی توجہ سے انتظار کرتی ہے۔“ ”لہذا میں یہ بتاؤں۔“ ”آپ کو کھیلنے کی

”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“

”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“

”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“

”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“

”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“

”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“

”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“

”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“

”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“

”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“ ”میں نے کہ“

”میاں جی! آپ کے لئے کیا مشکل ہے۔ کرم کر کے مجھے کا جل کوٹھا بھی دکھا دیجئے۔“ میں نے
کاٹھنا دیا ہے ہوئے کہا۔

”بھیا! پہلے اپنے تئیں سوچ کر یہ فیصلہ کر لو کہ اصل میں تم نے دیکھنا کیا ہے؟ خواجگان کا
کرنی ہے یونیر سے دیکھنے ہیں یا پھر کا جل کوٹھا ملاحظہ کرنا ہے۔“

”حضرت ابو نیر سے کا تو میں نے ڈر تک نہیں کیا آپ نے“

”بھئی مجھ سے نہ سہی رات گوالے سے تو یونیروں کی بابت بات ہوئی تھی نا۔“

”ہاں جی! اس نے ہی بتایا تھا کہ آپ کو چنگ پھیرا چنا اور یونیر سے تک جانتے ہیں۔
یونیروں کی مسجد میں منشاء کی نماز پڑھاتے ہیں لیکن یونیروں کی بات تو میں نے اس گوالے سے کی تھی۔
اس کا کیونکر علم ہوا؟“

”وہ مسکراتے ہوئے پوچھنے لگے۔“

”کیا تم نے اس گوالے کو دیکھا تھا؟“

”نہ میرا اتنا تھا کہ میں اسے سمجھتا تھا۔“

UrduPhoto.com

ہوئے گویا نہ تھے۔

”یہی پھر تمہارے چل؟ رات تمہارے رخصت ہونے کے بعد میں نے کچھ سے

انہیں دھریا لٹکایا اور پالش کیے۔“

میں بکا بکا سا آن کا لٹکتے لگا۔

اگلا شردا انہوں نے مجھے خوب دگڑا دیا۔ پانچو نے ہی دوسرے ہوٹل میں آکر رہتے تھے۔

مگر یہ اس لئے تھا کہ انہوں نے طہارت اور وضو کا ایک خاص انداز مجھے سکھایا تھا اور پھر شرمہ اس کے

غریب سا طریقہ۔ جو عام طریقے سے قطعی جدا کا نہ تھا۔ پھر چند روز انہوں نے مجھے تہجد کی نماز سے

خاص وظیفہ کروایا جس کے دوران میری بیانی اس قدر تیز ہوئی کہ اتنا میرے اُجالے ہی گئے۔

بلند پر از پردوں کے پرتھک دکھائی دیتے تھے۔ ایسے ایسے غلوم و گھٹ نظر آنے لگے جو صرف وہ

ہی دیکھ سکتے تھے۔ درود اور اخس و خاشاک۔ سو اور پانی کے چاند۔ پھلوں تر کو

دہی میں کھلاتے کیرے جراثیم وغیرہ۔ یوں محسوس ہوتا جیسے میری آنکھوں میں کسی نے

دیسے ہوں۔ ایسا ہی تجربہ مجھے اپنے بچپن میں اپنی پہلی استاد چاچی کے تصرف سے حاصل ہو

جہلی جانور کو دیکھ لیتی تھی۔۔۔ اب میاں جی کے تعارف سے مجھے نظر و نگاہ کی ایک نئی تعبیر ہو گئی تھی۔

رنگا ہے کہ ہر مخلوق کے ساتھ اس کا ایک مخصوص نظام بھی تخلیق ہوا ہے۔ نظام یعنی سسٹم ہر ایک کا ہے۔ کہیں ہلکی بھاری مشابہت تو ہو سکتی ہے لیکن ایک سے نہیں ہو سکتے۔ اسے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ تمام کے پھول ہوتے ہیں۔ شکلیں اشیائیں رنگ روپ، ممکنہ خوشبوؤں اور اوصاف تاثیریں اور رنگ و فیر ہر اک کے جدا جدا۔ اس کا راز اور رنگ و بو میں کئی ایک پھول پیچہ پن کے سرے کے لئے ہیں جن پہ کبھی کسی کی نظر نہیں پڑی ہو اور نہ کسی گل فروش کے ہاں پہنچے ہوں گے۔ کسی گل دان یا گھر کے حوالے میں سجے ہوئے دکھائی نہیں دیں گے۔ انہیں محدود سے چند سرخٹے، جوگی سنیا سی پرانے یا کوئی پھیلی نسلوں کے گل اشاس ہی جانتے سمجھتے ہوں گے۔ اس کے مقابلے میں اتنے بڑے پھول بھی کہ انسان ان کی قدامت و جسامت دیکھ کر ششدر رہ جائے۔ یہ سب اسی صنایع لم یزل کی شہکار ہیں جو خوب رنگ و روپ اور خوشبوئیں، مہکارس، پیرا فرمائے والا ہے، پھر ہر اک کی اپنی پھر دو سیف و قیافہ، قد و قامت، رنگ و اشاات، مشابہت و تشابہت، رنگ و بھیر، پیرا فرمائے والا ہے، ہاتھی اور گھوڑے، بچہ و بزرگ، اسی انداز میں کے ہاں ہیں ایک ہی زمین پہ چلتے مارے ہیں لیکن اپنے اپنے رنگ و قیافہ کی عمریں، مشورہ نہیں، ہر اک کی ہر اک نے کی قدریں، افکار، اور صورت و بود کے لئے تعلق ایک دوسرے سے مختلف۔

دن اول کے شہرہ آفاق فلم ستار دیو داس میں متعدد بار کیا ہوں بلکہ کئی ایک مشہور فلموں کی شوٹنگ بھی کی تھی۔ یہاں کا موقع ملا۔ معلوم ہوا کہ فلم بنانے کی ہنر مندی ہمیں سے کاشٹنگ اور جوہر یہ سہ لیس انا کے پاس کی دوسری فلم انڈسٹری کے ہاں موجود نہیں۔

ہاتھ لڑائی کے اسٹوڈیو میں ایک انتہائی پیرے یونیورسٹی کے متعلق ایک اچھوتی سی فلم کی شوٹنگ کا موقع ملا۔ یہ فلمی شہر اور موضوع کے اعتبار سے ایک انوکھی فلم تھی جس میں دکھایا کہ اتفاق سے ایک شریر سے ملحق ہو جیسے ایک نٹ کھٹ سے لڑنے سے ہو جاتی ہے۔ یہ لڑکا اسے اکثر اوقات اپنی جیب میں رکھتا ہے۔ یہ چونکہ بہت ہی پست قامت اور قلیل سا ہوتا ہے اس لئے وہ ارمالی سے اس کے جسم کے مختلف حصوں کو چھپ چھپ جاتا اور اپنی حرکتوں سے لڑکے کو قوی کیا کرتا۔ رات کو وہ لڑکا اسے کسی پلیٹ، جوتوں کے، یا کسی اور چیز میں لٹو بیچہ یا رومال کے بستر پہ لٹا کر خود سو جاتا۔ یہ یوں چونکہ جانوری طبیعت کا تھا اس لئے

رات کو اکثر کچھ کھائے پینے کی نیت سے باہر نکل آتا۔ اب فریق کھولنا چاہئے اس کی بہت طاقت ہے۔ اس لئے یہ کسی نہ کسی طرح کھانے کی میز پر چڑھ لیتا۔ وہ چڑے دھرتے بہکتے پھل پھیرنے والی رونی کے گھر پہنچ کر اپنی ضرورت عادت چاری کر لیتا۔ اسی قسم کی حرکتوں میں کہیں تو اچھی ٹانگ چائے دانی کی سسے پھنسا بیٹھتا ہے اور کہیں وہ لوسٹر میں الجھ جاتا ہے اور کہیں وہ کتابوں سے جھلستا ہوا کسی روئی کی نوکری میں جھپٹتا ہے۔ بس اسی قسم کی معصوم معصوم حرکتوں شہرارتوں پہ مٹی یہ فلم چھوٹوں بڑوں میں بے حد مقبول ہوتی۔ فلم کی سب سے بڑی خوبی وہ فطری ماحول تھا جو اس بڑی بھر مندی اور جدید ٹیکنیکی جاویدگری سے پیدا ہوا تھا۔ یعنی بیک وقت دو سسٹم دکھائے گئے۔ ایک عام قدم کا فح کے انسانوں کا اور دوسرا مخصوص یونوں کا۔ ایک سگریٹ کے سائز کا تھا جو ایک چھوٹے بچے کے جوتے میں آرام سے سوکتا ہے۔ سامنے کی جیب سے نکال کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ لٹنے کے پاس کھڑا جب وہ مڑا تھا گرد دیکھتا ہے تو وہ بچہ دوست اُسے آسمان سے نکالتا ہوا دیو دکھائی دیتا ہے۔ یہی ہونا ایک چوہی اور دیکھنے والے کی کینز کے پتھر کے لئے بھی دیو سے کہیں اگلی نہ پکھائی دینے والے جراثیم کے لئے بھی یہی حیثیت رکھتے ہیں۔

نیم شبیں جن کو اس سچے اور صاف پر جھپٹتے ہیں ان کے ہر ایک چوہی قدم بھی کچھ کیا ہے۔ مائند ہی ہوتی ہے۔ اس قسم کی شادی وادائی میں باغی اسی خوبی دار رہا۔ اس سچے شادی وادائی میں چشم تراشائی کی جگہ بھول جاتی ہے۔ وہ سید تک مشین کے سینڈ پچھتا چاہتا ہے یہ فرشتہ چاہتا ہے۔ ریشوں میں کمر تک ڈھک کر ان کی ترکیب لڑا رہا ہوتا ہے کہ کس طرح وہ اوپر مشق تک پہنچے جو اس کے ایک قلب میں آہنی احساں کی جگہ تک پہنچ کر کھڑکی ہو جاتی ہے۔ دیکھتا ہے کہ ایک چاب ایک سوڑا ہوا رنگ رکھا رہا ہوتا ہے۔ یہ ایک بازی گری کی طرح اس سے لپٹ کر اوپر چھٹا شروع کر رہا ہے۔ ہر اون رنگ کا دھاگا ہوتا ہے۔ یہ اوپر چھٹتا جاتا ہے دھاگے کی پلہ کی اس کے وزن سے کھینچ جاتا ہے۔ جو درمیان میں لٹکا رہتا ہے۔ آخر تمام دھاگا ختم ہو جاتا ہے اور یہ حزم سے نیچے گر کر زیوش ہو جاتا ہے۔ جب نہ تو یہ ادھوتا ہے تو یہ ہونا کھوت کے ڈبے میں اپنے ہستر پہ مہ جو نہیں ہوتا۔ تلاش کے بعد یہ کھوت اگھے اچیر میں پھنسا بیٹھتا پایا جاتا ہے۔ اسی نوع کے بہت سے مناظر جو انسان اور دیو کے درمیان افلاموں کو اک عجیب دلچسپ انداز میں ایک دوسرے میں دھم دکھاتے ہیں ناظرین کے لئے بے حد دلچسپ خبر کی کا منظر ثابت ہوئے۔

بات وامت ازلی کے سلوا یو میں شوٹنگ کی شروع کی تھی۔ وہاں اک عجیب نوع کی مہم تھی۔ ایک بہت بڑے میز پہ ایک متوسط درجہ کے گھر کا مائل سیٹ لگا ہوا تھا۔ ویسا ہی جیسے گھٹے چائے

یہاں بچیوں کے "گھر گھر" ٹھیکے کے لئے کھلوا گھر ہوتے ہیں۔ جس میں پلاسٹک کے میز کرسیاں،
 کھانا وغیرہ ہوتے ہیں۔ بالکل یونہی یہ سیٹ بھی تھا۔ لیکن سیٹ کیا تھا انسانی ہاتھوں کی ہنرمندی کا
 ایک ایک لونی اعلیٰ چیز برطانیہ اصل کے تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی چادر کی چھڑی سے گھر اور گھر
 اصل سے کئی بڑا درگنہ چھوڑا کر دیا گیا ہے۔ اس گھر میں شٹنگ ہو رہی تھی۔ یہ کسی زمین دوز گھر
 تھا۔ یہاں بڑا اپنے انسان دوست کو لے کر جاتا ہے۔ اس ماڈل سیٹ پہ جو مودی کیمروہ استعمال ہو رہا
 تھا۔ عجب و غریب کیمروہ تھا۔ کسی بچے کی چھوٹی سی پلاسٹک کی کھلوتا کاری کا اندرہ بوٹ کیمروہ جس کے
 ریت کی جگہ ٹھاسالینز تھا جو ماڈل گھر کی چھوٹی چھوٹی راہداریوں آگنیں باورپی خانے بیت الخلاء
 اور میز صیوں پہ ریوٹ کنٹرول سے مطلوبہ مناظر کی عکسبرداری کر رہا تھا یعنی یونوں کے ماحول جو
 کہ قحطی اور کوتاہ روی سے تعبیر ہوتا ہے کو ان کے حقیقی انداز میں پیش کر رہا تھا۔ اسی طرح میں نے
 یہ دیکھا کہ سیٹ بھی دیکھا جس پہ ہر چیز اپنے حقیقی قد و قامت سے کئی سو گن بڑی مٹائی گئی تھی۔ سینے والی
 سیٹ لگتی تھی۔ یہاں کے کپڑے بالکل ایک گھر کے جتنے کپڑے ہوتے ہیں۔ کچھ بچے کچھ بچے ہر قسم کے پردے

UrduPhoto.com

میں اس اکیلا قہید کا یہ تھا کہ ہر ایک سسٹم دوسرے سسٹم سے بنی ہوتا ہے تو انہوں نے یہ سوچا اور
 اس سے مراد یہ جاتے ہیں۔ کچھ کچھ میں نے دیکھا تھا کہ وہاں تمام ماحول کے الگ الگ مخصوص
 سسٹم ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک سسٹم سے قطع تعلقی کیے بغیر دوسرے سسٹم میں داخل ہوا جائے۔ عالم اسباب
 سے یہ عالم انفس و آفاق سے راسن پاک کر کے ہی عالم حکومت سے رہا ممکن ہے اور عالم لادست تو
 یہ حقیقت بات ہے۔ کسی بھی آپریشن سے پہلے مریض کو مکمل کنٹرول میں لایا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اس
 کے ہولی اور آزاد آرام سکون مود مزاج پہ نظر رکھی جاتی ہے۔ بعد کے نمٹانے کو صاف کیا جاتا ہے۔
 سسٹم سائنسی کی جاتی۔ آپریشن والی جگہ کے بالی موندھے جاتے ہیں۔ طاقت بحالی رکھنے کے ٹیکے
 مودہ تو خون کی باتوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ تسلیم میاں بھی مجھے کسی گردش سے گزار
 دیتے۔

قریذی فلم بغیر خصوصی ٹیکے کے نہیں دیکھی جاسکتی۔ نہ منظر صاف اور صحیح دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی
 حشر یہ ہوتا ہے جو اس مخصوص فلم کا خاصا ہے۔ زور و زار دیکھنے کے لئے ڈور میں اور قریب و غور دیکھنے کے

لئے خود چین کا ہونا ضروری ہے۔ اور جب بات روحانیت اور انارمل سائنسز اور سپر سائنسز کی ہو تو پھر اہتمام درویشوں و دماغ چنداں سوا ہونا چاہئے۔

نو چندی جمعرات تھی۔ صبح قطبی سے جب وہ میرے کمرے میں تشریف لائے تو ان کے ہاتھ کاڑھے سوٹ کا ایک سیاہ رنگت کپڑے کا جواڑا تھا۔ مجھے ٹھٹھاتے ہوئے بولے۔

"آج مغرب کے بعد غسل لے کر انہیں پہن لینا۔ سرمد اور غوث بھی تازہ کر لینا۔ طریقہ یہی ہے جو میں نے بتایا ہوا ہے اور ہاں رو پیٹے انھیں کی کالے تلوں والی گڑک یا آسرتیاں بھی بندھوا لینا۔ انھیں کی ٹکڑے چھندے حلوائی کے ہاں مل جاویں گی۔ آج عشاء اکٹھے پڑھیں گے۔ یہ کہہ کر یہ جاوہ جاسو پالے بگولے پہ چلے گئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کھڑے کھڑے یہی کچھ سمجھ گئے تھے۔

فجر کی نماز مسجد میں نظر نہ آئے۔ دوکان بند درگاہ سے غیر حاضر ابھی بلوتج یہ کدھر لے گئے تھے۔ محسن تک نہیں ہوئے۔ تنگ آ کر میں بھی ادا با دوا با ساسقی نظام الدین نکل آیا یہاں سے پندرہ

لال قلعہ پہنچے۔ یہاں لاہوری دروازے کے اندر ایک کھڑکی میں میرا ایک درخت کا ٹکڑا لٹا ہوا تھا۔ لوہاروں کا کدوا لٹا ہوا ہے۔ یہ درخت میرے لئے پاکوڑہ کہہ سکتا ہے اور کہتے ہوئے کہتا ہے۔

پرانے پھر انکھیاں وغیرہ مجھے نہیں یاد کہ میں اس کے پاس سے کبھی خالی ہاتھ لوٹا۔ وہ ہمیشہ مجھے کدوا ہاتھ لچا ہی ڈالتا تھا۔ اچھے خاصے دام ہونے کے بعد بھی وہ یہی کہتا گزروں میری طرف سے جیسے کہ

تجھ۔ خلاف معمول دوا اپنے ٹھیکے پہنچاؤں تھا کہ کے بھائی میری جھنڈاری سے معلوم ہو کہ میں

کے اندر موتی مسجد کے پاس کسی سے ملے گئے ہیں۔ اس نے مجھے ہراسہ اور جل پان کی دعوت کی تھی۔ دھندھا دیکھتے ہوئے اندر چلا آیا۔ الال قلعہ میں غلوں کی موتی مسجد کی حالت بھی قریب قریب وہی ہے۔

ہاں ان کے استخوانوں اور منہوں کی ہے۔ موتی مسجد اگر لال قلعہ کا ایک معتبر حصہ آقا اور اہل خانہ سے اس کا تعلق نہ ہو تو وہ نہ ہوا نہ پیدا کرنے کا ایک واضح ذریعہ نہ ہوتی تو شاید وہ اس وقت موتی مسجد

جو بھی ہوتی۔ نماز داڑ یا اذان وغیرہ کا سلسلہ تو نصف صدی سے بند ہے اب صرف دیکھو کہ موتی مسجد

ہاں کبھی کوئی سیریا مت کرے والا مسلمان ادھر آئے اور نماز کو وقت بھی لگا جا رہا ہو تو وہ نہ ہوگا۔ تجہ پر حیا اور وفا کے لئے وہ چار گز نہیں مارے تو کچھ عجیب از قیاس نہیں۔

میں لہکتا ٹھٹھا ٹوٹے ہوئے لیتا ہوا ادھر آ گیا تھا۔ سیر سپاہیا متعہ نہیں بلکہ محض مغرب سے

گزارہی کا بیٹا۔ اور یا پھر تسلیم میاں کے اس بے طرح غائب ہونے کا رد عمل جو مجھے یہاں سے

روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے پٹنے کی پٹی بھی اپنی پٹی آسودہ ما آسودہ گل سے نئے تھے جو نے بنا کر ارض کی دراڑوں پہاڑوں کی کھوڑوں عاروں میں اتار دیئے گئے تاکہ وہ باقی ماندہ مٹی جس کا نصیب سینہ آدم علیہ السلام کے پٹنے سے تھا وہ ضائع نہ ہو پائے یا پھر شیطان رجیم کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ یہ بھی روایت ہے کہ کتا بھی اسی مٹی سے پیدا کیا گیا جو پٹنے کی ناف سے کھینچا اتار کر پھینکی گئی تھی کہ شیطان نے جو شب رقابت و خیانت میں پٹنے کے پیٹ پہ ٹھوک دیا تھا۔ وہ خدا علم بالصدوق۔

قلعوں جو یلیوں 'سرنگوں'..... زمین دوز پناہ کا ہوں 'صدیوں پرانے چھٹا رو رختوں کے کھوکھے تھیں اور تنوں میں پاتال تک اتری ہوئی جڑوں 'گہرائیوں میں اتری ہوئی باؤلیوں اور اندھے سو کھے کوؤں میں ان کے بھرے ہوتے ہیں اور یہی اوپر زمین تک رسائی کے ذرائع بھی..... غلام نور دوں اور غوطہ خوروں کی طرف یہ ابھی ابھی زمین نور دی کی خاطر بلکی اور پیچھے سے زمین کے اوپر پہنچ کر کسی کی نظر میں آ جاتے ہیں اور پھر غائب بھی۔

یہ فطرتی طور پر انسانوں سے خاکف رہتے ہیں۔ شاید ہی کسی خاص جگہ سے کسی اچھان سے کسی دھڑکنے والی جگہ سے کسی اپنی عاقبت سمجھتے ہیں۔ انسانوں کی طرح ان میں ہر طرح قیام کے پائے ہوتے ہیں۔ بھلے نہ سمجھیں ان کے اندر بہت کچھ ہے۔ ان میں شعلوں اور ناریوں کا فریاد ہے۔ جیسا کہ ان کی سبوی بھی اور دنیا میں ہر اس جگہ موجود ہو سکتے ہیں جہاں زمین پرنا زحمر اور جگمگاتے ہیں۔ گوہر داروں میں ان کی ہستیاں موجود ہیں۔ ٹیل ٹیل کے آس پاس ان کے قہقہے ہیں۔ دھڑکنے والے ایک خاصے ویران حصے کی بنیادیں ان کی آبیاری ہیں۔ افریقہ کے جنگلیوں میں بھی ان کے بھرے ہیں۔ فرار کے ایک چھوٹے سے ٹرہ وہ ہزارے میں ان کی قومیں آباد ہیں۔ اسی طرح جزیرہ القریان میں ان کی ایک قسم پائی گئی۔ امریکہ کے خشک صحرا قطب ثانی کے برف دار یا سندھ میں ایٹھنٹر کے کھنڈرات و کھنڈرات غیر شاپور کے باغات۔ یہ ہر اس جگہ پائے گئے جہاں انسان کے قدم کی دھجک ہوئی۔

ابراہیم مصر کی اور یافثوں اور کھدانیوں میں بھی یہ دکھائی دے کر عجیب بات ہے کہ آج تک یہاں کسی سچے کسی یونیورسٹی کے جو کوڑا نہ و نہروہ ڈھالنے کی صورت یا ان کی کسی حقیقی تصویر کو پیش نہیں کیا گیا۔ یہ قدرت کا ان سے کوئی وعدہ ہے یا محض اتفاق امیں لے ان کے قبرستان اور مساجد بھی دیکھی ہیں۔ ان 'قرآت' صمد لغت حقی کہ گیت کا وہ دھیرہ بھی سننے ہیں۔ تین چار مخصوص لوگوں کے علاوہ میری یہ سب سے زیادہ راز میں کہیں ایسے لوگوں کو کھون پادیں جو یونیورسٹی سے ملے ہوں یا ان کے بارے میں مزید کچھ معلوم رکھتے ہوں۔

• تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے.....!

بات یوں کی تھی پھر آگے دہلی میں مہرولی کے صوفی تسلیم میاں کا ذکر شروع ہوا۔ جو ایک صاحب کشف تاجنا بزرگ تھے۔ جن کی زندہ خوبصورت آنکھوں سے مجھے کچھ اور آنکھیں بھی یاد آ گئیں۔ انہیں تو اس کن بات یہ کہ ان دونوں آنکھوں کا اک باہمی روحانی ربط بھی تھا جو بہت آگے جا کر مجھ میں آیا۔

میں نے آنکھیں یعنی سرمہ سے آلودہ آنکھیں لیکن کچھ آنکھیں سرمہ کا جل کے بغیر بھی قدرتی طور پر سرخ ہوتی ہیں۔ غزالوں، گدھوں، چھڑوں، شتر مرغوں، زبیروں اور بعض انسانی بچوں کی آنکھوں میں ایسی سرمہ لپٹا ہوتا ہے جو بڑا بھلا لگتا ہے ان کی قدرتی مضمونیت مزید ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ میری کسی کتاب کے ایک مضمون میں آنکھوں اور ان کی اقسام کے بارے میں میرا حاصل گفتگو بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سرمہ لپٹا ہوا ایسے موضوع ہیں جن پر بہت کچھ لکھ جانے کے باوجود ابھی ابھی کافی کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ یہ آنکھیں اور انہیں سیاہ رنگت کے علاوہ کچھ اور خوبیاں بھی ہوتی ہیں مگر جو اس لحاظ سے اور کاغذ پر لکھنے کے لیے کافی ہیں۔ وہ اس اور رنگت میں ابھرنا تو اس میں ہیں۔ انسان کے جسم کی اور باطنی باتوں کا ظاہر اور اس کا اشارہ ان ہی آنکھوں سے نمایاں ہوتا ہے۔ آنکھیں ان موشیوں کی ایسی زبان ہوتی ہیں کہ کہہ دینے پر وہ سمجھتی ہے۔ دل دماغ احساسات اجزات اور اردو خیالی کے سارے نوسے سلیسے اس سے ظاہر ہواں ہوتے ہیں۔ ابھی ابھی کہ شش محنت لگے ہوئے انسان کے اسات کا ہنسی سے ہی شروع اور ختم ہوتا ہے۔ آنکھیں چہرے کے آئینے کا خیر اور اس کی عین ہوتی ہیں۔ وہ آنکھیں تو یہ ایسی بے اثر لڑکھڑکی ہوتی ہیں جو نطق کے مقدور جس کی بات نہیں ہوتی۔ معصومی ہو یا ستم تراشی وہ انسان کوئی یا لہری یا لہجہ یا شکایت کا سنگ آنکھوں کی لہجہ کی معبر ظہر تی ہے۔ زبان لاکھ لکھ جو کچھ آنکھیں بولتی ہوئی ہوتی ہیں وہ واقعی شاعری معصومی آنکھوں کی جاہ و گری سے بھری پڑی ہے۔

میں نے اسی زبانے چشم و چراغ میں بڑی بڑی حسین دلچسپ آنکھیں دیکھی ہیں۔ ایسی ایسی آنکھیں جو آنکھیں کہ مقابلہ متر و منقذ تارہ جالے اور ایسی بھی خوشی خواب آگیاں آنکھیں کہ انسان خود کو ان میں بھٹکا رہ جائے۔ کبھی تو ہر جہتی اور کبھی آنکھیں زبان آنکھیں اسے خدا آنکھیں داستان آنکھیں داستان میں۔ مکان آنکھیں زمان آنکھیں اور حدیث آنکھیں قرآن آنکھیں لیکن ان سب میں سے مجھے یاد آتی ہوئی آنکھیں اچھی لگیں۔ مزہ برداشت کا چاہو تو ان آنکھوں میں آنکھو.....!

حکایت: انگریزی کی مشترکات پر عربی انگریزی کی عربی حروف میں خطائی پہ مصروف ہیں۔ ان کی مشاقق
 اور انداز تحریر دیکھتے اور تو مصیبت کا متقاضی ہے۔ اپنا یا اپنے کسی عزیز کا نام کاغذ پہ تحریر کر کے ان کے
 لئے بکھتے۔ اگلے چند لمحوں میں وہ صاف شفاف سفید پلیٹ پہ یہ نام ایسے سنائل اور عمدگی سے لکھیں اور
 ان کے کہ آپ یہ تحفہ پا کر غرضوں کریں گے۔ جو چاہیں انھیں ہدیہ کے طور پہ دے دیں۔ وہ بخوشی قبول
 کر لیں۔ اصل چیز اس فنکار کی پھر قی اور قی بالیدگی ہے کہ وہ زمانہ ہزاروں نام تحریر کرتا ہو گا پر کیا بھول جوا ایک
 نام سے اندازت لگا کھا جائے۔ اسی طرح ایک ڈبل پتے جتنک سلامتی سے آدمی کے نزدیک و بر و معلول پہ
 لکھا جاتا ہے۔ یہ عجیب اٹھالیہ شخص محض دس منٹ میں اس کا پورا ریت تیار کر کے اس کے حوالہ کر دے گا۔
 جسے سولے ماخوٹوں لائی لائی چکی انگلیوں والا یہ باکمال آدرست شخص ایک دو بار اپنے ماؤں پہ اچھتی سی نظر
 ڈالتے اور ایسا رولت دیتا ہے کہ چکر پڑتے ہوئے والا شکہ و تردد چھوٹتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ بیکانہ
 کے قمار خانوں موجود کے قمار خانوں خیالوں کو بھی ہضم کر کے خرماں پہ منہ کر سکتا ہے۔ میں نے احسان ہوا
 کہ میں نے اس کو خیال کو آجا کر کر دینے کا نام مصوری نہیں سمجھا اور اچھا مصور تو یہاں تک کہ وہ خط کو مستقبل
 میں ہیر کی اچھادی صوب کی انھوں میں محسوس کرتا ہے کہ وہاں کے کرم و گرد و غبار کے لئے میں بچتے
 ہیں۔ اس وقت اس کی ہر حرکت سے اس کا ہوا ہے وہ اس کا ہوا ہے وہ اس کی ہوا ہے وہ اس کی ہوا ہے۔

UrduPhoto.com

• مرنے والی اور مرنے والی

ایک بچہ لڑکا زہنی نے ایک باپ اور بچے کا ذکر متاثراتی کے پورے سر پہرے کا بھننے پڑی
 اور مرنے والی مہارت اور ہاتھ کی محسوسات کو بروئے کار لانے ہوسکتا تھا کیا۔ بھننے کی تکمیل کے دوران
 میں کوئی مہارت ماؤں کی صورت میں نہ ہوتا پڑا۔ دل میں اس کے شوق فراوان تھا دیکھیں کہ چاک ملی
 اور مرنے والی کیسا دکھائی دیتا ہے؟ تصویر کشی کے والا یا ان بھننے والوں کو لا کیر بھی کاٹا کھوٹا یا تک تک سے
 کیا کھانا ہو۔ نتیجہ تو یہ ہوتا ہے چاہتا ہے۔ مرنے والی صاحب بچے رنگ اور خاص و پہاڑی اشج قلع اور خد و خال کے
 حال میں تھے۔ تاہم بشری تھا جس کے تحت ان کے دل میں بھی نہیں چھپی ہوئی خواہش تھی کہ بھننے
 اور مرنے والی کے زور میں کاٹنے کوٹنا اچھوتا سا صورت ہو۔ اب جن جن سبیل کے مرنے والے ہوتے گئے
 ان کے مرنے والی صاحب کا شوق اور بے تابی راستی گئی۔ ان کے خد و خال کے کھیل کا وہ بھی آ پہنچا۔ خیال رہے
 کہ تصویر ہو یا بھننے، عملی ہونے کے بعد ہی دکھائے جاتے ہیں۔ بھننے سیاہ کچر سے سے اٹھانپا ہوا تھا جبکہ

مفتی بی اپنے جیسے کے صوری نور اور زوہبی کے یگانہ روزگار فن کے تخیلی ظہور کو ملاحظہ کرنے کے لئے سب سے
تھے۔ خدا خدا کر کے زوہبی مرحوم نے پردہ اٹھایا اور جلوہ دکھایا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ مفتی صاحب غیر مسلح تھے۔
زوہبی غیر ظہبی طور پر امر ہو جاتے۔ مفتی صاحب کو ویسے بھی اسلئے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ اسلئے سے کسی
بہتر کام وہ اپنی زبان کلامی سے لے لیا کرتے تھے۔ محسنہ و کچھ کر مفتی صاحب تو کیا کوئی بھی آنکھ عقل و درہ
کرنے کو تیار نہیں تھا کہ یہ محسنہ کم از کم مفتی صاحب کا ہو سکتا ہے۔ رنگ کو تو چھوڑیے صاحب مرحوم
دونوں یکساں تھے۔ اصل خصوصیت تو جیسے کے ضد و خال کی خشونت اور بے ڈھابا پن تھا یعنی صاحب کے اس
چرے سے مطابقت نہیں تھی۔ زوہبی جیسے آدرشت اور دوست سے کم از کم انہیں ایسی توقع نہیں تھی کہ وہ اپنے
جسمہ اس طور بکا ذکر بنائے گا۔ مفتی صاحب بڑے بڑے ہوئے تھا ہوتے ہوئے شکا تھا کہا۔

”یار اتم نے میرے ساتھ کیا کیا ہے یہ محسنہ دیکھو اور میرا چہرہ دیکھو۔ کیا میرا چہرہ ایسا ہے
تم نے بنایا ہے؟“

زوہبی نے چارہ صدیقیں کی طرح ایک درویش مفتی تھا۔ وہ بڑے لمبے میں گویا تھا۔
”مفتی صاحب اصل میں مفتی بی سے تھے میں نے کہا ہے۔“
”مفتی صاحب اصل میں مفتی بی سے تھے میں نے کہا ہے۔“
آخر میں بے پروا جاتے ہیں۔ بچپن، بھیروں کی طرح۔ جوانی ہے سب جی جی اور بچا ہوا
بھائی ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ مفتی صاحب کا بڑا سا وضع کیا گیا تھا۔
میں شاید یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مفتی صاحب کے بچپن کی تصویریں سے وہ ویسے ہی تھے۔
تینوں تصور اور باطنی تصوف کے ماضی سال اور مستقبل کی آگہی دہن ہے اتم سوچو وہ وہیں صورت
دیہاڑی دار مزدور تو ہو سکتا ہے سچا کارکن نہیں۔۔۔۔۔

جہاں کی مارکیٹ میں وہ آدرشت کچھ ایسی نوعی کی تصویریں ہمارا تھا وہ شاید ایک آدرشت ہمارے
کو کسی اندرونی آگ سے دیکھ لیتا تھا پھر اس کی پے کار۔ پھر تیلی آنکھیاں کھیریں کھینچنے میں ہنستے جاتی تھیں۔
تھوڑی سی دیر بعد وہ عجیب سی تصویر اپنے کا کپ کے ہاتھ میں تھا ہوتا۔ اس کا کوئی مترادف نہ تھا میں نے
ہر دکان کے ہینڈل میں پڑا رہتا۔ جو کچھ کوئی اس کے ہینڈلوں والے اپنے میں ڈال دیتا وہ اسے لے لیتا
جی نہیں دیکھتا۔ میں کافی دیر کھڑا ہوا اس کے کام اور اسے دیکھتا رہا۔ یقیناً وہ سودی نہیں کرتا
بلکہ دینی بھی جان نہیں پڑتا تھا۔ شاید ہندوستانی ہو۔ اب مارکیٹ میں کہیں سے اذان کی آواز آئی۔
دیکھتے ہی دیکھتے سب لوگ دوکان میں بڑھانے لگے۔ میں بھی اذان کی آواز کے سہارے نیچے مسجد جا گیا۔

نواز کے بعد مسجد سے نکل رہا تھا کہ وہی آرٹسٹ مجھے مسجد کے باہر سگریٹ سلگاتے دکھائی دیا۔
 مجھے اس سے کپ لگانے کی سوچھی۔ دل ہی دل ڈھاما گئی کہ یہ انگریزی بول سمجھ لیتا ہو ورنہ بڑی مشکل
 میں نے اس کے قریب پہنچ کر حسب عادت السلام علیکم کہا۔ میری سیاہ پوشی اور حال علیہ دیکھ کر پہلے
 مجھے تسکین لگا ہوں سے تو تیار رہا پھر سلام کا جواب دے کر انگریزی میں پوچھنے لگا۔

ایرانی یا افغانی.....؟

کو تو آئی ایم پاکستانی؟

وہ میری انگلیوں اور گلے کی مالاؤں کو بڑی استحباب بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔
 یہ سب کیا ہے.....؟

میں جواب دینے کی سوچ ہی رہا تھا تھاں اس نے اگلا سوال ڈال دیا۔

تم شیعہ ہو یا کسی خاص مسلک سے تعلق ہے؟

میرے پاس فرقہ واریت کی کوئی گمان نہ تھا۔ میں اسے اپنی ہی انگریزی میں بتانے لگا۔

کئی مسلمان عقیدوں سے بہت کرشمہ لڑتی ہوں۔ وہ بھی اس نے لے کر میری
 اس کے بعد میرے سر پر شہ عذرتی لڑی۔ میرے سسرالی اہل تشیع اور میرے باپا اہل شیعہ و الجماعت

میں سے ہیں۔ اور میں خود شیعہ مانتی ہوں اور یہی اور پیش ہوں یا نہیں ہوں کچھ ہوا خیال ہے کہ میں پاکو
 دے میں بھی جھگڑا ہوا ہے کہ کچھ ہونے سے کچھ نہ ہوا ہے۔ پتہ چلتا گیا تھا ہے؟

مجھے لگس پڑا کہ وہ میری اس اس گفتگو سے رنج ہوا یا رنج ہوا۔ وہ دوستانہ انداز سے منکراتے ہوئے

تم خاصے ہو سہرا ہو کر دلچسپ بھی۔ آداب میرے ساتھ۔ اس ملاقات کے نام نہ پھر کا کھانا
 کھاتے ہیں۔

انہوں نے اس سے ایک ہوٹل سے کھانا خریدا اور کھانا کھانا مجھے ساتھ لے گئے۔ وہ اپنی در کتاب کے
 مجھے ساتھ لے گئے۔ یہ جگہ اس کے سٹور سٹور سٹوری روم کے لئے وقف تھی جبکہ باہر کے حصے میں
 کھانا یعنی تصویریں بناتا تھا۔ اندرونی ہوٹل ہی اس نے روشنی کا ایک سیلاب پھیلا دیا۔ اور کئی ہر چ
 کی مانند اسٹج ہو گئی۔ اللہ اللہ اور درجہ امیرال میزبان کو لے کھدے پٹی کٹی چھوٹی بڑی اور صوری
 ہر جاہر جانب آنکھیں ہی آنکھیں۔ کئی ساکت و جاہد مجھے مہبت سامنے یہ "نہیں کہہ" دیکھتا

ایسی ہی کیفیت یہاں اس وقت بھی تھی۔ ہر گاڑی والا چاہتا ہے کہ وہ اگلی گاڑی سے آگے نکل لے جائے۔ جیسے کہ اگلی آگے نہیں جڑھ سکتی کہ اس کے آگے بھی گاڑیاں نہ کی ہوئی ہیں پھر بھی ہارن پہ ہارن دینے لگتا ہے۔ جیسے ہر شخص پاگل ہے جس ہو گیا ہو۔ ہمارے پیچھے ایک وٹمن والا لگا ہوا تھا وہ کچھ زیادہ سی آواز دے رہا تھا۔ بے تاب تھا ہارن پہ ہارن۔ کبھی دائیں کبھی بائیں۔ اس کی کوشش تھی کسی طرف وہ ہماری ٹیکسی سے ٹکے نکل لے۔ نکل بھی لیتا تو محض ایک گاڑی کے فرق سے وہ اسی قطار میں رہتا۔ پر تو یہ کیجئے کہ جو اسے تھک رہا تھا۔ دائیں بائیں بھی گھجائش نہیں تھی کہ ہم اسے راستہ دے کر اپنے آگے آنے دیں۔ میں نے منہ کڑوا کر ہوا کو کہہ دیا کہ تھوڑے عرصے میں آگے آئے تو ہنس دیا۔

”بھائی! اس وقت بے صبر ہے کوئی طو را پٹے سے آگے نکلنے کا موقع دے دو۔۔۔“

وہ میری جانب دیکھے بغیر ہی بولا: ”اچھا تو تمہیں بھی سہی ہوں۔“ تین انٹیں منہ پیٹنے سے تھک رہا تھا۔ ملائے ہرک رہی ہیں۔ یہ پاگل واپٹر! اوپر سے قلابی کر کے ہی ہمارے آگے جا سکتا ہے۔ دائیں بائیں سے نہیں۔ نہ کھاتے ٹھیک تھی۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔

اسی چھٹا ٹیکسی میں میں منت کر رہے۔ میں نے گڑی دیکھتے ہوئے اپنے اندر سے کہنا شروع کیا۔
UrduPhoto.com
 پہلی ٹیکسی

پہلے آگے چھٹا ٹپ کے نزدیک پہنچے نہیں تھیں وٹمن والے نے ٹیکسی ٹھہرا دی کہ وہاں سے ہمارے آگے آگے گئے۔ دیکھا کہ دو گلی بدگلی اسی آوٹ کی ٹیکسی کی خوش رنگ کلاں پہ پھر تھی۔۔۔۔۔ اسی کے اندر سوار یاں بھی سو جو وہیں جگہ اس کے ساتھ اسی سیٹ پہ ایک خوبصورت سی عورت تھی۔ ناز و انداز سے براہ راست تھی۔ ڈرائیور بھی چھیل چھیل سا ٹھہر رہا تھا۔ اس کی بے چینی اہمیت نہ تھی۔ گلی۔۔۔ ٹیکسی ڈرائیور کے چہرے پہ بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اب میں نے جو وٹمن کے پیچھے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ پیچھے والے پر سے شیشے پہ غر۔۔۔۔۔ ہوا تھا۔ وہ خوبصورت سی خرابی آنکھیں چھلن کے پیچھے سے جھانک رہی ہیں۔ بعد میں تو کسی حد تک آگے آگے آگے قریب قریب ہر وٹمن کے پیچھے دکھائی دیے گئیں۔۔۔۔۔ لیکن جب میں نے دیکھیں تب یہ غر کے ساتھ اپورٹ ہو کر آئے تھے اور واقعی ایک دلکش شہکار تھے۔ ایسی نہ صرف ٹیکسی آنکھیں کہ حقیقت کا ٹھکانہ۔۔۔۔۔ چھلن کی آوٹ میں صرف آنکھیں۔۔۔۔۔ سراپا انتظار آنکھیں۔۔۔۔۔ جس بھی ڈکارتے یہ ڈیڑھ ان کے ہاتھ تھے۔۔۔۔۔ اب میں آنکھوں میں گئی! کہاں کی پھنسی ٹریک۔۔۔۔۔ وقت کی کمی۔۔۔۔۔ انٹر پورٹ کرنا چاہی۔

کے لیے درجہاں میں پہنچا ہوا تھا۔

مجھے خاموش اور بے سندھ سا پا کر ڈرائیور بولا۔ ”تو آگے دیکھیں۔۔۔“

ایک بس فٹ پاتھ پہ چڑھی ہوئی تھی جبکہ ایک وہ موٹر کاریں بھی رگڑی گئیں تھیں۔۔۔ ایسی بلیس اور
کچھ بلیس بھی موجود۔ میں نے اچلتی سی نظر اُدھر دیکھا۔ پھر جو اُدھر دیکھا تو آنکھوں والی دیگن کافی
سے گل تھی۔ کیونکہ آگے اب ٹریک آسان ہو چکی تھی۔ میں نے ڈور دیگن کو سڑک پہ تیرتے ہوئے دیکھا
تو اسے کہا۔

”جلدی نکلو دیکھو دیگن کہاں سے کہاں نکل گئی ہے۔“

ڈرائیور نے جو کئی ڈہائی تو دیگن کو پورے گی کو اُڑوں کے پاس جا لیا۔ آنکھیں دیکھیں تو میری جان میں
ایک ڈرائیور میری بد معاشی سے بے خبر تھا اور تو سمجھ رہا تھا کہ میں ہفت کی گلی کے پیش نظر آسے رہتا
تھا کہ کہہ رہا ہوں۔ جو وہی سٹاپ پہ دیگن والے نے اُگنے کا عہد یہ دیا تو میں نے ڈرائیور کو دیگن کے
پیشے کے لیے کہا۔ اس شریف آدمی نے یہ سمجھا کہ میں شاید پان سگریٹ کے لئے ڈکا ہوں۔ میں دیگن
کے لیے اُدھر گیا۔ آنکھیں مجھ سے اب سات آنچ فٹ ہی دور تھیں۔ اس کی قربت پہ آنکھوں
کے لیے ایک ڈرائیور نے کہا کہ ”یہ ڈرائیور ہمارے پاس آگے جا رہا ہے۔“ میں نے اس کی بات نہ
سنی اور بھی میری جانب دیکھ رہا ہے۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ کچھ کہتا ہی جا رہا تھا کہ دیگن نے
اس کی طرف دیکھتے ہی دیکھتے یہ جا رہا ہے اب میں دیکھ لیا ہوا ڈرائیور سے مخاطب ہوں۔

”یہاں کمرے کیا کر رہے ہیں؟ جلدی جلدی اس دیگن کو بلانے۔“

اب پارہ کسی رویت کی طرح نکل کرنا ہوا تھوڑی دیر میں تین منہ سٹاپ پہ اس دیگن کے پیچھے

۔۔۔ دیگن کا پیچھا مست چھوڑنا۔ ”میں نے اسے قسم دیا تھا۔ وہ بے پارہ ہر سٹاپ پہ اس کے
ساتھ درمیں چلیں والی آنکھوں میں ڈنگی لگا رہتا۔ سڑک لاٹوں پر یا دربار کے سامنے پہنچ کر وہ بکھریا
ہوا ہوتا۔“

”اب آپ نے انہیں پارہ سے جاتا ہے یا اسی دیگن کے پیچھے دیکھتے ہیں؟“ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ
”اب وہ کھڑے رہے۔“

”میں نے ان آنکھوں سے آنکھیں ہٹا لے بغیر اسے جواب دیا۔“

”گراچی کی فلائیٹ کا وقت گزر چکا ہے۔ تم صرف اور صرف اس دیگن کو فالو کرتے رہو۔۔۔ دیگن

آگے اور ٹیکسی پیچھے۔ بیسوں کی فکر نہ کرنا، مجھ کو گھسے ملے گا۔“

پتہ نہیں وہ کیا سمجھا اور کیا نہ سمجھا مگر اتنا ضرور سمجھ گیا ہوگا۔ بڑھاظر کی بے انگن میں فرمت بہت لڑکی کو دکھایا ہے اسے بنالے کی غرض سے چھپا کر رہا۔ میری بات کے جواب میں معنی خیز مسکراہٹ سے کہنے لگا۔

”فکر نہ کرو امرکار! آپ دنگن ہمارے آگے آگے ہی رہے گی۔“

واقعی پھر اس نے دنگن کو اکیلا نہیں چھوڑا۔ آنکھوں والا معاملہ تو اس کے دم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ یہی چھوٹا چھوٹا اور بھٹن مٹی تھیلے تھیلے ہم اسٹیشن کے سامنے پہنچی گئے۔ یہاں سٹینڈ پر دنگنیں ایک تھیلے میں بیٹھتی ہیں اور پھر اپنی اپنی باری پر سواریاں بھر کے نکلتی ہیں۔ میرے حکم کے مطابق ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ٹیکسی دنگن کے پیچھے رکھی ہوئی تھی تاکہ یہ سب دیکھنے پہنچنے اپنی صورت کی دہا اور دنگنیں پہنچی آگے دنگن کے پیچھے قطار میں نکلتی آسمان اور مجھے دیکھ کر اگلی دنگن اور گھسی دنگنوں والے ڈرائیور نے اسے آگے رکھی دنگن والا وہ بے مہر افساف سحرے کپڑوں اور چہرے سرے والا ڈرائیور مجھے گراں گراں سے توتا ہوا اسٹیشن ڈرائیور سے ملے طلب ہوا۔

UrduPhoto.com

”اچھا جی! آپ شاہ نور سے میرے آگے آگے تھے پارکمن آباد سڑک سے یہاں دنگن تک۔“
 پیچھے پیچھے دنگن میں خوب کاکوئی بندہ تھا یا۔“

میں کیا جواب دیتا۔ ”جی ہاں، کاکوئی بندہ تھا۔“
 بولے جان چھوٹے۔ ”اسی سوسے محل اگر کاکوئی پیدا ہو جائے تو میں جی کہنے میں ہی بہتری نہ ہوں گی۔ اس سے مجھے کیسا ہی نقصان پہنچے۔“ میں نے جی کڑا کر کے اس کی دنگن کی جانب اشارہ کر کے کہا۔
 ”بنا اور اسلئے مجھے دنگن والی خوبصورت آنکھوں نے برا متاثر کیا۔ بس میں بے خود ہو گیا۔“
 دنگن کا چھپا کرنے پر مجبور ہو گیا۔“

وہ پہلے تو مجھے کھا جائے والی نظروں سے ٹھوکر مارا پھر انتہائی تلخ لہجے میں دھار دھار۔
 ”بڑا گواہ کیا کرو کہ کم از کم اپنی عمر اور اپنی مالک میں کاحیال کرو۔“ وہ میرے ساتھ تھمیں جاتی تھی۔
 کی باتیں ہے۔ اس کا خاندان چالیس میں امرتھ۔ ایک مقامیہ میں شریہ ہو گیا۔ تین بچوں کی ماں ہے۔
 اس کی مدد کے لئے رقم دی ہے۔ اس نے بچوں کی تعلیم و تربیت اور گھر کی اخراجات پر دے کر لے لی۔
 دنگن ڈال لی۔ آج پہلے دن یہ دنگن روڑ پہ آئی ہے اور وہ بسم اللہ کے لئے میرے ساتھ دنگن پر بیٹھا ہے۔

جس کے برابر ہے۔ بیٹیاں خوبصورت اور خوبصورت آنکھوں والی بھی ہوتی ہیں۔ کیا ماں باپ ان کی
پس پشت ہو کر سر دکھیں؟ ان کا بچہ چاہتے ہیں.....؟“

میں اس شریف آدمی کی یہ باتیں سن رہا تھا اور مسلسل سامنے اس چہرے والی آنکھوں کو بھی دیکھ رہا
تھا۔ منہ میں منہ میں اپنی منافی میں بھی کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ نظریں سامنے آنکھوں پر تھامے
رہے۔ نے صرف اتنا کہا۔

”مجھے معاف کرے اور تم بھی مجھے معاف کر دو۔“

ماہی گھر تک سارا راستہ ٹیکسی ڈرائیور خاموش رہا اور میں بھی کہ میں چشم تصور سے انہی چشم آہو
دیکھ رہا تھا۔

چشم آہو چشم لیلیٰ پیاسی نظریں دیدہ کی دلی مری آنکھیں پائے زکھیاں نکاح شوق حسرت دیدار
میں دم جھم دم جھم۔ آنکھوں کو رہے وہ آنکھوں کے آس پاس انہیں مری زمین جھرو کے وغیرہ
اس لڑکے کے بے شمار الفاظ اور مسرے آپ کوڑوں ڈیگیوں زکشاؤں کے پیچھے پڑنے کے لئے اور
رنگین سیلی نشلی آنکھیں دیکھنے کو لیں گی۔ سفر سے تھکا ہوا اور سوجھا ہوا کھنکھاتا ہوا

UrduPhoto.com

ہاتھ اس آرم کے سواغ کے ایب کوٹے میں بے عیالی سے پڑی ہوئی آنکھوں کی تصویر کی ہو
میں کی غیر معمولی کشش کے مجھے بے اختیار لگاؤ تھا۔ میں نے اس کوٹے پر پہنچ کر اس
کوٹے پر لگا ہوا تھا یہ شاید چار گولی سے بنا ہوا کچھ تھا۔ آنکھیں واضح تھیں اور باقی چیز واحد کے میں
تھیں۔ عمل اور برتاؤ اس کی اکثر تصاویر میں نمایاں تھا۔ لگتا تھا اسے نفس آنکھوں سے اک تعلق خاص
تھا۔ چشم چہرہ اور دیگر اعضاء اس کے لئے غیر اہم سے ہیں۔

آخر کی کشش اور سحر انگیزی میں جہاں دنیوی دنیا تھی۔ انہیں انداز لگے کی نیکیوں سپیدی
سے لگاؤ کی گیرانی اعلیٰ سربراہ مہربان اور سحر جی رنگوں کا نظریہ استخراج اور پتلی کا بیاد مری نکاح نقطہ
تھا۔ کہتے ہیں۔ ہیں آنکھ کے کوٹے کی کالی جڑ آخر کی آپ کی تاب نہ لے دو لہجی مڑگان اور کہتے ہیں
کہ جہاں شامل ہوتا ہے۔ یہ سب اصناف اوصاف اور جمال میں کے سحر آخر جی اور دلتا نہیں تاثر
سب سے ہیں اور یہ بھی کہ صاحب چشم و نظریہ اپنی ذات و شہم بچا اور احساسات میں کیسا لگتی و شمع ہے۔
کے لئے جذباتی کیفیات کس اون اور نوح کی ہیں۔ ایسی سرینت اور مہذبیت لوم سانپ میں بدرجہا شہم اور

بنام ہے اکہ مخصوص شہرت و اہمیت کا حامل رہا ہے۔ خاص طور پر ہندوستانی ناری کا تصور ہی دوسری دنیا میں سائنس کی سولٹی ہی رحمت کو راز گھیری مثلیں زلفوں چھری بدن اور سیاہ لہو ارہلکس والے کتار مینوں سے ابھرتا ہے۔

اسلام ایسے تمام علوم و فنون کی نئی کرتا ہے۔ جو دینی عقائد اور انسانیت کی سلامتی کے خلاف ہوں۔ محض تصنیع اوقات کی ذیل میں آتے ہیں۔ یہ علوم علوم نافع کے نقیض ہیں۔ مگر ہاں ایک آدھ صورت سے ان علوم کا حصول اگر محض جاننے یا سمجھنے کی حد تک ملے ہو اور مقصد ان کا انسداد کرنا۔ ان کی حقیقت سے لانا اور ان کا توڑ تلاش کرنا ہے تو پھر ان کا جاننا کسی حد تک روا ہو سکتا ہے۔ جیسے اگر کوئی شخص منشیات سے متعلق نہیں کرتا مگر وہ ادارہ انسداد منشیات کے افعال و کردار سے واقف ہوتا ہے اصل نقل کی پہچان کے بارے میں ہو کہ اس کے مضمرات اور مضرات کا کوئی تو عمومی تلاش کو مصلحت قانون کے محافظ اگر قانون شکنوں سے زیادہ ان کی وارداتوں کو دیکھ جانتے ہوں تو وہ کچھ بہتر انداز میں اپنے فرائض کو انجام دے نہیں پائیں گے۔ میر کسی سوا میر کے آگے جہاں کسی ذیل کے آگے۔ مگر جہاں کسی جہاں میر کے آگے اور اسلام ہی و فروع ہوتے کے آگے ہی اخیر ہوتے ہیں۔

UrduPhoto.com

ان غیر و کچھ بہت دور چند بے حق علوم ہیں۔ ان کا اقرار ضروری نہیں مگر انکار بھی ممکن نہیں۔ یہ جنہم الرحیم کے ساتھ شیطان الرحیم کا تصور بھی موجود ہے۔ دونوں سے انکار ممکن نہیں۔ جنہم سے نکلے اور اس کی توحیدیت و اس میں سے چھٹا ہوا اصل کرنے کے لئے اگر قرآنی آیات اور احادیث کا حاکم پڑھیں چاہیں اور ان میں یہ معلوم کرنا چاہیں کہ شیطان مردود اپنے کین زبوں اور جھگڑوں کو کھاتے لاکر ہمیں ڈرلاتا ہے۔ اگر ہمارے پاس یہ علم نہیں تو ہمارا ہی حشر ہو سکتا ہے جو ایک پروردگار کے نیکر کے فقیر مولانا صاحب کا ہوا تھا۔

● ابلیس اپنے چیلوں کے ساتھ.....!

شیطان الزحیم اپنی ایک ترقی و تک شاپ میں اپنے پیٹے چانوں کو لپکھ رہا تھا۔ یہ خطاب کے بعد آخر میں تاکید مکرر کے طور پر ایک خاص کتبے پڑھ دیتے ہوئے کہنے لگا۔ میر میرے ماننے والو ابلیس چیلو! میرے اس حکم اور ہدایت کو مضبوطی سے پکے ہاتھ لو کہ کبھی کسی عالم کو نہ دے گا۔

کے لئے۔ اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا تو وہ اپنے الہیاتی علم کے نور سے تمہیں جلا کر خاکستر کر دے گا۔ اس کے برعکس تم عام لوگوں، نام نہاد عالموں، جمعراتی مولویوں، ختم مولوی، حقائق قاریوں اور نمبر بنانے والوں کو خوب چمکے دے سکتے ہو۔ اس گھسیٹے کتے پہ آپس میں خوب سوال و جواب ہوئے۔ لیکن حقیقت یہ محسوس ہوا کہ اس کے شاگرد اس کتے کو کاٹتے سمجھ نہیں پاتے۔ اس نے مجلس پر غاصت کرتے ہوئے کہا: ”تم سب سٹوڈنٹ میرے ساتھ چلو میں تمہیں کچھ پریکٹیکل کرواتا ہوں۔“

سب چیلوں کے فرشتوں سے خلیے ہوائے اور خود ایک برگزیدہ اعلیٰ ذات کا ربیر فرشتہ بن کر وہ شہر کے مشہور نیک نام و نمود مولوی صاحب کے خجرو کے دروازے پہ دستک دے رہا تھا۔ آدھی رات چھپے ہوئے مولوی صاحب تہجد کی نیت کیے مولوانی کے پیلو میں آسودہ استراحت تھے۔ دروازہ کھٹکنے سے پہلے سوچنے لگے اس وقت کوئی اور پھر ہوش میں آیا تو یہ حلقہ کے مولوی دانی اور پولیس کے سپرنٹنڈنٹ کسی وقت بھی پہنچ سکتا ہے۔ بادل ٹھوس آٹھ سترہا چاہتے ہوئے دروازے تک آئے۔ ”چھا۔ کون؟“ جواب میں بڑی گہری نستعلیق نورانی سی ”السلام علیکم وعلیٰ اہل بیت“ کہی گئی۔

”سوچا کیسے الٹی لائی لڑاؤ باوقار آواز۔۔۔؟“

”آپ اعلیٰ حضرت کون؟“ اس وقت رحمت فرمائی: ”آپ کہاں سے تشریف لاتے ہیں؟“ جواب میں اعلیٰ آفاقی سا آہنگ پڑا سرار سالک: ”مولانا اللہ و سایا صاحب اور وارو دا کیجئے۔ آپ کی مناجاتیں سنیں گے انہیں اور اللہ تعالیٰ ہاتھ بڑھا کر لڑکا کھولے گا اور کھولیتے گا وقت نہیں ہاتھ سے نہ لگا پائے۔“

اے قریب سرمدی سی سرشاری سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے نورانی چہرے، مکتوبی خندہ خالی، خندہ خندہ چہرے، وچ والے فرشتے کھڑے ہیں۔ جہو میں اور تک مکتوبی انکس ہاتھ باندھنے سے تھکے ہیں۔ نصف شب کے اندھیرے میں اک عجیب سی روشنی چمکی ہوئی تھی۔ جبکہ انہی ہی وقت میں جہان میں اک تاریکی سی لہرائی گئی تھی۔ انہیں سر دھڑک رہا تھا کہ فرشتے کا روپ دھارے ہوئے فرشتہ بجالا کر گویا ہوا۔

”مولانا اللہ و سایا صاحب! آپ کو مبارک ہو۔“ ساتتائیں آسمان کی جانب سے آپ کو سلام پہنچا کر آپ کی شان و باری کی قراریں مہادتیں، شہ شریف، مولود شریف، نکات، ہمارے اور مسجد میں جمع ہو گئے۔ ضلع لالچ سے پاک اور اخلاق و اخلاص سے جھری پور زندگی کے پیش نظر بلکہ متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ

نے آج کی رات آپ کو عرض یہ مدعو کیا ہے۔ میں جبرئیل ہوں جو خصوصی طور پر آپ کو پورے پروتوکول کے ساتھ لے جانے کی خاطر مقرر ہزار قد سیوں کے ہمراہ حاضر ہوا ہوں۔ لہذا آپ فوراً لباس تبدیل فرما کر تیار ہوجائیں کہ وہ سامنے والے پہاڑ پر آسانی سواری آپ کی راہ دیکھ رہی ہے۔

بن سوچے سمجھے کہ جبرئیل اب زمین پر اتر سکتے ہیں یا نہیں وہ نام نہاد بے علم، عقل مولوی قیامت کی خوشی تیار ہو گیا۔ اگلا سید ہالباس تبدیل کیا اور ساتھ چل دیا۔ پہاڑ کی چوٹی پہنچ کر شیطان نے دھماکے سے دوسری طرف گمراہ دیا۔ اس کے بعد شیطان اپنے نولے کے ساتھ اک صاحب بصیرت عالم کے ہاں پہنچا۔ دین و دنیا کے پییدہ پییدہ علوم سے بہرہ ور رہی نہیں بلکہ چند ایسے علوم بھی جانتا تھا جو مردِ حق نہیں تھے۔ یہ علم اُس نے بحیثیت طاغوتیت اور شر و شذوذیت سے رات کے لئے سیکھ رکھے تھے۔ شیطان نے وہی حکم دیا بھی دہرایا۔ اس صاحب علم و فضل سے تمام بات سن لی اور لباس بھی تبدیل کا کہہ کر اندر چلا گیا۔ بعد واپس پلٹا تو اس کے ہاتھ میں لوہے کے کیلوں سے جڑا ایک مضبوط سا کھنڈا تھا۔ آتے ہی اس نے لا حول والا قوت کا اثر بلند کرتے ہوئے شیطان کی اصرانی شروع کر دی۔ چار چوٹ کی کھنڈا کو شیطان کی چیلوں کے ساتھ لودو گیا رہ ہو گیا۔

UrduPhoto.com

”یہ بڑے شاندار اہم نے دیکھ لیا کہ ہم کیا ہوتا ہے؟ اس نام نہاد عقل و علم سے پاک مولوی کا علم محض کراہی اور انسانی کتابی سا تھا۔ یہ تیر کا فقیر مولوی ظہیر سے ہوئے کہنے آئے کالی کھنڈے کی مانند تھا ایسے پانی میں پتھر کی طرح نہ گرتے ہیں مگر چھلکی نہیں ہوتی۔ پتھر ہاں کے ہاں پتھر سے میٹھا کون کے ہاں محض لڑا ہٹ ہوتی ہے۔ چھلکی کی مانند کارآمد شئی تو جو نہیں ہوتا۔ تمہارا آسان بھگت کہ تھوڑے لمحے لوگ ہیں۔ یاد رکھو علم عقل و امان کے قریب مرست پھٹنا یہ تمہارے چھل میں نہیں پھنسیں گے۔“

باتِ قوت باصرہ کی دوری قی برائت کی طرح بڑھتے جاتے ہیں کہیں سے کہیں نہ ہوتا ہے۔ سر کا پتہ نہ پاؤں کی خبر۔ خاصا بخر و فقیر کیا گیا ہے بڑگ و عظیم گل کھلاتا ہے۔ دس میں سے ایک ظاہری تسکون میں باصرہ پہلے درجہ پہ ہے۔ باصرہ سامعہ شامہ لامعہ اور اذائقہ۔ باقی پانچ باطنی حسوں سے بہرہ مند سمجھ نہیں ہوش اور اداسان۔۔۔ یہاں عقلِ اولیٰ ہے۔ فکری اور اعصابی طور پر پورا انسانی جسمانی کھنڈا کی خبر پر انحصار کرتا ہے۔ خود وہ جذبات ہوں یا لیا اات۔ سوچ ہو یا کوئی سوچ۔ حقیقت ہو یا رعب۔ سارے اچھے بُرے ذہنی انہی دس عدد حسیات کے مرکب میں مشتمل ہیں۔ اگر یہ حسیں توانا اور راست ہوں

برائو نے اچس کے شانز لے سے ماسکو لڑا تو اسلٹی امیونج بھو ہا نسرگ روم اور برسلز تک اس کے فوجی دستوں کا غلبہ بٹا تھا۔ اسی طرح اردو کا خلیماں باکوف ٹرکی کا زحیم را پاشا مصری جادوگر آفر مصری ہندوستان کے گوجیا پاشا ٹولکے کا راجندرناک بھائی برطانیہ کا بیجک ماسٹر سے این منگلین جبکہ ازمنہ قریب کے خلیما جادوگروں شعبہ ہاروں میں ہیر و ٹامس رابرٹ ہودین جین ہوجین کے نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہاں جادوگر جو ہاف مین کے نام سے مشہور تھا بڑی حیرت انگیز صلاحیتوں کا حامل تھا۔ شکر دو پہرے پر سات بجے دیتا تھا۔ لوہے کی سلاخوں کو گولی کی گز کی مانند چبا کھا جاتا۔ وہ اپنی گاڑی کی ٹینگی پٹرول کی بجائے پانی سے بھرتا تھا۔ دیکھتے انگاروں اور آب شور سے ناشتہ... ظہران اور عصران ہیوٹ ہیرنگ کی آہنی گولیوں کو کھانے کر دہ آکل کا ٹوپ کا پر کے آدھے انجی موئے پٹروں کے ٹوسٹ استعمال کرتا۔ اس کے پسندیدہ مشروب پٹرول میزلی گندھک اور لٹک کا میز آب تھے۔ وہ دو بجے کا بچوں اور کیلوں کے آرام دہ ہسٹ پ مین تھا۔ حیف کہ زندگی بھر وہ کبھی طیل نہیں ہوا۔ کسی لاکٹر حکیم یا ہسپتال سے وہ واقف نہ تھا۔ اس کی موت کے عجیب و غریب حالات میں واقع ہوئی۔ وہ چیکو سلواکیہ میں ایک شہر برگرام کے قلعہ میں چنگیز نے قتل کرنے کی فرسختی سے ایک آرام گری پر دراز تھا۔ ایک شنگ کی اوٹنی چھت سے ایک شنگ بھی پھیل گئی۔ آن کرئی۔ کھانے میں دو گولی میں اس کا سر کاٹ دیا گیا۔ بھاری کا سیم پینے ہوئے ایک چادر کے سے وہ مس تھک کر ہوئی تھی۔ کانے دانے کا تو سوال ہی پیدا نہ تھا۔ مگر کیا کہے کہ یہ جادوگر انھیں یہ ہے۔ خدائی چھپتی کے خوف سے ہی چس ہوا۔

ہندوستان میں صرف ان کے چاندی کے شہید کوہوں کی ایک ایسی خاصی تعداد موجود ہے۔
 ان کی ایک بڑی وجہ ان کا عقیدہ دیا کہ بھگت ہے۔ دیکھا جائے تو ہندوؤں کے روحانی ثقافتی تہذیبی
 معاشرتی اور تمدنی رجحانات ان کے مذہبی اسلوب بھی ہیں۔ منتر جتر منتر پرستہ رشتہ ہیں۔
 دیویاں، لکھوت پرست، پلٹ شہزاد شہزاد، شہن شہنوں پرست، ان کے ہاں روزمرہ کی طرح ہیں۔
 سادہ سادہ ہوتی ہیں ان کی فوجی چارہ گز، گرم چارہ، گرم چارہ ان کی ضرورت ہوتے ہیں۔
 حکومتی سطح پر ان کی خوب پذیرائی بھی ہوتی ہے۔ مہاراشٹر کے مرکزی شہر ممبئی میں چند ایک تھیں۔
 صرف جاوہری کر تب اور شہید گری کے کمالات رکھتے ہیں۔ یہاں کی کوئی فیملی ان کی سربراہی
 مشہور ہیں۔ ان جاوہریوں نے چند مندر، جاوہری کر تب ایسا کیے، ان سے پذیرائی حاصل کی۔
 بیرون ملک بھی خوب وام اور نام لکھا ہے۔

آج کے بیشتر ممالک کی طرح پاکستان میں بینہ ماہ سبز قرض کا جس تخفیف یافتہ آرٹ گیلری

میں یہ نظم اور اس کے ساتھ ساتھ بھنگ تھیز زبھی موجود ہیں جو ان کی ثقافت کا ایک نمایاں حصہ ہیں۔
 معاشرے کی تحریف شاید یوں ہے کہ وہ زندگی کی گونا گوں گھما گھماؤں اور دلچسپیوں سے بھی
 ہٹ جاتا ہے۔ اپنی تہذیب، ثقافت اور لوگ ورثہ سے جڑت کے ساتھ ساتھ اپنی روایات کی رخشندگی کا بھی
 حصہ ہے۔ انسانی جسمانی نظام کو اگر پرچشم عینی دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تختہ بندی، اعمال و خیالات
 طویل و خرابی اور مخالف زندگانی میں اک گونہ توازن قائم رکھنے سے برقرار رہتی ہے۔ اسی طرح
 میں اسی نوع کے توازن کی ضرورت ہوتی ہے۔

کیا اچھا ہے کیا بُرا؟ لیکن ہمارے معاشرے میں فنون لطیفہ بھری نظروں سے نہیں دیکھا
 جاتا۔ مصوری، شعر و شاعری، رقص، ہنرمندی، تصویر کشی، فلم سازی وغیرہ۔ شاید اس لئے بھی کہ
 یہ سب شہر میں یا اشغال اور دہلیز میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن ہاں تصویر وغیرہ بھی شیطانی اکھاڑے سمجھے
 جاتے ہیں کہ یہ سب فنون لطیفہ ایک طرح کے فنون کفر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن کیا ہونا مکروہ حرام مگر
 کفر کے دلی اور ذہن اگر کوئی نعمت کو کفر یا نعمت میں فتنہ کر لیتا ہے تو یہی ہمارے مشرف اسلام ہونے
 کے بعد ہونا چاہئے۔ یہ اصول طیب، بھلا، مکروہ یا حرام، اگر کسی طبع یا احساس کے ذریعہ آتی ہو تو کوئی حد
 نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کے ذریعے کوئی ایسا کام کرے جو دینی اصولوں سے میل جول رکھتا ہو تو اس میں اکثر
 مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ دائیں بائیں دیکھئے ہمارے ساتھی، کبھی فتنے سے تال ہل رہے ہوتے
 ہیں، کبھی اور اصول کے صداق آواز منہ سے پیدا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اللہ کبریا ہے ہوتے
 ہیں، اللہ تعالیٰ اور جذبی کیفیت میں کیا اور نہ ہونی چاہئے۔ اگر واقعی اللہ کبریا ہے ہوتے ہیں تو
 اللہ تعالیٰ آپس کی بجائے طبع کی تال تھاپ کی آواز کیوں ابھرتی ہے جب تک کہ اللہ اور اس کے
 کلام پر گزیرہ دستیوں کے نام انقلاب اچھے واضح اور محبت پرے انداز میں لیا کر۔ قرآن العظیم
 کے طبع الہامی اور خوش بولی سے کیا کر۔ اعراب و مخارج کی ادائیگوہات سے نہیں سہولت سے
 لکھ کر پڑھتے پسندیدہ اور اجر آگئیں ہیں۔ اسی طرح رقص و سرود کو بھی ہم نے قحط و سرود اور گیتیں
 کے طبع میں بدل کر اپنے لئے حلال کر لیا ہے۔ فنون لطیفہ کی دیگر اصناف بھی اسی طرح کی رفاہ بدل سے
 ہوتی ہیں۔ دیکھا جائے تو اس قسم کی منافقت نہ ہرے میاں دار، چالانی ہو یا ساری کے ہم سماں
 کے۔ اب آپ اپنے قومی انقلاب راہ کر دیکھ لیں۔ وہ پورا کو پھونک کر سب ہی قوم کا جہ و خرقہ کرنے پہ
 پورے ہیں۔ پورے کے پورے زمین، سفحائے جاوید گروں، غاموں، کالوں، باہوں کے گمراہ کن اشتہارات
 لگائے پڑے ہیں۔ ایک رات کے ٹل سے بکڑے کام سنورنے کے دھوئے۔ محبت، شادی، کاروبار

وہ مگر یہ ہونٹوں میں دبا کے میرے سر پہ کھڑا تھا اور میں آنکھوں میں یوں کھویا ہوا کہ اس کے اندر
 کچھ نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ کھڑا کرتے ہوئے جڑ بڑ سا گویا ہوا۔

کھولی اتم یہاں یہ آنکھیں دیکھ رہے ہو اور میں باہر تہجاری تراؤ دیکھ رہا ہوں۔ آگے بڑھ کر اس نے
 ہاتھ ہاتھوں سے دو آنکھوں والا کیوں کا نکڑا لے لیا۔ ”آؤ باہر آؤ۔“ میں تمہیں گرم گرم قبوہ چلواتا
 تھا۔ وہ کیوں کے نکڑے پہ چھتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم چاہو تو یہ آنکھ لے بھی سکتے ہو۔“
 ہر پہنچ کر اس نے مجھے گھڑی کے ایک چھوٹے سے سٹول پہ بٹھا دیا۔ تھرماں سے قبوہ اٹھ پلٹے ہوئے
 آگے گئی جہاں ہوں کہ تم بھی میری طرح خاصے کھسکے ہوئے ہو۔ اسی سٹے میں نے تمہیں اپنے ساتھ کھلایا
 تھا۔ لو یہ قبوہ فوش جان کر دو اور مجھے کام کرتے ہوئے دیکھو۔ مگر خاموشی اور صبر کے ساتھ۔“

اس قبیل کے آؤٹ کلاں لوگ بہت کم ایسے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کی بے اعتدالیوں بے یازیں اور
 غریب مجنونانہ حرکات و سحر و فیات انہیں تنہا نہیں چھوڑتیں۔ عمد حیف کہ ان کے غیر موزوں رویوں اور
 غریب خیالات کے باوجود ان کی مقبولیت و مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ کیسے کہ ایسے و کبیر
 کے تہذیبی جن کی جتنی ذراہوں سے انگریزی ہوتی ہے۔ ان کو انہیں نے اپنی فطرت سے دیکھتے
 ہیں۔ ان کی یہ رویاں۔ سیریں یا کمال یا وہاں کھارے کے طور پر اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ اپنی طرف کے
 ہر چیز کو دیکھ رہا تھا کیسے کیسے وی حیثیت لوگ اس ننگی زرد زرد رنگی سے آواز دے کھائی دینے
 کے لئے کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے ہو کہیں باہر مٹلی سے اترتا ہوا کوئی صورت گزرا اور وہ سب اس کی
 حرکت کے خطر ہوں۔ میں نے کچھ حیرت انگیز کی کہ اس نے اپنے ہاتھ دھو کر پکڑے۔ وہ گار ہوتے ہیں ایسی
 کچھ کچھ پاتے ہیں جو بالآخر ان کی طبیعت اور فنی زندگی کی گھبراہٹ سے بچنے میں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ وہ پتلے
 ہاتھوں میں نچر سا سکرینٹ دبا کے جکے جکے شے لے رہا تھا اور سکرینٹ کی زانچہ تھی مگر یہ کہ اب گری۔
 کھڑی اور بھی ہونٹوں پہ لٹکی ہوئی ہو گئیں اس پر مستزاد گئے میں ڈالا ہوا پاسٹک کا اجڑا۔ جس پہ
 کچھ کچھ ایک عجیب سی لہریوں والا پودا بنا ہوا تھا اس شکل میں کہ جوں کی بھائے مختلف کیفیٹوں کو
 اپنے سرے میں تھے اور گول بچوں کی جگہ ٹورنٹ۔ ان لہریوں سے آہٹلے ہوئے کئی ایک شیلڈ اور
 کچھ کچھ شے کے نیچے جہاں ہوتی ہو۔ کچھ شے کا کمال تھا۔ اس دھات پان سے آرٹس کی فنی
 کھڑکی نے مجھے بہت دھڑک کر دکھایا تھا۔ اس محسوس ہونے لگا جیسے قد سے بھر و بصیرت
 سے ہر شے اس دانائے ختم چشم کو مٹا کر دی ہوئی۔ میں بھلا و استجاب و اشتیاق اسے شائقین کے کچھ
 کچھ دیکھ رہا تھا وہ کمال یکسوئی سے مصروف کار تھا۔ ایسا منہمک کہ جیسے یہ کام اس کی زندگی کا آخری

کسی شخصیت منزل کے منتہی ہوتے ہیں۔ میں تو ہواؤں کے دوش پہ پھوس کے بے وقیر تنہائی
 کے شہر پہ بچے کسی درخت کے ٹوٹے پتے کی طرح۔ آمدنیوں کے انگ لگے کسی پھٹی جھڑی کے
 پتوں کی صورت۔ گرداب دریا میں چکراتے ہوئے کسی ٹوٹی پتھر کے ٹکڑے کی سی حالت آشفٹگی میں
 تھی۔ جہاں فطری اور جہتی جسمانی تعلیمی دنیاوی اور روحانی ترکیب و تعمیر کی تہذیب ہی کچھ یوں تھی کہ میں کچھ
 سمجھنے سے بھی کچھ نہ تھا۔ اور یا پھر کچھ تھا ہی نہیں اور بہت کچھ تھا۔ اس ہونے نہ ہونے کی کیفیت مجھے
 کتنی تھی۔ کہیں کچھ ہوتا یا نہ ہوتا نہیں اگر ہوا اس طرف کی چل پڑی تو میں بھی ادھر چل دیا۔ کیوں کیا
 دیکھتے تھے لہذا اور معنی پہ غور کرتا تو شاید میری نمرشت میں ہی نہیں تھا۔

میں بھی کہیں غرض کر چکا ہوں انسانی حیوانی اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ غیر مرئی مخلوق کی مانتی ترانہ بھی
 کہتا ہوں۔ اس طور طریق ظاہری پائنی حرکات و استحال کا مطالعہ علیحدہ مصرعات کا ایک نمایاں حصہ رہا
 ہے۔ جہاں ہوا یا عنصری مخلوق ہر کسی میں کوئی نہ کوئی ترجیحی خوبی خالی اور وہجوی عنصری نمایاں نشانی
 ہوتی ہے اور جہاں کہیں وہ موجود ہوں وہاں ان علامات سے اپنی نشاندہی کر چکتی ہیں۔ کچھ
 ان کی کھڑکیوں پر انہیں مخصوص برقعہ پوشی سے اپنی پہچان کرواتے ہیں۔ کچھ اپنے آئینے اور کچھ اپنی
 آنکھوں سے۔ ان عوامل میں حضرت انسان خصوصاً میں ملے پہ قابل ذکر ہے۔ یہ اپنے تمام احوال اور عقلی
 اعمالوں کی ہر ایک انگ ہی مقام رکھتا ہے۔ اس کے ظاہری دیگر میں سمجھنے والی اور اصول مند
 سمجھتی ہیں۔ شاید میری یہ بات آسانی سے سمجھ میں نہ آئے۔ ذرا غور کریں تو سمجھیں آتا ہے کہ آنکھیں
 ہر اور فعل کی ابتدا ہیں۔ ہر جگہ یا احساس سوچا۔ ایک زائر آنکھ کا مہیون منت ہے۔ خوبصورتی
 آنکھوں سے ہی ہوتی ہے۔ آنکھوں میں دم نہ ہو تو حسن سے متعلق پہنچ بے اہم ہی رہ جاتی ہے
 کہ شاعری رقص ہو کہ مجسم سازی کا پایا بھانا آنکھیں بڑا کردار ادا کرتی ہیں۔

پہری ہزاروں نائیوں میں میری نمایاں کڑوی حسنین، رگسی، کنول، حورو آنکھیں نہیں
 تھیں۔ خوف کے خلاف میں لپٹے ہوئے نہیں۔ پاگل اپنے عشق اور فاطمی کی اہل میں
 سے ٹھوٹے سے نہیں۔ چونکہ جانے والے اچھے صوفی، بدک پڑنے والے غین، جھٹ سے پخت
 سے بیکے بیکے نہیں۔

ہندوستان کے کلاسیکل فلم ڈائریکٹر اراپتھ کیر اور مرزا جو راج پور کے گرو بھی تھے کا تصنیف شکر نوح

سیا نگوٹ سے تھا۔ پر تھوڑی دیر کی پھر اس کو بڑا امان دیتا تھا۔ یہ اپنے اسلوب کا ایک نادر روزگار فنکار تھا۔ اس نے بمبئی میں جتنا بھی کام کیا۔ وہ کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی ایک فلم ”باورے فین“ تھی۔ جس سے گیتا ہالی نے بڑی خوبصورت اداکاری کی۔ یہ فلم میں نے کم از کم میں بار دیکھی تھی۔ میں جانتا چاہتا تھا اس کا نام ”باورے فین“ کیوں ہے۔ میں پڑا امراد فیناں کو صرف فینوں کے حوالے سے دیکھنے کے لئے ہوا تھا اور ممبئی گھر سے بھاگ کر گیا۔ لاہور میں ایک اداکارہ فیناں تھی اسے بھی اسی وجہ سے دیکھا۔ آہو چھوٹا اداکارہ شاہینہ عشرت جہاں جو بعد میں بائی کے ہاں بھی لا جواب خوبصورت آنکھیں تھیں۔ اداکارہ۔ گیتا آنکھیں نہیں تھیں فین تھے۔ آنکھوں اور فینوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ آنکھیں محض دیکھنے یا دکھانے کے لئے ہوتی ہیں اور تھک فین؟

دیکھیں امراد ہولی مرحوم و مفلوج کے ہاں جس زمانے میں میں ”امیر واری“ کی مشقیں کیا کرتا تھا۔ اس نے ایک بار مجھے آنکھ لودھن کے ماہین کا فرق سمجھایا تھا۔ یہ ظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ آنکھ اور فین اور کاچہ چشمہ اور چشمہ وغیرہ یکساں معنوں میں ہی مستعمل ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ کچھ فیناں تھیں۔ شاید جسے شکل اور عشق مسلمان اور مسکن تھی اور بعد میں جسے جن کے ہی معنوی تھے وہ آنکھ اور فین میں ہی ایک بڑا فرق ہے۔ وہ ایک اور چیز ہے۔ فیناں کی آنکھوں کی تلاش میں تھا اور اور میں بھی ان فینوں کی وجہ سے عین حال کے آگے تھا۔ مجھے یقین ہے اس نے اپنی فنی اور باطنی بالیدگی سے مجھے پہچان لیا تھا۔ اب مجھے جاننے کی غرض سے ساتھ شامل ملوٹ کیا۔ اس وقت مختصر ہی صحبت میں مجھے اس کے ہنر اور میں جھانکنے کا موقع مل گیا۔ تاکہ جہانگ کے دوران ایک گولے میں پڑے کیوں کے ایک نامکمل سے کچھ نے مجھے پکارا تھا۔ ایک زمانے کے بعد میں نے اپنے بارے میں دیکھے کہ جنہوں نے دیکھنے کی آرزو میں میں باورہ کو کر دیا تھا۔ لیکن چاروں طرف میرا دلیر دیاں رہا کہ میں فلم کی لٹاڑ میں اس کے ساتھ شریک ہوتا۔ پھر میں نے بادل خواستہ اپنے ہوٹل لوٹا۔ کھا گیا اس کے ساتھ۔ پورا دن میں اس کے پاس سٹول پہ بیٹھا اس کے انکھوں کی ”گٹھسناں“ کرتا رہتا رہتا۔ دن بھر اور قریب قریب ذاتی مصروفوں کی اپنی ایک ٹیبلٹ دہی پی رہا ہے۔ وہ حال خلیہ مشکل و مصورت اور اپنے طور طریقوں سے ہی پیچھا لے جاتے ہیں۔ اس ہدیہ وہ شہر وہ کہیں از مرقدیم کے باشندے دکھائی دیتے ہیں۔ شاید بچے آرٹسٹ کے پاس اک بیٹوئی کوٹھا ہوتی ہے جو اسے خود اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا ماکہ صرف اور صرف بیٹوں و فینوں سے ہی رہ جاتا ہے۔ اس کا بھی یہی عالم تھا۔ اپنے کام میں مصروف اسے کچھ ہوش نہ تھا۔

سکئی۔۔۔؟“ وہ مزید مزو لیتے ہوئے چمکنے لگا۔ ”تم یقیناً جانتے ہو گے سخی لوگ کسی نہ کسی طور غیر معمولی شے ہوتے ہیں۔ ایسے تنکیاے افراد کی ایک آواہ گ سچ بھی نہیں بلکہ دل و دماغ کی قریب قریب ساری شے انکی میز بھی ہوتی ہیں۔ بظاہر یہ بیکار و بیزار دکھائی دینے والے بڑے اوتارے ہوتے ہیں۔ مگر کمال سائنسدان شاعر ادیب وغیرہ۔“

یہ مصوّر بھی کمال کا آدمی تھا کھانا اور فرمانا دونوں کام ایک ساتھ کر رہا تھا۔ عربی النسل اور عربی تہذیب والے باتوں کے گارڈ ہوتے ہیں۔۔۔ کوئی دل ٹروے والا یا کوئی فقیر و رویش جس نے اپنا من مارا ہو جس کا اپنے کان کانے کروانے پہ نما ہو وہ ان کے آگے جم سکتا ہے۔ میں کمال قتل ویرداشت کا مظاہرہ کر رہا تھا شاید اس لئے بھی کہ میں اکثر ایسے ہی معرکوں کی بحر ابوں تلے تیش امام کا حکمتر بنا رہتا ہوں۔۔۔ ابتدا کھاتے ہوئی ہے پھر پوری گفتگو کی نواز مجھے خاموشی سے اگلنے کی اوجہ دے رہیں تھیں چلتی ہے۔ اُسے وقت دینے کی خاطر میں نے پوچھ لیا۔

”سکئی یعنی وہی تو نہیں جس نے مجھے طعام کا پھانا یوں تمھایا تھا جیسے اس کے اندر طفلہ فرطی کی بجائے بچہ کرینڈ اور ہوم میں ہم رکھے ہوئے ہوں اور اس کا بچہ ہے۔ اس نے عربی کا ایک عجیب سا لہجہ مارا کہ میں اس کی زبان پہ اس قدر تسلیم کر لیا کہ اس نے کہا کہ اس نے عربی کی بات نہ کر سکتا۔ وہ کہتے ہوئے اجابت میں سر جلاتے گا۔ منہ بھرے تھے نے اُسے لب جلاتے کی بات نہ کر سکتا تھی۔ میں نے سوچ کے لالہ واٹھاتے ہوئے یہ کہہ دیا۔

”تم بھی کچھ کم سخی نہ ہو۔۔۔“ اور ساتھ ہی میں نے بوجھا لکھتے ہوئے کہا ”شع سخی کا یہ اچھے اور سچے فنکار کی مجبوری ہوتی ہے درد و مکمل کیس کوئی ماصل نہیں کر سکتا۔ یعنی تخلیقی توانا نہیں ہو سکتا۔ رنج پہ ڈانے یا کسی مخصوص نقطہ ارتکاز پہ منتج کرنے کے لئے فنکار کا کھڑکا ہوا ہونا اور دکھائی دینا کھڑکا ضرورت ہوتی ہے۔ میں تو اس یعنی مطلع والے کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یقیناً کوئی سخی گپائی ہے جو اس کے کھڑکا لایا ہوا مردہ میزار ہے۔“

اور ان طعام اگر نہ لکھتے تھے پھل پھل پھل پھل مذاق لینے چلتے رہیں تو نہ صرف کھانے کا ان کی خدائیت وہ چند ہو جاتی ہے بلکہ ایسے خوشنوار ماحول میں بیٹ پڑا کھانا بھی جلد ختم ہو جاتا ہے۔ میں چلک کے ساتھ ساتھ خون صاف پیہا ہوتا ہے۔ ابسا لا بھرے مابول کی خوشنوار ریت آکھیر کر کے میں ایک سوٹر کروار ادا کرتی ہے۔ منہ میں لکھاب لازمہ کا چشمہ پھوٹ نکلتا ہے۔ طبیعت کا اس کے اندر مزاج کا ٹکڑہ ٹوڑ ہو جاتا ہے۔

[illegible]

اس نے ہمیں اس مخصوص کمرے میں بٹھایا جو شاید انتہائی معتبر اور خاص الخاص کاموں کے لئے تھا۔
 میں کیا داخل ہوئے محسوس ہوا، ہم کسی خفیہ نشان میں داخل ہو گئے ہیں۔ کمرے کا بیرون دروازہ ایک
 چھلکی جیسے آنکھ کے نقشے کا بنا ہوا۔ پورٹ کے پلوں کی جگہ بڑے بڑے نمایاں چھلکے تھے۔ ہم ان سب کے اندر
 پہنچے تو آگے سفید موتیوں کی چھلکی پڑی ہوئی تھی۔ یہ سیاہ موتیوں سے آنکھ کی پتلی بنی ہوئی تھی۔ اس سے
 کہہ کر سب اندر قدم رکھا تو یہ احساس ہوا کہ ہم کسی چشم نم میں اتر آئے ہیں۔ ہلکی ہلکی نم دار ہندوستان نے ہمیں
 یہ خوشگوار سی شگفتگی میں بھگو سادیا۔ ہم طلبہ سے ماحول میں ہر چیز غیر واضح سی تھی۔ لگا کہ ہم کسی نہایت بڑے

جس طرح سانپوں، شیپوں پر سیمے سیاہ دے ہوتے ہیں جو ان کے زہر و تریاق طریق و طور سے صاف جانکاری رکھتے ہیں۔ اسی طرح سمندروں، دریاؤں کے شیوار اور ناخدا بھی ہوتے ہیں۔ جو ان کے صحت، موسموں، لہروں، موجوں، گہرائیوں، پہنائیوں کے محرم ہوتے ہیں۔ اسی طرح شاید یہ سبکی سے مصوٰر بھی جانتے ہیں۔ کوئی پورے پیکر کو اہستہ دیتا ہے تو کوئی بچہ امن و پازیب اور کوئی گیسو لے تا ہمارہ تمکنت، جمال کو نکالتا ہے۔ عارضی ٹھٹھکوں اور چاہ و تمناؤں کو اور کہیں لب کی نزاکت اور کوئی آنکھوں، پکیوں اور ابروؤں کی بات کرتا ہے۔ مصوٰروں کی بھی اقسام ہوتی ہیں۔ فلسفی، صوفی، اجتہادی، مذہبی، تجربی، عسکریت پسند، امن پسند، ترقی پسند، اجتہاد پسند، تشدد پسند وغیرہ۔ کچھ حسن و جمال کو ہی پسند کرتے ہیں۔ چند بے محی جو محض کراہت و کدورت اور کسر و کسل کو ہی موضوع رکھتے ہیں۔ ایرانی، تورانی، کرد، عراقی، مصوٰر عسکریت اور وطنیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ فرانسیسی، جرمن، کھٹھن، ہندو، قدرتی مناظر، گل و غمر، فطرت کے خوبصورتیوں کے علاوہ انسانی معروضی مشاغل پر رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ امریکن، ہنگامہ باز، تیز، موٹر کاریں، گاڑیوں سے غرور، پولی اور بجری جہاز، شاہراہیں، رقص گاہیں۔ برٹش، کالٹن، پائمنے، گھوڑے، غریف، جنگلی جانوروں، لہجہ، جرمن، انجیلین، مصوٰر، بچہ، امانت، چھل، تنہا، کارواں، اور جاتی ہوتی تھی، اور تھی و غیرہ۔

UrduPhoto.com

یعنی مطلق کے پس نگار خانے میں ہمیں اپنی جہتوں کے چہ انوں کی لٹریچر کے ششدر سا بیٹھا ہے۔ یہ بات تو میرے دائرہ اشوک میں آگئی تھی کہ دیواروں کی انجیلوں سے جھانکے پھرکارنے والے۔ ان کے یہ سارے مار سیاہ اسی جھون پیرے کے کیلے ہوئے ہیں اور یہ مجھ و اہل یعنی اس کا زبردست مدعا ہے۔ اسی دوستی کی وجہ سے اسے اچھے اچھے کھانے بھجواتا ہے۔

ہوئے تھیں نہ توں میں قیوہ اور کھانے کو کھنے کا سامان تپانی پڑھرا لیا تھا۔ اسے کون اور کب آیا مجھے لگتا تھا۔ ہوتی تھی۔ میں تو ان تینوں کی نظارگی میں مجھ و کر خور سے بیکہ نہ ہوا بیٹھا تھا۔ جبکہ یہ دونوں چھکروں والے دے سے بے نیاز اپنی ٹونگی جینگی میں لگے ہوئے تھے۔

پلٹان اور عربی اپنی روزمرہ کی گفتگو میں باہم پکار پکارتی دیتے ہیں۔ فرق صرف پشتو اور عربی کی عربی کا ہوتا ہے۔ ان کی باہمی گفتگو محض زبان سے ہی نہیں ہوتی۔ ہاتھوں، آنکھوں، بونوں اور جسم و عمارت کی حرکات و سکنات سے بھی ہوتی ہے۔ جو دیکھتے سنے سے کہیں زیادہ محسوس کر کے لطف لینے کا بحث بنتی ہے۔

میں یونہی بے پردہ ہال کی بانک رہا تھا اور وہ میری لن ترانی پہ مسکرا رہے تھے۔ میں شاید کچھ زیادہ ہی
 بے پرواہ تھا۔ نکل سا ہو کر پوچھ بیٹھا۔

”میں دیکھ رہا ہوں آنکھوں اور نینوں کے حوالہ سے تمہارا خاص کام یہاں پہ آویزاں
 ہے۔ ایک طرح سے یہ کمر اتہاری لگاؤ پروری کا نگار خانہ ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر مجھ میں آتا ہے کہ آنکھ کیا
 ہے اس کا لحاظ باطن کیسی کیسی رعنائیوں سے بصیرت ہے۔ کیسے کیسے اسرار و افہام ان میں پنہاں
 ہوتے ہیں۔ شاید آج ایک ایسا سوال پوچھنے کا مناسب موقع ہے جو ملاقات کے پہلے روز سے ہی میرے اندر
 اٹھ رہا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ تم نے انسانی اعضائی حسن و جمال کی فتنہ توڑیوں اور رعنائیوں سے قطع نظر
 انسانی آنکھوں کو ہی مشق ہنر بنایا ہے جبکہ آنکھوں کی اکمیت چہرے سے متعلقہ اعضاء و جزویات کے
 ساتھ نہیں ٹھہرتی۔ غور کریں تو سمجھ میں آتا ہے کہ آنکھیں چہرے کا حصہ ہیں اور چہرہ جسم کا جزو ہے۔ جبکہ
 جسم تمام تر ذرہ صرف اور صرف آنکھوں پہ ہی ہوتا ہے یعنی تم جسم کی نمایات کے قطع نظر محض جسم کی جزویات
 سے متعلقہ ایتھے ایتھے اٹھاتے ہو۔“

اس نے بے غمراہی چہرے پہ زلزلے کے بے غمراہی سے اٹھتے ہوئے لہریں میری جڑ میں
 اٹھانے سے پریشان کر دی تھیں۔

”کیا تمہیں ایسی بھی دکھائی دے جاتی ہیں جو مجھے سمندر کی المتی ہوئی موجوں کی بانجھ اپنے ساتھ
 لے کر لے جاتی ہیں اور جو پھر ان گہرائیوں کییرائیوں گہرائیوں اور گویائیوں تک لے کر جاتا ہے اُسے بھلا
 کونسی کہ اب ساحل کیسی اور کتنی پھیلائی ہوئی ہے۔“ وہ تو کھیلوں کی سر جانی راہوں کھاتوں
 کے نام واریہ پھٹنے پہ لگ جاتا ہے۔“

”نہج ان اللہ“ میرے غم سے بے ساختہ نکل گیا جبکہ میں اس کی وضاحت و فصاحت پہ قربان ہو کر
 وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”میں اپنے تجربے اور گہرے مشاہدے کی بنا پہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہر جاندار خاص طور پہ انسان کی
 جسمیں ایک ایسی چیز ہیں جو کسی مصوٰیہ شاعر کی جولانی طبع کو اٹھاتے کرتی ہیں۔ جاتی چہرہ اور نقوش آفت آف
 ان کی فطرتی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ہزاروں آنکھوں میں چھوٹی سی لہریں خیر و عظیم ہوشیار باگہ ان کے سر مرآتے
 ہوتے چاند سر پہ چڑھ کر بولتے ہیں۔ نینوں کی سولی پہ چڑھا ہوا ہنر کان کی آئینوں سے چھدا ہوا اور اردوؤں
 کے کتبوں سے کٹا ہوا پھر کہیں کہیں نہیں پکڑتا۔ اگر وہ دنیا کا بندو ہے تو کسی نینوں والے کے ہاں

بندہ بے ذمہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر وہ تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا ہے تو اسے زمین جھڑکوں سے کسی نہ کسی کی جھلک جلوہ دکھائی دیتی ہے۔ شاعروں نے کشوں کے جہان تخیلی کے غنبد مینائی اور قلمزم آئینیں صائب نظر صانع منعم تراش اور مختصر معصود کے لئے ایسے دنیاں اک آفت جان سے کم نہیں ہوتے۔

کچھ دیر پہلے ساٹ بھر سا دکھائی دینے والا چہرہ ان غنیوں کی گفتگو کے دوران یوں تھمتھانے لگا جسے بان کا چہرہ اپنے پہلے پہلے پیاری زوداد سناتے سے تھمتھا اٹھتا ہے۔ شاعر اس پر دان معصود رقا میں سنگ تراشی یعنی فنون لطیفہ سے بڑے ہوئے یہ انوکھے سنو کھے ملوک سے لوگ باہر سے باورے مگر بھیتر سے شکر دے اور شیش شائستہ۔ آگ رنگ میں نہیں بھگ ہو جائیں تو فصاحت و بلاغت کی ایسی چٹیلچڑیاں اور شریہ چھوڑتے ہیں کہ سنا اور دیکھا کرے کوئی۔

میں اسے تیسری نظر سے دیکھ رہا تھا، قیاس کا ایک خرچہ چڑھاتے ہوئے وہ مزید

لگا۔

”یہ دنیاویوں پر آگے اترے اور چھپے ہوئے غداہوں کی مانند دنیاں دیکھ رہے ہو جیسے بے بھروسے بھروسے میں۔ یہ لخت لخت دنیاں میرے انگشت برسوں کی جان کوڑی اور انگشت نگاری کا حاصل ہیں۔ مجھے یہاں کافی علم ہے کہ ان کے لئے دنیا کا کیا ہے اور ان کے لئے دنیا کی کیا ہے۔ ان کے لئے دنیا کا کام کا اہتمام کرنا ہوں۔ کام کے علاوہ انہیں میری نشست میرا ستر اور سچی جگہ میرے لئے قبلہ چاروغ اور سناہ و درخ ہے۔“

میں دیکھ، ہاتھ کہہ گا، دنیاں سے عاری گفتگو کر رہا ہے۔ چھپنے والے کھینچی کی جانب بہت بڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ مزید گویا ہوا۔

”یہ میرا ایک شخص قدردان ہے۔ معصود تو لکھیں لیکن معصودی کی باریکیاں انکے خوب سمجھتا ہے۔ عہد جدید و قدیم کی امتدادی معصودی پر بھی گہری نظر رکھتا ہے۔ شاید تم یہ جان کر خوشی محسوس کرو کہ یہ بھی تہذیب طرح کسی عین نگری کا نہیں دکھتا ہے۔ اپنے منعم میں آنے والے کالوں کی جیبوں میں تریالوں کی ہوائ کی آنکھوں میں کہیں نما نے غنیوں کی کھوج میں پنا جاتا ہے۔ کسی بلی بکے کی آنکھیں خوبصورت ہوں گی تو یہ آنکھیں گود بھر لے گا۔ کوئی بھل پنا بھلی پھر، غیرہ آنکھ نما نظر آجائے یہ انہیں حاصل کرے گا۔ آنکھوں اور غنیوں کے متعلق بھی اس کا غنہ عجیب سا ہے کہ اکثر غنیوں پر غرور آنکھیں ہوتی ہیں جبکہ انہیں دکھائی ہی نہیں دیتے۔ کہتا ہے کہ کارزار حیات کا کوئی سطر اتنا دار از دار و شور گزر نہیں جتنا آنکھوں سے سمندروں اور غنیوں کے لپق و ذوق سحر اؤل کا ہے۔ جہاں ذرہ ذرہ شہاب اور ہر قطرہ ایک قلمزم ہوتا ہے۔“

ہم انیورسٹی کی حدود میں داخل ہوئے تو ہمارے خور کے حساب سے کاہل و خواہ سے زیادہ تھکے گزر چکا تھا۔ مایوسی اور بے ولی کے عالم میں باؤل ٹو اسٹہ ہم پرنس ایمر ویز کے کاؤنٹر پر پہنچے تو ایک ناواقف شخص اطلاع ہماری منتظر تھی۔ کسی ٹیکنیکل وجوہ کی بنا پر فلائٹ کا اطلاع ثانی لیٹ تھی۔ بلکہ خاصی سی لیٹ دکھائی دے رہی تھی کیونکہ مسافروں کو انیورسٹی کے ریسٹورنٹ کی جانب رات کے کھانے کے لئے ہنگا یا جبار باؤ تھا۔ صورت حال اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب روانگی کم از کم چار گھنٹے کے لئے غیر یقینی ہو جائے اور اس وقت کھانے کا وقت بھی آگے۔ ہم دونوں ریوالوں کے لئے یہ صورت حال بڑی تعجب خیز خوشگواریت کا سبب بن۔ خاص طور پر میری خوشی دوچند تھی۔ ریسٹورنٹ کے ایک انتہائی کونے میں ایک مختصر سی میز کے گرد ہم نشستیں بیٹھ گئے۔ خلاف حال وہ مجھے شاداں و فرحاں پا کر پوچھنے لگا۔

”تمہیں تو اس صورت حال سے ملکہ لگے ہو یہاں تو کھائی دیکھا جا ہے مگر تم تو ایسے ہشاش بشاش رہتے ہو جیسے پرنس ایمر ویز نے تمہیں دنیا کی مفت سیر کا اعزازی ٹکٹ پیش کرنے کی غرض سے یہاں مدعو کیا ہے۔“

میں نے ایک جھکاواں سا قہقہہ پیش کرتے ہوئے جواب دیا۔

”میں واقعی اس انتہائی تھریل سے بہت خوش ہوں۔“ اور اہم کرنا بند دہانی میں ممتحن ہونے کے لئے کسی بھی مددگار سے درخواستیں کرنا۔ ”میں نے اس وقت اس بات پر غور کیا کہ میں یہاں کیسے پہنچا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے اس کی منت کو شش ایلیٹ اور نیٹ میں نہیں سمجھا تھا۔ اس کے باوجود وہ ناگوار تھا۔“ کہ گو ہر مراد اس کے ہاتھ نہیں لگتا۔ ”وہ سوچا اور کرتا کچھ ہے مگر ہوتا اس کی توقع کے برعکس ہے۔“ ”مجھے کا قہقہہ ہی لے لو۔“ ”وقت یہاں پہنچنے کی خاطر ہم نے کہا کہ یہاں پہنچنے کے بعد استعمال نہیں کیا۔“ ”ہاری کوشش اور نیٹ میں کوئی کمی تھی؟“ اس کے باوجود ہم یہاں وقت پر نہیں پہنچ پائے۔ ”انیورسٹی سے یہ صورت حال کچھ اور دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں پہنچ پائے تو کچھ اور ہو گئی۔“ اب دیکھئے کہ آگے کیا ہوتا ہے؟“

”اس نے کچھ کہنے کے لئے پرتو لے لی تھی کہ میں نے معذرت پیش کرتے ہوئے اپنی جگہ سے جا رہی تھی۔“

”دوست! میں نے پرنس ایمر ویز کا روموں کی اڈوں پر پیش خوار ہو کر بڑی غلطی کی ہے۔“ ”ہوں۔“ شاید اس لئے کہ یہ مقامات بطور استعمالات استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے ازل اور ازل کے درمیان۔ ”زمین کی اور موت کے مابین زمانیاں۔“ ”مرگ اور محشر کے بچوں کی بزرخی گھر سے گھاٹ کے درمیان۔“ ”وہ جہاں جیسے رام کا کٹا وغیرہ۔“ ”لیکن میری اس خوشی کی ایک بڑی وجہ تو تمہیں معلوم ہی نہیں چلو میں غریب ہوں۔“

میں نے کچھ مزید وقت تمہاری صحبت میں بیٹھنے کے لئے مل گیا ہے۔“

”صحبت بولا۔“ اتنے دن تم میرے پاس بیٹھ رہے ہو کیا اس سے تمہارا دل نہیں بھرا؟“

”نہیں اس لئے کہ تم اتنے دن کبھی ایک لمحہ بھی میرے لئے تنہا نہیں رہے۔ تمہارے ہاتھ، انگلیاں، سر، داغ ہر وقت مصروف کار رہتے ہیں۔ تم چاہو بھی تو کسی کو ایسے لمحے نہیں دے سکتے جب تم اپنی سکرین پر نہ ہوتے ہو۔ اس جگہ اب تو کوئی کچھ کر سکتے ہو نہ یہاں کوئی تمہارا ماڈل ہے۔ نریش پورڈی اور نہ کسی کاغذ وغیرہ۔۔۔۔۔“

”مجھے یوں تشویش بھری نظموں سے غور رہا تھا جیسے میں اسے انوار کے یہاں لایا ہوں۔“

”اب تم مجھے یہاں تنہا یا کر کیا محسوس کرنا چاہتے ہو؟“

”میں نے غلط فہمی سے انہیں سے ناک ہناتے ہوئے جواب دیا۔“

”میں تمہاری ذات کے نہاں خالے میں ہمارا کن چاہتا ہوں۔“

”جودہ تم نے کچھ پانچویں کا مال پھینکا۔“

UrduPhoto.com

”پہ نظروں جھمکتے ہوئے بادل تو اس نے کہنے لگا۔“

”مجھے پہلی ملاقات سے ہی یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ تم ہمارے ایک ایک آسمان ہو۔“

”تمہاری آنکھوں اور سر پر ہونے والی باتیں، تمہارے ہونے والے لمحے، تمہاری آنکھوں میں لگنے والی کوئی

حالت حال ضرور پیدا کر دے گی کہ جس کا سامنا کرنے پر میں خود کو پھور پاؤں گا۔ اب دیکھو تو اس وقت وہی

حالت ہے کہ میں کوئی من سب سے ملک ملک کیے بغیر تم سے اپنی جان نہیں چھڑا سکتا۔“

”میں نے مسکراتے ہوئے اس کے منہ پر ہاتھ پڑا دیا تھا۔“

”تم اس ملک ملک کو حساب دوسراں نکلتے ہوئے مجھے یہ سمجھاؤ کہ تمہاری ساری مصروفی جو صرف

تمہاری آنکھوں کے چاروں طرف لگے ہوئے ہے اس کی وجہ یہ ہے یا شوقِ انہار۔“

”جودہ نے اس کے ہاتھ کو ہاتھ سے لے لیا۔“

”میں نے اس کے ہاتھ کو ہاتھ سے لے لیا۔“

”میں نے اس کے ہاتھ کو ہاتھ سے لے لیا۔“

تھے۔ کچھ وہ بھی ہمیں بے آسرا چھوڑ کر اس کے پیچھے نہ چلے گئے۔ شام سے کے گھاٹ پہ سورتج بس آخری
ایک پلے ہی والا تھا۔ سامنے آسمان ہماری بے بسی کا یہ دلخراش منظر دیکھ کر لپو لپو ہو رہا تھا۔ گھر کی روشنی سے نکل
سنے گھر سے ہوتے ہوئے سایوں میں مدغم ہونے والے اس باپ نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

اپنی جگہ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ میرا باپ ایک منفرد فنکار تھا۔ دیوئی دیوتاؤں اور سورگ کی
جگہ کے پیکر تراشنے میں اس کا کوئی غائی نہیں تھا۔ بڑے بڑے سینھوں اور حارک اور ادوں متعدد
تھیں۔ گھروں اور بدھ کی آرٹ ڈیپروں کے لئے اس نے بے مثال شاہکار تخلیق کیے۔ ڈاؤ ڈاؤم بھی ملے
موت و موت بھی سبھی۔ مگر شراب اور جوئے کی لت نے اسے ہمیشہ کد کال اور رخت حال ہی رکھا۔ وہ اکثر
پتے کے عالم میں میری سدا کی زد کی اندھی ماں کو پائی بھی کروا کرتا تھا۔ ہم بچے لوگ ڈرے سب سے
بچے گھروں میں ڈبک جایا کرتے۔ ہمارے گھر کو مچھیرے کی قسم کے اچھے بڑے تاثر سے عاری رہتے
تھے۔ ہم کسی قسم کا کوئی ڈھل خاہر کرنے کے قابل تھے یا شاید اس روز مرہ کل کے عادی ہو چکے تھے۔

اس دن پانی کر لیں ہی ماں بھی چار چٹ کی کھا کر بے مزہ نہ ہوتی۔ اس کے منہ سے ہائے اے تو دور کی
تھی۔ اس کی سسکائی بھی نہ تھی۔ عجب بات کہ مار کھانے کے بعد وہ بھی گھر اور اہل گھر کی خواہش کے
بغیر حیرت انگیز طور پر خاموش رہتا تھا۔ اس کی بیوی اپنے گھر کے میں جھک رہا تھا۔ ہمارا باپ بھی
کھانا کھاتے اور کھانا بھی جہاں ہو جاتا۔ اب ہم ایک اور ڈرامائی منظر دیکھتے ہیں کہ وہ دونوں خلیں خلیں
ہوتے ہیں۔ خیریت کو طاقت کر رہے ہیں۔ منظر بہ مقام و اعضا نول رہے ہیں۔ باپ میرا چچا چارہ ہا
ہم نے اس حرکت پہ بچپن ہی سے حیرت منگوا کر رکھی تھی۔ کچھ بچہ بچہ ہی نہیں تھا۔ ماں میری اس
جگہ پہ بے اطمینان ہو جاتی ہے۔ کچھ جالقی ہے نہیں جس کچھ نہیں ہوتا۔ میں بالکل ٹھیک تھا کہ
میں یہ قیاس کیا کرتا تھا میاں وہی میں یہ کچھ تو بتا رہا ہے۔ ہر۔ باپ کو اپنی خفت منانے کے لئے
یہ سوچتا تو وہ بے تھا شاید اسے نہ تھا پیسے لگتا یا پھر زور زور سے فرش پر اپنے ہاتھ توڑنا شروع کر دیتا۔
سب سے حال یہ دیکھ ہم بھی بھائی بھی رونا شروع کر دیتے۔

اگر ایک ختم پھر کی زد میں لاتے ہوئے وہ چند ساتوں کے لئے خاموش ہو گیا پھر دستہ بازی ہی
بہت کچھ مزید بولا۔

ہمارا گھر بھی ایک خوشگلی کی طرح تھا۔ جہر پر روزانہ صبح کو پہر یا شام ایسا نکل کر صبح دیکھا جاتا
تھا کہ ساقوں افراد ادا گروں کی طرح تھے۔ وہی رنے رنے کر دلا نہیں دیتے۔ اٹھن
تھا اور وہی جہاں جہاں ہوا انجام۔ کھیل تماشا تمثیل کیسے بھی اچھے کامیاب اور قابل دید ہوں

آخر کار اپنے انجام کو پہنچتے ہیں۔۔۔ ہماری باپ کے جانے پہ یہ ٹوٹتی بھی بند ہو گئی۔ اور اداکار

”اچھا اچھا تم پہلے اپنا کھانا ختم کرو۔ پڑاؤ اٹھنا اور رہا ہے۔“ میں اسے ہلکی سی رٹیف کرتی

سوچ رہا تھا۔

چند منٹ بعد دونوں سر میوٹے کھانے میں لگن رہے۔ یکبارگی میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے

”دوست! تم نے دوران گفتگو خود بتایا ہے کہ تمہارا تعلق بنگلور سے ہے جبکہ میں تمہیں سترہ برس

کے نچلے کار بننے والا سمجھ رہا تھا۔ تمہاری وضع قطع ’لب و لہجہ اور عادات والہ اور کسی طور بھی ہندوستانی نہ

اشعار نہیں دیتے۔ حتیٰ کہ تمہاری شکل بھی ’ہندوستانیوں‘ ’مصریوں‘ سے مشابہ ہے۔“

بلکہ سے مسکراتے ہوئے بتانے لگا۔

”ہاں! تم نے درست کہا۔۔۔ میرے ساتھ ایسے ہی ہے کہ میں اسی نچلے کا باشندہ لگتا ہوں۔

مشاہدہ میرے لئے کچھ نیا نہیں ہے بلکہ ایک طرح کا آزار جاں ہے۔“ ہلکی سی مٹا ہمت کو یہاں سے

اور مقامی لوگ پکڑ لیا خوشگوار بھی نہیں سمجھتے بلکہ انا معیوب گردانتے ہیں۔ اہل قاریں سمجھتے ہیں کہ وہ

شبہہ نہیں دیتے۔۔۔ بعد ازاں عرب کسی بھی کو اپنی سی تو قسم دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہاں

تھا۔۔۔ باپ کے ساتھ اپنی بیوی اور دو بچے۔۔۔ اسی بار میں نے اس سے کہا کہ اس سے بڑھ کر

بڑا تھا۔۔۔ بھائی کے ساتھ کسی نہ کسی طور گھر چلانے میں ماں کا ہاتھ بڑا تار بڑا آخر ایک کان میں

ایک رات ایسی سی ہو گئی صبح اس کی سیت اس حالت میں ہسپتال پہنچی کہ میں اس کے قریب

ہو گیا۔ چاندی کی ایک کوری میں سرسبز تھے اور بائیں ایک کانٹہ پہ لٹری کی شکلہ تحریر بھی

تھا۔۔۔ ”یہ پرنسپل آئیں! میرے بچوں کے باپ کے لئے میری جانب سے آخری تحفہ ہیں۔“

سے کہ یہ آنکھیں ابھی بھی حالت میں تھیں وہ پر پر میرے محبوب شوہر تک پہنچا دی جائیں۔“

نے ایک حکیم کے مشورے کے مطابق ان بڑی بڑی لڑو آنکھیں شہد میں ڈال کر شیشے کے ایک

مختوم کر دیں۔۔۔ ماں کی فوجیہ گی کے بعد میں نے سکول چھوڑ دیا۔۔۔ ماں بھی کچھ آسودہ تھا کہ

مخالفات قبول کر لیتا۔ بس برائے نام اس رہتی تھا۔۔۔ وہ کون سا معقول یا معقول کام تھا جو میں نے

نہ کسی طور ٹوکھی نوکھی روٹی چلنے لگی۔

بارہ دیکھتے ہی دیکھتے میرے قد کی طرح وقت بھی آگے نکل آیا۔۔۔ میں قاریں وقت سے

باپ کے کام ہانے کمرے میں ٹھس جا رہا۔ جہاں اب بھی اس کے کچھ اوزار تراشے ان تراشے

تکمل اور ادھورا کام پڑا ہوا تھا۔۔۔ یہاں مجھے ایک گونہ سکون سا محسوس ہوتا تھا۔۔۔ ادھر ادھر

سے ہر گزارتا۔ ایک دن پتھروں کے کاٹھ کھانا میں ایک ایسا نامکمل پتھر کا چہرہ ملا جو ہو بہو میری ماں کے چہرے سے مشابہ تھا۔ اس چہرے پر آنکھوں کے علاوہ باقی نقش مدح تھے لیکن آنکھیں ایسی چاند اور بولتی تھیں کہ جان پڑتا تھا ابھی مسکراؤں انھیں کی یا پھر پھٹک پڑیں گی۔ میں ان آنکھوں کو دیکھتا ہی رہ گیا کیونکہ یہ ہو بہو میری ماں کی آنکھیں تھیں۔ تم شاید جانتے ہو گے کہ پتھر پلاسٹر منی اور لکڑی پر آنکھیں ابھارتا ہے مشکل کام ہے۔ صوموسی طود پر ان میں کسی کیفیت یا تاثر کو پیدا کرنا ایسا آسان نہیں ہوتا۔ ایسی آنکھیں تراشنے یا بنانے کے لیے انھوں میں کہیں دو چار دی ہوتے ہیں اور میرا باپ بھی ان دو چار میں سے ایک تھا۔ میںیں مجھے بھائی کے ہر برائی ماں نے مرنے سے پیشتر اپنی آنکھیں نکال کر جو میرے باپ کو بجینٹ کی تھیں اس کے پس منظر کے لیے تھا۔ میںیں نے بچپن میں اپنے ماں باپ کو ہمیشہ لاتے جھگڑتے اور بعد صلح صفائی کرتے دیکھا لیکن اب میں نے دھیرے دھیرے سمجھ میں آ رہا تھا کہ میری ماں سے میرے باپ کا جو بھی کے علاوہ بھی کوئی رشتہ تھا۔ میری ماں بھی ماں میرے باپ کی بیوی سے زیادہ ایک محبوبہ تھی۔ وہ اس کی دہشتیں آنکھوں پر دل و جان سے فدا کرتی تھیں۔ میںیں نے ہی اسے ایک باغیہ روزگار صنم تراش دیا تھا۔ سینا یا دیگر دیویوں کے چہروں پر وہ اسی کی کسک لگاتا تھا۔ ان سندرہ ہندو سے میری آنکھوں کی جینٹ کے بنائے ہوئے تھے۔

”میںیں نے ان کی آنکھوں کو تراش دیا تھا۔ میںیں نے اپنے باپ کے لیے ان کی آنکھوں کو تراش دیا تھا۔“

”باقی میری ماں نیم اندھی تھی۔ جی ان کی روشنی میں برائے ہم زیلا سا کچھ کچھ تھی جبکہ شام کے آگے جلتے ہی وہ کور کور کی کاٹھار ہو جاتی۔ پر اس کی شفاف ہر سنی مانتہ دیکھتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ وہ مادرِ اذنا کی ہے۔ اچھا۔ کیا تمھیں اس کے علاوہ ایسا کالے بھی سب کے سب ایسی ہی آنکھیں تھیں۔“

”میںیں نے اس کے قریب سر رکھتے ہوئے جھنجھکے جھنجھکے پوچھا۔

”کیا تم کچھ ان خوبصورت آنکھوں والے اندھوں کے بارے میں کچھ مزید بتا سکتے ہو گے؟“

وہ ایسا لمبا سا وقفہ لیتے ہوئے قدرے متروک سا بولا۔

”یہ ساری کھانا شام کے لئے مجھے کچھ تفصیل میں جانا پڑے گا اور میں نہیں سمجھتا کہ یہ سب کچھ تمھیں بتانا ضروری ہے۔ ہاں البتہ دلچسپ ضرور ہے۔“

”یہ سنگ تراشی بہت کامی کاٹھن و پیشہ میں اپنے آپ کوں سے ودیعت ہوا ہے۔“

”میںیں نے مہاراجوں کے لئے پتھروں کی ہاتھی دانت اور سونے چاندی کی صورتیں بناتے تھے اور شاہی مہر صورت گڑھتے کہلاتے تھے۔ ان کے بنائے ہوئے چیدہ چیدہ شاہکار آج بھی مختلف ریاستوں کے

راج بھوتوں اچانک گھروں پر آنے مندروں اور بیرون ملک آرٹ گیلریوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔
 دادا نے میرے باپ کو بہت کم عمری میں اس کام پہ لگا دیا تھا۔ مگر اس کام میں اس کی دلچسپی نہ رہی۔
 برابر تھی۔ جب اک خاصا عرصہ پتھر رگڑتے، مورتیوں کی پالش کرتے، گز رنگیں اور اصل کام و پتھر کی فکر نہ کی۔
 تو دادا نے میرے باپ کو کھینچ سمجھتے ہوئے اپنے بھائی کشمن داس کے ہاں بھوپال بھیج دیا۔ کشمن داس
 شمار وہاں کے مہان استاد چترکاروں میں ہوتا تھا۔ میں بتاؤں کہ ایسے چترکار مورتیاں تراشتے تھے۔
 صرف دیویوں دیوتاؤں اور شرعی کرشن جی مائی جیتا یا نوٹا دیوتاؤں کے لئے مخصوص ہوتے تھے۔ کشمن داس
 عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح کشمن داس بھی ایک مہان چترکار تھے۔ ان کے
 میں مشہور تھا کہ وہ ہر کسی کو اپنا شاگرد نہیں بناتے تھے اور اگر کسی کو بنا بھی لیتے تو ذہنک سے کام لیتے۔
 تھے۔ مزاج کے تلخ زبان کے سخت نہ کسی کا ٹاٹا نہ خیال۔ میرے باپ کو بھی انہوں نے بڑی محنت سے
 شرطوں سے قبول کیا تھا۔

میں نے بڑی آہستگی سے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

ابھی ابھی تم نے کہا کہ تمہارے دادا کے بھائی کشمن داس تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ

UrduPhoto.com

دادا چچ دادا بھوپال تھے۔
 "لیکن ہمارے دادا ہمارے تمام رشتہ دار ہندو ہی ہیں۔ بلکہ کم ہندو ہی وقت ہو گا کہ میرے
 بھگوان داس کی ایک سہیلان دوستی سے کہیں متوجہ بھیج ہو گی۔ خدا جانے انہوں نے کیا چتر بنا دیے۔
 مسلمان ہو کر اس کام پر نہ لگایا۔ کشمن داس کا نام نہ تھا۔ کشمن داس کے دادا کے کہنے سے
 اور میرے والد کے دوست بھی۔ ان دنوں کا ایک ہی وقت زمانہ تھا۔ ایک ہی طرح کا کام ہو گیا۔
 کہایا۔ چاہے تو یہی تھا مسلمان ہونے کے بعد وہ مورتیاں اور دیویاں دیوتا بنا کر ترک کر دیے۔
 نہ کر سکے۔ حقیقت یہی ہے کہ اگر برت استقام گری اور چتر کاری میں اساطیر کی ہندو میتھا لونی کو مانا
 تو باقی محض انجیل کا انجیل گھوڑے اور بچوں کے کاروان رہ جاتے ہیں۔ جیسے گیت کو چچا دلجی۔
 ایک رنگ بھیرے ٹھوسے سے کہتے ہیں۔ میرے دادا نے اسلام قبول کرنے کے بعد کوشش کی کہ
 کسی ایسے معاش میں ڈالے جس میں کوئی مذہبی قدغن نہ ہو مگر کوشش بسیار کے باوجود ایسا نہ ہو سکا۔
 فن و پتھر کی آقا قیسے ہماری قسلی پہچان بن کر ہمارے خزان میں جذب ہو چکی تھی۔ دادا اب بھی
 گھر واری کا سارا بوجھ والد صاحب کے کندھوں پہ آچہ اور ان کا یہ عالم کہ ان کے نام کام سے
 اور نہ مسلمان راضی..... ہندو ان کے ہاتھ کی بنی مورتیاں تصویروں کو کھلے دل سے قبول نہ کرتے تھے۔

ہتوں کی ٹنگی اور شرب خوراک۔ پڑانے لوگ کہتے تھے کہ کور نظری کے باوجود وہ سب کچھ دیکھنے پر صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے گھرانے والے چند نے تجاں والے حافظ کھلاتے اور اس حراز سے حد پر سے جنگل کے کنارے ایک چھدری سی بستی میں رہتے تھے۔ مفلوک الحال بے ضرر شریف سے لوگ کھانا رزق پانی قرآن پاک کی تلاوت سے بندھا ہوا تھا۔ اس گھرانے میں جنم لینے والا ہر بچہ مادرِ زانو بیجا ہوتا تھا۔ یہ کسی بزرگ کی بدعا تھی اللہ کی طرف سے کوئی آزمائش یا کوئی انعام و اعزاز۔ اندھا ہونا یا بے حکم ہونا ایک ہی ضرور ہے مگر یہ کہی ان سب کے لئے رمت کا باعث تھی کہ ہر فرد قرآن پاک کی لغت بے بہا سے پڑھتا تھا۔ ان مرد اور عورتوں کا ٹھکانا سوزائش اور قرآن پڑھنا پڑھنا تھا۔ ایک اور غمایاں خصوصیت یہ تھی کہ خاندان کے ہر سچے یوز سے مرد و زن کی پہچان تھی وہ ان کے پر نور روشن چہرے پہ کنول نما تھے۔ ایسے بولتے زندہ جادو کہ دیکھنے والا ان میں کچھ نہ دیکھ سکتا تھا۔ ان میں سے ہر شخص کو دیکھنے والا کوئی بے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ بے نور ہیں۔ مقابل کے چہرے پہ آنکھیں جما کر بات کرتے تھے۔۔۔۔۔ انحصار کا جھٹلاہٹ اور اٹھنا اس خرومی ان میں نام کو نہ تھی اور نہ ہی روزمرہ کے معمولات میں کوئی غیر معمول بات تھی۔۔۔۔۔ انہیں گھار ہائے حیات میں پوری دلچسپی اور توانائی تھی۔ ان کے ارکان ہوتا تھا کسی کی ایک کمر اور بائیں ہاتھ والے۔

کچھ ہیں انہوں کے ہاں گھل اک ظاہری دنیا کی کی ہوتی ہے مگر ان کی حیات اور باتیں جادو کا غیر معمولی طور پر نتیجہ نکالتی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ آنکھ والے راست بھول جاتے ہیں مگر بے آگے نہ بھولتے۔ دس برس بعد بھی وہ اسی بات کو پہچان لیتے ہیں جس سے وہ صرف ایک بار کی ہم کلام ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے لہو و لعل والے کی سات چودوں میں بھی بولی ٹھہریاں لیا کرتے تھے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ کھانا مکمل ڈاکٹر سا کھانا پر فیصلہ نہیں لے ایک اندھا گھڑی مارا بھی دیکھا۔ اندھے سرکش حریف چلاتے ہیں۔ پیمانوں کی چوٹیوں سر کرتے ہیں۔ دیوں کے ستر کو نفلتے ہیں۔ شاعر ادیب موسیقار محترم ساز انبیادوں کے ایلٹریٹر قصبوں کے پروڈیوسر ڈائریکٹر بھی۔ سرکسوں میں نشانے بان آتے ہیں۔ یہ سب چلانے والے۔ حتیٰ کہ لی ایک طیب حافظ بھی دنیا کی سے محروم گزارے ہیں۔ معلوم ہوا جو جادو انہیں انسان ظاہری دنیا کی سے محروم ہوتے ہیں ان کے ہاں دیگر حسات اور ہمت سی پر اسرار صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔

دو بنا رہا تھا۔ اسی عالم شریعتی و بے خدائی میں ایک دن میرا باپ اس حراز کے قریب سے بے شرم و ہاد و رقت کے سنے سے ٹیک لگائے بے حرمت سا پڑا تھا۔ بھوک اور مایوسی نے اودھم مچا دیا تھا۔

ڈوبی آنکھیں اٹھاتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھا۔ لرزتے ہاتھوں سے کچھلے کاڑھا تھا جسے ہوئے خوب بولی کے انداز میں پوچھنے لگا۔

”تم اتنے روز کہاں رہی؟ میں ان دنوں ادھر بیٹھا تمہارا انتظار کرتا رہا۔ تیرا پڑھایا ہوا سبق میں لکھے ابھی طرح یاد ہے۔ میں نا اُمید ہوا نہ ہی بد دل۔ لیکن تم نے مجھے یہ سبق یاد کرنے کی خوب سزا دی۔ وہ بہتر نہیں کچھرا ٹھونس رہا تھا۔۔۔ اسے اس زری طرح کھاتے محسوس کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”وہ صبح سے کھاؤ کم پڑے تو اور لا دوں گی۔“

کچھ جواب دینے کا اٹھ کھڑا ہوا کھلی آستین سے ہاتھیں پوچھی۔۔۔ ہونٹ صاف کیے چہرے سے اس کے شانت نہیں سا گروں میں اور تک اترتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”تم کہاں رہتی ہو تمہارا نام کیا ہے؟“ وہ پوچھا۔۔۔ اس کے سر پر وہی آتی ہوئی۔۔۔

وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ان باتوں کو چھوڑو۔۔۔ بچانے کی بات ہے کہ کام کاج سے چھٹکارے کے غفلت سے بات نہیں بنے گی۔“ مزار کی جانب چہرہ پھیرتے ہوئے مزید کہنے لگی۔

بابا کہا کرتے تھے کہ جو مشق لٹے کے بھیر اپنی کوئی منزل مقصد تلاش کرتا ہے وہ یہ نصب العین ہوتا ہے۔

”میں یہاں۔۔۔“

اتنا کہہ کر وہ واپس جانے لگی تو اس نے بن سوچے تجھے نصیحت اس کی کاپی پڑنی پاس رکھو۔

”سے سے کچھ بچر نکالے اور کھاؤ۔۔۔“

”ایکھو میں ان دنوں گھر پہ یہ کام کرتا رہا ہوں۔ میں ایک چتر کار ہوں۔ کیوں میرا کام میں نہیں نکلتا۔ یہ ہمارا پیشہ ہے۔۔۔“

”پہلوں لگتا ہے کہ میرا حق من کی نے باوجود باوجود۔۔۔“

”قونے کوئی نہیں کرتا۔۔۔“

”جہن جہب سے تمہیں دیکھا تمہارا سبق پڑھو کیا ہے۔۔۔“

”کچھ میں دیکھو۔۔۔“

”اپنے پڑکھوں کے سن کو اٹکے یا حانا چاہتے۔۔۔“

”یہ نشہ کرنا مجھے بھی اچھا نہیں لگتا۔ میرے باپ کو بھی یہ نشہ۔۔۔“

”ڈوبی۔ لیکن؟“

”نہیں میرا غم بھی قابو نہیں میرا من کچھ کرنے کو نہیں کرتا اگر کچھ کام کرتا بھی۔۔۔“

”میں دُشمن ہوتا۔“

وہ اُسے اٹھ سیدھے کئی ورق دکھاتے ہوئے مزید بتانے لگا۔

”وہ کچھ نہیں اتنے روز تمہاری تصویریں بنا تا رہا ہوں۔ تمہارے شریع کے رُپ ٹراپ۔۔۔“

”جے جے مگر ہر بار تمہاری آنکھوں نے مات دی۔۔۔“

”جے کو تو وہ من جاتی تھیں مگر وہ بات نہیں مٹی تھی۔“

”ماٹک جو کچھ مانگتا ہے تو دیکھتے نہیں ہو صاحب! اگر شکار رہی ہیں پھر چراغ جلا لیں گے۔“

اس نے جو بھی مانگو بابا دلوا دیتے ہیں۔“

سُنی ان سُنی کر گئے ہوئے میرے باپ نے آنٹی لڑکی کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ لڑکی کون ہے؟۔۔۔ اس کا نام اور یہ کہاں رہتی ہے؟“

بوڑھا ناگوار سی حیراتی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”اگر تم صاحب مزار کو جانتے ہو تو صاحبزادی صاحبہ کو جانتے ہو گے۔ نہیں جانتے تو متواسا صاحبہ صاحبہ“

صاحبہ چند نے نیماں والے خاندان کی چشم چراغ ہیں اور صاحب مزار بابا کی متولی ہیں۔“

میرا باپ حیران سا پوچھ رہا تھا۔۔۔ اس کی عورت کسی مزار پر متولی ہو سکتی ہے؟“

”ہاں اگر صاحب مزار کی عورت ہو تو۔۔۔“

”تو کیا یہ کسی بزرگ عورت کا مزار ہے؟“

”اس نے ایک ویلہ کا مزار ہے۔ جنہوں نے قبر کی منہ کی گزاری اور تمام عہدہ ہر ایک آکر۔۔۔“

تلاوت کیا۔۔۔ UrduPhoto.com

”اب کہہ دیجئے کہ یہ لڑکی یہاں کی متولی ہے۔ میں یہاں ہر روز آتا ہوں اسے کچھ دیکھتا ہوں۔“

یہاں دیکھا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے مجھے گھرا دیا تھا اور پھر آج میں نے آئی کا لایا ہوا کچھ کھوٹا۔“

وہ صرف جھمکتی رہاں آئی ہے؟“

”متولی تو کیا۔۔۔ یہاں صاحب مزار کی رات کو نہیں رہیں۔ وہ بھگوان شریف کی رہتی ہیں۔“

وہ نے پتہ پتہ چلے چلی جاتی ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں یہاں شیر چروا دیتے ہیں۔“

”اور متولی صاحبہ۔۔۔؟“

”وہ سامنے جنگل کی آٹھ اپنی اپنی میں چلی جاتی ہیں۔ چند نے نیماں والے حاکم۔۔۔“

ہستی میں ہے۔“

”چند نے نہیں والے حاکم۔۔۔“ میرے باپ نے کئی بار ان الفاظ کو زہر لایا۔“

اس کی متولی آگ جاتی تھی۔ نیماں نیماں۔ یکبارگی اس نے اور وہ اس متولی لڑکی کے لیے مسکرائی۔“

انہر آئے جنہوں نے اس کی زندگی کا پانسہ ہی جلی دیا تھا۔ اس کے انداز فکر میں اک شیت تبدیل۔“

دی۔ اندر کے مدہوش فکا کو گھنچھوڑ کر اس میں جینے کا جذبہ کچھ کر گزرنے کی جستجو دیکھا دی تھی۔“

میں نے بھال کو انگلیخت کر کے بیدار کروا دیا تھا۔

”نینا چند نے نیناں؟“ بزرگوار ایہ چند نے نینوں کا کیا قصہ ہے؟“

بوڑھا اس کی جانب دیکھتے ہوئے بتانے لگا۔

”اس عجیب و غریب گھرانے کے بارے میں کوئی بھی و سوش سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کوئی کچھ بتاتا

ہے اور کوئی کچھ سناتا ہے۔ متونط طبقہ کے متونفل سے لوگ ہیں۔ اللہ جانے کیا جی ہے اور کیا نہیں؟“

شبیہت ہے کہ موجودہ خاندان ایک جن کی نسل سے ہے۔ یہ جن پہلے ملحد تھا۔ اللہ کا کرنا کہ یہ کسی مہلک

بھائی میں جہلا ہو گیا۔ بہترے علاج معالجے ہوئے مگر افاقے کی بجائے دن بدن حالت و گرگوں ہوتی چلی

گئی۔ آخر جب جان کے لالے پڑ گئے تو کسی حکیم حاذق کا یہ چلا کہ ان کی سیمائی سے جن و بشر کے علاوہ

بہتر حقوق بھی مستفید ہوتی ہے۔ اس لیے صاحب مزار سیمائیت حکیم مادر زاد ملحد و حافظ قرآن تھے اور ادھر

بھائی کے نواح میں ایک چمکاندہ سے علاقے میں رہتے تھے۔ مشہور ہے کہ ان کے پاس حکمت و طب کے

موسیقی وہی تھے۔ کسی سے کھانچا اور نہ کہیں سے سیکھا۔ کتب ہر در کے قریب تک نہ گزارتے۔ مریض

نہ تھک سوں کی شہادتیں دیکھ کر کہہ دیتے تھے۔ اس کا معنی تھا کہ وہ اس کے پاس آ کر اپنے

علاج کے چار اور اسی علاج کے سنے جیتے۔ اسی خاندان کے ایک موجود بزرگ سے یہی روایت ہے کہ

ان حکیم صاحب کھانچا بھائیوں کی پشت پر حضرت سیمان کے درباری حکیم عقیس قحشی والی لہجہ کا نقشہ اچھا دوا

تھے۔ اس نقشہ کی طلسمانی لہجوں سے حکیم عقیس جوڑا تھا۔ جنوں انسانوں کی لڑائی اور دیگر جانداروں

کا علاج کیا کرتے تھے۔ (باتوں کی شکایتیں اور اس خاندان کی حکمت و ترغیبات وغیرہ شاید اسی طلسماتی

لہجہ کو بروہی توان کی لہریں ہیں جو پورا اور نہایت علوم کی گم گونج سے کہیں خارج ہو کر انسانی دماغ کی چادری

میں کسی طرح صورت مگر خوفناک سانپ کی مانند قید و کر د جاتی ہیں۔ لہذا ارض پہ سانپ ہی سانپ اور مچھلیاں ہی

کچھ بڑھتی ہیں۔ اگر سانپ اور مچھلیاں اپنے نوزید اللہ سے بچے چلتے کہہ دیں۔ جو اپنے کسی مورخ اگھتا ہے

اسی انداز رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح کوئی خوش آکر تو کچھ ایسی کرکسی شخصوں انسان کے پاس آگھتا ہے۔ جس سے

نہ علم فیضیاب ہوتا ہے۔ اور قریب الموت جن اپنی جون بادل کے کسی نہ کسی طور حکیم صاحب کے پاس پہنچ

کیا۔ اس کی کچھ میں تھا کہ حکیم صاحب یہ اسکی دینا ہیں، خود کو ظاہر کیے بغیر اپنا علاج کرالے گا۔ ادھر

سیمائی تھے کہ اس کی لہجہ اس پاتے ہی جان گئے اس کی اصلیت اور مرض کی کیفیت کیا ہے مگر سیمائی

سے یہی طور پر مرض کے بارے میں کچھ سوال جواب کیے۔ نعل زبان آنکھیں وغیرہ ٹولیں اور کہا آپ

ادھر میرے ہاں مریض خانے میں قیام کریں۔ آپ کے مرض کی نوعیت کچھ یوں ہے کہ مجھے کچھ مزید تشخیص اور

غور و خوض کی ضرورت پیش آئے گی۔ میں دوبارہ طلب کر کے آپ کے لئے کوئی مناسب علاج تجویز کروں گا۔ اور اصل حکیم صاحب اس کے جنم ہونے کی وجہ سے شش و پنج میں پڑ گئے کہ اس غیر انسان مخلوق سے کس طرح نمٹا جائے۔ حکمت و طب سے زیادہ تر استفادہ خاکی بشر اٹھا سکتا ہے۔ ماری ٹوری مخلوق کے لئے ارضی نباتاتی جڑی بوٹیاں بے اثر ہوتی ہیں۔ اللہ کریم نے ابن حکیم صاحب کو اربعہ عناصر اور شش جہت کی بالیدگی بخشی ہوئی تھی۔ ایک دور و زائد انہوں نے علاج کے لئے ایک طریقہ وضع کرتے ہوئے اس سے کہا۔ ”تمہارے علاج کا ایک حصہ یہاں میرے ہاں مکمل ہو گا اور دوسرا حصہ جھیل سیف الملوک کے محلِ مت کوئی کے ایک غار میں مکمل پائے گا۔“

جھیل سیف الملوک کے پہاڑ اور علاقہ حاملانِ افلاکی کا جہانِ فسون، مسکن و ظہنم آباد تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہدِ حکومت میں جنات پری را اور نیساچہ وں کی تربیت گاہ کے طور بھی استعمال ہوتی تھی۔ یہاں ایک مت کوئی کا پہاڑ بھی ہے۔ مت کوئی پہاڑ کے اس غار کے باجھت کہا جاتا ہے کہ اس کا دوسرا بانہ دریا کے درمیان دیکھتی آگ میں اٹھتا ہے۔ سرکش شراعتی جنات جو معتوب و ملعون ظہرتے آتے تاجینی کاروائی کرتے تھے اس کے غار کے اندر قفل رپا ہوا تھا۔ غار میں دریا کی آگ کی آہٹیں آتے تھے۔ کاہل پیدا کیے جاتے تھے کہ سرس جہت کوئی سے کوئی کب کرتے تھے۔

علاج کے لئے مت کوئی کے پہاڑ کا سن کر وہ جنی لڑی طرح کا چٹنے لگا۔ پاؤں پڑتے ہوئے گا۔ ”حکیم صاحب! دوسرا دوسری کوئی آپاٹے کریں اور جیسے کا مطلب ہے کہ کھیرے پیچے کی لڑکھائی تو لڑی بہت امید ہے تو وہ بھی نہ ہے۔“

حکیم صاحب نے یہ خارجہ تھا ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟ حکیم میں ہوں یا کہ تم؟“ علاج تمہارے مرض کے مطابق تھا۔ تمہاری مرضی کے تحت نہیں۔ وہاں جانے میں تمہیں کیا پریشانی ہے؟ جھیل سیف الملوک کا علاج تو ایک صحت افزا مقام ہے۔“

وہ اپنی جان بچاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”آپ مجھے سیف الملوک کے علاقہ میں مت کوئی پہاڑ کے علاوہ کسی بھی جگہ پہنچا دیں۔“

”مگر کیوں؟“

وہ ہتھیار دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

”آپ جانتے ہیں کہ وہاں کھمیں اور کیوں بھیجا جاتا ہے اور میں اس حالت میں مزید کچھ

تہا نہ جنی النسل ہوئے کارا ز افشا نہیں ہونا چاہئے اور نہ کبھی کوئی خرق عادت حرکت سرزد ہو۔ آہستہ تمہیں بشری تقاضوں رشتوں سے شناسائی ہو جائے گی۔

تعلیم جی نے اس کا نام عبدالغفور رکھا تھا۔ علاج کے ساتھ ساتھ اس کی تعلیم و تربیت یہ بھی رکھا۔ شروع شروع میں تو اسے اچھی خاصی پریشانی اور مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ کہاں پتھر بندیاں۔ کہاں والی کچھڑی۔ قورسہ نہریانی اور ساک پات۔ آتش اور خاک کی تضادات کی باہمی کشش نے اسے محسوس کرنا شروع کر دیا۔ کئی مرتبہ یہاں سے بھاگنے کی ٹھانی۔ اوپر ٹھکی فضاؤں میں اترنے کو جی چاہا۔ خاندان یاد آتا۔ انسانی قالب اس کے لئے اک آزار بن گیا۔ ارد گرد اور انسانی محدودیت سے محسوس ہونے والی آہستہ سے آہستہ شہر سے فرگوش بنا کر رکھ دیا تھا۔ چند مشروں کی اس تبدیلی اور تربیت سے اسے ہر دور جن اور بشر کے درمیان کی کوئی ایسی جگہ ملنا چاہ رہا ہے جو مکمل طور پر بغیر سے اور نہ جن!۔ تعلیم و تربیت کے علاوہ ارضی و سماوی علوم میں بھی ورک رکھتے تھے اس کی کیفیت و اذیت سے خوب واقف تھے نسبت سے انھوں نے اس پر چاہا تھا والا ہوا تھا۔ اس کی خوراک میں ایسے معدنیاتی اور کیمیائی مواد شامل کر دیے جاتے تھے جن سے اس کی طبیعت خوراک کا نقصان نہ ہو۔ اس کے علاوہ تمام کالہ و کھٹ سے بھی اسے قریب ایک ایک کی جگہ پہنچا کر جو پیچیدہ و سرسبز ماحول اس کے لئے پیدا کیا گیا۔ آپ پر پتھر بندیاں کی تعلیم! تعلیم! تعلیم! یہ خود ہی تھے جس کا زیادہ تر وقت انہی کی مصالحت میں گزرتا۔ کیا اسے تعلیم و تربیت اور حکمت کے بند کھنڈوں میں باندھ کر بے بسی کیا ہوا تھا۔

یہ کہہ کر وہ بعد بہ حفاظ بصریئے تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ ایک نئے نئے انسان اور خلق بنی کے ساتھ ساتھ باقی کے لئے ک جان کے لئے پڑ سکے۔ مگر یہ علاج صدوری تو لے لیا تھا۔ پتھر بندیاں کوئی جیل نہ تھیں۔ ان کی مرضی چوتھی کیا نہیں رہی۔ وہاں کی یہ عقیدت مند نہ رہا۔ یہ سب ہی بوجھ بن گئے۔ غیروں نے ان کو کھینچ لیا۔ ان کے درمیان عبدالغفور جن بھی تھے ان کے ساتھ ساتھ وہ بوجھ و بھاری و غمزدگی کے لئے اپنے احوال کے حصار میں پابند کیا ہوئے۔ اپنی مرضی کے مطابق کوئی قدم اٹھا نہ تو کیا بلکی ہی جستش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کئی بار اس نے لب کشائی کی کوشش کی مگر بار بار وہ اسے ان انکھا۔ ملا۔ جن بھر طور بشر سے بہت سی چیزات و اذاتی میں ماورائی صلاحیتوں کے حامل ہوتے تھے۔ کرنا ہوا کہ زمانہ ارض و سماوی کرنا آتش کے علاوہ وہ کوہ کوہ کوئے بھی ان کی نگاہ و سحر میں ہو سکے۔ تک انسانی و سماوی اور انہم و ادراک کی پہنچ نہیں ہوتی۔ فاصلے وقت اوچھائیاں گہرائیاں پہنچایاں دیکھنے کے لئے سوزا نہیں بنیں۔ وہ اپنی حیثیت بدل لینے پہ قادر ہوتے ہیں جبکہ ہوا روشنی اور کھر بام کی مانند گہرے

”جنی و بشر کے مابین بہت سی قدریں مشترک ہیں۔ تفصیلی بیان کرنے کا محل نہیں یہ کچھ تم خود جانتے ہو۔ بہر حال اس موقع پر جب کہ ہمارے درمیان فاصلے بڑھتے والے ہیں ہمیں تمہیں مشورہ دیتے ہیں تم اپنا باقی ماندہ زندگی کا سفر اپنے ایک جیون ساتھی کے سنگ طے کرو اور واک انسان عورت ہوگی جو میری بیٹی ہے۔۔۔ اس کے ساتھ تمہارا نکاح ہوگا۔ اس بیٹی سے تمہاری اولاد ہوگی اور اس اولاد میں سے ایک یہ ہوگا بھی ہوگا جو اپنے وقت کا ولی کامل ہوگا۔ جس سے آگے اک مخصوص سلسلہ چند نے حافظوں کا چلے گا جو اپنے دور کے قابل قدر کامل لوگ ہوں گے۔“

حکیم صاحب کو کھانسی اٹھی تو وہ ان کا سینہ سہلاتے ہوئے متعجب سا پوچھنے لگا۔

”بچ و مرشد! آپ کا کہا سراسر آنکھوں پر ایک جن اور انسان عورت کی شادی۔۔۔“

”ہاں ناممکن نہیں۔۔۔ جن اور بشر ہوتا ہے اور انسان انسان جن اتم و کھو کہ قرآن پاک میں

ان دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہے بلکہ جن کو انسان سے اولیت دی گئی اسے بہت سے تشریفات دی گئی

انسان سے بہت پہلے تخلیق کیا گیا۔ ایسی صلاحیتیں عطا کی گئیں جن سے انسان بھی محروم ہے۔ وہ دونوں انسان

اور متاخرین جن سے ہیں۔ ان کی اپنی سادھ باندھ کی بنیاد ان کے مابین کئی حقائق و حقائق سے قائم ہے۔

پہلے عقیدہ میں سورج اور چاند کی نسبت ان کے درمیان برابری ہے۔ سورج اور چاند کی نسبت ان کے درمیان

اللہ کے امر کی اپنی اگلی بنی کو تمہارے نکاح میں دینے کا فیصلہ کیا ہے جو یہ طور تمہارے اس سے ہے۔

آدم زادی گراپے ان کی ہا شفاں اور روحانی اذواق و مواہید میں جن و انس کا جاساں ہے۔ اور ان کے

کے بعد تمہاری تمام تر تعلیمی ترغیبیں سننا چاہئے۔ یہاں تک کہ یہ سب سب ان کی اور تم ہمیشہ اپنے جن کو سنے

محافلہ راز میں رکھو گئے کبھی اپنی بیوی پر ظاہر نہیں کرو گے اور قرآن کے حفظ کی تکمیل سے پہلے بیوی سے صحبت

میں نہیں ملو گے۔“

مر گئے وقت اور اس کی قسم پرائی کے حجر میں ایسا چٹکا کہ مجھے کچھ ہوش نہ رہا تھا۔ کون ہوں۔ کب

کیا ہوں کہاں ہوں۔ جیسے میں خود اس کی قسم کا حصہ تھا۔ اذی سے دو کورہا ہے اور میں سن رہا ہوں۔

جسم و بود نہیں محض گوش ہوں اور وہ کوئی آفاقی سروش ہے۔

وہ شاید سگریٹ سلکانے اور وہ پیار بھر پر کشی لینے کے لئے خاموش ہوا تھا اور میں اندر باہر

جھپکے لے کر جیسے کسی چہرے کے زوہد اک ٹہنی فخر کی سے بیجا رہا تھا۔ باقی ماندہ کھانا شے ہم کھاتے

گئے تھے سامنے دھرا عجیب سا منظر پیش کر رہا تھا۔ دوڑ لگے ہوئے ڈسٹیکل کلاک کی سوئیاں جو بہت آگے

چلی تھیں۔ ناگاہ میری نظر اس کے چہرے پر جا گئی۔ اعلیٰ اعلیٰ سا سیات چہرہ ڈب لفظ حروف کی مانند

سے نہ اٹل گولی گول بے پک آنکھیں۔ مجھے بھر پوری سی آگئی تھی کچ تو یہ کہ میں آدھے جن اور آدھے
 انسان ہوں یہ قصہ سن کر خوف زدہ ہو گیا تھا۔ میں اسے انجینی نظروں سے دیکھتے ہوئے گھٹکھٹا کر بولا۔
 ”تم۔۔۔ تم کہیں ان دونوں کی اولاد میں سے تو نہیں ہو؟“

وہ سگریٹ پیچ لٹے ہوئے پراسرار سی مسکراہٹ سے مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”آریاؤں سمندروں میں ایک ایسی چھلی بھی پائی جاتی ہے جو چھلی کم اور خطرناک سانپ زیادہ دکھائی
 دیتی ہے۔ بے علمی کی بناء پر اکثر لوگ اسے پکڑنے کھانے سے اجتناب کرتے ہیں جبکہ وہ ذاتِ اللہ میں لذیذ
 غذا اور اعتبار سے مفید اور غذائی لحاظ سے اک بے مثال تریاق ہوتی ہے۔ مار (سانپ) اور مائی چند مٹی تہذیبوں
 کے ساتھ ایک نسل و خاندان کے بے دست و پا جانور ہیں۔ ایک پانی میں پیدا کر دیا گیا دوسرا خاک و خشت
 میں مل دیا گیا۔ جن و انس کی شانیں کبھی کبھی آپس میں ٹکراتی ہیں۔ شگوفے پیدا کرتی ہیں جن میں
 جن طرح کے رنگ اور خدوشوں کی ہوتی ہیں۔“

میں انہماق کی طرح منہ کھلے آنکھیں پھیلائے اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔ سگریٹ سے مئے
 حرکت کو دم دیتے ہوئے وہ پوچھنے لگا۔

”کوئی بات ہے؟“

میں نے لب ہائے اخیر حقائق کی مانند اثبات میں سر ہا دیا۔

”سیکیم صاحب نے دم داہیں سے پہلے جن مہداغلوں سے اپنی عالم فاضلہ علی کا عقد کر دیا۔ دونوں
 میں کوئی زندگی بسر کرنے کے بعد انھوں نے صاحب ان رات قرآن کی تلاوت میں پڑے رہتے۔ ملائ
 کے اور بھی کامیابی سے بیکل رہا تھا۔ یہ فی صاحب چونکہ عالم فاضلہ ہیں وہ طالب علموں کے جنوس ڈانس و تندرہس
 میں بھی رہتی۔ چھوڑے جنس کے کنارے لکھا نما مکان میں وہ دونوں نصف مہاں بیوی اپنے اپنے الگ حصوں
 میں رہتے تھے۔ بی بی صاحب انتہائی کم گزاجاب و نقاب میں رہنے والی اورس و تندرہس سے جو وقت بچا وہ
 کوئی خادہ کی خدمت اور عبادت میں گزر جاتا۔ عارض معاہدہ بھی کرتی تھیں۔ ارد گرد اور نزدیک و دور تک
 جن پانچہ شخصیت اور علمی فی رسانی مشیت کا شہرہ تھا جبکہ ان کے شہر کو لوگ اک مریض اور سیکیم صاحب
 کے ہوتے والے کسی دور دراز علاقہ کے رہنے والی مشوک الحال شاگرد کے طور پر پہچانتے تھے۔ عہداغلوں بھی
 اپنے گرنے کے ساتھ ساتھ انساؤں کے رنگ و جھنگ میں ڈھلتا ہوا ہاتھ اتارنا ہم اسے اپنی جلی خوصلت کے
 ساتھ ہی چھو پریشاںیاں لافن ضرورتیں۔ وہ کبھی کبھی اپنی غیر نظری بسر اوقاتی محدود حرکت و عمل اور موافق
 حاکم کی وجہ سے باغی ہو جاتا۔ جب بھی موقع ملتا ازان بھرتا غائب ہو جاتا تھا۔ چھاؤں سمندروں

وہ اسے مندر بھی نہیں لگا ہوں سے نکالتی ہوئی بوپ چھٹے گی۔

”کیا ایسی انہونی تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے؟“

”ہاں! کبھی سنی بھی اور کبھی بھی رہا ہوں۔“

”میں نے کچھ نہیں سمجھا۔“

عبدالغفور جواب کی بجائے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ بتائے نہ جانے کیا کرے؟ جس کا کام لینا اس کے نزدیک بہت غلط تھا سچ بولنے سے بہت سے کام ملزمت تھے۔ طوفانی رات جو کچھ سرزد ہوا اس میں اس کے کسی ارادے کا دخل نہیں تھا اور نہ ہی چرو و مرشد سے کہئے ہوئے وعدے کو کوئی نیت تھی۔ خلاف توقع و ارادہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ جیسے کوئی لمبی طاقت کی ایما پہ یہ سب کچھ ہوتا ہو..... دیوی سے قربت والا واقعہ بھی جیسے سا عام اصولی پیدا کر کے ظہور میں آیا..... اسے محسوس واقعات کے پیچھے یقیناً کوئی نہ کوئی منسلکت موجود ہے۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ سن و سن سب کچھ دے۔ انجام حاصل ہے کچھ بھی ہو۔ یہی کیا شروع سے اب تک ہر بات کھول کر سامنے نہ رکھ دی۔ وہ خود عبدالرحمن کمالی قتل سے سختی رہی۔ نہ خوف زدہ ہوئی، نہ کھلائی نہ کسی قسم و خصلت کا انبار کیا۔

UrduPhoto.com

میرے سر پر گرا..... اور اگر آپ مجھ پر نہ ہوتے وہ سنگساروں میں بھاری درختوں کے پناہ سے تو میں شاید آج زندہ نہ ہوتا۔ آپ نے اچھا کیا جو ہر انسان کو یہ یاد دہانا دیا۔ جس کی بنا پر کوئی اللہ کی مخلوق ہے۔ جس کو اللہ نے پیدا کیا۔ یہی انسانی سائنس ہوں اور خوش بھی۔

وقت کی گنتیوں کا رسمی جسمی رہی۔ سواریوں بعد ان کے ہاں ایک نئے کاظم ہوا مگر یہ چپے سے
اپنی راہنی برضا میں کو چاہا گیا۔ غریب و غریب طبعی نصحت و نہ چپے پیدائش کے وقت کچھ دیر کے
ہو گئیں کہ بچہ اپنے دونوں نظروں میں پھنس گئے۔ بچہ تو کسی طور بچ گیا مگر چپے جانور نہ ہو سکی۔ شاید
وہ ایک جن نر اور تھا۔ بعد الغور کے لئے یہ جانور ناقابل برداشت تھا اس کے لئے وہ خود کو مار دیا
کہ مرشد کی وصیت پر عمل نہ کرنے سے یہ سب کچھ ہوا ہے۔ بچے کی بہت حالت صورت دیکھ کر
کراہت سی غموں ہوئی۔ حالت غم میں اسے اٹھا کر جنگل اندر بھیج دیوں کے بہت کے
آیا۔ اب یہ گھر یہ جگہ علاقہ اسے کاٹ کھانے کو دوز تھا۔ بات بھی درست تھی۔ حکیم صاحب

ان کے سرتی و فرشتہ تھے۔ بیوی جو محسن رازدار اور شریک حیات تھی سو وہ بھی چل بسی اب رہا بچہ جو انسانی
 طبیعت کا عجیب سا نمونہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اس نے ادھر سے کوچ کر جانے کا فیصلہ کر لیا پھر جانے
 کے لئے ایک آلی۔ جنگل سے بچے کو اٹھا لایا وہاں بس ماں کے فردے پہ ڈال کر بیٹھ بیٹھ کے لئے کہیں غائب ہو گیا۔
 انسان کچھ سوچتا ہے اور کرتا ہے۔ قدرت کے اپنے طریقے اور فیصلے ہوتے ہیں۔ انسان اور قدرت
 میں اپنی اپنی ڈگر پہ چلتے رہتے ہیں۔ انسان اور جنم۔ پھر ماں بچہ اور باپ۔ ہر کوئی اپنے اپنے راستے پہ
 چلتا ہے۔ وقت اور کرم نے بچے کو ایک بے لولہ دھند کے آگن میں ڈال دیا۔ ہر طرف ہر جانب چھوٹے بڑے
 پتھر پتھر ان تراشے دیویوں دیوتاؤں کے چھوٹے بڑے بت۔ گھنٹوں کے بل چلنے کی عمر تک تو وہ
 ان گھنٹوں کو کھلونے سمجھ کر کھیلتا رہا۔ پاؤں پہ چلا تو مورتی ساز باپ نے پتھروں کی کٹائی رنگڑائی پہ لگا دیا۔ کام
 کے لئے اس کا نام بھی مورتی واس قہار دیا وہ بڑوں کی ایک ٹہلی واسٹ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے پاس یہ بچہ
 کچھ عجیب طرح سے ماں کے کفن دفن کے بعد اسے کوئی قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ باپ کی جانب سے تو
 اس کا ہی نہیں۔ تنہا ال والے خواہی فاقہ مست لوگ جو اس عجیب الفت کی پیدائش کے وقت سے ہی
 اس کے ساتھ تھے کچھ غم لینے ہی اپنی ماں کو بڑبڑ کر لیا باپ کو بھکا دیا۔ کم خن جہاں پاک کے تھے انہوں
 نے اسے ایک ایک کھانسی سے کھینچ کر لیا اور اسے اس کے پاس لے گیا۔ اس نے اسے ایک ایک
 سے یہ نصیحتیں کیں؟ جی تو قہر کلم میں جنم لیں رہیں کہیں انہیں کے ہر گز وہ جاویں۔ مورتی واس نے اس کے
 لئے جس خیمہ ڈال کر اس کا نام مورتی مل رکھ دیا۔ ہنومان جیسا چہرہ ویسا ہی بالوں کا رنگوں سے بھرا ہوا
 تھا۔ کچھ جیسا سر پر پنڈا۔ جنگل کا بڑا اور ٹھہم کا کھدرا۔ اوور کھتے ہی دیکھتے بچے سے جوان ہو گیا۔ اس کا کہ
 اس کے بھائی پتھروں کو اٹھا کر آسانی سے ادھر ادھر کر دیا۔ اس کا منہ بولا باپ بہت خوش تھا کہ اولاد کی
 نگرانی چاری ہوئی اور موت میں ایک کڑیل مزدور بھی ہاتھ لگ گیا۔

اب سے کچھ آگے لگا تو مورتی واس نے اسے سورتیاں بنانے اور چتر کاری کی تربیت دینی شروع
 کی۔ یہ دونوں تخلیقی فن ہیں نہ مطلقہ طور پہ ورثہ میں یا پھر خاص طور پہ قدرت سے ہدیہ ہوتے ہیں۔ اس
 کے پاس سورتیوں کے ہاں یہ دونوں باتیں نہیں تھیں۔ مورتی واس جلد ہی سمجھ گیا کہ یہ گوار گوار کسی نہیں
 ہو سکتا۔ اس کے لئے نہیں ہے۔

وقت کے گلو پہ بننا نکل جلد بڑھا ہوا جاتا ہے۔ اس کی گردن پہ گنگے ایک فاضل بوجھ بن جاتے
 ہیں۔ ایک مٹی کے گوار پہ ٹھوتے ٹھوتے وہ خود بھی ایک گھن چکر بن جاتا ہے۔ سوتے اٹھتے بھی وہ پتھری کا
 بنا ہے۔ پتھر تراشنا فن ہے اور پتھر تو زنا حور دوری۔ پتھر تو زلے ٹھیکے اٹھانے سے مزدور محسوس ہوتا۔ جو کسم

میں پڑنا 'جلد بازی' جلالت 'جلد بات سے عاری ہونا وغیرہ۔۔۔ گنگا تھا اس میں بشریت کم ہے اور جن چھوٹی سی

جنات کے طور طریق اور ذمہ کے عمل و شغل ایسا درو تھے انسان سے یکسر مختلف ہوتے تھے۔
شہروں اور دیہوں گنجان بستیوں میں رہنا پسند کرتے جبکہ وہ دیہاتوں، قبرستانوں، پہاڑوں اور جنگلوں میں
ہیں کیا دھرم خالق و رازق نے ان کے لئے پتھر، گوبڑے، بڑے اور گھٹے سڑے سوخت چوب و جام کا ذائقہ
ہوتا ہے۔ ان کی بود و باش کے لئے وسیع میدان، اوسنے پہاڑ، گہری کھائیاں، گھانیاں، غاریں،
و غیرے اور گھنے جنگلات ہوتے ہیں۔ وہ سمندروں اور یاؤں میں اترتے ہیں تو سیلاب سی کیفیت پیدا
ہے۔ بھنور پڑنے لگتے ہیں جبکہ بارشوں آنندھیوں، بھوت پھیریوں، جھکڑوں کا جب بھی اکثر اوقات
خرمستیاں، شرارتیں، کھیل کود، سفر لڑائی، لڑائی اور دیگر اقسام کے متفرقات ہوتی ہیں۔

اُس رات جب یہ نیاں بڑی اکٹھے ہوئے اور ان کا آپس میں اختلاط بوجھ آتشِ ذم ہوئی، غصہ
جب سب ایک جگہ تھے تو اس جگہ لسی ہوئی اور آتشِ لہریں بیدار ہوئیں جنہوں نے ایک ہی دم پانچوں
پادشہ کا سلسلہ کچلنے ہی چل رہا تھا۔ سولے اتفاق کا اور سے تین تین بچوں کا ایک نولہ چھٹی رستہ کا مہر
ہوئے گزر رہا تھا۔ یہ سب ایک ہی جگہ ہوئے اور ان کے ہاتھ پیر پیر سے لڑائی لڑائی کرتے تھے۔
انسانِ حق باطنی بندہ سناپ اور گدھے کے بچے بھی بچلے نہیں بیٹھے۔ کبھی انہیں چھا جوں جوں کی دھماکا
بھٹتی ہوئی ان میں ایک بے طرح کی سستی پیدا کر دیتی ہیں۔ مولانا ہے کہ اندر چھلا جائے اور اندر
اپنی اپنی ایک خصوصیت ہو یا اس رستہ میں۔ جیسے آدم بڑا بن جاتا ہے تو اس کا لڑکے سا چہرہ اور گدھے
وغیرہ..... حاملِ کاملِ انبیاء کی ہوگی اور رویشِ بھکت اور خصوصیتِ شامہ کے ماہرین ان بوکس نویسوں
کر لیتے ہیں۔

عہد انصورت کی بیوی اپنی ضرورت کے تحت باہر لگی باؤہاراں کا سلسلہ جاری تھا۔ عہد نبوت کے زمانے میں اس تک جانا تھا۔ یعنی اسی وقت اور جنات پہنوں کا گزرا ہوا۔ غشی موت سے جو گاہیں ہو چکی تھیں۔ غشی موت کی اصطلاح میں کچھ خاص خصوصیات کی حامل ہو جاتی ہے۔ اسے باؤہاراں کسی بھی طرح کے سہلے کے لئے۔ ڈاکٹر کے وقت 'سخت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ تین چار گھنٹہ تک ایک سنگ آپریٹ کرنا جنات نے عورت کے سر پر اپنی مخصوص لٹو ٹھنسی اور سنگ میں آکر بیٹنگوں میں برس پڑانے کی ٹیبل کے لئے چل رہے۔ سینے سے پھر آگے کھینچ شروع ہوتی۔ گاہیں عورت جس کے پیٹ میں جنات کا ٹھکانہ تھا یا اللہ کے فضل سے اپنی کوتاہی میں آگ کا شعلہ نہ کار ہی تھی۔ حکیم صاحب کی وصیت سے بھی رُوگردانی ہوئی۔ نتیجہ یہ کہ وہ

اُس نے میری آنکھوں میں اپنی چٹائی لٹکائوں کے چمکے برے اُتارتے ہوئے جواب دیا۔
 ”تمہاری آنکھوں میں مقابل کا اصل روپ دیکھنے کی صلاحیت ہے جبکہ تمہاری غیر معمولی خداداد
 طاقت و فطانت۔۔۔ ناورائی، معاملات اور مافوق الفطرتی ہوائیوں کو جاننے میں مجب ہے۔۔۔ میرے
 قریب آنے کی بھی یہی وجہ تھی کہ میں نے تمہارے حوالے سے میرا تمام کپاچہ تمہاری نظر میں آچکا تھا۔ تمہیں یاد
 ہو کہ میرے سٹوڈیو میں پڑاؤ میں ایک اُدھور سا کچا۔۔۔ تم نے مجھ سے مانگا تھا جسے ایک نایاب اور قیمتی چیز سمجھ
 کر اسی تک تم نے سنبھالا ہوا ہے۔ اگ عام انسان کے لئے یہ کیوس کا ٹکڑا دو ٹکڑے کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔
 مگر تمہارے لئے یہ ایک شاہکار اور ایک ناور لوح و قوید ہے۔“

ایک دو طویل کشوں میں باقی ماندہ سگریٹ رکھ کر تے ہوئے پھر کہنے لگا۔
 ”تمہاری فطانت کا وقت اب بھی قریب ہے۔ میں سناتے سناتے اور تم سنتے سنتے بور ہو چکے ہو۔
 اب اٹھو اپنی منزل کی طرف بڑھو۔۔۔ اللہ! پھر ملاقات ہوگی۔“
 وہ ایک سی سی آنکرائی تو لے کر گویا ہوا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم جب بھی کسی اور طرح کی چیز کو دیکھو، اس کی قیمت بھی اس طرح سمجھو۔“
 وہ ایک سی سی آنکرائی تو لے کر گویا ہوا۔
 ”اگر میں سمجھی اپنی سیلابی طاقت اور اندر کی شہرت کے لئے مجھ سے کچھ کم پال جائوں اور اس حمار پر
 حشر بڑھنے کے لئے بھی پہنچا جاؤں تو۔۔۔؟“

وہ میری جانب گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”میں جانتا ہوں تم وہاں پہنچے مارا ہی نہیں سکتے۔ ہندوستانیوں میں شاہی کوئی قابلِ ذکر
 نہیں ہے۔ یہ مارا موجودہ انداز سے کھڑا ہے۔۔۔ ان میں کوئی دانہ نہیں مل بھی گیا تو اس
 سے کیا تمہاری کوئی نہ طرح آتھی نہ ہو چکے۔۔۔ ہاں اگر تم جاؤ اور مل جاؤ تو میرے ماموں سے ضرور ملو۔
 یہ تمہیں اہلی مہرونی میں تلاش کرنے پہ مل جاویں گے اگر وہ وہاں ہوں تو۔۔۔ کیونکہ وہ اکثر گریڈوں میں
 ملتی مگر حضرت مل جاتے جاتے ہیں۔“

قارئین! میں نے اس بیکار روزگار مصوٰف کی اُدھوری ہڈی آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ مجھ ایسے

خبطیوں اور اُس ایسے جنوبی اور پختل فنکاروں کی کھانسیں کہانیاں اسی طرح ادھوری اور تشنہ لب ہوتی ہیں۔ دیکھا جائے تو جو لطف و مزہ ادھورے پن میں ہے وہ مکمل پنے یا سیر ہونے میں کہاں؟... ادھوری کہانیاں جو ایوں... کاتاتوں گھاتوں... خواہشوں خواہوں... مہبتوں زخاتوں اور زندگیوں شرمندگیوں سے... مزاحی ٹیپس حاصل ہوتی ہیں ان کا ایک الگ ہی سا نولہ سا سواہوتا ہے... یعنی جو گھات بات ان ادھورے نیوں والے کچھ میں تھی وہ اس کے مکمل ہونے پہ شاید نہ ہوتی... رخصت ہونے کے سنے اُس نے بڑا ادھورے مصافحہ اور معافیت کیا اور الوداعی بوسہ تو یوں تھا جیسے بھید گراہت و غلت و کسی ناپسندیدہ شخص کے حضور سے گالوں سے گل مس کرنے پہ مجبور ہوا ہو۔ ادھوری اچھکتی سی نگاہ وال کر وہ باہر لوگوں کے جھوم میں یوں... ہو گیا جیسے اس کا وجود کبھی یہاں موجود نہ تھا۔

انگلینڈ واپس پہنچ کر میں کئی محضروں تک اس کی آہنجی اور ادھوری کہانی کے تانے بانے سے ہمارے گلہ سکا... میں تو جیسے کسی چادر و گرنی کے بلند و بالا اونچے اونچے پام و وزیریناروں مشعلوں والے محل کی تاریک غلام گردش کے کونے میں لپٹی تار عکسیت میں ایک بوکھلائی ہوئی کمسی کی مانند پکڑا ہوا تھا۔ میں کہانی کے ایک ایک چارہ الگ الگ کر کے کھینے کی کوشش کر رہا تھا مگر اسے خود بہ خود آتا تھا کہ میں اسے اس مسورہ و سوسے کے روم پہ لے جا چکا ہوں اس کے تیار کیا اس جاتا ہے... یہاں تک کہ میں اسے حافلوں سے کیا جاتا تھا... یہ مکمل نیوں کے کچھ والی کون ہے؟ اور یہ بھی کہ چھٹے نیوں والی کا گھر نہ تھا اب بھی وہاں موجود ہیں کہ ان کے کسی فرد کو دیکھا یا سنا جاسکتا ہے... اسی جگہ پر اگلے حوالہ کے رسائی ہو سکتی ہے۔

بے شمار ادھورے سوالات تھے جو مجھ کے آندھے نیکوؤں کی مانند میری دماغ میں کھیل رہے تھے۔ کھنٹی کسی طور نہ ہو رہی تھی۔ اب میرے ہاں وہی طریقے تھے اول میں ٹیلیفون پہ رابطہ کر کے ان سے پوچھاں... یہ طریقہ شاید قابل عمل نہ تھا۔ ایسے سر پھرے تک چڑھے اٹا مارے تو سامنے دھڑکتے جیسے سپر نہیں دیتے ٹیلیفون کی لڑکوں نے گا... دوسرا ممکنہ طریقہ یہی کہ میں نکٹ کٹاؤں اور جدو اس کے پاس پہنچا جاؤں... لیکن نہ جانے کیوں صیحت و ہاں جانے پہ راقب نہ ہو سکی... اسی تذبذب میں کچھ اور جگہ کر گیا... چند نے نیوں والے کچھ لے مجھے تو بے حال کر دکھا تھا ان میں دو چار بار دیکھ نہ لیتا لیکن نہ چاہتا تھا انہی کی کشش مجھے ان کے اندر دوزخ آجائے جاتی... کوشش کے باوجود میں خود کو ان کے گھر سے باہر نہیں پاتا تھا۔ میں یہ عقیدہ بھی کھلا کہ میں کون کسی چہرے پہ کھلے ہوں سٹف مرمہ پہ کھدے ہوں یا کھلے قرطاس کیوں پہ ابھرے ہوں ان کی حرا گیزی سے بہر طور اغراض برتا نہیں جاسکتا... شرط یوں کہ

خبر محقق اور محسب جمال کے اجمال میں از قلم ”بوڑھ قصائی“ لکھی ہو !

● شکلیہ بات تو بھویالی ملکہ مرقوالی.....!

[illegible]

خلیلہ بانو بھوپالی سے میری بالمشافی کوئی واقفیت یا ملاقات نہیں تھی۔ ہندوستان کے اخباروں اور ماہانوں میں اسے جانتا تھا۔ البتہ یہ خواہش نہ رہی کہ کبھی اسے ملوں یا اس کا کوئی پروگرام دیکھوں۔ جب کبھی ہندوستان جانا تو وہ کسی لیے دورے پر نکلتی ہوتی۔ اصل میں میں اس سے تفصیل سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کا ان اعلیٰ ذہنی و جسمانی خوبصورتی یعنی جگہ پر فکر میری آرزو اور شوق کا مرکز بن گیا اور تھا۔ خلیلہ بانو بھوپالی جو اپنے بھم اور حساب کے مطابق لاکھوں میں ایک تھی۔ وہ عورت کا ایک ایسا انوکھا سروپ تھی جو مخلوق سے بڑی خاص سیرت، انسانی خوبیاں اصل جیتیں اور منزل و مقام حاصل کر کے اس جہان رنگ و بو

ایک صبح مہینے نے انہیں مطلع کیا۔

”خان صاحب! آپ کی بے پناہ مصروفیات کا مجھے احساس ہے۔ میں چونکہ پہلی مرتبہ مصروف ہوں۔ ہو سکے تو کسی بھلے سے بندے سے میرا رابطہ کرواؤں جو بھوپال میں میری کچھ رہبری کر سکے۔“
خان صاحب نے مصروفیت کا غدار اور معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔

”میں چاہتا تو بھی تھا کہ آپ کو اپنے ساتھ لے جاؤں پر کیا کہنے کہ اب چند ایک پروگرام سنبھالنے میں آں پڑے ہیں۔ آپ تو سمجھتے ہیں کہ آئی روزی کو اٹ مارنا بھی کفرانِ نعمت ہے۔ ویسے آپ کو وہاں کی ایسی جگہ بھی کیا ہے؟ ایک آدھ ہفتہ اور رک لیں۔“

”خان صاحب ایک تو مجھے واپس انگلینڈ جملہ پتھنا ہے۔ دوسرے وہاں ہنگل کنارے ایک مزار ہے جن کا عرس اس شکر و ان شروخ اور ہے۔ میں وہاں عرس کے موقع پر عاضری دینا چاہتا ہوں۔ چند لمحے انگریزوں پر خاموشی چھائی رہی۔

”ہیلو..... خان صاحب! آپ ٹن رہے ہیں کیا.....؟“

UrduPhoto.com

”ہاں! آن کا یہی نام مجھے بتایا گیا تھا۔“

اب خان صاحب کا لہجہ اک اتم تبدیل ہو گیا۔ بڑی بے ڈی سے بارگاہِ شہنائی کے تقصیریں شاید معلوم نہیں تھیں۔ لیکن ان کا دل نہ تو جھٹکتا تھا نہ ہی وہاں کوئی عرس ہو جا رہا تھا۔ شرم کی خواہش لئے تم وہاں جا رہے ہو۔“

”آپ کیا کہہ رہے ہیں! خان صاحب! یہ تو بہت قدیمی مزار ہے اور صاحبِ مزار بڑے بچے ہوئے بزرگ ہیں۔ ان کو انسان ہنگل کے شہر چیتے وہاں عاضری دیتے تھے بلکہ جنات تک وہاں سے ٹھکرے کرتے رہے ہیں۔“

خان صاحب ہنسنے لگے۔

”معذرت خواہ ہوں اس وقت تفصیل سے بات نہیں کر سکتا تو دوسری لائن پر سینٹو ٹیکارام میرے پاس ہے۔ ویسے مزار مست میرا مشورہ ہے آپ وہاں میرے ساتھ ہی تشریف لے جائیں۔ اگر کسی شے ہو سکے تو پھر بمبئی آئیے ہی چنے جائیں۔ لیکن وہاں کسی مزار و زار پر جانے سے اجتناب کریں! آپ ان سے آئے ہوئے ہیں بھوپال کے خانقاہی ماحول سے آپ واقف نہیں۔ محض وقت برباد کرنے والی بات ہے۔“

دو بڑی جگت میں کہہ رہے تھے جیسے انہیں مجھ سے جان چھڑالے کی پڑی ہو اور ادھر میں اُن سے بھی اُچھے کا اُتاؤ لاکھٹ سے پوچھ بیٹھا۔

”قبلہ خان صاحب! خاتم بدھن آپ کہیں وہابی شائی تو نہیں...؟“

جواب میں ٹیلیفون ڈیڈ ہو گیا۔ تعلقات ٹیلیفون اور سطح نیکار اسم۔ تینوں پہ چار حرف بھیجے ہوئے
تھے۔ پہنچ چھوڑ دیا۔ میرا طریقہ ہے کہ میں سفر کے دوران آسمان اور خوراک بہت کم لیتا ہوں۔ معمولی
کھانا کھاؤں گا۔ صوبائی کہ دھوا یا نہ دھویا ایک برابر۔ نقل صورت حال علیہ بھی ایسا رکھتا کہ انجینی وکھائی نہ دوں۔
میں طرح میں کمروہات اور سفر پریشانیوں سے بچا رہتا ہوں۔ زندگی اور سفر دونوں کا مزہ ہی بے سرو سامانی
میں حاصل ہوتا ہے۔ علی الصباح بھوپال کے شیشن پہ اترتا تو میرے کانڈھے پہ لنگے
کے تھیلے میں ایک آدھ بھڑا لباس دو چار کتابیں تھیں۔ گرتے پاتھیں اور معمولی سی جینل جو نہیں پہنے
تھے۔ اس حال اور اموال کے ساتھ باہر نکلتا تو کسی کی تیلیس رکشہ والے کے مجھے گھاس تک نہ ڈالی۔
میں نے کسی نہ تو فیکٹر کی طرح تھا جو شامت اعمال سے شہر کا رخ کر لیتا ہے۔

اور یہ راز کے عاقبتوں اور عاقبتوں سے معاشرتی مسئلوں کے حل کی تلاش میں جس حد تک خفیہ لوگ ہاگ
کے تجربوں کے لیے مثالوں میں ان لوگوں پہ گرتے ہیں تو ان کی روشنی میں ان کی جانب سے دیکھا گیا ہے کہ یہ
کے لیے کچھ سے قطع نظر وہ کسی راز کے بغیر نہ رہ سکتے ہیں۔ ان کی جستجو میں ہوتے ہیں۔ ان کی پہچان ان
معاشرے کو سمجھتا ہوں ان کے لیے جان بوجھ کر ایسا حال تخلیق کر رکھتا ہوں کہ نہ ٹریفک کی دھواں دھواں نہ کچھ کوئی دیکھے یا سنی
جسے۔ انٹیشن کے باوجود ان کی کوششیں بالکل ناکام رہیں۔ ان کے اصرار نے اپنی سواریاں لیے
کے لیے مسافروں کی کچھ دھواں میں مصروف تھے۔ ان کے حال کو میری جانب سے لے لگا دیا تھا وہ ان کی ہوس
کے سے ٹھٹھا بھٹکا ہوا انٹیشن کی حدود سے باہر ٹھٹھا روٹنے لگا آیا۔ چند لمبے راک کر دائیں بائیں دیکھا
کے لیے کیا کر سکتی تھی شہر کس طرف ہو سکتا ہے؟

یہ بھی سیاحت کی ایک سائنس یا سیر ہے۔ یہ نیشنل ہوتا تھا جس سے ہر تجربہ کار سیاحوں جہاں نور دوں یا
میں رہے ہیں ان کو اسی بلکہ بین الاقوامی خاندانی آوارہ گروں کے ماں ہوتا ہے۔ یہ راندا دکان کا
بڑا سیلاب کیلئے پہنچی اپنے اسی علم و سائنس سے دنیا بھر میں شہروں، شہروں، ملکوں ملکوں تک چلا سکتے ہیں
ان خدا بہار صدر کے تیسری طرحوں کی خارجی اور داخلی حقیقتیں غیر معمولی اور عام انسانوں سے کہیں
تک ہوتی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ غیر انسانی ہوتی ہیں۔ نئے کونے اور بوتھ کی خصوصیتیں پہنچیں اور عادات
خاندانی آوارہ گروں میں موجود نہیں تو وہ دوسرا ہے۔ شخص اندر باہر کی کالک سے کوا۔ انسان دوستی سے نکلتا

”بڑے میاں! میں سمجھتی تھی تو آیا ہوں۔ یہاں کے ایک باسی بھونچھلی میں رہتے ہیں مجھے ان کے ساتھ یہاں پہنچنا تھا مگر یو جہ وہ میرے ساتھ نہ آ سکے۔ ادھر آنے کا اصل مقصد یہاں آسودہ خاک ایک رنگ کے حرار پہ حاضری دینا تھا اور ذرا مقصد یہاں کے تاریخی مقامات موسابہد و مکاتیب تہذیب و تمدن کا مطالعہ و مطالعہ بھی ہے۔“

وہ مزید کریدتے ہوئے بولا۔۔۔۔۔ ”اور کچھ...؟“

”میں یہاں کے پراسے لوگوں ’قدیمی مزاروں‘ کنوؤں بادلیوں اور جنگلی بیابانوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ یہاں کے شاہی محلات ’عاجب گھر اور لائبریریوں‘ تک جانا چاہتا ہوں۔“

”بھئی! تم نے ابھی کہا ہے کسی بزرگ کے حرار پہ جانا تمہارا اصل مقصد ہے نا اور تم بھوپال کے رہنے سے کسی آدمی کے ساتھ ادھر آنا چاہتے تھے۔۔۔۔۔ ان دونوں کے نام پتے پتا کتنے ہو تا کہ ادھر پہنچاؤں؟“

”وہ ادھر کے بڑے چائے پینے والے ہیں۔ نام ان کا عبدالرشید خان ہے مشہور قوال شکیلہ بانو کے ساتھ ہیں۔ بہت گھٹ میں بھی ان کی سکونت ہے۔ دوسرے جن بزرگ کے حرار پہ میں حاضری دینا چاہتا ہوں وہ حضرت شاہ بابا نامی ہیں۔ ان کے پاس میں ایک قدیم سندھی خاندان کے کسی شخص سے بھی ملنا چاہتا ہوں جو چند صدیوں پہلے یہاں سے ہجرت کر گئے تھے۔“

نہری نے کہا میں سن کر کچھ دالے کو جیسے ساپ نہ گھوم گیا۔ اگر وہ جگہ پر بعد گھوڑے کی طرح بھڑکے گا تو یہ تو کتنا خطرہ ہے۔ اب میں اس مسئلہ میں کہہ دوں کہ وہ کون سا حرار ہے۔ بات کو دیکھ کر پتہ چلے گا۔ اچھے کوٹھنے کا سلسلہ میں ہی نکلتا ہے اسے منطقی انجام تک پہنچا دینا چاہئے تھا۔ جب خاصا سستی کے جس دم میں گزر گیا تو میں نے ہی بات کی ایک کھلی نئی کھلی سکوت کے تالاب میں جھنگی۔

”میاں! اچھا جواب نہیں، یا میری کوئی بات ناگوار گزری یا جواب کے لائق نہیں؟“

”اے میاں! نے لے لی میری جانب موزے وغیرہ تو لگا سکتا جواب یہی نہ۔“

”بھئی! صبح بسم اللہ پڑھنے کے وقت آپ نے بائیس ہی لاکھوں لاکھوں پڑھنے والی شروعات کر دی ہے۔۔۔۔۔ میں خاموش رہوں تو کیا آفرین کہوں؟“

میں سر ہٹا کر رہ گیا۔ اپنی باتوں پہ غور کیا۔ کون سی بات ایسی کہ لی جو قابل احوال نہری کے لیے تھی۔ جب چنداں سمجھ میں نہ آیا تو پھر بچہ چھ بیٹھا۔

”بارہا طرہ ہوتو کچھ بتا دیں میری کون سی بات ایسی تھی جو آپ کی صبح نازک پہ گراں گزری؟“

وہ یکدم روکتے ہوئے بولا۔ ”بھئی! ابھی تم یہیں اتر لو۔ میں سویرے سویرے کسی فصیحے میں پڑنا نہیں

چاہتا۔ جس مزار کا تم نے ذکر کیا وہاں تو جنات کا ہی رہا ہے۔ کوئی ہوش مند ادھر کا رخ کرنا پسند نہیں کرتا۔ شاہ بابا کا پورے کا پورا مزار ارد گرد کی مٹی تک جنات اکھاڑ کر کوہ قاف کے پہاڑوں پہ لے گئے ہوں۔ اب تو یہاں ان کی باقیات میں ایک بڑا سا گڑھا ہے جس میں ہر وقت الادہ جلتا رہتا ہے۔ نہ کوئی کھڑے والے ہے نہ ٹیل گھی پر چومیں کڑاک وہاں خوشبودار میٹھی میٹھی آگ روشن رہتی ہے۔ کہتے ہیں جنات خوشبودار ٹھنڈی ٹھنڈی آگ خود جلاتے ہیں۔ جنات کے خوف سے کوئی ادھر کا رخ نہیں پکڑتا۔ البتہ وہاں سے قریب ہی ان کی صاحبزادی صاحبہ کا مزار بھی ہے وہاں مست فلک لوگ آتے جاتے ہیں۔ وہاں جانا چاہو تو میں چھوڑے آ جاؤں۔ انکی کمزوری بھارا ہو گا صبح صبح بوٹی کا نیم ہے۔

بچے والے کی خوف زدہ کر دینے والی باتوں سے مجھے کوئی فرق نہ پڑا کیونکہ اس قسم کی جتنی باتیں جبرہ والے غیروں کے حضور سے بھی سنی گئی تھیں۔ اب یہ سب باتیں میرے کسی جواب کا مستحق نہیں ایک دماغی جھکاؤ کو چمکدے غیروں والے حافلوں کی بابت پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ غفلت کا ہر کسے ہوئے کہنا گا۔

”سب سے پہلے اپنا ہے تو میخوڑنے آؤ گے۔“
 میں نے کہا۔
 چلتے بسم اللہ

میرے اس جواب پر وہ یوں چمک اٹھے میں نے اسے کہہ دیا ہو۔ ”مہربان امیں آپ کو کون پہچانتا ہوں۔ بہت کالے برسوں پہلے لاہور شیش سے آپ نے مجھے اپنے کالے پہنچایا تھا میرے گھر پر۔ والے پھر خراماں خراماں داتا دربار کی جانب چل دیے۔ شاہ عالی کے باہر سبھ بھر کے پاس گئی۔“
 ”پیارے مہارگ ہو“ کہا تھا۔ داتا صاحب کا شکر کھلایا۔ وہاں سے شاہی محلے جتنا بائی جمل چوری کی دیکھ کر کھڑا پکڑا۔ بھلا کبھی جسم جگہ تا لگے اور وقت بدلنے سے بھی کہیں امر و اصل بدلنا ہے۔ ہو سکتا تھا کہ میں اسے کھانا کھاؤں۔ خاڑا ف تا کیلی کے شعبہ بازی کی یاد بھی رلاتا۔ مشکل میں موہنہ نیل والے کھانڈر سے ٹھیلنے کی بات بھی کرتا مگر شاید اس وقت ان قصوں کو چھیڑنے کا نہیں نہیں تھا۔ اچھا صدارت سے ملنے کے بعد میرے کھانا میں کچی پائے تھے۔ اس دوران ہمارے دونوں ملازموں پہ بات چیت کی مکمل قاذوبندی رہی۔

مجھے پاتال میں مختلف نوع کی معدنیات، مائنرات، اعلیٰ و کثیف، بادیات و معانیات۔ اعلیٰ اور بے پناہ گرم، دھرتی کی اپنی اپنی کیفیات وغیرہ۔ اپنے اوپر موجود مخلوقات پہ بددعا۔ اور اثر پذیر ہوتی ہیں۔ خواہ وہ حیوان مطلق ہوں یا حیوان مطلق، شجرات یا جھرات وغیرہ اور کچھ طبقات

یہ بھی ہوتے ہیں کہ ان پر سرائی انجام دے کر دھرم بڑے مثبت نتائج کے حامل ٹھہرتے ہیں کہیں ایسی زمینیں ہوں جو پہلو تو جیتل بھی نہ اگے۔ کئی ایک بدطالع، مضرت خیز اور کئی ایک خیرہ ارض ایسی تاثیر بھی رکھتے ہیں کہ قانون و ظہان پیدا کر دیں اور یہ بھی دیکھا جا کہ حصہ زمین پر ال و دماغ کے بند سوتے کھل لیتے ہیں اور بار بار جاتا رہتا ہے۔ بٹا شست، حق و رحم اور ا۔ تظنا پیدا ہوتا ہے۔

گو ہر مقدونیہ سکندر جب دنیا کو فتح کرنے کا عزم لے کر اپنے ملک سے اٹھتا ہے تو اس کا معلم المعلمین
تالیق اور مشیر خاص ارستو اسے چند خاص چند نصائح سے نوازا ہے۔ گھوڑے کی تنگی چنچہ کے پسینے سے
بچاؤ اور چشم چتر اور آنکھ آنسوؤں سے بات کرنے والی عورت کے گھر و فریب سے دور رہنے کی تلقین کی اور
سب سے اہم طریق جہاں بانی کے ظمن میں راز ہائے سر پرستہ کھولتے ہوئے کشش ثقل ارضی طبقاتی اثرات ان
مکان و خصوصیات کے بارے میں تحقیق کی کسی فیصلے سے پہلے کر لیا کہ وہ زمین کی اتھار تک درجہ بدرجہ تمام غشی
کے بعد اثرات اور کوئی حکم صادر کرتے سے اپنے سر کے اوپر واہستگان افلاک کا نقلی جائزہ لینا بھی سکھایا
کہ جو کے میں بیٹے اور اوپر جو گھنٹے، حکمت و معرفت سے غفلت و قدرت کے جو غشیف و غشیف اشارے
ہو جاسکتا ہے جو گزرا گیا ہیں ان کے اثرات و سترات کیسے جاننے اور سمجھ جاسکتے ہیں

کہ حضرت کہ اسٹیج کے پاس ایک عزم کا زو تھا۔ وہ مثبت مسکری اندازِ محرم سے جہاں بیانی پہ آنا دیکھا۔ اس کے
 ہاتھ پہ ایک دیدہ و دور رہا تھا۔ اور پایا بھی وہ جس نے اسے کسی جہر کا کنو و نو اب میں غیلا نہیں کیا بلکہ اس کے
 آگے آگے دنیا کو عزم و جسٹ کسٹ اور ملی و کشادہ قدمی ایسا ہی زبانی تقاضے کا شفا سے کا کتب بنا دیا۔ اسی
 سے ہی یہ سچی دیا کہ تم سکندر اعظم بن کر پوری دنیا میں جگہ کر لو جب بھی تمہاری مقدسہ دونوں ہاتھوں ہاں ہی لونا
 سے کہ جب تمہاری موت آئے گی تو وہ یہ نہیں دیکھے گی کہ تم اپنے دشمن کھر کے آنگن میں یا دور کہیں کلم نام
 سکندر کا عزم راہوں پہ ہو۔ آخری وقت دونوں ہاتھوں ہاں اور کھلے رکھے گا کیونکہ اس کے جیلے القدر کا فضل استوار
 بنا دیا تھا۔ اس خالی ہاتھوں دنیا سے جانے والے بادشاہ کو راجتی دنیا تک الیکٹرانڈ روی گریٹ ہی کہا جائے گا۔
 سکندر اعظم کا یہ مختصر سا تذکرہ زمین و افلاک کی دیدہ و آن دیدہ قوتوں کے حوالے سے درمیان میں آ
 کہ جس اور کچھ والا اک خاصا وقت اپنا انا دھارے رہے۔ شاید اس لئے ہم دونوں اک دو بے کے
 سے تھکے ہوئے یا جس زمین اور آسمان کے درمیان ہم موجود تھے یہ اس کا بھی اثر یا تقاضا تھا۔

دیتے ہیں۔ ہمیں کے قریب غنہ نہیں، چیزیاں، ثمریاں اور کچھیں آپ کا استقبال کرتی ہیں۔ سونے کی
راستے ایسے سرسبز اور خوش منظر نہیں ہوتے کہ یہ آنا سودہ زندگی اور فرسودہ موت کی گزرگاہ ہوتے ہیں۔
گزر رکاوٹوں کے نیچے تخت الہی تک گندھگ شکر کا جہنم دیک رہا ہوتا ہے۔ میں نے بروہلم کوئی کریم
دہلی امرتسر، میسور اور دنیا کے بہت سے دیگر علاقوں میں ایسے طبقات ارضی اور افلاک کی منکھٹ دیکھے جو آج
اسی بلاست آفرینی کے زیر اثر ہیں جو صدیوں پہلے ان کے حصے میں آئی تھی۔

[illegible]

انسان کھانا پینا تو سب کچھ کر سکتا ہے مگر ایک شے ہے جسے وہ ایسا نہیں کرتا۔ لیکن یہ شے
 دلوں سے چھو پائے کھاسے پینے اور فراغت کے لئے کسی برادروپاشی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ اڑتے نہیں جھپٹتے
 چلتے اور سوتے جانتے بھی یہ فریضے آسانی سے سرا جھامہ لے لیتے ہیں۔ ہر جانور کا بول و برز بشمول انسان
 نے کسی کام کا بہتتا ہے اور بہت سے عمارتوں کی وہ اناقند اور حیرت انگیز تعلیمات کا نیز و اناں اور کئی ایک مہیاں
 لئے تریاق۔ درجہ اعلیٰ نے ان جہاں میں کسی چیز کو بے کار پیدا نہیں فرمایا۔ بظاہر یہ مقصد نہیں
 دینے والی شے بھی نہیں نہ کہیں اپنی اداویت رکھتی ہے ہم اگر کوہ جنی کی بناء پر ت جان پائیں تو اس میں
 تصور ہو سکتا ہے۔ انسانی جسم سے خارج ہونے والے مختلف موادات کو ہم پسینہ کچا میل مسکری غلظت
 بیضاب کہتے ہیں۔ یہ انسانی میں نمودار اپنے ہاں کسی نہ کسی مقدار میں وہی میزلی پورین و فاسن اور وغیرہ
 ریشہ جات محفوظ رکھتا ہے جو اس کی غیر جسم غذائی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ ایسی کراہت و حالت کہ
 اس کا زیادہ دیر سامنا نہیں کر پاتا مگر یہ اس کے معدے میں موجود ہوتا ہے اور بعض اوقات تو کئی دن

بظاہر اس علاقہ کا کوئی روشن پہلو نظر نہیں آتا لیکن چڑھے کھٹے لوگ جانتے ہیں کہ انسانی فضلے کی یہ سب چیزیں سے بڑے بڑے قیمت اور مشہور میک اپ کے سامان بنتے ہیں۔ خاص طور پر عورتوں کے لئے ایک مخصوص لپ سٹک انسانی فضلے سے حاصل کی گئی چربی سے تیار کی جاتی ہے۔ انسانی معدے میں جو جسم بن کر جب فضلہ بننے کے عمل سے گزرتی ہے تو اس میں ایک خاص کیمیاوی تغیر پیدا ہوتی ہے اس سے بھی ایک ایسا نایاب مادہ وجود میں آتا ہے جو چمکاؤ کے فضلے اور ابا بیل کی ہیرت کے علاوہ کہیں اور یا کسی متبادل علاج سے حاصل نہیں ہوتا۔ انسانی فضلے سے اس مادے کو حاصل کر کے ایک ایسی ذوا نو وجود میں آتی ہے جو اسٹون کے سرطان کے لئے تریاق ثابت ہوئی۔ متعلقہ ذرائع اس پر مزید تحقیق کر رہے ہیں۔ اسی مادے سے ایک نیا 'الرجی' برص اور جلد کی دیگر بیماریوں کے لئے مرہم بھی تیار ہو رہے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ انسانی فضلے کی بدبو سے ضعف شام کا باغی میلان بھی ہو سکتا ہے۔ یہ غلط فہمی ہے۔ اس کا پلٹس باندھنے سے خاصا فائدہ ہوتا ہے۔ تجربہ کار پولیس کے تحقیقی افسر نہ قبولے والے مجرم کے منہ پر اس علاقہ کا تو برا پتہ چھادیتے ہیں۔ مختلف جان بچھلے اگلے بچھلے تمام جرم قبول لیتا ہے۔

یورپ میں زیر زمین پائپوں کے ذریعے گھروں کی تمام ملازمت شہر سے باہر ایک پلانٹ میں پہنچا دی جاتی ہے۔ جہاں پر انسانی فضلہ کو اس طرح کا بنایا جاتا ہے کہ اس کا پلٹس باندھ کر کئے جاتے ہیں۔ ان کے ایک ایک کا آمد چھ میٹر کی جاتی ہے۔ گھروں میں پائپوں کی شکلوں میں تبدیل کر کے تحقیق کے لئے بوتلیں کر دیا جاتا ہے۔ پھر کون جانے کہ ہم جو دوا کر رہے ہیں ایک آپ خاصی رقم بخوشی کر کے استعمال کر رہے ہیں۔ اس کا اصل ساتھ کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لئے ہر چیز کا خاص اور باطن سمجھ دیا ہے۔ پودوں پر لایا ہے۔ وہی بات کہ ری سائیکلنگ جسم ہر چیز اپنی ہیئت تبدیل کرتی رہتی ہے۔ ایک لمحہ پہلے بو خدا کی ہو گئی جاتی ہے۔ طاق سے اترتے ہی وہ پلید ہو جاتی ہے۔ علاوہ نہ منہ بعد کے کی صورت باہر نکل آئے تو کھانا بدبو دار اور ملازمت بن جاتا ہے۔ اندھیرے سے اجالہ اچالے سے پھر تاریکی۔ زندگی سے موت۔ موت سے پھر زندگی کی نمو۔ اچھائی سے بُرائی نکلی سے بڑی۔ محبت، نفرت، زوری سے نرا نکلا اور موت۔ زندگی اسی راہ و چل سے تغیر ہے۔ اچھا بیٹھ ایسا ہی نہیں رہتا (استغنا کے ساتھ) اور بُرا تو اکثر اچھا ہو جاتا ہے اس رنگ بدلتی دنیا میں ہر شے تغیر فریب ہے۔

انسان یعنی وہ فضول چیز جس سے اس کا جو ہر ٹکڑا ہوا اور باقی چھوٹا رہ گیا ہو۔ ہمیں چھوٹا چھوٹا چھوٹا چھوٹا بھی اصل کی مانند اقدار سے کا حال ہوتا ہے۔ بھلوں اور کارخانوں کے گودے چھٹکے آج کو ٹھیک اپنے اور گھریلو گوشت کی ہڈیاں چھٹکے باقی رہ جاتی ہیں۔ انانج دالوں کے چھٹکے بھوسی۔ چائے قبوے کی

استعمال شدہ پتی۔ استعمال کیے ہوئے برتنوں اور کپڑوں کی اڑھائی کا پانی 'سر جسم' کے اُتارے ہوئے ہیں۔
 ناخن وغیرہ میں سے کچھ بھی تو فضول نہیں، ہم ہی بے علم ہیں۔

کسی فیسس سا ہوکار کے ہاں ایک نہایت ہی غریب مگر عقلمند آدمی ملازم تھا۔ ساہوکار اپنی ملازمت
 کنبوسی اور کمینگی کی بنا پر اس کی پوری گرفت کرتا تھا۔ ایک ایک چیز 'حرکت' پر نظر معاوضے کے مقابلے میں اس کا
 کتنا کام لینا۔ گن گن کر کھانے پینے کو دینا۔ یہاں تک کہ اکثر باسی پٹی چھٹی خوراک سے بھی اسے محروم کرتا
 تھا۔ یہ بے چارہ غربت کا مارا جیسے تھے اس کے ہاں چائو اور گردہا تھا کہ اور جو کوئی زندگی بسر کرنے کا وسیلہ
 یہاں نہ تھا۔ گھاگ فیسس سا ہوکار اکثر اوقات اس کی صحت 'چہرے' بشرے سے پہ کھلی آسودگی اور اطمینان قہقیر سے
 کرکڑھتا اور سوچتا رہتا کہ اس کمبخت کو کھانا پینا بھی ناپائلا اور رہند کھوندنا ہے آرام سکون کا کوئی قصہ نہیں۔
 لعن و گھبر کی سے ہر وقت اس کی تو صبح بوقت سے بچھڑکنا دیکھ کر اس کی صحت پہلو انوں جیسی
 خوشی ہاشی ایسی کہ جیسے دنیا کا امیر ترین شخص ہو۔ کچھ مزید نگرانی اور تفتیش کے بعد جب سب کچھ سنے پلے پکھونے پر اتفاق
 روز پاس بٹھا لیا۔ بڑی ترسان و سچ سے اپ چھا۔

"اے گھبراہٹ بھائی، تو چوری کرتا ہے کہ میرا مال سناں دیتا ہے۔" سوئی میں منہ داتا ہے کہ گھبراہٹ
 سے ملے چہ اسے۔ "تو میری خدمت سناں دیتا ہے کہ میرا مال سناں دیتا ہے۔" سوئی میں منہ داتا ہے کہ گھبراہٹ
 فلم کی چھٹی اور دم خوش خوش پھوٹا رہتا ہے۔ کچھ کہتا کہ آج کچھ کہنے پر تری ہر خط معاف ہے میرا دشمن ہے۔
 وہ میرا آسودہ ہندوستان اور خدا اور حق و حقیقت و حقیقت سناں دیتا ہے۔ سوئی میں منہ داتا ہے کہ گھبراہٹ

"مالک! میں نے پورا مال اور نہ ہی بے ایمان دے دیا۔" سوئی میں منہ داتا ہے کہ گھبراہٹ
 و حقد ہے میں محنت اور گھبراہٹ ہے۔ میں معاوضے اور سکین کے قطع نظر اپنے ذمہ کے کام کا جان تو خدمت سے
 سرانجام دیتا ہوں۔ محنت اور خدمت میں ذرا بھائی میری خوشی اور اطمینان کا باعث ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ
 کہ آپ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ میرا ایمان صرف اس امر پر رہتا ہے کہ میری جانب سے
 خدمت محنت میں کوئی کوتاہی نہیں دیتی چاہئے۔"

ساہوکار چند لمحے خاموش رہے کے بعد اس کے سر آپ پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔
 "تیری حسد کی کار کیا ہے۔ میں دنیا کی ہر نعمت کھاتا ہوں پھر بھی تیرے جیسی حسد رستی نہیں کرتا۔
 تو کیا کھاتا ہے جو میں نہیں کھا سکتا؟"
 وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"اے ادا! سوئی سے جو چیز بھینکنے والی ہوتی ہے وہی میری خوراک ہے۔" ترکاریوں اور

انہوں کے چھلکے اناج آٹے کی لمبوی۔ مٹولی چو قد و شانچہ پالک کے پتے و ٹھل میری خوراک۔ میں انہیں پھینکنے کی بجائے بھجیا بنا کر کھا لیتا ہوں کہ اصل مزہ اور جو ہر تو ان میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہی میری تندرستی کا راز ہے۔“

بات ہو رہی تھی انسان اور دیگر جانوروں چوپایوں کی کہ ان کے فضلے اگلے اپنے پیشاب اور دیگر فضلے جو ان کے کانوں آنکھوں ناک جسم منہ سے عاب کچھ کچھ نکلنے لگتی ہیں۔ اسلئے اچھاگ کی صورت میں خارج ہوتے ہیں یہ بظاہر نجس ناپاک اور بیکار چیزیں اپنے اندر کیا کیا خواص رکھتی ہیں۔ طبی اور طبلساتی اعتبار سے ان میں کیسے کیسے اسرار پنہاں ہیں۔ سفیاسی ٹونگوں و لمبی طریقہ علاج اور صدوی لٹھوں میں ان کے کیا کیا چھکار ہیں۔ سفلی عملیات اور فصول بندی میں ان چیزوں کا کیا کردار ہے؟

انسانی حیوانی ہاں ناخن اور کھڑا تھلا لنگے پتھر سے جو پتھر پتھر کی مٹی سمونٹا کھانا پانی اور تحریر و تصویر سے کیا کیا نیکیاں بدیاں بن سکتی ہیں..... ہندوؤں اور دیگر لادین قوموں میں ان چیزوں کا بہت عمل دخل ہے بلکہ ان کو کہنا چاہئے کہ ان کے روزمرہ کا ضروری حق اور دھیان گیان اور تپسیا کی آتما ہیں۔ اسلئے ان کے گوبر کو پتھر سمجھا جاتا ہے۔ اس سے اپنے گھر کے فرش دیواریں لٹھیں بن جاتی ہیں۔ اس کی مٹی سے جڑ سائی جاتی ہے۔ اس کے پتھر سے پتھر کے کام آتی ہے۔ اس کی دم کے بال اگر انہ سے مٹی بن کر چھیا میں بانٹ دئے جائیں تو بیمار ہاں تندرست ہو کر خوب بھگتے اور پلکدار ہوتے ہیں۔ اسی طرح مٹی کا پیشاب طاقت اور مٹی کی نسبت بڑا کرج ہے۔ اس کے جلے ہوئے کمران کھراں کھڑا بہت سی جسمانی اور اعصابی بے صبری کا علاج ہے۔ اس کے پتھر گھر کے صدر دروازے پر نصب کرنے سے بھوت پرست آدمی کا رستہ بند ہو جاتا ہے۔ سالانہ صحت و بکریاں اپنا پیشاب پی جاتے ہیں ان میں زحمت اور سستی بڑھ جاتی ہے۔ زادہ تو آدمی ہے بکری بکری کدھی کدھی کدھی کدھی کہ کدھنی کے کدھنی کے پیشاب میں بھی غریب و غریب اثرات ہوتے ہیں جن میں بہت سے جسمانی عوارض کے لئے شفا ہے۔ ان کو پکا دوز کوا کدھ کرنا عار پشت پھیلنے جھلنے لٹا یعنی لگڑ پھل کا سام کھانا بیوا لومڑی ہندو کدھی بھینسا بھنگی خرگوش شیر زبچہ اور بانو ان جانوروں کا گوشت پوست پھونچ پھنچا ہے اور ان کی طاقت وغیرہ سفلی عملیات اور سفلی بیماریوں میں کام آتی ہیں۔ چڑ کے پیشاب میں حیرت انگیز اور شرف کر کے بھجائیے جاویں تو ان کا زخم جان لیا ہوتا ہے۔ خار پشت کے کاٹنے لمبا ہادی اور بے انتہائی کا موجب بنتے ہیں۔ کدھنی کے کدھنی کی کدھنی خوش خلی لاتی ہے۔ کستورہ ہرن کا نالہ جس گھر میں ہو وہاں اک عجیب سی روحانی خوشبو اور خوشیوں کی بھاری آندھی رشتی ہیں۔ مارخور کی جگالی کی جھاگ کدھنی گھس سمونٹنے پھیلنے کی بہت اور خون

[illegible]

جنگلات کی دنیا کی حیات و ہنگامہ سارا نظام انہی فطری و حیاتی جہتوں اور قوتوں پر مبنی ٹھہرتا دکھائی دیتا ہے۔ اکثر پرندے، درندے، خزندے ایک دوسرے کو اس کے لئے بول و براز کی نوبت سے شناخت و دریافت کا شکار کرتے ہیں۔ جنگل کی گہرائیوں تاریکیوں میں جہاں آنکھ کام کرنا تھوڑا دیرتی ہے وہاں جانوروں کی ایسی جیسے سامنے آتی ہیں جو حیرت انگیز ہوتے ہیں۔ انہیں تو انہی جہتوں کے ساتھ موجود نہیں۔ بول و براز کی پست و استغوا کی پائیم و حریف اپنی مخصوص سیمائی شدت رکھتی ہیں بلکہ فوق الطبیعیاتی انہوں فیزیکی حیرت بھی ہو جاتی ہیں۔

جہازوں کو لنگر بندش یا جہاز اور شکر شکنوں کے ٹکڑے کی شکل میں اجڑا کر پھینکا گیا ہے۔

UrduPhoto.com

سٹی ایئرپورٹ پر ایک حادثہ پیش آیا جس میں دو مسافر ہلاک ہو گئے۔

پانچ تھے ہیں -

ایک شیطان شخصیت نام نہاد عامل جو اشتہاروں اخباروں میں پڑے پڑے لوگوں کی تشبیہ کرتا ہے۔ اس کے پاس جسمانی و روحانی مسائل کا سو فیصد حل صرف اور حلالی منہ کے عمل میں ہے۔ خود ہی نئے حالات مولدات سے وہ انکی انسانیت کی فی تکلیف اللہ خدمت کا دعائی تھا۔ تا کا فی کی صورت میں سات لاکھ روپے نرمانہ ادا کر لے گا اور بھی خواہش کے لئے پروہ اور کھلی رازداری کا توفیق بھی فراہم تھا۔ ان کی تمام صورت الجلی ہی مفید وادھی صاحبزادہ اور ثناء صاحب کا لاشعہ بھی انہیں معتبر اور ناقص سمجھنے میں کاروائی تھا۔ ان کی صحت لاکھوں گھروں میں پھیلے جانے والے مخصوص اخباروں کے میگزین کے آفری رقمیں صفحات ایسے ہی یاد و گروں و فہر نورانی صورت عاملوں کا ملوں جنات نقش مولدات کی تصویریں سے مزین ہوتے ہیں۔ ان کی سن کر دینے والی تحریریں بلند و بالغ و موئے عجیب و غریب حیلوں شکلوں والے منشاء بنایا ہیں۔ ان کی تصویریں آسام مسر بھگدیش تبت کے جنگلوں پہاڑوں صحرائوں میں ریاضت اور عیاں کے تذکرہ کے اشتہاروں کو بڑا پہچان خیر اور پرامن راہ دیتے ہیں۔ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ایسی ہی صورت نور و جہنم نہیں پاتا۔ پڑھنے دیکھنے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔ خاص طور پہ بچے ذہن کے لڑکے لڑکیاں جو کسی نہ کسی جہان

”عودت کے لئے اس کے گھر کی سلامتی اور شوہر کی محبت ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ میرا پیسہ بڑا بڑا کچھ ہے حاضر ہے۔ میرا گھر برباد ہونے سے بچالیں۔“

قارئین! قصہ کوتاہ کہ اس پرانے پروفیشنل شکاری نے اس سونے کا انڈہ دینے والی مرغی سے لکڑی مہارت سے انڈے حاصل کیئے کہ اس بے چاری کو یہ احساس تک نہ ہوا کہ وہ آبِ غلابِ جواب پہ پھنسنے والی گولہ اندہ بھی دینے کے قابل نہیں رہی۔ خاندانی دو نمبر عامل! اچھے پروفیشنل فراڈیے اور شریف انفس ٹو مرہانہ کمال یہ ہوتا ہے کہ فتنے والے کو احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ برباد ہو چکا ہے بلکہ اپنے تئیں شرمندگی ہی محسوس کرتا ہے کہ وہ مزید لٹنے سے محروم کیوں رہا۔ عامل نے اس مسئلے کے لئے مختلف وظائف کیئے اور کروانے جب کبھی نتیجہ سامنے نہ آیا تو آخری نسخہ یہ بتایا کہ وہ اپنے جھٹ کی ایک خاص مقدار سوپ یا کسی گرم مشروب میں شامل کر کے برات مالتے سے اسے پلا دیا کرتا ہے۔

انسان اپنے نمٹنے والے مقصد کو پانے کے لئے ہر اوقات جا کر ناجائز ہر قسم کا استعمال کر لیتا ہے۔ غرض مندوبہ اندہ اور دیوانے سے کچھ بعید نہیں ہوتا۔ یہ لڑکی محض شک کی بنا پر یہ سب کچھ کر رہی تھی۔ اس شہر کو اپنی جسمانی ملاقات والے سے دلچسپی نہ تھی۔ عامل نے بتایا تھا کہ اس طرح وہ ہر گز کو اپنے مسلح کر لے گی۔ یہ فعل جس طرح اس کے دل میں گھس گیا اور اس کے دل میں یہ فکریہ گھس گیا۔ یہ یہ تو فکریہ بھی ایک عورت بدست تک یہ قبیح فکری نہ رہی۔ خاوند مسلح ہو آیا نہ ہوا لیکن وہ از خود ایک چیلر نما عورت ضرور بن گئی۔ خاوند میں زہریت اپنی انتہا تک پہنچ چکی تھی! نتیجہ یہ نکلا میاں بیوی دونوں جنسی مریضوں کی طرح مختلف عوارض میں مبتلا۔ گئے لڑکی کے چہرے پر غم پھیل گیا۔ وہ اپنے دل میں سوچ رہی تھی کہ پچھتاوا کبھی پائیس نہ ماندا تک لگیں۔ آنکھوں میں دھندلا پن تھا۔ پچھل کر پھٹنے لگی۔ یعنی سارا انسانی نظام ذرہ ذرہ برہم ہو گیا۔ خاوند کے جسمانی اعضا شست و دھست کا شکار ہو گئے۔ ایک عجیب سی خلیق بدبو اس کے جسم پسینے اور من میں یہ بو لگی اور وہ آنتھک کے جنسی مرض میں مبتلا ہو چکا تھا۔ آنتھک اسوز اک کے مریض سے یہ مرض اس کی بیوی یا اس عورت کو منتقل ہو جاتا ہے جس سے وہ جنسی رجوع کرتا ہے۔ بیوی پسینے آلودہ حال تھی مگر جب اچھا خاصہ عامل کے چہروں میں جھینٹ کر پھٹنے کے بعد کابل اور بے حال ہو گئی تو تب کسی میرے دامن نے اسے میرے ہاتھ کی راہ بھائی۔ میں اس کی زیور و کبانی سے قطعی متجنب نہ ہوا تھا۔ ایسے دھڑاں دانتے اور شرمناک تھے کہ میرے ہمارے ہاتھ سے میں پچھلک اظہار کی طرح پھیل گئی ہوئی ہیں کوئی کہاں تک سے اور کوئی کہاں تک خائے

تعبو یہ کبت نے تعلیمات جنات ہمز اور نسلی عامل ان اخباروں اشتہاروں کے ذریعہ محام الناس کو بے دردی سے لوٹ رہے ہیں۔ گھروں کے گھر ان نام نہاد بیروں صاحبزادوں کے ہاتھوں تباہ ہو رہے ہیں۔ قصہ مختصر

یہ جو اس قسم کے ہوں تو انسان ایک ایسا سولہ گریڈ کی طرح ہو جس کی چھپیں علیحدہ کر لی گئی ہوں۔
جو اس جام انسان کو مقدر کئے گئے۔ انسان کے علاوہ دیگر ذام و نوا اور جانداروں کو جو جو اس جام کے
میں کچھ تو انسان جیسے اور کچھ انسان سے ماوراء۔ جو ان کی طرز زندگی فطری تھانوں اور انسانی ضرورتوں میں
ہوتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جام سے پرندوں، ریٹنے والے کیڑوں، پانی میں پھرنے والوں، درختوں،
فازنے والوں میں ایسی فوقی افضل قسمیں پائی جاتی ہیں کہ فہم و ادراک کو پسپے آجائیں..... اپا بیوں، چوکا
سانپوں، چیتوں کے ہاں جیٹائی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے اور کسی کے ہاں تو بالکل ہی نہیں ہوتی۔ ان کی
جسم و اعصاب کی غرضی اور ذوقی شعاعیں ریڈیائی لہریں ان کی رہبری کرتی ہیں کہ دکھائی نہ دے
باوجود وہ لڑکھونوں سے نہیں ٹکراتے۔ سانپ، موش، مموالہ میلوں اور بھی کوئی پاؤں، ذہنی پتھر سے
آہستہ چاب محسوس کر لیتے ہیں۔ آبی مخلوق میں تمام طور پر پھیلاؤ اور چھلکوں سے متکڑوں کو سونے
ملتی ہیں۔ بسط فضا میں اڑنے والے پرندے بہت نیچے ریٹنے کیڑوں، موشوں، لچھڑ کے
الڑیوں، قمریوں، قنچوں اور پتوں کو دیکھ لیتے ہیں۔

لوہی، ماری مخلوق بھی اپنی خصوصیتوں اور خصوصیات کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔ یہ سچائی جانتی ہے۔ کہیں نہ کہیں اسے ہوس پالنے والے اور ان خصوصیات کے ساتھ پیدا ہونے والے انسان کے لیے یہ سچائی ہے۔ ان کی ان خصوصیات سے
 ہے۔ شہر شہر و جہاں پریت پر تو لے شیا طین و غیرہ تو ابھی خاصی لوہاری چاتے ہیں۔ ان لوہاروں کے
 اندھیرے مکان انسانی قدرتی سے اور سنسان جنگلی گھیاؤں پہاڑوں غاروں میں اس کیفیت سے
 ہی پادریوں کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہاں کہیں پہلے گھبراہٹ ہوئی کہ ان لوہاروں میں کہیں خالی مکان
 ہستیاں بھی ہوتے ہیں جنہیں سام انسانوں کے علاوہ کچھ خصوصیات جنہیں بھی قدرت کی جانب سے
 ہوتی ہیں۔ پانی جنہوں کے علاوہ جنہیں جس تو ہوتی ہی ہے یعنی وہ باطنی اشارہ جو کبھی کہیں پیش آئے
 غیر معمولی حالات کی تمن میں رہتا ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ ستر انتہائی اہم پراسرار باطنی حواس ہوتے ہیں
 اس حیوانی باطنی یعنی انسان کا تصور ہے جس میں کچھ انہیں کھو جاتا ہے تو یہ دین اور پھر ان سے افادہ حاصل کیا
 کے جس کی بات نہیں۔ یہ ان لوہیوں اور علم و فنون کی مانند ہیں جن سے بہرہ مند ہوا شاید ہم ہنسنے کی
 پھر بولہ جو حکم و مصلحت سے چلتی نہیں۔ یہ کچھ ان لوہی باطنی علوم میں سے ایک علم ہے جو تو ان کی
 اور انسانی بھی۔

واپس وہیں جو پاؤں پڑتے ہیں۔ میں نے کی چھوٹی نشست پر بیٹھنا: انگلی کی راہ پر ہوں جس کے پاس
 چکی راہ کے کناروں پر کھنکھناتے خرمیروں کی غلا غلت دکھائی دیتی ہے اور ہوا فضا میں کچھ ایسی ہی نہیں غرمیروں

بزاروں عقیدت مند اور مرید مرقہ پہ موجود ذکر اذکار سماع اور دیگر خانقاہی اشغال جاری تھے کہ ایک دوسرے کی آواز سے کالی آمدھی اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر چیز اندھیرے میں ڈوب گئی ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ آدھ بکا چچ چنار شور غوغا تک قیامت چاہو گئی ترشنی کے بند و لے اٹ گئے۔ مرنے کو مارے شاہد رہا۔ وہاں قریب ہی جتن بھڑکتا ہوا آواز بھی تھا جس میں فٹنس مراءیں پوری ہونے پہ زائرین اٹھی تھیں اور کچھ ڈالتے تھے۔ کالی آمدھی نے آواز کی بھڑکتی ہوئی آگ کو اٹھا کر چاروں طرف پھیلا دیا۔ جوشے جلنے لگی تھیں۔ آگ رسیدہ ہو گئی۔ کئی سادھو جنگ اور دیگر زائرین جل گئے ہوئے۔ کچھ دیر بعد آمدھی تو رک گئی پر آگ ڈھواں ڈھانس کئی روز تک قائم رہا۔ جلے ہوئے بلے کو ہٹایا تو دکھائی دیا کہ شاہ بابا کی چند روزہ قبر تھیں۔ پڑی ہے۔ یوں پتہ پڑتا تھا جیسے کسی تاویذ و طاقت نے ایک ہی جھٹکے میں پوری کٹنائی ہوئی میت کو نکال کر بل سے غائب کر دیا ہے۔ ایسی کالی آمدھی اور آگ ہی نہیں ہو سکتی انسان کے لئے ایسا کام کرنا ممکن نہ تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ قبر صاحب قبر سے خالی تھی۔ خاصی گہری قبر کشائی کے لئے کھدائی تھی اور آواز اور ضرورت ہوتی ہے اور ان میں سے کسی چیز کا بھی وہاں اتھم نہیں تھا۔ لگتا تھا یہ کام انسان ہی نے نہیں کیا ہے اور تھا بھی یہی۔ شاہ بابا دنیا کا جن شاکر و شکر و شکر بھی تھا۔ سب اسی کو شاہ بابا تھا۔ چند روزہ کسی معلوم شخص نے اس کو پھینک دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اس کو اٹھا کر کھوکھلے کے اندر چھپا دیا۔ پہاڑوں کے ایک مقدس مقام پر دفن کر دیا ہے۔ یہ جگہ اور یہاں کے لوگ اس قابل نہیں کہ وہ شاہ بابا کی بلند مرتبت ذی اللہ کے قدم اور درجات کو سمجھ سکیں۔

درختوں کے ایک بے شمار بیڑے جن کے پتے پتے کی زبان کی زبان دونوں رک چکے تھے۔ ان کی آواز بھڑک رہی تھی سیلابوں آتش زدگی یا زلزلوں کے بعد ہوتی ہے۔ کچھ بان غلات سے نیچے آتی ہیں بیری لگاتے ہوئے کہنے لگا۔

”بھیا! اوتھ پہنچ اپنی منزل پہ اور مجھے دو اجازت۔۔۔۔۔“

اللہ خیر۔ کہتے ہوئے وہ نیچے پہ بیٹنے لگا تو میں نے اسے کاٹھ سے پکڑ لے ہوئے کہ۔
”تمہیں جی ایس کس جگہ پہ مجھے چھینکے جارہے ہو۔ آدم نہ آدم ذات۔ جھل نما ڈیوہ تو جی۔۔۔۔۔“
سائے نظر آ رہا ہے لیکن وہ شاہ بابا کا مزار۔ وہاں فادہ۔ اور وہ۔۔۔۔۔“

میری بات کاٹھے ہوئے بولا۔ ”بھیا! گا ہے کو میرا بچ خراب کرتے ہو۔ سب کچھ تو سمجھ رہے ہوں۔ مزار والے کو تو جن کے گئے ہوئے ہیں اور مزار کی کئی اینٹیں وغیرہ ان کے عقیدت مند اکٹھے لے گئے۔ اب یہی کچھ بچا پڑا ہے جو تمہیں اپنے ارد گرد دکھائی دے رہا ہے۔“

میں نے ایک بار پھر آگے پیچھے نگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”حضرت! دیکھ تو مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا، کوئی تو ہو جس سے میں ملوں، کچھ دریافت کروں، اس بے آب و گیاہ زمین، مجازِ جہنم کا زور دیرانے سے تو میں کچھ حاصل کرنے سے رہا یا پھر مجھے جاننے والوں کے کسی فرد سے ملوا دیں، کچھ تو حاصل ہو جس کے کارن میں کالے کوسوں کا سفر طے کر کے جان بچا ہوں۔“

وہ چٹکی وارہی میں کھینچتے ہوئے خشکیاں سا بولا۔

”بھیا! میں جو کچھ جانتا تھا وہ پہلے ہی آپ کے کانوں میں ڈال چکا ہوں۔ اسے زیادہ تو مجھے کچھ یاد ہے اور نہ کوئی مزید دکر سکتا ہوں اب میں تو چلا۔“ یہ کہہ کر میری کچھ حریف نے بناؤ گھوڑے کو ہلکا کر دیا جو چکا تھا۔

کچھ دیر تو میں آئیں بائیں شاخیں سا کھڑا صورت حال پہ غور کرتا رہا پھر بجلا کچھ سوچے سمجھے اس سے درختوں کے ذخیرے کی جانب چل دیا جسے شاید کبھی دھنگل کہا جاتا ہو۔

میں بائیں لینا یا سولے میں سفر اختیار کرتا کچھ ایسا ٹوٹا کھسکی نہیں جاتا کہ مسافر خرابی خرابی چلتا رہے۔ انھوں نے یہ سب دیکھ کر انھوں نے مسافر کو روک دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں سے گزرنے والے مسافر کوئی کام نہیں کرتا بلکہ انہیں سفر ہوتا ہے۔ اس راوی کوئی سنگ میل سراسر بے فائدہ چاہا یا مل گیا تو کوئی عرصہ نمود و نریاں ہوتا ہے۔ یہاں میرے اپنے نشانہ پہنچ چکا ہوتا ہے۔ اگر کسی ایسا مسافر کی کسی مینت کا سامنا کرنے کی نوبت آ جائے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہاں سے گزرنے والا مسافر کیسے گزرتا ہے اور اسے کسی نہ کسی صورت میں گیسٹ لینا ہوں۔

کچھ لوگ قبرستانوں، شمشانوں میں جاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ اگر خود کو موت آشا بنا لیا جائے تو یہ ایک خوف نہیں بلکہ ایک مطالعاتی اور ذاتی نفسی مشاہدہ بن جاتا ہے۔ جنگلوں میں جانا پہاڑوں پہ چڑھنا، سمندر میں نہنگن، گہرے پانیوں میں اترنا بھی خاصی تفریح کا سبب ہو سکتا ہے اگر اپنے اندر کے جنگل، پہاڑ، سمندر اور تھیلے زور سے سرگرم رکھے ہوں۔ ان سے یاد اللہ اور ارادت برکت کی بناء پہ پھر کوئی جہاں نہیں رہتی۔ یہ کسی دلچسپ واد بن جاتی ہے۔

پھر رے درختوں کے جھنڈا زان سے ہولے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی ٹکٹان کی راوی ہوں۔
میں قریب پہنچا تو ادھر سے کچھ جانوروں پرندوں کی آوازیں سنائی دیں۔ یعنی وہ مجھے باور کروا رہے تھے کہ میں میرے اس طرف آنے کی خبر ہو چکی ہے۔ میں بھی تو یہی چاہتا تھا یہاں کا ایک اک پتہ، ’نونا درخت‘

نے ہے کہ آدم کی تخلیق سے بہت پہلے یہ مخلوق موجود تھی۔ کتاب ہمیں میں انسان کے ذمہ سے پہلے اور اس کے بعد ان کا ذکر بھی آیا۔ جن و انس کی اکثر قدریں مشترک ہیں۔ یہ افلاکی ہے اور بشر ارضی۔ خاکی اور نوری۔ ان کا تفاوت جن اور بشر کا بنیادی بعد ہے اور یہ معلوم میاں بھی ہے لیکن چنداں ایسے جن و انس بھی ہوتے ہیں جو ایک وقت ارضی اور افلاکی بھی ہوتے ہیں۔ جو مخصوص حالات وہ جو بات کی بنا پر اکثر ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ چند بنیادی مجبوریوں بھی انہیں قریب لے آتی ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ علوم و صفات و تصرف یوں بھی ہیں جو محض انسان کے پاس یا پھر جنات کے پاس ہیں۔ ایک دوسرے سے مستفید ہونے کی خاطر بھی ان کے درمیان رابطے ہو جاتے ہیں۔ ایک ٹیکنیکی جواز بھی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر مرد میں قدرتی طور پر کوئی نہ کوئی ایسی حرکت محض موجود ہوتی ہے جو مستحکم نازک کا حصہ ہے۔ چال و چلن، آواز، حرکت اور انہیں یہ سب کچھ گانے سے ضبط ہے۔ ایسے طور ہوتے تو مرد ہیں مگر کچھ ترکسٹ لیتے ہوئے۔ جنہیں زمانے سمجھا جاتا ہے کچھ ایسی صورتیں بھی ہوتی ہیں جن کے ہائیڈروجن والی حرکات و عادات ہوتی ہیں انہیں ماضی منہ اکتے ہیں۔

ایسے کچھ جن انسانوں کی خصوصیات کے خاتمہ کے لئے جاتے ہیں اور انہیں ایسے جو بشر کے لئے آدھے ہیں۔ انہیں انسانی اور انسانی کے درمیان ایک حد تک مشترک ایک خصوصیت ہے۔

ایسے خصوصیات انسان جن میں پر اسراریت اور دیگر ماورائی فوق العادہ خصوصیات پائی جاتی ہیں انہیں انہیں بھی دکھائی دے جاتے ہیں لیکن ان کے بارے میں کچھ سننے کو مل جاتا ہے۔ میں بھی ان چند نے انہیں دیکھ کر بھارت اور پر اسرار قوتوں والے لوگوں کو دیکھنے کی شدید خواہش لے ہوئے یہاں پہنچا تھا اور یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ ایک جن سے تعلق خاص رکھتے تھے۔ یہ حقیقت کچھ مزید تحقیق کے بعد ماننے آئی تھی۔ انہیں انہیں والے مانتوں کے خون و انہیں قدرت نے کہنا ایسے جنات کی ترکیبی بطور خاص رکھ دیے تھے جو انہیں انہیں سے صفاتی لحاظ سے ملکہ رکھتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے مبداء الخلق جن ان کی جانب راغب تھے۔ جن جن جن کے قریب۔ ولی ولی کی نظر میں اور عجیبہ نصیحت کو پہچانتا ہے۔

اس عام سے گھر کے یہ مرد و زنانہ فی الواقع بڑے معزز اور بڑی صافیت والے تھے۔ ان سے انہیں انہیں کی بہت پہنچتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یقیناً یہ نور و ظہور والے لوگ تھے۔ میں نے بالآخر اپنے انہیں سے مجبور ہو کر پوچھ ہی لیا۔

”میں کہاں ہوں اور کیا میں اپنے منہ سے متعارف ہونے کا شرف حاصل کر سکتا ہوں؟“

مسکراتے ہوئے بولے۔ ”مجھے حافظہ عقیق الرحمن کہتے ہیں اور یہ میرا پوتا حافظہ عطا الرحمن ہے۔ آپ کہئے کہاں سے تشریف لائے ہیں اور ادھر جنگل میں سویرے سویرے آنے کا مقصد؟“
میں چند اچھٹکتے سے لئے سوچتا ہوا کہ کیا جواب دوں۔ سچی کہہ دوں یا لکٹی پھٹکی غلط بیانی سے؟
چالوں لیکن اچانک میرے منہ سے خود بخود نکل گیا۔

”آپ چند نے غیوں والے حافظوں کے سلسلہ کھائی سے تعلق رکھتے ہیں؟“

اثبات میں سر ہلا کر انہوں نے اقرار کر لیا۔ ان کے چہرے کی بناوٹ ہی کچھ ایسی تھی یا ان کے جسم
بنال کا اعجاز کہ اک سدا بہار مسکراہٹ ان کے منور چہرے پہ لگی ہوئی تھی۔ دھان پان سا سراپا معمولی سا
لباس۔ پان کے لاکھے سے سرخ پتے ہونٹوں کو زحمت نکلتی تھی۔

”اللہ کریم کے خاص فضل و کرم سے آپ ان جنگلی اہلیانیت سے محفوظ رہے ورنہ ہر کوئی جو جنگل
کے مرقہ والی جگہ پہ جانے کی کوشش کرتا ہے ان خون آشام نگہریوں کے جھٹھے چڑھ جاتا ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے
اُسے اوجھڑ کر پکڑ دیتی ہیں۔ پلنگہ کر کے اسے چبٹ کرنے میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ مگر ہمیں ایسے کو
بد نصیب کی کوئی بات کہیں بڑی ہونی مل جا رہی تو اسے دنگل دیتے ہیں۔“

میں نے ان کے ہاتھ پکڑ لئے۔ ”اگر آپ ان جنگلی اہلیانیت سے محفوظ رہے تو اسے دنگل دیتے ہیں۔“
کوشش کی۔ وہ حالت سے آگے بڑھے مجھے لئے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

”آپ اپنی لپٹے رہے آرام کیجئے۔ ان نگہریوں کے کاٹنے کا اثر انجی مکمل طور پہ نہ لگے گا۔
جیل خدا میں جو خدا کی کئی کئی اہلیانیت سے فوری اتفاق ہوا ہے۔ جسم سے دوزخ سے جھٹکتے ہوئے جسم سے
خدا خواست موت تک واقع ہو سکتی تھی۔ تمیر سے ماتھے پہ اپنا شفقت بھرا ہاتھ دھرتے ہوئے عرض کرتے
ہوئے۔ ”یوں غموں ہوتا ہے کہ آپ پہ اللہ کریم کا خاص کرم اور کسی بزدل کا سر پہ ہاتھ ہے۔“

میں نے ان کا شہریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی اہلیانیت ہے جو آپ نے میرے پاس
میں ایسے اچھے شہدا استعمال کیئے۔ میں ایک آوارہ گرد سا انسان ہوں۔ قریہ قریہ لڑکھڑکھتا ہوں اور
برنگی و بندوں کے قدموں اور بے گنتوں کو بچے سا میرا شوق ہے جو جنوں کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ ایک جگہ
ناہیز کردگار بن کر مند سے ایک دفعہ ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی انسان دوستی اور فطرت میں بے حد شہادت
عام دکھائی دینے والے لوگوں سے یکسر مختلف تھا۔ اس کی دھڑبڑ مشاہدے اور تجزیوں میں کھو گئی تھی
باقوں کے تحیر نے مجھے زندگی کے انو کھئے درویشوں اور زروچوں سے آشنا کیا۔ میں نے ایک اچھا خاصہ انسان
کی صحبت میں بسر کیا۔۔۔ پر پمیل تذکرہ حضرت شاہ بابا کی بات شروع ہو گئی اور اس طرح میرے دل میں

سے کیا ہوا؟

میں اب تذبذب میں پڑ گیا۔ کیا بتا دوں یا نہ بتاؤں؟ خدا کا کمال فضل و کرم ہے کہ ایسے حالات میں جہاں میں سچی اور جھوٹ کے مابین کہیں پھنس جاؤں، غیر ارادی طور پر میرے منہ کھٹاک سے سچی بات نکل جاتا ہے اور ہمیشہ سچی ہوا کہ نتیجہ بہتر نکلا۔ انسان ایک جھوٹ سے نہ بولے تو آگے ستر جھوٹوں سے ڈھکا جاتا ہے۔ میں نے من و عن تمام ہتھ پھلائی گوش گزار کر دیا۔

وہ معنی خیز انداز میں جھٹسم ہو کر فرمانے لگے۔

”مجھے پہلے ہی شک تھا یہ کام اسی نو مٹا مٹوں کے نو بیٹے بھانجے کا ہے۔“

لفظ نو بیٹے پر میں چڑھتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

”آپ نے مایہ کیا کہا ہے بالو بیٹا؟“

”لوگ ہمیں بھانجے کہتے ہیں مگر ہم ایک دوسرے کو بیٹا مانتے ہیں۔“

ایک لمحہ میں وہ اپنی آمرانی خاتون جسے انہوں نے اپنی امیہ کہا تھا ایک گدڑی کے گھٹھے میں کچھ کھانا

پینے کا سامان لئے اندر داخل ہوئی۔ السلام علیکم کہتے ہوئے میرے قریب آ گئی۔

UrduPhoto.com

کوئی انجی نہیں آیا۔ اور نہ ہی کوئی ایسا شخص جسے اس جنگل کی گھریلوں نے کانا ہونے کا کہے۔ معلوم ہوا

ہے تم کوئی عام انسان نہیں ہو لہذا تمہارے گرد ایسے حصار موجود ہیں جو تمہیں بلایوں اور ایسی مصلوب سے محفوظ رکھتے ہیں۔“

میں نے مشنیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ

”یہ سب اللہ کا کرم اور؟“ پھر پچھلے درگوں کا تصرف ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو بتا دیں کہ کس

یہاں تک کیسے پہنچا؟“

اب بابا جی بولے۔ ”میں انہیں شاید معلوم نہیں کہ ہمارے خاندان کے چند گھراہی جنگلی کے لیے

کونے میں جو شیر کی جامبہ ہے واقع ہیں۔ جنگلی اور آبادی کے درمیان ایک گہرا سانالہ ہے جو برسات کے

ملاوہ اکثر خشک رہتا ہے۔ ہمارے گھروں سے شاہ بابا کے قدیمی مزار تک کا راستہ اسی مانے سے ہوتا ہے۔

ہے۔ جو جنگلی گھریلوں اور جانوروں سے محفوظ ہے۔ شاہ بابا کی اعلیٰ اور غم سے اس راستے کی پٹی پہ کوئی گناہ

قسم کا گزند نہیں پہنچ سکتا۔ بابا عبد الخور جنی شاہ بابا کے مزار سے ان کا مایوت نکال کر لے گیا تھا۔ حرا کے

کو بے نام و نشان کر دیا تاکہ کوئی انسان وہاں نہ پہنچ پائے اور یہاں کے چھوٹے بڑے جانوروں کو ایسی حالت

سہ کار یوں کا زبرد ہم اور ان میں شامل جنگی جانوروں کی ابھرتی ذوقی آوازیں۔ یوں لگا کہ میں کسی طلسماتی جنگل میں کسی چادوگر کے جھوپڑے میں قید ہو کر رہ گیا ہوں اور یہاں سے کبھی رہائی نہ ملے گی۔ اس طرح کی کڑوی کسلی دہائیں اور غذا کمیں میرا نصیب ہوں گی۔ یہ فرض پہ پڑا ہوا میرا نگہدار ہے اور میں اس طرح بیت الخلا کے چکر لگا تا ہوا بالآخر اوپر کہیں کرفا ظلماء میں پہنچ جاؤں گا۔ مجھے بھر بھری سی آگئی۔ تریلی سے بھیک گیا۔

انسانی فطرت میں شامل ہے کہ وہ یکسوئی، یک رنگی، ایک ذہنی وغیرہ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا۔ تمون کی تنازات اس کے مزاج کو دیاں سوچوں کی جہتیں بدلتی رہتی ہے اور یہی اس کی زندگی اور اس کے حسن و قبح سے بننے کا موجب ہوتی ہے۔ ہر وقت آرام سے وہ تنگ پڑا جاتا ہے جیسے کہ مسلسل محنت اسے غم حال کر کے رکھ دیتی ہے۔ نہ وہ ہر وقت عبادت کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے بغیر رہ سکتا ہے۔ ریگ گھڑی کا جب ایک پیلو پیٹ بھر جاتا ہے تو پھر اسے الٹ کر رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے جبکہ وہ اپنی اچھا خاصہ خانہ چکانی مسلسل کھات پہ پڑے۔ بنے سے پیلو پیٹ پھوڑے کی مانند کھٹے لگے تھے۔ سوچے لگے کہ کچر چھل قوی ضرور ہونی چاہیے اب کمرے کی یہ حالت کہ مشکل سے پائٹا گھوم بیت الخلا اس کے ذہن پر عام آگے دروازہ جو نہ جانے کسے کھلا گیا تھا۔ ایک ایک کمرے میں ایک ایک کھانا تھا۔ یہ کھانا کھانا کھانا تھے کیونکہ ان کے پو کھٹے یہ کچر پھٹے تھے۔ سامنے دروازہ پہ اوپر ٹائی کچی کوئی روٹھان رہا۔ کول سے سوراخ میں ہشیش جما کر اسے بند کر دیا گیا تھا۔ اوپر پست پہ کپڑے کے تھوڑے ٹالا کھانا بیت الخلا سے کھینچ کر جھایا جاتا ہے۔ دائیں طرف دو دروازے اس سے تین چار بار دھکوں اور دھک آئے گئے تھے۔ اب اس مفلوک الدرد کمرے میں ڈھل قدمی کا تصور کسی دماغ کے کو آپ ہی دوسکتا ہے۔

گائی دیر تک اپنے بھیڑ اور اس کمرے کے اندر فکری اور فکری ٹاک ٹوئیاں مارنے کے بعد جسے میں کسی حسی نتیجے پہ نہ پہنچا تو پھر اسے اندھ کر دروازہ تک پہنچ گیا۔ چار پانچ قدم چلنے کے بعد محسوس ہوا کہ گے حزیہ چلنا چاہئے۔ جیسے خالی بیت خوراک مانگتا ہے اسی طرح نسیم اور اس کے فری احتضار بھی آ رہا ہے۔ کارکردگی کے مستحاضی ہوتے ہیں۔ دروازے سے کھات اور کھات سے دروازے کے کھات تک دو چار کھاتے لگانے کے بعد میں دروازہ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ پرانا کسی کھڑت کا اور پلوں کے جوڑوں پہ کونکے کے کول ٹھٹھے ہوئے تھے۔ دائیں بیت کے سوار پہنے پہ چوب چلی کا قدیم انداز کا کام۔ تالے والی آواز بیت کی اوریاں کا پھوٹا ہوا ہے گا تھا۔ کمرے و قوتوں کے بیچ کو کے جوڑا بند ہونے کے قدرتی ٹھٹھوں کے کھڑکیوں پہ خوبصورتی اور مضبوطی کے لئے لگائے سجائے جاتے تھے۔ ایک ابھرے ہوئے کو کے کو آٹھی سے

سیاہ چشم سیاہ واکھیں، کالی کونسل، کالی گھوڑی، کالی مستوق، کالی لُٹی، کالی بھٹی، کالی کبوتری، "کالی تھری" کالی
 نکلی تے آؤدی توں باج پے گیا۔۔۔ "کالا ڈوریا کنڈے نال اڑیا اوے" جھونڈا دیورا بھا بھی نال اڑیا۔۔۔
 کالی کروتھ تے ملوکی کالی شلوار عطاء اللہ تیار دی کالی تمبھ "کالی گھٹھی" نال کالے ڈال پئی وانیاں آمل اصل
 جاتیاں "کالا کاس" کالی پُلی، کالی داس "کالا شاد" کاکو، کالی ٹکڑی، کالی بکری، "کالا گولا" کالی زبان، کالی
 کالا اندہ کالی کتاب، "کالا چاؤ" کالا پانی، کالی چھری، کالے ویرنٹ اور "سیرا گیا بنے گا کالیے۔۔۔"

میں اندھے میں اندھے کی طرح اتر گیا۔ جیسے کوئی کاجل کی کالک میں پس ہوئی ٹھونکی کی طرح
 ڈال دے۔ شرمیں شرمیں میں ملیں تو نشہ آگھ ہو جاتا ہے۔ اندھے نے اندھیروں میں شامل ہو جاتا ہے
 تو اہل اچالے اہل آتے ہیں۔ جیسے درد کا حد سے بڑھنا اور ہونا ہے۔

[illegible]

چاند کی ہنسی چاندنی بھی چٹکی ہوئی مگر فی نہ سہوئی اک عجب سامانہم کوئی چمکے جان پاسے
رات ہے یوں سوئم رہا ہے پاخان کی رات بلکے چمکے گئی ہوئی روف کے چلو ہے لوانس پاسے
دیکھ توں قور لے اپنے اعلیٰ ملک چاہے ہوئے تھے یہ ہے الفیاد کوئی جگہ ہے ہدم جنت کی
سارے منظر اوتیں رنگ سوئم لٹو شہریں اور خوبصورتیاں ادا بہار ہیں؟ کچھ اور آگے بلا توبائیں
ایک نیلے رنگ کی جھیل نکھرائی سفید لہرائی جھاگ آج آج تیرتے ہوئے رانی جس پر وہ کوجھ
ہوئی ٹھنڈیاں اور نکس چڑیوں کے آج کے پرے غوطہ تو زکرا بھرتی ہوئی سہری ٹھنڈیاں۔۔۔

[illegible]

تھیں سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ میرے قریب پہنچ کر وہ کہتا ہے۔

”جگھے یہاں پہنچنا مبارک ہو۔ شاہ بابا نے خاص طور پر مجھے علم دیا تھا کہ میں تمہیں یہاں لاؤں۔“
یہ کرٹل کا ٹکڑا دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ شاہ بابا کی جانب سے تحفہ ہے۔ اب تم واپس اسی راستہ سے چلے
مڑ کر نہ دیکھنا پتھر ہو جاؤ گے۔“

قارئین! یہ تحفہ آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ یہ اسی کرٹل کا ٹکڑا ہے جس سے کوہ قاف پہ شاہ بابا
لے کر آیا تھا۔

واپسی کا سفر چند لمحوں میں ہی طے ہو گیا۔ قراٹے کی دو چیز حیاں چڑھ کر میں اسی دروازے کے
دھڑے قریب سے میں چند تالے جھٹکتے باہر نکلا تھا۔ پتہ ہاتھ دھرتے ہی آپے آپ داہو گیا۔ اندرونی
بکھرے سا ماحول گھٹن اور وہی لڑکائی کرکٹ پہ لیٹا ہوا۔ میرا دایاں ہاتھ میرے پانچامہ کی جیب میں
کرٹل کا ٹکڑا پڑا تھا۔ میرا جسم حفوظاً محسوس ہوا جیسے سینکڑوں گز طویل بیلیوں میں پکڑا ہوا ہو جبکہ دماغ
کمرائی کی کونٹھوں سے نکل کر جھیل سیف املدک کو قاف کی راستوں پلندوں تک پھیل رہا تھا۔

انسان جیب میں کسی چیز سے دلچسپ رہتا ہے تو اسے جیب سے نکال کر دیکھتا ہے۔ یہی حالت میری تھی۔
میں نے جیب سے کرٹل نکال کر دیکھا۔ یہ کرٹل ایک عجیب سی چیز تھی۔ اس کے ایک ایک ٹکڑے پر سامان
تھیں۔ ان ٹکڑوں کے سامنے آتا جا تا رہا۔ نوٹ، الفیرو، نوٹ، الکی، دونوں میں بھی ایک غریبی پائی ہوئی ہے کہ اسے
کے گارڈ سے کوٹھم نہیں رہتا۔

آٹھ گھنٹے تو میں کئی گئے آٹھ گھنٹے کا ٹکڑا نکال کر دیکھا۔ یہ کرٹل ایک عجیب سی چیز تھی۔ اس کے ایک ایک ٹکڑے پر سامان
تھیں۔ ان ٹکڑوں کے سامنے آتا جا تا رہا۔ نوٹ، الفیرو، نوٹ، الکی، دونوں میں بھی ایک غریبی پائی ہوئی ہے کہ اسے
کے گارڈ سے کوٹھم نہیں رہتا۔

اب میں نے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈال دیا تو وہ رنگ کہیں کوئی آبادی نہیں تھی۔ جلد میں پڑا تھا یہ
میں وہی گھریوں کے حلقہ والی جگہ تھی مگر اب گھریاں تو کہا کوئی کوئی چڑیا بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

ہونے نہ ہونے کی حالت میں کافی دیر تک میں وہیں پڑا رہا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ آدمی خالی الذہن سا کچھ آنکھوں جاگتے حواس کے ساتھ ایسی حالت غنودہ میں ہوتا ہے کہ زمان و مکان کا اس سے تعلق کتنا ہوتا ہے۔ دیکھتا بھی ہے سنتا اور محسوس بھی کرتا ہے لیکن پھر بھی وہ ایک پتھر کی مانند ہوتا ہے۔ ایسی حالت ایک مہاجر کے لئے بھی ہو سکتی اور ایک صدی کے لئے بھی یوں سمجھ لیں کہ یہ ایک وجدانی اور روحانی کیفیت ہوتی ہے جو عام انسانوں پر کبھی کبھار اور ذریعوں مہذبوں پر اکثر وارد ہوتی ہے۔

میں بھی شاید کسی ایسی ہی کیفیت میں اتر ا ہوا تھا۔ انگور کے پتے کی مانند میرا ٹھکرا ہوا ہاتھ زمین پر
ٹکا ہوا بازو پہ بوجھ ڈالے میں ایک پہلو میں تھا کہ ایک موٹا سا چوبہ نما اور چڑھ آیا کنبی کے پاس بازو کی طرف
ہوئی نیلی رنگ پر کات لیا۔ انسان جمع الجھجھب اٹکوار کا وار سہہ جاتا ہے لیکن بیول کا کانٹا پھینچنے پہ وہ سہہ
ہے۔ اس کا لے چوبہ نئے کا جڑا ہوا سبز اور سرخ تھا سا ہوتا ہے جو پتھر پتھر کی طرح کھال میں اتر جاتا ہے۔
چوبہ نئے کے لئے اس کو کھال سے نکالنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ بندہ اسے خود ہی کھینچ کر نکال دیتا ہے۔ اس
میں چوبہ نئے کا پتھر الگ اور سر الگ ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی اسے کھینچ کر نکال دیا تھا۔ اسی طرح کھال
کی پٹلی نے مجھے غور و فراست کی کیفیت سے باہر نہ لایا۔ اس میں پوری طرح مستغرق ہو گیا۔

نور کی تہاڑے نے مجھے دلت کا احساس دلایا جو میرے شانے کے عین عقب میں بیٹھ رہا تھا۔
میں نے غور سے پہلو پر ہاتھ رکھا۔ اسی راہ پر جس راستے میں یہاں پہنچا تھا وہ انہیں پہنچا
کوئی تکتا نہ تھا۔ منظر میں اگر کوئی چیز حرکت کر رہی ہو جائے تو وہ مکمل توجہ کی مرکز بن جاتا
ہے۔ تاکہ وہ اس کے نور سے دیکھا آ رہی ہو۔ یہاں تک کہ اس طرح ٹیپک کر رہا ہوں تھا تو
کوئی کوزا گاڑی دیرالے میں پکرا اٹک کر بھاگتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ یکدم میرے قریب پہنچ کر میرے
ہاتھ تک پہنچ گیا۔ تاکہ اس پاس اور بھی ایسی جگہ تھی جہاں وہ رک سکتا تھا۔ اب میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
وہی یکدم ہاتھ کی بیڑی چھوٹتے ہوئے لگام بوندے میں اڑا کر اسے اپنے ہی منہ میں لے گیا۔

”اسلام تلخیم اجمالی میاں تمہیں خیریت سے پا کر سچ مالو بڑی مسرت ہوئی۔ کون سی کڑی شام بابا کا مزار دیکھا۔ یہ سبکی پہ پڑے۔ ہے۔“ لونا شتہ کر کے گرم گرم پتھر پاں بھاتی اور مٹو سے حکم بکھر ملوائی کی دوکان کی خاص موقوفات ہے۔ سوچا کہ اس جنگ میں تو دیکھتے کہ کچھ نہیں ملتا بھلا کدے سے ملے گا۔ بس اس شروع ہو جاؤ۔ گرم گرم ہے۔“

اُس نے مجھ کو بدلتی جگہ دکھا کر بندھنا کھول کر میرے سامنے رکھ دیا پھر یکے سے ایک برتن میں

کی ہوئی ہوئی لکھی اٹھالایا۔ ناشتہ واقعی مزے کا تھا۔ بھوک بھی چمک اٹھی! پیٹ بھر کے کھایا پیلا۔
مُرد صاف کرتے ہوئے میں نے پوچھ لیا۔

”آپ اس طرف کہاں؟ وہ بھی خالی یکے کوئی سواری داری بھی نہیں؟“

”بھیا! اپنے روزمرہ کے طریقے کے مطابق میں گھوڑا جوتے کے سب سے پہلے مومن گنج اپنے
غرضہ سرکار کے ہاں چوگٹٹ لپوٹنے حاضر ہوتا ہوں۔۔۔ راستے اگر کوئی سواری مل جائے تو اس سے کوئی معاوضہ
لیں لیتا۔ آج بھی میں مومن گنج پہنچا تو دل میں خیال آیا کہ کل قسمیں ادھر چھوڑ گیا تھا۔ بھیا! مومن گنج کچھ
یہاں سے دُور بھی نہیں لہذا میں یونہی ادھر چلا آیا۔“

”یہ گرم گرم ناشتہ تو تیار ہے کہ آپ اہتمام سے آئے ہیں؟“

”ناشتہ تو میں مومن گنج سے روزانہ ہی لیتا ہوں۔ آج کھلم کھلا کھنے کچھ زیادہ ہی بانٹ دیا۔ کہنے لگا
پنے کسی مہمان کو کھلا دیا۔ اب تم ہی کہو کہ تم سے بہتر مہمان کون ہو سکتا ہے۔“

”بھیا! اب کیسے۔۔۔ یہ تو میری گاڑی کا نام تو ہے۔“

UrduPhoto.com

• بیکانیر کا سیر ان کوٹ مٹھن میں سیر اس۔

کوٹ مٹھن سندھ میں حکومت غازی پور کا ایک تحصیل ہے۔ یہاں کے لوگ بیکانیر کے علاقے میں نے بیکانیر کے ایک ہندو
میں سے کوئی ایک جوہر کے میلے میں آئے ہوئے غریب جوہرے بھالے لوگوں کو گھیرے پدم ناگ دکھاتے
سے نئی جھولی استانیں سنار ہاتھا۔ پان سے کڑتے ہوئے ناگ و میری لگاؤ اس کے پاس سے کالے ناگ
پیدا ہی تو میرے بازو سے ہوتے قدم زنگ گئے۔ ایسا خوفناک حویل مارا سیاہ لکڑی کے بعد دکھائی دیا تھا
اس کا بچن ایک جوان آدمی کے کھلے ہاتھ کی مانند تھا اور دو شاخ سیاہ زبان بھی خاصی بڑی اور موٹی تھی۔ مجھ پہ
لکھنا پڑے ہی سیر اقدارے متوجہ سا ہو گیا۔ وہ اپنے غیر معمولی لمبے اور خوفناک ناگ کو پدم ناگ بتا کر کوئی
سکھڑت قسم کی پر اسرار داستان شروع کیے ہوئے تھا۔ اب میرے دہان قدم پر ہاتھ ہی جیسے وہ دکھانا گیا
تھا۔ نتیجہ چوٹکا اچھا خاصہ تھا ہوا تھا اور اس کی داستان بھی اپنے نظر میں یہ تھی کسی سب سے کسی نہ کسی طور پہ اپنا
جان جاری رکھے رہا لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے بیان میں وہ پہلے جیسا غلط اور خود اعتمادی نہیں رہی
تھی قدرے گھبراہٹ سا نظر پڑا کہ بار بار میری جانب کافی آنکھ سے دیکھتا تھا۔ میرا حیلہ کالے کپڑے بال واسی

میں نے انکو انہیوں سے شاید کوئی خطا اندازہ لگا میں یا پھر مجھے پہچان گیا تھا۔ میری موجودگی سے جب اسے اپنے
 پیسے دھندلے کا مسئلہ نظر آیا تو اس نے ”تم بولی“ میں مجھ سے سنت سمجھت کی۔ آپ میرے بزرگ گھر
 ہیں انہیں بے لگہ پاپی ہیٹ کا پیماری ہوں۔ آپ کی ہر سے زبان دھیان میرا ساتھ نہیں دے رہے
 آپ کا شکم ہو تو میں اپنا کام بند کر دیتا ہوں۔

صاف ظاہر تھا کہ میری موجودگی اس کے تماشے کے لئے پریشانی کا باعث تھی۔

[illegible]

اور سادہ زبان ہوتی ہے۔ اس میں اردو انگریزی یا ہندی بنگالی کا کوئی پتھر نہیں ہوتا۔ الفاظ و آہنگ اشاروں کا یوں سے باہمی افہام و تفہیم ہو جاتی ہے۔ جیسے سترے چور اٹھائی گیارہ لک ہزار نو سو بارہ پتے باز جعلی ہزار نو سو لاکھ کے والے سوچ دیا ہے والے بڑے فروش رت گیر وغیرہ اپنے خفیہ معاملات جو بیچ بازار آچکیں سو اسی رقم بولی سے طے کر لیتے ہیں۔ رقم بولی کوئی مستند قلم سے لکھنے لکھت کی زبان نہیں جو کسی حد سے یا کتاب و نصاب سے سیکھی جاسکے۔ اسے جاننے سیکھنے کے لئے ہندے کا کم سے کم وہ مہر اور زیادہ سے زیادہ وہ علم پیشہ ہونا ضروری ٹھہرتا ہے۔

میں نے اس کی پریشانی کو محسوس کرتے ہی "اسی کی زبان" میں تسلی دی۔ وہ خاطر جمع رکھے مجھے اس کے غیر معمولی ماریہاد سے شخص دیکھنے کی حد تک دلچسپی سے۔ لکھ لکھ یا اس کے دھندے میں کھنڈت ڈالنا محسوس نہیں۔ دس پندرہ منٹ اس کے کلام کام اور میرے سے ملاحظہ ہوئے بعد میں غیر محسوس طریقے سے مجھے قدم لیتا ہوا وہاں سے کھٹک لیا۔

فریادوں کے باہر ایک اتنی پٹلوں والی ٹری پر بیٹا اپنی تھکان اور تھکنی دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے طرف سے میرا پیسہ لکھنا ہی واجب آئے ہو اور کہاں وہ اسے لکھ کر تھکراتی ہو سکتا ہے۔ بتا دیا کہ یہ اس کی اس پریشان حال تھا۔ اور یہ کہ اس کی والدہ کی طبیعت بھی اس کا پیسہ دے دینے پر اس کو چھوڑ دیتے ہوئے کھٹک لگا۔

"مہاراجا کوئی بیٹا" غلام بد تو بیکو عمل پانہ شکوہ کا آدھار کروں۔ اس کا مطلب یہ تھا کوئی کھانا پینا کھانے پینے کوئی روپیہ میری طلب سے ملے نہ ہو۔ یہ پتہ پتہ اور زیادہ کڑوا رہی ہیں۔ اور وہ دارو اور دھت کرنے والے بڑے کا یاں قیالی شناس اور مرد شناس ہوتے ہیں۔ بھارپہ اک ٹکڑا لٹے ہی اس کے گتے پرست اور ٹپٹی اور جڑی کا نانا تو اس کا یہ نو فیصد درست اندازہ لگا لیتے ہیں جبکہ وہ بھر میں ہزاروں لکھ لکھوں سے خبردار رہا ہونے والے یہ گوارے بڑے مایہ نازیات بھی ہوتے ہیں۔ اپنے بھارہ کا تن و قوتش ہزاروں کا حد و درجہ دیکھ کر اندازہ کر لیتے ہیں کہ کس کس کو دے دے گی۔ شگ کھٹکی۔ میں اس مکار عیار کی شکایت اور پیشکش کا مطلب سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے کوئی معمولی سی رشوت پیش کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کی بات پہ سنی ان سنی کا ایک پتھر دھرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ ایسا مستند مہندر تیرا کہاں سے پکڑا ہوگی۔"

وہ کھسکیں لکھ لکھ لکھ جوڑتے ہوئے بتانے لگا۔

تس مگرے پڑے تھے۔

دودھ گھی اور شہد کی طرح سانپ کے زہر کے اصلی نقلی یا ملاوٹ شدہ ہونے کی پہچان بھی ہوتی ہے۔
اصلی دودھ گھی شہد کی پہچان تو بیشتر لوگوں کو ہوتی ہے مگر زہر جواہرات اور تریاق کی اصل نقلی یا ملاوٹ کے فرق
کو محسوس کرنا ہر اک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ کیسی گرا حکمت والا یا کوئی برکت والا سپیرا ہی یہ پہچان کر سکتا
ہے۔ میں نے اپنے انداز میں پرکھا اور اسے کھرا پایا۔ سینکڑوں اقسام سانپوں کی طرح ان کے زہروں
اور تریاقوں کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ان کی رنگت، لہکا بھاری پن اور قد و متاثر میں بھی زمین آسمان کا
فرق ہوتا ہے۔ شیشی کو اٹھتے پلٹے ہوئے میرے منہ سے نکل گیا۔

”تم جانتے ہو کہ ایسا زہر کس کام آ سکتا ہے؟“

وہ پٹ پٹ آنکھیں جھپکتے ہوئے بولا۔

”زیادہ تو نہیں جانتا، بس اتنا معلوم ہے اس سے سانپ، بچھو، باولے کے کالے کے ملاوٹ گھنٹھیا

اور دھار اور بھونکوں کا علاج بھی ہوتا ہے اور مجھے ایک سیانے نے یہ بتایا کہ خاص طور پر ایسے بھاری سیاہ رنگ کا
زہر بونوں کے کالے کا خاص علاج ہے۔“

”بھاری بھاری کیوں نہیں پتہ چلتا؟“

”بھاری بھاری کیوں کی طرح کہتے ہیں کہ ان کا علاج اس تریاق سے کیا جاتا ہے؟“

وہ رازدارانہ انداز میں میرے قریب ہوتے ہوئے بتانے لگا۔

”راجہ سانی دہلی میں ایک سیانے کی لاپٹ کے قریب کوئی بھاری باؤلی ہے اس کے اندر نہیں گہرائی

میں دلوں کی کوئی ہستی ہے اور دوسری سہروں میں کوئی دیا مہاراج رہتے ہیں جو ہماری گونہ کے ایک پجاری کے

یہ مجھ سے بڑا بڑے ہیں۔ اس طرح مجھے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔“

باتھ بولتے ہوئے کہنے لگا۔ ”مہاراج ایسی شہر ہندو ہوں، تو سب دین مہرموں پر مشہور اس رکھتا

ہے۔ آپ دلائی کے ملک ہیں اور میں بھی اُن کا ماننے والا ہوں، بس آپ سے میری ایک نئی ہے

مجھے شہرپ دین کہ میرا منت، یہاں اس کیز سے ہو جائے۔“

میں نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں تو بھگوان کی گر پا ہوتا ہے تو اس گر پا کو وہ یا ماننے کی چتا میں کیوں بے گل ہے؟“

وہ روہا نوسو سا بولا۔

”کوئی حیرت خیز وی ایسا نہیں جس کے دوارے میں نہیں پہنچا۔ پرنتو میرے من کی چتا اور بھیتر کی

بے کفی انت نہیں ہوتی۔۔۔ تجورو اور چورو کے دیہانت کے بعد میری بہو بھی بچے کو لے کر اپنے میکے چلی گئی۔
اب سندھ میں میرا کوئی نہیں۔ اب بیٹا مرنا ایک ماہ ہے۔ مہاراج! بس آپ مجھے۔۔۔

”بس! بس! مجھے اندازہ ہے تم نے کیا کہنا ہے۔ یہ بکڑا اپنی زہر کی شیشی۔۔۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔۔۔ ہو سکے تو اس ویڈیو کا پتہ بتا دو جو میری دہلی میں رہتے ہیں۔“
وہ شیشی تھامتے ہوئے بولا۔

”مگر وہاں اتنا کچھ کہ بتاؤ یا وہاں پتہ بھی بتا دیجئے اگر مجھے معلوم ہوتا۔ ویسے آپ اس ویڈیو سے کون کارن ملنا چاہتے ہیں؟“

اس کے سوال پر چند عرصے وقف کے بعد میں نے جواب دیا۔
”دراصل میں ویڈیو سے کچھ باتوں کو دیکھنا اور ملنا چاہتا ہوں۔ بھولی تمہارے وہ ویڈیووں کے لئے ناگرمی ٹائٹ کا زہر خرچ ہوا ہے اور ویڈیو سے اس لئے ملنا چاہتا ہوں کہ ہو سکتا ہے وہ بھی سلسلہ میں میری کوئی رہنمائی کر سکتے ہیں۔“

اسے کچھ دیر غوروں سے تولتے ہوئے اس نے کچھ جوابی کہا۔
”اس کے پتے میں آپ۔۔۔ کسی ایسی بات کو بھی یاد رکھنا۔“
”ہائیکوین میں میرا ان سے واسطہ پڑا ہے اور چنداں طاقت بھی ہوئی تھی۔ اس کے حق میں کچھ کچھ اور پھر سوچ میں بھی ایسا کہ زیادہ سے اس کی شکست حاصل نہ کر سکے۔“ میری یہ بات سن کر اس نے
”یہ۔۔۔ یوں کھیل گئے جیسے میں انہیں سے نہیں اس کے بیٹے کی کوئی بات۔“ وہ جیسے نور کا می کی کیفیت میں تھا۔

”ہاں جو خوش قسمتی سے ایک بار ہوئے کو دیکھ لے ان سے طاقت بھی کر لے پھر بیون پھر بھی نہیں پکارتا پھر سے بیون کو دیکھنے لئے کی تلاش ایک۔ کھلے زلم کی مانند بن جاتی ہے جو کبھی نہیں بھرتا۔“
”موتا اور ارد کا درمیان چھوڑنا رہا ہے۔ مجھے بھی انہیں دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ صرف ایک بھول و بھلی اور سے۔“
”مجھے کچھ ان کے متعلق بتا سکتے ہو، وہ کیسے تھے؟ ان کا رنگ، ڈھوپ، قد وغیرہ؟“

وہ ہلے گھسیں اور ان سے لہجے میں بتائے گا۔
”یہ کچھ زیادہ چالنی بات نہیں! صرف چار سو یا چار سو سے زائد ہوں گے جب میرے۔۔۔“
تجورو نے کاٹمن ہوا تھا۔ اس کے سر والی کوٹھ مہر کی کوٹھ سے تیس کوئی ٹیگم کی اور چیتا کی شریف میں ہے۔
یہاں ایک مسلمان مہاراجش کا استھان ہے۔ جن کے بارے کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بونے تھے۔ ان کی قبر

بھری پتی ہوئی ہے۔ اُن کے سر پر اور پریم مانے اوپر والی قبر پہ ہی آتے جاتے ہیں۔ یہیں غرس میلہ
 نکالیں ہوتی ہیں۔ ذور و دور سے لوگ آتے ہیں۔ یہاں کے جو مجاور گدی نشین ہیں وہ نئے جنم لینے والے بچوں
 کی گند خضے سے گونگھیلے سے ہیں۔ اُن کے چہرے پہ راز حیاں اور سر پہ لمبی لمبی ڈنٹھیں ہیں اور ایک عجیب بات
 کہ وہ گونگے بھرے بھی ہیں۔ کان موجود مگر اندر سوراخ نہیں۔ دانتوں کے بغیر منہ بھی ہے مگر اندر زبان کی
 بجائے پھلکی کی طرح سرخ سرخ گھمڑے۔ ناک بھی بند اور آنکھیں بڑی بڑی اور ایسی گولی کہ دیکھنے والے کو
 کانپ چڑ جائے۔“

اتنا کہہ کر وہ چپ سا دھ لیا اور ایسی خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا جیسے میں بھی انہی گدی نشین
 ہوں میں سے کوئی ایک ہوں۔

فقیر اور ویش اپنے مقابلے سے طرف ضرورت سے سخت ہی آنکھ ملاتے ہیں۔ آنکھ تو ہوتی ہی ہے۔
 مگر مجھ اور نظر۔ اس سچے کے زبردست۔

وہ ناک تک دیرم تھا اور میں بدست کوٹھ۔ اس کا دل شاید نہ ہی طرح اڑتا رہا تھا۔ کھٹک کھٹک کیا۔
 جب خاموشی فرمائی۔ بھاری ہو گئی تو میں نے غری سے کہا۔
 ”اس کی باتیں سن کر میں نے یہ سوچا کہ یہ کون سا آدمی ہے جس کی نظر ایسی ہے کہ وہ دیکھ کر چکا چودہ پھا
 کے غائب ہو جاتی ہے۔ وہ جیسے خواب میں گئی سے ہم کلام تھا۔“

”وہ بزرگ ہے۔“ جو بھیری والے حمار کے لیے نرنگ میں موجود اصلی قبر شریف کی گولہری میں
 رہتے ہیں صرف غرس کے دنوں میں یہاں رہتے ہیں۔ بڑے اور چھوٹے سب سے لگتے ہیں اور صرف شام کے سے
 اُٹھتے رہتے ہیں۔“

اسے پھر جیسے ہر ایک ہی لگ گئی تھی۔ چند لمحے بیٹھنے کے بعد میں نے پھر اس کی جانب استغما سے
 نظروں سے دیکھا تو وہ پوکھلائے ہوئے انداز میں پھر گویا ہوا۔

”وہ ذور سے ہی آشیر باد دیتے ہیں چڑوں تک کسی کو نہ دیتے نہیں دیتے۔ وہ روٹی اصولی کے
 سوس میں لپٹے بیٹھے ہوتے ہیں۔ صرف چروہ دکھائی دیتا ہے اور چہرہ بھی کیا صرف آنکھیں ہی آنکھیں ہوتی
 ہیں گولی مونی مونی جیسے انہوں نے چتر کے ایلوں میں انوکھے کی پتلیاں بھاڑ رکھی ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے اس بزرگ کی اصلی قبر نیچے زیر زمین ہے اور صرف قبر کا تھوہ۔ کیا کسی نے
 بھیری کے نیچے زیر زمین اصل قبر دیکھی؟“

”ہاں وہاں کے مقامی کئی لوگوں نے دیکھی۔۔۔ اور۔۔۔ اور میں نے بھی؟“

”مجھے کچھ قبر کوٹھڑی کے بارے میں بتاؤ۔ اور یہ بھی کہ اگر کوئی شخص وہاں جانا چاہے تو جاسکتا ہے

یا نہیں۔“

وہ گھبرایا ہوا بولا۔ ”پہلے مجھے دم لینے دو تو پھر شاید میں کچھ کہ سکوں میرا سر پر جل نہیں رہا ہے۔“

”ٹھیک میں تمہارے لئے کچھ کھانے پینے کے لئے کہتا ہوں اتنی دیر تم اپنا دم درست کر لو۔“

اس کا ”ووم“ تو کچھ کر میری تو تیور زنی چڑھ گئی۔ ایک لمبی سی چرت نمایاں جی جس میں وحشیانہ قسمی ہوئی

تھی۔ یورپ میں اسے ”ہش“ کہتے ہیں افریقہ میں ”ہشکین“ اسے زیادہ تر استعمال کرتے ہیں۔ یہ بڑا خلیق اور گھبر

نشر ہوتا ہے۔ ہر لمحہ کا شاید کوئی نہ کوئی مثبت یا بد حالی پہلو بھی ہوتا ہوگا لیکن ہش اور ہنگ بونی کی مشیات میں ہجرت

مصلیٰ کی سی مشیت ہے۔ بڑے گھنیا ذلیل اور کم ذات نشے ہیں۔

”میں نے نہیں دم درست کر سکتا تھا۔“

”نہیں۔“

”مجھے نکالو اسے پرے۔“

”وہ کمرچی کی مانند مریا تے ہوئے کہنے لگا۔“

”میرا آج اہم غریبوں مسئلوں کا دم دینا ہی اہم ہے۔“

”جانتا ہوں۔ دم لینے دو۔“

”چاہئے جسکے پاؤں کی بنی ہوئی مسالی چیرائی اور دم تس لگانے کے بعد وہ تازہ دم ہو چکا تھا۔“

”اس قسم کی بات چیت کے لئے یہ جگہ کچھ مناسب نہیں تھی۔ میں اسے اٹھانے کے ایک کھانے میں لے کر بیٹھا۔“

”تو آگیا کھانا کرتے ہوئے کھانے کے لئے۔“

”گرمہ ایہ یوں سے آپ کی گری وختی کچھ میری کچھ میں نہیں آئی۔ آپ اتنی کھائی میں اگر

بات کر رہے ہیں کہ مجھے خوف آئے لگتا ہے۔“

”اے انصاف! ہاتھوں کو چھوڑنا مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اصلی قبر دیکھی تو وہ کیسی تھی۔ تم نے کیسے کے

وہاں اور کیا کچھ تھا؟“

”میرے ان سوالوں سے وہ گھبراسا گیا اور شاید کچھ نہیں یاد رہا تھا کہ میرے کون سے سوال کا جواب

پہلے دے۔ بہت دیر لے مجھے تکتے ہوئے بولا۔“

”کہ میں کے بچے کہیں ایک چھوٹی سی قبر بھی کوٹھڑی ہے۔ اس کے اندر دو اور میں ایک بڑا سا حصہ

ہے۔ اس طاق میں ایک چھوٹی قبر بنی ہوئی ہے۔ ایک خرگوش کے قند کے برابر۔ اس کوٹھڑی میں جو

سوراخ ہیں۔ کچھ ہم زدہ فرش پہ ساپوں کے گھرنے کے بے شمار نشانات اور سوراخوں سے لگی ہوئی کینچلیاں

ہر جہت کی بات کہ اس زیر زمین کوٹھڑی میں داخل ہونے کے لئے صرف ایک چھوٹا سا سوراخ ہے جس میں صرف ٹھک کر یا لیٹ کر داخل ہونا جاسکتا ہے۔“

یہ بیان کرنے کے بعد وہ جیسے پہلی والی سخت سی حالت میں چلا گیا۔ لگتا تھا جیسے ہم دونوں کسی کے ہاں تعزیت کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ میں خود حالتِ استہلاب میں تھا۔ ایسا ہی ہوتا ہے جب کسی مخفی امور کی حقیقت کو مرقع عام بیان یا کھولا جاتا ہے یا کوئی بے بابا بے مرشدانہ طرفہ بے طرفہ کسی جواب و نقاب میں جسٹھ لگانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے ظاہری اور باطنی اعصاب چونکہ بے نقاب ہوتے ہیں لہذا وہ فلتانگی اور ہچکچاہٹ کا شکار ہو کر مذہال سا ہو جاتا ہے۔

ہمارے آڑے چند ساعت سی ساعتیں آگئی تھیں۔ میں نے پھر ایک سوال داغ دیا۔

”کیا وہ بونے بزرگ اسی کوٹھڑی میں رہتے ہیں اور صرف مری کے کچے دنوں میں اوپر آتے ہیں؟“

”ہاں! ایسے ہی ہے“ گوئچ کے ایک مسلم گھرانے کے دو مخصوص بزرگ اور ایک خاندانی پیسہ را جس نے کبھی گندا لباس نہ کھایا ہو انہیں کے ایک دن پہلے رات کو درپاشی کے بعد اوپر مزار کو بند کر کے ان کو زندہ جاتے ہیں اور پھر ایک خاص وقت پر جتنے کے بعد وہ صارت آتے ہیں۔ ان کے ہاتھ بھول گیا کہ یہ بزرگ اپنے خاندانی بونے بزرگوں کی ایک گاہ کو گھسیں یا کھڑکی کا سامان کو سبکیں اگر وہاں اور مٹی کے پائے ہوئے موزوں کا گھونگی ساتھ رکھتے ہیں۔ رات کے کسی سے چھتا دس بجے۔ گہری نیند سمیت یہ لوگ جب جاگتے ہیں تو خود کو نیچے اسی کوٹھڑی میں پاتے ہیں۔ پیسہ را سوراخوں میں سے ہانپوں کی کینچلیاں نکال کر ان کو کرنا ہے فرش صاف کر کے ان کی ہاتھ دھو کر پھینک دیتے ہیں۔ ان کی جوتوں کے ہاتھ مل کھاتے ہیں۔ ان میں یہ لوگ ہر جگہ سے اللہ کی حمد و ثناء کرتے ہیں۔ بعد وہ صاحب مزار کا شجرہ نسب پڑھتے ہیں۔ ان کی کتیں سے یہ دونوں بزرگ بونے ظاہر ہو کر اپنے آپ کو رولی اور تھکوں میں دھاپ لیتے ہیں۔ یہ بزرگ بونوں کو اٹھائے سہارے کی پہلی کمر کے ساتھ باہر نکلتے ہیں۔ یہ پیسہ را بھی سانچوں کے لئے مٹی کے پیالوں میں دو بھر کر کینچلیاں سینے اوپر آ جاتا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ نیچے کوٹھڑی میں سانپ بھی رہتے ہیں اور بونے بھی۔؟“

”ہاں ہی! میں صرف ایک دفعہ ہی نیچے گیا ہوں۔ سانپ تو کوئی نظر نہیں آیا البتہ چاروں طرف کچے ریا دین سانچوں کے پلوں اور پانچوں سے چھید چھید تھیں۔ چھوٹی سی قبر بھی دیکھی۔ بظاہر وہاں پلوں کا کوئی زمین بہن یا کوئی بست سیرا نکھالی نہیں دیا۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ ان کا مسکن وہیں کہیں آس پاس

”سانپوں کے درمیاں؟“

”ہاں! جہاں بونوں کے بسیرے ہوں گے وہیں سانپوں اور سانپیوں کے ڈیرے بھی ہوں گے۔“

مگر یہ سانپ اور ساپ عام دکھائی دینے والوں کی طرح کے نہیں ہوتے۔“

”میں سمجھا نہیں ڈرا کھل کر سمجھاؤ۔۔۔۔؟“

”یوں سمجھیں جیسے بونے‘ مغس کا ایک بہت ہی چھوٹا روپ ہیں اسی طرح یہ مخصوص سانپ۔“

ساپ۔ عام دکھائی دینے والے سانپوں‘ سانپوں سے خاصے بڑے ہوتے ہیں۔“

ان انکشافات پہ حیرت سے میری آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ میں نے پوچھ لیا۔

”ان کے بڑے ہونے کی کوئی خاص وجہ؟“

”جس طرح کتا‘ بلی‘ گھوڑا وغیرہ انسان سے انوکھے دیکھتے ہیں اور ان کے قریب رہنے کو ترجیح دیتے

ہیں اسی طرح ان بونوں کو بھی مالک نے کوئی ایسی خوشبو خوشی دی ہے کہ یہ مخصوص قسم کے سانپ‘ ساپ ان کی

قریب میں رہنا پسند کرتے ہیں اور ان کے لئے بے شمار آسانیاں پیدا کرتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”جوگی ایسے بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ ایسے خطرناک سانپ اور خاصے (ساپ)

غیر کوئی ایک خاص قسم کے انسان ہی دیکھ سکتا ہے۔“

”بھگت جی ایسے جانور ان کے لئے راستے جانتے ہیں۔ بوا اور روشنی کے لئے ایسے پتے۔ وہ ان سے

کرتے ہیں جو انسان کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ خوراک حاصل کرنے کا وسیلہ بنتے ہیں۔“

رسائی کے لئے کام آتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ کہ بونوں کو کبھی ضرورت نہیں پہنچاتے بلکہ سڑاٹ الارض اور گھر زچہ“

آفات و بلیات سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔“

”کیا نہیں وہاں جاسکتا ہوں۔ اور کسی طرح نیچے کوٹھڑی میں داخل ہو سکتا ہوں؟“

”بابا! اس مخصوص مسلمان خاندان کے لوگوں کے علاوہ کوئی دوسرا اندر جانے اور جان کھانے

والے کی جرات نہیں کرتا۔ اگر ایسا ممکن بھی ہو جائے تو پھر اس گھر میں ہونے والے غریب کا انتظار نہیں کرنا۔“

گا۔“

میں نے گنگو سمیٹتے ہوئے اسے کہا۔

”اگر تم اس معاملہ میں میری کچھ دکر سکھو میں شکر یہ ادا کرنے کے علاوہ تمہاری خدمات کے عوض

خاطر خواہ معاوضہ بھی پیش کرنے کو تیار ہوں۔“

وہ بھی اپنا جھولا پٹارا سمیٹتے ہوئے بولا۔

”مہاراج! ابھی غرس میں سات ماہ باقی ہیں۔ آپ چیتالی شریف جانا چاہیں تو زیارت کر آئیں۔
 ان کی رہی تو اگلے غرس پر میری آپ سے دوہیں ملاقات ہوگی۔“

میں نے کچھ روپے تھماتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ سلام کرتے ہوئے میٹلی کی بھینٹ میں غم ہو
 گیا۔ وہیں اپنی جگہ پہ بیٹھا ہوا میں کافی دیر تک اس کی پراسرار باتوں پہ غور کرتا رہا۔ جھوٹی سچی داستانیں سنا کر
 بے خبر نہ رہنے والا، جعلی تریاق اور اساک کی دوائیں سانپوں کے منکے، گیدڑ، سنکھیاں بیچنے والا۔ مگر فکر کا
 ہی کیا مجھے بھی کوئی داستان سنا کر ہاتھ کر گیا تھا؟ چنداں غور و غوض کے بعد میں اس نتیجے پہ پہنچا کہ
 اس کے تناظر میں جو کچھ اس نے بتایا نہایت سب و سب درست ہی تھا کہ ناقص جھوٹا بھی ایک وقت خالص سچی بول
 کر ہے تو وزن پر قرار کر لیتا ہے اور پاسے کا سونا بہر چند کثرت کندوں ہوتا ہے مگر سکت سبھاؤ، کثرت مضبوطی تو
 اسے کھوٹ میل سے ہوتی ہے۔

• خبر ولی کا مہابی —!

UrduPhoto.com

پھر وہ بعد جب میں اپنی منتخب کتاب خوب اختیار کیا کی چیز اسے پہنچا کر اسے اپنی غرض سے
 پہنچا تو دماغ کی کٹھن قہ میں رہی ہوئی خواہش ایک چنگاری کی مانند چمک اٹھی جو اس میں سے کی دلوں کے متعلق
 کشش سے پیدا ہوئی تھی۔ وہاں کشش اس نے سبکی میری میں کسی دیدنی کا قہر مکیا تھا اور یہ بھی کہ قطب
 العقب کی لائٹ کے قریب قدرتی باطنی کششوں سے کھینچا جاتا ہے اور اس کشش سے سب صوفی تسلیم یہاں سے
 راجت ہوئی اور ہر سبیل تک رہیوں کی مسجد عشا کی نماز کا مضمون ہوا تو یقین ہو گیا یہاں آج خالی از مصلحت
 نہیں تھی۔ میرا حضرت خواجہ کے مزار پہ جاہری کے وقت دامن چاہب کی قدرتی درست کی چیز کے پاس
 تھا کہ یہاں بونوں کی کوئی پہاں زیور تھی جدھر وہ زیارت سے مشرف ہوتے تھے صوفی تسلیم یہاں کا مجھے
 یہاں سے اٹھا کر پیچھے دیوار کے پاس ایک مخصوص جگہ پہ بٹھاتا۔ غیر ارادی طور پر اس کی تاریکی میں گواہوں کی
 سنی گور کچھ میں پھلتی۔ اور لال قلم صوفی مسجد کے سامنے ایک چھتہ اور دست کی چھاؤں میں لوگوں
 نہیں اور اس کے دیو پارسی لالہ کندھن محل کا میرے پاس پہنچ کر جھنجھوڑا اور بونوں کی یہاں موجودگی۔ ان
 کے واسطے لال قلم اور صوفی مسجد کی تعمیر کے تناظر میں سیر حاصل معلومات بہم پہنچانا۔ یہ سب واقعات کچھ
 ایسے ہیں تھے جنہیں محض الحاق سمجھا جاسکے۔ یہ سب طے شدہ امور تھے جن سے میں دوچار تھا اور شاید مزید
 کچھ ہو باقی تھا۔

حصب پر وگرا م نہیں اور صوفی تسلیم میاں نے عصر کی نماز اٹھنے ادا کی بعد میں درگاہ شریف ای پڑا جگہ بٹھا کے وہ لگا سا قیلول کرنے کا کہہ کر ٹٹل گئے لیکن وہ مغرب کی نماز تھمیرا ولی پہ موجود تھے نماز کے بعد صوفی سے نکلے تو مجھے لے کر سیدھے مرزا اسکندر بہت کی حویلی کے سامنے واسلے ہوئی میں آ اترے۔ جلی پھٹکی مسک کی وال کی کچھڑی اور درہر کی آتش کھلائی بائل ایسی ہی جیسے پیٹ پٹا پڑنے پہ کسی منچے یا بوڑھے کو لٹھنوالی جاتی ہے۔ وہیں باہر ایک طوائی سے تنوں کی گزک اور امرتی مٹکوائی۔ پیٹ آسرا کر کے وہ مجھے لینے بھی گئی میں اتر گئے۔ کچھ گھریاں کو پنے بستیاں ہیرے راہ راستے ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں اندھیرے اُجالے جلی غلبت میں اپنے پورے جلال و جمال سے اترتے ہیں اور کچھ راہیں اور منڑ لیں یوں بھی ہوتی ہیں کہ انہیں مساطے نہیں کرتا بلکہ یہ مسافر کو طے کرتی ہیں۔ میاں جی دیرا قدم آگے آگے اور منی پیچھے۔ یوں لگا جیسے ہر اتار دہیں۔ ہمارے نیچے سے آہستہ آہستہ پیچھے کی جانب کھینک رہا ہے۔ کچھ سے یا کی ایک ہم ایسے ہی سفر کی کیفیت میں رہے جیسے ہمارا یہ سفر۔ راہ روشنی کو دوست یا کسی عصر و منزل کا محتاج نہ ہو۔ بالآخر ہم وہیں پہنچے جہاں ایک گوالے نے دروازہ انصاف کی اندھی روشنی میں کچھ اور گورے سے تھڑے اٹھائے میرے پاس ڈھالے تھے۔ مویشیوں کے اکار نے چکا لٹے سانس کی آوازوں اور گوبر کی بوند کے تھار و شاید یہاں اور کچھ بھی تھے۔ ایک گوالے نے ایک خستہ کپڑے میں ہاتھ دھوئے کھانے کے لیے ایک جج جس کا تعلق روشنی یا روشنی پیدا کرنے سے ہو ہو نہیں سکتی اس کے باوجود میں جج ہر مویشی غیر موہو کو بھی دیکھ رہا تھا۔ خدا جانے یہ میاں جی کے سر سے کا پتکار تھا یا ان کی قربت کا تصرف کہ آگے کی گلابی انکس کی محتاج نہ تھا کہ کوئی اور نکال کر جو کیلیں۔ باز بے کچھوں کی چست تھی۔ ہاں بھاجا۔ کھڑیاں۔ چاراکاٹے کے آلات اور دودھ کے برتن پائے ہوئے تھے۔ کچے فرش پہ بھوسی لٹھری ہر قسم تھی۔ ہاتھیں کوٹنے میں ایک مریخی کاٹے بے سکہ چڑے ہوئے نوزائیدہ چھڑے کو چاٹ رہی تھی ابھی ایہ کہتی جگہ ہے میاں جی مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟ یہ کچھ سوچا ہی تھا کہ میاں جی بولے۔

”ولی دور مانے کو تو ہمیں رکھو بھیا راہ کی راہ در میں مت پڑا آگے کی پتا پانظر رکھو۔“

آگے۔ سنے دے ار سے گئی نکڑی کی جی ہوئی ایک بڑی سی نامدھی جس کے نیچے دھلیے کے سے کر کے سی بنے ہوئے رہیں گے ہوئے تھے۔ ایسی نامدوں میں بھوی ملا وہ تو زری نہات وغیرہ ملا کر مویشیوں کے آگے رکھا جاتا ہے۔ میاں جی نے اسے اپنی جگہ سے سرکا لیا۔ پیچھے دے ار میں ایک بڑا مساطق جس کے سرے ٹٹک گھاس پنچوں کھنسا ہوا تھا۔ گھاس ایک طرف ہٹا کر ہم اندر داخل ہو گئے۔ سیر حیاں تو نکلیں تھیں جسے وہ اصلوکان راستے پہ چل رہے تھے۔ یہ راستہ ایک چھتلی ٹٹک سی گلی کی طرح تھا۔ نیچے پاؤں کے گھاس پڑھرا

یہی تھی۔۔۔۔۔ کھڑکی نہ کوئی روزن اور دے گئے باقی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود نہ تو کوئی عملی غفلت کا احساس ہوا اور نہ ہی کسی تاریکی اندھیرے کا خیال آیا۔ ضرورت کے مطابق ہر چیز واضح اور رہتی تھی۔۔۔۔۔ راہ میں چند ایک موڑ بھی آئے اور پچائی، تنگی، فراخی بھی۔۔۔۔۔ ہم ایک متوازن سی رفتار سے آگے بڑھتے ہوئے آخر ایک ایسے مقام پہ پہنچے جہاں ہمیں تھوڑی اترا لی اترتے ہوئے کھٹے کھٹے ٹھہرے ہوئی پانی سے گزرنا پڑا۔ پاؤں کے نیچے ٹھنکی ہوئی ریت سے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی زیر زمین آب بڑیا چشمہ ہے اور چند قدم آگے بڑھتے ٹھنڈی ہوا۔ انتہائی مدھم آوازوں اور پتھر پیلے فرش سے واسطہ پڑا۔ آگے چند چھوٹی چھوٹی راہدار یوں نکلام گردشوں۔ مخرابی درآئندوں جن کی چھتیں نیچی اور تنگی تھیں گزرا کر ہم قدرے کشادہ سی جگہ پہ پہنچے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ جسمی و جسمی سی خوشبو اور ہلکی ہلکی پتے میگوئیوں نے ہمارا استقبال کیا۔ میاں ہی نے جی احتیاط سے گزرتے ہوئے مجھے ایک جگہ اٹھا دیا۔ بیٹھے ہی مجھے احساس ہوا کہ ہمارے دائیں بائیں ہر جیسے بونے ہی بونے بیٹھتے ہوئے ہیں۔ واضح دکھائی شاید اس لئے دے دیئے تھے کہ وہ انتہائی پست اور نیچے تھے۔ میں نے آنکھوں سے دائیں بائیں نہیں دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے یہی محسوس ہوا کہ جیسے بہت سے اہل کوشش سر پہ لائے بیٹھے ہوں۔ میری جب سی سالہ تھی مگر سر سر کہ بیٹھے اپنے دل کی آواز سن تک نہ سہی رہے تھے۔

UrduPhoto.com

”بسیا آؤ دو سنبھالو۔“ میں تو تم سے تھوڑے بیٹھے ہو مگر کتنا ہے جیسے میں آنا پسند والی مشین سے لگا بیٹھا۔ یہ تم نے اپنے آنکھوں کی پتلی چلا رکھی ہے؟ اب اٹھو اور سٹیشن پر صوفیوں کا وقت بھی قریب ہے۔ سلام پھیرتے ہی میری آنکھیں سے ایک پلاٹھی ایڑی اڑی۔ وہ اللہ کا اٹھا اور بہت آگے بچھے ہوئے سسے پہ بیٹھا گیا۔ میں نے فوراً سے دیکھا اس کا تھوڑا چھپلے پاؤں پہ کھڑے کسی خرگوش کے بچے کے برابر تھا۔ اب صوفی تسلیم میاں اٹھے اور عیسوی پر صوفی شراعت کی۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ ظاہر ہے سب نمازی بھی کھڑے ہو گئے۔ جگہ اندھیرے اور نیم اجالے کی درمیانی صورت گواہ کسی چیز سے کوئی تشبیہ ہی جاسکتی ہے تو وہ شاید احمد ہے۔ کبھی واحد کا احوال یہاں یونوں کی جامع مسجد میں برنارڈ بیٹا ہوا تھا۔ بونے امام صاحب نے آواز شروع کی۔ کیا یہاں جو سوائے جھنڈ بٹ کے کچھ پلے پڑا ہو۔ ہم دونوں ویوں کی طرح احتیاط اور آواز چاند کی فصل کی مانند نیچے نیچے ہوئے۔ رکوع بعد میں یہی حدیث لاحق رہا کہیں کوئی بونا کا موت آ جائے۔ خدا خدا کر کے نماز تمام ہوئی تو ان میں آیا کہ کسی بونے کو تفصیل سے دیکھنے کو شکوکہ موقع نصیب ہو۔ ان کے ابراہیم ترنگی دریافت کروں۔ یہ کس طرح کس زبان و انداز میں بات چیت کرتے ہیں۔ یہ اپنا لباس جو کس طرح کا پہنتے ہیں۔ ان کا طرز معاشرت زندگی بسر کرنے کے طور پر کبھی کیسے

ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں اگر نر ہیں تو مادہ بھی ہوتی ہوں گی۔ ان کے باں بچے بھی جنم لیتے ہوں گے۔ ایسا ہے تو پھر موت بھی ان کے دروازوں پہ دستک دیتی ہوگی۔ اسی نوبت کے بے شمار سوالات میرے ذہن میں گلابا رہے تھے۔ مگر میاں جی کے زبرد و اعتبار کی جرأت نہیں تھی کہ مجھے تعلیم دی گئی تھی۔ رہبر مرشد پاک سے بھی سوالات نہیں کرنے چاہئیں۔۔۔ جانے کب نادانی بے صبری سے کوئی ایسا کلمہ منہ سے نکل جائے جس سے مرشد پاک کی طبیعت کھدڑ ہو جائے، پیشانی مبارک پہ بل پڑ جائے اور کی کرانے پہ پانی پھر جائے۔ ادب خدمت شوق ضبط جذب اور خاموشی یہ چھ حفاظتی پردے اگر طالب کے پاس نہ ہوں یا پہلے کے مدرسہ وہ کبھی گوہر مراد بنو سکتا مرشد پاک حاصل نہیں کر پاتا۔۔۔

فیض نظر کے لئے ضبط سخن بھی چاہئے
حرف پریشان نہیں ہو کہہ دینا نظر کے حضور

حکیم اور ماحول ایسا کہ لب کشائی کی جرأت اور نہ ادھر ادھر نگاہ ڈالنے کی اجازت و ہمت قوم پخت چننا یا کسی قائد اندویش اندر اُپالے کھار ہا تھا کہ وہ چشم بینا رکھنے والا ہمارے نفس کی تن کا جھٹ پہ نہ ہمارے رکھنے والا گویا پتلا۔

UrduPhoto.com

ہے۔ ہمیں اپنے نظام کی حد میں رہتے ہوئے اور ان کے نظام کو براہم کہتے بغیر یہاں تک دھڑکنا ہے اپنے ہاڑوں کے پتھروں کی مدد تک تو سلامتی اس سے باہر ہانسنے یا دیکھنے میں سلامتی کے نام کے میں پڑ سکتے ہیں اور ہاں یہ بھی یاد رہے اس کا حکمت میں کچھ سر بہت چھٹینیں اور راز و اسرار لپیٹے ہوئے ہیں جنہیں صرف کسب و کسب کے ناموں پہ عیاں کیا جاتا ہے اور دوسروں کو ان رازوں کو پہنچنے کی آمد میری قبروں میں ملے گی کہ یہ ہے تم کچھ سمجھو؟

میں بھوتو آیا سمجھتا۔ مقررہ ماروں کی طرح مدد بھاڑ کیے انہیں، لپٹا کر دیا۔

رات کے دوسرے پہر کے آخر پہ ہم دونوں قحب صاحب کی باؤلی کی شلت سیر حیاں جہاں سے تھے۔ پنگا دریں ہماری جلو میں تھیں اور بیٹا پھنگ چاند ہمارے سامنے۔ سڑ زمین پہ پہنچے تو میں بھاڑ سے بھٹک رہا تھا۔ دو ایک روز میں پہنکی میں پڑا ہوا۔ اعصاب اور دماغ جیسے کام کرنا چھوڑ گئے تھے۔ کوشش کے باوجود میں میاں صاحب کی بات جو انہوں نے ہلونی اور انسان کے دو مختلف نظاموں کے بارے کی تھی نہ سمجھتا رہا۔ اس بات کے بعد جتنا بھی دھت میرا ہاں گزرا وہ سارے کا سارا یادداشت کی جارہی میں تھا۔ مجھے کہہ کر تو یاد نہیں تھا کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ میری یادداشت تو باؤلی کی سیر حیاں چڑھتے ہوئے دو بارہ واپس چٹنی تھی۔

بے صبر سے گونہہ کہاں؟ دیر پہ گالوں میں لوگ رات کو جلد سو جاتے ہیں۔ گھر والے سب برآمدے میں سوتے پڑے تھے۔ اوپر خدا اور نیچے گاؤں کا چوکیدار لٹکتے یا میں ہدیعتاً جاگ رہا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ کھوئی سے نئی گھر کر ہودانے اوپر نکالوں گا۔ خوب جی بھر کھا کر پھر سو جاؤں گا۔ چور سناپ کو ہر رکاوٹ رستہ دے دیتی ہے۔ خزانوں کی جلتی رنگ سے صرف نظر کرتا ہوا میں اللہ کا نام لیتا ہوا اٹھا اور دبے پاؤں کھوئی کی منڈیر پہ کھینچا۔ کھوئی کا تھیر چھوٹا ہوتا ہے جبکہ کھوئی کنویں وغیرہ بڑے ہوتے ہیں۔ کھوئیاں اکثر گھر کے چھن کے گونے میں ہوتی ہیں۔ منہ کھلایا پھر اکثر آدھے منہ پہ پھینٹ ڈال دیتے ہیں۔ کہیں کہیں کھوئیوں پہ دتی پمپ بھی لگے ہوتے ہیں۔ ورنہ چھوئی چرٹی یا پھر رستہ بولکا یا اول وغیرہ۔ بعض کھوئیوں میں پانی دو چار گام پہ ہی ہوتا ہے اور کچھ گہری گہری کہ تہ میں پانی چلتا ہوا ہوتا لگے۔ یہ تنگ تھیرے والی کھوئی بھی ایسی گہری تھی کہ اس کے رستے سے ہاتھی تھیرے میں لے لو۔ رستے کا پھر باہر نکلا۔ پہ کھنڈے شہتوت سے بندھا ہوا تھا ظاہر ہے کہ رستے سے دوسرے سرے پہ ہندو سڑک شہر کی ریلے تریوز تھے۔ جس کی سرخ سرخ چھاؤں کے تصور نے میری سانس میں میٹھی میٹھی سی بہت بھردی ہوتی تھی۔ میں نے پکا ماتھو ڈال کر رستے کے بوجھ کا اندازہ لگایا۔

کہ بوجھ میرے ذاتی وزن سے بھی کچھ سوا ہے۔ چھ تھی بھی اسے ذاتی وزن سے وہی بارود تھا وزن انھوں نے جبکہ چار سوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور وزن بھی تھا۔ اس کا پانی میں اٹھ کر پانچ گونے تک خراماں خراماں کھینچا جاتا ہے۔ میں نے ایسی ہی دو چار مثالیں ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے منڈیری کی اینٹوں پہ بیٹھ لی اور نکالیا۔ گھر کھوئی سے پانی کی آواز فچکے کے علاوہ اور کچھ برآمدہ ہوا کہ تریوز کھینچنے پر یوری اور فرالنگ بھر لیے۔ اسے کھولن۔ جب مجھے یہ کام اس طرح ہوتے ہوئے نظر آیا تو آخری کھوئی کے طور پر میں منڈیر پہ کھڑا ہو گیا۔ گھر والوں کو یہی میں نے ایسے ہی دسنا کھینچے دیکھا تھا۔ پانچ گام ذریعہ لگا کر دسنا کھینچا۔ وزن بہت زیادہ تھا۔ گھر میں نے سانس روک کر اٹھایا۔ اب جو سانس چھوٹے ہونے لگے رستے پہ ہاتھ ڈالنے کے لئے فوراً مٹھا تو پاؤں نے منڈیر چھوڑ دی۔ چاندنی رات تھی اور پھر اندھی جیسے کھوئی کے مین دہانے پہ دھڑکا دیے ہوئے تھا۔ کسی لمحے سے سناپ کی مانند ہر اتنا مل کھاتا ہوا دسنا ہاتھوں سے کھانچا نکلیں چھیلی ہوئیں۔ کھوئیوں کے ساتھ ساتھ آسمانوں کی گردش۔ میں نے وزن سانس کی جیکے میں گرتا چاہ گیا۔

ہمارے ایک شے کے جنونی جوش و خروش میں تھے۔ لے کر نئے کڑی جان سے اپنی ٹریفک کے بارے میں باہمی گریب گریب باتیں کیا کرتے تھے۔ میںیں خصوصاً ملحد پ بونی و لچوی یا کرتا تھا اور سوال پوچھ پوچھ کر انہیں وق کرتا رہتا۔ ایک سوال کو میںیں بار بار پوچھتا وہ یہ تھا کہ جب آپ چھوٹے

ہمارے بابا جی رحمت اللہ علیہ دعا کرتے وقت ہمیشہ اختصار و آہستگی اختیار فرماتے۔۔۔ زیر لب کہہ
 کہتے پڑھتے وہ بھی لب مبارک کی تمنیش سے پتہ چلتا تھا۔۔۔ خوش قسمتی کہ چند ایک بار مجھے ان کے دعائے اللہ
 سماعت کرنے کا موقع نصیب ہوا۔۔۔ یہی مواقع تھے کہ میں لفظ نور کی معنوی بصیرت سے فیض یاب ہوا۔ آپ
 بابا جی ہمیشہ لفظ نور کو ہر دعا و التجا کا نمایاں حصہ بناتے تھے۔ مثلاً "اے باری تعالیٰ ہمیں نور بصیرت عطا
 فرما" نور یقین، نور ایمان، نور علم، نور توحید، نور بندگی اور نور استقامت، نور رزق، نور صبر، نور صحت، نور اولاد و صلہ
 فرما۔۔۔ بات نکلی کہ ہمارے ارادے استفادے کا اصل ماخذ تو نور الہی ہے۔ اگر شخص یہ کہا جائے کہ میرے
 بے حساب رزق عطا کر۔۔۔ رزق تو آگیا اگر بدکست نہ ہوئی تو کیا فائدہ؟۔۔۔ اولاد مل گئی لیکن اس میں
 صالحت نہ آئی تو کس کام کی؟۔۔۔ بابا جی نے فرمایا نور اچالے میں ہی نہیں تاریکی میں بھی ہوتا ہے۔ پھولوں
 کے علاوہ کانٹوں میں بھی موجود ہے۔ فتنے، قیام، میں میں نہیں تو رعب میں بھی پایا جاتا ہے۔ فرمایا گیا کہ جسے تم
 سمجھتے ہو تمہیں کیا خبر کہ میں میں خیر کہاں چھپی ہوئی ہے اور جسے تم خیر گردانتے ہو اس میں شر کہاں پوشیدہ
 ہے۔۔۔ بابا جی پرکار اپنی اخلاص میں خیر اور سلامتی کے طلبگار رہتے۔ ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا
 ماتھے کا علم بے غلبہ گزرا کر ازل کی گہرائیوں سے اعلیٰ نکلا کرتا ہے۔ نور رحمت ہمارے ہر سانس کی سلامتی کے
 ساتھ صحت و شفا کا ذریعہ ہے۔

بات بھولی کی ہورہی تھی۔ آدھی رات خدا کی خدائی سولی چلی ہے۔ چاندنی رات میں ایسا نہیں
 پہ۔۔۔ کئی کی جلی پہ بھولنے کی طرح اترتی ہیں۔ یہ بھی ایک ایسی ہی نہالی دھولی بھولی رات تھی۔ جیسے گرس
 نے اپنی راگ و ادنی پھیرنی ہوئی تھی۔ میں کمر تک کھولی کے پانی میں اوندھ بکڑوں کی پوری پہ بیٹھا یہ سونے
 تھا کہ بقیہ رات اس اندھیرے کنویں میں کیسے گئی۔ جہاں ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دے اور نہ ہاتھ آ کے چمکے
 دکھائی دے۔ پھر ضد جانے کیا خدا کہ ارگرد ہاتھ کچھ نظر آنے لگا۔ پانیہ کہ اندھیرے سے آنکھیں آئندہ کی
 تمہیں یا شاید چاند میری بے بسی دیکھ کر کچھ پیسے اتر آیا تھا۔ گھنٹہ بھر کی مسہ ماری کے بعد طبیعت کچھ تک سہی
 تھی اور اندھیرے کا احساس بھی ہاتا رہا۔ اب میں آہستہ سے پوری پہ سے اتر اور احتیاط سے پاؤں سے
 تہہ میں بیٹے ہوئے کھولی کے پتک کا ہاتھ لیٹنے لگا کہ ہر سر سے پانی اس دس کر جمع ہوتا ہے۔ کالی بھی تھی
 اینٹوں پہ پاؤں بھاتا ہوا میں کھولی کی گول دیوار کے ساتھ چلنے لگا۔ اپنا تک میرے پاؤں کسی گھر کے کمرے
 میں اتر گئے اور میں غپ سے اس میں جا پڑا چمک کے پیسے میں سر پڑا اُٹھ گیا۔ اُٹھتا ہوا چاند اور اُسے سے
 لڑی طرح ہاتھ پاؤں چلاتا ہے کہ تکائی آسہرے کو مل جائے۔۔۔ میری بھی یہی حالت تھی معاہدہ ہاتھ کسی کت
 چر سے نکرایا جو گھڑی جیسی تھی۔ اسے پکڑ کر جو کھالیا تو میں پانی سے باہر ابھرا آیا۔ مگر یہ کھولی نہیں تھی اور نہ۔

اور میری قریبوں کی بوری اور اوپر چمکتا ہوا چاند۔ اچھی ایہ میں کہاں نکل آیا؟ اک عجیب سی مہک اور
ہلکی نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہر میں گرا تھا۔ پاؤں ہاتھوں سے اور اور
تو معلوم ہوا کہ جگہ فراخ ہے اور زمین سخت۔ کھسکتے کھسکتے میں قدم بڑھا آگے ہو لیا۔ یہاں قدرے ٹھنکی
ہی اور پھسلن بھی تھی۔ ایک پتھر پلے ابھار پہ آنکڑوں بیٹھا سوچا، ہاتھ یہ قریبوں کا لالچ تو بہت مہنگا پڑا۔
سب ظاہری طور پہ کچھ دکھائی اور سمجھائی شدت سے تو پھر باطن روشن ہو جاتا ہے جیسے کاروبار میں مندا پڑ جائے تو
انسان اندر کی قوت پونجی صرفے میں لاتا ہے۔ میں بھی اپنی خاطر جمع کرتے ہوئے قسمت ہو کے بیٹھ گیا کہ جو ہوا
میں کھائی جائے گا۔ آنکھیں دھیمی پھونے پھونے ٹھوڑی سینے پہ لگائے چند لمحوں ہی بیتے ہوں گے کہ شہد کی مکھیاں
کی جھنڈا ہٹ سی سنائی دی جو ابھرتے ابھرتے نیم انسانی آوازوں میں تبدیل ہو گئی۔ پھر مجھے ایسے لگا کہ
میرے ارد گرد جیسے پتنگڑوں کی تعداد میں چلے رہے ہیں جو بچے ہیں۔ میں نے کتا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ دو چار بار
میرے پاؤں بھی نہیں ہونے جیسے کوئی مجھے ٹھوہر رہا ہے۔ نیم اندھیرے میں میں نے جیتر اندازہ لگائے کی
جھل کی یہ فوج ہے میں یا کچھ پر یا کوئی کر لے بیٹھ۔ وغیرہ۔ اب محسوس ہوا یہ ہے کہ یہاں یا جو بھی میں
ہوں۔ دونوں پاؤں پہ چڑھ گئے ہیں اور میری ٹلوں کے سلسلے جھل سے لگ رہے ہیں۔ اب مجھے عجیب سی
محسوس ہونے لگی۔
سب اکروٹھ تو پلوں ہاتھیں ہوتا تھا یعنی ہونے والا ہوا بلکہ یہ ہے کہ کاٹھ کا قلم۔ میرے ہاتھ میں جیتر اندازہ اپنے
تو یہ وہی چار ہاتھ کا قلم ہے۔ یہ موقع تھا کہ میں نے نیم تلچے میں ایک ہونڈی آٹھوں سے ڈال دی۔ بہت حد مجھے
بے درگ نے بتایا کہ ہر آٹھ کے نیچے سب میں سلی ہونا، کھانا نہیں ہوتا۔ ہونا کھانا کھدیتی ہے وہ زمین
کے پیچیدہ اسرار بھی دیکھنے کی اہل ہو سکتی ہے۔ کدو کدو کے ایسی ٹکڑی ہیں جو ذرا زمین آٹھوں کے زمین
میں ہیں۔ قیمتی معدنیات، ٹھنک، سیال، دھاتوں کے ماحول، جیٹ قیمت ہاتھات و ہمدات۔ اب شیریں کے
تھوہر و تھوہر ان کے انصراف میں ہی تو ہوتے ہیں۔

سب ان کو دیکھا تو یہ کہ بائیس ہونا تھا یعنی ہونے والا ہوا نظر نہ رہا ہے کے کاغذ کا تھا۔ وہ میرے ہاتھ میں پھنسا ہوا اپنے
 گھر میں چلا رہا تھا۔ یہ سارا موقع تھا کہ میں نے غم غصے میں ایک بڑا ہی آنکھوں سے لڑکھاتے بہت حد تک
 پسینہ لگنے دیا کہ ہر آنکھ سے غصے میں اس کی ہونٹا کھینچا نہیں ہوتا۔ دیکھو آنکھ ہونا دیکھ لیتی ہے وہ زمین
 کے پیچیدہ اسرار بھی دیکھنے کی اہل ہو سکتی ہے۔ کچھ کچھ کھانے کی تلواریں ہیں جو زیر زمین آبیانوں کے زمین
 میں ہیں۔ قیمتی معدنیات، شعل و سیال دولتوں کے ماحول، چشم قیمت ہوائیات و جہازات آب شیریں کے
 گھنے و قیر دان کے انفرق میں ہی تو ہوتے ہیں۔

وہ بونا لڑی طرح میرے چہرے میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے میرے گٹھنے کی جڑ میں تار باندھ رکھی تھی۔
 نے شروع کر دیے۔ شاید وہ میری توجہ اپنی جانب مبذول کرانا چاہتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنے قریب
 کے خدو خال غور سے دیکھ لیا ہے۔ لیکن اند میرے کی سب سے کچھ بھی واضح طور پر دکھائی نہ دیا۔ اس کی
 ہاتھ دیکھ کر میں نے نیچے جھکے ہوئے اسے اپنے پاؤں کے پاس چھوا دیا۔ سبھی مجھے معلوم ہوا کہ پاؤں
 کے اندر جام میرے گرد مرقع ہے اور ان کے شور و غول میں تہذیبی اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ابھی اسی
 شکل و چٹ میں تھا کہ اچانک میرے پاؤں اور گتھوں یا گٹھوں پر جیسے انہوں نے پلٹا کر دئی ہو۔... اگلے چند لمحوں

میں بہت سی جڑی بوٹی ٹوئیاں میرے پاؤں انگلیوں ٹانگوں میں پیوست ہو چکی تھیں۔ پاؤں ٹانگیں ٹھنڈے ہونے کی وجہ سے کچھ خاص تکلیف تو نہ ہوئی لیکن ان کے خطرناک ارادوں کا اندازہ ہو چکا تھا۔ ہاتھی چاہے کتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو چوہا نہیں چاہیں تو اس کی چٹنی دلا سکتی ہیں۔ چڑیاں چیتے کو لوہے کے پتے چوہا کھتی ہیں۔ یہ تو بولے جیسے جو شاید اس لحاظ غمی میں مجھ پر حملہ کر بیٹھے کہ میں نے ان کے ایک بولے کو پکڑ لیا ہے جگر اسے چھوڑ بھی دیا گیا لیکن تم دھنڈے کی لہر نہ کہ نہ سکی تھی۔ اب مجھے اپنی جان کی فکر ہوئی۔ فی الفور جیسے میری عقل کی کوئی کھڑکی کھلی۔ میں نے کسی انجمام کی پروا کیے بغیر جھکائی لے کر پانی میں اُلت بازی لگا دی۔ میرے ساتھ کئی ایک بولے جو میری ٹانگوں کے ساتھ برسرِ پیکار تھے پانی میں لڑ چک گئے۔ پانی خاصہ گہرا تھا۔ لیکن میں نے اپنا حساب لگا لیا تھا کہ یہ جگہ کھوئی کے چمک سے نیچے بائیں جانب ہے۔ یہاں زمینی کٹاؤ سے قدرتی کھود سی بنی ہوئی ہے اور یہاں دیوؤں کے مسکن ہیں۔ بولے ہیچ نہ ہوں گے بلکہ ہاؤسوں، کنوؤں اور یاؤں، شہروں کے بے آباد کناروں پر اپنی بستیاں بساتے ہیں۔ اپنے اندازے سے میں نے ذرا اونچیں جانب ہو کر پانی سے ہر ماہر کا اتوار یعنی تریبوزوں والی کھائی تھی اور اس سے مجھے باہر نکالنے کی ضرورت نہ رہی۔ اور پھر میرے ساتھ ہر سلوک ہوا اس کا بیان کچھ ایسا پسندیدہ اور خوش الحان نہیں ہے اس بات پر میں لایا جا سکتے ہیں کہ یہ بڑا دکھناؤ نہیں تھا کہ میں تریبوزوں کے ساتھ کھائی میں لگا ہوا تھا۔ پانی کے اندر سے ان کو اس قدر بڑا سراواں کہ کر میرے منہ سے مار دیا تھا۔ شہوت کے شور پہ میں نے پاؤں ٹانگوں پہ پاؤں کے منہ سے نکلنے والے نکلے دکھائے۔ جواب میں انہوں نے بھی اپنے ہاتھ پاؤں دکھائے کہ یہ تو یہاں کے چھوٹوں کی کارستانی ہے۔ میرے ہاتھ میں ان سب کی کھائی دیکھی تھی کہ میں ایسے رشتہ میں گھومتے تھے اور اے جڑے تو اسے نہیں آستانوں کا آستانہ ہوں۔ واللہ علم بالسواب!

دوسری بار منات پر میں بعد میرا پنجرہ پاؤں سے واسطہ پڑا تھا۔

● تماشا کے ضمنِ آنم.....!

(بات بڑھانے سے پہلے مجھے اس سلسلہ کی اذیل کتاب ”پیو رنگ کا لالہ“ سے ایک اقتباس نقل کرنا چاہیے گا۔ صلی ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹) ”من آ۔۔۔ من منی نے پوچھتے ہوئے اپنے اور گرد و نیک کو کہتا ہے جو ”من آ من من آ من“ پکار رہا ہے مگر اس کر بہ سیاہ کے علاوہ اور کوئی ہوتا تو دکھائی دیتا۔ میں اٹھ کر بہتے کھلے دریا کے پاس پہنچ کر اس ”من آ من آ من“ کے اسرار کی کھوج کرنے لگا۔ اب میرے پیچھے سے ڈوبتا ہوا

میں آئم منس آئم" کی آواز ابھری ہے۔ میں بکھٹ ایزی پہ ٹھو ماٹرو ہاں بھی کون تھا بنز مگر بہ سیاہ۔ میں
 کچھ باٹھا کہ یہ آواز اسی بلی کے منہ سے نکل رہی تھی۔ "ی آ اوں" کی جہائے منس آئم۔ میں نے حیرت
 سے انھوں کو ملنے ہوئے پھر فور سے دیکھا کہیں سو نظر ہی نہ ہو۔ مگر یہ حقیقت تھی۔ بغیر سوچے کچھ میرے منہ
 سے اُچی "منس دانم" نکل ہی گیا۔

سبونی اور اوٹی کے ٹھکانہ کی طرح اس کی موٹی سی لمبی دم بڑی نمایاں تھی اس نے اپنی لمبی دم سے
 پے گرد حصار سا کھینچ لیا تھا اور خود کسی سیاہی شہزادی کی طرح سے تھوڑے کا تاری ہوئی بیٹھی تھی اور میں اس
 سے متصربوں کھڑا تھا کہ ابھی وہ اشارہ ابد کرے گی اور میں چشم زدن اپنے سر کی فصل کاٹ کر اس کے قدموں
 تک پھیر کر دوں گا۔ اس قماشائے منس آئم میں شاید اک زمانہ بیت گیا۔ پھر ساتوں کی گرہ ٹھٹھتے ہی اس نے
 اپنے غیر معمولی دم والا حصار بھی کھول دیا۔ یہاں اسٹینڈنٹ اور بیٹے اٹھ اٹھ گئے سر کو اک جھٹکا دیا اک کا فراتہ
 کی ٹکڑی توڑی اور ہانسی جانب دروازے کے پاس پھینک کر رک گئی۔ در کا آغوش پھٹا ہوا تھا پو کھٹ پہ
 جسے کھانچ کے بھول اور بلور کی مونگر لڑکیوں کی ایک خوبصورت سی آتش لگی ہوئی بڑی دفتر میں دکھائی دے
 رہی۔ میں نے یہ آتشار دیکھنے میں ٹوٹا کہ اٹھا تک اسی لڑکی کی آتش میں جھانک رہی تھی کہ میں نے آواز کے
 ساتھ ساتھ اس کے منہ سے آواز نکلتی تھی۔

UrduPhoto.com

اس نے کو اس نے شام کے سنے کا رنگ بٹول چھوڑ کھا تھا وہ بے وقتہ اور بے سنگ تھا۔ اس نے فوراً
 میرے کوٹھا کر کے ایک چلا۔ اب وہ راک وینس کو ابھیر رہی تھی جو قریب قریب ہی تھے۔ جی آرمی رات کا
 آواز ہے۔ اب جو میں اس کی جانب متوجہ ہوا تو وہ اپنی دم کے سر سے کچھ سی جانب کھٹا کر ہاں بلاری تھی
 جسے ان اٹھت شہادت سے کسی کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے داتا ہے۔ میں داسو پہ کچھ ہوئے آگے
 بڑھا ہوا۔ وہ اب پوکھٹ کے اندر تھی اور میں پوکھٹ کے اوپر یعنی نہ باہر نہ اندر۔ چند اچلتے سے میرے مجھے ٹھوڑی
 سے جسے سوچ رہی ہو کہ کیسے احمق سے پالا پڑا ہے۔ میں اس کی ذہنی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے پوکھٹ کے
 کچھ کچھ گیا۔ وہ پھر آگے بڑھ کر کھوٹے ہوئے مجھے دیکھنے لگی کہ میں کہیں ڈک تو نہیں گیا۔ وہ آگے آگے اور
 آگے پیچھے پیچھے۔ اندر سے اُجالے میں آنکھوں کا کام آگے ایک اور پوکھٹ تھی۔ ویسے ہی ساتوں کی جھالز
 تھی تھی وضع کا پت بڑا ہوا۔ کبھی ہلکی آواز پائی سی روشنی بھال کی جھلم سے باہر چھنی رہی تھی۔ یہاں
 آواز سے نختوں سے ایک عجیب ٹیٹھڑی خوشبو منس ہوئی میرا منہ کھل گیا نہ نہیں آ رہا تھا کہ اس سے خوشبو یہ
 خوشبو کی خوشبو کہاں سے نکلتی تھی؟ اسی بارش بادش میں میرا کہ بہ سیاہ کی جانب دھیان ہوا۔ وہ
 یہ بھی اٹھو دم کو الجھنے کی ٹھوٹی شکل دیے دے دت میری طرف دیکھ رہی تھی۔ کئی نکتے سناپ اور

کرنے والوں کی ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے اس جگہ پہنچ کر میری ظاہری بالشتی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہوتی چاہئے۔
 نہیں نہیں۔ میں چونکہ بابا رحمت امیرتوں والے اور نواسا میں سرکار کا فرستادہ تھا اور وہ تو میں گھورتا گئے والا
 میں رشید جو براستہ داتا سرکار یہاں اس شاہی محلہ میں "خوئی جونا پانی جہل پوری" میں مجھے لے کر آیا تھا اور
 میری کے وہ درجہ بال سیاہ پوش..... دلوں پر وہ رقص و رویاں والی پینٹنگ اور اس میں ٹھورتی ہوئی آنکھیں
 جس میں خود شامل ہو جانا وغیرہ۔ تاکہ بھی تو میرے اختیار و ایما میں نہیں ہوا۔ اب مجھے اس پر اسرار کا بیٹی
 کے سپرد کر دیا گیا جو مجھے اپنے پیچھے نہ جانے کہاں لیے جا رہی تھی۔ دل میں جیسے طمانیت و انساط کے
 غصے ٹھٹھلے پھانے رکھے پڑے تھے۔ اک گونہ تسلی تھی کہ میں میں صواب راہ منزل پہ ہوں۔

میرا گہرا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ منزل کی راہ پر دواں راہی کے لئے۔ وقت ٹھہر جاتا ہے۔ انسانی
 ضرورتیں ضرورتیں تقاضے اپنی اہمیت میں پشت ڈال دیتے ہیں۔ دماغ نہیں اور دل نہیں رہتا ہے۔
 احوال تردید وغیرہ کو سوجا دور ہٹ جاتے ہیں۔

بم آگے بڑھ رہے تھے تھوڑی دیر پھر ایک نوڑ آیا۔ یہاں بھی قدریں روشن تھیں۔ اور کچھ آگے
 گئی۔ صوفیوں کے لئے ہوتی اور نہ تک جیسے ٹکڑے لگی تھی یہاں کہ میرے دونوں شاہان کے اطراف شاید
 جیسے میری قیادت میں تمام اہل خانہ کے ساتھ چلنے کی جانب تھا۔ وہاں اطراف
 وہاں کے ساتھ ہونے سے بندھے ہوئے تھے جو شاید ہمارے لئے ہونے کے لئے تھے۔ چھوٹی ٹھہر
 میں تو نسبتاً ایک گلی کی جگہ پہنچے تو گلی نے دائیں دیوار کے قریب ایک پتھر کے باغیچے کی گڑھی۔ آگے
 گزرتے ہی کچھ وقف سے میری جانب پلٹ کر دیکھا پھر ایک جگہ گلی پتھر کی اونٹ ایک پتے سے
 گزرتے میں نہیں جا رہی۔ میری تھوڑی پہلے بھی کیا آ رہا تھا جو گلی کی یہ حرکت بھی میرے کچھ پہلے پڑتی۔
 اب جو پتے کی کا تو وہ بڑا بڑا ہوا کہ اب کیا ظہور میں آتا ہے خاصا اتکار کھینچنے کے بعد یوں لگا جیسے
 ایک ایک دواور کچھ لوگ آپس میں کھسک رہے ہیں۔ سر کے اوپر ہلکی آہستہ ی صوفیوں کی ایسے باہر کوئی چل
 رہا ہے۔ اب دیکھا تو سامنے سے کچھ دھیمی دھیمی روخیاں میری جانب بڑھتی چلی آ رہی ہیں۔ غور سے دیکھا
 تو یہ وہی کچھ سے سے ہونے لگے۔ گلیوں کی طرح ننھے ننھے ہونے تھے جن کے ہاتھوں میں ماچس کی
 ٹکڑیں بھی مشعلیں تھیں۔ اب سرنگ میں ٹھہر کر دیکھا تو وہاں تھا وہ جب قہر سے قریب پہنچے تو معلوم
 ہوا کہ وہ تعداد میں صرف پانچ نفر ہیں۔ چھ سے پندرہ سواں اور تن پہ جا گئے۔ ایک ہوتا جو دوسروں سے
 بڑا تھا۔ اور نہ تو کھائی دیا وہ پیچھے جبکہ ہائی چار مشعل بردار آگے آگے تھے۔ میں نے ان بزرگ
 ہاتھوں کو دیکھا اور مسکرا کر رہ گیا کہ دیکھیں اب میرے لئے کون سا درجہ ت نکلتا ہے؟ وہ سب میرے بالکل

پاس پہنچ کر رک گئے۔ میں نے خامسا جھکتے ہوئے انہیں غور سے دیکھنا چاہا۔ اونچائی سے نیچے دیکھو تو بڑی چیز بھی چھوٹی لگائی دیتی ہے وہ تو تھے ہی بونے مجھے ان کے سر و سرکونوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ پہلے دیکھ کر میں تھا پھر آنکروں سالن کے زور و بیہودہ گیا۔ پیچھے والا بزرگ بونا آگے آیا اور مجھے السلام ملے کہ آواز میں اور خفیف ہونے کے باوجود میری سمجھ میں آگئی۔ اس نے خندہ پیشانی سے سلام کا جواب دیا وہ بزرگ بونا قدرے بلند آواز میں کہنے لگا۔

"یہاں تک پہنچنا اور بابا سید صاحب کے حزار پہ حاضری کی سعادت مبارک ہو۔ میں بابا سید کے حزار پہ متوفی ہوں اور یہ چاروں حزار شریف کے خادم ہیں۔"

میں ان کی رہبری میں ایک جگہ اور نسبتاً نئی چھت والی کوٹری میں داخل ہوا وہاں پہلے سے موجود چند ایک بونے بیٹھے تلاوت و تسبیح میں مشغول تھے۔ میرے اندر داخل ہوتے ہوئے انہوں نے مجھے اک نعر دیکھا ضرور مگر کسی غیر معمولی رد عمل کا اظہار کیے بغیر وہ اپنے اپنے شغل میں مصروف تھے۔ کوٹری کے درمیان ایک چھوٹی سی قبر تھی۔ عجیب میں ہم فوت ہو جانے والے چند دنوں اطلوں اور چڑے چڑھوں کی ایسی چھوٹی چھوٹی قبریں دیکھا کرتے تھے لیکن یہ قبر ان سے کچھ بڑی تھی یوں سمجھ لیں کہ جہاد کی نہیں کسی جانی کی قبر تھی۔ قبر پہ قلمی تحریریں تھیں۔

میں گئے لگا۔ "بابا سید! یہ کون بزرگ ہیں؟" اس نے تو کبھی ان کا نام نہیں سنا۔ بونے بزرگ کی تاکید میں میں نے بھی فاتحہ شریف پڑھی۔ بعد ازاں گیا۔ آگے کی سڑک پر آگئیں بند ہوں تو باہر کوئی نیا اندھیرے اور اندر کا جہان روتی ہو جاتا ہے۔ باہر کی دنیا میں آنکھیں صرف مقابل کو اس کی بیرونی سطح تک ہی دیکھ پاتی ہیں مگر اندر آنکھیں انتہا تک دیکھ سکتی ہیں۔ صرف چشم بھاکا ہے وہ بند ہو یا کھلی۔"

● شاہجہان شاہی قلعہ اور شیش محل

اسٹن تصور نے ایک لمبی سی زندقہ جانی بعید کے قریبی کھیاں میں لاکھی۔ سلطنت و اقبال مندی کے خوشامی کے پھر برے ہر سو اترتے ہوئے نظر آئے۔ یہ لگائی جا۔ اس کی ایک ٹمکن سی صبح تھی۔ بھلی اور گہری دھند کی چادر نے منہ رتے ہوئے کہ اور کو اپنی پیٹ میں لے رکھا تھا۔ "اگلیم ہندوستان کا بڑا شہر اور شاہجہان جیسے اپنے پیشروؤں کی طرح" غولہ صورت زندہ رہنے والی عمارت زمین کے سینے پہ تن کے استوار رہنے والے

جیسے اللہ تعالیٰ کی حمد و بزرگی بیان کرنے والی مساجد، مینار، چاہ و باڈل، منارائیں، باغات و غیرہ تعمیر کرنے کا شوق ہی
 تھیں بلکہ جنون تھا۔ اسے لاہور بہت پسند تھا۔ آج کی بھیج آنے والا کل یا ہفت کی تمہوں میں اتر آؤ، ماضی
 لاہور میں لاہور کا مور ہی تھا۔ اس کا جوڑ پوری دنیا میں کہیں اور موجود نہیں۔ دیگر بہت سی غیر خوبوں اور
 تعلقات کے علاوہ اس کی وجہ شہرت میں اس کے عظیم الشان قلعہ کا بھی نمایاں حصہ رہا ہے۔

کئی ایک زمانے پہلے جب اس شہر کی عورت بھی کئی تھی تو دریا کنارے ایک بڑے شکوہ قطعہ ارض وسیع و عریض
 سرسبز میدان کے بیچ ایک فراخ بلد نیلے پٹی کی قدر نما عمارت تعمیر کی گئی۔ عسکری ضرورت و اہمیت کے
 لحاظ سے اس کا مقصد نے شہر کی تعمیراتی سرگرمیوں پر نظر رکھنا بھی تھا۔ مٹی کا نیلے جس کے گرد و گرد لمبی لمبی کھوپوں
 دیواروں میں دریائی اور زمینی پرندوں کے گھونسلے اور حشرات الارض کے سکن تھے۔ دور سے دیکھنے میں ایک
 جگہ ایک عفریت ہی تو دکھائی دیتا تھا۔ آخر میدان کی مائٹوں میں چھوٹے چھوٹے نیلے بے ڈھیریاں ٹیکریاں تو
 کہیں کہیں دکھائی دے جاتی ہیں مگر ایسا پہاڑ سا پہاڑ نیلہ وہ بھی دریا کنارے کھاتے لگا ہوا اور سرسبز علاقے
 کی کسی شے کے کڑا شاید ہی کہیں اور ملتا۔ ہو سکتا ہے کہ انہی وجوہات کی بنا پر اس عمارت کے غیر مسلم
 لوگوں بہادر اچھلنے سے اس نیلے کو روکنا اس کا موثر استخوان کا شوق نہ کر دیا تھا۔ انہوں نے یہ سوچ کر دیا کہ
 یہ استخوان سوکھ کر آدھار چٹائی کے بیچ میں رکھیں گی اس کے نیلے چھوٹے چھوٹے نیلے آکاں سے
 بنائے اور انہیں رخصت بنا جاتی ہیں۔ اس قسم کی من گھڑت بے سرو پا کہانیوں اور افکار شائستگی سے اس کی
 کمرت میں مزید اضافہ ہوا۔ نتیجتاً اس نیلے پہ ایک عظیم الشان مندر اور آشرم بھی تعمیر ہوا (جو میں آگئے
 وہی روز مقرر کا شوق و غیرہ کی طرح وہاں بھی باڑی چلی گئے۔ نیلے کے پہلے پت اور مٹی کے کچے کچے پتہ
 وغیرہ سے کاڑا نہ تھا۔

لاہور کی دہائی پائی دریاؤں کی خوبصورت منظر ادنیٰ تھی۔ نہ سرمو سوں خوشبوؤں مرکبوں کی سرزمین
 اور نہ جیتی تعمیراتی پتھروں کی غاروں کا نوں سے پرے اس کی اپنی ایک الگ ہی شان بان تھی۔
 اس دور میں مسجد، دریا، قلعے، سراپیں، حرم، شالے، نکل مالیاں وغیرہ سب سے چوڑے مٹی کے کچے کچے پتہ
 کیسے پاک نہیں ہوئی والیں شہری گوندیں، راب، درپے پتھر کے کار، وغیرہ سے بنی تھیں جو کہ اس زمانے کے
 عمارت سے بڑی چٹا دیر پا اور طاقت کی حامل تعمیرات سمجھی جاتی تھیں۔ لہذا قلعہ کے پہلے پتہ یہ جو تعمیرات
 تھیں وہ بھی اس نوعیت کی تھیں۔ پھر اختلاف زمانہ نے ان کے نقش و نگار بدل دیے اور عام و انتہا پرہیزگار۔ ان کے
 قلعہ و مٹی کا ایک باب بنا کر بند کر دیا۔ آنے والوں وقتوں کے گرد و بار کی نئی مٹی جہد و جہد چڑھتی گئی۔ نیلہ اور چٹا
 ہو گیا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ اکھاڑے گئے درخت کی کوئی نہ کوئی جڑ بڑی۔ اگر انی مٹی عمارت کی کوئی نہ کوئی

اودھ پچھڑی اینٹ روڑی — وہائی گئی آواز کی کوئی نہ کوئی ٹھنکی ہوئی کراہ اور ٹوٹی ہوئی محبت کی کوئی نہ کوئی جگہ وغیرہ کہیں نہ کہیں ضرور محفوظ رہ جاتی ہیں۔ اس طرح پہلی پرست کے پیٹ میں بھی بہت کچھ چڑا رہا کہانے والے وقتوں کا قلعہ بانجھ نہ ٹھہرے۔

پُر پیچ راہداریاں چھوٹی بڑی آخر میں 'مندرہ' مرگھت اور بارہل سرانیں — چین و بابا غنیمت ہندی خانے مال خانے 'اسلحہ خانے' سب کچھ تاراج ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ہر کسی قلعہ کا مزاج مطلب میں جتا ہے کہ وہ مضبوط اور ناقابلِ تسخیر صورت اختیار کرے جبکہ اس کے ہاتھ ہار میں ذالاقو کچھ جاتا ہے مگر نہ کہ نہیں جاتا۔ غلو پہ غلو چڑھا دی جاتی ہے اور طرہ پر ڈھیر جمادیا جاتا ہے۔ اس کی قد آور بلندی پھیلاؤ اور گھیر ہی اس کی سطوت و شان شوکت کے مظہر ہوتے ہیں۔ سو یہ قلعہ مختلف ادوار میں طرح طرح کے طالع آزمائش کے آگے ایک شطرنج کی جی بساط کی مانند بچھا رہا — ہر پہلا شاطر پارسی جھاڑ کر نئے کھلاڑی کے لئے کھلا جاتا — پیادے لڑ چکے ہوں یا شاہ فرضی پٹے ہوں بساط تو ویسے ہی پچھی رہتی ہے بارہیت کے لئے نئے کھلاڑیوں کی خاطر۔

وقت کے نشیب و فراز نے قلعہ کوئی ایک دو تین بار چھوڑ دیا تھا۔ مستند اور پختہ راہداریوں کے مطابق ہر آٹھ سو سال کے بعد اس شطرنج کی ایک نئی صورت تیار کی جاتی ہے اور وہ کھیلنے والے کے چہرے سے لے کر آئے اور اپنا اپنا رنگ چار کر چکے ہوتے ہیں۔ مہاراجا کو ایک فٹ پاتھ کے بائیں سرے کی مانند ہوتا ہے۔ جو اس کے اس کا غلے لے لیتا ہے۔ اس کے اصل کو چھو نہیں پاتا تو وہ قیامت اور مضر و مضمین ہے اور وہ انھما کر رہا ہے۔ شاہی قلعہ کی تصویر اس وقت تک تیار نہیں ہوا کہ اس کی جھڑی بھڑکی ایک تصویر ہی تو ہے جس میں ہم اس کی ظاہری اور اندلی ہی صورت تو دیکھ سکتے ہیں لیکن اس کی گہرائی ہوئی سیرت کو نہیں دیکھ سکتے۔ قلعہ جو اصل میں اندر و اندر اور تہہ در تہہ ہے وہ اوپر بلند و بالا اٹھتے ہوئے اتریں لے جوں امر میں آتی ہیں۔ ان لوگوں کے نقشیں بھر رکھیں والے قلعہ سے کمر مختلف تھا۔ آگے پیچھے کے ادوار میں مختلف مذہب و اقوام کے حاکم و حکمران اسے اپنے اپنے مزاج و مطالب کے مطابق اچھالتے اور استعمال کرتے رہے۔ بالآخر سلطان شہجہاں نے قلعہ کو آدروں سے اس کا واسطہ پڑا۔ محمود غزنوی اور سلطان شہاب الدین غوری کے قدم بھی اس کے دروازوں پر لگائے گئے۔ سب حکموں نے اس قلعہ اور شہر کو تاراج کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد سلطان بلبن نے اس کے تباہ شدہ حصوں کی مرمت کروا کر اس کو بحال کیا۔ اب پھر جو امیر تیمور کی باری آئی تو اس نے ایک بار پھر اس کے ایک خاصے حصے کو تباہ کر دیا جسے بعد میں مرمت کرانے کی سعادت مہاراجا شاہ کے نام لکھی گئی۔ اس کی شان بان بڑھانے اور چند نئی تعمیرات کے لئے نمایاں نام جلال الدین اکبر کا ہے۔ جس نے پرانے قلعہ

گھڑا میں یوں دکھائی دیتیں جیسے آبِ زندہ کے چنٹ دار وہ پٹا کے کنارے سبز گولت لگی ہو۔ شمال کی طرف سے زمینی پُردائیاں بڑی اداؤں سے اٹھاتی، اٹھکدیاں توڑتی ہوئی جب جھروکوں کی جالیوں سے گزرتی ہیں تو ساکنانِ قلعہ اور آئینہ بدعا کی شیش محل کے لئے فرحت و بہجت کی جلتی ٹھنسی سی بجے لگتی ہیں۔

آگرہ میں جہنا اور لاہور میں راوی کے پاٹ گھاٹ اور ساحلِ سبزہ اس کی ملکہ ممتاز الزمانی میں رمل بہت بھاتے تھے۔ جونہی بادشاہ کو کارہائے سلطنت اور تحفہ ہائے خلوت و صحبت سے چنداں آسودگی نصیب ہوتی تو وہ اپنی دلآرام کوزیہ پہلو بنا کر لاہور آگرہ و علی کشمیر اور دیگر قابلِ قدر مقامات پہ یادگار قسم کے قلعے تعمیر کرتی اور رنج و غیرہ تعمیر کرانے کے منصوبوں پہ مشاورت شروع کر دیتا۔

قلعہ لاہور میں یہ شیش محل بھی اس نے اپنی ملکہ کے لئے بڑی چاہت اور زرخیر کے صرفے سے تعمیر کروایا تھا۔ اس کی زینت و زیبائش عجائباتِ آثار میں سے ہے۔ قلعہ لاہور کے علاوہ دوسری ملکیتوں سے بھی لگانہ دوڑکار بنر مندوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ ان ماہرین میں ایک تری محمد ابراہیم مصطفیٰ قونی استر میں چمکتے پائوں کی مانند تھا۔ یہ قدرتی وسائل سے استفادہ حاصل کرنے کے فن میں فی الحال دنیا جانی نہیں رکھتا تھا۔ ہواؤں، موسموں، مہر وادی تابانوں، مہربانوں، رنگدار ساقوں اور بدلتی رنگوں سے ایف وٹ کا کام کرنے کے فن میں اس نے اپنے استاد کے مشورے اور اپنے استاد کی نصیحتوں اور اس کے حرموں کو شرمگین بنایا اور شاہی محسوس کے مطابق ان کی تعمیر میں محلی مشاورت و صلاحیتیں اس کا وسیلہ پیش اور شوق و ہوش و ذوق اور فکرِ باپ و دادا سے وراثت ہیں۔ جویسے استاد و شاگرد تھے کہ جن کے بے مثال سببِ کمال کے اہمیتِ فنونِ آج بھی ان کے مہول اور قویہ کی بے شکوہ مثال مساجد و کلاںبہ ایوانوں، قصراتِ اعتبار اور نگہستانوں کی صورت میں ثبت ہیں اور نگارہ کرنے والوں سے بے انتہا واد و تحسین حاصل کرتے ہیں۔ یہی قابلِ قدر بنر مند اور مصطفیٰ قونی دو لگانہ جہاں معمار تھے جنہوں نے دہلی و آگرہ اور لاہور کی چار گنجی عمارات قلعے مساجد اور دیگر قابلِ دید تعمیرات میں اپنی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی تعمیرات میں جو آئینہ بدعا کی شیش محل کے لئے فرحت و بہجت کی جلتی ٹھنسی سی بجے لگتی ہیں۔

کچھ ہستیاں کاہنہ روزگار ہوتی ہیں اور قدرت سے بہت خصوصیتیں قسم کی جہنیں صلاحیتیں اور فنونِ فطری طور پہ سے کہ پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا کوئی اور دعاوی و بانی نہیں ہوتا۔ جبکہ قدرت انہیں اپنی صلاحیتوں کے مطابق ان کے مواقع بھی فراہم کرتی ہے۔ وہ بے پناہ شہرت، عزت اور دولت بھی سمیٹتے ہیں۔ ان کی ان فطری صلاحیتوں سے ہمارے تحقیق و تحقیق کے لئے نئے باب کھلتے ہیں۔ جن کی بدولت پھر انسانی جنس و جنس سے بڑے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام پاتے ہیں جو آئینہ بدعا کی شیش محل کے لئے فرحت و بہجت کی جلتی ٹھنسی سی بجے لگتی ہیں۔

جیسا کہ بطور بالا میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ اس ترک ہوا اونچے تر کا سب سے بڑا وصف قدرتی وسائل سے بھرپور استفادہ حاصل کرنا تھا۔ وہ مومنوں، سنتوں، ہواؤں، بارشوں، دریاؤں، جھیلیں اور پہاڑوں میدانوں کی اونچائیوں، گہرائیوں کی فطری، باطنی قوتوں اور صلاحیتوں سے باریاب ہونا چاہتا تھا۔ وہ اقلیدس الجبر سے اور ریاضی کے ایسے ایسے مسرعوں سے روشناس تھا کہ اس سے پہلے کبھی کوئی ایسا فطرت شناس نکلتا، ان نظر نہ آیا ہوگا جو اس کی ہمسری کر سکے۔ فطرت اور حکمت اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی تھیں۔ وہ فطرت کے مسرعوں اور سر راستہ مجیدوں کو اپنے ناخن تدبیر سے چاک کر دینے کا بشر جانتا تھا۔ ایسی ایسی اذہن کی کوڑیاں دیاں کہ عقل و خرد کی ایزبوں تلے پسینہ بہہ نکلتا۔

شاہی قلعہ کے شیش محل کے عین نیچے تہہ بہ تہہ ایک کثیر المقاصد وسیع و عریض تہہ خانہ میں قیلولہ گاہ کے بدست خانے کی تعمیر قریب قریب مکمل ہو چکی تھی جس کی طرف توجہ دینا باقی تھی۔ یہ فقید المثال منصوبہ تمام تر حسن و عصفیہ قوی کی فنی المیہ کی اوج و کمال اور بے جھول مشاورت کا مہربان منت تھا۔

مغلان کو اس دور بہت سی وجوہات کی بناء پر پسند تھا۔ نہ ہور کی جھڑپائی قدر، مسکری اچھت اور چاروں طرف سے گھیرے ہوئے اس کا مزاج اتنی جگہ پہنچن جو فطری ذوق کے ساتھ ساتھ انہیں بساقتی تھی اور دیا راوی کا خاصہ تھی کہ اس کے اندر ایک عجیب و غریب انداز میں انسانی ذہن کی قوتوں اور ان کے گہروں کی قوتوں کی طرف توجہ دینا اور ان کی طرف سے اس کی طرف توجہ دینا ہوتا تھا۔

قد رے مکی پر مشورے، جہاں کے کدوے آگرہ اور دہلی کی تھی۔ ہندوؤں کے دل کھول کر قلعے کی تعمیر سے مساجد اور دیکریا کا کچھ قسم کر دیا گیا تھا جس کی تعمیر میں ان کی شہت سے چند اس لئے بھی تھی کہ قلعہ شاہدہ شانی مسجد اور دار حضرت علی جوہری اور دیا رے راوی۔ یہ پانچوں بزرگ استحقاق صرف سکے پہ باہم شریہ شکر تھے۔ شاہی قلعہ میں شیش محل کی تعمیر کوئی نوازش تھی بناء پر یہ بھی تھی۔ چنانچہ صرف کثیر مسرعوں کی شانہ روزگار کردہ گی سے شیش محل اور اس کے گرد و نواح کی نسبتی عمارتیں اوقات و اطلعات آنکھ سے کرج شاہی احمام شاہی انوکھے بھلے مصور و پارا حاطہ شاہ جہانی اوقات خانہ، یہ کی جھڑپ کے مسہر و مکتب اور دیکریا تعمیر ہوئے اور کچھ شہر و دیوں کی تعمیرات کو حسب زمانہ ضرورت تبدیل کیا گیا۔ لیکن ان تعمیرات میں بھی چار کام ایسے تھے جن کی نظر اس سے پہلے کہیں سے نہیں ملتی تھی اور یہ اسی بنیادی و جامع کے حامل انسان حسن و عصفیہ قوی کی اختراع تھے۔ ایک تو شیش محل کے فرش، مہبت اور دیواروں پر چنے روزن اور جھڑپ کے چاروں طرف کیے اور انہیں ایسے ڈال دیے اور رخ عطا کیے کہ وہ ہر ذرت اور موسم میں خوشگوار رہتے کا احساس لئے ہوئے رہتے۔ دوسرے شیش محل کی چھتوں، محرابوں، غلام گروشنوں، دیواروں اور ڈیڑھوں میں ایسی بے مثال

[illegible]

نیکو مشق و رسم.....!

کہیں ٹرائے بوڑھے باغبان یا وقت کھائے ہوئے کسی دیوانے حکمت یار سے اگر پوچھیں تو شاید یہی

پڑے ہیں۔ مزید چند روز جو توجہ دی تو یہ شکوے گلیوں میں بدل گئے اور جب ان گلیوں نے پھولوں کا
 ادب و صفا تو حلیہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس انداز خوش اتفاقی سے یہ گل بد اماں اتر کی سے ایران
 پہنچی۔ سکیم موصوف نے اس پر مزید تجربات جاری رکھے۔ یاد آ کر اس نے اسے گلی سے قلمی بنا کر پروان
 چڑھایا۔ اس کامیابی کے بعد اس نے مختلف اکیف الاثر پھولوں اور جڑی بوٹیوں کے اتصال سے ایک نیا
 ادب و رنگ دیا مگر اسے اپنے مظلومہ تن کی کاروبار دیاں نہ دیکھان اور پوست کے پوروں کی قسموں کے اختلاط
 سے حاصل ہوئے۔ ارحانی تین ہاتھ اوچے اس پودے پر جڑ او گھڑی انگوٹھی کے گینگوں کی مانند نئے نئے چمکیے
 دانے سے ڈکتے ہیں یہی اس کے پھول ہوتے ہیں جبکہ پھول چمکڑیوں کے کول کنور سے ہوتے ہیں اور یہاں
 کول کنور سے کوٹھار کے دانے۔ یہ معصوم و صدم سے روغنی دانے بنتے اور پھولتے رہتے ہیں۔ ٹلمی کی طرح
 اس سدا بہار پودے کی جب جڑ جات تو پودہ کی مانند تھوڑا سا پھیلا ہوا ہوتا ہے یعنی پہلا جہنم شمع کر کے دوسرے
 جہنم میں وجود پکڑ لیتا ہے۔ عجیب آوا گوئی عنصر الوجود جو حیات و ممات کا ایک حیران انگیز واقعہ ہے جو تخلیق ہا محال
 کا اختلاف و اشیا علی پیش کرتا ہے۔ نظر غائر یہ واحد حقیقی لطافتی لطافتی اور کرامتی پودا۔ جو بھلا دوست اور
 سدا دوست ہے اوسطاً ایک پتہ اسرار پوست کی علامت ہے۔ اس سدا دوست کے اندر جہنم کی مہر کی نگلی میں
 چھپے رکھتے ہیں۔ اس کے اندر اس کی تمام باتیں ہیں۔ اس کی تمام باتیں ہیں۔ اس کی تمام باتیں ہیں۔ اس کی تمام باتیں ہیں۔
 صورت کہ شہر کی ہے۔ سر پہ زلف چٹائی پہاڑوں کی قدرتی خاروں کھان پتھروں کی کھوٹوں جہاں روشنی کا گزر
 کچھ نہیں ہوتا اور پانی کی اندرونی غلوں۔ اور زمین میں دھنوں تہہ خالوں میں یہ قدرتی طور پر موجود ہو
 سکتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی ارضی تخلیق موسموں کے چوراز غولانے سیاست و ریاست اور شاہد اہل ذوق و شائق
 میں شامی نیمائی افتخار ان۔ یہاں کوئی اور وہ کہ یہ خاص صندل ٹھوڑا مستوری اور زعفران کی طرح ادھر کیاب ہی
 وجود ادھر کے باشندے اس کی یو باں کو ترستے ہی رہے۔

شیرازی ماہر نباتات حکیم نے گل شب دم کو جو کی شکل و شکم دی اس سے وہ شیراز کے گلزار و چمن میں
 ایک جھونکا نو بہار تو محسوس ہوا لیکن فراموشی انکسار و لطافت عبت نہ ہوا۔ اس کی محدود اور محسوس کاشت بھی
 زمین میں نمایاں کھڈوں میں ہی ہو سکتی ظاہر ہے اس کے ثمرات بھی محسوس افراد تک ہی پہنچ سکتے۔ ایک اور
 انجن بھی ہمیشہ آگے رہی کہ یہ ذکی انجن کوئی محسوس انسانی لمس حاصل کر کے کسی پسند کے مت پر ہی بیچا۔
 یوں لے آکر اسے کاشت کیا تو یہ محض چند ہاتھوں سے ہی پروان چڑھا۔ اس طرح یہ ہونے نہ ہونے کی حالت
 میں ہی رہا۔ قدیمی حاذق اطباء اسے خاص الخاص صاحب ثروت مریضوں کے لئے تجویز کرتے جو کم خوابی

نخستانِ زور و خسی ز اور زنجی اعصابی شستگی و گرفتگی یا عرقِ اقسام کے مریض ٹھہرتے۔ بادشاہِ امراء اور پیش کوئی اسے اپنے اپنے مختلف مقاصد کے لئے استعمال کرتے۔ ایک طرف تو یہ بے خوابی و ذہنی اور بارہ جسمانی اعصابی متعین قلبی گھبراہٹ اور بے سکونی کا جہ بہدف علاج تھا جبکہ اس کا دوسرا رخ بڑا ہی رخشندہ تھا۔ یہ انسان کے مثبت تیوروں، ارادوں، خیالوں اور منصوبوں کے لئے بڑا خیر خواہ و مددگار ثابت ہوتا۔ جبکہ منفی سوچوں اور ادوں میں یہ خود مگر جھکا کر اپنی ناراضی کا اظہار کر دیتا۔

شاہِ جہان نے شمالِ رغبت و زورِ کثیر کے صرغے اور انتہائی معتد ہاتھوں سے گلِ شبِ دم کے قصور جہاز اور پاؤں شیراز سے منگوائے تھے۔ استادِ مصطفیٰ قونی کی مشاورت و معاونت سے وہ انہیں شیش محل کی مخصوص جگہوں پہ بھار کر مچا چاہتا تھا۔ بادشاہ چونکہ کم خوابی اور اعصابی غلبان کا بھی مریض تھا اس بناء پہ گلِ شبِ دم کی ہم نشینی کی ضرورت تھی۔

یہ مقصد پورا کرنے کے لئے شیش محل کی شاہی خواب گاہ اور نیچے تہہ محلے میں مخصوص آرام گاہ اور قیادہ کا ٹیچر منتخب تھے۔ جن کے زورِ شاہ و زورِ دل و دل و دیاے راوی تھلے تھے۔ دوسرے نمبر پر فرست بخشِ قلعہ دی ہوا تھیں۔ انتہائی گرمیوں میں بھی کچھ کھلم طاری نہ ہوا کرتی تھیں۔ ان جگہوں پہ مخصوص نیم تیار کیے جاتے تھے۔ ان کے اندر ایک شبِ دم کے مریضوں کی سوجھ بوجھ پائے۔ پائے تھے۔ پاؤں کے اندر لٹکی غیر آلودہ مٹی مخصوص طور پہ بنوائے گئے اور انی مٹی کے کھلے اندر مرتبانوں میں لٹکائی گئی تھیں۔ ان مرتبانوں کے پیچھے وہیں جہ سے ہنس کی کاتھوں کی جڑیں بچھ کر تھیں جو نیچے درہائی زمین کی نمی کو اکٹھا کر کے معتد میں پودے کی جڑوں تک پہنچاتی تھیں۔

یہ ان دونوں کی بات ہے جب شاہی قلعہ کی اضافی تعمیرات شیش محل تہہ خانہ آب و ہوا موتی مسجد کی تہہ آب و شاہی حماموں، شیشیوں، فواروں اور باغیچوں، گل تختوں کی آرائشی و زیبائش کا کام استادِ مصطفیٰ قونی کی زیر نگرانی شاہِ جہاں کی حسبِ منشا مکمل ہو چکا تھا۔ آنے والی بدست و زنت میں شاہ اپنے مجسمے ملک و متاد و گل کو بعد اہتمام و احتیاط لے لیتے لاہور آتے تھے کا اور وہ ہاند سے ہوتے تھا۔ اس نے شاہی قلعہ میں ہوتے والی قسمی تعمیرات و تہہ دیوارات ابھی تک ملک کے علاقے میں نہیں لائی تھیں۔ ملک سے چاہت و چاہ کو کا یہ تھا کہ بادشاہ اسے اپنی محبت کا مختلف طور سے یقین فراہم کرنے کا کوئی دقیقہ ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ وہی شاہ بد و ہمتا کنارے کے باغات ہار و ہری آگرہ لاہور کی تعمیرات وغیرہ۔ اسے یقین تھا کہ جب ملک لاہور آتے گی اور شیش محل باغات فوارے زور زمین شبِ دم کی زور و ہوا پرور مہک سے محو و زینت بہت آرام گاہوں سے خاطر خواہ محفوظ ہوگی.....!

لکھے سے اور کچھن موسم میں آپ کو جو بے پناہ رحمت اٹھانی پڑی نیاز مند اس کے لئے بھی شرمندگی محسوس کرتا ہے۔

بادشاہ نے قدرے جھٹک کر سید بابا کے نغصے سے ہاتھ پیرسہ دیا اور کھولے کو خدام کے کاندھوں سے اٹھا کر اپنی مسند پر رکھتے ہوئے خود دو لڑاؤ ساز و بر و بیٹھ گیا۔ اس اثناء سید بابا ب کا ایک خادم بالشتیہ جو خدمت میں ایک شیر خوار بچے کی مانند تھا سید بابا کی بائیں جانب استاء ہو گیا۔ بادشاہ نے فرط عقیدت میں ایک قیمتی مروارید لڑی جس میں ایک چمکدار مونا سا امام بندھا تھا نگلے سے اتار کر سید بابا کے قدموں پر بچھا دیا۔ اب جواب میں سید بابا نے اپنے ہاتھ کی باجروں والے موتیوں کی تسبیح آگے بڑھا کر خادم سے کچھ ارشاد فرمایا۔ خادم نے کمال منانیت و ادب سے تسبیح پیش کرتے ہوئے عرض کی۔

”یہ نادروں و بابرکت تسبیح ملکِ عالیہ کے لئے سید بابا کا تحفہ ہے۔ سید بابا نے ہندوستان کے فرمانروا کی خدمت و بندگی کو پسند یہ کی کی تھا ہوں سے دیکھا۔ بادشاہ کے اقبال کی بلندی اور اہمیت کو جاننا کی خوشحالی کے لئے ہمیں وی ہیں۔“

یہ کہہ کر توقف کے بعد سید بابا نے پھر اپنے اسی خادم کے ہاتھ سے کام کرتے ہوئے فرمایا۔

”آج کے دن بادشاہ کا خطاب سنا ہے جس میں بادشاہ نے اس کی اس قدر تعریف فرمائی ہے۔“

”ہاں ہائے آپ کا احاطہ کیسے رہیں۔ ہم اندھیروں اندھروں کے یہ دروازہ کھولنا اپنے یہودی و گاد کی خاص کامیابیوں و رحمتوں سے ملنے میں ہیں۔ افسوس پارہ ہے کہ اس سیاست و سیاست پرکھنے سے بہت پہلے راوی کا یہ کنارہ اور خاص طور پر یہ لیا۔ اس کا یہ کہ یہ قلعہ بند ہو کر ہی اپنا اہمیت پر لیا ہے۔“

”یہ زہین اور نیلے کی نگریوں میں ہماری آماجگاہوں اہمیت کا ہوں اور قریب واریوں پہاڑی اک جہاں آباد رہا ہے۔ ہر چند کہ ہمارا تعلق کلی دینی سے بہت نیلے چار کیوں اور پنہا کیوں سے ہے اور سبکی پرست سے علاقہ نہیں ہوتا۔ تاہم اوپر چست کی ہر کارکردگی کو ہم محسوس ضرور کرتے ہیں اور ان کی بھی برداشت بھی۔ ایک وقت آن پا کہ آپ کی تجاویزات ہماری توجہ کی گہری حد کو پہنچنے لگیں۔ ہماری آرا وانی سب اور روزمرہ کے مشاوارات و معاملات و رسوم پر ہم ہر گز ہٹے۔ نہ صرف ہمارے مقدس مقامات و مزارات کی بے غرضی کی نسبت تک آئی بلکہ توڑ پھوڑ اور گندہاکی کے دوران ہمارے کلی ایک افراد بھی شہید ہوئے اس کے باوجود ہم نے چاہا کہ کسی طرح آپ اور ہماری بائیں اور ملکی کی ایک خوشگوار فضا قائم رہے۔ لیکن پچھلے دنوں ایک نا قابل برداشت واقعہ نے ساتھ کہا چاہتے ہیں آپ۔ آپ کی قیمرانی سرگرمیوں سے ہمارے جد امجد سید بھائی رحمتہ علیہ کے مزار پاک کا ایک حصہ مسموم ہو چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اعلیٰ کی وجہ سے سرزد ہو گیا ہو۔ لیکن اس غیر معمولی سانحہ کے بعد ہم کسی مناسب

سبز باب کے بارے میں سوچنے پہ مجبور ہو گئے ہیں۔

ہمارے ماحول پہ اکے گہرا سکوت طاری ہو چکا تھا۔ شاہجہان مہبوت و نگوب ساسید بابا کے فاضل و فائق ترجمان کی زبانی ان پہ مسلط کن جانے والی زیادتی کی دل فراموش روداد سماعت کر رہا تھا۔ فرط استغلاب و استغراق وہ خود کو کسی جو ابدی سے قاصر پار ہا تھا۔ اسی وقت فاضل و ترؤد میں سید بابا ترجمان کے مابین کچھ مزید قیل و قال ہوئی۔ بادشاہ سے اذن گفتگو پا کر ترجمان دوبارہ عرض گزار ہوا۔

”عالم پادشاہ کا اقبال بلند ہو۔ شکوہ شکایت سید بابا کا شیوہ نہیں مگر درگزر کی آخری دیوار بھی اس آستے ٹوٹ گئی جب کھدائی کے دوران آپ کے کارکنوں نے ہماری ایک قدیمی گزرگاہ کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ جس سے نتیجے میں ہماری آمد و رفت میں تعطل پیدا ہو گیا ہم اپنے دیگر حلاقوں سے علیحدہ ہو کر رہ گئے۔ اسی دوران آپ کے چند کارکن ہمیں کما ایک قومہ گزرتے ہوئے اندر لوٹ آئے۔ ہم نے ہر لحاظ سے کارروائی کر کے ان کی جانیں بچا دیں اور اس وعدے کے ساتھ اوپر پہنچایا کہ وہ آئندہ اس طرف نہیں آئیں گے۔ ان کارکنوں میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو یہاں سے نور مخلوق اور خاص طور پہ ہمارے روحانی بزرگ سید بابا کی بارگاہت علیہ السلام کا شہادت و درجہات کے بارے میں بھی خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ اس کے سامنے سے ہماری حاجت اُٹھنے والی تھی۔ اس سے ہوتی ہو آپ نے اس شخص کو اس سبب سے بھیج دیا کہ وہ اپنے بزرگ سے رابطہ قائم کرے۔ اس شخص نے قریباً دو سالہ معرکہ نشات و فتنہ میں آنکھیں بند کی۔“

ترجمان اپنے اس بات تمام کرتے ہوئے بابا اب سانس نہ بڑے سید بابا کی ٹوٹ میں ہو گیا۔ بڑے کی بادشاہ و ملت نے اکہ لمبی کی سانس لینے سے خارج کرتے ہوئے کچھ باری باری اپنے رفقاء کی جانب دیکھا۔ آخر میں مہندس اعلیٰ بحیرہ چند کو دیکھنے میں کچھ سلوت لیا بعد اُنکھیں میچے آستہ مصطفیٰ قوی سے مرزا شرف الدین بیگ کو طلب کیا۔ کچھ دیر مشاورت کے بعد فرمایا۔

”اگر ہر خدمت کے لئے ہمارے پاس الفاظ موجود نہیں، بھلا! ہم کھس شرمندہ ہی نہیں۔ ہمارے طول و غم وہ بھی ہیں کہ ہماری وجہ سے تقدس آپ بزرگوں کے لئے پریشانی کی صورت پیدا ہوئی۔ ہم آپ سے ہر طرح کے نقصان و آزار کی تلافی کے لئے حاضر ہیں۔ اگر ہم کسی طور یہ بھی جان پائے کہ شیش ٹھنک کھج خاندان اور مسجد کے زیر زمین آپ کی اقامت کا ہیں۔ عبادت خانے اور بزرگوں کے محرابات ہیں۔ تاہم یقیناً اپنے ارادوں کے ذریعہ بدل دیتے۔ فضیلت مآب سید بابا سے ہم اپنے انجانے میں سرزد ہونے والے اقدامات کے لئے حضور رحم کے طلبگار ہیں۔۔۔ اس موقع پہ ہم غم سادہ کرتے ہیں کہ ہر وہ تعمیر و تباہی جس سے ترک ہو جس کی نشت ندی ہمارے عظیم القدر سید بابا نے فرمائی اور ہر اس کارروائی و سرگرمی کی منافی ہے جس

تہ ہمارے قابلِ عزت و احترام ہمایوں اور محسنوں کو کسی بھی طور کوئی راک و زحمت پہنچنے کا احتمال ہو۔
بادشاہ نے بنفسِ نفیس منتقل طوائفِ خوشنوی میں بھرے ہوئے زمرہ والے فیضانِ پوری فیروزے۔
حقِ یحییٰ کی بھٹی سی تسبیحِ حسندل اگر کارواہ۔ کشمیری زعفرانِ محمود و خیر کے بطور اور خاص طور پہ ایک ننھا سا
حقِ مصحفِ پاک جو آپ زرت سے زہنت تھا نذر گزرا۔ سید بابا نے خوشدلی سے التفات کرتے ہوئے بادشاہ
کے جذبات کو سراہا اور کہلوایا۔

”مسجد اور مکتب خانے کے زیریں تہاؤں کو توڑک دیا جائے۔ جن جگہوں کو نقصان پہنچا ان کی
مطرِ غوامت کرائی جاوے۔ جنوب مغربی ہاتھی تھکے کے پیچے والی کھدائی کو چنے کی ملانی منی اور
بھروسے سے بھرائی کی جاوے یہاں تک کہ اس کی لائٹ اوپر فیل ہارے کی دیوڑھی کے فرش سے جا گے۔
آبی کی تمام تعمیرات بحال رکھی جاسکتی ہیں۔ اور آئندہ کے لئے یقین ہے کہ ہمارے مابین
کیک نوٹھ اور لاٹھائی زوارہ بن گئی۔ ہمارے جو بھی امرِ ارفاش ہوئے زیرِ زمین جو پھنک دیکھا پایا گیا۔ بشمول
پہاڑت و مٹھنہ اور ناٹو طور سینہ راز میں رہے گی اور تہی آئندہ ہم سے رہا و رسم کی کوئی ضرورت پیدا کی
ہوئی۔ اور ہم بھی اس امر کا اعادہ کرتے ہیں کہ ہماری رعایا میں ایک خواہشیں اور خواہشیں آئی جہاں کے
ان اور رعایا کی کوئی اور بات نہ ہو۔“

شاہِ جہاں کمالِ مقامات و عقیدت سے مراد اے سید بابا کا فرمودہ سن رہا تھا۔ سپید کی کھانسی تابیانی کی
ات تک پہنچی تھی۔ اب بولی دم جاتا تھا کہ عروسِ شہنشی کا نہیں جھٹک کر سیدھی ماٹھ کی سینہ دہری افشاں کی
جھٹک پر سنا بکھیر دے۔ جہاں وہ بھی پہنچا پہنچا ہے۔ چشتیہ کی بان بستیوں کے لئے زیرِ زمین
مردوں میں اتر جانا ان کی مجبوریِ شہری تھی۔ وقت کی قلت اور سنے کی اس نیکی کا احساس بادشاہ کے پیشِ نظر
گرا۔ چند ساعتوں کے سکوت کے ساتھ ہی وہ ٹلنس ہوا۔

”میرا منہ نفس یہ درخواست پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے کہ خیر و برکت کے لئے گاہے گاہے آپ
سے اور حضرت سیدِ بھائی بابا رحمتِ علیہ کے حزارِ اقدس کی زیارت اور نگہِ پوشی کی سعادت باہارت نصیب
ہوئے۔“

سید بابا نے اپنے خادموں کو اذنِ رخصت دیتے ہوئے کہلوایا۔
مکتب خانہ کی کسی گھڑی کی ٹنگی لائٹ کے نیچے ایک فجرِ روزن ہے اس کے ساتھ جگ سیاہ کی لائٹ
سے اجری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ سرکارِ سید بھائی بابا کی تربت کا تعویذ بین اس کے نیچے ہے۔ اس
تیم پہ پہنچنے والا سرکار کے زورِ ہوتا ہے اور فجرِ روزن کے اندر گلِ شبِ دم کے پھول پتے شبنمیں رکھنا

بابا سرکار کی خوشنودی کا موجب ہو گا۔“

نسی کو بھی ایک حد تک بڑھایا جاسکتا ہے مگر بات کے بڑھانے پھیلانے کی کوئی حد نہیں ہوتی۔
 وہاں تک پہنچی تھی کہ میں شاہی محلے میں جتنا بائی جہل پوری کی حویلی کی سرنگ میں آگے بڑھتا ہوں
 تو میرا دل طبلوں سے چڑتا ہے۔ جن کی معیت میں میں ایک ایسی جگہ پہنچتا ہوں جہاں ایک چھوٹا سا حوض
 واقع ہوتا ہے۔ میرے رہبر بزرگ بونے کے مطابق یہ مزار سید بابا کا ہے۔ میں یہاں فاتحہ پڑھتا ہوں۔
 نیکیں ذرا پڑے جت کر ایک اور نمایاں مزار دکھائی دیتا ہے۔ میں وہاں پہنچتا ہوں اور فاتحہ پڑھنے کے
 ساتھ اٹھتا ہوں تو میری جیرانی دو چند ہو جاتی ہے کہ مزار کے تین اوپر کھلے گنبد کے غلام میں بھونکنے
 پرکا دڑوں کی سی منگوں آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ میں مستحضر سا غم میں فاتحہ و اتحہ سب کچھ بھول ہوں
 اوپر غلام میں ٹھونسنے لگتا ہوں۔ مسلسل ناگوار کریرہ آوازوں سے طبیعت میں کرب و جھج سی آتی ہے۔ کچھ
 پاکیں زورانی جانا مول اور حالت پر بارگزر رہی ہوئی ایسی آوازیں؟ میں سوچنے لگتا ہوں جو ممکن ہے گنبد کے
 اوپر پرکا دڑاؤں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں جن کی جی ٹانگیں آوازوں کے ایسی سحر و شہرہ کی آواز کی ہے۔
 میری سب سے پہلی اور زیادہ پاؤں پہنچے حرکت ایک بڑے بڑے جانا پیر صاحب ہی تو اسے اسے گونے میں
 ہوئی تھی سی زورانی آوازیں جس کو میں نے غیر ارادی طور پر پوچھ لیا۔

”یہ کون کونہوں کی آوازیں کہیں سے آ رہی تھیں۔ یہ کون سی جگہ ہے؟“
 بزرگ بونے نے قد کے ساتھ اشارہ کیا۔
 یہ کونسی پرکا دڑوں کی نہیں انسانی آوازیں ہیں اور یہ جگہ جہاں آپ موجود ہیں قلعہ کی بخشی گھر
 کے تین پہلے واقع ہے۔“

”قلعہ کی بخشی گھر کی تین پہلے۔“ میں نے دیکھ کر انداز میں ابرو اٹھائی۔ ”میرے تین پہلے کھڑا
 اگر واقعی آپ بخشی گھر کی ہے اور یہ جانوروں کی نہیں انسانی آوازیں ہیں تو یہاں آگئی کیسے ہیں؟“
 ”اے! یہ بھی جب دماغ کوئی جواب دینے سے قاصر ہوا تو اچھا کھ پھر پوچھا۔“
 ”یہ جگہ اوپر بخشی گھر کی سے بہت نیچے ہوگی؟“
 ”کوئی ڈیرہ فرسنگ.....“

بزرگ بونے نے جواب دے کر مجھے اچھنجے کے گہرے کنویں میں دھکیل دیا تھا۔ میں اپنے دماغ کی
 اکھڑی چولیس دھاتے ہوئے پھر پوچھ بیٹھا۔

گھر میں دکھائی دے رہا تھا کہ وہ مختلف خانوں سے کراکری ٹھکری نکال رہا ہے جیسے وہ یہاں کی ہر چیز سے رشتہ ہوا کی گھر میں رہتا ہو۔ اب میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب کھانا پینا میرے سامنے تپائی پہ سجا چکا تھا۔ میں حیرانگی سے اسے کبھی کھانے اور کبھی اس کی مصمصوی اداؤں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ سب کچھ کر کے وہ خوش خوش میرے پاؤں میں بیٹھ گیا۔ اب شاید وہ میرے کسی اشارے حکم کا منتظر تھا۔

اوں سے نکلے ہوئے تازہ تازہ دیز سے پہ بڑی پڑا شہنا بہار نکلی ہوتی ہے۔ پیٹ بھر اہو یا خالی اسے دیکھتے ہی آنکھوں میں قل خوالہ کا درد شروع ہو جاتا ہے۔ رشتوں پھر اور رونی کی خمیری مہک نے اک قیامت اٹھائی ہوئی ہے۔ میری آنکھوں ہاتھوں اور منہ کی زو میں رکھا ہوا چیز اب میرے لئے ناقابل برداشت ہو چکا۔ میں نے مصنوعی سے خفیہ انداز میں دہاتے ہوئے کہا۔

”اب مجھے کھانا دے یا اسے عمارت کر کے دوست بن میں چیتے کا ادا دے؟“

دو بڑا ایا ہوا لٹی کی کہتے ہوئے بیڑا کاٹنے لگا۔ اک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ لے کے جب وہ میرے منہ کے قریب آیا تو میں نے آنکھیں میچتے ہوئے منہ میں کھول دیا جیسے کوئی چپہاں کے ہاتھوں آکر چلیے وقت منہ کھلا ہے۔ لٹی میں منہ میں رکھے بیڑے کے ٹکڑے کو منہ میں رکھ رہا تھا اور وہ پوچھ رہا تھا۔

UrduPhoto.com

اس قبلے کچھ ایسی مکی سکھ سی مصمصیت سے پوچھا کہ مجھے سر کے کیس اور رازمی دھڑکے والی کھائی سی دے گی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے کوئی جواب دینے کی بجائے شخص اگات میں سر ہا دیا تھا۔ میں یا اس کی مصمصیت سے متاثر ہوتا ہوا لٹی میں بیٹھ گیا۔ یہ لٹی وہی تھی جہاں اس دہانت و فطانت سے لٹی پڑھے کھے کی بھر اسیت کا شانہ نہ ہو۔ اٹھی کڑی مافی ایسا گل نو جوانی بھر کر دیکھ لو تو آنکھیں کھلا کر سیدہ سندل سے بھر جائیں۔ ایسا جوان رہنا چکی سا بھی کہیں دکھائی دے جائے تو پھر کسی کوئی جان سے ہٹے کی نوبت نہ آئے۔ لٹی کی ایسا تنگی ایسی شیریں اور مرمری کہ سماعت کے گھن میں پڑتے ہی بتاتے ہیں پچھال دے۔

غوب مسورتی اور غوب سیرتی جو اگر آپس میں ایک خاص ترکیب سے بھگی ہو جائیں تو طعس کا مل سہ پہ پناہ کا روپ دھار لیتی ہیں۔ آپ اسے ٹس سدا رنگ ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہ بچپن میں ایک آتھ جوانی میں آتھ اور بڑھاپے میں س آتھ۔ جیسے پتھو اکٹرا اور ششیر لڑاں۔

ادھر میں ان تینوں کھاؤں کھاؤں کا مات کھایا ہوا۔ جو دوزخ کے پہلے تین ذرواروں کے ذمہ سہ کر کے اس کے لئے آگے کے عذاب عذاب نہیں گھزار عذاب و گلاب سے ہوتے ہیں۔

جی۔ انسان تو انسان جانوروں تک شکم سیر ہو کر رکھاتے ہیں۔ جانوروں میں بظاہر دکھائی دینے والوں کی تعداد اتنی نہیں جتنی کہ نظر نہ آنے والوں کی ہوتی ہے۔ اللہ کے بندے جنہیں یہ لذت تو اضع ذوق رزاقیٰ تو اقل میزبانی و لذت ہوا یا انفرادی خصوصیتیں و تمیزات جس و پاک ان سب کے لئے انظر کا اہتمام کرتے ہیں۔

اجمیر شریف حضرت خواجہ معین الدین چشتی غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی چوگت اقدس پہ حاضری دینے والوں کے مشاہدے میں آیا ہوگا کہ وہاں گلی بازاروں میں دیگر جانوروں کے علاوہ خنزیر بھی ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہندوستان میں خنزیر بندر مانپ ہاتھی وغیرہ کچھ زیادہ ہی ہیں۔ حضرت ایشیائی یا علاقائی و جوہات کے علاوہ یہ گگ کہ وہاں ان جانوروں کی کچھ ماورائی حیثیت بھی تسلیم کی جاتی ہے۔ دیوتا سامان سمجھ کر ان کی پوجا ہوتی ہے۔ وہاں ہندو مسلمان سبھی عیسائی سب کے لئے یہ روزِ مہ کے جانور ہیں۔ انہیں کچھ کرناک بھول نہیں چڑھایا جاتا۔ یہی ان کی موجودگی اکثریت کسی کے لئے سہا بن کر رہا ہے۔

اجمیر شریف میں زائرین کا اکثر ان سے سامنا رہتا ہے جس سے طبیعت میں تبدیلی آجاتا ہے۔ یہ حال کر لے لگتا ہے۔ ہمارے احترام و حقیت خواجہ غریب نوازؒ کوئی طرف پریشان نہ ہوا۔ انہیں ان کی ایک کروڑوں سال کی عبادت کے لئے یہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ انہیں یہاں رکھ کر ان کے چائے پر کھجوریں، سواریوں، گالیوں میں لوگ لوگ کرتے دکھائی پڑتے ہیں۔ اب اس بار ایک سی بات کو سمجھنا چاہنا کہ اس کی بات بھی کرنا ہے۔ بے شمار خنزیر تو ہیں ہی ایسے جانور جنہیں ہم تو اپنے سے انسانوں کو بھی کہہ سکتے ہیں۔ انہیں ان کے لئے مشرک کہتے ہوئے مطلق نہیں کرتے۔

لہذا اگر وہ خدا کے عظیم و بڑھتی ہوئی جو خاک و خاکوش ہا کھ بھری۔ اگر وہ مسلمان انہیں و پاک اس کی تفریق و تمیز کیے بغیر سب کو رزق پر پہنچاتا ہے اور خوب پہنچاتا ہے۔ انسان کی سمجھ اور ادراک اور اس کے خلاف ہے۔ تو تو چند ایک نام لہا انہیں اور کچھ گائے، بکریوں، مرغیوں، سوروں کے علاوہ سب جاندار اس کے واسطے ہی مریں۔

حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے انتہائی عقیدت مندوں میں غفل معظم علیہ الدین اکبر کا نام بھی لہا یا ہے۔ کہ حضرت خواجہ سیم چشتیؒ سے اسے ایک نسبت خاص تھی لیکن وہ اس حقیقت سے بھی خوب واقف تھا کہ اگر غریب نوازؒ کی چوگت فیض ہار کو چوسے بلکہ کسی دلی کا تعریف خاص نہ مل سکتا تھا۔ اسے حضرت غلام الدین چشتیؒ، قطب القطب خواجہ غیاث الدین، حضرت حمی بخاری داتا گنج بخش سے ملے گی و الہامانہ حلیت تھی۔ وہ جہاں کہیں سے گزرتا پہنچتا اللہ کے ولیوں کے آستانوں مزاروں پہ حاضری ضرور دیتا۔

پھولوں کی چادر میں انگلیوں کی لڑیاں سونے کے ٹکسے سبک مرمی کو میں نقد نذرانے پیش کرتا۔۔۔ چاہے سدا
باؤ لیاں لنگر خانے مسافر خانے تعمیر کر دے۔۔۔ یہ اس کا شوق بھی تھا اور اولیاء اللہ سے خاص عقیدت و انسیت
کا عاجزانہ اظہار بھی۔

دروگاہ خواجہ غریب نواز میں لنگر کی تیاری کے لئے دنیا کی سب سے بڑی دیگ کی تعمیر بھی ایک مسافر
کی اولیاء اور رعایا سے عقیدت و محبت کا ایک اظہار ہی تو تھا۔۔۔ اس منجھاتی سینکڑوں من اجناس سے بھرا
ہونے والی دیگ کے لنگر سے ہزاروں غریب ہمارے خاندانوں کا پیٹ بھرتا تھا۔۔۔ اور آج تک یہی سلسلہ چلا
آ رہا ہے۔ اکبری دور پر شکوہ ہے اس دور پر آشوب تک شاید لاکھوں بار یہ تعمیر دیگ چڑھی ہوگی۔ کئی آنی کی
نسلیں اس کے لنگر سے مستفید ہوتی رہیں اور ہوتی رہیں گی۔ بادشاہوں کے ہاں تو کمی نہ تھی ان کے لئے
کا پیٹ بھرتا کچھ مشکل بھی نہ تھا۔ لیکن عام انسانوں کے لئے یہ ممکن نہ تھا۔ راجستان کے اس بے آب و گیاہ
علاقے میں زندگی چنداں آسمان نہ تھی۔ وسائل کی کمی غربت افلاس کے سبب یہ رنگے شرلوں مٹھنوں جنوں کی فضا
پڑی رہتی۔ ہفتا کی حیوان آج نہ پرند غنیمت پاک سب اس پر چلتی ہی نظریں ڈال کر گزر جاتے۔ یہ تعمیر
کوئی بڑا کام نہیں سستہ پہنچا۔ ہزاروں کا صرف خرچہ تھا اسے جسے پہنچاتا تھا۔ کوسوں دور
کاؤں کاٹوں کا یہ کام تھا۔ اس کے بعد یہ دیگ ہزاروں سالوں سے لگاتار چلتی آ رہی ہے۔
واسطے کچھ ایسا ہی ہوا ہو گا۔

کمال خیر کے تمام ہے کہ مجھ ایسے کنگھے لنگر سے کو بھی جس نے تمام حیاتیات تک تاک کر چوری کر لی
اور پھر نہ سمجھتی اسے ہی کام چلایا ہے۔ ایک تکیے چند مرتبہ آگ دہکائے کی تو بقیہ سب آگ
یہاں درگاہ شریف کے خاص لوگ ہیں جو اس کے تمام سامان اجناس منگائی پکانی اور پھر تقسیم کرنے تک درگاہ
کا دروازی کے قریب رہتے ہیں۔ ایک منزل اوپر گڑھی اس دھاتی مہان رنگ کے پیچے آگے دھکے لگاتے
لگے تین ڈر ہیں۔ منگائی کے بعد اس میں آگ سے زیادہ پانی ڈال دیا جاتا ہے۔ منوں کے حساب سے پانی
گھڑی پیٹنگ کر آگ دکھا دی جاتی ہے۔ جب پانی خوب ابلے لینے شروع ہوتا ہے تو پھر چاولوں کی برہم
کے منہ کھول دیے جاتے ہیں۔ دھاتی جگوالی چٹائی اور منگائی۔ لنگر پھر رواج ایسی سب اندازہ کوئی مسافر
ناپ اور تول۔ چاولوں کے بعد پوریوں کے حساب لنگر یا پختی۔ اسی طرح منگ مہو جات کی ہر پختی
کے کشتہ میں کے کشتہ کو سفران کے پچے رونا کیوڑا کے منہ ترپنے کے سر جان سیروں کے حساب سے لگتی
توٹ سونف کشمش اور خشک آلو بخارے وغیرہ۔ پوری رات یہ دیگ اللہ کی حکمت اور خواجہ غریب نواز
برکت سے چلتی رہتی ہے۔ فجر کی نماز کے بعد دعا فاتحہ اور پھر لنگر کی تقسیم شروع ہو جاتی ہے۔۔۔ پاؤں سے۔

آئیے تک مخصوص لباس پہنے کارکن سر بھی نکا کر دیگ کے اندر اتر جاتے ہیں۔ نئے کنویں کے کارے کی طرف ہاتھیاں بھر بھر کر لنگر لگا جاتا ہے۔ ہاتھ ہاتھ بھر لگی اور پتھر رہا ہوتا ہے۔ نہ کوئی بندہ اور نہ کوئی بندہ۔ نہ یہ زردہ اور نہ یہ پلاؤ۔ قہقہے بھی نہیں کھیر یا علوا بھی نہیں کہہ سکتے۔ مگر کچھ تو ہے جس کی ہمدردی ہے۔ بس خواجہ بیاضا کا لنگر ہے۔ لذیذ زردہ، شمشاد، خوش تر کوئی لنگر پتھر اور نہ کوئی چٹا سیپا، گستر ہاتھوں میں لٹکے ہاتھیاں مٹھیلے بھر سے جا رہے ہیں۔ قرب و دور اور دور اور جہاں جہاں تک ایک ذرا خون کی سہافت تک پہنچا جاسکتا ہے لے جایا جاتا ہے۔ اندرون صحرا غریب مفلس لوگ اس لنگر کو اونٹ کی کھال پر بٹ کر بچھیلے دیتے ہیں۔ سوکھ جانے پر یہ لنگر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تنگی کی دلوں میں یہ لنگر ان لوگوں کے لئے اک نعمت غیر مترقبہ کا درجہ رکھتی ہے۔

جب مجھے کبھی اس ایک بکے سلسلہ میں سعادت نصیب ہوتی ہے تو انہی پرانی سے تقسیم تک اوپر کوٹھے پر ایک ایک لوح کا جائزہ لیتا رہتا ہوں۔ انتظامیہ کے لوگ اپنے کام میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔ لہذا جس زمانہ ہاتھ بھر محض ہتھکیں کھانے دیکھتا رہتا ہوں۔ ایک بات بتانا بھول گیا تھا اس ساری سلسلہ سے پہلے درگاہ شریف کے کسی مستند چاہو سے سلسلہ میں پہنچنے والے لوگوں سے مراد صحرائے عرب میں چھاپا ہوا ایک دور کا شریف تھا۔ ان لوگوں میں چاروں جہاں اور انتظامیہ کے اہلکار اپنے جگہ جگہ پر سرکارت کی سرکارت تھی۔ گو وقت زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کے الطوار و احوال میں بھی خاطر خواہ تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں لیکن مجاہدت کے معاملہ میں ان کی قد امت پسندی میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اپنی اپنی جگہ کے استحکام کے لئے ان کے ہر سانچہ میں بھی جیڑی لگتی ہے۔ ان کے لئے لڑائیوں بھڑائیوں بھی ہوتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ نشتہ القدر سر پہ چڑھ کر یوں ہے۔ چاہے وہ کوئی درگاہ خانقاہ ہی کیوں نہ ہو۔ جبکہ ان لوگوں میں بڑے بڑے جید عالم فقہاء، سکالری، ایجوکایڈی، ڈاکٹر، قانون دان، سیاست دان اور تجارت پیشہ لوگ بھی موجود ہیں۔

ان مجاہد بزرگوں میں ایک قانون دان سید صاحب سے بھی میری یاد اللہ ہے۔ نہایت مخلص و جید اور شریف انسان ہیں۔ گو مجاہد کی نوبت ان میں بھی پائی جاتی ہے مگر مقبولی۔ میرا قیام و طعام کا انتظام ان ہی کے ہاں ہوتا ہے۔ دین و دنیا دونوں چلتے ہیں جہاں ہمارے درمیان سیاسی، ادبی اور عالمی امور بحث مباحثے، چمڑے ہوتے ہیں وہاں دینی، روحانی معاملات پر بھی سیر حاصل کشتکار رہتی ہے۔ مجھے وہ عرصہ خاص ذمہ فائقہ چرائی جی، فضل کشانی، شمس سہرائی، پوٹی کے اوقات میں شامل رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لنگر کے معاملہ میں بھی مجھے ان کی سرپرستی حاصل رہتی ہے۔ اس صورت میں وہ بھی شب بھر میرے

ساتھ نیم بیدار رہتے ہیں اور اپنی چارپائی پہ لیٹے لیٹے ٹکرائی کرتے رہتے ہیں۔

پرائی بات ہے کہ ایک مرتبہ جب فکر کی تقسیم کے بعد منائی والے کارکن لمبے لمبے ریش لیے نیچے پائے میں گرے پڑے۔ فکر کے کچھ کو صاف کر رہے تھے تو میں نے پوچھ لیا۔

”سینڈ صاحب! آپ دیکھ رہے ہیں یہ منظر۔ یہ انداز اور تہن مو انسانوں کا فکر۔ جس پر کسے زور کثیر طرف ہوا ہے، کس بے ذراہی اور بے خرمی سے پاؤں تلے نہ وگدا جا رہا ہے، کچھ غلاظت کی طرف سے باہر مودیوں نالیوں میں دھکیلا جا رہا ہے۔ کیا یہ فکر یا رزق کی بے خرمی نہیں؟“

انہوں نے میری بات شکایت یا سوال سن کر کوئی جواب تو نہ دیا البتہ بھاری بھاری پچوٹوں والے سر پر آنکھیں میچ سی لی تھیں۔ ”نہیہ ہو، دوسرا وجہ، پانچویں کی جھونک میں کھسک اتر گئے ہوں۔ اچھے خاصے کے ہمارے درمیان خاموشی کے سرک گئے تھے۔ میں اپنے تئیں شرمندہ سا کہ خواہ مخواہ بات کر کے گنوائی کہ جواب نہ دے۔ اچانک سوچ ڈر آتی ہو سکتا ہے رات بچنے کی مشقت سے سنی ان سنی کر گئے ہوں۔ جب ادھر ادھر سے نیچے نیر صیانت ایک جگہ آکر پہن کر چیز کی صفائی ہو گئی تو میں بابا نے ایک بھر پور لکھائی توڑتے ہوئے چارپائی چھوڑ دی۔ فکر میں مبتلا رہا۔“

”ہاں۔“

ہم بچھڑانے کے دامن سے بے باک نظر کر جاتی وزیر دیکھ کر ہنسنے لگے۔ میں نے ہنسنے لگے۔

”ادھر دیکھو۔“ انہوں نے مجھے باہر سامنے درگاہ سے لٹنے والی نموریوں کی طرف متوجہ کر دیا۔ آخر نموریوں کے چورے کم قہیے نموریوں نالیوں میں گھسے ہوئے کھاپی رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ

”دوسریاں آنکھیں پھانے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایسے خوش اور گویا کی خاص دعوت طعام میں مدعو ہوں۔ اللہ مالک و رزق کی جھٹکوں پر قربان چاہیے کہ ہر انسانی جان کی فطرت ضرورت کے تحت اس کو رزق خود بخود

پہنچانا اس کی شان ہے۔ اس لئے کہ وہ رزق و مالک ہے اور اترین رزق ہم پہنچانے والا ہے۔ حکمت و قدرت کہ ایک جاندار کی خوراک دوسرے کے لئے بالکل ہی مختلف۔ کھوڑا گوشت نہیں کھ سکتا۔

شیر گھاس نہیں کھاتا۔ حرام و حلال اور پلید و پاک کے پھر سے نکل کر اکرات کریں تو ایک جاندار کے لئے ایک خوراک پاک اور حلال ہے لیکن دوسرے کے لئے وہی حرام و نجس بن جاتی ہے۔ کائنات کو تو علیحدہ و علیحدہ

صرف اس اپنے کرۂ ارض پہ پھیلے ہوئے پہموں کھریوں آریوں جانداروں کو دیکھیں تو حیران ہوں ان کی
 تخلیق جسامتیں قد امتیں الگ الگ۔ اسی طرح ان کی غذاؤں پہ ہی غور کریں تو انسانی عقل و ہمتش و ملک و
 ہمتی ہے۔ اثر دھار زندہ سالم بارہ سنگ سینگوں سمیت نکل جاتا ہے اور ہضم کر کے دوسری جانب سے باہر
 نکال دیتا ہے۔ سمندری وکیل ہر وہ شے ہڑپ کر جاتی ہے جو اس کے جڑوں میں سما جائے۔ چوہے کٹر کٹر
 حوصلے کھا جاتے ہیں۔ ان چوہوں کو سانپ نکل لیتے ہیں پھر ان کھیلے سانبھوں کو تھنی گردنوں والے بازو شکرے
 ایک لیتے ہیں طاؤس اور مار خور و کار جاتے ہیں۔ مرغی لٹا اور دیگر حلال جانور ہر نہیں پاک چیز پہ منہ رکھ
 دیتے ہیں۔ انہی جانوروں پہ پھر بندہ اپنے دانت تیز کر لیتے ہیں۔ انسان کی مانند گھایا پاک نکالا نہیں۔
 اسی حجاست ایک پتھر کاٹ کر پھر پاکیزہ ہو جاتی ہے۔ انسانی جسم کے اندر کئی کئی میل طویل آغواں اور یہ وہ
 رگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ بچھا ہوا سلسلہ جس کے کھربوں خلیوں میں مایا جوں اور لاکھوں بالوں کی جڑوں میں
 سرخ اور نیلے رنگ کی گھمبی ہوئی خون کی لائیں۔ ناک کان پیشانی اور معدے کی بالیوں سے چمٹے ہوئے
 کھلے سرخ منہوں والے کینروں کے ٹھنوں کے گھٹے۔ آلائشیں معدے کی گندگی لٹا کے منہ میں بھرا بیٹاب
 رگ کا فتور نہتے کاجور۔ نگاہ کی کئی انشاق کی ہڈی۔ اور یہ لاکھ ہزاروں متغیر رنگ۔ کہاں کہاں
 کس کس سانپ کا جھنڈا ہے۔ کس کس کچھڑی کا پتھر ہے۔ کس کس کھجور کا پتھر ہے۔ کس کس کھجور کا پتھر ہے۔

UrduPhoto.com

معلوم ہوا کہ صاحب کو نہایت سوچ بچار کرم اور راضی رہنا رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ صاحب پر ہوا اور کو کوئی
 کیفیتوں میں ہی مانتیں نکلتی ہیں۔ تمام حیات کو آسان جی سے سمجھتا ہوتا ہے۔ وہ سورت کی منزلوں پہ
 غور کرے۔ چیت بھی پر وہ ہوتا ہے۔ جب تک یہ سمجھ نہیں سکتا کہ یہ کونسا کونسا ہے۔

میں اور خور و خور میں بیڑا بیڑا کرتے خزیروں کئی کئی تھنوں والی خزیروں اور خضے خضے
 تھنوں والی ڈوموں والے لاکھ اور خزیروں کو گدھا صاف کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ سید صاحب نے کانا کانا کر
 کھانے کے استہاک میں کھنڈت ڈالتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

”خان صاحب! اللہ صرف پہلوں بکروں کا ہی نہیں سورتوں کتاؤں کا بھی رازقی و مالک ہے۔ خوب
 غریب نواز کا کٹر بھی ہر خاص و عام کے لئے ہوتا ہے۔ جو ہوتا ہے اسے جی ملتا ہے اور جو نہیں ملتا پاتا ہے جی
 کچھ ہوتا ہے۔ جس کسی کے ساتھ پیٹ لگا ہے اس کا بھینا کوئی رازق بھی ہے۔ جو رازق رازق پہنچاتا ہے
 کھانے کے لئے۔ اور وہ پیٹ کس کا ہے وہ اس کی کالنی ذات پات گدھب اور اچھالی برائی نہیں دیکھتا۔ اب
 جہاں کتاؤں بلیوں اور دیگر کینروں کھوروں کو پھرتے سچی والا تھن قابو میں رکھ کر تو نہیں کھلایا جاسکتا اور نہ ہی

وہ چار پائے ہم دو پائیوں کے ساتھ اندر پہنچ کر کھاسکتے ہیں۔ اب یہی راستہ ہے کہ ان کا لشکر پانی اُن کی ہاتھ پیر پیچھے تاکہ وہ اپنے اپنے طور طریقوں کے مطابق حکم میر ہو کر کھاسکیں۔ ہزاروں انسانوں میں لشکر کی تقسیم آسان کام نہیں۔ احتیاط کا ہر طریقہ استعمال کرنے کے باوجود بھی لشکر پیچھے گری جاتا ہے۔ پاؤں سے آ جاتا ہے۔ جل جاتا ہے سخت اور سیاہ ہو جاتا ہے۔ دیگ اور برتنوں کی صفائی سے ضائع ہوتا تو روزمرہ کی بات ہے۔ بس یہی لشکر چار پائیوں اور کتروں پر غصہ ہوتا ہے جو دھوئیں دھلائی کے پانیوں کے ذریعے ان کے مقامات پہنچ جاتا ہے۔ دیکھا آپ نے رازقی کس حکمت و خوبی سے انہی سے مخلوق تک اُن کا رزق پہنچاتا ہے! باقی رہی بات انہیں دیکھ کر طبیعت کے ملید نے کی اُن کے غصہ و ناپاک اور اس کے ٹم کے حرام ہونے کی قرینہ اللہ کی رضا و عطا اور تقسیم و تفریق کے عہد ہیں کہ وہ جسے چاہے جو بھی دے اور جیسا چاہے ویسا بنا دے۔

کچھ دیر توقف فرمانے کے بعد سرگوشی کے گڑا میں گویا ہوتے ہیں۔

”خان صاحب! اگر مجھے اور آپ کو ایسا چار پایہ بنا دیا جاتا تو کیا ہم اس کا شکر ادا اور شہنشاہ بیان کرنے والوں میں سے ہوتے؟“

میں نے اس سے پاؤں تک رد کردیا۔ ایک لمحہ کے بعد انہوں نے کسی ادا کے لیے ہاتھ دیکھے ہیں۔

قد رے تقوت علیٰ قدری۔ اس پر ادا کے لیے ہاتھ دیکھے ہیں۔

حق کہ وہی لاشعیر ہے بہت۔ یکتا داخلی ہے جو شر سے شر اور غیر سے شر نکالتا ہے۔ وہی ہے جو بات کو ہر سر اور روشنی کو تاریکی میں ڈالتا ہے۔ جس نے ہر شے کی تخلیق میں کوئی نہ کوئی مسلمات و مفادیت چھپا رکھی ہے جسے انسان اپنی بشری حیول کے لیے بنانا چاہتا ہے۔

میری ماں نے قیدنا مجھے اپنے ہاتھوں سے کھلایا یا ہے۔ تیرے خوار ہونے اپنی ماں کا نتائج ہوتا ہے۔

بب بھی اپنے ہاتھ سے کھانے پینے پر قدرت حاصل کر لیتا ہے تو کچھ کسی دوسرے کے ہاتھوں کھانا پینا نہیں کرتا۔ اس سے شاید اس کی کئی خود مختاری یا آخری ہی رہا بھروسہ ہوتی ہے۔ لیکن دیکھ گیا ہے کہ تیرے خوار ہونے کی مانند کچھ کچھ کئی خوار ہونے سے بھی بعد خوارت اور عشت دوسرے کے ہاتھوں کھانے پینا ہوتے ہیں۔ علاوہ انہیں چند ایک دیگر خورقوں میں بھی دے دے کے ہاتھوں کھانے پینے کا انوکھا نمونہ ایک ایک نمونہ ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی محبوب، معشوق کئی نوبی یا کئی کوئی بی و مرشد و نصیر۔ مگر اس وقت میرے ساتھ ہو رہا ہے جسمانی معذوری یا معشتی و دل کوئی جلت نہیں تھی۔ بس اس سیکھنے نے اپنے ذہن آئینوں اور خاموش زبان سے یوں ہی مجھے اپنے ہاتھ سے کھلائے کا کہہ دیا اور میرے منت سے بھی خیر ارادہ طور پر یہ جان نکل گیا۔ جس کا خمیازہ اب بھی بھگت رہا تھا۔

وہ اپنے بحرِ بحر سے باتھوں سے تھکی تھکی بڑکیاں کچھ اس انداز سے میرے مُنہ میں رکھ رہا تھا جیسے کوئی پینہ و بے بے پردہ میں سے پلٹنے والے اپنے اکلوتے پُت کو بڑے چاہ چاؤ سے دیکھی گئی کششِ شکر اور حمیری خمیری رونی کا لمبہ دینا کر کھلاتی ہے۔ سرورِ سوادِ لذتِ خلوصِ خواہش و قوتی 'خواہوں' خوشبوؤں کا تعلق اگر محض لذتِ حسیوں اور نسیبوں سے ہی ہوتا تو شاید یہ دنیا بڑی کریمہ النظر اور ناقابلِ برداشت ہوتی۔ کمالِ حیرت و صدق کہ قدرت و فطرت ایسی کوتاہ نظر و فکر نہ تھیری ورنہ مذہبی جنوینے کو ہر نظر اپنے علاوہ کسی اور کو دیکھنے تک لینے کے بھی تر وادار نہ مگروا دیتے۔

بے غیر! صابرا! سنگھ.....!

[illegible]

اور تیرے دادا سے کام چاہا تھا، تیرا بھائی کی شہین ہو گا۔“

”ہاں، جی، میرے دادا سے (اماں) بھگتیہ، بھگتیہ ہی تھا۔ پر تہانوں کیہو میں پتہ لگا اے؟“

سلطنتوں اور پنخانوں میں کئی کئی نام ایسے سننے کو ملتے ہیں کہ سننے والا اشتداد سہارہ جاتا ہے۔ وہ وقت دوستوں میں سوچنے کا سفر شروع کر دیتا ہے کہ نام تجویز کرنے والا کیسا پالیدہ فکر لطیف طبعیت ہو گا۔ سوچے وہ کسی قدر بڑے مزارع خراج اور بڑے عزم ہو گا۔ میرے جاسنے والوں پشاور لی اور انسانی پنخانوں میں چند نام مجھے بڑا اظہار دیتے ہیں۔ مسعود خان اور یاخان، بانو خان، شیر خان، آؤدہ خان، وغیرہ۔ اب ذرا لطیف قسم کے نام ملاحظہ فرمائیں۔ دلہر خان، صنوبر خان، اور یاخت خان، طور خم خان، زر گل خان، بلبل خان، نوشیز خان،

کاہل خان زور تاش خان، میو خان اور شہر خان..... ہمت خان، زور آدر خان، بادشاہ خان، خطر خان، بیٹ خان، استنبول خان، کڑا کے خان، شتر خان وغیرہ وغیرہ۔

سنگھوں میں اقبال سنگھ، امیر سنگھ، شمشیر سنگھ، بیج سنگھ، ہمیش سنگھ، منگل سنگھ، پشاور سنگھ، لاہور سنگھ، خمیر سنگھ، کشمیر سنگھ، زن جیت، من جیت، دل جیت، سوہنا سنگھ، نما نا سنگھ، دل باغ سنگھ..... سوڑا، چو آ، سنگھ، چرک سنگھ، سنگھ، جین سنگھ اور نمین سنگھ بھی ہیں..... میں ایک بھڑ سنگھ سے بھی ملا ہوں..... تلوڈی اور ابدال سنگھ بھی ہیں..... بابا سنگھ، سیاں سنگھ بھی..... سہجان سنگھ اور مکھن سنگھ، کالی سنگھ، کریم اور کریم سنگھ..... میرا خیال ہے کہ سنگھ اور پشمان حضرات ناموں کے معاملہ میں ہوم ورک نہیں کرتے جبکہ اولاد کے معاملہ میں یہ خاصا ہوم ورک کرتے ہیں..... اور نہ ہی یہ بچے کی پیدائش پر کسی سیانے یا نے، مولوی یا کسی گرو گرنتھی سے استفادہ حاصل کرتے ہیں..... ادھر بچے کی آمد ہوئی اور جو بچہ سناٹے، دھانی یا جو دھن داغ میں موجود ہوئی اسی پر نام رکھ دیا۔ ایک پشمان کسی پولیس والے کے ہتھے چڑھ گیا۔

”تجھ کا نام کیا ہے؟“

”معاشر خان.....“ خان نے وہ ٹوک جواب دیا۔

”تجھ سے جانتا ہوں کہ تم بد معاشر ہو۔ اب تم اپنا اصلی نام اور پتہ بولو.....“

”بد معاشر دیکھت.....!“ پشمان نے دھڑلے سے جواب دیا۔

پولیس والا شاید کہہ کر کہے کہ

”میں نے نام پوچھا ہے خان ایسے نہیں۔ شاہاش اپنا صحیح نام بتاؤ کیا کرتے ہو؟ بھی بولو اور باپ کا

نام بھی لکھواؤ۔“

پشمان بولا۔ ”سیا ہی صیب اہم نے اپنا نام کام اور والد صیب کا نام بلکہ دادا جانی کا نام بھی لکھوا دیا ہے

اور بولو؟“

”پولیس والے نے اس کی کلائی پر گرفت کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں بتانے لے جا کر پانچا لگانا پڑے گا پھر تم اپنا نام پتہ بتاؤ گے۔“

”داروغہ صیب! ہم بھوٹ نہیں بولتا ہمارا نام پتہ یہی ہے..... پیدائش کے بعد سے ہم نے اپ

باپ دادا کو یہی کہتے سنا ہے۔ اب بد معاشر اور دھوکا اوشیطانا..... ویسے شاید ہمارا نام مرجان خان ہے۔ کی کی

ہمارا نام نانی ہم کو مر جانے، مر جانے کہہ کر بلاتی تھیں۔ ہم کو ایسا لگتا تھا وہ ہم کو بدعا دیتی تھیں۔ ہم کو مر جانا چھ

ہو ہے سیدہ سمست درست کر کے چل بھی پڑتا ہوں مگر کیا کہنے کہ شاہد رے میں کسی مجمع کو دیکھ کر کھڑے جاتا ہوں۔ بہت ممکن وہیں سے کسی اور جانب نکل جاؤں۔ یاد پڑا تو پھر چل دیئے۔ آگے پھر کہیں بھٹک گئے۔ کوئی واقعہ 'منظر' 'موسم' بندہ بندہ کچھ بھی مجھے کہیں کا کہیں لے جانے لگا۔ عشرے میں بیس سال صدیاں گزر جائیں پتہ ہی نہیں چتا۔ کہاں ہوں کدھر ہوں۔ کیا ہوں؟ کوئی متشدد لے کر چلا تھا یا یونہی جدھر ہوا۔ اڑی ادھر ہی نکل لینے۔ لکھنا کہنا کچھ چاہ رہا ہوں۔ لکھ کچھ اور رہا ہوں۔ کوئی منصوبہ پلان نہ تھا۔ ہوم ورک نام کی چیز کبھی سمجھ میں نہ پڑیں۔ قرینہ 'سلیقہ' اصول طریقہ بندھن بندشیں کبھی راس نہ آئیں۔

میرے کچھ قاری شکوہ سنا بھی رہتے ہیں کہ میں اچھا خاصا چلتے چلتے ہدک جاتا ہوں۔ ایک موضوع سے کئی موضوعات پھوڑوں کی مانند ٹکبا کر نکل آتے ہیں۔ اصل موضوع شرم سے منہ چھپا کر کہیں مٹی پاگے جاتا ہے۔ قاری کے دماغ میں کانٹھیں سی پڑ جاتی ہیں۔ جو اس حمل کے عصباب میں تاؤ، طبیعت میں تبدیلی پیدا ہو جاتا ہے۔ الفاظ ابلق اور قابض ہوتے ہیں۔ مزاج میں شادابی کی بجائے غمور غمور آتے ہیں۔ احباب اشارہ کیا چلے ہیں کہ آپ کے ہاں بیشتر لفظ اجنبی اور کسی نامور یافتہ سیارے کی مخلوق کی مانند ہوتے ہیں۔ گویہ مفلکوں اور کسکس مضمون میں پھولوں کی مانند گندہ جیہا معنوی تعارف کراہتے ہوئے مضمون ہوتے ہیں لیکن پھر بھی قلمچہ پھول سے ملے ہیں۔ ان کے ہاتھ لکھ رہے ہیں کہ آپ اپنی بکسریاں کھانا کھاتے فصول کام سے بھونکے نتیجہ کا براہ نہیں ہوتا۔ کچھ شہر قسم کے صاحب زبان و بیان فرماتے ہیں کہ میں شہر زبان لکھتا ہوں۔ بلکہ کچھ خاصی شہر زبان کا علیہ بکا ذکر رکھ دیتا ہوں۔ اسی قسم کے بہت سے اعتراضات۔ مثلاً میرے مضامین اور کہانیوں میں ایک مضامین کا عنوان غمور ہوگی۔ لکھتے اور لکھنے بغیر تو میں ایک قدم بھی نہیں اٹھاتا۔ لہجہ پریت اور ہنسات کے بغیر بھی میرا گزارہ نہیں۔ اور یہ کہ ہمیشہ کہیں نہ کہیں مل کر رہا ہوتا ہوں۔ فوق الفطرت حالات جیسے میرے فخر ہوتے ہیں۔ ذرا بے فکر بعد اہتمام موجود ہوتے ہیں۔ انیا بھری پڑی ہے انسانوں سے۔ ان کے ساتھ ایسا کچھ پیش کیوں نہیں آتا جو میرے ساتھ پیش آتا ہے۔

ایسا انداز ہی کی بات یہ ہے کہ سبھی کو بود و بان باتوں کا کوئی جواب نہیں پیش کر سکتا۔ سوائے یہ کہتے جو کچھ بھی لکھتے ہوں اس پر میرا کچھ نہیں ہوتا۔ کیا بات دلائل تو شیریں دلوں یا پھر مکانوں فارموس سے ہوتے ہوں گے۔ جو سبھی لکھ سکتا ہوں اور نہ بنا سکتا ہوں۔ کتاب نامہ ولی لکھنے کے لئے تعلیم ٹیڈت لکھتی تو تیں کہانی کردار کرافٹ پیشہ وقت اور حوصلہ وغیرہ چاہئے ہوتے ہیں اور پھر اک ذہن رسائی جو فوٹو ایچینڈیشن کو منظر کی بھر پوریت کا فانیٹ سے سجا سکے۔ حرف و الفاظ کے ایسا ایسے نگینے جیہاٹ کے دے جو

کے نقش کو پڑھائی اور دہلیز پری سے جل تھل کر دیں۔ مذکور بالا کوئی چیز میرے ہاں نہیں پائی جاتی۔ لکھنے اور
 لکھنے کا جو گناہ سرزد ہوتا ہے وہ شاید میرے نصیبوں میں لکھا ہوتا ہے کہ میں از حد کچھ نہیں لکھتا۔ بس مجھے کچھ نہ کچھ
 لکھنے سے غرض ہے تصحیح یا غلط سے نہیں۔۔۔ ویسے سب کچھ صحیح ہی ہوتا ہے کہ جو صحیح ہوتا ہے وہی تو غلط ہوتا ہے۔
 عرب تو عمر و عیار کی زنجیل کی مانند ہوتا ہے۔ اس نے زنجیل میں بڑے بڑے مسالے ڈالے ہوتے ہیں کبھی
 اسے خود بھی یاد نہیں رہتا کہ اس نے اس میں کیا کچھ پھینک رکھا ہے۔ اب وہ موقع پہ موقع یہ بھولے تماشے
 کرتا اور دکھاتا رہتا ہے۔ یہ نکالنا اور دکھانا ہی اس کا اصل کرافٹ ہے۔ بس مجھ تاہنا کے پاس ایک کشتول اور
 یہ بھولائی ہی گدڑی ہے۔ جب کشتول ڈان دکھانا سے بھر جاتا ہے تو میں اسے گدڑی میں الٹ دیتا ہوں اور
 اب گدڑی بھی بھر جاتی ہے تو میں اسے کر بیٹھ جاتا ہوں اور پڑیاں باندھنا شروع کر دیتا ہوں۔ کاشتول کی
 یادیں۔۔۔ اندھا کیا جانے ان میں چھاپا باندھا ہے یا برا۔۔۔ میرا کام نظم کی زنجیل میں تسلیم بھالانا ہے۔ بس!

صاحب مجھ نے حیران و پریشان ہوتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اس کے دل کو گانا نام کیسے
 مانا کیا۔ میں جواب تھا کہ تم جس بڑی گولہ کر رہے ہو اس میں بالکل کچھ تو ہے۔ لیکن میں تو تمہیں
 اس کے آگے پہنچا رہی ہوں۔ بہت کچھ یہ لکھا ہوں۔ اس میں تم اور وہ سوائے پیار کے سوائے کچھ جادو اور مجھے
 سچے ہاتھ سے لکھتے اپنے پیٹ میں اُٹارنے دو۔ تم جس عقیدے و محبت سے مجھے لکھ رہے ہو اس
 سے میری خاطر خواہ سچائی نہ ہو سکتی۔

وہ میری درخواست کی۔ میں میں سے کچھ لکھ کر لے کر آئی۔ وہ ہاتھ دے کر دیکھا اور وہ کھانے والا
 چھن جانے پہ چھن اٹھ نہیں ہوا۔۔۔ منہ سے تو خیر کچھ نہ بولا لیکن ہنسنے سے چاروں طرف سے ہنسنے لگے۔
 میں نے کچھ سوچتے ہوئے اسے مزید چند ایک لقمے کھانے کی اجازت دے دی۔ وہ خوش ہو کر
 مجھے کھانے پہ بٹ گیا۔ اچانک کھانے کھانے کی کسی ٹینفنگل لٹلی سے اس کی بڑی انگلی میرے انگلی
 کے درازت کی زد میں آ گئی۔۔۔ اک گہری سی می کے ساتھ اس نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ یہ سب کچھ ہوں
 اور جیسے کبھی کبھار کھاتے ہوئے اپنی زبان اپنے ہی دانت کے آجاتی ہے۔ میں نے دیکھا اس کی انگلی کی
 پستہ خون رس رہا ہے لیکن وہ بجاے کچھ مترو ہونے کے ٹنگی باندھے بہت آمیزہ نظروں سے میری جانب
 دیکھ رہا تھا۔ میں اس نے زخمی انگلی سے میرے ہونٹ پہ لگا ہوا خون کا دھبہ صاف کیا۔ میں گھبرا سا گیا تھا
 کہ میری بے احتیاط سے بالک کی انگلی زخمی ہو گئی۔۔۔ میرے سوری کہنے پہ کہنے لگا۔

”یہ تو بھڑائی تھا۔ بابا سرکار! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

اب آپ خود اپنے ہاتھ سے کھا لیں۔“

ایک بھر پور تھمے میں کچے اورک اور لہسن کا سوا لیتے ہوئے میرے منہ سے خود بخود ایک عجیب سی بات نکل گئی..... بعد ازاں خود بھی حیران ہوا مجھے یوں سوچا کیونکر؟

”صابر سنگھ! تجھے کوئی پیا سیہاں بھی کہتا ہوگا۔“

وہ سامنے بیٹھے ہوئے یوں جھٹکے کر کپکپایا جیسے اس مہرگی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ میں دیکھ رہا تھا بڑی طرح فحش تھا۔ ناگاں جب کوئی جی گزری کہانی سامنے آ جاتی ہے تو انسان بڑی طرح نفسیاتی جد جاتی دھچکے محسوس کرتا ہے۔ کچھ دیر کے لئے ہی سہی وہ شدید اعصابی براہنجتھی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اب ہم دونوں کے درمیان خاموشی کا ایک دبیز پردہ حائل ہو گیا۔

ٹرانڈو پہنچے آج میرا دوسرا دن تھا جبکہ صابر پیا کا دائرہ چھوڑے مجھے سات روز بیت چکے تھے۔ آٹھ دس روز پہلے کا پہنا ہوا میرا سفری لباس ہنوز میرے تن پر موجود تھا۔ کلینر شریف کی مقدس خاک کے روشن ذرے ابھی تک میرے جسم و جین میں جگمگا رہے تھے۔ میری تربیت اور طبیعت کہ میرا نہانا ڈھونڈنا گزیر ضرورت کے تحت ہی ہوتا ہے۔ ہر روز کا غسل اور لباس کی تبدیلی ضروری نہیں ہوتی۔ ہمارے یہاں تو مایا کرتے۔ ”ہر روز غسل اور تبدیلی لباس کا دستور اور کمرہ کی دھوئیں میں آتا ہے اور صابن کی آلودہ دھوئیں پر چہرے سے سبب بن سکتا ہے۔“ لیکن ہماری بے علمی اور بد قسمتی کہ دن میں کئی کئی بار نہانا اور سوا ماحول کی مطابقت سے نئے لباس بدلنا اپنا شغل اور حق سمجھتے ہیں۔

بات پھر کہیں کی کہیں نکل نکلتی۔ قاتل ہوا تھا کہ میرے آنے والے روز پرانے پہنے لباس اور سوا پہنے دیا۔ کلینر شریف کی مٹی اور مہک موجود تھی۔ اور ہمارے صابر پیا کا ایک دیوانہ صابر سنگھ بیٹھا تھا۔ مجھے نے باجو کا نام فرید سنگھ اور دادوے کا نام اننتیار سنگھ تھا یعنی یہ سنگھ خاندان پورا کا پورا پشتیہ رنگ انگ میں لگا تھا۔ یوں یہ کوئی ایسی حیران کر دینے والے بات بھی نہیں تھی کہ اکثر دوسرے مذاہب کے پیروکار اور اہل مذہب کے حد درجہ اراکین مند ہوتے ہیں لیکن شادی کسی نے اپنے نام پہچان میں ان جیسی مماثلت بھی پیدا کی ہوگی۔ سنگھوں میں راجپوت سنگھ، اقبال سنگھ، سندھو سنگھ، میاں میر سنگھ، لکھا سنگھ، باہو سنگھ، قسرو سنگھ، مہر سنگھ، جٹ سنگھ، طرح کے اور بھی نام سننے میں آئے لیکن یہ تجنیار سنگھ، فرید سنگھ اور صابر سنگھ وغیرہ اپنی حد تک میں نے سنا۔ بارہنے بکھ ٹوب سننے تھے۔ سوچنے لگا کہ سنگھ حضرات عقیدت یاری بھولپن سوچ میلے کے معاملہ میں کیا حد انتہا کو قبول نہیں کرتے۔

پتہ نہیں وہ کہاں سے بولنے لگا تھا۔

”میرا دادا وی اکلا ای پت سی۔ آگاہ میرا بابا وی کلم اکلا تے سوچن والی گل کہ میں وی اپنے باپے

اکلا ای پت واس۔۔۔“

کچھ وقفے لے کر پھر کہنے لگا۔

”میں اسے وی جاناواں کہ میٹھوں آگاہ اکلا نہ دوکلا۔۔۔ بس اللہ ہی اللہ۔۔۔!!“

ظلال کرتے کرتے میں اس کی خودکامی جیسی اس بات پہ غور کرنے لگا۔۔۔ نہیں مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میں تفتیشی افسر ہوں اور وہ کوئی تازہ بہ تازہ پکڑا ہوا کوئی جرائم پیشہ۔۔۔ جو یہ استاد کی گرجتا ہو کہ انڈے سے کھڑے اور ڈنڈے تینوں بیک وقت کھانے کی حماقت سے لاکھ درجے بہتر ہے کہ خود بخود اگلی کچھلی ساری دادا میں بے کم و کاست فر فر کر ڈالو۔ تفتیشیوں کو کچھ کہنے پوچھنے کا موقع ہی مت دو۔ سنگی ساتھیوں کی نشاندہی کروا کر سب حساب کھاتے برآمد کرو۔۔۔ یہ بھی شاید اسی پالیسی کو اپناتے ہوئے تھا یا پھر کسی خاص کیفیت کے زیر اثر اس سے یہ کچھ ہرگز ہو رہا تھا۔

”بابا آپ جانا چاہیں گے کہ باؤ ایشان نے مجھے نیلغون پہ کیا کہا تھا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، میں نے بھی کہا۔ ال۔۔۔ ال۔۔۔“

”باؤ! یہ سب کچھ یاد ہے۔۔۔“ اس نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تھے اک بے خبر اجیا بابا کھکھال ترنن ویا والے۔“

آب وہ شاید میرا کوئی رد عمل دیکھنے کے لئے خاموش ہو کر میری جانب دیکھنے لگا تھا۔ میں نے پچھلے سانس بھر کی تاریں چھوڑتے ہوئے چڑے کے ٹکڑے کو منہ میں رکھتے بھٹکے اس کی جانب یوں دیکھا جیسے میں نے خاموشی کی زبان سے کہا ہو۔ ”کہتے جاؤ۔۔۔“ میں اپنے منہ سے ایک وقت میں صرف ایک ہی کام لے سکتا ہوں کھانے کا یا فرمانے کا۔۔۔ میرے ذہن کو اس نے جیسے پڑھ لیا تھا۔ وہ اسی ٹون میں مزید گویا ہوا۔

”باباجی سرکاں! مجھے تو اسی وقت ہی کھڑک گئی تھی کہ آج کھڑاک ہونے ہی ہوئے۔ کیونکہ کچھ دیر پہلے میرے اندر کچھ اس طرح سے ٹل کھڑکنے شروع ہوئے کہ اندر باہر بے طرح کے شور سے میرے کان

اٹکنے لگے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تب مجھے بہت دیر پہلے داوی کی گود میں بیٹھنے کا ایک واقعہ یاد ہو نظر دوں کے سامنے آ گیا۔

یہ اس سے کادہ اقد ہے میرے بابا بڑے نور ہے تھے اور ابھی تک اولاد پریت کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ پتہ نہیں کیا دل میں آئی کہ داداجی میرے بابا اور ماما کو لے پاک پتن شریف ملام کے لئے گئے۔ وہاں کئی روز

کے قیام کے بعد ایک رات میرے بابا جی کو لالہ اورینڈ کی بشارت ملی۔ یہ بشارت دینے والا درگاہ شریف کا ایک بوڑھا خادم تھا۔ اس نے صابر سرکار کی بیوی کے بچوں کا ایک تھیلہ بھر کر بابا کو دیا کہا ان بچوں کو کوٹ کر کسی کورے مٹی کے منگے میں بھر لینا۔ ہر روز اس میں سے ایک چنگی اپنی گھر والی کو کھلاتے رہنا اور جب اللہ کرم کرے سر بچے جنم لے تو اسے بھی بطور نذرانی کچھ ماں کے دودھ کے ساتھ چناتے رہنا۔ جب ایسا وقت آئے کہ بچے جنم لے گا۔ تو اب اسی چنگی بھر ملیدہ بچوں کے ساتھ چند چنگیاں اناج بھی شامل کر لینا جبکہ اسی اناج کی آگ ہی چنگیاں بچوں والے منگے میں بھی ڈالتے رہنا۔

میں بارہ اور دو چودہ برس تک یہی چند چنگیاں بطور نذرانیاتا رہا۔ اسی صابر پیانا نام کی برکت کے گھے کبھی بھوک پیاس نے جھگ نہیں کیا اور نہ کہیں کسی کی کمزوری کا احساس ہوا۔ اس دوران میرے دادا سو رنگ باٹس ہو گئے تھے اور میرے بابا بھی اپنی بیماری کے ہاتھوں دکھی رہے تھے۔

اپنے علاقے میں ہمارا خاندان چند باتوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ پہلی بات یہ کہ اورنگ زیب بادشاہ کے دور میں ہمارے بزرگ جتے دار تھے جو بعد میں بادشاہ کے ساتھ جنگ میں شریک ہو گئے تھے۔ ہر کے باوجود ہم مسلمان فقیروں ذیلیوں بزرگوں کو بہت مانتے تھے جہاں ہمارے ہاں گرختہ صاحب کا پانچ بیٹا تھا وہیں ساتھ ساتھ ایک مسلمان پیر بھی تھا جس کا بیٹا بھی تھا۔ اس کا بیٹا بھی سیاحی سیاحی اثر و رسوخ اور کھیلنے ویسے کے علاوہ بدست میں بھی کاروبار تھا۔ اب اسے کیا کہنے کہ ہماری آل میں مولانا کی نسبت سزا بہت ہی کم تھی۔ جس کی وجہ سے ہمارا خاندان بہت محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ میرا دادا کیا باجی آگے آیا۔ اور اب میں بھی ایک سیاحی ہوں جبکہ میری باجی بیٹیاں ہیں۔

میں کھانے پینے سے فارغ ہو بیٹھو پیچے سے منہ صاف کرتے ہوئے بادل خواست بولا۔

”تم شاید اپنے دادا کی کوئی بیٹھی کا کوئی واقعہ سنا چاہو رہے تھے؟“

”ہاں جی امیں اسی واقعہ کی طرف ہی آرہا ہوں۔ دادا بابا مجھے اپنی گود میں بٹھائے کھڑے تھے۔ گھولی ہوئی وہی مخصوص نڈا اپنی انگلی سے چنارہے تھے کہ کہیں بے دھیانی میں ان کی انگلی پہ میرا ہاتھ نہ گیا۔ کبھی سی سی کرتے ہوئے جو انہوں نے انگلی چھینی تو ناخن کی جڑ پر گڑھے خون کی ٹھنی سی بوند پڑتی تھی۔ دانے کی مانند نکلیں مار رہی تھی۔ انہوں نے مجھ ہی سرایتنگی میں اپنی زخمی انگلی سے میرے ہونٹوں پہ دبا دیا۔ خون صاف کرتے ہوئے کہا۔

”صابر! یہ تم سے کچھ اچھا سر زخمیں نہوا۔ اوئے چندریا! اتنی جلدی چنارہے ہی بدل دیا ہے۔

دادا کچھ دیر مجھے عجیب سی نظروں سے تولتے رہے پھر ایک ایک ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہنے لگے۔

”تیرے باطن کے فقر اور ظاہر کے جلال نے اپنا آپ کھول دیا ہے تو عشق و جذب کی ایک انوکھی سی داستان لکھوائے گا۔ جسے فرزانے اور مستانے کئی زمانوں تک یاد رکھیں گے۔“

میں ایک بالک تھا۔ دادا بابا کی ایسی گھمبیر باتیں میرے سر پہ سے گزر گئی تھیں لیکن میرے ننھے سے دماغ کے کسی کوئی گوشے میں کسی انوکھی سی چیز کی طرح ہمیشہ کے لئے محفوظ بھی ہو گئیں۔۔۔ انہوں نے کبھی مجھے یہ بھی کہا تھا۔ تجھے اک سیاہ پوش درویش ملے گا جسے تو اپنے اندر کی گواہی سے خوب پہچان لے گا۔ تو اسے سزا دے تجھے کھلانے گا۔ تم دونوں ایک دوسرے کے من میں لکر کے کھڑے کی مانند ٹھب سے جاؤ گے۔

وہ یوں لہک لہک کر مجھے بتا رہا تھا جیسے گور و بانی سنار باہو اور ادھر میں بھی خوب نگاہیں لٹکائے اور دل ہائے صرف نہیں رہا تھا کہ مریض نمریہ مجبوب اور مجنون وغیرہ جب خود بخود بولنا چاہیں تو انہیں خوب بولنے کا موقع فراہم کر دیا۔ کھل کر رونے سے جس طرح آرام ملتا ہے اسی طرح کھل کر بولنے سے بھی بڑی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ خاص طور پر وہ جو ذرا ذروں تال سحر فصول اور جذب و جھوٹ کے سزاوار ہوں۔ اس کی پتہ صاحبہ کے چشموں کے اشکارے مارے ہوئے پانیوں کی مانند طلسم گھومتی ہوئی آنکھوں میں قیامت کا اندھیرا مچا رہا۔ روشن چہرے کے چاند میں الہامی صفت لہجہ اور کھوپڑیوں پر لٹکائے لٹکائے لٹکائے کی باتیں اور حیرت انگیز حقائق جس سے اتفاق سے ماہر کا دل رک گیا ہو۔

کینیڈا میں میرا قیام محض چند یوم کے لئے تھا۔ اس دوران دو مسلسل روزے اور پچھلے سے مجھے دوسرے رہا۔ بروز روزہ میرے لئے ایک کھانا لایا گیا اور کھانے کے بعد آٹھ بجے اور آٹھ بجے کے درمیان پانی پیا۔ اور سارے پھر بہروں بیٹھا مجھے کھانا اور دیکھا۔ ٹیپ ٹیپ اور اڑتی سی باتیں سننا اور پوچھنا جن کا بہ ظاہر کوئی سرچ تو دکھائی نہ دیتا مگر وہ کمر کمر اور کی آنکھوں تک تصوف تہذیب و فکر میں اتری ہوئی تھیں۔ بانی مریض اس کی یہ اثران اور فوجی و کچھ کر نہیں اس سے خوف نہ محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی کلمہ کا و طیلہ بھی میرا ان کن تھا۔ اچھا خاصا چلتے چلتے پیری سے آکر جا جیسے کوئی تکت کھٹ ساسا نیل سوار ہو ایک اچھی جھلی رولہ چھوڑ کر کچے یا سبز سے میز سے کھلونے میں اتار لے اور اچھے خاصے نمونے جھیلے کھا کر پھر لے کر اوپا آگئے۔

ایک چپ سی شام وہ میرے سامنے ہنسی لہرے بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ اس کی ہور سی تھی کہ وہاں جسے کیسے مایہ ناز کار اور دیکھا جسے صبر لوگ پیدا ہونے یا رہتے تھے۔ اس کے چہرے کی ہنسی بھی چونک چھوٹے کے علاقہ میں تھی اس لئے وہ خوب چپک چپک کر وہاں کی باتیں سنار باہو اور ساتھ ساتھ میرے لئے

میں بسم اللہ بسم اللہ کہہ کے چھوٹے چھوٹے لقمے بھی ڈالتا جاتا۔۔۔ اچانک اس نے درمیان میں گرہ لگا دی۔

”لاہور بادشاہ امرتسر لدھیانہ بھگتے جاندھر فقیر“

میں بھونچکا سا اس کا منہ ٹخنے لگا۔ الٹی ایہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ مجھے اس طرح نکتے میں دیکھتے ہوئے

اس نے واپس اپنے موضوع پر آنا چاہا۔۔۔ میں نے اشارے سے روک دیا۔

”یہ کینڈا میں سے ایک ذمہ دار امرتسر لدھیانہ اور جاندھر وغیرہ کہاں سے چپک پڑے؟“

اس نے ابرو اٹھا کر میری بات کو حیرانگی سے اچکا۔

جواب کچھ ہوتا تو دیتا۔ ”مجھے اس طرح نکتہ سا لگا دیکھ کر پوچھنے لگا۔ ”بابائی سرکار میں کچھ

نہیں کہہ گیا؟“

میں نے ابرو اٹھا کر آہستگی سے کہا۔ ”تم جو غلطی سے بھی کر رہے ہو وہ بھی خوب صحیح ہو جاتا ہے۔“

وہ بھولیں سے ذیدے منکارتے ہوئے بولا۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”جی تو سمجھتے ہو۔۔۔ جسے تم کہتے ہو کہ نہیں سمجھا۔۔۔!“

UrduPhoto.com

انسان سمجھنے اور سمجھایا یہاں کو بروہی غرا تو سب اس پر بند زمین رہا لوگ رنج و غمت میں

پلے اٹنے کے ٹھہرے گیا۔ صابرانہ سنو رت میں داخل ہونے سے بچھا رہا تھا۔۔۔ تار کے گہا اگر ڈاٹر سے

صورت بنا ہوا یہ خوب سنو رت کمال آہستگی سے ٹھوٹتا ہوا اوپر نیچے آتا جا رہا ہے۔ اس کے اندر جیسے

ہوئے پورے شہر اور سہار کا اور جو تک غلطی کیا جا سکے۔۔۔ صابرانہ سمجھتے ہوئے جانے لگا کہ وہ یہاں

رہنے کے باوجود بھی اس ٹھوٹنے اور اترنے چڑھنے والے ریسٹورنٹ میں داخل نہیں ہوا۔ اس کی وجہ

بتانے لگا کہ شاید اسے بلندی پہ چڑھنا اس ہے اور نہ ہی پسند کہ چڑھنے کے بعد نیچے اترنا۔۔۔ کہ یہ جانی سمجھ

نموشی کا باعث ہوتا ہے۔ اسی لئے تو میں ہوائی جہاز کا سفر بھی خوشدلی سے نہیں کرتا کہ وہ بھی آغاؤں پر

ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے زمین چاسے لگتا ہے اور ٹھوٹنے والی چیز بھی عجیب سی لگتی ہے۔ چڑھ کر اتار

چڑھنا ہی قصور ہے اور اگر ٹھوٹ کر پھر وہیں پہنچنا ہو تو ٹھوٹنے سے کیا حاصل؟ اور اگر بھی چڑھنا ہی مکہ

غمروری ظہرے تو بیخ و طمان اور ملے یہ ٹھکے کی آواز سے سولی چڑھ کر چڑھتے ہی جاؤ کیونکہ کونے پار سے گل

ہو راستا سولے در لگتا ہے وہ آگے وقوع دارین تک پہنچتا ہے۔ اس سے خوشتر کہ صابر اپنی بات کو یاد

سے کلیئر تک پہنچاتا میں نے ایسی چیز حالی اترائی اور ٹھہرائی والے ریسٹورانٹ پہ تین حرف جیتے ہوئے یہ کہ

معمولی سے کافی بار میں جانے پر ترجیح دی۔ وہ کافی سرکتے ہوئے اچانک گرہ لگا بیٹھا۔

”اُٹھیاں چڑھاں تے نہ ڈڑیاں سکھاں“

میں اُس کا نہ بکٹا رہ گیا۔ الٹی لپے کس امر کا بندہ ہے؟ — چند اجنبی سے لمبے لمبے اُسے غفلتی بانہ سے
تو متا رہا۔ اُڑ بکے میں نے ایک میز ہا سا تیر پھوڑا۔

”کیا تم نے میاں محمد بخش کا کلام پڑھا ہے اور پھرے شاہ غازی سرکار کو جانتے ہو؟“

وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ”بابا جی سرکاراں! آپ تو جانتے ہیں کہ کیاہ کہیں سے بنی جاتی ہے
وہا کا نُسوت کہیں اور بننا جاتا ہے۔ کپڑا پہنے نہیں کہاں پہ تیار ہوا ہے۔ تیرا سیا کہیں اور جاتا ہے اُسٹری و تر کوئی
لگا تا ہے اور تب پھر کوئی امر والا پہنتا ہے۔ میرے کلبوت پہ بھی و تر وہیں سے لگا ہوا ہے۔ عارف کھڑی شریف
سرکار میاں محمد بخش کی عقیدت محبت کے و تر سے فقیر ذرویش کا عشق چو لارنگ زنگیلا ہو جاتا ہے۔“

عالمِ ذلت میں معشوق بنا جاتا ہے

عشقِ انسان کو پاگل نہیں ہونے دیتا

”مگر تم معشوق کی بجائے ذرویش پڑھ لو تو شعری حُسن دو چند جبکہ معنوی باطلت چھ چند ہو جائے

کی... کیا خیالی ہے؟“

UrduPhoto.com

”کیا تم نے کبھی کبھی اس شعر کو پڑھا ہے؟“

وہ غصے سے وقفہ جب طول پکڑ گیا تو میں ناچار سا بولا۔

لیکن کیا

”لیکن یہ کہ اس شعر میں عشقِ خدا کی بات ہے نہ کہ عشقِ مادی کی بات ہے۔“

”کوئی معقول وجہ؟“ میں نے مزہ لینے کی خاطر پوچھا۔

”آپ استنبول اور قونیہ شریف تو جانتے ہی رہتے ہیں۔ مسجد سلطان احمد یعنی نبلی مسجد میں بھی

کئی بار نماز پڑھی ہوگی۔ یقیناً آپ اس کے گرد و نواح میں بھی گھومے پھرے ہوں گے۔ مسجد کی داخلی انحص

کے سامنے کی دوکانوں اور فٹ پاتھی قبوہ خانوں کے چھوڑے ایک شغل سے بے خانماں کوٹے میں ایک

ڈھیری سی ہے جسے قبر تو کسی طور نہیں کہا جاسکتا ہے۔ بس سنگ و خشت پہ کچھ نشانات۔ آس پاس کی دیرانی

آرامی اور اک عجیب سی دھانس چھوڑتی ہوئی بوہاں کہ جیسے پاس ہی کہیں بھی لہوئی چاری ہو۔ انہی چیزوں

سے اعجاز ہو جاتا ہے کہ یہاں کچھ نہ کچھ ضرور موجود ہے۔ قریب قریب پہ اک عجیب سی کیفیت طاری ہوتا

شروع ہو جاتی ہے محسوس ہوتا ہے کہ کسی نہ جمل شہید نے جس کے جسم و اعضاء سے تازہ و تازہ سرخ لہو ٹپک رہا

ہے آگے بڑھ کر آپ کو بازوؤں میں بھر لیا ہے۔ یہاں تک آپ اس کے دمِ نفس کو اپنے زخموں پہ محسوس

کرتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کا تعلق و رابطہ کوچہ ملامت سے ہو۔ یہ بے نام و نشان شکستہ و ویران معتبہ سلطان ملامتی و رولش اسطیل معشوق کی شہادت گہرے اُلفت ہے۔۔۔۔۔ اسی کیفیت کے بارے میں حضرت علامہ اقبالؒ نے کہا تھا۔

یہ شہادت گہرے اُلفت میں قدم رکھنا
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

اس نمدھاری سکھ بچے کی ان اچھی باتوں سے مجھے ڈر سا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس اُدھ پھری عمر ایسی اٹھان۔۔۔ ”اُلی! اس کی اُڑانوں کی خیر۔“ منہ سے بیساختہ و عاقلی۔

وقت ہذا ق رستے نے مجھے اگلے روز وہاں سے ٹہلا دیا تھا۔ اُس کے چن بکھرے اور اخلاق و اخلاص کی منکشف بہت دنوں تک میرا فہم گونانی رہی۔۔۔۔۔ چمڑا چمڑے دھیرے سے مکی چوندی نے آنکھوں کے سامنے کے منظر بدل دیئے اور میں زندگی کے تماشے میں تماشا بین کر رہ گیا۔ لیکن اس دوران صابر سنگھ سے ٹیلیفون اور دیگر ذرائع سے سلسلہ وفادار نگاہیں اُڑا رہا۔ ہر آہستہ آہستہ فقیری اور بستی وغیرہ وغیرہ اس کے اندر اُٹکے برائیاں سا چارہ بناتا تھا۔ جس سے خاں کو دل والی چٹش و توانائی کم آنے لگی تھی۔ اسے ناقابل برداشت تھی۔ مگر اس کا جواب یا شکر دینا یا حق میں کہاں ہے یا ایسے کہ آپ بھی مٹتی جا جائے کر استغناء سے اپنی جان بچانے کی کرتا ہے۔ اس کے ہاں جذبات شدت اور طلب اس نوری کی ہوتی ہے کہ اگر منہ سے احتیاط نہ برتی جائے تو جان بچنے والی کا حوالہ رہتا ہے۔ میں بھی اس عاشقی میں اعمیٰ حضرت سادات ”پچھو“ تھا۔ میری ساتویں آنکھ دیکھ رہی تھی کہ وہاں سے اپنے ہاتھ مجھے بھی گھسیٹے ہوئے تھے۔

وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تنق الم نکلا

اُداس کی آدمی رات پیچھے اور آدمی آگے ٹیلیفون نے اُدکے توڑ دی۔ اس سے میری محویت کا کچھ نہ ہی عالم تھا۔ ٹیلیفون کی ٹھنی نے میرا سارا اٹھاک چوپٹ کر دیا۔ بادل خواہست متوجہ ہوا تو دوسری جانب کے حضرت داغ داغ تھے۔ پکڑتے ہی بولے۔

”باپا جی سرکاراں۔۔۔!“

لوک آکھڑے نے ہالانچھ جوگی قول جاندا اے پار لگا ونے دا

اور

سانوں وی پار لگا دے دے گھڑیا مٹیاں تیریاں کر دیں

ٹیلیفون بند ہو گیا اور میں کئی لمبے بند ٹیلیفون کوکان سے لگا کے رہا۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہائی

ات میں نے کس طرح سے گزاری ہوگی۔

ایسے ہی ایک بار میں ایک مجلس میں بیٹھا تھا کہ یلیون تھر تھرایا۔ بڑی سچ سے کان سے لگایا۔
”بسم اللہ السلام بیگم“

اُدھر وہی حضرت آتش..... ”بابا جی سرکاراں! اُلکھ نہیں جاگدا..... کہیں سے حضوری کے ساتھ رونا لے ویں۔“

کوئی اور جگہ ہوتی تو شاید میرا سر گھوم جاتا۔ اس مجلس میں اس کا عمل نہیں تھا۔ صرف اتنا ہی کہنے پہ اکتا کر گیا۔

”میری جان! کھانا چلے جاؤ..... چاہ یوسف میں نماز معکوس ادا کرنے کے بعد وظیفہ یعقوبی کی تکمیل کرو۔ اللہ نے چاہا کہ اُلکھ تو کیا سوا لکھ اُلکھ جاگ جائیں گے اور اگر یہ زاری میں حضوری بھی لے آئے گی.....“

میرے پاس بیٹھے ہوئے ایک عاتقِ فراخ نے کہیں یہ مناکہ نہ کیا۔ اب وہ میرے دروازے پر تھا۔
”بابا جی! نماز میں حضوری کا تو سنا تھا کہ زونے میں زاری ہوتی ہے“
”یہ سچ ہے۔“
”تو وہ کیا موتوں پہنے مسکراتے میں بھی حضوری ہوتی ہے۔ بلکہ جیسے مرنے میں بھی یہ کار فرما ہوتی ہے۔ یہ سب امر معلوم اور معلوم کا تشبیہ ہے۔“
”وہ معلوم ہو گیا کہ میرا کونسا ہے۔“

تھنہ ایک اور بھگی شب کا۔ نیچا خوب برس برس لڑا کی ذرا خمی تھی۔ میں بالکوئی میں کھڑا آسمان کے شادابوں کے شعلوں کو تنگ رہا تھا۔ میرے حساب سے چاند برون اسد میں تھا اچانک زبردست کڑا کہ سے زہد لہرائی اور شمال تا جنوب بڑی شعلوں کی پٹھاری پھیل گئی..... اسی لمحہ جو پھر بادلوں کے منہ کھلے اور میں اُڑا کر نیچے اتر آیا..... کھڑکیوں کے کھلے پنوں کو بند کر دیا مگر آسمانی بجلی نے اب وقفہ وقفہ سے اپنی چاند ماری شروع کر دی تھی۔ اندھیری رات کی اس ذراؤنی ساختوں میں جب آسمانی بجلیاں اور چھابوں سے پانیوں نے تھلک بچا رکھا ہو اگر اچانک یلیون بھی ٹرن ٹرن شروع کر دے تو ایسے میں ایک بونک اکیلے جہے بندے کا کیا حال ہوگا۔ مجھے کھڑک لگی کہ یہ وہی ہے.....

ایمان سلامت ہر کوئی ملے، عشق سلامت کوئی کوئی

رکھا جائے تو یہ نظام قدرت کا ایک حصہ ہے اگر ایسا کچھ نہ ہو تو کارگہ حیات کے کل پرزے فطرت کی مشینری سے ٹوٹ پھوٹ کر الگ ہو جائیں۔ انسانی تعلقات رشتے اور پیار محبت کے مانے جانے وغیرہ بوسیدگی و فرسودگی کا شکار ہو کر باہمی آکٹاہٹ اور عدم توجہی کی صورت اختیار کر لیں۔ نسیان، مصروفیات، فاصلے، موسم، حادثات اور باہمی چھوٹی موٹی جھگڑائیں بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ یہ وظیفہ ہائے حیات و ممات، انعام و انقطاع میں ایک خاص خواہ فاصلہ اور توازن برقرار رکھنے میں ممد و نجات ہوتی ہیں۔

بہت پہلے ادھر ہی سے آہستہ آہستہ یہ یلیغون ملاقاتوں کا سلسلہ بھی بند ہو گیا تھا۔ میں نے کینیڈا میں ریٹائرڈ ہونے سے پہلے کیا تو معلوم ہوا ہندوستان چلا گیا ہے۔ پھر ایک ذرا تک سے خبر ملی وہ کلیر شریف نہر کے پانی میں استاد ہو کر کسی طویل المیعاد چلنے کی پیمائش کر رہا ہے۔ میں نے کلیر شریف اپنے ایک جاننے والے سے پتہ کروایا تو معلوم ہوا ایسا ایک نیم جذبہ خستہ حال سا جوان کی ہفتوں سے نہر کے گہرے پانیوں میں گرون گرون ڈوب کر کسی چلنے میں مصروف تھا۔ غرض کے دنوں میں ہری دوار کی کوئی طوائف یہاں حکام و نیازیوں سے نہر کنارے گناؤں میدان میں اتری ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر اس نے کہا کہ اس طرح اس نے ان دونوں کی ایک دوسرے سے ملنے کی پیمائش کر رہی ہے۔ یہ پانی اس کے گہرے پانیوں میں آ جا رہا ہے۔

طوائف کے لئے یہ صورت حال بڑی پریشان کن تھی۔ اس قنوی کا سارا سر پر پھیل گیا اور پانی نے اس کی گردیا ہوا تھا۔ طوائف اپنے صابر پیا کو مست ملنگ جان کر ان کی خدمت اور توجہ و بازی کی۔ میلہ ختم ہونے پر طوائف ہری دوار شہر کے کسی قریبی مقام پر پہنچ گئی۔ وہاں طوائف نے کسی طرح اس کے گہرے پانی کے سارا حال کہہ سنایا۔ اور اپنے ایک دو آدمی اس کی نگہداشت پر بیٹھا دیئے۔ ایک دو روز اس گہرے پانی کے پانی اور کسی نہ کسی طرح اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

اس نے کہا کہ اس نے اپنی زبان بند کر لی تھی۔ کوئی کچھ بھی پوچھے کہے اس کی ایک ہی چپ تھی۔ اس نے کھانے پینے کی تعلقات سے بھی بھی آزاد ہو گیا۔ اس پر ہفتہ خدائیں میں ٹھوکتے رہتا اور آگ کھانے ہوئے کسی جگہ بے مشغول کی مانند شعلہ بے ماں رہتا اس کا حال تھا کہ کسی سیانے نے بتایا۔ اسے کسی نے سونگھ لیا ہے۔

صابر کے گہرے پانی کو یہ کسی کالے کاٹو گنا سمجھ نہ آیا۔ وہ یہی سمجھے کہ کسی کالے کپڑے یا سانپ لٹھو سے کاٹ لیا ہوگا۔ جس کی وجہ سے اس کی زبان اور دیگر معمولات میں فرق پڑا ہے۔ کالے کپڑے اور نوٹھنے کا فرق ہر کوئی تو نہیں سمجھ سکتا۔

● مشاہدہ ذات میں گھات.....!

تصویر میں مشاہدہ ایک اصطلاح حالت اور کیفیت ہے۔ ایک شاہد کے لئے ضروری ہے کہ وہ صبر ہو اور تجھیر بھی۔ اس کی تمام تر توانائی آنکھ کے تل اور پچر پچراتے دل میں سمٹ کر رہ جائے۔ وہ مشاہدہ کی حالت میں بولے نہ سنے حتیٰ کہ سوچے بھی نہیں۔ باہر بھی مخصوص پچن کو ابتدا میں ہلکے ہلکے اور بعد میں گہرے ضروری ہو تو بھاری بھاری مشاہدوں سے گزارتے ہیں۔ مشاہدات کچھ ظاہری ہوتے ہیں اور کچھ باطنی۔ کہیں آنکھ لڑی ہوتی ہے اور کہیں دل ادم دیکھے ہوئے ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اک مشاہدہ مجازی ہوتا ہے جو کہتے کا مجاہدہ ہوتا ہے اور اک مشاہدہ حجابی۔ جو درمیان میں آگن رکھ کر اوٹ آفت ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اسی طرح مشاہدہ غشی خاصی بھی جو ظاہرات پر قدرے تمام عمر بطوری حالات پہ قابض و جم اثر انداز ہوتا ہے۔ مشاہدہ ذات مشاہدہ شیخ مشاہدہ انصاف مشاہدہ کئی و اثبات مشاہدہ کائنات مشاہدہ عالمین مشاہدہ کونین مشاہدہ لوح و قلم مشاہدہ حشر و عرش و ملک مشاہدہ یوم نشور اور مشاہدہ حق۔ علیٰٰ هذا القیاس۔ انگنت رازیں مشاہدیں اور پھر آگے منزلوں کی بھی پتلیں مگر شاہ فقیر و ارمیش کی کوئی منزل منزل نہیں ہوتی وہ اندیشہ رہا ہے جو حجاز کا سرزمین ہے۔ اس کے لئے یہ سب کچھ اس کی تمام زندگی کی توجہ ہے۔

خاص طور پر مشاہدہ ذات میں گھسا ہوا فقیر و رمیش کی کھنکھن منزل میں ہوتا ہے۔ عالمی حیات و حالت سے علاقہ بیکر شرم ہو کر رکھتا ہے۔ احساس و انکس سے بے تعلقی و رآتی ہے۔ ورنہ کیا ایسا بے ہوش ہو جاتا۔ ہوش میں ہوتا ہے اور ایسا گمراہ ہو جاتا ہے۔ یہ کچھ کی طرح گمراہ ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا ناخبر بھی جو حال موجودہ قیام مادی، عنصری، مصلحتی اور زوہد مانی تقاضوں سے بے نیاز و بیزار دکھائی دیتا ہے مگر ظاہری باطنی بصارت سے قلب و قدر بقدر مقام و طلب اس کے ہاں موجود ہوتے ہیں۔ جن کے حجاب میں صلب آدم سے اس کی ذات تک تمام مراحل و مقامات ایک فلم کی مانند اس کے سامنے ہو کر رہتے ہیں (مشاہدہ حق حجاب میں رہتا ہے اور اس میں وہ ایسا مہر ہے و ششدر ہوتا ہے کہ دنیا و مافیہا کہیں بہت نیچے رہ جاتے ہیں۔ یہ مشاہدہ ذات و ذات زمانہ محدود اور لامحدود بھی ہو سکتا ہے۔ یہ دنیا لوکی دین اور طالب کی طلب پر منحصر ہے۔ کوئی تو جھٹلی پر مہر بھی محض ایک ٹیکہ ہی لگا کر منڈپ پر چھیرے لے لیتی ہیں اور کوئی ایسی بھی دوزخ کی دالین ہوتی ہے جو ہاتھ پاؤں گراں نہ لگتا تھا خوب رنگا کر سہاگن ہوتی ہے۔ ایسے مشاہدوں میں پڑے ہوئے مجذوب و مجبوب کو گمراہ سے کچھ غرق فطرت و عادت اثرات بھی ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ گو ان کی نمود و نمائش میں ان کا قطعی کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن کیا کہنے کہ یہ چچک کی طرح نکل کر ہی رہتی ہیں۔ یہ لوگ ایک طرح کی آفاقی بخشی گزروں کی

ذرو و رزق والے لوگ ہوں گے۔

قبرستان کی بیرونی دیوار کے پاس سفید رنگ کی چھوٹی سی ایک گارڈ رکتی ہے چاک و چوبند سا ڈرائیج پھرتی ہے باہر نکلا اور پچھلا ذرو و رزق کو کھول کر ایک انتہائی نکلیں و جمیل بیس بائیس سالہ دوشیزہ کو اترنے میں مدد دیتا ہے۔ دوشیزہ کمال وقار و تمکنت سے پو لے پو لے چک : دھرتی ہوئی اسی تنگ سے راستے پہ ہو لیتی ہے ہر صبح یہ خوبصورت لگا ہوں میں ٹھہر جانے والا مزار ہے۔ دوشیزہ کے ہاتھ میں بید بچوں کی قمیضوں کی نوکری جس میں خوش رنگ پھول اور انگریزی کا پیکٹ موجود ہیں۔ جب وہ قدرے قریب پہنچی تو اس نے قبروں کے درمیان کی شخص کو لینے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اکثر نشہ کر لیا لے آ کر اے گھر یا پاگل سنایاے ہوئے ایسی جگہوں پہ بیٹھے لینے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ یہاں سے انہیں اٹھانے بھگانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہی کچھ دیکھتی سوچتی تیز گامی سے اس کے سر پہ کچنگ لگی۔ اسے اب جو دیکھا تو ایک کالا کتا بھی چبھتا ہے کے کتوں کے اوٹ میں بیٹھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ قبروں سے لینے ہوئے دیوالے کی جانب متوجہ ہوتی اور کوئی اچھا برا سلوک کرتی۔ اس نے اپنے ڈرائیج سے جی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”اسی گئے گویاں سے باہر نکالو۔“

UrduPhoto.com

جائے۔ اس جگہ سے قبروں پہ پڑے دیوالے کا پیر و سامنے واضح تھا۔ چہرے پہ دوسرا مہر آگئیں گئے تھے ہی وادہ کی تھیں۔ بھانسنے قیامت کبریٰ تھی۔ دو اور دو چار آگئیں ایک آگئے تھے تھیں۔ اس کے منہ کی مالا لگے ہوئے ہوئے تھیں۔ یہ بہت کر قبر کے منہ کے تھیں لینے پہ دل کی جگہ جمع ہو کر مہر کی مہر جم ہی گئی تھی۔ ہالوں کی بلبل بلبل چیناے تھیں یوں مرقد پہ گھری ہوئی تھیں جیسے کوئی رات کی دیو دیکھتا تھا۔ لہجہ اور چہرے تو ذکر یہاں تھا پاؤں نے آئی ہو۔ ایک جیب سی دشت اس کے بٹرنے پہ لٹکتی ہوئی تھی۔ اس کی منہ لگا ہیں اس عورت کے چہرے پہ بھی ہوئی تھیں۔

دو دو کھا کر اک ہکا مہر کی پیچھے ہٹ گئی۔ جیسے وہ اس کی آنکھوں اور سامنوں کا سامنا نہ کر پار ہو۔ دیوالے کے ہونٹوں پہ پھینٹ ہوئی۔

”تمہارے ہاتھ میں پھولوں کی بجائے پھری ہوئی چاہتے تھی۔ تم مجھے ویسے ہی دیکھتی جیسے وہ اپنے منہ پہ لینے کی پاداش میں رانچس کو بیٹھا تھا اور ہاں تمہارے منہ سے لینے کا حق نہ اچھا لگا۔ ہو سکتا ہے کہ پھر نہ آؤں گا۔“

اس دوران ڈرائیج والے کالے گئے کو ہنس ہنس کر کے بھگانا چاہا مگر وہ تو نرس سے نرس نہ ہوا۔

خٹک کر ٹھنڈا بھی نکایا مگر دوسرے ایک ہی جواب آیا۔ پوچھا "تجھ نے کڑملا کھاں نال جنگ نہ کر۔"
 باہر دیا جانے کی اس بیہزار آنکھوں اور ٹٹنے والی بات پہ قدرے متعجب سی ہوئی پھر قدرے توقف اختیار کرتے
 سارے ٹر شروٹی سے جواب دیا۔

"اٹھو اٹھو یہاں سے یہ جگہ تمہارے لینے لینے کی نہیں ہے۔"

دوسرے نے کی جانب غضب بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے ڈرائیور کو تھکاتا ہوا انداز میں غصہ دیا۔
 "عہد انکریم! ان دونوں کو یہاں سے نکال باہر کرو اور پانی سے اس ساری جگہ کو صاف کر دو۔"
 ڈرائیور اب دیا جانے کے گرد ہوا۔ "اٹھو بھائی! اس ٹٹنے کو لے کر فوراً یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔"
 صابر یہاں خشکیوں لگا ہوں سے ڈرائیور کو تومنا ہوا اٹھا اور باہر اس راستے پہ آگاہ جو قبرستان کے بیچ
 کے گزرتا تھا۔ کالا ٹٹنا بھی سارے کی طرح پلٹا ہوا آسمان پر ہوا۔ دونوں اپنی اپنی سرست اوڑھ کر پلٹے
 گزرتے کی ایک قبر کے تھوڑے پڑھے سے گئے۔

دو شیڈ کو شاید اپنے تلخ زردیے کا احساس ہو چکا تھا۔ لیکن انہیں سے اور نیچے نیچے انہیں دیکھ
 کر تھی۔ جو بلیک سی رد عمل اسے نینت سے بڑھاتے تھے جسے نہ دیکھ سکتے تھے۔ ڈرائیور نے جھپٹا یا مشکل سے
 دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس کی طرف سے پلٹا ہوا آسمان پر ہوا۔ دونوں اپنی اپنی سرست اوڑھ کر پلٹے
 گزرتے کی ایک قبر کے تھوڑے پڑھے سے گئے۔
 "تمہارے ہاتھ میں لٹھروں کی بجائے چھری ہوئی چاہئے تھی۔ تم مجھے جیسے ہی مٹاتی جیسے میرے
 ساتھ پہ لینے کی پاداش میں رائیونگ کی لٹھری تھی۔"
 اور ٹٹنے والی بات.....!

"تمہارے منہ سے نکلنے کا لفظ برا بھلا لگا۔ ہو سکے تو ایک بار پھر لڑا کہو؟"

لٹھروں میں وہ اس شخص میں اتارتی چلی گئی تو اس نے اپنے آپ میں کہیں غرق ہوتی گئی کہ اس دیا جانے
 پہ بات کس نہ ہو گئے سے کہی۔ ایسی کچی اور ڈونگی بات کسی عام انسان سے سرزد نہیں ہو سکتی بلکہ اس کا
 احساس ہی ہو سکتا ہے جس کے اندر عشق جوت جمل رہی ہو۔

وہ خود بھی ایک ایسی ہی آگ میں جل رہی تھی۔ ہوا سے جلا کر جسم کرتی تھی نہ کسی طور بچھ کر دھواں
 بن کر تھی۔ اک عذاب مسلسل ہی تو تھی اس کی زندگی۔

امر تر پیر بھولا کے مشہور کشمیری سکہ خاندان کے قائمہ چرخ سلیم سنگھ کی یہ دوسری جتنی مسلسل شہانی تھی۔
 کشمیر ہرن کی آنکھوں اور دم و حانس والی یہ باگلی سی ناراز آگ انوکھے سے روپ رنگ اور رنگ سنگ سے

ابھی اس کا جینز مکمل طور پر اس کے سرسار تک نہیں پہنچ پایا تھا کہ یہ خود طلاق لے کر پانچ تھکنوں پر اپنے میکے پہنچ آئی۔ سابق شوہر کو اس نے باہر دروازے سے ہی یہ کہہ کر لوٹا دیا تھا کہ تم بہت ہی شریف انسان ہو اور وفا شعار انسان ہو۔ تمہارے ساتھ میں یہی اک نیکی کر سکتی تھی جو میں نے تمہیں اس آزار سے آزاد کر رہا ہے۔ آگے تمہاری قسمت ...؟

اولاد ماں باپ کے لئے اک بہت بڑا امتحان ہی تو ہوتی ہے۔۔۔ یہ لوہے کے پتے چبواتی ہے۔ انگاروں پہ چلاوتی ہے دین دنیا میں دو کوڑی کا کر کے رکھ دیتی ہے جبکہ ماں باپ اپنی ممتا پتا سے مجبور ہوتے ہیں اور اولاد کا ہر ذریعہ یہ برداشت کرتے ہیں۔

اسے اس وقت دروازے پہ لڑکھ کر ماں کو مشورہ پینٹ کر دیا کہ باپ کو سکتے کا سانپ سو گھ گیا۔ غصے طلاق کا کاغذ لکھاتے ہوئے کہا۔

”یہ شریف انسان میرا شوہر مہلوانے کا سزاوار نہیں ہو سکتا جو میرے بچوں کو بیمارال سے قدر میں کڑھوٹ کر ہر حرکت و عمل میں میرے حکم کا پابند ہو کر رہ جائے۔ اس نے ہاتھ پاؤں نہ بچھے دیا ہے۔“ اس نے اپنے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ دکھائی۔

● داد و ماتا کی شوق ...!

وقت اپنے مدار پر چوڑی آواں آواں یہ بڑھا چلا ہوا ہر آن حرکت میں رہتے ہوئے آگے گئے۔ معلوم منزل کی جانب رہنمائی رہتا ہے۔ مگر اپنی تصوراتی منزل پہ کبھی پہنچ نہیں پاتا۔ کیونکہ ایک ایسے دروازے پر محسوس رہتا ہے کہ اس دوران کبھی جان ہی نہیں پاتا کہ قتلہ آواز سے وہ کتنی بار ہو گزرا ہے۔ اسی آواز سے اس میں اک انت ہو جاتا ہے کہ بنو منزل کا تسوڑا ہوا گھرا اس کے ہاں جاں گزریں ہوتا ہے۔

منہل نہانی کا انت ابھی نہیں ہوا تھا۔ وہ کسی ایسی منزل کی مسافر تھی جس کی ابتدا اور انت اس کے دائرہ اور راک سے ماوراء تھی۔

وہ اپنے جہاں خود حسن و مسرتی عالم ذات اور بے نیازنی پس و پیش کے اک دائرے میں گھومتی تھی۔ مگر خود و زبان اندیشہ و ہم و گماں سے دور دور جیسے وہ زمان و مکان کی قید سے بھی آزاد تھی۔ پیش و متحرک ہے۔ چند ماہ و سال دور میں تماشے کی ماتحت یوں گھل گئے کہ پتہ ہی نہیں چلا۔ وقت کے اس چل چلاؤ میں

کا انگ انگ اسی 'رقص بھل' میں رقصاں تھا۔ جسم کا رقص اور جبکہ جاں کا رقص اور؟ جسم پہ قابو تو کسی طور پایا جاسکتا ہے مگر جاں پہ قدرت نہیں ہوتی۔ وہ اک موقع پہ جاں بلب سی اٹھی اور دیوانہ وار گھر سے نکل کر درگاہ شریف میں وہیں پہنچی جدھر یہ طرفہ تماشا لگا ہوا تھا۔ نہ یہ خبر کہ وہ کون ہے یا وہاں میں میرا نہ سر پہ اور مہنی۔۔۔ وہ حکم چل کرتی وہ پنڈال میں گھس پڑی۔۔۔ تماشا کی اجیت قماش بین سے ہوتی ہے اور جس تماشا میں کسی طور کی بھی صنف نازک شامل ہو اس کی اجیت وہ چند ہو جاتی ہے۔ شاہد بازوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے ہیں۔ سٹلے سٹلے کا میدان پکڑتے ہیں۔

اب نچ میدان ایک وجہہ راز قد سحرانہ خصوصیات کا حامل جوان اور ایک سیمیں بدن آتش بداماں سی و شیراز جس کا سر پایا اور ضد و خال ارضی نہیں سماوی لگتے تھے اک ڈوبے کی موجودگی سے بے نیاز تقدیری وصال میں نہٹے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ لوح ایک باغین وصال کا رقصاں بلبل دور ہاں ہے۔

طوفان تھما آئے تھیں رکیں' جھکڑ بند ہوئے تو انہوں نے اک ڈوبے کو ہوش و خرد کے ہاتھوں سے گریدا تو معلوم ہوا کہ وہاں کلیاتوں کا پیرا مٹی ایک ہے۔ مزید مل بیٹھے تو رہی سہی اجیت سے بھی جاتی رہی۔ پتہ پڑا وہاں پچھلے کی جنموں سے ایک دوسرے کو کھینچ رہے تھے ایسی شہسازوں کی دین و دھرم نہ بچتی تھی آتش کے آگے کوئی امتا غیر نہیں ہوتی۔ انہیں زور راہ کی ضرورت نہ کسی تار و تار یاں کے متعلق سوچنے کی فرصت ہوتی تھی بلکہ کچھ ہوتا ہے تو صرف بغاوت مول نیٹے کی جرأت یا پھر سر نہیں کی ہوتی۔

اس سے کچھ کہنا سکتا ہے کہ تھا۔ ابھی ٹرس شریف کی تقریبات سے کچھ کھرا کھرا کرکٹ بھی اچھی طرح سمجھ نہ گیا تھا کہ سبیل شہابی، علیم علی کی سٹیوٹا باسوں میں بیوی بن کر رہ آئی۔ یہ شو سپر دی تھی۔ علیم علی کو دوسری بیوی کی کیا ضرورت وہ تو پہلی بیوی سے بھی بھرا بیٹھا تھا۔ بیوی تو جہت جہت اور وقت مانتی ہے جو پہلے وجود سے نہ سکتا تھا۔ ادا و تودہاں پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے یہاں میاں بیوی یا بچے میں پڑتی آوازے قلائف غمخوئوں کریں جبکہ ان کے ہاں ایسی بزرگوشتیں بیکار رہتے ہوئی تھیں۔ علیم علی جیسا ہاتھ پاؤں کا کھلا پڑھا کھلا انکھوں میں ایک جوان رحمانہ حرم کوک بھی پیٹنے سے کیا جب کہ وہاں لاال و یا من کل کھا انھیں۔ وہ سہمی نہیں ذہنی اور زوہانی طور پہ بھی بانٹتے تھے۔ وہ عورت کے ساتھ جیسی تھی قلم کرنا پید جائیکہ وہ اس کی بیوی نہ ہوں نہ ہوں جدی زیادتی اور بد رفتاری پہ غموں کو لگتا تھا۔ وحشت و برہنہ سمجھتا تھا۔ وہ صنف نازک کو گھسوں کرنے والی دیکھی دیکھی مہک سے تھیر دیتا۔ کھل کر بد سے دلی بارش سے کھیں زیادہ اسے کھلی کھلی پھوار اچھی لگتی جو جسم کو ہڈی طرح بھگوئے سے کھیں زیادہ اندر کے وجود کو نرم نرم ہلکا سے سرشار کر دیتی ہے۔

ایسے ہی کچھ خیالات سنیں سہانی کے بھی تھے جس کا انہماک اس نے اپنی پہلی شادی کو مختل ہو کر کے کیا تھا۔ دوسرا اور محسوس کو انسانی وجود کے سیدھے لئے دلربا سمجھتی تھی۔ جیسے آئینے کے درخشاں ہوتے ہیں۔ وہ دونوں دلخیز تقابلی لحاظ سے ایک دوسرے کے تقیض ہوتے ہیں لیکن ان دونوں کی باہمی برقراری ہی آئیے کہ مکمل معنی و مقصد سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ شاید یہی نوٹ پناہگ خیالات اور فلسفہ نہایت انہیں ایک دھارے میں پڑ گیا۔

وہ ایک بار پھر اپنے معزز و مشہور والدین کو چھوڑ کر ایک ایسے شخص کے ہمراہ چلی آئی جس کے ساتھ اس کی تین قدریں مشترک تھیں۔ پہلی دونوں کا انسان ہونا۔ دوسری ازدواجی طور پر شیطانی اور غیر متوازن ہونا۔ تیسری دونوں کا پہلے سے شادی شدہ ہونا۔ اس کے علاوہ سب کچھ مختلف تھا۔ سب سے بڑا اختلاف اس کے شوہر کا پنجابی سکھ ہونا تھا۔ مگر جو کچھ ہونا تھا وہ وہاں پہلے والدین سے ایک مرتبہ پھر سینے پہ پتھر رکھ کر اسے الوداع کر دیا تھا۔ چونکہ ان کے پہلے ماں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

”کی بھاری بیٹی اب کے ناکام ہونا تو مری میا کا نور دیکھو۔“

اس نے ماں کے لئے یہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

UrduPhoto.com

نیکو شکر کی پہلی بے اولاد بیٹی اپنے میکے والوں کے پاس چند ہی گز گھر میں رہتی تھی اور وہاں بھی ان کے اندر جری کے خلاف میں ایک ماؤں نیم چار تھا۔ مائیم کی درگاہ شریف سے اسے ایک خاص عقیدہ تھا۔ سب سے بڑا صاحب کے ہاتھوں مسلمان ہونا کالج کیا اور بی بی کی کھانے کے اپنے پر آشوب فلیٹ میں چلا آیا۔ دولت کی پتی چلتی رہی۔ زندگی کا گرم گرم آنا بکھیرا سا پر گزرا حالانکہ اس سے میں گراہا مسکرا ہوا۔ باغریہ، خرابہ فریج کی کانیاں، شلوک۔ سنتوں منگول کی ٹھٹھیس یعنی دن رات کا کوئی ہل پہر ایسا نہ تھا کہ یہ دونوں ہم رنگ ہم سنگ نہ کسی ایسے شخص شغل میں مصروف نہ ہوتے جو عام انسانوں کی دانست میں شخص کا ریکارڈ کی ذیل میں نہ آتا ہو۔ پیچھے جا کر ہر مذہب والے اور چند ہی گز گھر میں ذرا محنت پیشے سے آگاہ بے حساب تھی۔ گھر والوں کی جانب سے بھی گراہ و چلی نہ کوئی پریشانی نہ کوئی پھنکارا ہوا ارادی بھی نہ نکلتا تھا۔ سچ ہوتی ہے غلام ہوتی ہے بڑی غرق م ہوتی ہے۔ ہر اہل کوئی اختیار بھی رکھتی ہے اور ہر کہانی کو نہ کسی انجام سے جھکنا ہوتی ہے۔ ان کی کہانی بھی سسکس سے بھر پور تھی مگر ہر سسکی شیرازی کا انہماک نہ خود کو اور نہیں ہوتا بلکہ اکثر انجام کچھ ایسی خوف ناک اور یاں آئیز صورتیں اختیار کر لیتے ہیں کہ ان کے کلمے اثرات سے افکار انتہائی مشکل امر ہو جاتا ہے۔ ایک خاصا عرصہ ایک ساتھ گزارنے کے باوجود وہ میاں بی بی

کے طور پر بھی کسی ایسے عمل سے نہ گزرے جس کے نتیجہ میں آگے نسل بڑھنے کی کوئی امید ہو سکتی ہو۔

ایک رات وہ دونوں سمندری سانپوں کے جوڑے کی مانند آپس میں الجھے پکچھے سوئے پڑے تھے۔ آدھی رات پیچھے آدھی آگے۔ نیلم تنگھ نے اسے ہلکا سا جھنجھوڑ کر جگایا۔ وہ نیم خنودگی کے عالم میں اسے متنبہ نہ کئے گئی۔ نیلم تنگھ کے آنکھوں میں اک عجیب سی چوندا چوندا تھی جو اس سے پہلے کبھی دکھائی نہ دی تھی۔ جب لگاتار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ گالوں پر حیا کا کھال۔ نیم واسٹیلے گینے ہونٹوں پر اک نامعلوم سی قرقر آہٹ۔ جو کسی کو پدم لینے کی خواہش پر در آتی ہے۔ اس کے سانپ کی مانند ریگتے ہوئے ہاتھ اس کے جسم کے ایسے حصوں پر سرسراٹے گئے جہاں اس سے پیشتر ان کی رسائی ممکن نہ ہوئی تھی۔ وہ ابھی صبح سے اس صورت حال کو سمجھ نہ پائی تھی کہ وہ سرگوشی کے انداز میں اس کے کان کی لو کو چومتے ہوئے کہنے لگا۔

”نسہانی! آج رات کچھ کچھ ضرور ہونے والا ہے۔“

”کیا ہونے والا ہے؟“ سنبل نے پوری آنکھیں ڈاکرتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ تو پتا ہے اس سے پہلے نہیں جوا۔ میرے شانے جھنجھوڑ کر کسی نے جگایا ہے۔“ گوشی میں کہا۔

”جس میں ایک سے زائد اصل والے لے کر حمل کر کے لائی گئی ہو۔“ سنبل نے کہا۔

”سنبل! نے اشتیاق بھری نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کہاں ہے یہ سب کچھ؟“

”اُس اجنبی بوڑھے نے یہ سب سنا لیا۔“ سنبل نے کہا۔

”میں صبح سویرے پوچھنے ہی آؤں گا اور تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔“

سنبل یہ کھانن کر رہی ہوگی۔ چند لمبے مجبب سی نظروں سے اسے ٹھوڑتی رہی۔

”اگر اچھا قرینے سے بیجا نہ ہوا تھا۔ آنکھوں میں روشنی سے مائے لہر ہے اور چہرے کے خدو خال آپس میں

کھٹکے اور ہے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے وہ انداز سے دہلیسی گئی۔ خود کو سنبا لے کر صورت حال کا صحیح

تھکا۔ اصل کرنے کی نہ طر اس نے فائن چاہا۔ اسے اپنے تنگ صلی کوڑ کرنے کے لئے پانی کی ضرورت

تھی اور ہی تھی مگر نیلم تنگھ نے اسے اپنی گرفت سے نکلنے نہ دیا۔

”نسہانی! میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے۔ مجھے ایک لمحے کے لئے بھی تہامت چھوڑنا۔ مجھے

بے حد جذب کر لو۔ وہ بوڑھا مجھے ہی اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آیا ہے اور لے کر ہی جائے گا مگر میں

نہیں کیا لائیں جانا چاہتا۔ تمہارے بغیر میں ادھر رہوں۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے اس کی ٹھٹھی زانگوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ پھر وہیں سے مزید گویا ہوا۔
 ”سہانی! میرے اندر کوئی طوطا بول رہا ہے کہ میںیں باغیرہ خالی کرنے والا ہوں اور یہ بھی کہ میںیں اپنے
 ہی از جاؤں گا۔ اس آواز میں تم میرا ساتھ نہیں دے سکو گی۔ یہی سنے کا امر دکھائی دیتا ہے۔“
 سہانی نے کچھ بولنا چاہا تو اس نے اس کے لبوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔ غصہ اباتھ جس میں ہلکا سا ارتعاش
 تھا۔ ایسا ہاتھ جو دوسرے ہاتھ سے چھوئے والا ہو۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔
 ”تم صرف سناؤ کچھ کیومت۔ وقت بہت کم ہے۔ سہانی! آج کی رات تمہاری سہاگ رات ہے۔
 فرق صرف اتنا کہ یہ رات ابتداء میں نہیں انتہا پہ آئی ہے اور کیا خوب آئی ہاں! میرے بعد اگر محسوس کرو کہ
 تم ماں بننے والی ہو تو شروع دنوں میں ہی اپنی کوکھ میں رکھ رکھ لینا۔ زب وارت ہو تو پھر کسی وارث کی
 ضرورت نہیں ہوتی۔“
 تھوڑی دیر سکھائی موش رہنے کے بعد مزید کہنے لگا۔

”اگر تم کسی بھی وجہ سے ایسا نہ کر سکو تو پھر زب پہ چھوڑ دیتا۔ میری الماری میں تمام ضروری ترسکتے
 اور دیگر سرکار کے لوازمات ہیں۔ دوسری سوئی کی خشک ستر میری خف عاتیکہ اور کپڑے ہیں۔
 ہاں! تم جب میرا رونا سہی سہی سہی ہو۔ مجھے ہاتھ دھو کر غسل کی ضرورت نہیں۔ میرا رونا میرا رونا میرا رونا
 وصال کا احتجاج ہے۔ میری قبر کے ارد گرد نسل پھیلائی کا خاص انتظام کرنا۔“
 وہ خاصی دیر سوچ رہی تھی۔ اس کی جی دہا دینے والی باتیں سننے کی باتیں سننے کی باتیں سننے کی باتیں
 سننے پہ اسرار کرتا۔ سوچ رہی تھی لیکن کائنات نے کئی چیزیں نکال دی تھیں۔ اس کا رد عمل اس کی لہجوں میں
 پائیت میں آدلی ہوئی باتیں ہیں۔ یہیں اسے یہ بھی احساس ہوا کہ کم از کم غلام سنگھ اس کی طرح سوچتی چلتی ہے
 سے پہلے دیکھتے والا یہ خوف نہیں۔ سراپا خواہوں یا خدا یوں سے بھلنے والے والا بھی نہیں۔ وہ تو خدا سے
 سے بہت زیادہ حقیقت پسند۔ اور حق امر کی کائنات وارنگو اور پہ پاؤں میں نہیں سر کے ملنے والے والا
 ہے۔ انوں نام کا جوان نہیں بھلا۔ جذبہ کفر زائد ہے۔ ایسا حق خود کافی اللہ جو بھولے سے بھلائی میں
 بھی کوئی بات یا حرکت ایسی نہیں کر سکتا جو ہم زب واری یا غیر سنجیدگی کے زمرے میں آتی ہو۔ اس کے بعد
 نہیں وہ کیا کچھ کہتا رہا۔ اب وہ اپنی طرح بچنے لگا تھا۔ جیسے اسے کسی نئی طرح کی نجات کا سامنا
 اور سنبھل سہانی اس کی گرفت میں کسی ہوئی نہ کسی طرح سنبھال رہی تھی کہ کسی طرح کھل کے سانس لینے لگی
 سے اس کی بات سمجھنے کے قابل تو ہو۔ مگر غلام سنگھ تو جیسے اپنے ساتھ اسے پر لوک لے جانے پہ تلا ہوا تھا۔ وہ
 میں ڈوبنے والے اپنے بچانے والے پہ اور یاری گود میں دم دینے والے اپنے یار لے جانے پہ لہجہ آخر گرفت

کہتے ہیں۔ شاید یہی پہلا اور آخری موقعہ ہوتا ہے جو انہیں اپنے نبشتہ و نشتہ جذبات کے ٹکٹ بالآخر تک پہنچاتا ہے۔ ویسے بھی شہل سہانی کے لئے مرنا بھینا ایک طرح سے یکساں ہی تھا۔ چنانچہ اوتا اور شائقی مانتی وغیرہ ایسے لکھنے والے مضموم و معنی نہ رکھتے تھے وہ ادھر وہاں بے ادھر لکھنے پہ وٹاں رکھتی تھی۔

نیلیم سنگھ نے اچانک اسے پوچھنا شروع کر دیا۔ اس وقت اس کا چہرہ دکھتے چرخ کی مانند ہمارا تھا۔ اسے جیسے دیکھتے انگاروں کی تپش اٹھ رہی تھی جبکہ وہ نئی طرح ہانپ بھی رہا تھا۔ سہانی سہانی کہتے ہوئے اس نے نئی طرح اپنے ساتھ لپٹا لیا۔۔۔ رات کا یہ آخری پہرہ ان کے لئے سہاگ پہرہ بن گیا۔ دوسری بار شہل سہانی آج پہلی بار اس لذت سے آشنا ہوئی تھی جو خاندان دیوی کے درمیان ایک ناگزیر حالتِ بدست اور آسودگی سے تعبیر ہوتی ہے۔

اندھیری کے اندرونِ مصلحتوں کے علاقہ کی کسی مسجد سے اذان فجر کے سردی آہنگ سے فضا میں بھائی سی کیفیت چھانی ہوئی تھی۔ نیلیم سنگھ جس نے مسلمان ہونے کے باوجود وہاں سکھوں والا نام رکھا تھا۔ اذان کے درمیان اپنی گفتگو نہ کر دی تھی۔ اذان کے آخری حصہ میں غنیمت سے بہتر نہ کہنے ہی چاہی جان کر سو گیا کہ اب شہل سہانی انہیں گے۔
نیلیم سنگھ نے کہا کہ وہاں جو ہم رہا ہے وہی سکھوں کا ہے تو اس میں سے جان پڑے پانی ہے وہیں حال ہی میں خوراک کی قلت میں پڑے اعضاء کے ساتھ بردستی کرنی پڑتی ہے۔ نتیجہ میں سارا اندھا پن پھارے زندہ کو لے جاتا ہے۔ بہر حال شہل سہانی یا مشوق جنہیں اک اور ہے کی گویا یادیں وہیں بھی جان دینے کا بوا کرمان ہے۔ وہاں دوسرے کا تشکر و نکتہ ہے۔ یہاں اس سے لاپرواہی نظر آتی ہے۔ پورے ہندوستان میں یہی کہہ کر کے پھر دہرا لگاتے ہیں۔

شہل سہانی نے بھی وہاں اندھروں کے علاوہ سب کچھ ایسے ہی کیا۔ اس پہ چادر کاھیلا کر سب پر اپنی صورت حال کا ادراک کیا مسہری کے پیچھے جھانکا۔ عجیب سے کچھ۔ کالیکٹ کر پڑا۔ ہاتھ نہ کھینچا کھولا دیکھا تو وہی کچھ سامان۔ جو نیلیم سنگھ نے بتایا تھا۔ کھنڈر و ٹکڑے ہاتھوں کے سر۔ عطر اور گہرائی دھونے چائے چکنے کے بعد اس نے ماہر شریف اپنی خالہ اور ظہیر وں کو اطلاع دی۔ اسی دن اس کی نماز کے بعد اسلامی طور طریقے کے مطابق ختم کیا کر پایا ختم و مہاشاہ کے قبرستان میں دفن دیا۔ قبر کے لئے ایک قیمتی خزانہ میں خاصی قیمت کے عوض حاصل کر لیا گیا تھا۔ جس میں مزید ایک دو قبروں کے ساتھ ہی کے علاوہ احاطہ اور ارد گرد پھولی پھولاری پودے لگائے پانی اور بجلی کی بھی مناسب انتظام موجود تھا۔ شہل سہانی کے مواقع پر اکثر مذہبی یا رسمی اجتماعات ہوتے ہیں مگر یہاں ان کا کوئی تصور نہ تھا۔ یہاں تک

میں پیدا ہوا تھا جہاں رنگ بھگنواؤں کی باس کے پرانی نیلم سنگھ نے عجیب و غریب حالت میں پران ہمارے تھے۔
 اس کے دوران اس کی خانہ خیموں اور خاندانی اذیتوں نے مدد دی تھی۔ شکل و شماری کے لحاظ سے نو مولود اپنے
 والدہ تھیں اس کے رنگ و ہنگ بھی اس جیسے ہی تھے۔ وہ نکل رہا ہوتا تو لوری سنگھت سے ہی دھیرج
 کا ہوتا۔ گھٹکر و ذول تھاپ کی آوازیں تو جیسے اس کے اندر مدد و جزو آجائے لگتیں۔ نہایت نحیف و نزار
 رہا سپید اور کچھ نیوں والا ملکوتی سا بچہ تھا۔

● عشق میں شرک نہیں ہوتا.....!

وقت گزرتے بھٹکتے دکھائی تو نہیں دیتا بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے بڑے بڑے فاصلے طے کر جاتا ہے۔
 جس طرح وہ پہاڑ کی تہ پہنچتی آجراتی ہیں۔ محض آٹھ گھنٹے میں اس کی خالی ڈول کی مانند ہنڈر ہو جاتی
 ہے۔ اسی طرح وہی اٹھیاں اور کھائیاں جسم بگنوں کی گولیاں ترہنیاں گردنوں کی جھراخیاں ہکا لوں کے
 کال دھکاب 'خیموں' خولوں کے چاند ویاں 'لوں کے پاؤں' کے دھکے موتی واسے اور پھل کھانے
 کے مکان پہنچتے ہیں۔ ان کے لیے کھانا کھانے کے لیے کھانا کھانے کی سورت اختیار کر لیتے
 ہیں۔ اس وقت بھی کسی کو کال کے بے رنگ و آب چھوڑے جھڑ سے جھانے کی مانند ہو جاتی ہے۔ جو
 اسے جھانے اترتے دکھائی نہیں دیتے لیکن بہر طور زبرد و زوال کا عمل جاری رہتا ہے۔ اب یہ تو بڑا کھارہ
 ہے کہ وہ کس گل و گل کے آمیزش سے تشکیل پائی کہ اسے کسی خیر یا برکت کا احساس تک نہ تھا۔ کبھی تو
 اس کی جان پڑتا کہ وہ گوشت پوست سے نہیں کسی آتش فشاں کی لہر سے کی بنی ہوئی ہے۔ نئی ہو اور پانی کا گور
 ہے۔ وہ ازل آثر سرپا کر مل ہے۔ کبھی بھی رست آئے جانے اس کے آٹھ کوئی چلی چلی چلی نہیں لگتی
 ہے۔ اس چند اڑتے سے لے دو رخاؤں میں گھور لیتی اور پھر وہی بے نیازی و بے دانی۔ وقت اس پر نہیں
 بہت ہے سوار تھی۔ اب جو کہیں مرکب وقت نے انگریزی توڑی تو دھڑ سے نیچے آ پڑی۔ ہیٹ کے ایک
 حصے سے اڑ جاتی برس کا لعل سنگھ ہاتھ ہی ہاتھ میں لڑھک لیا۔ ہاتھ لٹکائے پیت جایا اٹھایا اور اس
 کے باپ کے پہلو تیار قبر میں دبا آئی۔ یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

ان باپ بیٹے کے مزار پر ہر وقت نگاہ رکھتے والا کچھ دنوں سے اپنے گاؤں گیا ہوا تھا کہ یہ والدہ پیش
 کیا باپ بیٹے کی قبروں کے درمیان یہ مست المست صابر سنگھ لینا ہوا پایا گیا جسے اپنے ذرا نیور کے ذریعہ وہاں
 سے ہٹایا تھا اور صابر سنگھ نہایت خاموشی سے وہاں سے نکل کر باہر راہ گزر پہ اک شلست سے منڈیر پہ آ نکلتا

اور اس کے پیچھے پیچھے آنے والا وہ کالا سٹن بھی جو مزار کے کتبے کی اوٹ میں بیٹھا ہوا پایا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ سٹنل سہائی کے حراج اس وقت سخت پرہم تھے۔ ایک فضول سا سٹن اور ایک جیب بھول سا ملنگ اسے کسی طور پر بھی گوارہ نہ ہوئے تھے۔ لیکن اندر ہی اندر اپنے بازو پر تاقہ ہلکی سی خانقہ بھی ضرور ہوئی تھی۔ کچھ نہ کچھ تو ایسا تھا جو نیزے کی آئی کی مانند اسے کچوکا سادے گیا تھا۔ صابر سنگھ کی متوحش سرخ آنکھیں حال ہلکا مر جھکا کر ہوئے سے اٹھ کر چل دینا کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا اسے گھائل سا کر گیا تھا۔ یہ کوئی عام ملنگ خٹک دکھائی نہیں دیتا تھا جو گورستانوں، شمشان گھاٹوں یا جنگل بیابانوں میں مارے مارے پائے جاتے ہیں۔ یہ کسی ایسی انجینی ڈال کا پتھر و جان پڑتا تھا جس کے پتیل بیچ کی چیزیں پر تصوی بھیتر کسی انجانے سے سوگ میں اترتی ہوں۔

وہ اپنے روزمرہ کی ٹیبلٹی پی اوڑھتا تھا اور سٹنل سے آج لکڑی کے چلہ ہی فارغ ہو چکی تھی۔ شاید اس کی وجہ اس کے اندر کی آنکھیں پتھر تھیں۔ مزار کی چار باز کے آگے دروازے کا ٹالا ڈالی کر ڈرائیور کے آگے آگے وہ اس پگڑی پہنا کر آگلی جو پندرہ بیس قدم آگے اس راستے سے بڑتی تھی جو گورستان سے باہر پور اندر جاتا تھا اور مسجد کی جانب نکلتا تھا اور اسی راہ پر صابر سنگھ بھی ایک مہذبہ بھڑی آگلی سے آگے میں چلتا تھا جیسے کسی گھوڑے کا قندار۔

اس کے قریب سے گزرتے ہوئے دل کی دھڑکن آج کل کے آگے کی مانند بھڑکی تھی۔ جسم کی ساری پولیس ڈھیلی تھی اسے نظر انداز کرتے ہوئے گزر لینا چاہتی تھی مگر شعلیں ہوتی آنکھیں سے نظر صابر سنگھ پر پڑی تو گزرنا کر رہی تھی۔ چہلپونہ لگتی ہوئی آگلی سے لگتی تھی جس سے پہلے ایک نیا امراری بے نیالی تھی جس میں ششوں جھانکے مار رہی تھی۔ لال بولی آنکھیں اٹھائے وہ اسے گھور رہا تھا۔

ساپ پھوڑا اور مہذبہ ان کی وحشت ہی بہت ہوتی ہے۔ زبردست بے اور زہونہ ہوا تھا۔ تو دہلی جاتا ہے۔ ہپ ہپ ہپ چو چو اور ٹھوٹو۔ آپ یہی منہ سے نکلتا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ خود کو سنبھالے تیر تیر تھوڑوں اس کے برابر سے تو گزر گئی لیکن لگاؤں جیسے کوئی پل صبر اور صبر کے آئی ہو۔ گاڑی کے قریب پہنچ کر ڈرائیور نے آگے بڑھتے ہوئے دروازہ کھولی کر اسے اندر بٹھایا۔ سٹنل سہائی نے ماتھے کا پسینہ لپٹے ہوئے کن اکھوں سے اس دیوانے کی جانب دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے گاڑی بڑھانے کا حکم دیا۔ لیکن اگلے لمحے وہ لکڑی کو کہتے ہوئے دروازہ کھولی کر باہر نکل آئی کیونکہ اس نے صابر سنگھ اور کالے ٹٹے کو داپس مزار کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

وہ ادھر لپکی تو ذرا نیور بھی بھاگا بھاگا پیچھے پہنچ رہا مگر ان کے پیچھے پیچھے وہ دونوں دوبارہ اپنی اپنی جگہ پر ارجمان ہو چکے تھے۔ تب سمنل شہانی اور ذرا نیور کو اپنی جانب پکٹے دیکھ کر ٹٹنے نے بھونکی لگانا شروع کر دی۔ اب جو ذرا نیور قریب پہنچا تو ٹٹنے نے اچک کر اس کی پنڈلی پر دانت رکھ دیئے۔ ذرا نیور کی چیخ اور ان دونوں کی دھمکتی دیکھ کر یہ آپے سے باہر ہوئی۔ آؤ دیکھنا تافہ جھٹ پوس سے چھوٹا سا پوسٹل نکالا اور ٹٹنے پہ میگزین خالی کر دیا۔ یہ سب کچھ یوں آفاقانہ ہوا کہ اسے خود سمجھ نہ آیا کہ یہ سب کچھ اس سے کیونکر سرزد ہو گیا۔ ٹٹنے پیارے کی کیا اوقات تھی چھ عدد گرم گرم گولیوں نے اسے ٹوم کر رکھ دیا تھا جبکہ کسی کالے کے لئے تو ریٹھے کی اک بے ضرری کالی گولی بھی کافی ہوتی ہے۔ ٹٹنے سے نکلنے والی آخری چوڑ کے وقت اس کی کھلی آنکھوں کا رخ صابر سنگھ کی جانب تھا۔

اُدھر صابر اوہیں باب پہنچے کی قبروں کے درمیان اپنی آڑی بے عیازی دے مٹی کے ساتھ نیم آڑوں پر اہوا تھا۔ ٹٹنے کی آخری پیڑوں تو کیا اس کی آنکھیں تو گولیوں کی توجہ سے بھی کھلی تھیں کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ مستحق ذرہ نشوں سمجھ دیوں کے لئے راوی چھن ہی چھن نکلتا ہے مین ہی مین نہیں۔ کوئے پار سے نکلیں یا سونے دار نہیں ان کے پائے استکان میں فروغ شہر تھے۔

غیر ہوا کی صورت پر اس کے بے خبری سے اس کی جانب سے کی جا رہی تھی کہ وہ ہاتھ دھڑکی مٹی کے مقابل۔ یہ بھی خیال نہ رہا کہ میگزین خالی ہے۔ یہ احساس ابھرتے ہی اس کے غنڈی مٹی کی آنکھوں میں جھانک توں ہوائی فیل کو دھکی۔ کھڑے کے ہنسنے کی سی آواز ابھری۔

”ایک تو سر گیا اب اس کھٹکے کا بھی فیصلہ نہ ہو گا۔ یہ وہاں شہر تھا۔“

”انہوں نے میرے پوسٹل میں کوئی گولی نہیں۔ نہیں تو تمہارا فیصلہ بھی اس ٹٹنے کے ساتھ ہی ہو جاتا۔ تم دونوں نے اسی جگہ کو بپاک کر دیا ہے۔ ایک تو انجام کو پہنچ گیا مگر شاید تمہارا انجام میرے جیوں نہیں کھٹا۔“

”میرا انت تمہارے ہاتھوں ہی ہے آج نہیں تو کل۔ تم غصہ و میرا فیصلہ کرو گی۔۔۔ کلیر شریف میں جری دوبار والی مائی جی نے یہی شکم دے کر مجھے یہاں بھیجا ہے۔ اس سے پہلے بابا جی نے بھی یہی کہا تھا کہ تمہارا آتم انت ناہیم شریف والی مائی کے پاس ہے۔ مجھے یہاں اس حصار پر بڑا آئندہ ملا ہے۔ اجازت ہو تو میں یہاں پڑا رہوں گا۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر خون میں نہانے ہوئے ٹٹنے کے پاس اٹھ آیا۔ اس کے خون سے ہاتھ بھگو کر اس سے مخاطب ہوا۔

دو ٹکٹے کی لاش کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”یہی اک میرا وفادار ساتھی تھا۔ جو کلکٹر ٹریف سے میرے سنگ آیا تھا۔ اب تو اس کا مزار بھی اسی لاش میں ہے گا اور میں یہاں مجاور بن کر بیٹھوں گا۔“

”سُن، سُن، سُن۔“ سنبل سہانی پہ جیسے ہڈیائی سی کیفیت خاری ہو گئی۔ وہ وہیں کنبیوں پہ ہاتھ رکھے بیٹھ گئی۔ اسے غصہ لگیں لگا ہوں سے تو متی ہوئی پھر ٹٹے ٹٹے کی کردار دے گئی۔

صابر سنگھ نے اک عجیب سی وجدانی کیفیت میں منہ اٹھا کر بھوؤں بھوؤں کی ہانک لگائی۔ پھر سننے والوں نے سنا کہ گورستان میں ہر منہ بھوؤں بھوؤں کی بازگشت کو جے لگی تھی۔

● سُننا سُننا کر دی فی میں آپ سُننا ہوئی۔

اس سہولت کے واقعہ کے بعد تو جیسے اس کا چین لہ گیا تھا۔ اک عجیب سی بے کئی نے اسے اپنے حصار میں بکڑ لیا تھا۔ روشن دن تو کسی نہ کسی طرح کٹ جاتا تھا مگر کئی پھیلتے ہی جیسے اس کا کھینچا جاتا ہے۔ کانوں میں بھونک بھونک آواز آتی ہے۔ یہ سنا کر اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھتے ہی رہتے ہیں۔ ان کے کمرے پر ہاتھ آواز آتی ہے۔ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ بڑا بڑا منہ مگر بے کئی لاکھ کے کمرے کہیں کچھ بھونک بھونک آواز آتی ہے۔ گزیرے دھارے میں گزیرے کو آواز دینا شروع کر دیتا ہے۔

ایسا ہی کچھ حال اس کا بھی ہوا۔ صحت کے ساتھ ساتھ زبان بھی گھٹ گئی تھی۔ نوکر چاکر رشتہ دار تو جان بچاتے بکرتے ہی تھے۔ یہ خود اپنے آپ سے جان بچانی رہی تھی۔ بسنا سنا کرانا کھانا پینا کھلنا پھلنا سنورنا۔ تیرے ہاتھ نہ ہی کا۔ دیکھا۔ وہ کئی روز سے قبرستان نہیں جاسکتی تھی۔ شراعت سے ہی اک مخصوص سے اس کا مزار پہ رخصتی اور پھول پتی ہر روز کا معمول تھا لیکن اب وہاں کا تصور بھی اس کے لئے سہاں نہ رہا تھا۔

بھوؤں بھوؤں کی دل آزار آوازوں سے تنگ آ کر اس نے اپنے طبیعت کے دردوں کو گزیرے کی اس کلکٹر تک کر دیا تھی مگر وہی بات کہ باہر کے شہر سے تو کان بچائے جاسکتے ہیں مگر اندر کے شہر سے جان بچانا مشکل پڑتا ہے۔ بہت ہی بولی شور و غوغا سے کان اور دماغ بچتے گھٹتے ہیں جبکہ اندرونی شورش و ہلچل سے وجود و وجدان لرزے لگتے ہیں۔

آہنگِ نشتِ سواد و سوزِ صدا و کراہ و فیرہ لرزش کا نمایاں نہ ہی تو ہوتے ہیں۔ تنہا و اک تار اُتار پیرا ہوا۔۔۔ ستارہ ہو یا سورگی نر منڈل یا مستور یہ سب لرزے کچکپانے پھیرنے کے گد گدانے کے سہارے ہیں۔

رُخس (خود) انگشت و کمانا خون بہتر مضطرب مضطرب اکثری آہنی یہ سب اٹھاتے ہی تو ہیں۔

لہذا قریب و دور کہیں بھی بھونکی لے اس کے کان کھڑے اور دل بیٹھنے لگتا۔ بے کلی، خستہ منی، بے طرح کی توڑ پھوڑ و چند ہو جاتی کافوں میں اٹھیاں گھسیڑے، دروازے کھڑکیاں بند کرنا شروع کر دیتی۔ ایک عجیب بات کہ سوتے کے بھونکنے پہ اس کے ذہن میں لٹکتا نہیں بلکہ صابر سلگے کا تصور ابھر جاتا۔ بس وہیں سادے مناظر آسرو شروع ہو جاتے جو عمر صد پہلے قبرستان میں وقوع پذیر ہو چکے تھے۔ وقت کچھ اور آگے چلا تو اس کا ایک ملازم جس کے ذمہ قبرستان جانا اور اس کی جانب سے پھول جتنی آگرمتی اور صفائی ستھرائی کر دینی وغیرہ کے انتظامات کرنا تھا بغیر اطلاع غائب ہو گیا۔ وہ کوئی ایسا غیر ذمہ داری یا بازار میں ملازم بھی نہیں تھا کہ جن کے آنے جانے کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا وہ بھر دے کا بندہ تھا۔ تیسرے روز اس کی بیوی نے کسی ہسپتال سے اطلاع بھجووائی کہ اس کا خاوند ذہنی طور پر بیمار ہو چکا ہے لہذا اسے عمومیہ خدمات سرانجام دینے سے قاصر کر دیا جائے۔ مزید کرید نے سے پتہ چلا کہ وہ سنگ آزاری کے مرض میں مبتلا ہو چکا ہے۔

اور اس صبا میرے نے اس کی موت مار کر رکھ دی ہوئی تھی۔ وہ سارا گھر اور دن اور رات میں قبروں کے درمیان پڑا رہتا۔ کھانا چپکا، ٹبک ٹوٹ، سو جاؤ گا اور دوبارہ زندگی کے لوہے سے اس کے لیے اپنی اہلیت کو بنائے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ سب تو میری دل کی بات ہے آتے ہی آتے ہوتے۔ وہ شاید قبل شہائی کی راوی بختیار بتاتا تھا جو اس دن کے بعد اسے دکھائی نہیں دی تھی۔ انکی کے علاوہ اسے جہانگیر یاد تھا۔ انسانی منہ میں تنگدور وہ جیسے فراموش کر پڑتا تھا۔ ذاتی طور پر معذور ہوئے وہ اپنے ملازم نے اپنے تنہا بہتری کو کشش سنت کی کسی طرح بھیج دیا۔ ان قبروں کا بیچھا چھوڑا۔ وہ ان کے سامنے کھانا بیٹھا بھی رکھتا تھا۔ پیچھے کی صفائی پر پلنگھالی کے علاوہ اس سے محبت و عقیدت سے بھی پیش آتا۔ مگر یہ اس کے برعکس مسکراتے ہو اب جہانگیر بھی نکلتے سے ویجا۔ ملازم چاہتا تھا کہ جس روز اس کی مانگیں نے اسے دیا اسے کو قبروں پہ لے کر رکھ لیا۔ اس دن اس کی چٹخنی ہو جائے گی۔

منہیں اگلے روز خواتین قبرستان پہنچی گئی۔ وہاں کار سے اترتے ہی ادھر ادھر کے ٹپٹوں نے بھونک کر شرم دیا۔ اسے کیا ٹپٹ کہ ان آوازوں میں ایک آواز انہیں دلیحانے کی بھی ہے جس نے کئی دنوں کی رنج و ملال سے آواز سے بھائی ہے۔

ادھر صابو آتے دیکھتے ہی دیوانہ وار پکا۔ ہاؤس دیوار پر قبریں چھاونے کی طرح بھر گئی۔ اس کے سامنے یوں نبوسیاں کھا کھا کر بچنے لگا جیسے پالتو کتا کھوت بعد گھر لوٹنے والے مالک کے آگے ہے۔

فحش ہو یا تری جنگل ویرانہ۔ شمشان گورستان، سماجی آستانہ۔ دریا گھاٹے، کنواں ہاؤس، چور
یہ فقیر رویش، مجذوب عاشق اپنی کچی چادر پارسی میں پائے جائیں گے۔ ہر چند کہ سب گئے، کوئے کیو تو
یگھوئے اپنی قامت و شہادت، خود خساگل اور محاسن و معائب کی ہلکی بھاری تفریق و تفصیل سمیت ایک سے
دوستے ہیں۔ تاہم چنداں، چنیدہ بخت اپنے ہم ذاتوں ہم جنسوں میں ایسے اولی اوقات و مراعات ٹھہرے کہ
باعث رشک بن کر ضرب الامثال و تمثال ہوئے۔ کوئی دغا، تسلیم اور صبر کا پیکر۔ اور کوئی اپنے اندر
کائناتیں ملائیں پڑھ کر ریں دبکائے۔ پیا رنگ کی تصویر اور تفسیر کا لاشعرا فقیر۔ گئے اور کوئے تو اس سے
جلے ہوئے ہیں جب خیند بھی ذرا کی ذرا نیکی لے لیتی ہے۔ شب زندہ دار، خود کو زندہ کیئے ہوتا ہے تو کوئی یاد
سانسوں کی مبرکار سے تار نفس میں موتی پرور رہا ہوتا ہے۔ قعود میں چرا کوئی تجھ میں گرا اور کوئی کسی کے
میں گرا۔ کوئی زہری اور کوئی چو کہ ہری ہیں۔ لکھیں جاہم فدا ہیں تو کھیں پائے پختیں۔ ہر ذی نفس کسی
تہ کہیں و ہر اکر یہ ملائی فقیر۔ جو بن ماں باپ پیدا ہوا، موذن اول سورے، سورج سے خیر سے سب
سلا مت اور جہاں کی پھر ہے۔

نہیں چاہئے کہ ان کو ان کے گھر سے دور کر دیا جائے۔ ان کو ان کے گھر سے دور کر دینا ان کے لیے ایک بڑا شوک ہے۔ ان کو ان کے گھر سے دور کر دینا ان کے لیے ایک بڑا شوک ہے۔

فہمہ کو جاہا امیہ کیا خط لے یاں مجھیاں — ہے نہ سے بال کی طرح تو نہیں جو نہ ماقہا کر کے کہتا
جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو کوئی کسی کے لئے نہ بھی کیا ملتا ہے۔ جب اپنی ہی گوئی نہ ہے تو دوسرے کی ہر
کچھ لگے؟ البتہ یہ مشورہ ضرور مذکور کہ یہ عرماش کی رال چننے کے لئے نہیں سوز و غلظت اور آگ و آب
بسانے کی ہوتی ہے اور یہ بھی کہ جوانی کی چوٹی غصہ اور بوجھ ہے میں یہ کی ہوتی ہوتی ہے۔ جوان نہ
کہ سلیقہ ملے بن جاتی ہے اور اگر بوجھ ملے پڑھائے تو کوساویوں کا تعلق بن جاتی ہے۔ سارا ملے نہ ہو
اور کھانا ملے کی کھانا ملے.....!

ہاں اس وقت نے کیا چنے چنے پنا مارا کہ دیکھتے سننے والوں کے من ہارے حیرت منحل کئے۔ اس کے شوہر جس سے پہلی رات کھڑے کھڑے طلاق لکھوا لی تھی۔ اسے کمال رضا و رغبت مناکت کا پیغام

خیز مناظر کی ہولناکی کو اپنی ریزہ کی ہڈی میں اترتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ کچھ ہنسنے اور کروڑا متحرک بھی ہیں۔ غور کریں ایک برہنہ خوبصورت ڈوشیزہ جس کے سڈول جسم کے ابھار گولیاں اڑ گئیں پچھے ڈھلوانے اٹھا نہیں قیامت اٹھا رہی ہوں۔ ہاتھ میں ایک خطرناک چرمی چابک اٹھائے ایک ارجیز عمر مردکی ڈھلوانی کر رہی ہے۔ ہر چوٹ پہ شراپ سی آواز ابھرتی ہے اور اس مرد کا سارا جسم کانپ اٹھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مضروب کے غصہ سے آگ تسکین آمیز سسکی نکلتی ہے۔ چہرے پہ لہمانیت کی لہریں ابھرتی ہیں اور وہ سہرا اٹھا کر اس جلاؤ عورت کو تحسین بھری نظروں سے دس سود کرتا ہے۔ اسی طرح کہیں کوئی مرد کسی عورت کو بیٹروں سے پیست رہا ہے۔ کہیں وحشی مرد آجہی بنوں والے ہات سے بیک وقت کسی برہنہ عورت کو مار رہا ہے۔ ایسے ہی مناظر کہ جن میں نر بریت و وحشت شیطانت اور جنسی خباثت کو اجاگر کیا گیا۔ مرد اور عورت کے ایسے ایسے جامے اور جوتے میل لک کہ جن کے اندر سیدھی منھیں لٹکی ہوئی ہیں۔ سر سے ان کی ٹاپاں ہیبت خارا دروستانے وغیرہ غرضیکہ آگ جہان غرامت ہے جو وہاں سما ہوا ہے۔ دنیا کی کوئی قوم ملک ایسا نہیں جن کے باشندے وہی خرید و فروخت نہ کر رہے ہوں۔ بڑے بڑے عجیبہ وادار عالی نسل و حسب لوگ یہاں سے بھی نوحہ کی سنگساریں اٹھیں کیست طرح سے دکھائی دیتے ہیں۔

UrduPhoto.com

اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ ایک شخص کسی من چاہی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن یہ عورت اس کے پاس آتی شریف اکاؤنٹ شہرت والا ہے۔ ان حالات میں قصداً خود کو خود اڑتی میں دھکا کر لیتا ہے۔ اس کے انکی عورت سے برہنہ و وحشت شادی کرتا ہے جو کسی طور اس کی پسند سے بچتا نہیں آتی۔ اس طرح نہ سہلی سے ساری زندگی خود اڑتی میں بسر کر لیتا ہے اور کہیں بھی خود اڑتی وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ سر خوشی میں بسر کرتا ہو کر اس کی تسکین کا سبب بھی بن جاتی ہے۔

شاید اس سوداگر نے کے ساتھ بھی یہی خود اڑتی والا معاملہ بن گیا ہوگا۔ وہ اپنے کاروباری کاموں کے مطابق حساب کتاب میں بڑا انجیک ٹھاک بندو تھا۔ آج ہاں والا اور خود اڑ۔ گو پہلی راست ہی دیوی کی طرف سے طلاق کا تھک ملنے پہ اس کی کافی بعد از می تھی۔ لیکن صد افریقہ کی سمجھی اس نے سبیل نہانی کے خلاف اپنے لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں نکالا تھا۔ ہر بات ہر رسوائی کو اپنی پندھ منوں کی شادی کا تھک جان کر سب پر تھک۔ اس نے بھی گھر میں شادی کی بات پیچیدگی کی تو اس نے یہی کہا کہ میری دیوی بنے گی تو وہی۔ ورنہ کہیں کہیں نہیں ہوگی۔ عیلم شادی کی شادی کے موقع پہ اور اس کے مرلے پہ بھی لگی اس کے ہاں نہیں کیا تھا۔ محراب میں دیوانے اور کالے لٹنے کا عجیب و غریب قصہ اور اس کی درمادگی کاٹن کر اس سے نہ رہا گیا۔ وہ آگے کے

سنبھل سنبھانی کی غم زدہ اماں کے پاس پہنچا۔ تمام حالات جان کر اپنا تعاون پیش کیا۔ اماں بے چاری پہلے ہی شرمندہ تھی اسے اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ تھی۔ بجائے کچھ جواب دینے کے بیساختہ رو پڑی۔ وہ پاؤں کو جڑاتے ہوئے کہنے لگا۔

اماں! مجھے آپ اور آپ کی بیٹی سے کوئی شکایت نہیں۔ افسوس صرف اپنی بد نصیبی پہ ہے کہ میں آپ اور آپ کی بیٹی کے کسی کام نہ آسکا۔ آپ نے جب مجھے اپنی فرزندگی میں قبول کیا تھا تو یہی نیت کہ میں ایک بیٹے کی کمی بھی پوری کروں گا۔ والے نصیب! میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اب ان نامساعد حالات میں جب کوئی گھر میں محرم مرد موجود نہیں نہیں ایک مرتبہ پھر بیٹا بن کر آپ کے دکھ سکھ بانٹنا چاہتا ہوں۔“

اب یہ نہیں سنبھل کی اماں نے اس کی ہمدردانہ پیشکش کو کس انداز میں لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اماں اس کے اخلاق و اخلاص کے گمن گانے لگی اور وہ بھی وہی قحط و قحطی کے ارشاد و اقصیل میں پیش پیش رہنے لگا۔ پھر وقت کا دیلت کچھ یوں گھوما اور عقد نکاح کا رنگ بال بھلکتا سنبھلتا لڑکھڑاتا کچھ ایسے پڑا کہ وہ مگر گھر کا سبز گھر تھا۔

کیسے ہو میں جوئے کی گھومنے والی تشری کو ذرا سے چکر دے کر دیشے کی گولی سے ذرا ڈھکا اپنا تھی و انت واسطیہ بال تشری کے چکر کے لئے لڑخ گھوما دیا جاتا ہے۔ تشری جس کے کناروں پر خونی سیاہ خانے سے ہوتے ہیں۔ ان خانوں سے شرم کی اور چاہیں پیچاس سے دھندلے ہوتے ہیں۔ شرم کا باز شرم یا سیاہ خانے پر ٹپکتے ہیں۔ جو جیتے کی صورت میں آگنی آتی ہے۔ کچھ پائے تجر بہ کار لیسوں پر لگاتے ہیں۔ اس میں جیتے کے چاکر کچھ ہوتے ہیں۔ لیکن جیتے کی صورت میں ایک کے مقابلے میں آٹھس ملتے ہیں۔ ان سے اعداد اور گانے شرم کا آگنی کے درمیان ایک ہی زمانہ پھر رنگ اور منظر لہجہ کا بھی ہوتا ہے۔ اس سرفرد سے خانے میں اگر بال رک جائے تو اس وقت دانہ پکلی ہوئی تمام غم ہافس کی ہوتی ہے۔ یعنی تمام جواری ہار جاتے ہیں اور جواہر کرانے والے جیت جاتے ہیں۔ لیکن ایسا ہوتا بہت کم ہے۔

پہلی بار وقت کا دیلت کچھ یوں گھوما تھا کہ بال شرم گھر میں براہتے ہوئے دکھائی دیا۔ لیکن گھر زون میں یوں اچھل کر سبز کوٹھے میں جا پڑا کہ ساری بازی کا لڑخ ان پلٹ گیا۔ وہ اپنے اخلاق و اخلاص سے ماں کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دو ماہ بعد ماہ رمضان سستا میسویں کی بابرکت رات کسی نکاح گاہ نے انہیں مناکحت میں باندھ دیا جس نے ان کا پہلا عقد پر خانے کی بھی سعادت حاصل کی تھی۔

جیت کے رنگ بھی نیارے ہوتے ہیں جبکہ اوجہ قسمت بھی عجیب عجیب کیلیاتی ہے اور حضرت انسان تو اپنی حق حرائق سے ایسے ایسے تھل پھٹے دکھاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ ان ہونیاں اور حادے بھی اگر نہ ہوں تو نہ کچھ بھائی رہے اور نہ ہی انسان بھیکر انسانیت میں برقرار رہے۔ جو لوگ اپنا پرست ہوتے ہیں۔

خود پسندی، غرور و تکبر کو اپنی محتاج اور خود کو عقل نکل کا مالک سمجھ لیتے ہیں اور اپنے تئیں تصور کر لیتے ہیں کہ ان کے 'حسن'، 'دولت'، 'طاقت' اور 'شہرت' کا نورجنگھی ٹکس گھٹانے لگا۔ سدا یوں ہی ہر سے بھرے قابل قدر اور چاہے جانے کے قابل رہیں گے تو ان کی مثال ایسے ترکستہ پسند بھولے بھالے امیق مگر خوبصورت جانوروں کی طرح گھوڑے، موز، کیوڑ جیسی ہے جن کو ترکستہ لے ڈالتی ہے۔ !

سنبھل سنبھاتی کو یہ صابر مہذب اور کالائیکٹا لے ڈوہا تھا۔ ڈوبتے ڈوبتے اتفاق سے اس کے ہاتھ اچانک اس کے ساتھ شوہر کا دامن آگیا جسے تھاے دو بچہ زندگی کے کنارے تک آگلی تھی۔ ڈوبنے والے کے لئے سب سے پہلا اور بڑا مسئلہ صرف اور صرف ہلاکت سے خود کو محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔ سو ساتھ شوہر سے نکال کر کے اس نے وقتی طور پر سہی خود کو کس قدر محفوظ کر لیا تھا۔ بیوی دوستی ہواری تو کھٹکھٹکار کا رنگ دیکھو اگر نے میسر آ جائے تو پھر ساتھیں پہلی ہی اہمیت کے حامل نہیں رہتے۔

شادی کی شب قبل غمزدہی میں داخل ہوا تو اس سے وہی انداز اختیار ہوا جو پہلی مرتبہ ملو تھا۔

”میں نے تم کو دیکھا ہے“ اس نے کہا۔ ”وہ چہ؟“ اس نے کہا۔ ”وہ چہ؟“ اس نے کہا۔ ”وہ چہ؟“ اس نے کہا۔

UrduPhoto.com

”اب آگے بڑھ کر اس پائیں میں کی دھڑکھولیں۔“

حکیم کی تحریک اس آگے بڑھتے ہوئے اس نے دھڑکھولی۔

”انداز سے لگائی۔“ اس نے کہا۔ ”وہ چہ؟“ اس نے کہا۔ ”وہ چہ؟“ اس نے کہا۔

اس نے ایسا ہی کیا۔ اتفاق کے اندر کا انداز پہ لکھا تھا تو ان کے بعد آپ نہیں بلکہ میں آپ کے پاس پابند رہوں گی۔ اب آپ میری جانب بڑھیں اور چہرے سے کھوتھتے اٹھائیں۔ آپ کی دلہن منتظر ہے۔ کہنے کو تو وہ اب اس کے حکیم کی پابند ٹھہری تھی مگر اولیٰ بے چارہ وہی کچھ کرتا رہا جو وہ چاہتی رہی۔ معلوم ہوا شاہ و بتالوں اور نایب فضاہوں کی بندگی اور نیاز مندی میں بھی ایک طرح کی تھکات و تھکام ہی ہوتا ہے۔ لاکھ پیچھے پیچھے دکھائی دیتی مگر اصل صورت وہ چھائے چھائے ہی ہوتے ہیں۔ ان کی مثال غریبوں کے ہاتھوں کی ہوتی ہے کہ ہر حال میں غریب وہی کشادہ، پھری ہی کا تھی ہے۔

شادی کے کچھ ہی دنوں بعد اس نے محمد علی روڈ سے اپنی رہائش تبدیل کر کے اٹلی پائیت کے محلہ چائ علاقے میں اختیار کر لی تھی۔ ساتویں مالے پہ دو بیڈ روم والا یہ فلیٹ بے حد نیا آسائش نو بہ صورت میں تھا۔ دلہن کو تحفے میں ملنے والی اس رہائش گاہ کی چند لمبائیاں خوبیاں تھیں۔ سامنے ڈوبر تک منوئی ذرا صبح

[illegible]

کہتے ہیں کہ جس کے گھر میں بھینس موجود ہو اسے باہر سے روک لیتے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پر کیا
 کہے کہ انسان فطرتاً ایک ہی کھوٹے پہ بندھے رہتا گوارد نہیں کرتی۔ گھر کے فوٹ خانے میں کیا کچھ
 روک نہیں ہوتا ہے لیکن باہر بھی لوگ باہر کے کھاتے کھا لے کھاتے ہیں۔ اسی طرح وہاں شخصیت 'عزت'، 'عزت'
 'عزت' و 'عزت' اور پاک و طہا کے حاصل ہوتے ہوئے بھی یہ یہاں بے صفات انسان 'فصوص' فطرتاً ہی وقت
 حرم و حرام اور بے وفائی و بددیانتی کا مظاہرہ کرنے میں عار محسوس نہیں کرتا۔ گھڑی میں تو لہ گھڑی میں
 پل میں پل گھڑی پل میں بتا رہا یعنی یہی بشریت کا خاصہ کہ اسے کہیں ثبات نہیں۔ یہ ثابت رو ہی نہیں

سکن۔۔۔ تغیر تسامیل، تنوین، تملک، اہم، توہم، تخرق، تفاخر، تنقید، تلامذہ، تیلی وغیرہ اس کی پختیلی پودھرے رہتے ہیں۔
 ناگ کی سیدھ چلنے۔۔۔ اظہار، قریہ، قول میں قائم رہنے سے اس کی کایا کا پسے نکلتی ہے۔ اس کی ایسی کلپن مٹی کو
 پوری حیاتی کد کدورتی اور کل کل میں ہی گزر جاتی ہے۔

وقت کا پیہر تبدیلی کا قیل دینے سے ایک بار پھر جیسے تیسے زواہاں ہو گیا تھا۔ اصول حرکت ہے کدورت
 میں یکسانی نہیں ہوتی۔ جن عناصر آوازوں، سوچوں، خیالوں سے بد کی ہوئی وہ یہاں نئی پناہوں میں پختی تھی۔
 اب یہی چیزیں شدید شدت سے اسے اپنی جانب کھینچتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔۔۔ ڈھول، ڈھالے، قوالی،
 اور گھٹوں کے بھونکنے کی آوازیں۔ نشے کی ٹوٹ والا جس طرح دیوانہ وار اپنی خوراک کے حصول کے لئے
 سرگرداں ہوتا ہے اور ہر جائز و ناجائز لکڑی سے حاصل کر کے ہی چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح اب اس کی حالت
 بھی ہونے لگی۔۔۔ سدا کا وہ سسٹم، فیم ذالیم کھول کر ڈھول قوالیاں، سنجی۔۔۔ گھٹوں کی آوازیں سننے کے لئے
 کھڑکیاں کھول دیتی۔۔۔ اسی پرانی دور میں سے حاجی بابا کے حراز کے غدارے، کھیتی راجی، شوہر جی،
 سب کچھ کھینچتے ہوئے بھی خاموش اور صبر کرنے۔۔۔ مجھوتہ، اس کی تو "آف اللہ" اور کچھ کہہ بھی سکتے
 سکتے "اولیٰ علیہ السلام"۔۔۔ اس کی پس منظر میں۔۔۔

پران، خرام پنی سے بائیں بغل، راز سے باہر کی باز کو چھوڑ تو ایک پتلا سا بازار کھلتا ہے۔۔۔ چلوں،
 سست بازار، اس کے لئے مختلف جمل پوری، بھوجن کھا ہے، تسیجاں، سترے، نو پال،۔۔۔ سپوں، گھوگنوں کو، ہر
 کے زپوز کھلونے۔۔۔ بھلی، ناریل، میں کو پانی پھٹکا، گھٹا،۔۔۔ کھانا، چھانچوں کے سلاو وغیرہ۔۔۔ دھلوں سے
 اترتے ہی سامنے نیلے سدرے میں اک لوٹوئے بکر کے ماتھ، مٹکا ہوا حاجی بابا کا مزار نظر آتا ہے۔ گشت
 جیسے مہ بان مہان سا کرنے پختیلی اور پمپا کے چھوٹوں اور گھٹوں سے بھری نوکری اپنے کشادہ بازوؤں میں تھام
 رکھی ہو۔ ہل کھاتی ہوئی اک پکلی ٹکڑی چمکڑی، جس کے دونوں اطراف پتھر اور کنکریٹ کے بڑے بڑے
 بارک چڑے ہوئے اور سامنے درگا و شریف تک راز و کھاتی دیتے ہیں۔ اس جگہ سے راستے کو جھڑا ہے۔
 وقت نام بکر سمندر کا جھٹ بن جاتا ہے نہ تو سڑک کہا جاسکتا ہے اور نہ چمکڑی۔ یہ کوئی درمیانی سی جگہ ہے
 جس کے دور دورے پر پتھر اور بھک مٹے پتھریوں کی مانند چھٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ بولہ سے جوان بچے عورتیں،
 لوگ لنگڑے، اندھے، فرسید، برنوج، قبیل کا تغیر، فقر، ایساں اپنی اپنی آلات جگہ پڑھ رہا ہوتا ہے۔
 تو وہ جواز ل اڑیل سے پیدا ہی نہیں یہ ہوئے۔ کچھ وہ جو بولی دامد بڑے کر اور دھڑلے سے پڑھ بیٹھے۔
 کمال ہے کہ یہ اس زائر سے بھی دان بھٹکا، نکلا لیتے ہیں جس کے پاس زہر بھانکنے کو پھوٹی کوڑی تھک

ریت پہ اتر آئی تھی اور بہت آگے سامنے ایک جہازی پتھر پہ صابر دیوانہ بیٹھا اس کو آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

روزمرہ معمول کے مطابق دو چار بار ٹیلیفون کھمایا مگر سوداگر بچے کو کوئی جواب موصول نہ ہوا۔
 بڈنگ کے گمران سے پتہ چلا کہ وہ صبح ہی عجیب و غریب حال خلیے میں باہر نکل گئی تھی۔ اندر کا طوطا
 بائیں بائیں کرنے لگا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوئے والا ہے۔ مگر پہنچا تو پتھرہ خالی تھا۔ نیم واکھڑی کے پاس میز
 پر فوکس کی ہوئی دو دین دھری تھی۔ معاملہ سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ اور جین اٹھا کر سامنے سمندر کی جانب دیکھتے
 دیکھتے حرار شریف پہ آ نکلا۔ چنانچہ وہاں ادھر ادھر دائیں بائیں تاک جھانک کرنے لگا کہ شاید وہ کہیں دکھائی
 دے جائے۔ کھوج تو کہیں ملتا نہیں نہ مانگو تو سامنے دھرا ہوتا ہے۔ کافی دیر ادھر ادھر دیکھتا بھان رہا مگر وہ
 کہیں نظر نہ آئی۔ مایوس ہو کر بچے کو آگیا کہ مزار پہ جا کر تلاش کرے۔ اس کا اندر بول رہا تھا وہ یقیناً یہیں نہیں
 ہوگی۔ نوچندی جمع ہوتے اپنا تک اس کے دماغ میں پناہ سا لپھوٹا کہ آج یہ سنگ کی بری بھی تو ہے۔
 چند روز پہلے منہلی نے یاد دلائی کہ اس کو نوچندی جمعرات وہ عظیم سنگ اور بچے کی فائدہ نہ پہنچے گی۔

UrduPhoto.com

ارشادِ سماوی نورِ روحانی اعتبار سے بھی اس روز کی بڑی اہمیت تسلیم کی گئی ہے۔ دلیوں، قلوبوں، فکروں اور
 قلموں اور ہمتوں کے لیے اس روز اہمیت ہے۔ انوار کی بے تحاش چمکا جھمک جھمکتی ہے۔ قمر و قمر خواتین کی رو و صلوات
 میں اک خاص لطف و اثر در آتا ہے۔ عالم برزخ میں صابا اور سحر آسمانی اور شادمانی محسوس کرتی ہیں۔
 کتاب دجاؤں اور دقتیجات کے سچے اور حیرت انگیز بہرہ و سیرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی جانب
 پھرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ حدیث پاک: نصف اشرف، بندہ اشرف، قوسہ قدیر، امیر کونہ دلی و دربار
 پادشہ شریف، انا گری میں روحانی میلے لگتے ہیں۔ حمد و نعت قول و توانی کی محافل سجائی جاتی ہیں۔ لنگر تقسیم
 ہوتے ہیں اور اس روز نصف شب چند ایسے لمحات بھی ظہور پذیر ہوتے ہیں جب فرشتے سے عرض شد مبد سے
 سجدہ تک اور دعائے قبولیت تک اک، دشن لیکر لکھی جاتی ہے۔ نویں چند روز کے شہد پہ اک ایسی بجلی اور
 گھبراہٹ کا ہال ہوتا ہے کہ کبھی تو وہ کسی چند لکھی کے کان کا بالا اور کبھی وہ کسی شیش تن کی گردن کے گرد گزرتا ہوا
 کے پھیلے گھبراہٹ کی مار دکھائی دے۔ لوہہ نگاہ کریں تو عجیب و غریب بجلی جھمکتی ہے گھبراہٹ کے دھن و دھن
 کہانی میوز تیرے منہ لگاؤں اور نگاہوں میں تیرے سے محسوس ہوتے ہیں۔ یوں کہنے کہ نوچندی جمعرات
 گذشتہ سے چوست گردش ایام میں اک شب برکت کی مانند ہوتی ہے کہ نہایت افراد یوں کی بوجھادیں ہر انگ سنگ

کو گدراے رکھتی ہیں۔۔۔ ہر چند یہ بھی دیکھا کہ سودائے عشق اور جذب و جنوں میں بندھے گئے ہوئے عریض ہوتا ہے اٹھا ہو گئے۔ کچے گڑوں کا پانی ابل پڑا۔۔۔ سینہ دھری پھیلیوں کے کنارے جھڑ گئے۔ سلاسل خود بہ خود ٹوٹ گئیں۔ قفس بند چڑ سے رہے اور پتلی اڑ گئے۔۔۔ یہ بھی کہ جنگلوں کے غم نے لہرائے لگے۔۔۔ غمیلیوں کے پروں کا نسیری نقشہ قمری غبار ابل سا گیا۔

عشق ہی جانے کہ سنبل نہائی کو آج نوچندی جھمرا تے سے کی گون سی لہر بہا کر اپنے ساتھ سمندر لگا لے گئی تھی وہ کوئی بے اختیار تھی محبوبی یا مقصوموں کی کوئی گرفت۔۔۔ ادھر یہ بندہ عشق و مشک نمرود خاویہ شوشہ تنہیم و رضا سے کمال بندہ ہی و استقامت یہاں انسانی ٹھوسے کے کھلاڑے میں سونے کی مانند کھونے رہا تھا۔ ادھر اندھیرا کہ لہ بہ لہ کسی کنویں میں اترتا پھلا جا رہا تھا۔ مغرب کی آواز تک وہ جھک بار کر پھوڑ ہو چکا تھا۔ نماز دعا کے بعد اس نے ایک بار پھر تلاش کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تو اگلی کا چنڈاں خواہ تین کی محفل اسبیل لنگر خانہ و حول و حوال کے چمکنے و فیرہ مگر اسے ادھر نہ ملنا تھا لہذا وہ نہ ملی۔

نورجی انکی اپنا کھڑا حج سے عذاب نہیں پاتا کہ سمندر کا شور یدہ سر پائی اترے جو بڑے کناروں کی جانب دھیرے دھیرے جھانک رہا ہو جائے۔ پھر دیکھتا ہے کہ شرف کے دیوار پر بیٹے پھریے لپٹے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان عروص اوجھاتے ہیں۔ پتلی کی رچ بڑھ چکی ہے۔ ان کے پاس جھک گئے ہیں جام بھام سیسے۔ ادھر مراد شریف کی جانب بڑھاتے ہیں یا پھر ادھر شرف کے پاس بڑھتا ہے۔ اس کی اسلیمہ کی طرف نکل جاتے ہیں۔ یہاں سمندر کا پانی اب اس جھک سے پھریے راستے پہ پہنچتا ہے۔ محفل کر دیتا ہے۔ خاص طور پہ نوچندی جھمرا تے اکثر یہ راستہ خوب بند ہو جاتا ہے۔ یہاں پھلا جھک بچھا لگ کر آتے جاتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر اٹھ آ یا کہ پانی بڑھنے سے پہلے پہنچ یہاں سے نکل جاتے۔ گری انجس انجس۔۔۔ اور تلاش میں ناکامی نے اسے خاصہ پڑھ رہا تھا۔ اترے جاتے لوگوں کے سیلاب میں وہ بھی یکساں خشک وخت پندب کی صورت میں تھم رہے دیکھے کھاتا ہوا انجس پلٹ رہا تھا کہ ناگاہ اس کی نگاہ پائلیں جاساں لہجہ ہوئے ایک بار سے پتھر پہ پڑی۔ پتلی شام کے ٹکے میں اسے سنبل نہائی کو پہچانے میں مدد دیتی تھی۔ وقت نہ ہوئی۔ یادداشت اصابہ دیا نہ پاس پہنچا کا لاسٹ اور پاؤں میں ٹٹنی بکھری آس کی پہنی تھی۔ وہ جھیل میں سے کہیاں اٹھاتا ہوا باہر نکل کر اس کی بال پہ آ لگا۔ دم مارے ہوئے سر سرتی پانچھوڑ کر بے طرح و ختم ہیں پانچا پانچا اور اس پہ مستر اذیہ آنکھیں چھوڑ دیا منظر۔۔۔ اترے یوں لگا جیسے اور پڑا اور پڑا۔۔۔ کر سمندر کی ریت بن جائے گا۔ دیکھ رہا تھا کہ پہلے کتنا جھونکتا ہے بعد دیوانہ اور پھر؟ یہ سب کچھ دیکھ کر اس کے ہوش غوطہ مار گئے۔۔۔ للچب ایہ کیا؟ تیریں ایک ہی آواز میں جنہیں سن کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ

ان تینوں بھوتکیوں میں دو بھوتکیاں کہیں انسانوں کی بھی ہو سکتی ہیں۔ خاصی دیر وہ ٹھنکی ہاندھے بھوتکیوں پہ کچان دھڑ سے اُدھر دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ سے بالا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ بلا ارادہ اس نے بائیں جانب گردن موڑ کر حاجی بابا کے مزار کی جانب دیکھا۔ نیچے سوئی کی مانند چمکتے چمید گنبد پہ جوت تلجی ہوئی تھی۔ چھپے کہیں اہلی فنا جزیرے کی اوت میں کہیں سے ٹھس ہو رہا تھا کہ زور تک آسمان پگھلے تانبے کی مانند چم رہا یا شاید دن بھر کا تپا باران سورج سا گر آسمان لے رہا تھا کہ آپ کی چیمپٹوں سے ہوئی ہوائیاں چھوٹی پڑی تھیں۔

سوداگر نیچے کالہی ہے چارگی کی حالت میں گنبد کی جانب دیکھنا اس امر کا غماز تھا کہ وہ اُدھر سے اُدھر لہنا چاہتا ہے۔ آچانک سمدری کونجوں کی ایک ڈار گنبد شریف کی اوت سے نمودار ہوئی۔ نیم اندھیرے میں ان کے سفید سراپے خوب چمک رہے تھے لگتا تھا کہ باغ بہشت سے نورانی پرندے آج نوچندی جھمراٹ کے موقع پہ حاجی بابا کے مزار پہ سلام کے لئے پہنچ رہے ہیں۔ اُدھر مزار شریف کی جانب سے ٹھنڈی ہوا کا ایک تریا اس کے منہ کو کد کداتا ہوا گزر گیا۔ تسکین و طمانیت کی ایک نچ بہتی سی لہر اس پر اسی گئی۔ یقیناً یہ صاحب مزار کی جانب سے طغائے شرف تھا۔ سکون و سست کا سانس لے کر دوبارہ اسی جانب دیکھنے لگا بدھ

دو تینوں سب سے پہلے اس نے اپنے ذہن میں یہ سوچا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ پانی کی رات سے نیچے چلے برہنہ اور پانی تھا نہ گھر سے لے کے کر بڑھتا چلا آیا۔ سوداگر نے سوچا کہ اس کا رخ اسی چمیلے ٹھوٹے سے نیچے کی جانب تھا بدھ اس کی دوبارہ دیکھنے والی ہوئی ایک دیر لے کر اس کی جانب و غریب کا لے گئے کے ساتھ نیچے ہوئی تھی۔ وہی گنا جس نے شاید اسی دن نیچے میں دوبارہ موسم لے لیا تھا جس میں وہ چو گولیاں کھالے سے بڑھتا ہو رہا تھا۔ بڑھتا ہو رہا تھا۔ دیکھ کر بھونکا ہوا نیچے پر پتے پاتر آیا تھا جبکہ سوداگر اس اور چوڑے گردن انسانوں اور شمعروں کے راہ راستے کتوں کے بھونکنے سے مارے نہیں جاتے۔ سوداگر چپا گھٹوں اور پانی میں اُدھر بڑھتا ہوا رہا تھا۔ کیا حال جو سنبل سہانی اور سارو دھالے نے آنکھ اٹھا کر بھی اسے اک نظر دیکھا ہو۔ جبکہ اُدھر اُدھر سے کچھ شہدے شہد ہار اور آوارہ لوٹے بھی اور آٹھ لپکے تھے۔ گھاس نکوٹے اور چھندہ وغیرہ کسی کے پاس سے اوتے نہیں ہوتے وہ تو گاؤں کی اشیاء بھٹکے اٹھوٹے ہوئے سو گھو پا کر خود بہ خود ہی کھینچے چلے آتے ہیں۔ اُدھر ایک جھٹ دھار یہ تک دھڑنگ ملک اور ایک سیان پوش نورانی شمس کول کا چول شام کا چھینہ۔ کھڑے لے لے کر سمندر کا چھتا بڑھتا ہوا پانی اور سچ پانی اُنھی ہوئی پنہان اور ایک عجیب و غریب والا کالائٹ۔ جو اپنی اوقات سے پکھڑا کے لڑا لڑا کر ہم تک رہا تھا۔ یہ سب ہاتھ ان تماشا بینوں کے لئے اک تماشا ہی تو تھا۔ پاس پہنچ کر سوداگر نیچے نے کیا دیکھا کہ کتنا تو بھونک ہی رہا ہے مگر اس کے ساتھ یہ دونوں بھی باری دے دے کر بھونک رہے ہیں۔ وہ تو کچھ اور آگے بڑھ گیا کہ شاید

دیگر جانور بعد میں ہیں۔ جو اسرار اوصاف عقیدہ و باطنیہ نکتے میں موجود ہیں کسی اور میں اس کا مشعر شہر بھی نہیں۔ یہ واحد جانور ہے جو جنوں و آفات قدسیہ جلالان افلاکی اور بلیات ارضی و سماوی کو اپنی آنکھوں سے بغیر کسی درمیانی حجاب دیکھ سکتا ہے جبکہ گھوڑا بلی کی گن گن سنا یا آواز میں سن سکتا ہے فی الواقع وہ نہیں دیکھ سکتا۔ بلی اٹھل آہٹ کی گن گن یا پھر خوشبو بدبو کو محسوس کر سکتی ہے۔ اس قسم کی صورت حال میں اکثر ذمہ سنبھالنے والے کسی کو نے کھد رے میں پڑ جاتی ہے۔ گھوڑا انھل تھان پہ کھڑا پاؤں پکھتا ہے یا ہٹنا کراچی بے چینی کا اظہار کرتا ہے۔ اب صرف گھٹا ہے جو ان کے پیچھے لپکتا ہے جھونک جھونک کر بھگا رہا ہے۔ ان کی موجودگی کی خبر دینا ہے۔ بعض نکتے تو ان سے بجز کراچی جان پہ پھیل جاتے ہیں۔ خب زن ایسے پولیس یا چوکیدار سے نہیں لڑتے جتنا وہ گلی محلے کے گھٹے سے برکتے ہیں۔ اس سے طاغوتی الہی طاقتیں بھی خاصا ہٹ کر رہتی ہیں۔ کیونکہ یہی ایک ایسا ارضی جانور ہے جس کا شیطان الرجیم کے ساتھ زوار اولیٰ سے اٹ گئے کا ذکر ہے۔ پرانے زمانے کے بڑے بڑے گھر میں گھٹا ضرور رکھتے تھے۔ کہتے تھے کہ گھر میں اک گھٹا رکھنے سے گلی دین و دنیا کے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ چوکیداری رہتی ہے شر شرار لہو سے پریت سے حفاظت اور گشت خبر دار رہتا ہے گھر کے رنڈ پانی میں برکت کے علاوہ ڈھار کے کام بھی آتا ہے اور سسے سے بڑی ہوتی ہے کہ اگر کوئی دھمکنا چاہے تو اس کی دھمکی سے ڈر کر ہٹ جاتا ہے۔ اس کی دھمکی سے ڈر کر ہٹ جاتا ہے تو وہ گھٹے سے بھی کچھ اٹھ سکتا ہے۔ انسانیت کے لئے بھی اس کی خدمات گراں قدر ہیں۔

جیسا کہ طبعی انسان کے بعد گھٹا ہی ایک ایسا حیوان حقیقی ہے جو اپنی سیاسی و معاشی اور عقل و قہامت کے باعث قدر و قیمت کا اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔ آپ نے انسانوں کے لئے بڑی بڑی چیزیں اقامت گاہیں، تفریحی مقامات، ہوسٹل، آرائشی سیلون، سینما، سونا ہاتھ اور ورزش گاہیں، کسی سنی ہوں گی۔ گھر گھٹوں کے لئے یہ مخصوص جگہیں انسانوں کی جگہوں سے لی گئی زیادہ قیمتی اور خوبصورت ہیں۔ مٹی کے علاوہ برصغیر پاک و ہند میں کہیں گھٹوں کے باقاعدہ ہوسٹل، کھیلنگ ریسٹورنٹ، ہوٹل نہیں۔ اس کے علاوہ زنجیر میں ان کے لئے مخصوص ہوٹل اور ہوٹل ان کے بیوی بچوں، جدھر ان کی بیکرنگ، میک اپ، فیشنل اسباق، ورزش اور سوسائٹ ڈائننگ کا انتظام ہوتا ہے۔ ان کی رہائش گاہوں انسانوں سے زیادہ صاف ہوتے ہیں۔ ان کی حفاظت و برکاتی اور آرڈنگ کے لئے بہترین ڈگری ہولڈر مضاف ہوتا ہے۔ کوچ بنگلہ اور ڈاکٹر۔ کئے کسی ملک یا بادشاہ کے ہوں یا بدو کریم یا کسی جاگیردار کے۔ ایکٹریس کے ہوں یا کسی گلوکار کے۔ بہترین تہذیب اور پائیکل پاتے ہیں۔ فوج میں گئے کیپٹن یا میجر کے عہدوں تک ہوتے ہیں۔ پولیس کے گئے افسر ہوتے ہیں۔ جیلوں میں یہ قابل اعتماد چوکیدار عالمی انسداد منشیات کے اداروں ایئر پورٹس، نیوکلیر پلانٹس اور اعلیٰ سرکاری دفاتر کی سیکورٹی پر

معمور۔ برف زاروں میں جہاں انسانی وساکی کام نہیں آتے وہاں ان کی خدمات قابلِ فحشین ہوتی ہیں۔
 ٹھیلوں، دریاؤں میں ڈوبنے والوں کو بچانا۔ آگ، سیلاب طوفانوں سے قیمتی جانوں کو نکالنا۔ والٹ ڈزنی کی
 معرکتہ آراء فلموں میں ان کے کارنامے دیکھ کر انسان ششدر رہ جاتا ہے۔ نٹوں کی تاریخ کے مطالعہ سے کسی
 حد تک اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے انسانیت کے لئے کیسے کیسے کارنامے اور احسان ہیں۔ ایسے ایسے عظیم مسٹر
 سائنسدان معنی و مصور جنہوں نے اپنی تمام زندگی ان کی مولست و بھدی میں بسر کر دی۔ ان کی بہترین یادوں
 میں لئے شامل رہے۔ انسانوں کی اس دنیا میں اس انسان نے جو کچھ ترکے کے نام پہ نٹوں کے لئے نقش
 کیے۔ وہ اس نے اپنی آل اولاد کے لئے نہیں کیا۔ چشم حیرت کو مزید واکرنا مقصود ہو تو یورپ امریکہ کے
 کسی نٹوں کے قبرستان میں تشریف لے جائیں آپ ششدر رہ جائیں گے۔ ایسی ایسی خوبصورت
 فنِ تعمیر و آرائش کی شہکار قبریں کہ جہوت پیدا ہو کر بھی ایسی عجیب و غریب نہیں۔ سنگ، انیٹل اور سنگ پہ
 کے تراشے ہوئے استادِ تصویر کشی۔ سر ہانے کی قیمتی لوح پہ پوری داستانِ زندگی کا ان باپ دادا کا نام۔
 وظیفے اور تھیں کارنامے ہائے حیات۔ شادیاں اولاد۔ عادات و مشغلات وغیرہ اپنے گنبد و گنبد کے لئے
 یہاں کٹاؤں پہ ہو کوئی پہ سا اور یا کسی شاہی خانہ ان کا کوئی نمونہ استراحت ہو۔ مطلب غصہ رکھ کر
 ہوئی یہاں قبریں جہاں ان کے لئے کھدائی گئی ہیں وہاں پہ پہ پہاڑ بن گئے ہیں۔ ان کی قبریں بھی
 ہیں کہ خیمے و غریب اور فاخا کو خزانہ حسین پیش کرنا اعلیٰ انسانی و طیرہ بھی ہے۔ اس کے لئے نہ دیا نہ دیا
 ضروری نہیں قبرستان۔ انسان یا شیخ ان ہونا بھی شرط نہیں۔ نٹوں کے نام پہ ترسے نٹوں کی ادارے سکول
 موجود ہیں۔ جانوروں سے لے کر انسانوں کے لئے سیکھنا اور یاد کرنا کوئی مغربی ملک سے نکلے۔

سورۃ الباقیہ میں اللہ کریم فرماتے ہیں۔ "اس زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزیں کو تمہارے لئے
 مقرر کر دیا۔ سب کچھ اپنے پاس ہے۔ یہ جنگ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے
 ہیں۔" ہم اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں تو واضح محسوس ہوتا ہے تمام مخلوقات اور اس کے تشرفات انسانیت کے
 لئے وقف ہیں۔ ہر عنصر میں اس کے لئے سامانِ تعمیر پیدا کیا گیا ہے۔ یہ سب قدر و فکر کے مقامات ہیں۔
 میں غور کرے، سمجھے اور جائے پھر انہیں حاصل کرے اپنے رب کا شکر گزار بندہ ہے۔

کسی عجیب بات کہ دنیا بھر میں تو قیر اور تھکن لیاؤ دونوں صیغوں میں لفظ لئے کا استعمال عام ہے۔
 اعلیٰ اصناف کے لئے بھی اور ادنیٰ معاملہ میں بھی۔ دیکھا جائے تو اعلیٰ رتوں جاتیں اس کے بار
 موبود ہیں۔ جو بیک وقت ہم میں گراہت، خمرت اور محبت و عزت پیدا کرتی ہیں یعنی کتنا اصولی فکر سے
 تحت اچھے برے دونوں زرخ رکھتا ہے۔ اچھائی بڑائی دونوں معاملوں میں وہ کھلم کھلا ہے کہیں منافقت و مصلحت

کے کنارے پہ واقع ہے اپنے ایک معتقد سچے سے اتفاقا ملاقات ہو گئی وہ بھی لاہور میں ملازم اور ہر جمعرات
 دو تار صاحب میرے پاس آتا تھا یہ شریف الطبع سچے اکثر مجھے اپنے گلوں آنے کی دعوت دیتا رہتا تھا۔ لیکن میں
 چاہنے کے باوجود کبھی اس کی یہ معصوم سی خواہش پوری نہ کر سکا۔ شوقی اتفاق کہ کراچی ہی پورٹ سے مجھے الہ
 گاڑی بذریعہ سڑک لائی پڑی نو سچے بھی تھے جو ڈرائیونگ کے لئے ساتھ تھے۔ اب بھول یہ ہوئی کہ یاد ہی۔
 رہا گاڑی آفریونک ہے جبکہ وہ میٹول گاڑی چلانے والے تھے۔ اس حال مجھے مجبوراً ڈرائیونگ کرنی پڑی۔ میں
 بوڑھا نا تو اس ایسی لمبی ڈرائیونگ کا کہاں تحمل ہو سکتا تھا..... دن کی روشنی میں تو کسی نہ کسی طرح میں گاڑی
 کھینچ کھاچا لیتا لیکن رات کی ڈرائیونگ میرے لئے ممکن نہیں ہوتی۔ سامنے والی گاڑیوں کی لائٹ میں مجھے
 کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میرا پروگرام تھا کہ ہم ملتان پہنچ کر قیام آراہم اور طعام کریں گے لیکن سڑک خراب ہو کر
 کی وجہ سے راستے میں ہی شام ہو گئی۔ آدھے دوپہر کا تھا چنوا چارہ ایک موٹر سوار نے ہی لب سڑک آبادی دکھائی
 ڈرا آگے آئے تو پاس ہی کسی مسجد سے اذان کی آواز ابھری۔ میں نے ڈرا آگے مسجد کے مینار دیکھتے ہوئے
 گاڑی کچھ پاتا دہی۔ مسجد کے باہر ہی بیت اللہ ہے بے ہونے تھے۔ جلدی جلدی طہارت کی آمد ہو چکی تھی۔
 کرتے کرتے نماز گزری ہو چکی۔ کچھلی صف میں کھڑے ہوئے۔ نماز ختم ہوئی دل میں غائب رہا۔
 7 ویں لاہور واپس آیا۔ لاہور میں آکر رات گزری۔ لاہور میں آکر رات گزری۔ لاہور میں آکر رات گزری۔
 ہوئی تو وہ میرے ہاتھ جو سنے لگا حیران و پریشان سا پوچھنے لگا۔

”بابا جی! آج یہ اویا یہ درست آیا آپ تشریف لائے؟“

میں نے مختصر اسے اپنی سڑی اردو سنائی۔ اسے میرے ساتھ میں طرح عقیدت سے جھٹکتے
 دیکھ کر اور نمازی بھی میری جانب متوجہ ہوئے۔ اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ دو دو گھیرے کالے کپڑے والے
 انگوٹھیاں لالا کھیں سکے دیکھ کر کوئی اور بچا ہر فقیر سمجھ رہے تھے۔ یہ حال دیکھتے ہوئے میں نے اس بچے سے کہا۔
 ”بھائی! مجھے یہاں سے نکال لے چلو۔“

وہ ہمیں مسجد کے پیچھے روکھیاں آگے ایک کشادہ سے مکان میں لے آیا۔ میرے اصرار کے باوجود
 اس نے ہمیں اصرار نہیں لے پہنچو نہ کر یا..... جب میں نے اپنے ڈرائیور ساتھیوں کو بھی اس کا ہمہ دورہ کیا تو اس
 شرمناک حالت ظہر نامعلوم کیا کہ سو رہے سو رہے ہی نماز کے بعد ہم یہاں سے چل دیں گے۔ اب میرے صحبت
 میں آرام یا مینڈ گہاں کھانے پینے کے دوران ہی لوگوں کا آنا جانا لگ گیا۔ یہ میرا میزبان آپ جس کا
 ہشید تھا۔ کبھی کبھی دیا کرتا کہ اس نے یہاں میری سیدھی نوادہ بھی ہوئی ہے۔ جہاں رہا ہے ہاتھ پہ میرے
 معائنہ ہو رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمر ابھر گیا اور مجھے چنگ پہ مسد لگا کر کسی پیشہ ور ہی کی طرح اٹھ کر

سوچتے لگا۔

انہی اہمیں کس مصیبت میں پھنس گیا۔ دل ہی دل میں دعا کی مالک اچھے ان آمدھے عقیدہ مندوں سے بچا۔ وقت قبولیت تھا۔ ایک معتر سا بوڑھا شخص اندر داخل ہوا۔ مجھ سے بچنے کے بعد اس نے اعلان کیا۔ ”حضرات! نماز عشاء کے فوراً بعد ہمارا قافلہ سنگ دار بابا کی جانب روانہ ہو جائے گا۔ بس اور لیکن سامنے چوک میں کھڑی ہیں۔ ڈوبلوں اور چادر والا جھنڈا بس کے اوپر نیچے گا۔ لہذا تمام سنگ دار بابا بے کے دوانے نماز کے فوراً بعد بس میں بیٹھ جائیں۔ یہ آخری اعلان ہے۔“

میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے۔ میں بٹکا بٹکا سا بھی اس بزرگ کو اور بھی اپنے ”بزرگ“ بچے جمید کو دیکھ رہا تھا۔ سنگ دار بابا! معاً میرے دماغ میں کوئٹہ سا پکا۔ گاؤں والی سرکار گھوڑے شاہ سرکار! لٹو سائیں! بلایاں والا بابا! اگر ہو سکتا ہے تو سنگ دار بابا بیٹوں میں ہو سکتا ہے۔ سارے جانور اللہ کی مخلوق ہیں اس کی حمد و ثناء کرتے ہیں۔ جمید سے اس ہاتھی میں کچھ کہنے سننے کا موقع نہ مل سکا۔ نماز کے فوراً بعد میں نے اسے گلی میں پکڑا۔ ایک کونے میں لے جا کر کہا۔

”بھائی! میرے آرام کر لیا۔ کئی بیٹھ لیا۔ تھوڑی دیر ہوئی۔ اب بس چلے۔ دو۔ ہم کون کسی ہول میں سو رہے ہیں۔ آج وہ سارا دور سے روانہ ہو جائیں گے۔“ اس نے سنگ دار بابا کو کون ہے اور جلدی ہو رہی۔“

وہ میری بات کو سمجھان سے دلخت کرتے ہوئے بولا۔
”بابا! باقی باقی تمام یہاں کے بیٹے آپ کو ساتھ لے کر چلے۔ بس آپ کو سنگ دار سرکار نے ہی یہاں روکا ہے۔ آج آپ اسے ساتھ لے کر چلے۔“ میرا درد کیا آپ بہت مسرور ہوں گے۔“
میں نے گہری نطروں سے اسے سمجھوتے ہوئے پوچھا۔
”یہ تم کس بھرتے پہ کہہ رہے ہو۔۔۔؟“

وہ سر نہ ہوا کر بڑے ادب سے بولا۔
”بابا! بس! میری گردن مار دیتے گا اگر میری اس بات میں نہ ہو بھی فرق لگے۔“
وہ میرے آگے سے سر نہ اٹھاتا۔ کڑی اعلان والا بزرگ درمیان میں نہ آ جاتا۔ جمید یہاں سے مل کر انتقامات میں لگ گیا۔ میرے ساتھ بچے ہاتھ پاند سے میرے عقب میں کھڑے میرے کسی فیصلے کے منتظر تھے کہ دیکھنے پر روانہ اور آتا ہے یا اوھر جاتا ہے؟
میرے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے بس اور لیکن بھر گئیں۔ جدھر جسے گھبراہٹ ملی وہ وہیں پہنچا ہوا تھا۔

چھت پہ اھول تاشوں والے بیٹھ گئے تھے۔ جنہیں اوپر یا اھور بیٹھنے کے لئے جگہ میسر نہ ہوئی وہ بس کے پاس اور پیچھے لٹک گئے۔ میں دیکھ دیکھ خوش ہو رہا تھا کہ چلو بس وہاں میں جگہ نہ ہونے کی بنا پر جان چھوٹ جائے گی۔ آپ جو دیکھا جمید خراماں خراماں میری جانب چلا آ رہا ہے۔

”بابائی آئیے سب تیار ہیں بس آپ کا انتظار ہے۔“

”بیٹا! ایک تو میں بس میں سفر نہیں کر سکتا دوسرے وہاں میں بھی مل دھرنے کو جگہ نہیں ہم تو یہاں افراتاہاں بیٹھیں گے؟“

”بابائی! آپ کے لئے موٹر کار کا بندہ بست ہے۔ آپ آرام سے نکلے ڈھلے جائیں گے۔ آدھے پونے گھنٹے میں انشاء اللہ ہم وہاں ہوں گے۔“

ایسا یہ میلہ بھی بیکار جانتے دیکھ کر میں نے اپنے سر میں کا آخری سیلے جھوڑا۔

”برخودار نہ کسی سیلے میں شرکت کرنا میرے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ میں مسلسل اٹھا رہا تھا سے دارالجمہ کی گھر آ جاؤں۔ میرے جسم کی ایک ایک پول ٹی پڑی ہے۔ مجھے چند گھنٹے کی سیرانی کرنا سبقت دینا پڑے گا کہ میں آج دوبارہ گاڑی چلاؤں گے۔“

میں نے اس وقت پاپائی آپ کا میں وقت پاپائی شریف رہا۔ خالی رخصت نہیں آچکے ملا سٹھ فرمایا آپ کی آمد سے یہاں کس قدر خوشی کا اظہار ہوا۔ کچھ لوگ آپ سے کہیں گے سوال سے بھی عقیدے کرتے ہیں آپ انہیں۔“

میں نے درمیان سے ہاتھ کو ہٹا کر ہٹا کر کہہ دیا۔

”اور کچھ لوگوں کو میرے بارے میں الٹی سیرجی ہانک کر گمراہ کیا ہوا ہے۔ میرے لئے عقل کے سچے غریب سیلوں میں جانا کچھ نہیں آسان ہی نہیں ہوتا۔ یہ ہاتھ کا کردار نہیں آئے گا۔“

پہنا آسان اور انہی انگلی کی مرضی سے ہوتی ہے۔

وہ ستم ظریف کمال ڈھٹائی سے کہنے لگا۔

”لھیک ہے بابائی! وہ بس کے پیچھے کالے رنگ کی گاڑی بند ہوا تیار موجود ہے۔ بابائی کے لئے

نے آپ کو بغیر کسی پیشگی پروگرام اور ہر گاڑی ہی لئے ہے کہ آپ کی شرکت کبھی جا چکی ہے۔ بابا ہر گز سے

وہ ہو جاتا ہے۔ اللہ والہ آپ آج ضرور شرکت کریں گے۔ باقی اللہ جانے کون بشر ہے۔“

میرے پاؤں کو ہاتھ لگایا اور چلتی ہوئی بس کے پیچھے لٹک گیا۔ میں بس کے پیچھے بھاگتے ہوئے تکیوں پر

کی سرخ بٹیوں کو دیکھتا رہ گیا۔

تک خاکستر کر دیتے ہیں۔ میں جب اتنی ساری کالکوں کے بیچ کسی جوگانہ رہا تو خامشی کی ہلکی ماری۔
 ملانی فضا میں کچھ شہ نہ آیا لیتے ہوئے میرے کانوں سے گزرا۔
 ”باباجی! یہ سواری آپ کو لے جانے کے لئے باباشنگ واد سرکار نے بھیجی ہے جمشید نے نہیں۔“

کافی گاڑی ہمیں اپنے پیٹ میں ڈال کر روانہ ہو چکی تھی۔ پورے راستے ڈھول تاشے چنے تھکے
 فرط عقیدت سے دھماکیں بھگڑے ڈالتے ہوئے خوش عقیدہ ڈائریں۔ سب کی منزل صرف ایک تھی
 وہی باباجی کتیاں والی سرکار۔ اگر اپنی سے لے کر اس گاؤں تک کی پوری فلم وہاں میں چلنے لگی۔ یہاں تک
 ہمارے شیڈول میں نہیں تھا اور نہ ہی علم تھا کہ یہ جمشید کا گاؤں ہے۔ اذان نے ہمیں روک لیا۔ سڑک کنارے
 مسجد میں پہنچے۔ نماز کے بعد اس وقت شریف جمشید صاحب کو اپنی ذاتیں جانب بیٹھا پایا۔ بہت لوگوں سے
 ملاقات ہوئی۔ کچھ کھانا یا اب یہاں سے آگے ملتان کا قصد تھا اچانک درمیان میں بابا کتیاں والے کے لیے
 کو کراہ گیا۔ مجھے ساتھ چلنے کی دعوت ملی۔ مگر میں یہ سوچتے ہوئے میلے کے لئے بیٹھا نہ ہوا کہ پورا ایک
 علاج ہو جائے گا جبکہ ایک بڑی دیر تھا کہ کبھی تھی۔ میں دیکھتا رہا۔ پورا جوان ساتھ بیٹھ کر میری صحبت سے
 دم مادمے ہوئے ہیں۔ ان کے گائیڈوں نے یہ بھی کرنا تھا کہ ان کے ساتھ رہیں۔ میں نے ہلکے روکے۔
 ان کی حیرت کو جانک لیا تو لیکن جو میرے خوش فکر تھا اسے وہ نہیں سمجھتے تھے۔
 پورے گاؤں میں جمشید کے ان کلاس گمشیاں کرنے لگے۔
 ”آپ کی شرکت کبھی باقی ہے۔ آپ اپنے انشاء اللہ سرکار شرکت فرمیں گے۔ باباجی شنگ واد سرکار
 جو کہہ دیتے ہیں وہ پورا ہو جاتا ہے۔“

بابا اور کتیاں والا بابا کتیاں والا۔ لیکن شنگ واد سرکار ہونے کا کہ جیسے میں بھی ایک شنگ
 اور مجھے کتیاں والے بابے کے پاس ضرور جانا چاہئے۔ سو اب میں وہاں پہنچنے ہی والا تھا۔ اک جیسے بہت
 کہ پورا راستہ نہ تو کوئی بات ملک کا فورسے کی اور نہ ہی میں نے۔ شاید ہم دونوں اپنے اپنے جہاز پر
 گمراہیوں میں پھنسے ہوئے تھے بلکہ مجھے تو یہ بھی شک گذرا کہ یہ کانی گاڑی کوئی رحمت بیڑیل کی بنی ہوئی
 بلکہ اندروں پاک سے باہر پلیدی والی کوئی کالی کتھی ہے جو سارا راستہ بھونکی نہ چوکی۔ تھکاتے تھکاتے
 کی بھول میں بھونکتی ہوئی اپنے مرشد کی بھوک میں کھینچا کی۔ لیکن مجھے وہ کمر لڑی کالی کتھی بھی یاد آئی تھی
 جتنی نے بہت ہوں چوں کرنے پہ مرنے کی بدعا دی تھی۔!

● لایا ہے تیرا شوق مجھے پردے کے باہر۔۔۔!

کھٹ سے ایک اور در چھوڑا ہوا اور میرے سامنے ایک اور کھٹیا آگئی جس کی نگاہ دُعا سے ایک ناپٹے کھٹے عشوہ ادا نہیں بیچنے والی طوائف کے درجات یوں بلند ہوئے کہ وہ ایک اللہ والی کہلاوے لگی۔ اس کی دُعا سے محبوب ظہور کی اس کی نگاہ سے بڑے بڑے مگرے ہوؤں نے راہِ ہدایت پکڑی۔ جس طرح اس قادر مطلق کے عطا کرنے کی دُعا کے نرالے ہیں اسی طرح اس کی ہدایت دینے کے بھی رنگ جدا گانہ ہیں۔ اصل چیز تو اخلاص و اخلاق ہے اللہ پاک کو یہ دونوں بہت پسند ہیں۔ بندہ کیسا بھی عبادت گزار نیک و پارسا کیوں نہ ہو اگر اس کے ہاں یہ دونوں عشقیہ موجود نہیں تو سب کچھ بیکار ہے۔ ایک ایسے پھول و پھل کی طرح جو خوبصورت ہو لیکن رنگ تو ضرور ہے مگر ذائقہ و خوبو سے خالی۔ کام و دھن کا سامان تو ہے شاد کا مٹی قلب و دماغ نہیں۔

یہ طوائف اپنے کمالِ شہ کے حساب سے ایک پیشہ ور طوائف ضرور تھی مگر اس کے اندر اخلاص و اخلاق نہ تھی یہ قدر بھی نہیں روش تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے بلا سے اندھیرے کمرے کے کسی کونے میں کوئی کھانا مارا جھلکا ہوا ہو۔ یہ طوائف اس قدر غفلت میں ڈھال تھیں کہ ان کو چاہے کسے ان کی رجعت مان سے روکا نہ جاتا ہے۔ یہ ایک خوبصورت ماہر تھا۔ دنیا کے کنارے آباد۔ نمودار ہوسیتاروں، مسکول اور مسلمانوں سے گرا پڑا۔ مذکورہ ان چھوٹی بچوں کی یہاں بھتا تھی۔ مسجدیں اُردو سے اُٹھانے کے باشیپے طاؤسوں سے بے گھر ہوئے۔ دربابِ شہ کے بازو کھولنے سے ایک بڑا کراٹھ کا دانت نما زکار۔

انہیں طرح طرح کے افسانے چندن چروں والی لڑکیاں اور زمانہ چشید و آریہ واریاں یعنی تاشم گروں کے لیے یہ دور سا اک مٹا شہ تھا۔ وقت ہو گزرا کہ یہاں شنگ حالی کا سماں آیا۔ کالی گھٹائیں اللہ اک آتیں اور زمین سے گزرتی جاتیں اور پاشنگ اور زمین کے لیے کاپنی مزید کیس پیچے اتر گیا۔ کھیتوں میدانوں میں دراڑیں پڑ گئیں۔ بھار پھیلنے لگے۔ اب چار پانی ختم ہونے سے موسیٰ جانور پرندے مرنے لگے۔ اللہ کی حق بات بھلا تھی۔ ہا آفر شہ کے لوگ اکٹھے ہو کر ایک اللہ کے دی کے پاس پہنچے اور بارش کے لئے دُعا کی۔ اللہ کے بندے نے ہاتھ اٹھائے۔ لیکن کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ سب صورت حال مزید بگڑی۔ بارہ ماہ نہ ہوئے۔ حب انہوں نے فرمایا۔ سب لوگ پارسا نہ شہر کی میدان میں جمع ہوئے گزرا کر بارش کی دعا کریں۔ لہذا ان کی معیت میں ادھر کا رخ ہوا۔ راستہ میں بازارِ حسن کا کچھ حصہ چڑھا تھا۔ اللہ کے بندوں کا جلوس اس جگہ پہنچ کر قدرے بجلتے سے گزرنے لگا تاکہ ادھر کی حکمرانیت و مسخرات سے بچتے ہوئے

بزرگ 'کچھ خاموش رہنے کے بعد فرمانے لگے۔ "بہتر اچلتے" ہم سب اس مالک ارض و سما کے حضور گڑگڑا کر اپنے کرد و گرو گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور بارش کے لئے نماز استسقاء کا اہتمام کرتے ہیں۔"

اب پھر ایک جھوم جس کے آگے آگے ایک عجیب اٹھلیہ درویش تھا اسی راستے پر چلتے چلتے جب بازار مصر میں پہنچا تو وہی زمان بازار میں اقصیٰ اجتماع طرح داری اسی جھروکے جمال گاہی میں جلوہ نما تھی۔ غفلت وہی شور جب سنائی دیا تو چلمن سر کا کرلوہی تو معلوم ہوا وہی عشرہ قبل والا ہی قعدہ ہے۔ جانے کیا دل میں سنائی کہ پیچھے سے پناہی کو طلب کر کے پھر اک نیا پیغام اس نے درویش کو پہنچایا۔

"بابا! اتنے سارے جھوم کو ایسی دور لے جانے کی زحمت کیوں دے رہے ہو؟ جبکہ یہ لوگ ایک دو ہل پہلے بھی وہاں جا کر زانماز کر چکے ہیں۔ آپ میرے کوشے کی سیر تھیاں چر جسے کی زحمت گوارہ فرمائیں مگر آپ کا کام دوسری ہو جائے تو ایسی دور جانے کی کیا ضرورت۔"

درویش نے تو ابھی کچھ جواب نہ دیا تھا کہ انہیں پائیں کے لوگوں نے پہلے کی طرح اس سے پناہی کی گردن دلوئی تھی۔

"ابھی حضور نے فرمایا تھا کہ اس مالک ارض و سما کے حضور گڑگڑا کر اپنے کرد و گرو گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور بارش کے لئے نماز استسقاء کا اہتمام کرتے ہیں۔"

گات جانے چلتا ہوا کام کر جاتا ہے۔ "جھوم میں چند لوگ بے طرح اس پر پٹ پڑے۔

چار پوٹ کی کھارو درویش کے قدموں پر پا کر گھس گیا۔

"وہاں میں مالی بی کا لکھتے ہوں جیسا حکم دیتی ہے میں بھلا کیا کروں۔" پیغام دیا آپ تک پہنچا۔

اب آپ جو چاہو سوک کرو۔"

بادا جی نے اسے پاؤں سے ہٹا کر کھڑا کیا۔ زیادتی کی معذرت چاہتے ہوئے بڑی دھم سے

پہنچا۔

"یہ آپ کی مالی بی کون ہیں کہاں ہیں.....؟"

اس سے مشترکہ وہ کوئی جواب دیا۔ ایک واقعہ کاروبار میں پھٹ پڑا۔ سرکار یہ کسی مالی بی کا

ملازم نہیں بلکہ اس بازار جس کی مشہور زبانا زمانہ طوائف چنداں ہائی المعروف بی جان بی کا بھڑوا ہے۔ یہ

اس زمین کے مالک نہ لگے۔ انہی کہنے کی دیر تھی کہ طوائف کا یہ فرستادہ اک بھیا تک سی بیج کے ساتھ لوٹ گئی۔

ہوئے اٹ۔ "میری گھرار کہ مالی بی اسے معاف کر دیں یہ انہاں ہے کچھ نہیں جانتا۔ بھوک پیاس نے اسے

بے لگام کر دیا ہے۔" اب وہ بادا جی سے مخاطب ہوا۔ "حضور! میں نے مالی بی کا پیغام پہنچا دیا ہے لگے

اجازت دیں۔ ”وہ اپنے پیچھے ہوئے لباس اور مضروب ہاتھ پاؤں سہلاتا ہوا اٹھا اور جھوم سے باہر نکل گیا۔
اب لوگوں نے ہادی کے لئے راستہ کھولتے ہوئے عید گاہ کی جانب چلنے کی درخواست کی۔ انہوں
نے کمال استغنا سے فرمایا۔

”لوگو! تم مجھے کیوں ساتھ لائے ہو.....؟“

کیبارگی کی ایک پکار اٹھی۔ ”اللہ ہم پر رحم کرے ہمارے گناہ معاف فرمائے۔ بارش!
رحمت باراں۔ آپ بارش کی دعا کریں۔ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ خدا آپ کی سنت ہے وغیرہ
وغیرہ۔“

آپ نے ہاتھ کے اشارہ سے خاموشی اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔
”لوگو! یہ فیصلہ بہت مشکل ہے کہ کون اچھا کون برا ہے۔ کس کے ہاں اخلاص ہے اور دکھاوے والا
کون ہے۔ کوئی بانی ہے اور کون مائی ہے میں تو اتنا جانتا ہوں کہ ہمارا رحمت کے لئے طعناؤں کی قبول ہوگی
بس کا اخلاص اللہ کے ہاں قبول ہوگا۔ اور سنو! جو اللہ سے حیا کرتا ہو اللہ بھی اس سے حیا کرتا ہے۔
بازارِ حسن سے راستہ جدا کر گزرتا۔ کسی کوٹھ کے کرفٹ پر گھبراہٹ سے لڑائی ہو رہی تھی۔ پتہ چلا کہ
وہ ایسے ہی کیوں نہ ہو چمڑی یہ تھا جہیز میں۔ اس کی بیوی نے کہا کہ میں چاہتی تھی کہ اس کے سرے کے
پروے میں کون چل رہا ہوتا ہے۔“

گنگ سنگ کے ملک باؤ سے کے پیچھے ہو لینے مگر ہاد کا رخ عید گاہ کی جانب نہیں تھا اس پیاہر کی
طرف تھا جو چار پوتے کی کھڑکیوں پر چلا تھا۔ اس کے چلا جانے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جھوم میں کاٹا چھری
ہوئے تھے کہ یہ ہادی اللہ کے گھر کی بجائے اک طوائف کے کوٹھے کی طرف چار ہے ہیں۔ اس طرف
بالا خانے کے صبراء کے میں کھڑی تھی جان بیکری سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ میں نیچے وہ ہاد آ کھڑا ہوا
چاروں اطراف اشرف بھی کھڑے ہیں بازاری تماشین بارش کی دعا اور مالک کی رضا والے بھی۔ شاہ بازار
بھی اور حیانواز بھی۔ اوپر بازار میں گل والے کی جگہ خالی نہیں اٹھتے کے ٹھٹھے ہلکے ہوئے کھڑکیوں
نہرو کے بالکونیاں پیسے سیرے بازاری عورتوں سے طومارے ہوئے کہ اک تماشاکار ہوا تھا۔ قلعے سے وہی
پنڈاری نیچے اتر آیا پیغام لایا۔

”بازار میں یوں جھوم نہ کیجئے۔ اوپر تشریف لائیں لیکن اسکیے۔ کسی مولوی دودلی کو زمت دینے
کی ضرورت نہیں۔“ پنڈاری یہ پیغام زبانی اور با آواز فراوانی منار ہاتھا۔
ہاد تو حسب طریق شانت تھے مگر دائیں بائیں اسے ان کے طوائف کے کوٹھے پر اسکیے جانے اور

مولویوں کی ایسی تحقیر پہ بھڑک اٹھے تھے۔ انہوں نے باواہی کو یہاں سے نلنے اور عید گاہ کی جانب چلنے کی درخواست کی۔ باواہی نے بڑی سخت و پیرستانی سے جواب میں کہا۔

”آپ کو آم کھانے سے غرض ہے یا بیچ گھٹنے سے۔ میں آم بیڑے اتار رہا ہوں یا آگ سے آپ کو اس سے غرض نہیں ہونی چاہئے۔ مناسب ہے کہ سب لوگ ان پہلے والے سحری صاحب کی معیت میں عید گاہ تشریف لے جائیں۔ میں انشاء اللہ عصر کے قریب وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

عام سادے سے لباس میں ایک باقوال سا نوجوان تھا جس کی زندگی ڈب و تھوٹی میں گزری تھی جو بونہ کیس پالنا اور ان سے فساد خون کے مریضوں کا علاج کرتا تھا۔ قدم قدم اوپر کوٹھے پہ چڑھ رہا تھا۔ نیچے لوگ کچھ تو عید گاہ چلے گئے کچھ اچھا بڑا کھڑی کر کے قبل لینے اور اکثریت وہیں باوھر اوھر ہو گئے کہ دیکھیں ”کوٹھے طوائف“ سے کیا تعبیر میں آتا ہے؟۔ پورے حصار و زمین اس طرح اس کی جھٹک میں داخل ہوا جیسے بے جھک و جھجک اپنے گھر میں وارد ہوا ہو۔

طوائف زانی نے اپنے گئے بعد سے پیش و رانہ انداز میں آداب تسلیم سے ان کا استقبال کیا۔ باواہی درہائی اور عشق طرازئی سے ایک مست خاص پہ غرق ہوئے کہ کسے بھرا بھلائی۔ باواہی نے بونہ کیس پالنے والے کو دیکھا تو اس نے بڑا کھڑی کر کے قبل لینے اور اکثریت وہیں باوھر اوھر ہو گئے کہ دیکھیں ”کوٹھے طوائف“ سے کیا تعبیر میں آتا ہے؟۔ پورے حصار و زمین اس طرح اس کی جھٹک میں داخل ہوا جیسے بے جھک و جھجک اپنے گھر میں وارد ہوا ہو۔

”آپ کو جی جان جی کیوں کہتے ہیں۔۔۔۔۔؟“

مشہور سی کنگ اٹھی۔ ”وقت ہو گزرا میرے ہاں جیب میں ایک نوٹ آ یا تھا۔ وہ بھاری سے قصبے اسی کے بحر نوٹھے۔ یہاں ٹہکتے ہی اولوں قصبے میرے سپرد کرتے ہوئے کہنے لگا۔ اسی جان جی آپ دولت سے محروم ہوئے ہیں۔ انہیں اپنے پاس رکھو مجھے کچھ دیر یہاں آرام کرنا ہے۔ رقص و موسیقی شراب شراب گوب کر باب ہر چیز سے اسے پر جانا چاہا مگر وہ کسی چیز کا طالب نہیں تھا۔ میں پہرے یہاں آرام کیا۔ اگلے صبح پھر پل آیا۔ جاتے سے کہنے لگا۔ جی جان جی ایہ ساری دولت تمہاری ہے صرف ایک شراباکہ تم“ جی جان جی اپنا تکیہ کھڑا بناؤ۔۔۔۔۔!“

باواہی نے گروہ لگائی۔ ”پھر۔۔۔۔۔؟“

”پھر یہ کہ میں نے ہر بات کے آغاز و انجام پہ جی جان لی تھی مگر اب یہی میری پہچان ہے۔۔۔ جی جان لی!“

”مجھے تمہارا پیغام ملا۔ بارش کی دعا کے لئے کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ لوگ نیچے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ مخلوق خدا کی ہمتوں سے بے حال ہے۔ بھوک پیاس سے لوگ مر رہے ہیں۔ اچھے بُرے سب ٹوٹنا کر دُعا نہیں مانگ رہے ہیں مگر کسی کی دعا مستجاب نہیں ہوتی۔ تم نے کس بھرتے پہ بارش برسانے کا یہ پیغام دیا ہے؟“

وہ مسکراتے اٹھاتے ہوئے اُٹھی۔ شراب کی صراحی تھامی اور جھروکے میں جا کھڑی ہوئی۔ آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”جی جان لی! بارش اور شراب کا برسا نا ہیہا نا پکڑا یہاں بھی تو نہیں۔۔۔ آپ میرے پاس یہاں جھروکے میں آئیں۔ آسمان اور زمین کی جانب دیکھیں!“

بادا تھی! ادھر پہنچے تو شراب کی صراحی اُن کے ہاتھ تھامتے ہوئے ہوئی۔

”جی جان لی! کچھ جتنی چاہے بارش لے لیں۔“

بادا تھی! آسمان اور زمین کی جی جان لی!۔۔۔ جب بادا کھائی تو اسے وہاں سے کھڑے رہے۔

جی جان لی! سننے لگا ہوا۔

”شراب کو اُن کی پیاس میں یا لٹکا دیں تو بارش لے لیں۔“

بادا تھی کے چہرے پہ اسے کوئی کھانا لایا۔ مجھے شہدائے کرام کی طرح حاکم کیا۔ آسمان سے گولڑوں کی آوازیں آتی شروع ہو گئیں۔ طرفین اُٹھیں بادل کھڑے۔ جی جان لی نے اپنی کولہ سی ہنر بولڑیوں بھری کھائی جھروکے سے باہر نکال کر جوہرائی تو پتہ لڑیوں کی چمن چمن میں میٹھا کی رسم بگم شروع ہو گئی۔ خلقت خدا جو نیچے اوپر کھڑی تھی۔ غوشی سے ناپنے لگے۔ ہر سست خستہ کی ہوا کے ترہے نہ لے لگے۔ مٹی کی نوہ جی سونڈھی خوشبو اور موسلا دھار برسی بارش نے اک سماں باندھ دیا۔ جسے دیکھو بارش میں بھیگا ہوا آدم بچا رہا ہے۔ وہاں کی مار سے حیرت، ششدر سے کمرے اس غلامانی بارش کا نظارہ کر رہے ہیں اور کبھی جی جان لی کی بارش میں ٹپکتی ہوئی کھائی اور ملتی ہوئی ہنر چولڑیوں کو بھی دیکھ لیتے ہیں جن کے حلقہ سے ہینڈ کی دھندل پھرتی موتیوں کی مانند ٹپک رہی تھیں۔ اک اچلتی سی نگاہ چہرہ پہ پائی! بعد ازاں اک ہوتا بہ اترانہ اُتار۔

”جی جان لی! سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے۔ یہاں تک ہر لائق و لکڑ رہے مگر باطن کو رچی انور مجھے لگا اپنی عمر اس دشت کی سیاحتی میں رائیگاں گئی۔ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ تمہارے پاس صراحی سے سے کے

چند قطرے نکلتے ہیں تو آسمانوں پہ بادلوں کے ہندو مکھل جاتے ہیں۔ چوڑیاں کھٹکھٹاتی ہو تو نرم جھم جھم برسنے لگتا ہے۔ اب کچھ سمجھا دیے مقام کیسے حاصل ہوا؟

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنی سی کہنے لگی۔ ”چھوڑیے ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ ذرا باہر کا لکھا۔ کیجئے۔ اللہ کی مخلوق کیسی خوش ہے ان کے چہرے تازہ گلابوں کی مانند مکھل اٹھتے ہیں۔ بیباکی دھرتی خوب میرا بھورہی ہے۔“

بادامی نے نیچے دیکھا۔ ہر جانب پانی ہی پانی دکھائی دیا۔ پھا جوں برہتی ہوئی بارش نے ہر جہاں آب زار کھلا دیئے تھے۔ اب عید گاہ کی جانب سے بھی جھوم واپس پہنچ چکا تھا۔ وہ لوگ شاید وہاں پہنچ بھی نہ پائے تھے کہ مقصد پورا ہو گیا۔ ایسے میں بھیگتا ہوا پناوڑی اوپر پہنچ آیا۔ پیغام لایا کہ نیچے لوگ بادامی کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر بادامی کو اب نیچے اترنے کا ہوش ہی کہاں رہا تھا۔ وہ تو اب پہنچنے کے چوبارے چڑھ چکے تھے۔ منڈھے چڑھی ہوئی بٹلی تک چڑھی رکھیل پکٹی گھائی کا تیل۔ ان کے کھیل میں بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ تھرا امرتہ کو دے چوبارے کو دے نہ بخارے۔۔۔

UrduPhoto.com

راہتی تھی۔ نگے قلم سر سوئی تھی کا استحسان تھا۔ شہرت و دولت کی باندیاں پاؤں پائی رہتی تھیں۔ واقعہ ہے کہ میں اونی سے دور بچھڑت میں ایک کپکپ پارتی میں شریک تھی۔ یہ سارا احکام وہاں کے ایک شخص نے اپنے اگوتے بننے کی پہلی سانسوں کی شہرت میں لکھا تھا۔ وہ ایک پارٹی تھا۔ بڑے امیر کبیر لوگ اور نیچے ممبران بھی شامل تھے۔ جنگل میں قدرے محفوظ حصوں میں مناسب قاصدوں پہ حسب مراتب نیچے چھو لہاؤں۔ تنہا قاصدیں استادمہ کر کے بڑی رہتی پیدا کر دی تھی تھی۔ رقص و موسیقی کا بڑا خاص انتظام تھا۔ میں بھی اب طالب لکے کے ساتھ شامل تھی۔ یہ بھی رقص و موسیقی کی اعلیٰ قدروں اور تہذیب و ثقافت کے عالم سے میرا قدیم تعلق تھا۔ چنانچہ اس نے اہل و خاص میری خاطر داری کے لئے میرا پہلا سانس و آرائش شہرہ و دوسرے شخصوں سے بہت کر ایک ہموار جگہ پہ استادمہ کر دیا۔ یہاں دوسری جانب بڑی دھڑب دھڑی تھی۔ کئی ایک جھرمٹے اور آبشاریں زرد ایک دوسرے گھائی و بٹلیں۔ گھائی جہازوں کا موسم تھا۔ قدر بلند یہ جگہ خاصی عمدہ اور دلچسپی تھی۔ کوئی بھی چیز واضح اور خشک دکھائی نہ دیتی تھی۔ دن بھر میری تفریح اور شکار کا شغل رہتا۔ اس وقت رقص و موسیقی کا دھڑلہ کی محفل گرم ہو جاتی۔ ایک شام کا ذکر کر کے اچانک سردی بڑھ گئی اور اچاند نے ایک دھڑچا در تان دی تھی۔ ساتھ ہی ڈالہ باری شروع ہوئی۔ اس سے سردی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اب جو ہوا چلی تو نیچے پرندوں کے

پروں کی مانند پھڑپھڑانے لگے۔ میرا خیمہ اس پنڈال سے خاصے فاصلے پر تھا۔ تیز ہوا بارش اور تند اور لمبہ ہوا
 جو سختی ہوئی سردی نے ہمیں اس جگہ سے نکلنے نہیں دیا۔ ہماری ایک مجبوری ہمارے آلات موسیقی بھی تھے جنہیں
 بارش اور ایسے تند و تیز موسم کے اثرات سے بچانا ضروری تھا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح ہم انتظام کر کے
 اپنے خیمے میں پہنچے تو وہ صحیح سلامت تھا۔ میرے ساتھی سازندے اپنی اپنی چھولہ دریوں میں گھس گئے کہ سردی
 اور بھیگے لباس نے ان کا برا حال کر دیا ہو تھا۔ میں بھی اپنی خوابگاہ والی چھولہ دری میں چلی آئی جس کے پردے
 پر تھوہری تہہ والے کپڑے سے بنے ہوئے تھے۔ اسی نرم گرم اور آرام دہ بستر کے تصور سے میری ساری
 کلفت کا فور ہو گئی اور میں جگت سے شب خوابی کا لباس تبدیل کر کے سونے کی غرض سے تو فلک اٹھا لیٹنے لگی تو
 مارے حیرت و فکلی میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ایک لمبوترے مرد والی کالی کتیا معا اپنے پانچ چھوٹے زائیدہ بچوں
 میرے بستر میں آسودہ ہے۔ ان کے کبک موت سے بستر کا ناٹ مارا ہوا بچہ بدبو نے میرا دماغ صاف کر دیا
 تھا۔ میں تو فلک واپس لٹھی پر چپکتے پانچ بچے ہوئے باہر خیمے میں نکل آئی۔ میرے فانی ملازم سازندے جو
 بھیگے سردی سے لڑتے ابھی ابھی اپنے بستر میں گھسے تھے مجھے اس طرح تنگ پایا کہ بستر میں سے باہر نکل
 آئے۔ جب سبھی صورت حال کا انکسار ہو گیا تو بھلائے میں سے سات چھولہ دریوں میں چپکے۔ کتیا پناہ لیا
 اور چہرہ تو فلک پر چپکے ہوئے۔ اب میری دیکھ بھال میں تھیں۔ وہ بچے ابھی آگے بڑھ کر کتیا کو بے ہوا
 کہنا شروع کر دیے۔ اب وہ اسے بستر سے باہر کرنے کی ڈکھیں مارتے لگے۔ ایک نے آگے بڑھ کر تو فلک کھینچی
 اور پھینکی۔ بچے جسم والی کالی کتیا کو بے ہوا سے خستے سے ایک پھونپھون دار ذمی نصف درجن زائیدہ خستے خستے بچے جن
 کی ابھی آنکھیں بھی نہیں کھلی تھیں۔ چھوٹے جسموں پر وہ بچے تھے۔ ہر بچے کے سامنے اس عظیم موسم میں ان
 کے سروں پر کڑے نرم گرم مخمور بستر سے بے دخل کرنے کی ترکیبیں کر رہے تھے۔ میری کچھ میں نہیں آ رہی تھی
 کہ اس نیم جنگل میں یہ کتیا میرے بستر میں کیونکر گھس آئی۔ جبکہ مہمانوں کے خیموں کی تعداد تھی کہ
 گھمبیراؤں کا کلد موجود تھا۔ میرے ملازموں میں دو آگے بڑھے تاکہ بستر کی چادر میرے انکسار اٹھا کر نہیں لٹکا
 دے۔ آئیں۔ اب اٹھا کر چاٹو معلوم ہوا کہ کتیا کبھی طرح کرائے لگی ہے۔ غور سے دیکھا تو پورا بستر تو فلک کے
 نیچے کتیا کی زینگی والی آرائش سے شہزادہ لپ۔ اب ہمیں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ ایک پڑا جس کا آدھا
 اعز باہر اور آدھا کتیا کے پیٹ کے اندر تھا۔ یہ اس حرکت پر اہوا ہے۔ میری توجہ دینے پر کتیا بڑی طرح ہانپنے
 اور جسم اٹھانے لگی تھی۔ مزید توجہ دینے پر معلوم ہوا کہ ایک پڑا زینگی کی کبھی وجہ کی کی جہ سے سر چمکے کہ ہر گھنٹہ
 کوشش کے باوجود اس کے چادرے جسم کو اپنے جسم سے خارج نہیں کر پا رہی۔ خدا جانے مجھے کیا ہوا میں نے
 ایک ملازمہ کے علاوہ سب کو باہر کیا۔ پانی گرم کر دیا۔ ملازمہ کی مدد سے کتیا کے جسم کو صاف کیا مگر وہ بچے سے

نجات دلوائی۔ گرم زودھ چای، ہسٹر کی چادر میں تھپیل کر کے لٹایا اور پلوں کو اسی بستر پہ لیٹایا اور خود تمام رات اس کی جیاداری تکلیفداشت میں گزار دی۔“

جی جان جی بتا رہی تھی اس واقعہ کے بعد اس کی زندگی اور سوچ میں اک عجیب سی تبدیلی واقع ہوئی۔ اس تلاش میں رہنے کے باوجود وہ اللہ کی توفیق سے گناہوں سے بچی رہی۔ ظاہری اور باطنی عبادتیں وہ ہمیشہ پوشیدہ رکھتی۔ کتوں سے محبت اور ان کی خدمت کا یہ عالم کہ اس دن سے اس تک وہ روز کتوں کی دعوت کا اہتمام کرتی ہے۔ ان کے لئے خاص پکوان پکوا کر کھلاتی ہے۔ کہیں دکھائی دے جائے تو احترا م کرتی ہے۔ اس نے بتایا کہ اللہ پاک اس کی کسی بات کو رد نہیں کرتے۔ جو اسجا کروں مان لی جاتی ہے۔ لیکن میں نے اپنے لئے کبھی کچھ نہیں چاہا۔ ا

بابا جی سنگ دار سے یہ کہتا تھا کہ اگر نفل آیا تھا تو اس میں وہیں پہنچتے ہیں۔ میں اور میرے تین ساتھی ملک کاغذ بننے والوں کے ساتھ سنگ دار بابا جی کے میلے میں شرکت کرنے لئے روانہ ہیں۔ بھگوان سنگ کاغذ بننے والوں کی کارستانی فرارسی اور کرم بابا جی سنگ دار نے مجھے شکتی کو لانے کے لئے بھیجا ہے اور جیشید کے مطابق کہ بابا جی نے ہی آئے۔ کو اور روکا ہے۔ میں جس شرکت گئی جا چکی ہے۔ اب شکتی ضرور شرکت کریں گے۔ میں نے کہا کہ ان کی حالت دیکھو گی۔ یہاں تک کہ ان کی سبھی باتیں سن کر ہر شخص ہمارے پاس آکر بیٹھا اور اچانک سبحان اللہ کہنے لگا۔

مگر اور خاموشی..... اگر ساتھ ساتھ ہوں تو تجھیں الجھن اور پیچیدگی بگاڑ رہی ہے۔ مجھوں ہوتی ہے۔ جس کے
راستوں اور قاصدوں کا اور سناٹا ہے۔ کئی کئی بار یہ ہے کہ جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے۔ منزل پہ مسافر کی جگہ
ایک فرد و ناما و جانچ رہا ہوتا ہے جس کے پاس نہ تو کسی خوشی کا احساس ہوتا ہے اور نہ کوئی چیز جو اسے
سہانی دے۔ وہ ایک پارسل کی مانند ہوتا ہے جیسے جیسے چلتے پہ اتار پھینک دیا جاتا ہے۔ سفر تو ایک مکمل کتاب کی
جس کا ایک ایک حرف و لفظ آپ سے توجہ بھی چاہتا ہے اور اقلہ بھی۔ سفر میں ساتھ ساتھ
اس سے بہتر ہے کہ اپنے ساتھ کسی بندہ کو لے لیں تاکہ کم از کم وہ اپنی غموں غمناکی اور مٹکی حرکتوں سے آپ
بہالے تو رکھے..... بندہ سے یاد آتا۔

● **لنگا کے سفر میں بندر بنزار**

ایران جانے کے لئے بذریعہ بس بلوچستان میڈرکٹ ماہری مجبوری تھی افریقہ کا ٹریک ٹو ہوا۔

عربی زبان کی سروس تہران تک تھی جبکہ مجھے بارڈر کے قریب ایک ایرانی گاڑی میں پہنچنا تھا۔ اب وہی طریقے
تھے ایک مقامی بس پہ سفر اور دوسرا کار یا ٹیکسی۔ دوسرا طریقہ اس لئے قابل عمل نہیں تھا کہ پرائیویٹ کار یا ٹیکسی
ایسے طویل اور تھکا دینے والے پہاڑی اور صحرائی سفر کے لئے سبوزوں نہیں تھیں اور پھر غیر محفوظ بھی ایسی کہ
سفر اور گاڑی دونوں غائب ہو جائیں۔ اب صرف اور صرف مقامی بس ہی میرے سامنے تھی راستہ تھا۔
میں نے نہیں کوئٹہ کے مقامی ادا سے پہنچنا۔ بس میں بھارا بھرے جا رہے تھے۔ وہی بلوچ، کمراتی، ایرانی، افغانی،
پاکستانی، زیادہ تر پھیرے باز۔ اندر جھانکا تو وہی ماحول، ایک نشستیں بٹھنے ہوئے مسافروں پر نیچے سامان کے
جوار۔ الہی! میں چوبیس گھنٹے کا سفر کس طرح طے ہو گا؟ میں بس سے نکل آیا کہ جو بھی ہو میں اس طرح سفر
نہیں کر سکتا۔

آپ کے لئے ہے

”عاجی صیبا انکٹ لے لیں بعد میں سیٹ نہیں ملے گی۔“

میں نے شکایتوں پر جان بھیجے تھے اور کہا۔

”جیسا میں نے اور پڑھاؤں ایک کھوئی سیٹ اور اس سے ماہوں میں ہے۔“

UrduPhoto.com

جہاں

اور مجھے پتہ ہو کے کہ وہ اعلیٰ صیبا آپ کے فرستے گا میں تم کو لے کر

اسی کے مشورہ پر میں نے فرسے کا بس کا جانا کو لیا۔ (ماہیو کے چوتھے پورا ماتے نشیسی تھی۔)

تقدیر کے کشادہ دہانہ صاف پینے کے پانی کی ایک گنگہ کا نام ہے جس کے کناروں کو ریگستان قرار دیا گیا۔

مسلحہ فساد کی بیک پیٹک ہے۔ کچھ سرگرمی بھی ملی رہے تھے۔ دو گنڈے یکسر ہوا۔

”جانتی صیب ان چار شخصوں ہی رہ گئی ہیں۔ بیٹھنا ہے تو (اوپر چھپے) درواگے بھی کھڑے ہیں۔“

میں نے کہا: "یہی! ان لوگوں کو اوتھر بٹھا دو مجھے نہیں چاہتا۔"

میں ایک مایوسی کے عالم میں وہاں سے نکلنے ہی والا تھا کہ چپس ہی کھڑا اچھکیں ڈرا نیو زامیر احوال خلیہ

۱۸۰ لباس انگوٹھیاں لگنے کے مسئلے وغیرہ کیجیے کہ مشورہ ہوا۔

”اوتے نوازے مگرے کیا پرانے ہیں؟“

کنڈیلکٹر تیار ہائی "طابی صوبہ نے تفتانہ بیان ہے۔ یہاں پہنچنے کے آگے۔

اب وہ بھلاؤ راستہ رنجش سے مخاطب ہوا۔ ”یہ عجیب احوال کیا پورا کلم ہے؟“

آپ میں نے بتایا کہ بس بہت خوبصورت ہے۔ آپ اور یہ کنڈیٹر بھی بہت اچھے ہیں۔ اندر سیتیں

میں پھر خاموش رہا کہ میری پالیسی ہے اگر مقابل زیادہ کہنے بولنے کا مزہ نہیں ہو تو اسے خوب تے کرنے دو۔ جب اس کا پیٹ خالی ہو جائے گا تو خود ہی شانت پڑ جائے گا۔ میں اب کسی نہ کسی طور ادھر سے نکلنے کی سوچ رہا تھا۔ اچانک مجھے سوچھی۔

”بھائی جی! آپ نے تو ادھر سے شام کو نکلتا ہے۔ مجھے بھی دیکھ کام ہے آپ آرام کریں میں اللہ شام تک ادھر آ جاؤں گا۔“ انھنے کی خاطر گھٹنے پہ ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہی لٹو جلد رکٹریکٹر اندر آ گیا۔

”اؤئے نوازے! تجھے کیا پراہم ہے بھر صیب کے لئے نکت کیوں نہیں بناتا۔ ان کو سپر وینکس دی آئی پی کلاس میں بٹھانا ہے۔ جلدی سے ان کا نکت بناؤ۔“

میں اس طرح چھٹتے دیکھ کر پوچھ لیا۔

”بھائی صاحب! یہ سپر وینکس دی آئی پی کلاس میں آج صیب ایہ تین تینیں میری بائیں طرف ہوتی ہیں۔ آرام دہ کھلی۔ دباؤ نہ چھکا۔ سنے ہر منظر صاف۔ راستے میں جگہ جگہ کسٹم پولیس زونز اور پینکٹ والے بھی آگے والی آئی پی سواروں کو روک چھتے ہیں بلکہ اناسلوٹ کر کے جانے والی گاڑیوں کو روک دیتے ہیں۔“

اب میں نے اس کی بات سنی۔

”نوازے! ادھر وہ تینیں تک ہو چکی ہیں۔ ایک تو تینیں اسکرین والی اسکرین صاحب ہیں دوسری سوائی سردار صاحب صاحبہ چنگ والے ہیں۔ تیسری سیٹ کیئر تینیں کے ساتھ چالی ہے۔ چالی صیب کو اسے سیتہ ہیں۔“

میرا تو کلیجہ اچھل کے حلق میں آ گیا۔ ڈرائیور کے ساتھ آگے تینیں تینیں اور میری سیٹ کیئر تینیں کے ساتھ..... میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”بھائی جی! سفر میں مجھے الٹی کا احتمال بھی رہتا ہے۔ آپ یقین کریں کہ مجھے نقصان جانا ہی نہیں۔ جس تو ویسے ہی ڈرائیور معلومات کے لئے آیا تھا۔“

اب میں نے طوعا کر یا اٹھ کر جانا چاہا۔

ڈرائیور بھائی بھی کھانا چھوڑ کر میرے ساتھ اٹھ لیا۔ دفتر سے باہر نکلتے نکلتے وہ مجھ سے مل گیا۔

”میں سمجھ گیا آپ تک، اگر دینا نہیں چاہتے۔ میں آپ کو تینوں دی آئی پی سیتوں پہ اکیلا ہی چھوڑوں گا۔ ٹھکانا اٹنی آئے تو کھڑکی سے باہر۔ اؤئے نوازے! میری بھو میں نہیں آتا تجھے کیا پراہم ہے۔ اؤئے آگے کی دونوں سواروں کو پیچھے فرسٹ کلاس میں بٹھاؤ۔ انھیں سمجھاؤ ہمارے مرشد پیر صاحب

آگے اکیلے بیٹھیں گے وہ کچھ نہیں بولیں گے۔“

میں نے گڑبڑا کر انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ انہیں وہیں رہنے دیں۔ میں نے جانتا ہی نہیں وہ میرے کان کے قریب پہنچ کر سرگوشی کے انداز میں مشورہ دیتے لگا۔

”بھئی صیب! مجھے ایسا تا بعد از ذرا ٹیور اس بس سے بہتر بس آپ کو پورے اڈے پہ نہیں ملیں گے۔ پورے راستے ہمیں ہی دوسروں کو اُدھر تک کروں گا۔ اگر کوئی اس بس کو اُدھر تک کر جائے تو میں یہ بچپن کی پالی ہوئی موٹھیں صاف کر دوں گا۔ یہ میرا بلوچستان کو بچپن ہے۔“

اس نے پاس کھڑے کنڈیکٹر کو ایک دھول جھاتے ہوئے پوچھا۔

”اڈے نواز سے اچھے کیا پر اہلم سے تو بھ صیب کو میرے بارے میں کچھ جانتا کیوں نہیں۔“

اس سے جو دفتر کہ وہ اپنے استاد کی بلوچتا ٹیڈ کرتا۔ میں ہی میا اٹھتا۔

”ذرا ٹیور بھائی! یقین کرنا مجھے آپ اور آپ کی بس کی تمام خوبیوں کی خبر ہے۔ ایسی لا جواب خبر۔

ایسا ہاکال! بالمشاق ذرا ٹیور پورے بلوچستان میں نہیں ہوگا۔ یہ نہیں کہ میرا دل کیوں آتا وہ ستر گھر

آپ ۹ UrduPhoto.com

اس نے پھر میری بات اچک کی۔ اس میں ہوسباری سے کہے لگا۔

”کونسا اب ایک بات ہے میرا دل بھی آتا وہ دکھائی نہیں دیتا کہ میں آپ کو یہ سب اس پر چلی کی

حالت میں چھوڑ کر جاؤں گا۔ وہ میرے سفری قہیلے کھانے پینے کے سامان کی لٹکائی کی جاباب اٹھانے کے

ہوئے مزید لگا۔“ آپ یہاں آج کتنا ہی جلد سے کی فون سے ملے ہیں۔ اس بس پہ نہیں کی جہاز

پہ یا کسی ٹیکسی کار۔ لیکن یہ میری گارنٹی ہے کہ آپ کو میرے ساتھ اس بس سے بہتر کوئی اور سفری جہاز

نہیں ملے گا۔“

میری دیکھ کر وہ یوں کے علاوہ میری ایک نمایاں کمزوری میری اڑنے والی طبیعت بھی ہے۔

تھکان سے قطع نظر میری سولی چوہرا لگی سواڑ لگی۔ جا بقیہ۔ کوئی ایسی ذرا مانی صورت حال درمیان میں

ہو جائے جو میری خواہواہ کی ضد کا بظلال کر دے۔ یہاں بھی یہی صورت تھی۔ میں ”بے فضول“ کی

ہوا جبکہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اگر جگہ کی غمی کا علاج ہو جاتا ہے اور نہ ملے پاؤں سواری اور پاؤں کو نہ

سے طبعہ کشہ وہ بیت مل جاتی ہے تو اور مجھے کیا چاہئے؟ بس میری نام نہادانا کا مسئلہ کہ میں ایک

جو کر بیٹھا تھا۔ میں نے اپنی انکار والی انا کے ترنس کا آٹری تیر بالآخر اڑانے کا فیصلہ کر لیا۔

”بھائی! میں بڑا مسکین فقیر منش ہوں۔ میں تو عام مسافروں والے کرائے میں بھی استوار ہوں

صیوان کو محسوس کیا تھا اتنی جلدی اسے باطل ہوتے دیکھ کر میری آنکھوں میں ٹون اتر آیا۔ یوں لگا کہ میں اس بیوروہس جس کے وی وی آئی پی کے کندھے سر اور بال ایک چھچھوری ہاندی کی دستبرد سے محفوظ نہ ہوں ایک لمحہ کے لئے بھی سفر جاری نہیں رکھ سکتا۔ میں نے قہر بھری نظروں سے چمن لٹھ کو ٹوکا۔ وہ مجھ سے نظریں نہ اٹا ہوا کھسیا نا سنا بتائے لگا۔

”بھ صیب! میں نے آپ کو اپنی جس دوست باوری کے بارے میں بتایا تھا وہ یہی چھٹک چھلو ہے۔“
 ”انٹ کھٹ ناوان ہے آپ اسے معاف کر دیں۔“

میں نے اس چوٹکا دینے والے انکشاف پر مزید برا فروخت ہوتے ہوئے پوچھا۔
 ”جہاں تک مجھے یاد ہے تم نے شاید کسی مسلمان لڑکی کے بارے میں بتایا تھا جسے تم چاہتے ہو اور وہ بھی تمہیں۔“

وہ حسب عادت قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کسی لڑکی کا نہیں اس باوری کا ذکر کیا تھا۔ یہ لڑکی پکڑی مسلمان ہے۔ مجھ نہیں کھاتی جسم اور مرد عذاب کے رکھتی ہے۔ یہاں شرم کرنے والی بھی کس ہے کھرا کھالی بیمار لڑکا کرنے والی ہی ہے۔“
 میں نے پوچھا۔ ”یہ کون سا لڑکا ہے؟“
 ”اس کا نام ہے اس کے پاس بالوں کے ساتھ یہ لڑکا رکھا ہے اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

میں نے ایک لمحے وار موڑ کاٹتے ہوئے کھلے بے نیازی سے جواب دیا۔
 ”بھ صیب! آپ تو جانتے ہیں کہ یہ لڑکا کون سا ہے؟“
 ”یہ جانور ای طرح سے اپنی محبت یا عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔ اگلے کے سر سے جو نہیں نکلیں وہ غور نہ نکال کر چٹ کرنا۔ بالوں کا نوں سے مستی کرنا ان کے لئے پسندیدہ ہوتا ہے بلکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ دوسرا بھی ان کی حرکتوں سے خوش رہا ہے۔“

میں بندروں کے بارے میں اس کے فلسفہ الف و مقیدت پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ کافی آنکھ سے بے بی باوری کی حرکت لیا گھٹ بھی دیکھ رہا تھا۔ ریشمی چمکدار کپڑے کی گھا کر یا جس پر ملنے کا ہکا کا کام تھا۔ دونوں کانوں میں سونے کے تارپاؤں میں چاندی کی جھانگھریا ہارہوں میں تھنے تھنے کھنکھن۔ میں نے کم از کم اپنی ہوش میں ایسا کوئی پالتو بندر یا بندر یا کھنکھن جس کے گلے میں کوئی زوری یا زنجیر بندھی ہوئی نہ ہو کیونکہ یہ جانور بڑا اچھل ہوتا ہے۔ موقعہ میسر آتے ہی سارے بندر من نوڑ کے لٹک جاتا ہے۔ یہ جنگل اور تختوں غاروں گھپاؤں کے بغیر وہی نہیں سکتا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ گلی خلوں میں گھومنے والے مدار یوں

قلندروں کی رسیوں میں بندھے کھینچتے ہوئے بندر؟ یہ بندر نہیں بلکہ بندر روڑ ہوتے ہیں یعنی سڑکوں کے بندر۔۔۔۔۔ جو جنگل کے بندروں جیسا ایک روڈ ہوتا ہے۔ بندر اور انسان کا بچہ اگر خاموش اور بغیر کسی اچھی لڑی حرکت کے ہے تو یہ بے گدوہ پیار یا پھر گرا پڑا ہوا ہے۔

آپ نے کہیں نہ کہیں ضرور دیکھا ہوگا کہ ریڑھیوں کی ٹیکوں کی ٹیکوں والے اور کچھ اسی قبیل کے شائق لوگ ویسے تو قصبوں میں آوازے لگا کر سناٹیلوں ریڑھیوں پر سامان بیچنے والے دوکاندار اکثر اپنے ساتھ بندر کا بچہ بھی رکھتے ہیں۔

”بندر والا آیا“ یا ”بندر والا آیا۔۔۔۔۔“ بچے بالے اور ان کے پیچھے ان کی مائیں بیٹیاں بھی لگن لگن ہیں۔۔۔۔۔ دوکاندار کچھ نہ کچھ دے دلا کر ہی وہاں سے لٹتا ہے۔

نوجوانوں میں اکثر وہ بندر لایا پاتے ہیں جو ریڑھیوں کے کسی حصے کے میں ناکام ہو چکے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ اپنے محبوب معشوق کے نام پر کچھ حرف آگے پیچھے کر کے اس کا نام دھر دیتے ہیں۔ اچھا کھانا پلانا کینا۔۔۔۔۔ زبردستی وہ ایک حرکت سے اسے اپنے بے وفایاں محبوب کا دل چاہے کہ خود کو تسکین دینے کی وجہ سے اسے لڑکوں کے ڈرائیور حضرت کے لئے بندر لایا اچھی سی ریڑھی اور دوکاندار سے کھانا مل جاتی ہے۔ بندر یاں تو چھپ چھپ کر اور کچھ دیر بعد اس کی ریڑھی پر لائی جاتی ہیں۔۔۔۔۔ اور اسے اور کچھ دے دیتے ہیں۔۔۔۔۔ کبھی ہیں۔۔۔۔۔ جس کے چھوٹے موٹے سب کام سر انجام دیتی ہیں۔ کھانا پینا آرام سب ایک ساتھ۔۔۔۔۔ اس کی گود میں معشوق کی ریڑھی دھرے سو رہی ہیں۔

سہیلی باوری کے پاؤں میں کوئی لڑکی ریڑھی رکھائی تھی تو سہیلی نے پا چھ لیا۔
”چن چن احم اسے کوئی ریڑھی دے دینا کہ نہیں رکھتے؟ سفر کی حالت میں اسے ہاتھ۔۔۔۔۔
رنگن اس کی حفاظت کے لئے بھی بہت ضروری ہے۔“

میری اس بات کے جواب میں وہ یوں بیٹھا جیسے میں نے کوئی انتہائی بچکانہ سی بات لڑکی کے لئے کہنے کی کوشش کی ہو۔۔۔۔۔ ریڑھی ہٹنے کے بعد وہ ایک دم نوم و سدا ہو گیا شاید اس نے بھی کہہ سنا ہے۔۔۔۔۔ نفل اسٹ چھوڑے آ رہے تھے۔ غم کے سیٹ پر سفر کرنے والے جانتے ہیں کہ ایسی تیز روشنی کسی کی نظر سے چھپا کر دیتی ہے۔۔۔۔۔ لڑکے لڑکے تو وہاں اپنے لڑیکے چاتے ہوئے کہنے لگا۔

”بھئی سب ایہ باوری میری محبوبہ ہے کوئی اتار دے تو میں نے ریڑھی پر پانی جا میں۔ جس شخص نے بندھنے کی ضرورت نہیں آئے اس سے خود ہی دستبردار ہو جانا چاہئے۔ اس کو میں اس لئے بھی باور دے رہی ہوں کہ یہ واقعی باوری ہے جو مجھ ایسے بے مایا بے گدوہ کے سنگ اک وفا کا بندھن جوڑے بیٹھی ہے۔ جس کے

مردانے اور دس کھڑکیاں کھلی ہوتی ہیں۔۔۔ کسی سے جس میں کوئی بھی نہیں ہوتا۔۔۔ یہ جاسکتی ہے کہیں بھی شہر، صحرا، پہاڑوں میں کہیں جہاں وہ جانا چاہئے۔ مگر میں تو چلا جاتا ہوں اپنی ضرورت کے مطابق۔ یہ کہیں میرے پاؤں کے نیچے اپنی جگہ پڑی رہتی ہے۔ جب جی چاہے بس کی سیٹوں، کھڑکیوں، چھت، انجن پر لیٹے لگتی ہے۔ یہی بس۔۔۔ اس کا گھر آگن، اینجیل، منگل۔۔۔ ایک سہ ماہی سب کچھ ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ کوئی بھی جائداد زندگی کے کسی بھی روپ میں ہو۔ مکمل ایک کائنات ہوتا ہے۔

اس کے اپنے سورج، چاند، ستارے اور یا پہاڑ، سمندر، آسمان ہوتے ہیں۔۔۔ وہ اپنے اندر کے صحراؤں، سرابیوں کا بھی مالک ہوتا ہے۔ اپنی سوچوں، خیالوں کے ٹواہیوں، غذاؤں کا بھی وارث۔۔۔ وہ اپنی سائیکس کے سائیکلون میں پھنسا ہوا سادہ زندگی زیر و زبر ہوتا رہتا ہے۔ جبکہ ہر انسان روز و آزل سے ہی دین و دنیا کے ہر علوم و اسرار سے آراستہ ہوتا ہے، دانش و پیش کا اور ملک، توکل، تہذیب، ہندو، بونیا، بدو، اچھوت، ویزاں، ٹوب کھتے ہیں۔ صرف اظہار و بیاں کے بورے ہوتے ہیں۔ پھر اپنی اپنی تسکین و تشفی، یقین و تسلی کی بھی بات ہوتی ہے کہ جہاں ہندو کوئی ٹھک جاتا ہے، شہر جاتا ہے۔ رفتی حیات، ہندو، اندر، ہندو، انسان ہی نہیں بلکہ چمچ، پرند، شجر، جز، جن، و انس یا کوئی اور جائداد بھی ہو سکتا ہے۔ بات تو طبیعت کی کہ جہاں۔۔۔ کتنی ہے کہ اس اتنی ہی بات ہے۔

UrduPhoto.com

کر دو حائس چھوڑنے لگیں تو دھواں دھواں کو غبار میں زماں و مکان کے فاصلے، سلسلے، چشمہ، دریاں میں سے ہو جاتے ہیں۔

لگی بندھی رفتار، ہونٹوں کے نیچے، دا میں بائیں مل، پتھر نسا، چھوٹا چھوٹا، کھڑے کھڑے پہاڑ آسمان کی سیاہ چادر پہ بکے موتیوں سے جھلکتے ستارے پہاڑوں، ریلزاروں کی مخصوص خوشبو۔۔۔ جو رات کے پہلے پہر پر وہ اور آخر شب تک میانے کان لیتی ہے کی شاہ، ابھی ابھی، ادھک، کوئی تھی کہ کھڑکیوں سے منظر ہر جگہ کے جھونکے یوں تراوت دینے لگے کہ جیسے ہم نفسی، دہائی، کشتی پہ سوار کسی قلوب کھت۔ کچھ میں اترے ہوئے ہوں۔ ایسے لمبے لمحات رات کے رازیوں کو رازیوں، مسافروں، سپر، وندروں پہ ٹوب اترتے ہیں کہ وہ چارے ہند سے پڑ بھی ہوتے ہیں اور چکر چکر جگے ہوئے بھی۔ یعنی جاگو، مٹی کی پڑکھ، کیفیت میں سرشار بھی۔ بس کے فرٹ کہیں میں موجود ہم ہیں رات کے رازیوں کی اس وقت یہی حالت تھی۔

سمندر میں رات کا سفر، ہفتی، سکون دیتا ہے۔ صحرائے ستاروں کی تصویر میں سفر، روحانی ہالہ، گی، عطا کرتا ہے۔ پہاڑوں کے سفر، مزاج میں سفر، اذیت، طبیعت میں سکون اور توفی میں قوت پیدا کرتے ہیں۔ میدان، سفر، آموگی، آسانی اور غفلت کا میلان پیدا کرتے ہیں جبکہ فضائی سفر، وسعت، خیالی، بید و ذہنی اور فکر میں

تھے پھر۔ تھے۔ پیچھے بس میں سوئے جاگے مسافر بھی کسمپاس کر دوش پار ہو چکے تھے۔ مس باہری بھی ٹپسیاں دارتی ہوئی اچمن لعل کی گود سے باہر کود کر میرے ساتھ خالی جگہ پر بیٹھ کے بغلیں کھینچے گئی۔

میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

"بیٹائی، چمن لعل! یہ کون سی جگہ ہے۔ کوئی پتھر ہوئی یا جینٹل۔ پوسٹ؟"

وہ مجھے اپنے اتارنے کا آؤں دیتے ہوئے بولا۔

”بھری صیبا! یہ جگہ اس بات کا جواب ہے جو ایک گھنٹہ پہلے آپ نے پوچھی تھی کہ باورچی مجھے کہاں

[illegible]

”بچہ بچہ آپ فارغ ہو گئے۔ اتنی دیر میں میں آپ کے لئے کڑک سی جائے ہوا تھا یہی“

اتفاق کہ کے وہ کچھ دالے جو پیارے میں محسوس کیا۔ شاید وہاں کوئی چائے کی دکان تھا۔ میں اس باورے کو
جاتے دیکھ رہا تھا جس کے کاندھے پہ لٹا ہوا تھا۔ وہاں تک کہ اس کے سر پر کا کچھ پتہ ہی نہیں
چلتا تھا جو پچھلے کی لپٹ دیتا ہے اور آگے کی اچانک کھل دیتا ہے۔ پیراٹاب کی اشد حاجت تھی نوٹے کی گردن
اور بچے میں ڈاڑھ پر ڈھلاواں ہی جوگہ پہ ہونیا۔ اب کوئی جگہ مجھے پسند ہی نہیں آ رہی۔ میرا ہمیشہ سے طریقہ
یہ ہے کہ سفر میں سفری چاقو (سوئیس میڈ) منی پرچ سرخ ڈسٹے والا) اور سفری بین نارنجی میری جیب میں ضرور
موجود ہوں گی۔ ایک ہاتھ میں پانی والا گولا اور دوسرے ہاتھ میں منی سی نارنجی جس کی لڑتی ہوئی مدھم مدھم
میں میں اپنے پاؤں تلے کے اونچے نیچے پتھروں پہ کوئی معقول سی جگہ واسطہ دے ہاتھ ٹکراتا مال کوئی ایسی جگہ
جہاں نہ پڑی جدھر میں حاجت رفع کر سکتا۔ کثرت بول کا عارضہ تھا کہ ہاں موروٹی چھاری ہے تم از کم میں
اس سے بہت عاجز رہا۔ دن میں بار بار اور رات بھر بیت الخلاء کے پتھر۔ زیادہ پریشانی سفر کے دوران ہوتی
ہے۔ حتی الوسع میں کچھ کے ذریعے سفر سے گریز کرتا ہوں۔ البتہ ٹرین جہاز سے قدرے سہولت رہتی
ہے کہ سیٹ ہاتھ روم کے قریب تر حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر بھی کبھی کبھی ایسی غلطی دہراتی ہے کہ

تھپتھپتے تھپتے ہی گیا ہو جاتا ہوں۔ کئی بار تو ایسے ایسے مذاپ تھیلے ہیں کہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی پریشان کر دیا۔ ملاحظہ فرمائیں کہ آرام سے سفر کے دوران پڑھ رہا ہوں باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا ہوں یا کسی مسافر سے گفتگو ہو رہی ہے۔ یونہی محسوس ہوا کہ مٹانہ قدرے یونہی ہو رہا ہے۔ اس فرسودہ سے پیشاب آور احساس کو جھٹک دیتا ہوں کہ شیطان خواہ مخواہ خراب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ خود کو صحت مند اور ایک ایسا مسلمان ثابت کرنے کے لئے لاجول والا تو پڑھتا ہوں مگر میرے خیال میں اس قسم کی مکر وہ بہتاریوں میں لاجول والا قسم کے پائیزہ تو گلے کچھ زیادہ اثر نہیں کرتے۔ اب حال یہ کہ ناف کے نیچے اندر جیسے کوئی غبارہ پھول رہا ہے اور مٹانہ پھینکے کو آ رہا ہو۔ اب میں آگے پیچھے اور اندر باہر کی صورت حال کا جائزہ لیتا ہوں۔ زانوؤں کو جوڑ کر اکڑا لیتا ہوں اور پہلو پہ پہلو بدلتا ہوں۔ اس مقام پہ میرے ہاں ایک آدھ منٹ ہی ہوتا ہے وہ بھی غشی سے دانتوں تلے زبان داب کے اب میں باہر نظر ڈراتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ اس کسی ایسی جگہ سے گزر رہی ہے کہ وہ رنگ نہیں سکتی یا ذرا نیر کرتا ہے۔ پانچ دس منٹ اور صبر کر لیں آگے پڑو! کشن پہ دوش زوم بھی ہے اور مٹانہ کی جھلک بھی! پانچ دس منٹ اگر حقیقت میں پانچ دس ہی ہوں تو آدمی ناف کے نیچے میں تھوک کا گرم پاس کر لیتا ہے اور اب پانچ دس منٹ اور صبر کر لیں گے کہ کب تک یہ نہیں آجوتا ہے وہ لکھنے کے قابل نہیں۔ میں نے پارسوں کوئی کسے راستہ میں ہی آجوتا ہوں۔ وہ بار بار ایسا ہی ہو یا راستہ ان کہیں کی پیشاب کی چٹا کرے تو میں بھارت یہ کہنے کے کہ میں رہا ہوں۔ مجھے پیشاب کرنا ہے مٹی کی جھلک سے انور ڈرائیو کے سر پہ آ کر صبر کر رہا ہوں۔ بس فوراً روکو اور مجھے اتار کر چلے جاؤ۔ یہی مسئلہ آکر کر فارغ ہوئے۔ پھر میں واپس پہنچ کر کسی ایک ایک پہنچنے کے لئے

لاہور کے ایک پانچ ستارہ والے ہوٹل میں اولڈ ٹاؤن کا سالانہ وزخا۔ کسی کی غلطی سے مجھے گرمی میں شریک کر لیا گیا۔ مہمان خصوصی چونکہ ایک بڑے صاحبان تھے اس لئے سیکورٹی بہت سخت تھی۔ شرکا، گوجینک، سکریننگ کے مختلف مراحل طے کرنے پڑے۔ جب تمام شرکا، مشقوں پہ بیٹھ چکے تو سب سے اردوازے بند کر دیے گئے۔ آنا جانا موقوف کر دیا گیا۔ میں مجھے اور ہوٹل کے سیکورٹی عملے کو ایک ایسے لاکر مرسلے سے گزرنے پڑا جسے ہم دونوں حصہ داران بھلا تا بھی چاہیں تو شاید ایسا نہ کر سکیں۔ میں مخصوص نشست پہ بیٹھ گیا، مگر رام سے متعلقہ ہو رہا تھا کہ ہوا کب مٹانے سے متعلق موصول ہوا کہ مجھے زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ تک کسی دوش زوم میں ہونا چاہئے، ورنہ وہی ہوگا جو کم از کم اس فائیو ستارہ ہوٹل میں اور اس عجیبہ اور اعلیٰ رانگے حامل اس ہمہ جہت ڈرنگشن میں نہیں ہونا چاہئے۔ قطعہ کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ میں سمجھ کر اٹھا اور غشی اردوازہ پہ استاد سیکورٹی کے مستعد اہلکاروں سے دوش زوم کا پوچھا۔ میں صدقے جاؤں کہ ان کی فنی

گردنوں کے سر یوں میں کوئی غم ہی پیدا نہیں ہوا اور نہ ہی انہوں نے میرے سوال کو کسی جواب کے قابل سمجھا۔
انہیں خاموش پا کر میں نے دوبارہ اپنا مدعا بیان کیا کہ شاید وہ اُدھڑا سنتے ہوں یا سنگرمٹکو کی موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ اس بار اُن میں سے ایک بڑے زور کے اور تھلے لہجہ میں بولا۔

”واش روم! ہاں سے باہر دوسری طرف ہیں مگر اس وقت تک ہاں سے باہر کوئی نہیں جاسکتا۔“
”کیوں.....؟“

”جب تک شرمہارک مندر (سائنس دان) یہاں موجود ہیں ذرا اُسے بند رہیں گے۔“
میں اپنے زانو دباتے ہوئے بولا۔ ”یہنا! میں شوگر اور کھرت بولی کا مریض ہوں۔ یقیناً مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا مگر یہاں کے کچھ لوگ زبردستی چکر کر مجھے یہاں لے آئے ہیں۔ میں گھرتے احتیاطاً خوب اچھی طرح پیشاب کر کے آیا تھا۔ اب کیا کروں؟ پیشاب سے پتھر پریشانی نہ ہو کر دیا ہے۔ میں یوں گیا اور یوں آیا! میں ڈرا کی ذرا ذرا دھڑکھڑکھ رہا ہوں۔“

اُسی لمحہ وہ اسی اور بے حس کا منہ پرہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”بھئی! کسی بھی صورت میں ذرا دھڑکھڑانے کی اجازت ہے۔“
میں نے مزید یہ کہہ کر اپنے جوتے ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہاں پہلے سے کسی کو بھی نہیں لگتی ہے۔ یہ

میر جیسی کامیاب شخص ہے۔ فوراً دروازہ کھولو۔۔۔ ورنہ؟“

میری جانب ناخوشی سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”آپ دوسرے بڑے ڈاکٹر ہیں؟“

”نہیں! میں جہاں کمر اتھاڑ ہیں جہت گیا کہ کم از کم بالکل پاگیا تو کیلا نہ ہو۔“
”رہاشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ جب یہ حد ختم ہو جاتی ہے تو کوئی ضابطہ اخلاق قانون اور شرم کی لٹا پاتی نہیں رہتا۔“
”پاگیا و حیا کر کے بیٹھائی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ لیکن اب مجھے کسی واش روم میں نہیں بلکہ گھر جانے کی حاجت تھی۔“
”دست فستر ہاں! چیز کارہٹ! انتظامیہ کی اخلاقی ہے جس اور عدم تعاون پہ پانی پانی تو نہ ہوا البتہ شرم کے مار سے پیشاب پیشاب ضرور ہو گیا۔“
”اور رے! یہ ورنہ قابلین تیرے نصیب۔“
”جہاں واش روم کا ثبوت! وہاں پریت نہ لیت۔۔۔!“

واش روم تنہا کے غری کی جانب چلتے ہیں۔ پانی خارج روشن کیے میں نیچے دیکھتا سمجھتا ہوا کسی مناسب اور جموار جگہ کا متلاشی تھا۔ عام آدمی کا کیا ہے کسی بھی بظاہر مناسب جگہ پہ بیٹھ کر فارغ ہو لے گا۔ مشکل تو ہم ایسے خطیوں کے لئے پڑتی ہے۔ سے پہر کا خیال نیچے پا حال تک کا جھانکا۔۔۔ اور نگاہ اٹھا ڈالے

تم از کم صاف ہمواری جگہ آؤت دیکھ کر بیٹھے اور کسی ٹنگر یا ٹنٹی سے 'لا حول ولاقوۃ' زرب لب اذہرا کر اپنے غم کو
حصار کھینچ لے اور قدرے آواز سے تین مرتبہ ڈھرائے۔ "میں رفع حاجت کے لئے یہاں بیٹھتا ہوں اگر کوئی
اللہ کی ان دیدہ مخلوق یہاں آس پاس موجود ہو تو وہ پردہ لے لے اور میرے اس بشری تقاضے سے ڈر کر
کرے۔" یہ انتہائی محرب ہے۔ یاد رہے کہ جنات اور دیگر عنصری 'ہوائی مخلوقات' مختلف قالب میں بھی
موجود ہوتی ہیں مثلاً سائب، پچھلی، چمکا، زشت، ملی، آہٹیل، کوا، الو، گیلڈر اور گدھ۔۔۔ یہاں تک کہ کھنٹی، چمٹرا اور
انسان وغیرہ کا روپ سروپ بھی دھار لیتی ہیں۔

میں اپنے حساب کتاب کی جگہ ڈھونڈتے ہوئے کافی آگے نکل آیا تھا۔ یہاں مئی کم پتھر زیادہ تھے
اور سامنے کچھ آگے پھاڑاؤ نیچے نیچے ہوتے دکھائی دیے۔ یہ نہ ہوتے تو میں شاید کچھ اور آگے نکل لیتا۔ کچھ
آگے ایک چھوٹا سا کٹاؤ دیکھ کر میں بیٹھ گیا۔ ہاتھ میں نارنج روشن تھی۔

دنگل، پہاڑ، میدان، صحرا میں اگر کہیں رات بسر کرنے کی مجبوری پیش آجائے تو اپنے قریب آگ
جالتے کا انتظام ضرور کر لو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو کسی بھی طرح کی روشنی کا چارہ کرو۔ چاہے وہ نارنج، مشعل
ہو، مٹی یا کوئی چھوٹا سا دیسی کیوں نہ ہو۔ یہ شرارت بنیات، شہادت الازھر، افکار کے مختلف طور سے کا آرمور
ہوتا ہے۔ بالکل انوکھی جگہ پر یہ نہیں آتا کہ یہاں بھی آگ لگے تو میں اس بات کو غور سے یاد کرتی
ہوں۔ ان کے اندر آگ ابھانا سا خوف خدائی رہتا ہے۔ مگر ایک قسم یہ بھی ہے کہ آپ ہمارے یہاں سب کی نظر
تک رہتے ہیں۔

بچے ہو یا بڑا ان کے ہاتھ میں چھٹا یا سینی تھا، وہی جالتے تو وہ اپنے سرور بھائیں گے۔ اگر اندھیرا
تھا، ہاتھ میں نارنج ہو تو آدمی اسے روشن کر کے دھڑا دھڑا دیکھے گا۔ کیونکہ اندھیرے میں اس کے علاوہ اور
کوئی مشعل نہیں ہوتا۔

میں انہوں سا بیضا، شب کی مصیبت میں چھٹا ہوا تھا۔ جو قطرہ قطرہ اپنی مرضی سے ٹپک رہا تھا۔
کلات بول اور شاگر کے مریضوں کا یہ ایک المیہ ہے کہ وہ مٹائے میں آخری فکر سے نکلے آتے خارج کرنے
کے لمحے میں گئے رہتے ہیں۔ پہلو پہ پہلو بدلا جا رہا ہے نیچے پاؤں پہے نہیں ہیں، زشتی کے ہالے میں چمٹرا اور
پتے پر پتے لگے تھے۔ میں نارنج کی روشنی کا رنگ بدل بدل کر آس پاس کا ماحول دیکھنے لگا ہوں۔ نہ کہاں مجھے
تھوڑے کھینچے ہوئے خائفتی دھار کے باہر چھوٹے چھوٹے قدم کے وہ انتہائی مضطرب بندہ دکھائی دیے۔
مجھے بالوں میں سیاہ بالوں کی کچھ زیادہ سی آمیزش تھی۔ تو کیلے دانست چلچلتے ہوئے وہ سخت ناگواری
کے عالم میں چٹی و پکار کرنے لگے۔ اب کیا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے میرے گرد بندہ جمع ہونے شروع ہو گئے۔

ہے۔ حقیقت میں جنگل کے دربار کا سارا دار و مدار بندر کے نام بھرم سے ہی ہوتا ہے۔ مچھری سے لے کر چنڈ بداری، پلے واری، پوکیداری، تاج بداری اور اہلیان جنگل کی پالنے والی میں بھی اسی بندر کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یعنی جنگل کے طویلے کی ہر بلا بندر کے سر ہوتی ہے۔ جنگل کے چوہے لگڑ بھگے سے لے کر بادشاہ شیر خاں اور اس کے بیوقوف بیوی بچوں تک سب چھوٹے بڑے اس کو تاپائی کہتے ہیں۔ اس جنگل تاپا کے جب درجاء بلند ہو جاتے ہیں تو یہ تاپا بندر سے خلیفہ محمد ہو جاتا ہے۔

سانپ کے آڑی دشمنوں میں بندر، مور، ٹیوٹا، گرگز چیل، مارخور، باز اور انسان سرفہرست ہیں۔ مگر بندر کا کوئی دشمن نہیں کیونکہ وہ سب کے کام آنے والا اور دل بہلانے والا جانور ہے۔ بندروں اور قندروں سے وہ بدکتا ہے کہ وہ بندھن باندھ دیتے ہیں۔ اسے ان کی سوئی اور دھوئی کے اشارے پہ تاج پڑتا ہے۔ بندر دوست بھی ہوتے ہیں اور دشمن بھی۔ بدھت ایک حد تک مگر دشمن ہے حد کے بعد اس کے ہاں ذہانت و فطانت ہوا ہوتی ہے تاہم اوت کی انہدکین اور کینگی کے زچانات بھی پائے جاتے ہیں۔ فانی کو جب کرتا ہے۔ زجولت پسند بھی ہے۔ بندر بچہ ذات کا شہر ان کی اعلیٰ ذات رہیں لنگور ہوتے ہیں۔

ان سے مجھے جن بونے پورنوں سے واسطے پڑا تھا ان کے بارے میں ہمیں کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ درباروں کی کسی بڑی ذات ہے۔ اس لیے یہ جو بڑا دربار ہے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا اور باد کے پلے میں جب اندازہ لگایا کہ جہاں میں ہیں وہاں اس کے اطراف کی چٹانوں اور زردوں میں ان کے مسکن ہیں۔ وہاں موسم بندر اس کے ہاں پیداؤش کا ہوتا ہے لہذا وہاں ہو یا رات بندر اپنے سکھنے کا حق میں انعام ملتا ہے۔ کسی انسان کی آمد کو اپنے سکھنے کے حق میں کوئی مناسب نہیں سمجھتا۔ بندر بکارتے والے بکارتی اور بداری اس موسم میں جانوں اور زمینی چائیوں جنگلوں سے انہیں پھانسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بڑے بندر تو راکم ہی ان کی کڑ میں آتے ہیں مگر چھوٹے بچے اکثر اپنی یہ کھلی کی ہاپ پکڑے جاتے ہیں۔ بڑے بندر کو سدھانے میں بڑی مشکل پڑتی ہے جبکہ بھابندر آسانی سے سیکو جاتا ہے اور بداری سے فافوں ہونے میں بھی کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی۔

یہ ننھے ننھے بندروں کا گرد و بھی شاید مجھے اوسم کوئی قند دلداری مجھے ہوئے تھا۔ اس میں ان کا بھی کوئی قصور نہ تھا میرے اخیلہ حال ہی ایسا کہ میں کو رنکروں کو بچے چنک دکھائی دیتے ہوں۔

بول و بار کا خراج ایک نور کا نظام ہوتا ہے۔ اس میں قتل کو دیکھنا زیادہ تر دشمن پر ہوتا ہے۔ نور خود ہی سارا کام پڑ جاتا ہے۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ میں فارسی ہو چکا ہوں اور اب مجھے لہارت سے فارسی ہو کر اوسر سے عزت سادات بچا کر نکل لینا چاہئے۔ اب میں پا مجاہد چڑھانے لونا مارا ج تھا سے کھڑا ہو جاتا ہوں۔

پیدا کر رہی تھیں۔ اوجھ جگے سی حالت تھی کدوانوں کے نیچے پنڈلیوں پہ آہستہ سے کسی نے گدگدی کی۔ پہلے تو خواب سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا۔ بعد ازاں کسی نے ہلکے سے دانت دھڑکے تو احساس ہوا کہ نیچے کوئی ہے۔ کھٹ سے دماغ میں آئی کہ ہونہ ہو باوری کی حرکت ہے۔ چہن لعل کی جانب دیکھا باوری تو اس کی گود میں سر دیے سو رہی تھی۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اگلی اینچے کون سی ہوا ہے؟ مزید کوئی اضافی حرکت کیئے ہو لے سے دونوں زانوؤں کے درمیان نیچے نظر کی۔ نیم اندھیرے میں بھلا کیا دکھائی دیتا؟ ذہن جان کر ڈر گزر کرنا چاہتا مگر توبہ کچھتے جو اس ہلانے میرا پیچھا چھوڑا ہو۔ اب اس نے ہلکی ہوا والے نیچے غبارے کی مانند اپنا جسم میری پنڈی سے مس کرنا شروع کر دیا۔ جیسے کوئی نرم نرم ہاتھوں سے سہارا رہا ہو۔ اب بجائے ٹھٹھکے پیار آنے لگا۔ یوں سہلانے تھپکانے سے تو بڑے بڑے درد بے وحوش شانت پڑ جاتے ہیں انسان تو ہے ہی بڑی نرم گل کا آب یہ طے تھا کہ وہ کوئی بی کا بو گھڑا ہے اور یا پھر ہاندر کی کا پچہ دیکھ کر اب نہیں نے بھی اس کے ساتھ کھیننا شروع کر دیا۔ دونوں پنڈلیوں کے درمیان لا کر ہلکا سا بھیچا تو اس کی پیچس چاں تھی اس کا ہنر کا بچہ ہونا واضح ہو چکا تھا۔ چہن لعل کو اس واردات کی خبر نہیں تھی بلکہ مجھ پہ گزر گئی تھی یا سمجھ رہی تھی۔

اچانک اس نے میری اس ٹھٹھکی والی حرکت کو دیکھا۔

”چہن لعل! اس بات کو یاد رکھنا کہ میں اس کے ساتھ نہیں ہوں۔“

اب میں نے قدرے اس حرکت کو دیکھا۔

”چہن لعل! کیا تم بتا سکتے ہو میرے پاؤں میں کون ہے جو میری پنڈلیوں کو ٹھٹھکا رہا ہے۔“

وہ قدرے میری جانب جھک کر میرے پاؤں کے نیچے دیکھنے لگا۔

”بھروسہ! کیا چیز ہے مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا؟“

اب میں بولا۔ ”دکھائی تو ابھی تک مجھے بھی کچھ نہیں دیا مگر ہے کوئی شہرہ زبو میری ناگوں سے لگا لینا

کھیل رہا ہے۔“

”آپ! انا ہاتھ بڑھا کر اسے اوپر نکالیں۔“

”ہندو! تم نے تو مجھ سے ہاتھ الگ کر اس ذات شریف کو گراں سے بچا کر

اوپر اٹھالیا بالکل یہ ویسے ہی تھا جیسے کوئی اوجھ مری نہ بھیا مرنے کے سگے سے باہر کرتا ہے۔ یہ ایک ہندو یا

تھی بالکل باوری تھی۔ اپنی باوری تو بھائی برتی تھی۔ پوشاک جہاں شہر میں مڑکیاں آنکھوں میں کاہل

بزار نخرے نخرے۔۔۔ ٹھہر یہ تو بڑی غریب لاغری بانگن کسی چنے کے جا پانی کھلونے کی مانند کٹ پتلی سی ٹھہر تو
 درکنار نظر بھی دیکھتے ہوئے کچکا پائے۔۔۔ اس کے منظر پہ آتے ہی باوری جیسے پاگل ہو گئی۔ وہ چیختی ہوئی وہی
 بھاگتی اور میرے سر پہ آبرائی لپک لپک ٹھوم ٹھوم غرائے لگی جیسے اسے اس کی موجودگی بے حد ناگوار گزری
 ہو۔ میرے لیے بال پکڑے وہ ہارن کی طرح جھول رہی تھی مٹیں بڑی طرح جھلا کر رو گیا۔ دو بندرچوں
 کے درمیان اک چھندر بنا ہوا میں مدد طلب نظروں سے چمن لعل کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بھی اس صورت حال
 سے پریشان ہوتے ہوئے کہنے لگی۔

”اس مصیبت کو وہ ایسے نیچے کر دیں۔۔۔“ پھر اس نے اپنی زبان میں باوری کو کچھ کہا۔ وہ بھاگ
 کر وہیں اس کی گود میں پہنچ گئی مگر اس کی جھنجھلاہٹ اور خفگی میں کمی نہ آئی۔

میں نے اپنے اٹکے ہوئے ہال جیسے ہوئے پوچھا۔
 ”چمن لعل! کیا اس وی وی آئی پی کلاس کے مسافر کے لئے یہ بندرچے بھی نکٹ میں شامل ہیں؟“
 وہ کھٹک کھٹک ہاروں وید و میرے اس سوال پہ خوب کھٹکھٹا کر بٹسا۔

”میں صیب اسات پر اس ہو گئے اس راستے۔۔۔“ اسے افسانہ خیل اور اس سے بھی چلی نہیں
 آتے۔ اس نے انداز میں اسے دیکھا۔ ”میں نے اسے سب سے پہلے دیکھا تھا۔ ایک بڑی کن والہ ہے
 کہ ایسا کبھی کبھی مسافر کے ساتھ نہیں ہوا۔ حالانکہ مسافر اور مقامی اور آگے تک بھی نکل پڑتے ہیں اور یہاں پہ
 بندرچی کے بچے والا کام بھی آپ کے ساتھ ہی ہوا ہے۔ بلکہ مجھے پتا نہیں ہے کہ یہ بندرچی کا چہرہ تو ہیں کبھی
 آپ کے گزرتی سبب یا چادر میں لپک لپک کے پتوں پہنچ گیا ہے۔ تو پتا ہوا کہ میں نے باوری کو کتنا
 کر لیا ورنہ وہ اسے اڑھیر کر رکھ دیتا۔“

میں اس کی یہ بات سن کے حیران رہ گیا۔ سوچنے لگا یہ کچھ ہوتا سکتا ہے کیونکہ وہاں ایسے ہی بندرچے
 مجھے گھبرے ہوئے تھے ہو سکتا ہے کہ اس کا کبھی میں یہ معلوم نہ کر سکوں۔ مگر میرے نیٹے پائپے سے
 لپک کر یہاں تک آ گیا ہوا؟ میں نے قدروں سے مترو ہوتے ہوئے کہا۔

”چمن لعل! بونہوا سو بونہوا۔ بونہوا اب کیا کریں؟ میرے خیال میں اس کو ٹھوک بھی لگی ہوئی ہے۔ کبھی
 کوئی ڈودھ ڈودھ۔۔۔؟“

ناپ وائی سے بولا۔ ”ڈودھ شو کی جگہ سے ہم کافی آگے نکل آئے ہیں۔ اب تو صبح چھ بجے کے قریب
 اٹکے ہوئے پہنچ پائیں گے۔ اب تو وہیں ڈودھ کا ڈودھ اور پانی کا پانی ہوگا۔“

”اس کا مطلب۔۔۔؟“

سے آفتان تک اور واپسی پر دوسرے منزلہ میں اتر جاتی ہے۔“

میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”اس کا نام سا قوری کیا تم نے رکھا تھا.....؟“

”اس کا جواب تھا۔“..... اور کیا آپ نے رکھا ہے.....؟“

کارکنیں ایسے بندروں والی بات سنیں تو ان کی بات سے نکلی تھی کہ کس طرح طوائف جی جان جی کی زندگی میں ایک نوزائیدہ بچوں والی گتیاں آتی جس کے وسیلے سے طوائف کی زندگی بدل گئی۔ معلوم ہوا کہ فیض انھیں اچھوں، نیکیوں، تولیوں اور پاکیزہ نفس انسانوں سے ملتی تھی۔ ایسے لوگوں سے بھی مل سکتا ہے جو بظاہر نہایت بدقماش بدنام ہوتے ہیں یا پھر وہ ایسے دکھائی دیتے ہیں۔ فیض تو انسانوں کے علاوہ جانوروں اور حتیٰ پھاڑوں سمندر میں سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک چوہی کے بھی مل سکتا ہے۔

بادشہر سے ملنے والی طوائف سے پہلے بابا گتیاں والے کے میلے کی بات شروع کرتی تھی۔ جہر میں شہر کے کے لئے ہمارے ہاں۔ ملک کا نورانی رنگ سیٹ پہ ہے اور ہمارے ساتھ میرے ذرا نیورنگے بھی ہیں۔ اب ہم ایک گہانے سے گاؤں میں داخل ہوتے ہیں جہاں گتیاں کے بچے، کھانسی، کھانسی اور کھانسی کی آوازیں آتی ہیں۔ یہاں کی لڑکیوں کے کپڑے اور ہاتھ کیوں ہیں۔ سارے گزرنے والے بات خاص طور پر بچوں کی کہ وہ کانوں پہ سنی اور پلاسٹک کے کتوں کے کھلونے لٹایاں ہیں جیسے گھوڑے، گاڑی، کار کے میلے میں سنی کے چھوٹے گھوڑے لٹایاں ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کے ہاتھ کے کھلونے عام طور پر گتیاں کے فرش اور دیواروں پر رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ کتوں کے کھلونے گتیاں میں ملنے کا حق پلاسٹک کے کتے ہیں۔ ہاتھ کیوں ہی یہاں بھی سنی کے کتوں کے کھلونے رکھے ہوئے تھے۔ کچھ چلے اور سنی کے اصلی کتوں کو بچہ اسٹارٹ کر لائے ہوئے تھے۔ گتیاں کے کتوں سے مزین پتلے اور وہ بچے۔ گتیاں کے کتوں کے کتوں کا کتہا نظر آیا۔ خاص بات یہ کہ سب سیاہ کالے۔ اصولاً گتیاں سے بھی کوئی چٹا لال یا کسی اور رنگ کا دکھائی نہ دیا تو میں نے ملک کا نور سے پوچھ لیا۔

”گتیاں ایسے جانتے اور کھلونوں کی صورت میں سب کتوں کے لئے ہی دکھائی دے رہے ہیں اس کی وجہ سے“

خاص وجہ؟“

”اس نے اسرار بھری ڈبیا کا ڈھکن کھولا۔“

”سرکار! آپ کا بچہ کتنا کالا۔ میرے سمیت سب بچوں کا لباس کالا۔ آپ کی اس گاڑی کا کتہا“

کاست گدائی اور ایک موٹی سی کالے گوبہ کی ہمار اور چند موٹے کھدڑے گاڑھے کے کپڑے تھیں چادریں وغیرہ
 ہٹا کسی اجتماع تکے ہوئے تھے۔ بیچے زمین پر کھجور کی صف میں ہانے کی جگہ لپٹی ہوئی ٹھٹھکی تو شک اور شاید
 اوڑھتے کے لئے دیہاتوں والا چار خانہ نکلیں۔ خیرہ اور ان اشیاء کو دیکھتے ہوئے یہی سمجھ میں آیا کہ یہ جگہ
 بابائیاں والے کی ذاتی آرام گاہ ہے۔ پھر بھی مزید تسلی کے لئے میں نے پوچھ ہی لیا۔
 ”جناب ایہ کاہل کوٹھا.....؟“

اُس مرد پر اسرار کی شاید عادت تھی یا پھر وہ شخص میرے ساتھ ہی بیچ میں بات کاٹ دینے والا رویہ
 زور رکھے ہوئے تھا۔ کھٹ سے ہوا۔

”سرکار! یہ اوطاق باباجی کی ذاتی اقامت گاہ ہے۔ جہاں تک میں نے دیکھا ہے کہ یہ خیرہ بھی کسی کو
 شب بھری یا آرام کی خاطر نہیں دیا گیا۔ اور نہ کسی کے لئے باباجی نے گاہ بھی کی تھی۔“

”میرے بارے میں جمشید نے اطلاع دی تھی کہ میں اس کے پاس پہنچا ہوا ہوں.....؟“

”نہیں سرکار! جمشید صاحب نے کوئی اطلاع نہیں دی۔ باباجی اسی طرح اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔
 اچانک مجھے طلب کر کے حکم دیا۔ فوراً جمشید کے پاس حاضر ہوا۔ وہ سرکار کا نام باباجی کو بتائی رہا ہے۔

اسے اپنے ساتھ لے کر وہاں پہنچا۔ جمشید نے باباجی کو قہر سے دیکھا کہ کوئی پرکرام
 نہیں اور نہ ہی اس کی طرف سے کوئی اطلاع ہے۔ میں نے اسے کہا تم مختصر ہوو آ یا ہی جاتے ہیں۔ باباجی

نے تو ان کے لئے گاڑی کھڑی ہے۔ میں چونکہ میں چائے کی دوکان کے باہر ان کا انتظار کرتا ہوں۔ جمشید
 میری نہ سمجھ میں آنے والی بات پر کہہ رہے تھے کہ باباجی صاحب اللہ کا کرنا کہ آپ کا کوئی رشتہ

وہاں پہنچ گئے اور سیدھے مسجد کی جانب چل دیئے۔ وہاں جمشید سے آپ کی ملاقات ہوئی چونکہ آج میلہ شروع
 ہو رہا تھا بہت سے حقیقت مند میلے ٹھٹھنے کی تیاریوں میں تھے۔ آپ کے سے ساری تو پہلے ہی پہنچ دی گئی تھی۔

پھر آپ سے بھی شرکت کی درخواست کی گئی۔ آپ نے کسی بھی وجہ سے معذرت کر لی۔ لیکن مجھے پتا نہیں
 تھا کہ آپ آج کاہل کوٹھے کے مہمان ہوں گے۔ آپ دیکھ لیں کہ آپ کا لے اوطاق میں فروکش ہیں۔“

میں اس کے طرز استدلال اور اپنے بارے میں اپنے انکشاف میں کرسٹھ شہرہ لگایا۔ میں تو بھی
 باباجی کتیاں والے سے ملنا ہی نہیں تھا اور نہ کہیں ان کا ذکر سنا تھا۔ تب تک کہ انہیں مراد میرے گھر کا کیونکر

پتا چلا؟ اور یہ بھی کہ میں اور نھار کے لئے زکوں گا۔ انہوں نے میرے کہنے سے پہلے ہی کالی شا کاڑی
 کھجوا دی سیوا لباس و راجپوت گہرا سا نولا۔ اس کی باتیں بھی سلوٹی۔ مجھے تو یہ ملک کا نور (اسے کوئی نظر دیکھتے ہی
 یہ ہم میرے لئے پہنچا تھا) بھی کوئی مستور الحال درویش دکھائی دیا۔ جس کے مشکلی رنگ میں کا نور و مستوری

ہم ملاستی آویسی ڈرویش ہیں۔ ہر تعزیر کو بر جان ڈرویش لینے والے۔ ہمارا مسلک اس ڈرویش
 سا ہے جو گھوڑا چوری ہونے پر قبرستان جا کر بیٹھ گیا تھا۔ کسی کے استفسار پر اس نے گھوڑے کی چوری والی ساری
 زوداد سنائی۔ جواب ملا یہاں جینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بازار منڈی میں جا کر گھوڑے چور کو تلاش کرو۔
 تھانے چوکی زپٹ لکھواؤ۔ ڈرویش نے کمال استفادہ سے جواب دیا۔ یہ پتہ سنیا پے ہم سے نہیں ہوتے۔
 گھوڑے کھویا سو کھویا۔ اب اپنا دھیان گیان بھی کھو دو۔ یہ جو کھم چھما ہمیں اس نہیں۔ کہاں تک بھاگے گا
 آوے گا تو بالآخر ادھر ہی..... حساب کتاب ہو جائے گا۔

بچن میں رہنے والوں سے تو میں صحرائیں اچھا
 بہار آ کر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

وہ روشنی آجائے کس کام کے بچن کا انجام اندھیرے اور تاریکیاں ہیں۔ وہ خوشی کس کاج کی جس کا
 انعام رنج و محن ہوں۔ میں تو ایسا طعام جو کسی عارف کا موجب ہے۔ کم خور بہ نسبت کھار خوروں کے بہت کم
 پیار پڑتے ہیں۔ ایسے آبلے پیہ لہاس کا کیا فائدہ جسے دانوں اور لوگوں سے بچانا پڑے۔ جو کچھ سے شام تک
 کاسا کھو بھی مشق سے وہ سو سو کالے شہ کاٹنے بڑی ذرا دلی سے رہتے ہیں۔ چاکریاں نظر بد کی
 روکے لئے کاٹ کر لٹکانے لگی ہیں۔ ہم سر پر سیاہ دھبے اور بالوں سے لڑائی کا جادو لٹکانے لگے ہیں
 لہجوت پریت پڑاؤں کا دماغتے ہیں..... "قدم درویشاں زو بلا۔"

بیالے میں پرے چلے پینے والی نہیں بلکہ سرکے والی تھی۔ جس طرح کچھ اہم کھاتے والے اور کچھ
 نہ پینے والے ہوتے ہیں۔ کھانے اور پینے کے معاملہ میں کچھ ایسا ہے جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے۔ چھپنے والے آگے نکلیں چھپنے
 سے زیادہ عرصہ دیتے ہیں۔ میں آنکھیں میچے ہوئے چائے سرکے رہا تھا کیونکہ جس چائے نما جو شاندارے میں
 دارچینی چھنی بڑی الٹائی باویہ ٹھانی باویان پے ہوئے بادام اور گڑ کی شیرینی سوارو سے رہے ہوں اور
 ہونگی گرم تو اسے آسانی سے پیا نہیں بلکہ بخوری سے شرکائی چا سکتا ہے۔ بیالہ خالی کر کے دھوا جب منہ
 تلخی شیرینی سے بھرا ہوا تھا۔

کچے فرش پر لیٹنے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے اور وہ آتھ جب ہوتا ہے جب اس پر کوئی کھجوری صاف اور
 ذریائی سرکنڈوں کے بالیں سے بنی اور پانی سے نم پٹائی چھی ہو۔ ساتھ لطف وہاں حاصل ہوتا ہے جہاں
 زری زمین پر پرلی چھی ہوئی ہو۔ اوپر کوئی سایہ دار درخت اور درخت پر نہیں بچھنے والے پرندے ازہم
 کوئے چڑیاں طوطے چیلپیں یا چکاڈر ہوں۔ پرانی میں پتوں چالوروں کی جوتیں۔ ڈالیں چپوئے تلکی
 کیڑیاں بھی موجود ہوں۔ ایسی جگہوں اور استروں بسترؤں پر نیند بڑی ذوب کے آتی ہے۔ کھل رہا ہے

کروٹوں پہ کھڑے رہا ہے۔ فرائے بھی چل رہے ہیں۔ بڑا بڑا بھی رہا ہے اور گھوڑے گندھے پیچے سو بھی رہا ہے۔۔۔ وجہ یہ کہ بندہ سو فیصد قطرے کی گود میں آسودہ خاطر ہوتا ہے۔ پرانی کی ٹونڈھی ٹونڈھی خوشبو دھرتی ماں کی گود کی ممتا بھری تھامت۔ تکی کا تکی سے ملاپ (ارتھ ہونا یعنی کرۂ ارض کے پہلے حصار سے لڑا رہنا جو اس بشر خاکی کی جسمانی وجودی اور روحانی نشوونما کے لئے ہے جدا ہم ہے) شراٹے الا ارض میں جو انسان دوست کیڑے ہیں ان سے مستفیض ہونا وغیرہ وغیرہ۔

● اے رتیرو و تار اے مشتِ غبار.....!

[illegible]

پرانے سیاسی جوگیوں کی کھلی کھلی مخالفت کی گئی۔ ان کے پانچ چھ چورے کی حیران کن سزا سنائی گئی۔
تھے۔ سولے گھڑے کچرے کی پائیاں لگی بہ ضرورت کام میں آتی رہی۔ ان پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ
یہ سب حسب ضرورت تھا۔ زمین سے ذرو کی مقدار دیتا تھا۔ چونکہ اکثر تاریک اندیش فقیروں و دانشجو کے گھروں
لینے والے قسب و عمارت کی ہوگی وغیرہ۔ یہاں زمین و شور و گڑا راستوں، خانوں اور جنگلوں، آتش چاہاں، تنہا
و است رہتے ہیں اس لئے انہیں بقدر ضرورت اپنے گھروں کی حالت کے پیش فکر و کچھ اہتمام کرنا پڑتا ہے۔
یہ اشیاء بھی ایسی جو زمین سے انسانی رابطے کو کسر ختم نہیں کرتیں کہ پاؤں ٹھلے ہی رہتے ہیں۔

دنیا بھر میں قدرتی اور قدرتی طریقہ ہائے علاج مروج ہیں۔ ہوا، آواز اور آسانی دہائی سے کہیں
میں آئے وائے اور دستے بھی ہیں۔ مثلاً موسیقی، پانی، آتش، شعلہ، تو جہ۔ (تو جہ) جڑی بوٹیوں کا
غذا، تعلیمی، نفسی، اور زرخیز، خوشبودار، حاتمیں، روشنی، ہوا، گرمی، سردی۔ آفتابی، مہتابی، شعاعیں، مسمیٰ، سردی،
سائپ، پتھرو، پھل، پھل، شہد کی مکھی، جوک، ویسو۔ گدھی، اونٹنی، عورت، گائے، بھینس، بکری، اور گھوڑے۔

پھیلے مار خور چو ہے اور چمکاؤ کی مختلف چیزیں وغیرہ (ان کے علاوہ ہزاروں لاکھوں اور بھی قدرتی فطری نعمتیں ہیں جن میں انسانی عوارض کے لئے شفا ہے) پرانے حکیم اور کیمیا دان ایسی نکتوں سے واقف تھے۔ آج اگر کوئی ہے تو وہ نام نہاد اُدھورہ یا جتہ بہ خدمت خلق سے عاری۔

معلوم ہونا چاہئے کہ مذکورہ بالا مخلوقات و عناصر کا تعلق بالخصوص کرڈا اثر اب یعنی ارض سے ہے جبکہ دیگر کرڈا لھوا کرڈا النار اور کرڈا الماء سے واسطہ بالعموم ہے۔

آدم کے تخلیق میں تراب یعنی مٹی کا عنصر پانی ہوا اور کچھ دیگر لوازمات سے زیادہ رہا ہے۔ اس کو اُتار بھی اسی مٹی پہ اس کی پیشتر معیشت کا بار حیات و ذرائع و وسائل جینا کرنا اسی مٹی اور زمین کی مہربانِ جنتِ ظہیر نے گئے۔ اس کی گل اسی مٹی سے تیار ہوئی۔ اس کی فطرت و قیامت اس مٹی کی تاثیر اور مزاج کے مطابق اُحالی گئی۔ مگر جب اس مٹی سے بیگانگی نہوار کھڑی ہوئی مٹی کا جتنا ملنی ستوری فلیٹوں میں جا بسا تو نتیجہ یہ نکلا کہ ایسی ایسی جگہ میں آنے والی بیماریاں اُرمانی عارضے نفسیاتی اُلجھنیں اور روحانی روکا نہیں پیدا ہو گئیں کہ جن کا شافی علاج اور مسودہ تک سینہ کلک سانس کے پاس بھی موجود نہیں۔ یہ سارا کٹنا خُشنا زمین مٹی سے تعلق تو ہے مگر اس سے مٹی کے قریب رہنا محسوس کرنا ہے۔ مگر یہ مٹی کے ساتھ ساتھ اس پر لکنا لکنا مٹی کی کائنات جہاں کی کوئی بیچاری وغیرہ بہت دور ہزاروں برسوں کا علاج ہیں۔

زمین بھلا دی طور پہ تو کرڈا ارض ہی ہے صرف اپنی طبعیاتی علاقائی خطائی یعنی طبعیاتی وجوہ یا خصوصیات و مسرات کی بنا پر کہیں بارانی یا چابی ہے تو کہیں شور و غور۔ کہیں ریلی اور کہیں چینی۔ پتھر کی دلدلی۔ لہدار اور کہیں سوات۔ ملکیت نہایت کٹنا کٹنا ملکیت و مملکت ہے اس لئے ہونے جیسے کھارے پانی کی حامل یا جیل گیس اپنی کوکھ میں چپا لے ہوئے۔ نرم ہے تو کہیں کرم ایسے ہارہ برگ کہیں ریشم من وثر۔ سداور غش بھی ہوتی ہے۔ برشت کا گھزار بھی اور فوج کا علمبردار بھی۔ سر ہاں او بے ہر بھی۔ جس نقطہ زمین کی کوکھ میں جو ہوگا اس کا پر تو اس کے کھڑے پہ گھنڈا ہوگا۔ اس کی دھب تک اسی مٹی میں رہی ہوگی ہوگی اور اس کی اثرات اور نمود کی ہر چیز یہ ہوید اہوں کے۔ زمین مٹی پختی بھی ہے پختی پختی اور پختی پختی بھی ہے۔

نقطہ ماں کی ہمہ گیری کو کما حقہ طور پہ جاننے سمجھنے کے لئے صرف اور صرف دھرتی ماں ہے۔ انسان ماں کے حوالہ سے اس دشت کو بڑی طور پہ سمجھا جاسکتا ہے کئی طور پہ نہیں۔ ذرا اس مثال سے اندازہ ہو کہ ہماری گوشت پوست سے بنی ہوئی ماں ممتا محبت اور ایثار کا ایک ایسا مینارہ ہوتی ہے جو اپنی دھرتی دھرتی دھرتی دھرتی سے اندھیرے میں بسکتے ہوئے کو راستہ دکھاتا ہے۔ اب غور کریں کہ ایسے کئی کروڑ مینارے یہ دھرتی

کی صلاحیت عطا ہوئی شاید اسی بنا پر خلق آدم میں بنیادی طور پر اسے استعمال کیا گیا۔ معدنیات، نباتات اور حیوانات اور دیگر متعلقہ مخلوقات کا بھی اسی زمین مٹی سے فیروزہ اٹھا اور انجام کار یہ سب اسی میں آسودہ ہو جاتے ہیں۔ زمین مختلف حالتوں میں ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ مٹی پانی پتھر اور رینگ۔ مٹی ہی مٹی دکھائی تو میدان ہیں۔ پانی کا اجتماع 'سمندر'۔ پتھروں پتھر پرے ہوں تو پہاڑ بن جاتے ہیں اور ریت اڑ رہی ہو تو صحرا، تھل سردی وجود میں ہوتے ہیں۔ وسیع و عریض زمینوں پر ہزاروں شہر کی زیادتی ہو تو جنگل بننے لگ جاتے ہیں اسی طرح سمندروں میں جزیرے بن جاتے۔ پہاڑوں میں غاریں ڈالتے چوٹیاں۔ صحراؤں میں ٹکستان اور وادیاں اپنا اک الگ تشخص قائم کر لیتی ہیں۔ اسی طرح ان مقامات اور قلعہ گاہ ارض کے موسم مزاج اور طبعاتی تقاضے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ کہیں خشکی اور گرمی، کہیں نمی اور سردی۔ کہیں اعتدالی اور کہیں شوریدگی.....!

یہ نظر حقیق اور شخص صدیق سے اگر غور کیا جائے تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ سب عناصر اک دوسرے میں اس طور ضم ہیں کہ ایک میں سے دوسرے کو نکال لو۔ مٹی میں سے پانی پانی میں ریت پتھر۔ کنواں کھودو تو ریت نریت نکلو، تو مٹی۔ ایسے ایسے سنگی پہاڑوں کا جو ملک جو لوگوں کے آہر چشما پتھر نے جمیل ہو جود ہیں کہ چٹائی کسی ایک پر چلی ہے۔ آگ اور آواز کا جو کچھ ہو گا کیونکہ مادوں میں مادہ کم اور نور کا نمود زیادہ ہو گا ہے۔ یہ ہیں بھی اور نہیں بھی۔ یہ دونوں اس جگہ بھی موجود ہیں جدھر پانی مٹی ریت پہاڑ یا جنگل موجود نہیں۔ ان دونوں کو انسان پیدا کر سکتا ہے جبکہ دوسرے مادوں کو ہر جگہ حاصل نہیں کر سکتا۔

آگ اور ہوا؟ کیا ان دونوں کو ایک جگہ سے جدا کر کے آگ کی صورت دیا میں ہماری مٹی جہلہ بادیم یعنی ہوا بہشت کے خوش کوثر کی منڈھیر پر سرسراہے ہوئے ایک چھوٹے کو اتنی ہی بار اس کی حرکت چڑی اور مچھلا دے سے کم کر کے دیا میں دکھایا گیا۔

مذکور بالا ان مادوں کی اصل ماں مٹی ہی ہے اس ماں کی مامتا اور محبت کے بھی ستر ہزار روپ ہیں۔ اس نے اپنی گود کے بچوں کی ہر ضرورت پوری کر کے کا ز م لے رکھا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی ہر چاری پریشانی کا شافی علاج بھی اس کے پاس ہوتا۔ کیا کریں کہ ہم اپنے نوپ فضاؤں، خلاؤں کو مسخر کرنے کی تو گمانے ہوئے ہیں جو ہم سے کھربوں نورانی سال اور ہیں لیکن اپنے وجود سے چڑی ہوئی مٹی اور زمین پہ ہویاں نہیں دیتے جو ہمارے اصل مزاج، زمین فطرت کے مطابق اور ہماری رہتس میں بھی ہے۔ شاید اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہو زمین اور مٹی ہماری انتہائی اپر دلی میں ہے جبکہ آسمانی فضا میں اور خلا میں ہمارے ذہم و گمان سے بھی بے حد دور آفاک و۔۔۔ جو ہاتھ میں ہے اس کی قدر نہیں اور جو اذری ہے اس کے ہم پیچھے بھاگتے ہیں۔

پیارنگ کالا حصہ اول میں آجین کے ذورافادہ ساحل پہ ایک قدیمی مترہک روشنی کے مینار میں
 دنیا والوں سے دور چھپے ہوئے کوزہ کے مرض میں مبتلا مردوزن سے ناگہانی طور پہ سری ملاقات ہوتی ہے۔ وہ
 مجھ سے ملنے اور نکل کر سامنے آنے سے گریزاں ہوتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں ان سے مل کر ان جیسے
 عذاب میں مبتلا ہو جاؤں۔ لیکن میں ان میں موجود ایک ڈاکٹر میاں بیوی کی انسان دوستی اور ڈاکٹر ہونے
 کے واسطے ان ایک عظیم قربانی کی کہانی سن کر بے حد متاثر ہوتا ہوں کہ کیسے انہوں نے یہاں موجود ان بد نصیب
 کوزہیوں کا علاج شروع کیا لیکن کچھ عرصہ بعد وہ دونوں میاں بیوی لاکھ احتیاط کے باوجود خود بھی اس مفلح
 مرض کا شکار ہو گئے تھے اور پھر انہوں نے اپنی باقی اچھی بڑی زندگی انہی ساتھیوں کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کر
 لیا۔ جب سے اب تک خود بھی مریض ہونے کے باوجود اپنے ساتھیوں کے علاج معالجہ بیمار داری میں مگن تھے۔
 میں ان کی اس قربانی اور جذبہ خدمت سے متاثر ہو کر ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرتا ہوں جبکہ وہ مجھ سے ہمہ
 نہیں تھے۔۔۔۔۔ ان سب کا اصرار تھا کہ میں فوراً یہاں سے چلا جاؤں اور انہیں ان کے حال پہ چھوڑ دوں۔ لیکن
 جان بچاؤں۔۔۔۔۔ ایک لمحہ کے لئے میرے دل میں بھی برائی نہیں تھی اپنی خانہ خراب وادہ گردی کی
 عادت سے مجھ پر صدوں برائیاں بار کچھ اور اچھل آیا تھا۔۔۔۔۔ میں ان کے ساتھ رہنے سے بہتر نہ سمجھتا تھا۔
 اوپر اوپر بھر رہی جتا کر بیویاں بیٹیاں جس کوں سزا چاہتے تھے وہ ہم پاس و دور سرائیں وہاں ہواؤں ویراں تھے۔
 جہنم زار میں ان کے کھانے پینے اور دوا وادہ کا بندوبست بھی کسی لالچ معاوضہ کرتا تھا۔ ان کی بوا اور بیب بھی
 بیٹیاں پلیدہ چھوڑتے ہوئے مستحق سے اور دیگر استعمال شدہ چیزیں اپنے ہاتھوں ان کے کمرے میں پھینکتا۔۔۔۔۔ ان کی
 خواب گاہ اور عبادت کے ننگے فرش سجھان کے کمرے کی حفاظت کرتا تھا۔ یہ سب سوچتے سوچتے میرے
 دل خون کے آنسو رنے لگا۔ میں ان قبور زید نصیب مردوزن کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا ہوا تھی۔
 کے زندہ دیکھتے تھے پھر سری نکلاؤ ان ڈاکٹر میاں بیوی پہ پڑی۔ جن کا چہرہ ناک اور ہونٹوں سے خالی تھا۔۔۔۔۔
 کی ہڈیاں ٹکی تھیں۔ ہاتھوں کی آدمی انگلیاں بھر چکی تھیں۔ یہاں سب کا قریب قریب یہی حال تھا۔
 یہ سب مسلمان تھے۔

اللہ جو عظیم بھی ہے اور غلامینے والا بھی۔۔۔۔۔ اور سے امر نکلتے ہی میں نے ان کے علاج کی حکمت
 لی۔ لیکن یہاں کوئی میرے پاس ادویات علاج کے لئے دیگر سامان یا حراشیم کش انکیشن تھے۔ میں نے کچھ
 پلا بھی اور اپنے اندر کا صندوق کھولا۔ کچھ لایا ہوتی تھیں ان کے لئے اللہ کا نام لے کر شروع ہو گیا۔ اللہ جانتا ہے
 کہ ان کوزہیوں 'جذامیوں کے ساتھ میں خود بھی کوزہ صابن گیا تھا کہیں کوئی احتیاط نہ دار بھی اور نہ چھوٹے بھات
 کا کوئی خیال کیا۔ جن انگلیوں سے انہیں کھلایا میں دھوئے انہی ہاتھوں سے خود بھی کھایا انہیں نہ دیا۔

یہ نایا کرب ان ڈاکٹر میاں بیوی کی طرح نہیں بھی ان کے مرنے جینے میں شامل ہونے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اپنے ایک مخصوص طریقہ علاج کے مطابق 'ساحل سمندر' پہ زمین کا وہ خاص قطعہ تلاش کیا جو اپنے باطن میں زلزلے اور پارسے کے ہمارے تاجے کے سرکبات کا حامل سمندر میں آیا تھا۔ معلوم ہوا کہ سمندری مخلوق 'از قلم' کیلئے 'گھونگھے' سمندری گھوڑے' کچھوے' پگھڑے' جھینگے' سمندری کھڑے' چمڑے و غیرہ سمندر اور ساحل کی ایسی جگہوں پہ خود بخود کھینچے چلے آتے ہیں۔ جدھر ان کی من بھاتی خوراک' حرارت اور مٹی ٹھیک سی لہروں کی ہلچلناہٹ موجود ہوتی ہے جو ان کی مزاجی جبلتی کیفیات میں تحریک پیدا کرتی ہوں۔ ذہیل و ذہن شادک اور دیگر آبی مخلوق بھی اسی فطری تقاضوں پہ سفر بسر کرتی ہیں۔ اسی میں ہی ان کی بقا اور ارتقا کا راز پنہاں ہے۔ سمندری مخلوق پہ ہی کیا موقوف' کائنات کی ساری مخلوقات اپنے اپنے خمیر کی جانب ملتفت ہوتی ہیں۔ انسان خواہ کتنا ہی عرصہ خلاؤں یا پانیوں میں رہے مگر زمین اسے زمین پہ ہی آئے گا۔ مچھلی پانی میں پرندہ فضا میں۔ شاہین چٹانوں پہ ٹیڑھ و وحوش جنگلوں میں۔ سانپ پانیوں میں۔ نیوے کے مچھلی بلوں میں اور تیل' تیلوں میں۔

ساحل' اپنے علاج کے مطابق جسم پرورش کر کے ان کے جسم میں ایک خاصہ رکھتا ہے۔ کھوار' ان کی ریت میں ڈبو گیا یا اس طور کہ ان کے چہرے اور ہاتھ اور پیرے ہاتھ ہیں اور ان کی اس قدر ریت سے اپنی مدد آپ کے تحت باہر بھی نکل گئیں۔ بیمار کے آس پاس اُٹھایا توں میں جنگلی پورے اور شہری نیاں جو کے پورے آسانی سے دستیاب ہو گئے تھے۔ ان کے عرق سے تر چکے کی پانیوں کو کھڑے زمینوں پہ پیہنے کے لئے گئے تھے۔ یہی عرق ان کو پلا کر رکھتا ہے کہ سمندر مخلوق کے لئے پانی' روشنی اور ہوا کے پیر و کر کے' جس و جس اپنے مادی مستقر کی جانب پلا آیا تھا جدھر وہ بفلول جسم کے میاں بیوی میزبان میرے منظر تھے۔ ان کا وہاں سنبھلنے کی ان کی سپورٹ کا کاروبار تھا۔ مجھے بلک بلک ماسٹر بکھتے اور بے کچھ جانے سیکھنے کی جستجو میں رہتے تھے۔

میں ایک روز بعد وہیں بیمار پہ پہنچ آیا تھا۔ میری ایک دن کی غیر موجودگی میں ڈاکٹر میاں بیوی نے میں میری بدانت کے مطابق ریت میں دبے ہوئے مریضوں کی و کچھ بیماری کی تھی۔ شہر سے لائی ہوئی آدھی خاصہ جی طور پہ کان کا پٹیاں تو لینے چادریں اور اسٹیل پائینک صاف اور کچھ مریمیں وغیرہ لے کر علاج معالجہ میں بے شمار سہولتیں پیدا کر دیں۔ پہلے ان کے قہر بے نے مریضوں کے اندر ایک خاطر خواہ تبدیلی محسوس کی گئی تھی۔ اب باقاعدہ ایک شیڈ دل بنا کر علاج کا سلسلہ کر دیا گیا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ علاج کے تیسرے روز ایک مریض چل بسا۔ یہ ایک اوجیز عمر کا انتہائی قابل اور صابر انسان تھا۔ بیمار کے نوچ چڑھنے آخری ذرا وارہ کا

قتل کھولنے میں اس اچھے انسان نے میری مدد کی تھی۔ کٹن دفن کے روزاریت کے علاج کو مؤثر کرنا چاہا۔
چوتھے روز تک یہاں کی باہمی فضا بڑی جو جھل سی رہی۔ لگتا تھا اس جہر و قتل کی طبعی موت نے ان سب کو انتہائی
سوگوار کر دیا تھا۔ اب جب ریت کے سنے ٹھہرے ہوئے گڑھوں میں اترنے کا موقع آیا تو اچانک ایک مریض
نے انکار کر دیا کہ موت سے رستگاری نہیں اور اگر علاج کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو باقی ماندہ تباہ حال جسم و اعضا
کے ساتھ زندگی کا کوئی معقول جواز باقی نہیں رہتا۔ یہ مایوسی کی انتہائی خطرناک صورت تھی۔ اس کے باوجود
میں نے ڈاکٹر میاں بیوی کی حد تک ریت والا علاج رکھا۔

عرض کرتا چلوں کہ اس طریقہ علاج میں مریض کے لئے ہر روز ایک نیا گڑھا تیار کرنا پڑتا ہے۔ اگر
مریض ایک سے زیادہ ہوں تو درمیانی فاصلہ کم از کم دس بارہ فٹ ہونا چاہئے اور مریض کا گڑھا ساحل پہنچی
فورک سمندر کی لہریں رات دن کسی وقت بھی گڑھے تک نہ پہنچ پائیں بلکہ گڑھ گڑھے ہی رہیں۔ رات کو صبح
کناروں تک چڑھا آتا ہے جبکہ دن میں وہ بہت پیچھے تک اتر اہوا ہوتا ہے۔ صلی الصبح گڑھ آپ ساحل سمندر
دیکھیں تو آپ کا قلم ہو گا کہ پانی بہت آگے تک پہنچ کر پیچھے ہٹا ہے اور گیلی گیلی نرم ریت پہ چھو چھوٹی
سیپیاں گھونٹتے سمندری گھاس کالی اور الم طم جو سمندر میں چھوٹے چھوٹے سمندری ریت کے ساحل پہنچتے ہیں
وال چاہے گھاس کے ذریعہ الم اور ساحل میں پہنچے۔ گھاس بہت ہی کم ہوتا ہے۔ رات کو سمندر
پانی جمع ہو جاتا ہے۔ سمندر جو کنارے سے دکھائی دیتا ہے وہ تو اس کے ایک پہلو کی شخص اپنی ہی جھک جاتی
ہے۔ اس کی وسعت دکانی کا خلیفہ سا اندازہ چاہئے ہو تو کسی کشتی جہاز پر سوار ہونے کے لئے سفر پہنچنے
رات دن کے کسی قہار لہروں میں کشتی جہاز کے کنارے پہنچنے کے لئے چاروں اطراف کو دیکھ کر
ادرا لیں۔ خوب توجہ دیں۔ اس کی ٹکرائیوں اس کے امیرج۔ اس کی موجوں لہروں جھکولوں سمندر
پہ غور ہو۔ اس کی سپہ قہاریوں سمندریوں اطراف میں یہ بھی طرف نگاہ کریں تو ہر شاید کچھ میں آئے کہ اس
سمندر میں گڑھوں اور غریبوں کہتے ہیں؟ ایک جو کچھ اور جتنا چھوٹا آپ کی نگاہوں کے ذریعہ ہے وہ محض ایک
لوہری کی سٹک کا ایک اوٹی سا منظر ہے۔ اصل سمندر تو اندر کے اندر لکھن ہوتا ہوگا۔ افق کی وسعتوں کا کچھ
کے بے کنارہ سیلوں۔ سمندر کی پراسرار چٹائیوں اُتاروں کے انداز سے لگانا کم از کم اس لمحہ سمندر کے
محسوس نہیں ہو سکتا۔ ہاں جن کو رب العزت و عظمت نے کھٹم مینا عطا فرمائی ہے ان سے کچھ بھی نہ
عالم صور کا ذکر کیا ایہ یہ اندویشی لوگ تو عالم کبر سے بھی پرے تک کی بھی خبر دیتے ہیں۔

نہ پوچھ ان زبردہ ہمینوں کے اختیار کی بات
یہ لوگ کون و مکاں زیر دام رکھتے ہیں

سوزاک و فیبرہ میں بھی ساحل کی ریت میں دھسے ہوئے کیڑے بڑا کام دکھاتے ہیں۔ خون کی بڑھی ہوئی حدت چیشاب کی مکر وہ بیماریاں برسوں فطوں کا زہم۔ مقصد کا اللہ ناف کی ناؤ رنگی جھڑوں کا زور یہاں تک جسمانی بالوں کی کمی یا زیادتی کا بھی بہدف علاج اسی طریقہ میں موجود ہے۔ اسی طرح نمک تلی زہم اور مرانہوا چونا آب شوزہ ہی اور دودھ کے حوض میں بھی دو ایک ہنسی بیماریوں بڑی خطرناک کا علاج ہوتا ہے۔ آپ کے لئے نئی بات ہوگی کہ مختلف درختوں بیڑوں کے کھالے کی مٹی ان کے سامنے اور طلوت گوند اور پتوں چھال سے بھی بہت سی بیماریوں کے لئے شفا ہے۔ خاص طور پر نیم آم از جون اصفندل نمرہ اور پتوں کے درختوں کے تنوں سے مریض کو پلہا اور ہاندھ کر بھی تپ مخر کہ سہل جگر کے سرطان اسانس دے کی تکلیف نہ پھیر دے کا ورق گھٹے کی گھنٹیاں اور آنتوں کے کیڑوں کا شافع علاج کیا جاتا ہے۔

مالک کا کات نے کوئی بھی شے ایسی پیدا نہیں کر مانی جس میں انسان کے لئے فائدہ اور شفا نہ ہو۔ جیسے ہم سب کے آقا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے گل کاتات کو تخلیق فرمایا۔ تمام نبیوں رسولوں و پیغمبروں کی سیوا اور دیگر مخلوقات کو ان کی امتداد میں رکھا کہ ان کے ادب و عبادت کو رائج کرے۔ اسی طرح انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر رخصت و تقاضا کرتے ہوئے اس کے شہادت اور افواہات میں بڑے تصرف میں آئے۔ پانچویں انسان کے لئے اور ان میں کل نبیوں میں سے مالک نے اس کی تخلیق و ترکیب مصلحت و مہینے میں اسے داخل نہیں کیا مگر اس کی مستحیات کے ساتھ بعض اپنی ذات و زندگی کے قریب و واضح اور سودمند محرکات سے ہی ہم ویاب رہا۔ یہ ظاہر کی عظمت و افادیت ہی اس کے لئے قائم رہی جبکہ کہ اس کے قریب جس چیز کو اپنے لئے مضر سمجھتے ہوئے بھی مستعمل رہے۔ لے شہر ہوئی ہے اور یوں بھی کہا چھٹی و گھنٹہ والی بڑی بھی ہو سکتی ہے۔

ساحل کی نرم ہندو ریت کے نیچے ایسے انسان دوست کیڑے کیڑے بھی ہوتے ہیں جو کہ علاج کے مریض کی بے دینی و لالچ جراثیم مالک کر کے اسے بیرونی اور اندرونی طور پر شفا یاب کرتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے جو کہیں فاسد مادے اور خون چھریں کہ مریض کو صحت یابی عطا کرتی ہیں۔ آپ نے بھی مریض کو شفا دے دیا مگر اس نے اسے میں کھڑے ہوں تو پھر تک چھپیں پاؤں پھنڈلیوں کو کاٹی ہیں۔ تکلیف و روت و کسب میں بس جلی جلی کی گدگد ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ کیڑے کیڑے بھی عمل کرتے ہیں۔ گلی مریض کھال بالوں سے اوپر کا زہر و جراثیم آلودہ متعفن گوشت یہ کھا جاتے ہیں۔ ان کے منہ کے شفا کی لعاب اور اندہ کی جراثیم لہروں میں قدرت نے کوڑھ اور جلدی امراض کے لئے تریاق رکھا ہے۔ خدا کی قدرت کہ جہاں یہ جراثیم ریت میں ذب پڑے ہوتے ہوتے ہیں وہاں یہ مخلوق اندر ہی اندر کہیں سے ان تک پہنچ جاتی ہے۔

کھیا جی 'جو خود ایک مہا فید تھے اور ان کی فید کا کاڈور وورجے چا تھا لیکن اپنے انگوڑے بیٹے کے اس روگ کا کوئی اپائے نہ کر پائے۔ شاید اسی غم نے فید کے کارن ان کا ویرہانت ہو گیا۔ کلبجہ پہ بھاری بوجھ لینے باپ کی جگہ بیٹھے تو احساس ہوا کہ اب یہ فید کام انھیں بھی کرنا پڑے گا۔ بڑے کھیا جی نے اپنی ساری وڈیا کی پرائی پتھیں سنہال رکھی تھیں۔ یہی کام آئیں۔ اپنے علاج گڑے ہوئے چہرے کا بھیانک پن چھپانے کی خاطر انہوں نے چاندی کا ایک چہرہ نما خول چڑھالیا تھا۔ آنگھوں ڈاک اور نمہ کی جگہ 'سوراج' تھے۔ جن کے ذریعہ انھیں دیکھنے سننے کھانے پینے کی ہر وقت سہولت تھی۔

میرا ان سے تعارف 'میرے ایک بنگالی شاعر بھگت دیاس ڈاڈیلا کی وساطت ہوا تھا۔ میں پانچ چھ بیٹھے سندھ بن اور اس کے مصافحات کی آوارہ گردی کے دوران 'ملیرے' لکھنے اور دیگر بیٹ کے عوارض میں مبتلا تھا۔ اور اُدھر کی ویسی ولایتی دوا بھی چھانک چھانک کر سبے حال آؤ اور اُدھر دکھائی دیں دے رہا تھا کہ آخری لہانا ڈھونڈا اسی 'سونار بنگلہ' میں ہی ہوگا۔ واقیلا نے میری اس حالت زار کو دیکھتے ہوئے۔ وہاں سے غاصر اور ڈرائن 'کھیا جی' سے ملنے کا عندیہ دیا۔ وہاں علاج کے دوران مجھے انھیں دیکھنے پر مجھے اور ان کے چہرے والی بنا جی کی اصل بہر بھی جاننے کا موقع ملا۔ اس میں 'ملیرے' بھاری بھول گیا۔ وہاں کے علاج کا اور پ. ہو گیا۔ چھوٹے دل کے چہرے والی بیوی اس کے جسم کے کسی باور وچ اور غایت تھی اس نے وہ اسے لا علاج آخر اور صبر کر چکے تھے مگر میں نے انھیں اک کی راہ پہ لگا کر اللہ کے امر سے اس غلطی آزار سے نجات دلا دی تھی۔

یہ بندہ ذرا اصل بڑا لکھ کا تھا جسے لکھ بنگالیوں پرانیست کے نہیں بھرت خاکیٹ کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ گناہ اور سرکشی کی لذت اسے عبادت و اطاعت کی حکمت و برکت سے نہیں زیادہ مرغوب ہے۔ ستم بلا کے ستم اس کا خون اور بھگت پسندی جو اس کے خیر میں گندھی ہوئی ہے۔ سوچتا بعد میں ہے اور "فن" پہلے کر لیتا ہے۔ چونکہ چڑیوں کا کھیت چک جانے کے بعد بچھتا کا لا حاصل ہوتا ہے اس لئے اس نوع کے چھوٹے مولے خلا کار اپنی کار کرفت کی کشتی مناجات کے پھرے دریا میں روڈ کرنا ممانی حالات کے کنارے پہ بیٹھے ڈوبنے کے کار کرفت پاس کرتے ہیں اور یا کوئی چل نہ کھینچ رہے ہوتے ہیں کہ کب کوئی خواب الیاں یا خوابہ سفر آئے اور انھیں نجات دلائے۔

اس کھیا جی کا بھی یہی حال تھا۔ ہوائی یا جوائی کے جوش میں منش بہک جاتا ہے۔ یہ بھی بہک ڈک لڑھک گئے ہوئے تھے۔ آراستہ بندہ تھا 'ہما جیاتی' ذوق کا پروردہ۔ مگر تھا تو بشر اور بشریت کا نقضاتی بکنا۔ لڑکھڑانا ہے۔

کہتے ہیں کہ زیادہ مادی لذتوں میں انزال اور کھجلی سے بڑھ کر کوئی لذت یا مزہ نہیں اور اذیت تاکہ ذروں میں ذرہ ذرہ ذرات سے شدید شاید ہی کوئی اور درد ہو؟۔ وظیفہ وصول اور کار کھجلی میں پڑا ہو عفت کسی بھی اندیشہ ہائے سود و زیاں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ آمادۃ القفات و اختلاط طرفین کے جذبات و جسم بے قابو مقل سمجھ بھجھ ہو جاتی ہے اور جب بندر اور چھندر کھجلی ہے تو ایسا مزہ ضرور حاصل ہوتا ہے کہ گزرتی گزرتی نکال دے گا مگر کھجلی نہیں چھوڑتا۔ یہ دونوں فطری عمل یوں ہیں کہ انجساک و اطمینان سے آنکھیں منہ بند چلی جیں۔

اسی فطری بشری پھسلن چکھیا جی بھی پھسل گئے تھے۔ بس غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے شکلیہ دھماکی جیسی ہونہار اور پُر صلاحیت شاگرد اور ساتھی کو اس "ساتھ پُر لطف" کے بعد بالکل اکیلا چھوڑ دیا۔ کھیا جی کے اس رویے سے شکلیہ دھماکی کو جذباتی اور نفسیاتی طور پر بڑا شدید جھکا لگا تھا۔ وہ سوچتے پہ مجبور ہوئی کہ برسوں پرانے احرام افہام و تفہیم کے رشتے یوں بھی ٹوٹ سکتے ہیں؟ مان لیا غلطی ہو جاتی ہے مگر اس کا یہ غلطی مطلب نہیں کہ خطا کار مُندِ فخر ہو کر نہیں بھاگ لے۔ اور ایک حساس لڑی کو تنہا اس حرکت کے ردِ عمل کا سامنا کرنے سے لئے بچ میدان چھوڑ جاتے۔ شکلیہ دھماکی کی نظروں میں کھیا جی کا یہ رویہ بڑا سوچا ہوا نہ تھا اور شکلیہ خود غرضی کا مطلب نہیں سمجھتا۔ اس کی اس حرکت سے اس کا ہنسنا تھا کہ کھیا جی نے جان چالے اس کے درمیان کیا تھا کہ انسانی فطرت کی حالت میں اس کے مُنہ پہ چھوک دیا۔ بے بسی مجبور اور کھرا اس کے علاوہ کر بھی کیا تھا؟

قہر اور زہر بھری نگاہ اور جہر میں دلی ہوئی گراؤ آج۔ غصہ شکایت ہزیت کے اعتبار میں پیڑ کا ہوا شوک اور اسی ظلم بے انصافی کو زد کئے کے لئے خود اختیاری مرگ بھوک کبھی اپنے بھیا تک ردِ عمل سے بیگانہ نہیں ہوتیں۔

● پوثریشی کا چھینکار۔

"پیار رنگ کالا" کے مطابق سے آپ کو معلوم ہو چکا کہ غیا جی کے بھیا تک چہرے اور آتما پہ گئے دانوں کا علاج میں نے امرالمی سے دھوکے استعمال شدہ پانی۔ شفا کی ترغیبات اور کی سے کیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف ان کے چہرے کے داغ اچھے اور ہلکیاں دکھاتے ہوئے گھاہ ٹھیک ہو گئے بلکہ ان کے احساسِ خود کا ازالہ بھی ہو گیا۔ شکلیہ دھماکی اک زمانہ سے اُنھی کے آشرم میں ان ہی کی جینی کے ساتھ ان کی خدمت

میں نے جبر ہلا کر اسے پڑھا دیا۔

کھانے کے بعد پودینے کی چائے آئی۔ شکیلہ رحمانی اجازت لے کر نکلی تو کھیاتی نے اندر سے دروازہ بند کیا اور بانس کی قتیوں کا بنا ہوا ایک صندوق لے کر میرے سامنے بیٹھ گئے۔ عجیب بد حال پرابھو تو براٹھا صندوق تھا۔ یہ کچھ باہر نکل چکا تو آخر میں جو شے باہر نکالی گئی وہ ایک ہنگامی پٹ سن کا ایک چھوٹا سا تھیلہ تھا۔ نہایت نفیس ملائم جھوٹ، ریشہ ریشہ سیا.....!

نہایت ادب و اعتدال سے مکھیا جی نے مجھے تھمتے ہوئے کہا۔

”یہ کھٹے کیا ہے.....؟“

آج ایک مگھوڑی تھی..... لگتا تھا اس کے اندر پسی ہوئی بھاری وزن کی کوئی چیز ہے۔

میں نے ماتحتوں سے تو ایسے سواروں کو ملے جن کے کپڑے

”مہاراج! مجھے تو کوئی رستہ منشی یا جو نا سمجھ میں آیا اب اس میں اچھل میں کیا ہے تو وہ عظیم و عظیم

9-06-76

وہ مجھے زندہ لے کر جیسے معنی خیز سی ٹکڑوں سے ڈالتا، ماما مجھے ماما جواد

UrduPhoto.com

نونا شلار، بھائی سے زیادہ ترو ترو شریک نہیں اور تھی میرے لیے۔ - جو مجھے ہونے لگی ایک سے

چلتے ہیں! مجھے کچھ اس کے بارے میں پتا نہیں

میں نے اس کے دل میں اس بولنے کی جگہ پر غور کیا۔ یہ جگہ پر...

”کیا آف نہیں جانتے کہ ہر کام ہے؟“

”نہیں! جانتے کے لئے ایک بار اسے کھولا تھا۔ اندر ٹھنڈی سی ہوا اور کوئی چیز تھی۔“

کے دلچسپ مضامین

فیس کے اسے نذر دینے والے گاہکوں سے قتلے ہوئے اور تھکا۔

سے تو آپ مجھے اس پونے کے بارے میں وہ سب کچھ بتائیں کہ آپ کو کہاں سے ملانا ہے۔

وہاں اور تک ہے آک کے پاس ہے؟

مرد کی عجیب سی شکل بنا کر وہ پتھر لگا۔

”جہاں تک مجھے مارے میں چھوڑا سنا تھا۔۔۔ میرے سرورگشاہی پتا ہی کہیں دوسرے گاؤں میں

مریض کو دیکھتے جانے کی ہماری میں تھپے۔ اسی ذراؤں کا تھپا اور دو چار پٹنگیں بھی ساتھ تھیں۔ اچانک

نے میری ماتائی کو اشارے سے کچھ اٹھانے کو کہا۔ وہ جھٹ سے اپنے کمرے میں گئیں۔ میں بھی بھاگا بھاگا پیچھے ہولیا۔ اُن کے کمرے کا ایک خاصا حصہ اُن کی پوجا پات کے لئے مخصوص تھا۔ یہاں پورب کی اوڑھن کھڑکی کے آگے چندن کاٹھ کے ایک بڑے سے چوکے کے اوپر کرشن جی مہاراج کی کالشی کی بنی ہوئی منورتی اور پوجا یون کے لئے مختصر سامان تھا۔ چوبیس گھنٹے یہاں اگر اور لوہان سلگتا تھا۔ دوسری صفائی ستھرائی کا سارا کام بھی ماتائی خود ہی کیا کرتی تھیں۔ گھر کے نوکر چاکر اور دیگر افراد کو بھی ادھر داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ اتنی غیر ضروری احتیاط کی ایک خاص وجہ یہی سمجھ میں آتی تھی کہ ماتائی چونکہ اپنے مذہبی عقیدے کے لحاظ سے ایک ایسے سلسلہ سے متاثر تھیں جو اپنی ضرورت کی اشیاء پر تنے کھانے پینے پہننے مونے اور پوجا پات وغیرہ ہر چیز کو دوسروں کی نظر دسٹرس سے دور رکھتے ہیں یہاں تک کہ اپنے پرچہ اور پتی سے بھی بچاتی ہیں۔ میں چونکہ اکوتا اور لاڈلا تھا اس رعایت کے نظر اُن کے ساتھ اس پوجا پات کے کمرے میں آیا جایا کرتا تھا۔

میں اُن کے پیچھے اس کمرے میں پہنچا تو ماتائی نے پہلے تو لگی ہوئی ٹھکی بھائی کرشن جی مہاراج کی آرتی اُتاری پھر تھوڑی دیر تک آنکھیں نمونہ سے نمونہ ہی منہ میں رکھ کر شہ پرستی رہیں۔ کھانا پکانا اور آہستہ سے منورتی کے آگے چوکے کے ایک ٹیبلے خائے سے ایک ٹیبلے خائے سے لگایا اور منورتی احتیاط سے اٹھائے ہوئے باہر لے آئیں۔ پوجا پات کے آگے پہلے سے لگایا ہوا منورتی اور احتیاط سے وہاں والے ٹیبلے میں ڈال لیا۔ اب میں پتے کیا جانو کہ یہ کیا بنا ہے۔ بس تجس بھری نظر دیکھ کر سے دیکھا کیے۔

یہ میرا پہلا موقع تھا کہ میں نے اس پرانی قصبے کو دیکھا۔ اس کے بعد تو پھر اکثر دوسرے تیرے لئے اس کے درشن ہو جاتے لیکن تیرے اس بات پر بھی کہ مجھے بھی پتہ نہ تھا کہ اس کے بارے میں کیا کون سا کیا۔ وہ شاید میری مریا بدھی کے حساب سے اس قابل ہی نہ سمجھتے تھے اور نہ ہی مجھے بھی اس بے رنگے ڈھنگ سے دہائی پوئے گئے کہ جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ درپوڑیاں ٹکڑی شکل یا پھیری وغیرہ ہوتی تو کبھی کا قصبہ خالی ہوتا۔ خالی پہلی ہی کو جان کر کیا کرتا.....؟

بنا ہی سو رکھائی کے بعد اُن کے امتحان آشرم کا سارا انتظام، انصرام نہادلو خواست مجھے سنبھالنا چاہا۔ یوں میں ان کثرت تہذیبیاں آج بھی تھیں۔ ٹھکرت اور اُس کے واقعات اور کہیں دھند میں ڈوب چکے تھے اور میں اُت کے ساتھ ساتھ یہ قصبہ دیکھتا بھی بھول چکا تھا۔ وقت ہو ہوتا ہے وہ کہ سہ ماہوں کے پتے اسے قصبوں کو اٹھانے ساتھ لینے لینے نہیں پھرتا۔ بے اتنی قدروں کے مولے ہاتھوں سے بے ڈھنگے سٹے سوت سلائی والے بے طرح کے قصبوں کو کون پوچھتا ہے۔ اسی طرح پڑھنے بزرگوں کے طریقے علاج اور نوچنائیں وغیرہ اُنے

ہوا کہ وہ تمہیں نہ تو اس منی کے بارے میں کچھ بتا پائے نہ کوئی اور نصیحت و نصیحت کر پائے۔“
چند لمحے چپ رہنے کے بعد مزید کچھ سوچتے ہوئے بتانے لگیں۔

”یونہی ہم ایک بار بیٹھے تمہاری اس چہرے والی بیماری کی بابت چٹا کر رہے تھے کہ بتانے لگے۔
”کانتی! مجھے لگتا ہے میرے بچے کے دکھ کا وارو میرے پاس نہیں۔ کسی اور ملت سادھو کے ہاتھ
میں ہے۔ جو اس کا علاج اپنے کسی بیمار تک ویدک سے کرنے کا اور یہ اپنے پرکھوں کے دھرم پر مبنی
اُڑان بھر لے گا۔۔۔۔۔ اسی میں اس کا آنت کھل ہوگا۔“

اب شاید میرے بھی بولنے کی باری تھی۔ میں نے کہہ دیا۔
”اب آپ کہیں گے کہ میں ہی وہ ملت سادھو ہوں جس کی بشارت آپ کے چنانچی نے آپ کو دی
تھی۔ خیر آپ منی کی بات کر رہے تھے۔“

”یہی کہ یہ منی مجھے سوپ دی گئی۔ ماں کے مرنے کے بعد میں نے تمام بھت اور سورتیاں بنادیں مگر
یہ چننے والی منی میرے پاس ہی رہی۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ پہلے یہ کرشن جی کے چنوں کے بچے تھے مگر اب
یہ قرآن کریم کے سامنے میں پڑی تھی۔“ جواب یہ اس لئے آپ کے پاس آیا ہوں کہ اس کے بارے میں
مجھے تفصیل سے بتائی جائے۔“

میں نے گہری نظروں سے اس منی کے بارے میں اس کی چٹائی اور اسے جاننے کی قدر یہ خواہش کا
ملاحظہ کر دیا تھا۔ اس کی جب تک نہیں جانتا اس تک بڑا مضطرب اور تنہا رہتا ہے اور جب جان جاتا ہے
تو اس کی بے گلی بے دم ہو جاتی ہے۔ وہ بڑا لخت اور لام وا ہو جاتا ہے۔ منی کو کیا میں جو بھی پرکا اٹھا میں ہے
وہ پراسرار مقدس ازب دوست اور قائم ہے۔ اٹھا بھی اگر کسی شکل و صورت میں ظاہر ہو جاتا تو شاید اپنے اُڑی
ابدی تصور سے کچھ اور ہو جاتا جو یقیناً خدا نہ ہوتا۔

زمین اور منی کو ہی آپ لے لیجئے۔ منی ظاہر ہے وہ باہر ہے اور جو بھیتر ہے وہ نہماں تیری قدرت
کہتا ہوا کا اُتھر ہے۔ اس کربہ ارضی پہ چند ایک چیزوں کے علاوہ ہر چیز منی اور پانی سے تخلیق ہوئی ہے اور جو
موجودات ان سے بنی اس کی بنیاد کاری چیزیں بود و باش احوال و اموات وغیرہ اسی منی پانی سے ہی منسلک
تھیں۔ اسی لئے زمین اور منی کو بڑی ماں کہا گیا کہ وہی گود دیتی ہے اور وہی گود دیتی ہے۔ نہات میں
سرف آکاں بن ہی ایسی خدا کی قدرت ہے جس کی کوئی جز پھول پتا نہیں ہوتا۔ جو زمین منی سے نہیں لگتی
ہے۔ اسے مشقیہ بولی بھی کہتے ہیں کہ اس کی ایک تانت ہرے بھرے پودے درخت پہ ڈال دو تو دونوں میں
چاٹ چاٹ کر کے رکھوے اسی طرح کانتوں والا چوہا (خار پشت) بھی ہوتا ہے جس میں بلی ہو وہاں

بندے تو گیا بند رہا کھانچوئی اور ہکا بکا لپٹے ہیں۔ جس گھر میں اتفاق برکت ہو وہاں اس کا ایک کاٹھا دو۔ پھر کچھ اس المیہ سی بات کی بد معاشی اور بد بادی۔ کھانا کا نشین کا کھیر کر رکھ دے گا۔ جو قلعہ سر نہ ہوتا ہو۔ اس کے گرد کی جھیل اور فیصل گہری مونی مضبوط ہو تو چاروں طرف اس زایل خار پشت کے پنچے اور کاٹے پوندروں کی بنییری کی مانند اٹل گاڑو۔ آٹھ اور آٹھ سولہ پہر کی مندی کے بعد کار کا رندے کرم کھائے ہوئے کا کرہ چوں کی مانند باہر نقل آئیں گے۔ بندوؤں پاندوں امرہوں کی کچی ایک جنگیں ایسی جھکتوں جھیل جب اور چتر بدھیا کی بدولت ہدی تنگیں۔ پرانے زمانے کی جنگی حکمت عملیوں میں منجھوت زاموں مجید بھادر ہیں۔ پراسرار علوم و فنون کے ماہرین کا بہت بڑا عمل دخل ہوتا تھا۔ جان مال کا نقصان کم ہوتا تھا۔ جنگی حکمت عملیوں اور نونوں نوکھوں سے میدان مار لینے جاتے۔ مٹی پانی روشنی اندھیرے اور موسموں کی بوالعینوں سے کام لیا جاتا ہے۔

خار پشت مٹی کھانا ہے اور مٹی گھنا ہے مگر جو مٹی اس کی خوراک ہوتی ہے۔ وہ عام مٹی نہیں۔ مٹی دو مکر مٹی بنے ہوتے کسی خار پشت کی مٹی ہی ہوتی ہے۔ جنگل آجاز کر یہ شمشانوں قبرستانوں میں آج ہیں۔ ہر مکر مٹی خوراک کا خاصا الزام ہوتا ہے۔ یہاں سے سانس کھنکھرتے جھکڑ اور بکھڑ بکھڑتے ہیں۔ ضرورت پڑے تو اس کا رخصت کر دیتے ہیں۔ اس کا مٹنے میں ششہ کر کے قرص بنائے جاتے ہیں۔ آپس میں محبت کا تعلق رکھنے والوں کا خوراکیں کھلا دی جائیں تو وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن جاتے ہیں۔ اس کا کوشش کوششیں کرتے ہیں۔ گناہ بنا کر رکھ دیتا ہے۔

مونی کھنے والوں کی کھنسی سے امرتال (آکاس بولی) کی پانچوں کھنسی کر کے اگر کسی خوراک کے بالوں میں گزاری جائے تو وہ نہ صرف زندگی بھر کے لئے گھٹی ہو جانے کی بلکہ صورت بھی گھڑ کر دے گی۔ اس آکاس بولی کی خوراک مٹی نہیں اور نہ پانی ہے۔ بلکہ درطوبت و خصوصیت ہے جو ایسی حالت بدنگہ نیست کم گشتہ ظلمات و آفات افراد کے درختوں پودوں یا ان کی جڑوں میں تھوکنے ٹھونکنے سے بنتی ہے۔ بہت سی جڑی بوٹیاں جانوروں انسانوں اور پرندوں کے کھنے ٹھونکنے سے جنم لیتی ہیں۔ ایک خصوصیت بھی یہی ہے جس کے شجر کا اگر ایک قطرہ کسی جاندار کے صفت میں داخل ہو جائے تو فی الحال موت واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح زہریلی گھسی بھی ہوتی ہے۔ چھلی اور کچھ پرندے بھی۔ فوشنا جنگی ہیر اور دیگر گھسی بھی زہریلے اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ میں کئی ایک ایسے انسانوں کو یاد ہوں۔ جو اپنی اک نظر سے اچھے خاصے مضبوط انسان کو موت کا پروانہ دے سکتے ہیں اور ایسے گھبراہٹ

انسانوں کو بھی جن کی نگاہ انتہات 'مردوں کو بھی حیات نو سے نوازتی ہے۔ مطلب یہ کہ دنیا ہر طرح کی مخلوق سے بھری پڑی ہے۔ شر کے ساتھ خیر اور اندھیرے کے سنگ آچال۔ رحمان اور شیطان ... اچھا بُرا ... یہ سب عین مشیت الہی کے تحت ہے۔ یہ سب فطری تقاضے ہیں۔ ان سے انخاص برکت کر زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا.....!

● بول مٹی قیام دیا، تیرے دکھاں نے کایجہ ساڑیا.....!

مٹی کا یہ بادا مالک ارض و سما کا خلیفہ ارض، محبوب ملائکہ، شاہ کار کائنات، وارث علم الاسماء، مجموعہ ثواب و مائدہ ناز و ہوا اپنی فطرت و کثرت اور کثرت و کثرت کے تحت ایک نادار الوجود مجموعہ، خدا و واقع ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم مٹی کے حوالہ سے بات کرتے ہیں۔

ملائکہ کائنات نے جنات و انسان کی تخلیق سے بہت پہلے زمین اور مٹی کو پیدا فرمایا تھا مگر ملائکہ ان دونوں سے بہت شرم عالم ملکوت میں موجود تھے۔ باور سے مکاشفہ اور جن میں بہت فرق ہے۔ فرشتوں کے بعد جنات آئے۔ جنات کے لیے ایک خاص دنیا تھی اور مٹی کے لیے ایک خاص دنیا تھی۔ جب پختہ پختہ ہو گیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جو ملائکہ جنات کی نسل سے ہیں ان میں جلالت اور آتش مزاج فطری تھا خدا ہے یہ نور خاص کی ایک ذیلی شرافت سے تخلیق ہوئے۔ یعنی آتش اور قدرے مٹی یا پانی (تخلیق آبیروں)۔ مٹی وہ ہے جس کی انہیں انسان سے بہت پہلے زمین پر بسایا گیا۔ انہیں ہوا یا پانی کی طرح ایک دوری زمین آسمان کا ہر فی فنی ہر عہد کے اختیار دیئے گئے۔ جبکہ انسان ان تصرفات سے محروم رہا۔ یہ ملک امر ہے کہ بشر کو کن کن سموات و درجات میں افضلیت دی گئی۔ ان میں سب سے اعلیٰ اس کا خلیفہ الارض، علم الاسماء کا حامل ہونا۔ مٹی پاک کا کبار و بشریت میں مظہر بھی شامل ہے۔

مٹی کے کھدو نے گھڑی پل دے پروئے

مٹی میں نمود و جذب کی بے پناہ قوت ہے اور یہ اسے اللہ کے امر سے اجرام فکری یعنی چاند سورج، ستاروں، سیاروں سے حاصل ہوتی ہے۔ جو مختلف اوقات و صورت میں مختلف نوع کے اثرات و تصرفات کی حامل ہوتی ہے۔ مٹی اپنے نطرون میں ان معدنیاتی اور کیمیائی خصوصیات کو بھی سموئے ہوئے ہوتی ہے جو اس کے لیے یا قریب و م پخت ہوتی ہیں۔ مٹی اپنے ہضراتیاتی اور موسمیاتی محاسن و معائب سے بھی متاثر رہتی ہے۔ انسان کا وجودی ضمیر چونکہ مٹی ہی ہے اس لئے جس جہاں اور جدھر کی مٹی اس کی ابتدا کی تکمیل کے لئے

کام میں لائی گئی ہوگی وہ مزاجی اور طبعی طور پر اسی طرح کا ہی ہوگا۔ انسانی آشفہ سر یا شعلہ پانی لازمِ خلق ہے۔ چہ اپنی نسبت یا جلد بازی، حقون یا قتل، مزاجی اسی مٹی کے شاخسانے ہی تو ہوتے ہیں جس مٹی کا وہ بن رہا ہوتا ہے۔

ماہرینِ ادبیات، طبیعیات، صحاحیانِ طبیعیات اور عالمانِ فہم و عہد کے ہاں ایسی نظر اور بصیرت ہوئی ہے جن سے وہ دیکھتے سیکھتے ہی مٹی کی اقسام و فضائل کی تمام کیفیات جان جاتے ہیں۔ دورِ جدید کے سائنسدان بڑے بڑے پیچیدہ آلات کی مدد سے زمین اور مٹی کی ظاہری باطنی تفصیلات جاننے کی کوشش کرتے ہیں مگر پھر بھی صحیح نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ مگر اجدادِ یہاں بڑے سمجھنے والے بنکار چمک کرنے والے تھیں، دیکھا نہیں ہوتا جو ایک حرف لفظ کسی زبان کا نہیں پڑھ سکتے۔ ان کے ہاں علومِ دینی ہوتے ہیں۔ لطف کی بات کہ یہ علومِ چرمدون و زردون اور چرمدون کے ہاں بھی کسی طور ہوتے ہیں۔ صحرائی مخلوق بھی جانتی ہے۔ انسان کی عقل و دانش جہاں اختتام پذیر ہوتی ہے وہاں اکثر دیگر مخلوقات کی شروعات ہوتی ہے۔

صحافیوں، پیادوں، ہنگاموں، سمندریوں میں جھٹکتے ہوئے داروہشی، جھگڑتے، فقیہوں، آوارہ گزراؤں، جانوروں پر ہنگاموں، غصے، کھانسی، دل دھڑکنے والے پانی، گلاب، روایت، پوری اس کے ہیں۔
راہیں اور زیر زمین راستے، رنگتے والے جانور، کیڑے، کھڑکیوں سے خاصہ مدد ملی جاسکتی ہے۔

[illegible]

موتی ہیں۔ کچے پھوڑے کو پکانے کے لئے بھٹ متور یا چوبلی کی مٹی کا لیپ کیا جاتا ہے۔ مسجدوں، قبروں
 اور کسی باغیچے کی مٹی پوتی جاتی ہے۔ پکانے کی ہڈیاں یا پانی پینے کے بدھنے اگر شیم کے بیڑے کے نیچے کی مٹی سے
 بنا کر استعمال کیئے جاویں۔ تو برق بھل معتدی بخار اور جلدی امراض کا شافع علاج ہے۔ بغل گندہ منہ کی بد بو
 اور پیروں کے وارم میں ٹمسی کے پودے کی مٹی کا لیپ کرنا اور سوگھنا فائدہ دیتا ہے۔ چھیک آپریشن اور زخموں
 کے بعد بے منتانات کو معدوم کرنے کے لئے حلال چانور کے گھٹنے کی ہڈی کو ملانی مٹی میں گھس کر لگانے سے
 بخیر نتائج نکلتے ہیں۔ ناسور خناذیری گھاؤ کو بھرنے کے لئے گھیکوار کی جڑ اور برگد کے سائے کی مٹی کا لیپ
 کرنے سے گھاؤ بھر جاتے ہیں۔ اسی طرح مٹیوں کے پیچیدہ بھاؤ جاننے کے لئے خاص طور پر مشراٹ الارض
 سے کام دکھاتے ہیں۔

مجھے اپنے ایک دیہاتی عقیدت مند بچے کی شادی کا ایک مسئلہ یاد ہے۔ کا موقع ملا۔ دیکھئے مٹی کے

حالت۔

یہ شریف اور رئیس بچہ تھا۔ لایا تو کر ہوا اور عمرہ انوں سے انگوٹیاں ہونے کی بنا پر کھٹے سے شادی کا
 دست کر دیا۔ میری بڑی عادت یا اصول کہ میں کسی کی شادی میں شریک نہیں ہوتا۔ اگرچہ ایک رشتہ دار
 اور عقیدت مند ہوں اس کیلئے اور میری عمر وہی سیر خری حرکت یا بد عادتوں پر گھروں کر رہے ہیں۔ جبکہ ایسا
 نہ ہو تو میں ان کا بدل رکھنے کے لئے بھی ایسا کوئی عمل نہیں کر سکتا جو سراسر منافقت اور بھت کے تحت
 زندگی ایک فساد ہے جبکہ موت اک حقیقت۔ فقیر اور پیش نہ زندگی کے خوش اور نہ موت سے
 ڈرتا۔ وہ ائمہ مد علی نقل حال کا مشورہ تھا کہ شادی کے بعد دو روز کے بعد نکاح کے وقت اس
 کا سسر (جو اس کا بھائیوں تھا) بدگ گیا۔ ہر طرح کی کوشش زنت حاجت کے باوجود وہ جس سے جس نہ ہوا
 اس ایک ہی رات کہ کسی قیمت پر نکاح نہیں ہوگا۔ بارہ رات واپس ہائے گی۔ بزرگوں رشتہ داروں نے بھی
 نکاح کے وقت انکار کی وجہ دریافت کی۔ وہ بولا تھا وہ بیان کرنے سے بھی گریزاں۔ میں یہی کہہ دیا اور میری
 عمر نہ جانے یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی کہا گیا اگر حق میں خیر چہ زیورات زیادہ لکھو اور چاہو یا مکان لڑکی
 کے نام کر دانا چاہو جب بھی ہم تیار ہیں۔ جب ہر طرح کا طریقہ آزمایا گیا تو آخری فیصلہ کے لئے اس بچے
 نے مجھے ٹیلیفون پر ساری رات اور آدھی رات اور میرے کسی فیصلہ کے لئے جھگی ڈوا۔ ساری سنواری من کر ظاہر ہے میں
 کو امداد نہ دے گا کہ ایسا شریف بھائیوں کا لکھا خوب صورت صحت مند اٹھوتا ہے۔ اس بڑے پیڑ کو کو تو خدا کا
 شکر ادا کرنا چاہئے جبکہ لڑکا اس کا بھائی بھی ہے۔ بہر حال وقتی طور پر میری کجھ میں کچھ نہ آیا کہ اسکی
 صحت حال سے کس طرح نبھا جائے۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ اپنے ماموں سے ٹیلیفون پر میری بات

کہتے ہیں کہ آنے والا مائی جیوں کا پتر ہے یا گا کے لوہار کا دامار۔ اجنبیوں کو پہچان سونگلیہ کر وہ خاص طور پر آگے جا کر نعروں سے اس کا استقبال کرتے ہوئے گاؤں تک لاتے ہیں۔

گاؤں چنچتے چنچتے ہمیں نے راستے میں ساری صورت حال معلوم کر لی تھی وہ ساری بار بار اسے اپنے چھوٹے ماموں کے گھر چلا آیا تو بڑے ماموں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی اپنے فیصلے میں ذرا ہرج چرک پیدا کی۔۔۔ کھانا دانا تیار حالت میں گرم بھجوا دیا۔ جو شاید مسجدوں اور غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ذہن تیار رہی اپنے نصیبوں کو کون رہی ہے بلکہ ایک آدمہ ہار بیوش بھی ہو چکی ہے۔ اس کی ماں بھی سکتے کی حالت میں ہے مگر اس کے اچھے اور ضد کی باپ چ کوئی اثر نہیں ہوا۔ گاؤں چنچتے ہی آذان کی آواز کان پڑی جو ایک اچھا شگون تھا۔ وہیں سے ہمیں نے رخ مسجد کی جانب کر لیا۔ بیرونی فقیروں کی آمد اس لحاظ بھی اچھی بات ہوتی ہے کہ ایسے افراد کو بھی ان کے ساتھ مسجد چنچتے کا موقع مل جاتا ہے جن کا تعلق مسجد سے نماز عید یا نماز جنازہ تک ہی محدود ہوتا ہے۔ نماز ادا کے بعد میں کبیر احمد کے چھوٹے ماموں کے گھر چلا آیا۔ خوب آؤ گشت سے مجھے چھایا۔ دو بھلا شریف آدمی بھی اپنے بڑے بھائی یعنی کبیر احمد کے ہونے والے گھر کی عقل سمجھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ میں تھے۔ اس نے کہا کہ میں نے اپنے دوستوں کو بھی بلایا ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے اپنے دوستوں کو بھی بلایا ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے اپنے دوستوں کو بھی بلایا ہے۔

میں نے اس کی کوئی بھی دعا اور جس کو ملے گا کوئی پیندا نہ ہو وہ دونوں فرماتے ہوئے ہیں۔ قدرے بعد کے بعد وہ گھبرا یا سا چلا آیا۔ میرے سامنے کھینچتے ہی بھاگ کر باخدا بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی سلام کا جواب دیتے ہوئے بڑے احترام سے اپنے پاس بٹھایا حال احوال پوچھا۔ بیٹی کی شادی پہ مبارک اور خیریں دیں۔ کچھ باتیں بتائیں کہ جو باپ ایک بیٹی کو پال پوسن کا عظیم تہذیب سے ملا کر جوان ہونے پر اس کی شادی کر دیتا ہے پاک اس کو بدلے میں جنت کا ایسا ٹکڑا ملے کہ جسے جہنمیوں کا خلیفہ اس کے لئے ملے۔ ابھی میں اس نوع کی باتیں کر رہی رہا تھا کہ وہ خود کھینچ لگا۔

”بابا جی! اچھے چل کر کالج پڑھائیے۔ پچلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ کھانا بھی پڑا ہوا ہے۔“

11

پاس بیٹھے ہوئے سب لوگ مڑکھ لے آئے تھے۔ الہی! اس بندے کو کیا ہو گیا ہے کچھ

دیر پہلے تک تو یہ نکاح دینے سے انکاری تھا مرنے مارنے پہ ٹٹا ہوا اور اب یہ خود نکاح کا کہہ رہا ہے۔ میں نے ترخت کہا۔

”بھلے لوگ! اب یہ نکاح وہاں نہیں اس گھر میں ہوگا آخر یہ بھی تو تیرے ہی بھائی بیٹی کے چچا کا گھر ہے۔ دوسری وجہ یہ بتائی کہ میں بیمار روز صا آدمی ہوں۔ جہاں بیٹھ گیا سو بیٹھ گیا۔ بار بار مجھ سے اٹھک بیٹھک نہیں ہوتی۔“

پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی میری ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ تیار ہو گیا۔ کہنے لگا۔

”جیسے آپ سب کی مرضی۔“

اُس کے جانے پہ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے؟ گھر کے والے نکاح کی تیاری میں جُست لگے۔ دریاں برتن دیکھیں و پیرہ سب اٹھا کر ادھر لانے لگے۔ سب کچھ سے سر سے یہاں بٹھایا گیا۔ اب رادو دیکھ رہے ہیں کہ کب لڑکی کا باپ آتا ہے اور نکاح کی اجازت دیتا ہے۔ پیٹھ دھو لوق سب کب بھی بار بار یاد دلا رہا تھا کہ کبھی نماز کا وقت بھی قریب ہے اور میں نے نکاح پر جانے سے بعد ایک دوسرے گاؤں میں جنازہ پڑھانے بھی جانا ہے۔ اُٹھنا اور کھانا کھانے کے بعد چائے کی پیرہ لگائی۔ لڑکی چائے کے لئے اور کھیت چھوڑ گئے۔ پیرہ رادو چھوڑ دیا۔ دوست ہیں رادو انور لڑکی سے والد اور گواہوں کے علاوہ۔ یہ باتیں ہوتی رہی تھیں کہ لڑکی والوں کے گھر سے پیغام آیا کہ نکاح نہیں ہو سکا۔ بارات واپس چائے گا۔ لڑکی کے والد نے گھر پہنچ کر اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ باراتی ایک بار پھر دھڑکتے ہیں ڈوب گئے۔ لیکن میں مسکراتے ہوئے ہلکے ہلکے ہنسنے والی صورت حال کا مزہ لے رہا تھا۔ اب کہہ دو اور سب باراتی میری جانب دیکھنے لگے مگر سب کے پہلے ہوئے۔ جو وہ موشیوں کی زبان سے کہتے تھے کہ بابا جی اب بولیں؟ انہیں تو قس حوالہ سے والٹاس تک پورا قرآن پڑھ چکی ہیں۔ نکاح کو چھوڑ دیا۔ طرح پیٹ پوچا کا بندوبست کریں۔

ہوتا نہیں ہے کہ پیٹھ و شادیوں میں ہار تپوں کو کسی کی شادی حلاق سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ دلچسپی کا نکتہ ارکان کا وہ کتابا کئے ہوتے ہیں جو سالن اور چالوں میں اپنی مٹی بہار دکھا رہے ہوتے ہیں۔ ان کا تو رادو اور کتابا بانی کو وہ شخص سمجھتی نہیں سکتا جس کا واسطہ کسی پیٹھ و شادی سے نہیں چلا۔ اگر پیٹھ و شادی کنوئیں کی بہانے گھر سے سکے ہیں تو سمجھ لیتے چاہئے کہ شادی والا زنی یا سحر یہ میں دس چھوڑا جس کا ہے۔ بکروں والی شادیاں پھس پھسی بے لطف و بے جان ی ہوتی ہیں۔ جو جان جرات کئے کئے کوستے ہوتی ہے وہ بکروں کے بک بک بکے بے ریشہ و زک گوشت میں کہاں؟ بکروں کا گوشت تو چھنگلی کے پتے سے

تیز ناخن سے کاٹا جاسکتا ہے جبکہ کٹے کے گوشت کے ذکرے ٹوٹے آ رہے مشین سے کرواتے جاتے ہیں۔
 بکرے کا گوشت دو چار انگڑائیاں توڑنے سے ہضم ہو جاتا ہے مگر کتے کے گوشت کو گلانے اور جڑ و معدہ بنانے
 کے لئے پینڈہ بھگڑا ڈالتے ہیں یا آپس میں لکھن و ششم ہوتے ہیں۔ سگریٹ کھنڈ بڑھکیں یا پھر انھیں
 زبانون کے راس سے کام چلا کر پڑتا ہے۔

میرا ذاتی طعمائیاتی تجربہ ہے کہ کالے کٹے اور ڈب کھڑے دیتھے کا گوشت انتہائی لذیذ نرم و کھینچی اور
 قدر امت پسند قسم کی جذباتی کیفیات پیدا کرنے کا محرک ہوتا ہے۔ فلسفہ تصانیف پر بحث کرنے کو جی کرتا ہے۔
 جنگلی حیات پر مبنی دستاویزی فلمیں دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ چوپایوں کے بارے میں سلسلہ رمی کے جذبات سرور پڑ
 جاتے ہیں۔ اعضاءے ریکورڈ لمٹلٹات خبیث میں تبدیلی می محسوس ہونے لگتی ہے۔ ذہنی صلاحیتوں میں وائرس آ
 جاتا ہے۔ ایک بار اگر کسی کے منہ سے کچھ دھڑکے کا گوشت لگ جائے تو وہ بکڑھنے نرے پھللی بیڑہ فرمائی سے منہ
 اٹھا لیتا ہے۔

تو میں بات کر رہا تھا کہ احمد کی شادی کی دہائیوں میں چلی تھیں۔ انہوں میں کتوں کا گوشت اپنے کھانے
 پانے کی ذہنی طور پر راجا تھا۔ مگر دھڑکی کا والہ کسی کھانے کو نہ کھاتا تھا۔ انہوں نے کتوں کو کھانے اور
 پانی وغیرہ تو سب سب کچھ پڑیے ہوئے ہیں۔ کتوں کو کھانے کے لیے کتوں کو کھانا پھرنا پڑتا ہے۔ لیکن
 جی تو یہ ہے کہ میری اپنی سیتے میں کتا ذکر رہا تھا۔ بچے کے کتے کا تھنہ تو کھس بہانہ تھا اصل چکر تو میں کتے
 کے ساتھ سر کرنے پہنچا تھا۔

ولی ہوا مطلب یہ ہو یا ولی یا ولی کا کتا تھا۔ یہ کتا کھانا کھاتی ہوئی ہے ویسے ہی جیسے ہر
 ایسا دار کے ساتھ خود غرضی اور کھینگی بڑی ہوتی ہوئی ہے اور کوئی بھی اس سے مہرا نہیں ہوتا بالکل یہی کیفیت
 میری بھی تھی۔ تم جنس بچہ کی اشتہا آور مہک لے میری سیتے کا نال مار کر کھ دیا ہوا تھا۔ اوپر اوپر کی میری
 کھانہ اور بھانہ کھانہ کی دھڑکی پڑتی جا رہی تھی۔ جھوک سے میری یہ حالت تھی کہ اگر اوپر اوپر کی کا باپ کھانہ نہ
 لینے کی شرط پر مجھے کتے کا گوشت اور دھڑکی تو میں بھی اس کا ہوا میں جاتا۔ کھینگی دھڑکی نہیں دیکھتی ڈال دھڑکی
 دیکھتی ہے۔ کھانہ کھانہ نہیں لے اس کے بھائی اور مستہ قسم کے لوگوں کو دو بار وہاں بھیجا اور یہ بھی کہا کسی
 نہ کسی طرز پر یہ ضروری کرنی پڑے اسے آؤ۔ گھر کچھ زیادہ دور نہیں تھا وہاں سے وہ شرم ظریف
 دل نواست اپنے پاؤں پر ہی چلا آیا۔ وہی ملک ملک بڑھتا ہوئی کئی نہ نکلتا۔ اس کے برتاؤ اور بچے
 سے معلوم ہوتا تھا یہ وہ شخص ہی نہیں جو اپنے گھر بکلی کر پاؤں سے لے کر سر تک نوکل بدل جاتا ہے اور مانتے چ
 آنکھیں رکھ کر دو لوگ انکار کر دیتا ہے۔ میں نے پوچھ لیا۔

ذہن میں اک کچھڑی سی پک رہی تھی کہ یہ بندہ ترکیہ نفس کی کس منزل پہ ہے؟ انسانی عقل تو دلیل و حوصلہ ہی ہے۔ اس محیر العقول حرکت کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے۔ اس نیگے دھڑنگے کو تو چندو ہیں منٹ میں برف کے تودے کی مانند تودہ بن جانا چاہئے۔ اصول و فطرت کی اس نفی پہ نہیں بڑا حیران تھا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ کچھ کھانے پینے کے آزاد سے بھی آزاد ہے۔ بڈیوں کا وہ حانچہ تودہ پہلے ہی تھا۔ وہ عام انسان ہوتا تو برف کی بچ بچگی اسے کب کی پتھر بنا چکی ہوتی۔ چند منٹ ایک ہی جگہ کھڑا رہنے اور اس کے بارے میں مسلسل سوچنے سے میرے ہر ناخنیں نم ہونے کو تھیں کہ میں وہاں سے ٹل لیا۔ کھانا دانا کھا کے میں آشرم کے فحاشے سے باہر نکل کر اسی راستے پہ آگیا جدھر تپتیا گرمیوں کے گوسے تھے۔ یعنی وہ منش جو اس آشرم میں یوگا، یوگا، یوگا کیسے کہتے آتے ہیں۔ انہیں مختلف جگہیں آلات کر دی جاتی ہیں جدھر وہ تپتیا میں گمن رہتے ہیں۔ جب میں اس نالگے بوگے کے گوسے سے ٹکڑیلک چھوٹا دیکھا کہ اس کے کانھ سریر میں جان ہی پڑ گئی ہے وہ جھکائی لینے برف کے تودے سے اتر رہا تھا۔ میں نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اترنے میں اس کی مدد کرنی چاہی۔ میری محض انگلیاں ہی اس کے ہاتھ سے مس ہوئی تھیں کہ میں جھٹکالے کر بچے پیچھے بنا بیٹھے کسی انتہائی گرم سچ کو پہنچا ہوا۔ وہ آرام سے لیے اتر آئے۔ اس کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے مسکرائے کہ نام تو شش کی تھی۔ اس کے بعد اس نے اس کی طرف اشارہ کیا کہ اس نے چپا کا رہا ہے۔ اس نے مسکرائے کہ بے وضع ہی مسکرائے میں تو کہنے کی تو ذرا سی گرمی تھی۔ اس نے بہت تھیشہ ادا دی میں گرمی کا کیا کام۔ وہ میرے قریب آیا۔ کوئی بھڑکی اخرجی میں کلام کرنے لگا۔

تھیں اپنے ہاتھوں پہ وہ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کے لیے بارے آشرم کے دواخانے میں موجود ہے۔ وہ بھی میری طرح گزارے لائق اگر چہ یہ میں اپنا مانی انصاف دیان کر سکتا تھا اور اتنا ہی بھو بھی سکتا تھا۔ میں کچھ ہاتھ کا کا صدمہ کھ کر سنا تھا ساتھ چل رہا تھا۔

”کہاں سے آئے ہو۔۔۔؟“

میں جواب میں خاموش رہا۔

”یہاں یوگا کیسے آئے ہو یا جوگا۔۔۔؟“

”میں موگا میں دلچسپی رکھتا ہوں یہ گا اور جوگا بھی موگا میں آتے ہیں اسے جتنے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”یہ تو صحیح ہے اگر تم محض جوگا کیج رہے ہو تو میرے ساتھ ہی آئے پیچھے کسی تو اسے پیچھے کرتے“

اور اس طرح کے بیکار سوالات اپنے دماغ میں جمع نہ کر رہے ہوتے اور نہ ہی اک دم مجھے سہارا دینے کی توقع کرتے۔ اچھا ہے تم جوگا میں نہیں چڑے۔“

وہ مجھے لے کر اپنے منہ میں آگیا جو میرے منہ سے نکھڑ پادوڑ اور نہیں تھا۔ درمیان میں ایک ٹک سی گھائی تھی جو برف سے ڈھکی رہتی تھی۔ آ رہا اترنے کے لئے نگڑی اور جوت کے ریشوں کا جھولاہل تھا جس سے نکلتی ہوئی برف کی تھمیں اور ہر وقت چھائی رہنے والی زحند بڑا خواب آگئیں منظر پیدا کرتی تھیں۔ ایسی ٹھنڈ اور خاموشی جیسے پوری کائنات برف اور زحند میں لپٹی ہوئی ہو اور ہم خاک سے نہیں کر سکتے برف سے ہٹے ہوئے پتے ہیں۔ اُس کے منھے میں گھاس پھوس کے علاوہ شاید ایک بوسیدہ سی سرخ رنگ کی چادر نگڑی کا ایک برتن اور ایک تھیلا تھا۔ ہم آٹے سامنے بیٹھ گئے۔ نیچے پڑی گھاس سے چند خشک خوبانیوں جیسا خشک پھل نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

”چاہو تو یہ کھا سکتے ہو؟“ پھر بولا۔ ”جانتے ہو ک گیان اور نروان میں کیا فرق ہے؟“ خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”گیان“ کھنت تھیلا اور شوق سے حاصل ہو سکتا ہے مگر نروان کی نکتی بڑے خوبصورت سے حاصل ہوتی ہے۔ ہر خوف، خواہش، خواب، خیال اور خرابی سے چھٹکارا پانے کے بعد ہی اس راویہ قدم رکھا جاسکتا ہے۔ پاؤں دھرتی، پس اوپر آکاش۔ چاروں کھوت دباتے چلے آتے ہیں۔ شش کاری ان کے بھیڑ نہیں کاہل جاتا رہتا ہے۔ ہر صبا رنگ سے نوازا جاتا ہے اور آواز آتی رہتی ہے۔ وہ اپنی طرح میں پڑے نہیں جاتا رہتا۔ چھٹکارا ہی میں ہوتی ہے جس سے کسی دیکھ رہا ہے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ الفاظ انسانی الضمیر غور، خود آجائے چلے جاتے ہیں۔“

یہاں بھی کرنا ہے قریب میں معاملہ تھا اُس کا کیا تھا سوچا جانا نیسے میرے لئے جبران پہ الفاظ اور باتوں۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”برف نکتی اور کبھی بھی ہو۔ ہوتی تو دھرتی کے اوپر ہے۔ اور دھرتی کے بھیڑ آگن کا جو اوجھا اوجھا ہوتا رہتا ہے۔ میلوں اوپر برف کی ٹنڈک میں چھوڑ میلوں نیچے کی کڑی سے ناطہ جولا مشکل تو ہے پر ہمنس نہیں۔ یہ سارا کھیل راجہ کا ہے۔ تسوڑ اور تھیل کی سانت کا ہے۔ جو اس میں کاش ہو گیا وہی نروان کو کبھی پتا ہے۔ ہماری یہ تھن تھیلا اپنے سر پر کی سرچا کو مارا ہوتی ہے۔ آتما کی راویہ چل کر نے کے لئے یہ روش ہے۔“

ارے مائی کے پتے تجھے کتنا گمان ہے
تیری اوقات کیا تیری کیا شان ہے
شاید ہینٹس چالیس برس پہلے حبیب جیلر قوال کی ایک قوالی لکھی تھی۔ یہ بول آئی تھک بیٹھ میں
کاٹنے کی مانند ٹھسا ہوا ہے۔ یہ مائی کا چلا اپنی اوقات اور شان میں واقعی عجیب و غریب ہے۔ گونے چائے

تو قہرِ لذت میں چڑے اور جب چڑھنے کی سوچے تو ہامِ رنعت کو چھوٹے گدلی مٹی کا پروردہ بیچ ایسی آنکھوں لیتا ہے کہ آؤجِ شریا کو شرماتا ہے۔

گجرات شہر کی مٹی بڑی نرم تھک اور سرلی ہوتی ہے۔ عشق و محبت کی مستی میں رہتی یہی مٹی اپنے اندر بڑے کمال و جمال رکھتی ہے۔ یہاں دریائے چناب کے زو پھلے پانیوں اس کے سرسبز گدراے ہوتے کناروں اور زوہان پرور وسیع و غریب بیلوں میں بہاؤ رہتیں پے پے کے پے پے جھایا کرتیں۔ عکبت بیڑ ہوا تھیا مایے پے گشتائی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ مہو میں جیسے آکاش سے اترتی اپہرائیں ہوں۔ مردِ عشق پیشہ صاحبِ پیشہ اور کارِ بارِ عشق میں بے ریشہ ہوتے تھے۔ اس بستی کی گلیاں کوچے بازارِ زلف گرہ گیر کی تھیں تھے۔ چوبارے پنجے خجھر و کے مکان شہرِ خلد کی تصویر تھے۔ یہاں شہزادے فقیر اور ذریوزہ گروہ پر باتو جی تھا کرتے تھے۔ اس کے سپر پر رات کو سارا دن کی کھانسیں اور کھجھر رات سے جاتے تھے۔ ادھر کی چاندنی راتوں میں گلزاروں کی مہکاروں میں گودِ قاف کی پریاں رقص فرما محسوس ہوتی تھیں۔ شادی اسی وجہ سے یہاں کی مٹی بڑی گدلیاں عزم ملائی تارک اور خوش رنگ تھی۔ کوزہ گڑا اس روایت سے ایسے کھجھر تخلیق کرتے کہ قور و زونیک کے ملکوں شہروں سے خاص و عام مکمل ان کی عنائی کے کمال و جلال کے ہوا ملک کی خاص

UrduPhoto.com

• ڈگر چنگٹ تھی !

ایک وقت ہو کر رہا۔ میرے اندر آشتی سہی کے سر پے دھسے ہوئے تھے۔ میں ہر نو چندی جھست گیا لکھنؤ سے پیدل جہا پور جہاں راستہ گجرات چلیا کرتا تھا۔ وہاں پر ہندو پائیدل خچنے کی مشغول و جو جھیں میں ایک بڑی قہر میر سے جنون آوارگی کی تسکین تھی۔

”پانی چاہیے ہو تو پھر سے تنگ خالی کا گریا اٹھانے ہو گے چنچنا۔ تو ان قہم رکھتے ہوئے سدا جلتے رہیں آج کا ایک قطرہ پچلے نہ چھٹے۔ رادو راست کی ہر نوٹ کی مخلوق سے تعلق ترازو کرنا اور ہر کام پر ایک ہر روز کرتے۔ گڑہ کام کا ایک قصور و حریف۔ گڑہ مٹی کو کہیں بھی چھوڑا آؤ وہ وہاں سے ہر طور ایسا اپنے گڑہ کی۔ گڑہ کام دھینے میں بھی گڑہ گھٹاتے اور گڑہ کا کھیل آہرایا جاتا ہے۔“

جہاں پور جہاں گجرات سے چند میل دور ایک پرانی بستی ہے۔ راستہ میں ایک نیم سانا لہ بھی پڑے نام سے جانوں کا حوالہ ملتا ہے جبکہ میں نے وہاں کسی بائبل جات کو نہیں دیکھا۔ کھدیاں ایک جہیں اور سب سے

ٹھک ٹھک کام کرتے ہوئے مستعد کارنگر۔ جو انتہائی نفیس کپڑا پہنتے تھے۔ ان کارنگروں میں ایک چکارو سا بانکا بھیا کارنگر میرے روحانی استاد سے کہیں زیادہ سیرادوست تھا۔ نگاہ سیرے کی اور ہال سونے کے وہ سچے شگرف اور سفید ٹوہیے سے بنا ہوا تھا۔ چہرے پر چاندی کی چمکی اور کہیں کہیں کندن کے کوکے بھی لگے ہوئے تھے۔ محل چنے کہا ہے موتی سیاہی نہیں سرخ بھی ہوتے ہیں۔ قدرت چہرے میرے نمین نقش کے حساب کتاب سے انہیں سجاتی ہے یعنی یہ صاحب نظر بھی قدرت کے اُن خاصاں میں سے تھا جنہیں محض کہیں غم نہیں دیا جاتا۔ بلکہ بنا سنوار اور خصوصی تیاری دے دلا کر کہیں اُتارا جاتا ہے۔

میری ابتدائی عملی روحانی تعلیم میں میری چاہی میاں جی سنگاں والے حافظ باؤ فرین اور اس چکارے جولاہے کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ ان ہستیوں کے علاوہ ایک ہستی اور بھی تھی مگر تھن ایلک جوزف جس کا ذکر آگے آئے گا۔ جلاپوری جولاہے استاد نے مجھے بچھایا کہ تجرات ملوک والوں کی ہستی ہے اور جلال پور جٹاں سلوک والوں کی۔ راج سلوک پہ پیدل سفر ہوتا ہے پھر ایک وقت آتا ہے کہ محض دو کام پہنچنے سے ہی منزل سامنے آ جاتی ہے۔ ”دور کش کے لئے کا کا تے ارحانی قدم“ والی بات بھی شاید یہی ہے۔ پیدل چلنے سے جو مشاہدات و تجربات اور پھر خطاب اور اسرار سنلتے ہیں وہاں جو کہ کچھ نہ آئی نہیں کہے۔ میری موتی کچھ میں دیر سے آیا کہ میں اس میں باہین اور علی کے آگے جولاہے جاتا ہے۔ اس سرور میں ایک پادری ہم سرور اوپٹی چچی نرم پتر ملی لکھن سٹی پہ چلایا گیا۔ انسان جب تک مٹی کے ساتھ مٹی نہ ہو جائے تو وہ ان کی اکسیریت سمجھ سکتا ہے اور نہ اس کے ذرات کے سمجھ میں پہنچے ہوئے اسراروں سے شہادتی حاصل کر سکتا ہے۔ انانیت کی افلاکیت اسرار و ہستی انسانی کی کھوت نہ ہو نہ غافل نہ ہو نہ جگہ نہ ہو نہ زمانہ نہ ہو نہ حاصل اور بھی پاتی ہے۔ اس وقت کے کلابوں کی دہی گمانی ہی غریبا میں یہ حکمتی راز پالیں کچھ میں نہیں آیا تھا کہ سیالکوٹ کے علاقہ بارہ پتر سے انکوئی اسمہ پال دیو والی وادیا آباد اور پھر گجرات کے راست مجھے پیدل اور پادری ہوا جلال پور جٹاں پہنچنے کا حکم کیوں دیا گیا تھا جبکہ مجھے کمال پور گھنڈیاں بھی جہتوں سمیت مار میک کے اس پار سے مانگے یا اس کے ذریعے برسات پابے وی بی بی بھیجا جاسکتا تھا۔

سیالکوٹ بارہ پتر پیرسائیاں کی بہت بڑی ہستی ہے۔ خواہ صورت عاجز و حق اور پیارے پیارے شہرام رنگے کہ چچن گیموئی سفر ایک خوبی یہ کہ اور اکثریت پر جسے کچھ مہذب میسائیاں کی ہے۔ جو زیادہ تر تعلیمی مشنری اور تعلیم و تدریس سے وابستہ ہیں۔ یہاں کا سکھاتی ایلک جوزف ہائی ایک لڑکا جو سرے کالج کا سلوڈنٹ تھا میرا خدا واسطے کا دوست تھا۔ ہاں دشمنی کی طرح کوئی دوستی بھی خدا دادا۔ ملکی جوتی ہے۔ وہ انٹر کالج سے فارغ ہو کر مجھے تلاش کرتا ہوا کالج روڈ کے قبرستان میں پہنچ جاتا تھا۔ اُن میں سیالکوٹ میں موجود

ہوتا تو تو سے فیصد میرا دھرم موجود ہونے کا امکان ہوتا۔ یہاں قبرستان کی قبروں کے نیچے زرنگت، قلمبر، مڑے میں بے مثال تھے۔ پاس ہی شیعہ مستریوں کا مندر والا اور بازار حسن!۔ یہاں گندے نالے کے طرح ایک چھوٹی سی کوٹھڑی کے دروازے پہ کھڑی ایک سیاہ و بھنگی سی بکھری اہم شرارتی آوارہ گردوں کی بلیک میٹنگ کا اٹھ نہ بنی رہتی۔ ہم اسے بے پناہ وق کرتے تھے مگر وہ کسی ایسی غم گھٹی کی بنی ہوئی تھی کہ خند و پیشانی سے نہ صرف ہماری زیادتی برداشت کرتی بلکہ کچھ دے دلا ہماری ٹٹھی بھی گرم کرتی۔ خدا جانے وہ کون تھی کہاں سے آئی اور اور کن حالات میں یہاں پڑی ہوئی تھی۔ پرانی زونٹی سا چوکور چہرہ چپانا ناک ٹھک ماتھا دھنسی ہوئی چٹنی سی آنکھیں اور ستم بالا نے قسم کہ بائیس والی آنکھ ایسی جھنجکی کہ وہ بیک وقت دو مختلف سمتوں میں دیکھتی ہوئی محسوس ہوتی۔۔۔ چونکہ چھانڈنی قریب تھی اس لئے فوجیوں کے لئے یہ گندے نالے والا علاقہ ریڈ ایریا تھا۔

سولیس کپڑوں میں ملیں اکثر فوجی انگریزی پولیس کے ہاتھوں پکڑے جاتے۔ اس ریڈ ایریا میں اور بھی کمرے کوٹھڑیاں تھیں جدھر بہت سی جسم فروش عورتیں تھیں۔ جو خصوصی طور پر رات کو کچ شہوکار جموں کی روشنی میں اپنے اپنے پردہ پوش کھڑی دعوت گناہ دیتی تھیں۔۔۔۔۔ یہ کاروبار منشا سامراج غروب ہونے کے بعد ہی ختم ہوا تھا کہ یہ قسم غریب و مند رات کی تاریکی ہی میں چھلتا پھرتا۔۔۔۔۔ دن کی روشنی یا شام کے اندھارے میں وہ کسیاں کسب کرتی تھیں۔۔۔۔۔ وہ کھڑکیوں پر کھڑی ہوتی تھیں۔۔۔۔۔ یہاں ایک ایسی عورت تھی جس نے آنکھیں اور نام بھی لگا کر پڑا تھا یہ پھر ایسی کسیاں جو شعل و ضرورت قد کاٹھ میں ماضی کی کسی پسرانہ رمانچ یاد دہانہ میں جٹا ہوئی۔ وہ ہڑکیلا لہجہ اسٹریٹ میک اپ اور اپنے دیگر مہیاں پہنپا کر مجبوراً کچھ دیہاتیوں اور ایسے ٹوڑے ہوئے بھگوانوں کے لئے کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ جو رات کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔

یہ ہمارے والی بھی ایسی ہی فوجی مسکینی سی تھی۔ ہمارا اس سے ایک خاموش سا معاہدہ تھا۔ ہمارے کٹنے کے بعد میرے پیسے بلڈر جگا ٹیکس ہماری جانب اچھال دیتی اور ہم دھیل و مڑی آپس میں قسب فرماتے۔۔۔۔۔ اگر وہ بھی اوجھا پہ پٹی لگی ہوتی تو ہم پھر مارا دن اسے دھند دیکھ کر لے دیتے تھے۔ اس گلاب سے کا دروازہ کھول دیتے تو لڑکا پتھر اچھال دیتے۔ اس کا باہر پڑا ہوا گالے کا منہ بڑا گندے نالے سے سر اٹھ دیتے۔ وہ ہم سے عاجز تو ضرور تھی مگر شاید ہم ہی تھے جو اس سے اک تعلق بھی جوڑے ہوئے تھے۔ وہ ہم تھی کہ ہم محض دو چار دھنوں کے لئے اس سے جڑے ہوئے ہیں اور شاید یہی جڑت اسے اپنی بے پرواہی سے جوڑے ہوئے تھی۔

اس ایٹک مجوزف کی روتی بھی اسی طوائف کی جھٹی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ نوازیوں کہ ایک دن میں غم سے ہوا تھا۔ شیعہوں کے سینما میں گیتا نکھائی کا زردہ شو تھا وہ تازہ تازہ بھنگی سے آئی تھی۔ ساتھ ساتھ شادی

ذی صاحب بھی تھے۔ میں یہ سن کر یکنچا چاہتا تھا۔ اب اگر کوئی فلم ہوتی تو میں دھکم پیل کر کے ٹکس جاتا مگر زندہ شہ تھا۔ داخلے کا سارا انتظام دوسروں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ بہت سہارا کہ کہیں سے دو چار آنے ہاتھ لگے جاویں مگر نہیں۔ کوشش بسیار کے باوجود جب کوئی دروازہ کھلا دکھائی نہ دیا تو آخری "لڑائی" کے طور اس بے سرو سامان غریبی کا بے کھٹکے کا دروازہ نظر آیا۔

میں اپنے طور ہی ادھر نکل آیا تھا۔ دوپہر کا وقت شو سائز سے تین بجے شروع ہونا تھا۔ دروازہ کھلی گئیں باقی تھے۔ گرمی اور تیز دھوپ سے چٹا ہوا میں اس کی کوفٹری کے سامنے شیشم کے بیج کے پچے آکھڑا ہوا۔ دیکھا تو دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ مطلب کہ اندر کوئی بھارہ کٹ رہا ہے۔ دل کو کچھ حیرت ہوئی کہ دو چار بھارہ کٹے اگر مزید ادھر آ گئے تو اپنی دوٹی چوٹی پٹی آس بندھتے ہی میں بیج سے پشت ٹکا کر نچت کھڑا ہو گیا۔ پانچ دس چندرہ مست بعد بھی جب دروازہ نہ کھلا تو تشویش لاحق ہوئی۔ اندر کچھ بھی نہیں رہی۔ دروازہ بند ہے کہیں کوئی پینڈو ہی نہ ٹکسا ہوا ہو۔ جیسے وہ کہتے ہیں کہ مارنے سے کہیں زیادہ ٹکسینا ہوتا ہے اسی طرح اکثر پینڈو بھی اچھا بھلا پیدا کا کام نہیں نہ کہیں حماقت دکھا کر ان کو دیتے ہیں۔ مزید وہ مست جسے اور دیت گئے تو بڑے بڑے سے برا کھانے گئے۔ کہیں گڑا رہی نہ کھانے۔ پیادہ رہی نہ کھانے۔ ہوسوت ہو گیا ہو۔ دائیں طرف سے کھانا کھانے والی رکھی رہی۔ کھانا کھانے والی رکھی رہی۔ کھانا کھانے والی رکھی رہی۔ اور ایک سالو اسٹار جوان بڑے اعتماد سے باہر نکلا جیسے وہ گھر کا کوئی سامان لینے بازار جا رہا ہو۔ چلی اندر بھی رکھائی دی (یہ نام ہم کے لیے طوڑا ہے دے رکھا تھا) جو اس سے کچھ کہہ سن رہی تھی اس کا بھی انداز کچھ یوں ہی تھا جیسے تاکید کر رہی ہو۔ باہر سے کئی کئی چٹائیوں نے لایا تھا۔ کچھ بچے یا زیادہ کچھ بھی نہ ہوں۔ تازہ تازہ دھلیا اور شعلے کی مریج لانا نہ ہونا۔ میں نے دیکھا کہ وہ میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بھی اسے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہاں سے پچھے اترتے ہی یہ پینٹ شرٹ میں لمبوں والا سالو جوان میری جانب بڑھا میں بھی بچھڑا ہائے پیدہ کینز والے بڑے کھولے تیار کھڑا تھا کہ شاید اندر بھی نے اپنے اس بندے سے میری لوکائی کا پروگرام بنایا ہوا ہو۔ میرے بھانجے کے تیار بھاپتے ہوئے اس نے دروازہ دھری سے مسکراتے ہوئے کچھ بے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک روپے کا گراماں بھانجہ بہار رکھا رہا تھا۔ لوگوں کے بھاگوں کہیں مجھے پکڑنے کی کوئی چال ہی نہ ہو؟ ایک روپے کا گراماں اتنی ہی رقم میں سوچتا ہی رہ گیا اور وہ میرے سر پہ کھڑا تھا۔

کچھ لوگ دھور سے اچھے دکھائی دیتے ہیں پاس بچھی پائیں تو پولیس والے کہتے ہیں اور کچھ یوں بھی کہ فاصلے سے غالتو کہتے ہیں۔ قریب آ جا کیں تو قیمتی سے نکل آتے ہیں۔

یہ بھی ایسا ہی تھا۔ مہولی کسی کی کوٹھری سے نکلنے والے کے چہرے پہ تو عرق انفعال تھا تھا۔ اور شہ عرام کا داری کی اعنت کا کوئی سایہ۔ صاف ستھرا انداز داری کے ذیلے کی طرح نکھرا ہوا چہرہ۔ من بھاؤتی تھل سی مسکراہٹ لیے وہ میری آنکھوں میں بھرائی زبان کا محبت و حرمت بھرا کوئی ابدی گیت گانے آنکھیں اتارے کھڑا تھا۔ جب طرفین آنکھیں مجھ گفتگو ہوں تو نطق کی بغیر ہی بے نری پڑ جاتی ہے۔ زبان کام اور لگا ہوں کی گفتگو میں بڑا تھاوت ہوتا ہے۔ کلام اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لئے الفاظ و بیان کا حسن ظہر۔ وہ دماغی عقلی ذرائع سے نمود و زیاں کا حساب لگا کے شوکارے پیش کرتا ہے۔ نظریہ ضرورت سے مصلحت پس و پیش ہزار حیلوں و کیلوں سے کام لیتا ہے لیکن آنکھیں ایسے بوند و سیلوں سے احتراز کرتی ہیں۔ آنکھیں قلبی باطنی کیفیات کی مظہر ہوتی ہیں۔ نطق کے ذرائع وسیلے ہزاروں لیکن بھری طریق گفتگو ہر ایک سادہ ہوتا ہے اور پھر محبت کی تو کوئی زبان ہوتی ہی نہیں۔

کون جتنا ہے محبت کی زبان ہوتی ہے

یہ حقیقت تو لگا ہوں سے بیاں ہوتی ہے

میں نے بھانپ لے کر خود کو اس بار دوگر کی لگا ہوں کی غبی میں ڈوبنے سے بچا یا۔ وہ تو مجھے۔

UrduPhoto.com

اچانک وہ ایک روپے کا بٹک میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”تہا رے لئے یہ پیسے ہیں۔“

اس کے ہاتھ میں وہ چھپکا چٹکا ہوا روپہ لکیر میں نے ہر بڑا۔ تھوکنے پر چڑایا۔

”میرے لئے۔ تم مجھے یہ کیوں دے رہے ہو؟“

وہ پٹ کر اللہ رکھی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس نے ایسے ہیں کہ میرے بھائی کو دے دو۔ اسے آج کچھ زیادہ پیسوں کی ضرورت ہے۔“

بھائی کے الفاظ میں کر میرے ہاتھوں میں جیسے کسی نے لہر لہا انکارا سی سلاکیاں اتار دیں۔

نے نکتے سے الال پیلے ہوتے ہوئے کہا۔

”اس گھری کو چھٹ بھائی کہنے کی جرأت کیونکر ہوگی؟“

مللی ہی نہایت میرے گال پر دسید کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”کم از کم تمہیں تو ایسا نہیں کہتا چاہئے۔ بہت عمدی بات!“

میرے منہ سے خود بخود نکل گیا۔

”..... اور تم بہت اچھے ہو جو اس کے کمرے سے نکلے ہو.....؟“

وہ چند ثانیے مٹی خیز نظروں سے مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔

”تمہیں یہ بھی نہیں کہنا چاہئے۔“ اٹھا کہہ کر وہ دروازے چوک کی جانب چل دیا۔

نیکہت روپیہ ملنے کی خبر اور خوشی اپنی جگہ۔ مگر اس کھڑی کا بھائی کہنا اور اس پر مستزاد اس پلے نہ پڑنے والے تو جوان کی بھید بھری گفتگو نے مجھے سل پتھر کر دیا تھا۔ میں اسے جانتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ شیعوں کے مندر کے کوکراس کر گیا تھا۔ ایسے میں میری نظر مسیحا کے باہر لگے ہوئے گیتا نظامی کے زندہ پروگرام والے بورڈنگز پر پڑتی ہے جو اس ساری خوشی اور بہتری کی اصل وجہ تھے۔ روپیہ کا سکہ میری منگی میں سنبھالنے کی مانند ڈال دیا تھا کہ یاد قائم ہوتے ہی مجھے دس لے گا۔

میں اللہ رکھی کی کوٹھری کی جانب بٹھنے لگا مگر وہ وہاں موجود نہیں تھی اور وارہ بھڑا ہوا تھا۔ شاید کوئی بھارو آ گیا تھا یا پھر اپنے کسی کام سے اندر گئی تھی۔ اسی تذبذب میں پھنسا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔

خیر، خیر، خیر اور غصے کی دلدل میں پھنس کر شیعوں کا بیٹھنے میں کمر کی دھڑکی سن رہی تھی۔ میں اس کو دیکھ کر پراس مندر کو لے کر جوان کے پیچھے چل گیا۔

میں گھڑائے شیش کے سامنے کھائے کھانے کے کمرے کے پاس جا رہا تھا۔

”بھائی! اس میں تم کچھ کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

اسے شاید یہی خبر آتا تھا کہ وہ وہاں کھانا کھا چکا ہے۔ نہ کھائے سے بے بس کروے۔ میری

آنکھوں میں اپنی لگا ہوں سے جو بے مارتے ہوئے جواب آیا۔

”مجھے ساڑھے چار بجے چرچ میں ایک ضروری میٹنگ امینڈ کرنی ہے۔ میرے ساتھ چلتے آؤ یا تم

بھی ہو، تمہیں اور میں وقت پہنچ بھی پاؤں گا۔“

میں نے مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ یہ تو جوان کرپن ہے۔

”تم کس چرچ میں جاؤ گے۔؟“

”بارو پتھر والے بڑے چرچ میں.....!“

میں نے اس کے پیچھے پلٹے ہوئے کہا۔

”اتنی دُور..... یہاں سے ناکھ پیمٹھ جاتے ہیں۔“

وہ اپنی دھن میں چلتے ہوئے بولا۔

”مجھے زمین اور مٹی پہ چل کر سکون اور سکت حاصل ہوتے ہیں۔ ناگئیں ہوں تو مانگے پہ بیٹھتا کیا معنی...؟“ مزید پچھتے لگا۔ ”بارس پاؤں جاتے ہو کیا ہوتی ہے؟ گھوڑے جیسی طاقت!۔ اور گھوڑے کو یہ طاقت اس لئے حاصل ہوتی ہے کہ وہ کسی مانگے پہ نہیں بیٹھتا کہ جس کے آگے کوئی احمق انسان نہیں ہو۔ انسان ہو یا جانور چوپایہ بیڑ پودے پہاڑ۔ یہ فطری توانائی پاؤں جڑوں کے ذریعے زمین مٹی سے اور عقل خلیفہ اپنے سر چوٹی سے آسمان اور فضا سے حاصل کرتے ہیں۔“

میں نے پہلی بار اپنے اس دوست اور استاد سے زمین اور مٹی کی برکات و حکمت کے فلسفے کو سننا سمجھنے کی اپنی سی سعی کی۔

وہ مجھے کشاں کشاں لینے پکھری کی جانب بڑھا رہا تھا اور میں اس کے پیچھے کسی ایسے ڈھیلے ہونے کی طرح لپک رہا تھا جیسے کوئی بھولی بھیک ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ لیکن میں وہ لمبے ہاتھ پاؤں والا عمر میں بھی دس بارہ برس بڑا اور کثیر کام بھی تھا۔

پکھری کے پاس پہنچ کر مجھے اس سے بات کرنے کی گنجائش ملتی محسوس ہوئی۔

UrduPhoto.com

پہلے سے پہلے میں نے اس سے کہا تھا کہ میں نے آپ کو اپنی کتابیں دے دی ہیں۔ آپ نے ان کو پڑھا ہے؟

”ہاں جانتے ہیں۔“

وہ میری بات چلتے چلتے یوں لگا جیسے اب ہر جیسی بریک لگانے پہ گاڑ لیا جاتا ہے۔ اس کے آنکھوں میں اک کوئٹہ سا لہرا یا پھر محسوس کیا کہ ایک لنگھنے والا ہے۔ یہ لنگھنا اس کے ثبات لیتے ہوئے گویا ہوتا۔

”بھائی! تم نے مجھے پتا سے کسی قسم کی برائی کرتے ہوئے دیکھا؟“

میں اس شعوری کی کیفیت میں تھا کہ اس سے کچھ پچھنے کی بجائے انہی میں سر ہا کر جواب دے رہا تھا۔

”تمہاری جانناں سی ناگئیں اس لئے سوچتی ہیں کہ تم زمین اور مٹی سے براے راست تعلق رکھتے ہو تمہیں دھرتی ماں کا درد مناسب مقدار میں نصیب نہیں ہوتا۔ انسانوں اور جانوروں کو یہ طاقت تو انہی جڑوں اور جڑوں کے ذریعے زمین سے ملتی ہے۔ پھر یہ قوت تمام جسم میں پھیلتی ہوئی اور ہر حصہ تک پہنچتی ہے۔ اسی طرح اس میں توانائی ذاتی بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ ذرا غور کرو نامہ و مانع میں طاقت ہوگی تو اس سے عقل سوچ سمجھ اور دماغ کے رویوں میں مثبت طریقہ عمل پیدا ہوگا اس طرح وہ شخص آنکھوں اور کانوں سے اس سے ہی کام نہیں لے گا بلکہ باطن کی آنکھ اور دماغی برکات سے بھی آگاہی حاصل کرے گا۔“

میں شرمندگی سے آنکھیں جھکا کر زمین میں گڑا جا رہا تھا۔۔۔ میںیں مجھے احساس ہوا کہ میں نے

چمک رہے تھے۔ یہ پرتے سونے چاندی کے ایسے درقوں کی طرح تھے جو ایسے مازک و نفیس ہوتے ہیں کہ ذمہ منقص کے ہلکے ارتعاش سے بھی لرز جاتے ہیں۔ اس نہ جل و اقب اسرار نے مجھ کو یوں غم غمہ کیج کر رکھا۔

”یہ نیم مہشت مئی؟“ دیکھنا چاہتا اور غور کیا جائے تو کائنات سمجھنے میں مدد ثابت ہو سکتی ہے بلکہ اس کا ہر ایک ذرہ اپنی اپنی الگ پہچان اور اک متحدہ جہان رکھتا ہے اور وہ جہان مکمل اور منفرد ہے۔ یہ مئی جس کی آستہ دھڑھری اور جس نے اس کی توقیر تاثیر سے آشنائی پائی اُس نے اس کے بطن سے جنم لینے والی ہر شے تک رسائی پائی۔“

اتنا کہہ کر وہ ٹھپ ہو گیا۔ چہرہ پہ خمیدگی، غمزدگی سی ٹھنڈی سی ٹھنڈی نیوں کہ جیسے بے دھیانی میں کسی نمر بستہ راز کو افشا کر بیٹھا ہو۔

اپنی حیرت اور اس کی خاموشی سے نکلنے کی وہی طرح میں نے ہر قسم کی بات بنائی۔ میں اس سچی سے ایسی آشنائی کیسے پیدا کر سکتا ہوں جیسے تم نے بیان کی ہے۔ ”

[illegible]

مجھے پتا چلا کہ روبا نہایت کا اور اک بعد کی بات ہے جبکہ ماریت کے لئے خود کو معصوف کرنا پہلا قدم ہے۔ غالی کی خاک سے نسبت پہلے ہے۔ صحبیات اور مابعد الخیرات کے معاملات و مشاغل میں اس سے پہلوئی ممکن نہیں۔ جیسے عشقِ حقیقی کی ابتدا عشقِ مجازی کی خیرگی چڑھنے سے شروع ہوتی ہے۔

[illegible]

سادہ اور تعلیمی پہنچائی، پتھر جی مونی نرم وغیرہ سے خوب گارھی چھن چکی تھی۔ مٹی کی تاثیر طاقت، خلعت و خوبی کی پہچان کچھ ایسا آسان کام بھی نہیں ہوتا کہ دیکھتے ہی سمجھ میں آ جائے۔ یہ بڑی تپیا، تجربے اور شن ماری کا مستقاضی ہوتا ہے۔ ہر ظروف کی گل اس کے ظرف کے مطابق تیار کرنا بھی ایک ایسا کار کرم ہے جو سب سے بڑے "کوڑمگر" کی خاص حمایت سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ مٹی ایسی ملائم اور سخت چیز کو اپنی غلط اور ضرورت کے تحت و حال کر کوئی شکل و وجود دینا کار خداوندی ہے۔ مگر خدا نے اپنے اوصاف و خصائل ابداء و ابداء اپنے اس خلیفۃ الارض کو بھی تو کسی حد تک عطا فرمائے ہیں۔

مٹی سے میری آشنائی جلد ہی ہو گئی تھی۔ شروع شروع میں نے مٹی کو اپنے ہاتھوں سے محسوس کرتا جانا پھر آہستہ آہستہ مختلف نوع کی مٹیوں کی خوشبو سے آگاہی پائی۔ کالی سفید سرخ، ہیلی نیلی، نیالی، بادامی اور نعل رنگی ہر رنگ کی الگ مہک، ذائقہ، صفتیں۔

میں نے اپنی لہک مٹی کو تھ کر چھوئے چھوئے برتن، کھلونے، جانور پڑھنے بنانے شروع کیئے۔ ان کو پکانے کے لئے اپنی الگ بھٹی بنائی آگ لگائی پھر ایک وقت آیا کہ میں باقاعدہ چمک پہنچا۔ اپنی مرضی کا پیالہ بنایا، صاف سے آریا، کاج۔ سب ہاتھوں سے اٹھا کر مٹی پر دھرا، کھجری کی پونچھل کے بالوں والی قسم سے پٹے بنے۔

میں نے ہاتھوں انگلیوں اور پوروں نے مٹی کے لمس کا اور اک حاصل کیا تھا لیکن کبھی بہت دور مٹی کو احساس ہوا کہ مٹی سے ہاتھ آلود کرنے سے کہیں پہلے اس کے "پاؤں گنا" ختم ہو جاتا ہے۔ پاؤں لمبے ہونا چاہئے۔ اس استاد نے مٹی کو سمجھایا کہ وہ ان خاک میں مل کر مٹی بن کر رہے۔ مٹی سے ملنے کے لئے اس پر پادبند چلا کر۔ کچا کچا جیسے پاؤں مٹی کی دھیرے دھیرے ٹکڑے ٹکڑے ہوتی جاتی ہے۔

گرم ہوا نرم صفت اور پختی پختی زمین پر پادبند پانچنے سے اندازہ ہوا کہ اس میں فائدہ ہے بے شمار ہے جس جگہ نقصان نہ ہو سکے کے برابر۔ مسافر سے زمین اور مٹی مسافت اور تنہائی میں آشنائی پیدا کرتی ہے۔

میرا نور دس سے تھل صحرانصف شب۔ ہزار افوں اور ملاموں سے سندھ آغوش۔ خطا باروں سے غم سرشام اور کوہ پیافوں سے پہاڑ سورج سب نصف مہار پہ ہوتا ہے شب سرگوشیاں کرتے ہیں۔ اپنی ہی کہتے ہیں دوسرے کی سنتے ہیں۔ اسی طرح جنگلی ٹیلوں میں بڑے جوگیوں فقیروں دیوانوں اور سنیاہیوں سے بھی یہ جنگلی بیلے ویرانے اجڑی بستیوں کھنڈر کھلے ہاتھیں کرتے ہیں۔ جنگلی جانور، ہاں کے بھڑی مالے درخت موسم تمام کے تمام ان کی حفاظت خدمت و احاطہ پہ آمادہ ہوتے ہیں۔ دیکھو تو اندکورو بالا ان تمام کا قلمی برہور است یا بالواسطہ اسی زمین اور اس کی مٹی سے ہے۔

● سفر شرط ہے مسافر تو از بہتر ہے.....!

جب میں ٹکریں الارض اور فہیم القرباب سینے کے سلسلہ میں لگا تو میرا سہارا گت پورن بھگت کا کنواں
تجویز ہوا جو بارہ پنچر سے خاصا دور ایک ویران سی جگہ پہ خستہ حالت میں تھا۔ میرے استاد نے بتایا کہ اس
کنویں اور اس کے گرد و پیش والا قطعیاً ارض ایک خاص قسم کے اثرات اور اہمیت کا حامل ہے۔ تفصیلات تو
میں بتائی گئیں بس اتنا ہی کہ تم خود چانو اور سمجھو۔ میرا کام صرف یہ تھا کہ راستہ دکھانا ہے ساتھ نہیں جانا۔

[illegible]

ہاں! میں بتا رہا تھا میرا پہلا نئے پاؤں پہلے سترچوں بھرت کے کوئی تکہ کا تھا۔ دوسرا سفر بارہ پشتر سے جلال پور جہاں تک شروع ہوا تو میرے استے نے بارہ پشتر سے انگوٹی (سیانگوٹ سے) ویرہ آباد کی جانب کا سپا قصبہ پہنچاؤ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”جاؤ چھتے جاؤ جب تک دریا سے چناب کا پانی پار نہ کر جاؤ۔ کھجرات پہنچی کر سامنے گاواں والا کے مزار پر سلام کرنا پھر وہاں سے جلال پور جانا پہنچی کر باٹے کے شاہ کے گھر اور پھر کے مسجد کا پوچھ لینا۔ ہار تم جانو اور وہ؟ ہاں! اگر کبھی دلہیں پہنچی پاؤ تو مجھے مل لینا“

یہ سب کچھ نہیں تھا جیسے وہ مجھے کہیں پاس کے گاؤں آگئی یا گولانے کے لئے بھیج رہا ہو۔ اس وقت کے بندے نے یہ بھی نہ پوچھا کہ سچے کوئی دہلی چوٹی جیب میں ہے یا نہیں۔ نچوتے کپڑے حال خلیہ ایسے بے سفر کے لئے موزوں ہیں یا نہیں۔ کھانا پینا شب بھری کا کیا بندوبست ہو گا؟ رخصت سے یہ بھی مراد نہ تھا کہ

اس راہ پہ قدم اٹھانے کے بعد مڑ کر دیکھنے کی غلطی نہ کرنا۔ سفر کے دوران کسی سے لٹ و غیرہ بھی نہیں مانگنی۔ کسی کھیت سے بانٹ سے مولیٰ گا جڑ کو نکالو! امر و نہی و غیرہ چرا کر نہیں کھانے ہاں اگر کوئی چیز زمین پہ پڑی مل جائے یا کوئی اللہ کا بندہ قیام و طعام کی دعوت از خود دے تو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ سڑک کے بچے سفر سے احتساب کرتا ہے۔ ایک پہر سے زیادہ کہیں قیام کی سختی سے منافی ہے۔ اطراف کی کچی زمین پہ درختوں جھاڑوں کو چھوتے ہوئے گزرنا ہے۔"

ان نصیحتوں کے ساتھ مجھے باکساؤ کا دیتے ہوئے کہا۔

”پہل میرے گلے ٹکٹ ٹکٹ ٹکٹ! اگلے ہی قدم مجھے ہریک لگ گئے۔ پیچھے دیکھنے کی ممانعت تھی نہیں کچے پاؤں الف ہو رہا دل میں یہی کہ پہلی زلفت پہ اچھا زار و رام ملا۔۔۔ اچا نکلیت پیچھے سے جواب ملا۔“

”گلے سے بہتر حیوانی مطلق اور کوئی نہیں۔۔۔ لیکن کو یہ حیوان مطلق بہت بھی ارفع نظر آتا ہے۔ یہ واحد مخلوق ہے جو زمین مٹی کے اندر جھانک کر دینشتا لیتا اور نموتا ہے۔ مٹی کو سونگھتا رہتا ہے جو اندر رہے پڑے سب غرائز غصہ، حسد، شہوات اور اس کے اندر کا نظام اسے زمین کے اندر بہت نیچے تک جھینٹے میں مدوریت سے اور بہت اونچے تک کہ اسے ان افکار کا خیال نہیں ہے، جن کو انسان شیا میں آفات آفاق کوئی خاص فائدہ نہیں دے سکتا۔۔۔ جیسا کہ اس کے اندر کھائی ہوئی ہے۔“

”سیدھی کر لیتا ہے۔۔۔ راضی نہ خواہ شکوہ نہ شکایت ایک ہی در کی دروازہ پر دھڑکیں اور ہلتا ہے۔“

پالاک کے برعکس جسے محل سے لئے تھے اگے بٹکے سے ہمیں آگے روانہ تھا۔ یہ پادشاہ بیہل چلنے کا چٹھوڑا چار تو چست ہی گیا۔ پادشاہ کوئی سوئیں نہ لگا سکتا تھا۔ آج وہاں جسے پادشاہ کی طرح شہر اور پھر ملکوں ملکوں میں اپنی آشتی مری اور آوارگی کی وحاس اور زحوم آتا تھا پھر کسی نے فتنے کو آوارہ گرد اور کسی نے زندگی کے حقائق سے سامن نہ جھڑکا تو وہ اب بے خبرا تاب ہوتا انسان۔ کسی نے کچھ اور کسی نے کچھ کتاب و الزام دیا۔ کوئی کیا جانے کہ میں کس لذت فراموشی میں سرشار ہوں؟ لمبے طویل راستوں پر اپنی لگن میں کتنے تھے پالاک بیہل پتے ہوئے میں نہیں نکلیں سے کہاں ہوتا ہوں۔ بچے بچھی ہوئی نرم سدا کی طرح روتی تھی مجھے کیسے کیسے بلک رہے وہی ہوئی آگے آگے وہ حکیماتی اور پادشاه کے نیچے پوئی پوئی سنی لہائی کی جتنی حد تک کی طرح محسوس ہوتی۔

وادی شکی کی راہ کا مسافر اور کسی چھائی کی جانب پلٹتا ہوا اپنے تئذ اور انہوں نے مشتاقی قدم بڑھا تا ہوا یہ کہہ کر۔
بچہ گناہ۔۔۔ ان میں ایک عجیب سی سرسختی ہوتی ہے۔

کچھ خبر نہ ہوتی کہ کتنے شب و روز چلتا رہا۔ کھانا پیا کیسں سویا جا گا ۔۔۔ اوندھیرا سویرا دھوپ بڑھی

سب برابر۔ پتہ سب چٹا سب میں سائیں کا نواں والے کے احاطہ میں داخل ہوتا۔ مقام قاتحہ کے بعد یہاں خوب کمر سپردگی کرتا۔ وقت کشادہ ہوتا تو جلال پور جہاں کی راہ پکڑتا اور نہ یہیں کٹی ہو رہتا۔ شہر میں گلیوں بازاروں میں بے مقصد گھومتا رہتا۔ چناب کنارے چلا جاتا۔ خطے میں چرواہوں کی وٹلیوں ہانسیوں کی گائیں سنتی۔ دو ایک روز خوب خاک خوار ہوتا پھر جلال پور جہاں کی راہ پکڑتا۔ جہاں کھڑی پہیٹا میرا پیارا سا دوست سدا سے میرا منتظر رہتا اور یہیں کہیں میرے حافظہ باؤنٹین بھی رہتے تھے جن سے قلب و نظر کا باقاعدہ سلسلہ کچھ عرصہ بعد شروع ہوا تھا۔

ایک آدھ روز بعد واپسی کا اذن ملتا تو وہی جانی پہچانی راہیں راستے وہی شجر و خمر لہی تالے دیریا پل۔ سرسراتی نواں اشک و پیریں آسودہ نا آسودہ موسم۔ پتھراتے طہیز بھانت بھانت کے لوگ۔ میرے سنگ سرکتی ہوئی رسوائیاں طرح طرح کی تڑتالی ہوئی ہانسیں اور جہاں سب پہ مستراؤ گھر والوں کے جوتے کھومڑے 'لعن طعن اور.....!

ایک اداوان کا وقت آرام۔ گھر والوں کے غصہ و انتقام میں دم جاتے ہی پھر بھی کہیں پرکھم تھا اور پتھیر و تپ۔ کبھی کبھی گھولنے والا لہو لہی۔ زنا و زانیہ نہیں کہتے۔ ان کی آنکھیں پھوٹی اور پتھرتے ہوئے ہیں۔ کبھی دل چڑا دیوں اور کبھی دل سے غم میں جبرائے کامت مٹاؤں سے ہی آتا ہے۔ اٹلی لاچھری بھرات تک گھر سے جلال پور جہاں کا دہلہ پا چوہہ سطر نوکر رہتا اس دوران میں اپنے "خسن آوارگی" کی کوششوں میں گزارتا رہتا یا پھر اپنے اس سیاسی استاد دوست کے ساتھ مختلف مشاغل میں رہتا..... زیادہ تر ہم کا لگے پارک میں مختلف حصوں کا لٹنے چلنے پھرنے پر ہی پڑا ہوا ہے۔ جیسے جیسے اب ہر روز جیسے جیسے اب ہر روز کی طرف بھی لکھنا موقوف ہو چکا تھا جس سے میں پیسے بڑا کرتا تھا اور جس کے "وسیلہ باجیلہ" سے مجھے یہ مرد پر اسرار میسر ہوا تھا۔

ایک روز وہ مجھے صحائف آسمانی کے مختلف حوالہ جات سے کائنات اس سے مختلف جہانوں اور دیگر دنیاؤں کے بارے میں بتاتا رہا۔

گڑا ارض اور اس کے گرد لپٹے ہوئے گونا گوں جوہری ہر قاتی 'شعانی' انواراتی لہروں کے جوہر ہیں۔ یہ لہاف ہو ہو ہیں ان میں کیسے کیسے تعمرات ہیں جہاں ہیں نوران کا اسل سل ماخذ سورج کی تمازت اور زمین کی سطح کے مٹا مٹسی ذرات ہوتے ہیں۔ اس مٹی کے ذرات کے سامنے یوں ہلکے اور سرخحرکت ہوتے ہیں کہ وہ خلا میں اک غبار کی صورت لہرے لپٹے رہتے ہیں۔

یوں لگتا میرے اس دوست کا پسندیدہ موضوع دھرتی تھا۔ زمین اجواک منبعِ مٹی ہے جس میں رنگِ پانی اور ہوا بھی کسی حد تک شامل ہیں۔ مٹی کے موضوع پہ وہ پہروں جھٹ کرتا ہوا نہ تھکتا تھا۔ مٹی اور مٹی۔۔۔ مٹی مٹی مٹی خود مٹی کا باطن چکا تھا۔ یہاں تک کہ مٹی نے مجھ پہ دھیرے دھیرے اپنے مزید اصرار و اوصاف کھولنے شروع کیئے۔ تب میں نے دیکھا کہ مٹی مجھے یوں لیے لیے پھرتی ہے جیسے پلاسٹک کی تھالی کے نیچے جتنا طیس گھمائے سے اوپر تھالی میں یہ رنگ کی گولی حرکت کرتی ہے۔ زمین کے اندر کی سہری آشنا نیاں اور واشگاف ہوتی گئیں۔ اس کی باتیں زور پئے اشارے کنا نیچے واضح سمجھ میں آتے گئے۔ اس کی اک اک آواز سے نظر و قلب شاد کام ہوئے۔

مٹی مرنے کے بعد دفن کے لئے دو گز جگہ دی جی اسی ہے کہ زندگی کے لئے دیا ہوا چند منٹھی مٹی کا ادھار ہو واپس لینا ہوتا ہے۔ کیا سوزنا کہ دے زندگی کے تو مڑو مٹی اے۔ کبھی جب دوستی ہو جائے تو زندگیوں کو بھی اپنے اندر بلا لیتی ہے، غیبِ خاطر تو اشع کرتی ہے، جھولیاں بھر بھر شرارت دیتی ہے۔

جہاں زہرِ قاتل کی جگہ پر مسرورہ سے ایک اور لڑکی شہل کی تصویر لگی ہوئی ہے۔

۹۔ کئی تار کول والی سڑکوں پر ٹریفک کی حالت بہت ہی براہ کھلاؤ ہے۔

ریجھے گئے اور نہ کوئی پاس سے گزرتی ہوئی کڑی یا پس۔ جس میں ہی اکیلا کہاں رہا؟ کیا کامیلا؟ حسیب نے انہیں ان کی کھنٹی سنی راہیں نظر۔ ہر دکھائی دینے والی چیز سے دیکھ کر اسے کچھ بھی نہ ایسا ہو پہلے دیکھے ہوئے سے مماثلت رکھتا ہو جیسے یہ کوئی اور جہان ہو۔ ہر شخص کے ہمارے جا کے میرے سامنے آئے۔

مست خرام آگے بڑھتے بڑھتے اچانک یہ اس نیچے مازنی سے باہر نکل آتا ہوں جیسے کوئی ایک سرے سے داخل ہو کر گھبراہٹ کی دوسری جانب نکل آتا ہے۔ اچانک روشنی اور منظر کے بدلنے سے اُک چوٹا سیجہ اور مراستہ کی گھاٹا حساس ہوتے ہے۔ سو اُنک زمانہ ہو گزرا کہ میری بھی حالت ایسی ہی رہتی سطر منظر، دنوں صورتوں میں

میں کہیں سے کہیں نکل جاتا۔ کتا ہری خاکی جسم تو منظر پر موجود تھا مگر بھلنی فیہ مرئی دیکر پہاڑوں سے
 پہاڑوں سحر آؤں دور دراز برف داروں کی جانب رجوع کر لیتا۔ میں بیک وقت شش ہفتی دھیان میں
 ہوں۔ یوں میری حس متحیلہ ایسی راسخ رسوخ انگیز اور رسیدہ خاطر تھی کہ بس ذرا جھکائی لی اور جھانچا

اسی استاد خارا فام نے نیکی بہی اچھائی بُرائی اور خوب و گناہ کا اک عجیب سا فلسفہ بیان کیا کہ یہ تصویر اور آئینہ کے دو رخ ہیں کہ ان کے بغیر تصویر مکمل ہے نہ آئینہ۔ ایک پاؤں اس لئے نہیں ہوتا کہ تو اس پر قرار نہیں رکھا جاسکے۔ کوئی عبادت کا نہایت اخلہ کے بغیر اور کوئی بشر گناہ سے گہنائے بن نہیں رہ سکتا (استاذ کے ساتھ) کہ بشر تو ہے ہی "ب" بشر ہے وہ "ب" خیر "اسی شر کی شرابی سے جو گڑر کر ہوتا ہے۔۔۔ اس شر سے شر مشکل لہذا اس سے اسی طور پر بھا کر ناپڑتا ہے جیسے تھی نا ہنجار اور نا ادب و حیا اولاد سے کیا جاتا ہے کہ نہ جانے ماہر نہ پائے رفتن۔۔۔ ویسے مجھے زعم پارسانی سے احساس نا رسائی کہیں بھر دکھائی دیا کہ یہ بعد سے کیونڈے میں رکھتا ہے۔ غرور و غور کھوپڑی کی اوپر دان کھاٹے میں پیدا ہوتا ہے کہ اسے پاؤں کی پستی کے لیے زمین کی مٹی ہی تسلیم ہستی تو دکھائی نہیں دیتی جبکہ بہت اوپر بام شریا کا مبہم کرہ قریب قرین کچھ میں آتا ہے جو مٹی سرابیوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مجھ کو کساری پاؤں اور پیچھے چھٹی خاک پہ رحبان دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ سو بلندی اور پستی اسی فرق اور جزو کے درمیانی فاصلوں کو سمجھنے کے لئے زمین اور آسمان کو جاننا از بس ضروری تھماتا ہے کہ آسمان اعلیٰ ثانی فانی سرائوں کا نام ہے جسے ہمارا شیعوں گری سے دیکھنا سکتا ہے مگر نہ اور بس سے مٹیوں نہیں کہا جاسکتا جبکہ زمین اور مٹی کی خوشبو کشش ہوائی اور اخلاقی اعلیٰ مٹی اور مٹی کو مٹیوں کرنے کے لئے ہوا سے دیا اور مٹی کو مٹیوں میں۔ یہ اپنے بیرونی روپوں کے حوالے سے آپ کے لیے ہے اور آپ کی نیکی ہی ظاہر ہائے اخلہ کے قدم پڑتی رہتی ہے۔ ہر گز گئے تو اس کو آپ شمس سے غور و غور سے دیکھیں گے آپ کے پاؤں اعلیٰ رخ کی گری طور و خون کو ثابت کرتی ہے۔ طرح طرح کے یہ۔۔۔ آسمان سے چاند نہ رفت پڑے سب کر سکتے ہیں کہ وہ اعلیٰ مٹیوں کی اور مٹیوں کی کاجل کوئی کا سبب بنتی ہے۔ اولاد اور گوروں کا اہتمام بھی وہی کرتی ہے۔ غور کریں کہ ہر مٹی جلیبہ والی قطب فقیر نور و ہیش اہرم آقا جی سے پہلوان کیا دان بہ یادان کو بخشی گیانی نردان براہ راست یا بالواسطہ اسی سے ملا۔ سمجھ رہا ہوں جملہ نیکیوں پر ریکڑ اور برغز اور اسی دھرتی کے پروردہ پر پوچھو اور ہیں۔

مجھے بتایا گیا اور کچھ میں نے اپنے تئیں بھی جانا کہ اپنی حقہتی ماں مٹی اور اپنی مجازی ماں یعنی اپنے آپ کی بیوی کو اچھی طرح جانے پہچانے اس کی خدمت ادب اور نچو چاہیئے بن کرین و دنیا کا کوئی دھرم نہ تھا کما حقہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ مادیات اور مادیات کی کوئی اور مٹی مٹیوں کی زمین مٹی کے اندر اپنی مٹی سے سیدھی دھرتی بغیر سر نہیں کی جاسکتی۔

ایک موقعہ پر میں اپنے اس استاد سے پوچھ گیا۔

"دوست اچھے یہ سب کچھ کھاتے جاتے ہو۔ تمہیں اس جہنم کے تیر کس نے ڈالا تھا؟"

وہ بے دھیانا سا کہنے لگا۔ ”جب پیاس کی گار گرا تو کبھی چڑی ہو تو پھر کسی کنویں اور یا کی گھون میں گھسنا
میں پڑتا ہے۔“

میں اپنی عادت بند سے مجبور بول پڑا۔
”گاگر اٹھائے گھونگھٹ کاڑھے گوری کو اگر گھاٹ پاؤں کنویں خالی خشک ملیں اور اپنی بے بسی پہ
لے کے لئے نہیں میں وقفہ کرے آنسو بھی نہ ہوں تب۔“
اب اس کا چہرہ آتش تپاں کا نقشہ پیش کرنے لگا۔

”زور پیش کی نگاہ غولادی برے سے بھی زیادہ ٹپکھی ہوتی ہے۔ جو پڑتے ہی دبلا سادتی ہے۔
میں کی آنکھوں میں اتر کر پورے وجود کو چھید ڈالتی ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ شاہ کے زور ہوا کجہ۔
میں کے پیش ذرہ ذروں عالم کے سامنے زبان اور عاشق صادق کے حضور اپنے دل کی حفاظت کرنی
پاہے۔ لیکن کیا کیا جانے کہ احتیاط کے باوجود بھی کہیں بے احتیاطی ہوئی جاتی ہے۔ مجھ سے بھی ایسے
وقت سر زور ہو چکے تھے جو گستاخی بے باکی کی ذیل میں شمار ہو سکتے تھے مگر تیرے کمان سے نشانہ بن گاتا۔“

UrduPhoto.com

”ایسے سوچ میں غور، یا اور حالت اسے بڑھ کر خود تلاش کر رہے ہیں میں اسی سے ذرا غور زیادہ۔“
”میرا یہ ارشاد غور۔“ اکثر مسافر مسافروں کے لئے ہوتے ہیں لیکن کوئی منزل ایسی بھی ہوتی ہے جسے خود ایسے
مسافر کی تلاش رہتی ہے جو اس کی منزل کا سنگ میل ہوتا ہے۔“

ایک روز مرے کانٹا میں میں اس کے ساتھ تھا وہاں خشک کے ہنگامے پانچھے۔ وہ بھی شاید کسی
مردے کے لئے اسی دار کھڑا ہوا تھا۔ ادھر ادھر کے کاموں سے فراغت ملی تو استاد ایک مقفل کار میں زورم کھولی
کرانہ رلے گیا۔ وہ از رو بند کر کے مجھے پہلی زور کے ایک بچہ پر بنا کر خود کچھ پرے آنکھیں پیچے یوں استاد وہ
تھوڑا جیسے کوئی غم تختہ عدالت میں کھڑا ہوا ہے۔ مجھے لگا پہ پتھرتے ہی ایک زور کا جھکا سا محسوس ہوا۔ اس
نکلت کو شاید جھکا نہیں کہنا چاہئے۔ میں ایک مثال دے کر اس کیفیت کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ دیا
کے سوار پانی پہ چرتے چرتے ایک کو اچانک جھٹکے گئے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ ایسی جگہ کے قریب پہنچ چکا
ہوتا ہے جہاں گلاب کی مہتاب لہروں کی ممداد ہی ہوتی ہے۔ جو اپنے حصار میں داخل ہونے والی ہر شے کو
اپنے گرد وانی مرکز کی جانب کھینچ لینے کی بے پناہ کشش رکھتی ہیں۔ گلاب پیدا ہونے کی بہت سی وجوہات ہیں، تاہم
معدنیاتی تھکن آتی اور چند ایک مادی وارضی بھی ہوتی ہیں۔ جبکہ ارضی وجود میں وہاں کوئی گہرا کھدایا زمینی کٹاؤ
ہو سکتا ہے کہ پانی کا تیز بہاؤ وہاں اپنے راستہ میں کسی زاویہ سے سخت مزاحمت پاتا ہے اور اس کی لہروں اپنے

لرخ میں لٹھا دھپدا کرنے پہ مجبور ہو جاتی ہیں اور کہیں یوں بھی کہ نیچے تہہ زمین میں مدارک معدنیات۔۔۔ جو تو تیا 'گندھک' فاسفورس اور دیگر جاذبات ارضی اپنی کیمیائی لہروں سے گھومنے والے مدو جزو پیا کرنے شخص گھیریاں پیدا کر دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں کبھی افلاکی استقامتیں۔۔۔ مدو میر 'نجوم' سیارو بروج کے اثرات۔۔۔ زہد و مہا طبعی لہروں کے تصادم 'سندروں دریاؤں' سمیلوں اور وسط آبی ذخیروں میں لے غیر متوازن فاضل توانائی کے کوندے گرا کر خلاطم اور انتشار پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ گرا کر آبی چٹیاں 'ہوادروے' 'نبوت گھیریاں' جھکڑا 'آمد حیاں' آتش فشاںیاں 'دولے' بھی اسی نوع کی اصول کارستانیوں کے شاخصانے ہوتے ہیں۔

برہ مادہ جو ارضی جزویات سے تخلیق ہوا اپنی مقررہ مدت کے بعد مٹی 'ہوا' پانی 'نبھرات' اور آگ میں تبدیل اپنی شناخت کھو دیتا ہے۔ امرحق یا کروح اوپر مراعت کر جاتے ہیں۔ مگر بعض جسم جو معدنی تبدیل ہونے پھر بطور میں میل ہو کر واصل امرحق ہونے وہ اپنے اپنے اجسام وہ جوہر کے ساتھ رہا ہوا مسعود موجود رہتے ہیں۔ اپنی ظاہری میات میں وہ جہاں کہیں بیٹھے لیٹے چلے سفر سفر یا کبھی قیام کیا 'ان کی ایک خاص خوشبو' جو اللہ پاک کی خاص عطیہ و عطا کی جان ہوتی ہے ان کے ہر موجود کے کیفیت سے بدلیاں پیدا کیے اور کوئی خیال وہاں قائم نہ کیا۔ وقت و مکان کی کڑھیں کہ کہیں کے کھور کو کبھی طحانہ پائیں۔ اللہ کے ان برگزیدہ بندوں نے جس پر توجہ دی نہ کھانا کھا کھانا اپنے اعمال و خواص میں غافل ہو گئی۔ جس طرح ایسی کوشاں تیر لگیاں انسان کہنے مدارک ہے ہلکتی چٹائیں لیکن اسی طرح نورانی قوتیں کھانے کھانے کی تیر لگیاں ہر انتیں سلا متیاں ہر تیر لگیاں اپنے طالب سادق کے حصول کے لئے وسیلے فراہم کر دیتی ہیں۔

بارگزی واقعات بتاتے ہیں کہ نبی و مہر رسول اور دیگر ولی 'قطب' نوٹ۔۔۔ ج 'تغیر' و 'تبدیل' ہر جہر جہر سے گزرے 'جہاں کہیں قیام و قیلولہ کیا۔۔۔ جس 'ج' کو چھو 'درخت' پتھر پیرا 'سکون' کھٹے جانور کھانا اور دھپائی وغیرہ وہ خوش حالت 'ج' سے دیگر سے بن گئی۔ اس میں برکت 'شہ' و 'جہ' ہوتی۔ ہزاروں ہنگاموں سال گزرنے کے بعد بھی ان کی صفائی تاثیر و توفیر کم نہ ہوئی۔ میں پیرا 'سکون' بے شمار ایسے مشاہدات و تجربات سے گزرا کہ چلتے چلتے اچانک کسی جگہ پتھر یا گندمی اور است و ہر گز سے پاؤں کھڑے ہوئے ہیں۔ عجیب و غریب سکور کر دینے والی خوشبو لے جھڑ لیا ہے۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی ہونے لگا جیسے کسی کے ناوید و ہاتھوں نے مجھے آگے بڑھ کر تھام لیا ہے۔ میرے اعصاب و اذان کو الٹے

کھینچ کر لیا ہے۔ میں بے بس اور بے خود سا ہو جاتا ہوں۔ مجھے اپنے قول و فعل اور اسے فیصلے پہ کوئی قدرت نہیں
 آتی اور یہی اپنی کسی مادی یا جنکی ضرورت کا احساس باقی رہتا ہے۔ زمان و مکان کی قید سے نکل کر میں کسی اور
 جہاں میں پہنچ جاتا ہوں۔ معصوم بچوں کا تخیل کے خواب میں نکلنے کی طرح میں بھی چمن زاروں
 و جہنموں میں نکل لیتا ہوں۔ اس طرح میں کئی جالے اُنہانے بزرگوں اور روحانی ہستیوں سے ملتا ہوں۔
 میں ہر پندہ کیسے کئی زمانے لہ گئے۔ ان کے پاکیزہ شخص کی خوشبو ان کے نورانی پیکروں کی
 برکت سے۔ سبک قدموں کی آہٹ اور سرگوشیوں کا مدھر آہنگ! میری کتابوں کی زینت کی ایک
 محنت ملاقاتیں اور روحانی مکالمے جو بیتے زمانوں کا احاطہ کیسے ہوئے ہیں بزرگوں، علماء، غیر معمولی رجال
 و روحانی مخلوق سے میری ایسی ہی ظاہری یا باطنی اور روحانی وابستگیوں کی زواریں ہیں۔ جن کا اظہار محض کسی
 لفظ کے نکلنے کو بیان کرنا اور یہ واضح کرنا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے مہذب و متعلیٰ خلیفہ کو کبھی کسی نعمتوں، حکمتوں
 و فوقوں سے سرفراز فرمایا کہ وہ ان سے کام لے کر اپنے مالک و خالق کو پیچھے نہیں کی عنایتوں کا شکر ادا
 کرتے۔ اس کی مخلوق کے لئے ہر تخصیص آسانیاں مہربانیاں فراہم کرنے کے لئے کوئی چیز ہے۔
 اور اس کی ہر کھیل باتوں سے عارفوں استغنیوں کا رد کر کے انسانیت کے شکوک و شبہات کو مٹاتا ہے۔

UrduPhoto.com

میری شخصیت کی توفیق الہی سے ہمیشہ انسانیت کی خدمت میں بساط بھر کا رہا ہے۔ سب ملک یہ
 ہے۔ خالق و مآلک کا خاص فضل اور خاصان بندگی کا فیض و تشریف ہے کہ جو بھی مجھے کسی بھی طور کسی
 صورت اور کسی حال میں ملتا ہے اسے اسے اللہ کی حمد و ثناء میں ادا کرتے ہیں۔ شکر و تحسین کے ساتھ لیا۔
 آپ کے تجربے میں ہو گا کہ حسن و دل کے بر کسی کی توجہ دیتے ہیں۔ سرخیاں گویا روتھیتوں کی راہ مار دیتا
 ہے۔ یہاں عمارت و تشریف منظر لہذا یہ کہ ان کی اشیا انگیز مہکتے پھولوں کی خوشبو۔ کسی کا پیار، خلاق
 و روحانی اور خدمت و ادب و غیرہ۔ یہ سب جاکر تو دوسروں کے پاس ہوتا ہے مگر آپ کے پاس بھی تو حیات
 ہے۔ جہاں یہ خوبصورتیوں و خوبیوں کو پہنچانے ان سے مخلوق ہونے اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت ہوتی
 ہے۔ مزید یہاں اگر آپ میں تو صبر و غور و محمل شناسی نہیں ہے تو آپ ابھی کس خام ہیں۔
 غرض گسترانہ میں پائی بات کہانی کی کہاں کہانی مقصود یہ تھا کہ میں خام نہیں۔ میں خاص ہو تو
 میں کسی کی بیانی لہروں سے خوب تھکتے پکارتا ہے اور جب ایک بار طالب مطلوب سے اپنی خاص ہو جا خاص
 میں شامیں سے میں ہو جائے تو وہ بھی اس جہیز مانی ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی جیسے کوئی کھولتی سی آج کل اچیل دریا
 صحرے میں ہوتے ہی اپنی حیثیت کھو کر اسی کی عظمت و وسعت کا جھڑپن جاتی ہے۔

● تین پیار کے لئے قوم بستی !

[illegible]

آئے۔ ادھر چھوٹے سکولوں کی ٹیمیں کرکٹ کھیل رہی تھیں۔ ان سے بچتے بچاتے ہم سڑک تک آ گئے۔
 دیوں منہ کھٹکھٹیاں ڈالے ہوئے جب کانگے پارک کے ریلوے چھانک کے قریب پہنچے ہی تھے تو چھانک
 نے چاسپے نذرے نے سڑک بند کرنے کے لئے چھانکوں کے ساتھ ذہم چلی شروع کر دی۔۔۔ چھانک
 سے گاڑی آرہی تھی۔ ہم دائیں جانب جھکولائے کر بڑی کے ساتھ گاڑی پور کے لاش پہ ہو گئے جدھر آگے
 ایک ہلکے سے موڑ پر ریل بڑی کے ایک مخصوص ٹکڑے پہ ہمارا ڈیرا یعنی ہماری میٹنگ ٹیمیں تھی۔۔۔ پشت پہ
 گاڑی پور سامنے امرودوں کا بانٹا ہو کا ننگے پارک کے جنوب مشرق میں جو ہڑ کے پاس تھا۔ اس جو ہڑ سے ہم
 آتے ڈولے پکڑا کرتے تھے۔ دائیں ہاتھ شہر بائیں طرف نارووال چک امرود جنوں وغیرہ۔!

نہ تو اس نے خود بتایا اور نہ میں نے ہی کبھی پوچھا کہ خاص طور پہ یہی پوائنٹ ہماری میٹنگ کے لئے
 کیوں مخصوص ہے۔۔۔ شہر سے بہت کو ایک الگ تھلک کی جگہ۔۔۔ حقیقت جو ہڑ چتر اور بے قاعدہ سے بنے
 ہوئے۔۔۔ ریلوے ٹریک کے دونوں اطراف تنگ تنگ چمڈنڈیاں جو پیدل چلنے والوں کی ٹھیک سواروں یا پھر
 ٹھوڑوں گدھوں کی ٹولہ گاہیں تھیں۔

یہاں لگے میں اور بھی چند ایک ٹیمیں تھیں جدھر کسی ٹیم کے تحت بیٹوں کی دستاویز تھا مگر وہ
 بہت مجھے ہاتھ نہیں آتا تھا۔۔۔ اس لئے میں نے ان سے بات کی۔۔۔ ان سے قریب قریب وقت اچھے
 سے اس چتر سے ٹریک کے بارے میں جہاں تک میں چاہتا تھا کہ وہ چارو جو کی بنا پہ ٹیمیں کے قابل سمجھا
 جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس سے سنگ پوائنٹ کے بالکل سر پہ آپ ڈالیں والا سنگی تھا۔ دوم سائیکل پہ لوہے
 کا ایک نمایاں بورڈ لٹکا ہوا تھا جس پہ لکھا ہوا تھا کہ یہاں ٹیمیں ٹھہریں گی۔ تیسرے میں ہمارے
 بچے ہزاروں کا ہوتا تھا جس کا اور یہاں ٹیمیں ہزاروں میں کم اور گریڈوں میں زیادہ ہوتا تھا۔ چوتھے ہزاروں کے
 بچے گڑی کے دو ٹیمیں دن پہ کالا رنگ لگا ہوا تھا جیسے کوئی بڑے اہتمام سے باقاعدہ رنگ بھیر کر جاتا ہو۔ پچھے
 چاروں پر گلاب کے رنگ تر پھول پتے بھی آکھڑ کیسے کوٹتے اور اس جگہ سے لڑتے بہت اور دو تین بیٹیاں
 ہار لگھارتی۔ آکھڑ گمان گزرا کہ شاید ادھر قریب کسی بچہ فقیر کا استخان ہو یا کسی کا کوئی عزیز بھائی کے بچے آکر
 ٹھہرے ہو گیا ہو جس کی نشانی کے طور پہ یہ سب کچھ ہو لیکن مجھے کبھی اس سے یہ بات پوچھنے کا موقع نہ ملا۔

آج بھی ہم دونوں یوں ادھر آکر یوں ہمارا جان تھے جیسے کسی سے نہ خبر ہو یا پھر کسی سے بچتے بچاتے
 ہوں اسرا لینے بیٹھے ہیں۔ انہم دونوں اپنے اپنے اندر کے چور کو خوب جانتے تھے اور یہ بھی کہ ہم کن کیفیات
 سے گزر کر یہاں پہنچے ہیں۔ اس طرح کی مابعد الطبیعیاتی غیاب و منسوخی سے جو گزرنے والوں کے ساتھ بھی
 کچھ ہوتا ہے۔ ان کا دم خشک اور چہرے سے نئے ہوئے ہوتے ہیں۔ گویا کئی تنگ اور طبیعت تنگ ہی ہو کر رہ

جاتی ہے۔ جب کافی دیر ہم دونوں کی بولتی بند رہی اور بظاہر ایک دوسرے سے بے نیاز، ادھر ادھر روڑے ٹکڑے پھینک کر بیڑا روکے تو کھٹنگوں کی جھلی ٹکڑی بھی میں نے ماری۔

”یا استاد! بھوک اور پیاس سے نہ حال ہے۔ کیا پیٹ پوجا کا بھی کچھ خیال ہے؟“

اُس نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے لٹکتے ہوئے کہا۔

”انسانی جسم میں محض معدہ ہی نہیں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے جن کا خیال رکھنا معدے سے زیادہ

ضروری ٹھہرتا ہے۔“

بھلا میں کہاں چُپ رہنے والا..... کھٹ سے بول پڑا۔

سیانوں نے کہا ہے بھوک و افلاس انسان کو کفر کی حد تک لے آتے ہیں۔ ”پیٹ نہ پیاں نہ نونیاں تے

سُکھے گھاں کھونیاں“

میں نے معنوی شکایت پیدا کرتے ہوئے مزید کہا۔

”نہی اعدا مجھے نہ تو کچھ دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی کچھ دکھائی میرے جڑے بھائی! مجھے کچھ نہ کچھ

چاہیے وہ سامنے، رُخ سے آکر رہا ہوں یا۔ اُس نے کھٹوں کی گاتھیں نکالیں۔“

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ یہی بات میں نے پہلے ہی سوچ لی تھی۔

UrduPhoto.com

ہجرت کی 117 ویں شہنشاہی فلم سامانِ ہجرت

فیصلہ تیار ہو گیا ہے۔ ہجرت سے قبل یا بعد

میرا کوئی راضی بنانے کا وہ خیال ہی نہ تھا کہ کہنے کا۔

”یہ تو مجھے بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ فلم رانا علی کس راضی آ گا۔ پھر اس کا طاق بن کر اس کے

گھر کہاں اور کیوں؟ اور یہ بھی کہ اس شخص پر نمونہ کے خطاب کون ہیں؟“

میں نے تو محض اداانہ حرکت کے لئے یہ پچھلائی چھوڑی تھی تا کہ یہ طبع پر پڑا ہوا کھٹ نہ جیسے کسی

تو بات جھٹکنا ہی تھی۔ کیا کرتا میرا اُس سے کہو معاملہ ہی اگر تھا کہ جو میری جانب سے اشتیاق و انگیزش کے

شواہح ہوتا مگر اس کے ہاں وہی آگ مذہب ناگ بازید و ہزارشت پہ اختتام ہوتا۔ اُس کے مشاہدات میری

مشکلات سے روحانی کچھ ایسی بالید و سچا پہ تھے کہ وہاں تک رسائی پاتے پاتے میری حسی و فکری رو بہرہ کی

کے پر بھرنے لگتے تھے۔ میں بے حس و شش مجھلا اٹھتا۔ تب میری وہ ہیرت کی سوند سے کوئی چونکا، اُسکی

وفا نہایت اور شعوری درماندگی کو چھپا لیتی۔

اُن کی علمی، فکری اور روحانی دانش و بصیرت، انسانی، ملی اور آفاقی فلسفیانہ خدمات کے اعتراف میں جہاں انہوں نے انہیں حکیم الافست، شاعر مشرق، عاشقِ رسول، واقفِ اسرار، آشنائے راز، مریدِ حق، آگاہ اور پتہ نہیں کیسے کیسے القابات سے نوازا وہیں دیگر مذاہب و علوم کے علماء نے بھی انہیں ڈاکٹر اور سر جیسے القابات سے اُن کی قدر افزائی کی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”وہ کلاس روم بچا، لیبارٹری والی بچھلی تھی۔ غور نمٹ سکول کی گراؤنڈ اور ریل کی پڑی والی جگہ۔ یہ سب وہی جگہیں ہیں جدھر وہ پہروں بیٹھا کرتے تھے۔ کیونکہ ہر جگہ بیٹھنے، کھڑے، سونے یا غور و فکر کرنے کی نہیں ہوتی اور علامہ اس راز و حکمت سے کما حقہ واقف تھے۔ نہ ہی ہر کس و نامکس سے دوستی ہر مدرس سے علم اور ہر بزرگ سے باطنی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ انسانوں کی طرح جگہیں، جہتیں، جاناور اور دیگر اشیاء بھی کسی بزرگ کی بخشش سے ہی ہوتی ہیں۔ یہ کسی سوز و محنت سے ملے ہو جاتی ہیں۔ نسبت بڑی چڑا ہے۔ قسمت بدل دیتی ہے۔۔۔۔۔۔“

چلتے چلتے ایک ایسی ٹرک چلی۔ آنکھوں میں آنکھیں گاڑا ہوا کہنے لگا۔

”یہی وقت، اُن کے لئے خاص ہوتا تھا۔ ریل کی پڑی پر اس قسم میں جگہ تھوڑی سی بچے کی چوٹی کیلیوں، جہاں چھپا ہوا ایک شخص تھا۔ اس کا نام علامہ تھا۔ وہاں پرانی سی ٹرک ہوتی ہے۔“

ایک لمحہ میں نے پوچھ لیا۔ ”خاص طور پر یہی جگہ کیوں۔“ سیالکوٹ سارا ہی ان کی گراؤنڈ تھا۔

ہاں ایہ جہاں بھی تم نے کہا ہے کہ ہم دونوں، بہن بھائی، بہتہ نام کرتے ہیں۔ یہ بات میں کیا نہ سمجھا نہیں۔“

تو وہ بھلاتے ہوئے بولا۔ ”لو، کچھ بھائی الگ مثال ہے کہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم جی جانتے ہی ہو کہ تنظیم افلاک کی نور اسرار آفاقی کے مشاہدہ و مطالعہ کے لئے مشاہدہ کا ہیں، سیارہ گاہیں، سورج، چاند، جگہ نہیں بنائی جاسکتیں۔ جیسے قلعے، چھاویاں، ڈیم، ذخیرہ گاہیں، جیلیں، ہسپتال اور عبادت گاہیں ہر عام جگہ پر بن سکتے۔ اسی طرح مضامین خاص پر غور کرنے کے لئے بھی کہیں ایسی خاص جگہ کی ضرورت پیش آتی ہے کہ جگہ پر ارضی اور سماوی استغنائوں کا کوئی واضح اتصال ہو۔ نورِ مثال کی کرنوں کے رنگ، خاص طور پر سورج، سورج، سورج اس جگہ پر ایک خاص زاویہ سے ارتکاز کرتے ہیں۔ یہی پتھر، دیوب اور آئین خاص کا میلان ہے۔ فطری ہمارا سامنے بیڑائی کے قلوب پر۔ کوہِ متناہی کہیں جانب۔ جھیل سیفِ اسلام کا بائیں کان کی جگہ۔ بچے۔ پشت پر خارہ کے رنگ راز۔ یہ سب تشرفات اس جگہ کو ایک مقام خاص بنا دیتے ہیں۔ لیکن طالبِ علم کے لئے کسی درخت کی گھٹی چھاؤں، تنے سے ٹپک آں پاس خاموشی اور خوشوار موسم اس کو پناہ کی جانب رغبت کا باعث بنتے ہیں۔ بحیثیتِ تلمیذ و تصوف، مشاہدات و مشکوفات کے طالبِ علم کے لئے یہ

گوشتہ تہائی کی ضرورت ہوتی ہے جس کی ہر اس سمت اس کے لئے مدد عابت ہو۔ ایسی جگہ کی نشاندہی اسے خود بخود ہو جاتی ہے۔“

”میں دوبارہ پوچھ رہا ہوں کیا پورے سیالکوٹ میں بس یہی ایک جگہ ہے؟“

”ہاں! جگہ پورے ضلع میں یہی ایک خاص پوائنٹ ہے جہاں ارض کے نیچے کے ذروج اور فلک کے ذروج ایک ہی اس کے سرخ پہ اکثر مقابل رہتے ہیں۔ گردہ ارض پہ ایسی جگہیں روز ازل سے ہی مخصوص تھیں۔ کوہ طوندار حراء فلسطین کی وادیاں اور پہاڑ گیارہ کا جنگل چام کھال زرتشت کا الاء ہندراہن پورن بھکت کا کھوہ جھیل سیف الملوک ایکسلا اور کابل کے پہاڑ امیر ولی گیسر کی ویرانی حجرہ شاہ مقیم وغیرہ ہر اوتار تیشہ برہم کی قطب رشی مہاتما کہیں نہ کہیں گیان وحیان عبادت و ریاضت کے لئے بیٹھے۔ مہاتما بدھ شری رام چندر تہی بابا تہی گورو نانک سید وارث شاہ کچھ شاہ عارف لہری شریف شاہ حسین اولہی بہت سے بزرگوں کے بے شمار استھان تھے۔ سرکار داتا گنج بخش کے لئے لاہور میں یہی مہا ایک جگہ جہاں پہ آج بھی رکامزار شریف ہے۔ مخصوص سرکار کے لئے لاہور ویرانے میں منگھم کی چٹانوں میں عبادت اور سرقہ کے قطعہ ارض چھڑ رہا۔ ایسی برگزیدہ اور اوجھانے والی کی حامل جگہیں آفاقی کے دوران طالب و طالبہ کے لئے انتہائی اذکر دی جاتی ہیں۔“

ہم غصہ انہی باتوں میں تین الہا شہباز خان آئی آئے۔ نو باروں والے بارہ ایک پکڑوں والی دکان پہ جگہ بیت آسرا کیلئے ساتھ بغلی تھی سے ہوتے ہوئے قلعہ پہ چڑھ آئے۔ مندر کی جانب قریباً اٹھارہ گز پہ چڑھ کر شہرے نعلی صاف سے کھڑے تھے۔ عقلمندوں کے اچانک سے وہاں کی عمارت و محلات کی بجلی چمکی جھلک دکھائی دے جاتی ہے جبکہ رات کے وقت ابھرتی آدنی روشنیاں اذور جھال میں جھکڑوں کی مانند جھلکاتی ہوئی بڑی بھلی لگتی ہیں۔

اوپر پہنچتے ہی ہم بحر خرابی کے حصار پہ حاضر ہوئے۔ قلعہ عمارت کے بعد ہم وہیں پہ چھوٹی سیالکوٹی بکوں سے اٹھی ہوئی شان و دیوار سے ایک نکاح کریم دراز سے پڑ گئے۔ وہاں خاموش جیسے کبے کبے کے لئے اب ہمارے پاس کچھ باقی نہ بچا ہو۔ کھالے کا قمار یا لہجی آوارہ گردی تھہ پہ چڑھنے کی تھکاوٹ کہ ہم اک ڈوبے کا آسرا کیئے ہوئے اب بے سہارہ سے پڑے تھے۔

ظاہری خار بی عوامل و کیفیات کھلی آنکھوں اور ہوش و حواس دیکھی یا محسوس کی جا سکتی ہیں۔ مگر لہجائی یا بطونی کیفیات و معاملات کی تہذیب و تعمیل اکثر حالات میں جا گئی آنکھوں اور عقل و شعور کی بیداری میں ممکن نہیں ہوتی۔ جیسے پیرت بھر کر کھانے سے ذکار اور فہم کی آمد شروع ہو جاتی ہے یا جیسے محنت و مشقت سے

موندیشیوں سے بھرے پُرے تھے۔ ملکیت کھلیے نوں میں ہریالی بار آوری کیوں نہ ہوتی کہ جموں کشمیر کی سرزمین سے لہانے موسموں اور سہانگیں پڑوائیوں کی بہاریں پرے پاندھے یہاں اترتی تھیں۔ گھمبیرے بانوں کے قافے ارتقا قے کشمیر کی وادیوں سے اُڑتے ہوئے دودی نیکی نہیں پہ لیتے۔ اور جموں کی راجہ جاتی سے دھان پان کی ندی عیرکاں رانی راجہ جاتوں کے پائے لگ کر تہہ چالیاں کے انگ لچھوتے ہوئے اُڑتے بڑھ جاتی۔۔۔ اور عیرکاں ندی کا گھاٹ بھی بڑا سر کھا گھاٹ تھا۔ اس کے کنارے کسی اعلیٰ باری کے چاکر کی گوت کنارہ کی مانند بھل تھے۔۔۔ یہیں پہ دھوبی گھاٹ، گنو گھاٹ، ٹھہ اور ناری گھاٹ بھی تھے۔ یہ سب گنو اور ٹھہر سے قدرے دور مرتیو گھاٹ یعنی شمشان گھاٹ بھی تھا۔ یہاں عیرکاں ندی قدرے گہری اترتی تھی۔ بغل پاٹ میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہیں کنارے نسبتاً ایک اونچے نیلے پہ اونٹلہ مندر تھا۔ یہ مندر کہیں جیتی پرگٹھ کے دھنوں کے اک اونٹلہ حالہ آشرم کے ڈھب پہ تھا۔ اور گریا کریم عروہوں کو آگ دکھانے سنی کرنے کے ڈھنگ ڈھب ہون کرنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ یہ مندر نما آشرم یا آشرم نما عروہ اور پر سے کہیں سبھا دھرتی کے اندر تھا کسی خاص طریقہ سے عیرکاں ندی کی اک آجیو نیچے تہہ خانوں سے جو گزرتی تھی۔ جس سے پوتر پانی سے لہر مٹنے والے پتلوں کی مٹی کی گودھی بن جاتی تھی۔ ایک تہہ خانہ میں ایک ناسرورہ کارخانہ تھا۔ جو پوتر پانی کی سیوں کا دھن والے پانوں اور گودھی کی پانوں اور مسالوں سے گودھی کی پھول راکھ گوند کر چھوٹے پھولے بنتے تھے۔ اس دور میں دست پرستی تو اپنے عروج پر تھی۔ جس سے گودھی کے ساتھ ساتھ اک خاں ہندوؤں کی توہم پرستی اور چھت پانہ پرستی بھی اختیار پھیلی۔ یہاں کے یہ کارخانہ تہہ خانہ پوتھوں کی اک خاص گوت سے نکلتے تھے جو ہندوؤں کے گودھی کے پینہ قدرتی فن سے ایسے پانہ خانے پانے گزرتے جن کی شکل و صورت اتنے سنسکارت سے انہیں دکائی دیتی۔ مندر کے پر اسر تہہ خانوں کے پانے پانے گزرتے تھے مختلف مراہٹل سے گزرتے۔ راجہ راجن چڑھایا جاتا عیرکاں ندی میں مل اٹھان کر دیا جاتا تھا۔ اک خاص سبھا بن کر ہون لیا جاتا۔ سہاگشی کے چار گودھیوں کی کھلیں اور اگلے جنم کی خوشگوار زندگی دھیلے پیسے بنو رہے جاتے۔ ان عیسائی پتلوں کو پوس گودگان خرید کر اپنے گھروں کے مندروں میں رکھ دیا جاتا۔ ان کی صورتوں کے ساتھ ساتھ ایسے اور پھر ان کی پرستش پوجا بھی ان کا روزمرہ بن جاتی۔

اس اونٹلہ مندر کے گودھے اندر سے پر اسر اونٹلہ خانوں میں کچھ ایسے چھوٹے پتلوں کے گودھے گودھے جو صرف اور صرف راجہ اور راجہ جاتی کے بڑے مندر کے لئے مخصوص ہوتے۔ انہیں جوشی جوتھ مندر سے حساب سے بنایا جاتا۔ ان خاص خاص پتلوں کی گل میں جہاں شامی شمشان گھاٹ کی راکھ تھی استعمال ہوتی وہیں اس میں گنگا جل ہندوؤں بھری دواؤں مندر بنارس اور دیگر پوتر استھانوں کی مختلف اشیاء بھی شامل

جاتیں۔ بڑے مہمان جو تھی 'پنڈت' بہت ترش اور دیگر فنکار اپنی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے۔ اس کا کرکرم میں جہاں انسانی محنت و ہنر کام کرتے وہیں زور و جواہر سوتا چاندی کانسی وغیرہ بھی استعمال میں لاتے جاتے۔ اصل صورتیں پٹلوں کی گلی۔ سرخ ملانی مٹی کھراچون، گھٹل ریت چیز کی بکٹی گوند، جوت ریشے بانس کی جڑیں۔ ماش کی دال، انگلی کی تاج، گنگا جل، پٹیل جھانڈی گونگیں، اگتاس کی بالوں کی آمیز سے تیار ہوتی۔ چندان مہوہ بڑگدا اور ناریل کا ٹھکی انگی بھسم سے سرخ آٹھ اے کر عیك ندی کے منور تی گھاسے کی منور تی تلائی میں پورنماش کی رات جوگ اشنان دیا جاتا عکس یہ مہا پوٹھ پٹے تختی پھل ہوتے۔ پھر حسب مراتب انہیں سونے چاندی یا کانسی کے بنگے بھاری پتروں سے منڈھ دیا جاتا۔

یہ وہ بہت سنگت پر شارانہ صرف اس شاہی منم خانے کا مہمان پجاری پتھر کا تھا بلکہ اس سے کہیں زیادہ وہ راجہ کا مشیر خاص بھی تھا۔ یوں کہنا چاہئے کہ راجہ کا دایاں بازو اور دماغ ٹھکانہ ظاہر ہے فیصلہ تو راجہ کرتا مگر بھیتر میں سوچتا اور کھوجتا وہی تھا۔ یہ انہی دنوں کی کھتا ہے کہ راجہ اپنے قلعہ کی قیصر کی سنگت میں ایسا پھنسا کہ کچھ بھائی نہیں رہے رہا تھا کیا کرے اور کیا نہ کرے قلعہ کی دیواریں اور سر اٹھائیں اور دھجسم سے اٹھتے جاتیں۔ دنیا راجہ مضبوط سامان مسالہ پورا۔ منہ منہ بکھڑا ہوتا ہے۔ گندہ جلی پوری ہو کر کھاب۔ اس کے باوجود سب کا سب اس کے ہاں اور یہاں ہوتا ہے۔ یہاں ہوتی دپے کھانے کی اور ان کی کاکوئی آپا نے دکھائی دیتا۔ کھیلنے کی مینے اس طرح گزر گئے تھے۔ راجہ اور پجاری کا کھو جھیں اس کا کالی نے بھگتی لیا تھا۔

شاہی مندر میں چند گرہن سے کی متوقع اشوگرزی کو نالے کے کاران ایک سال پر اتھن کا اہتمام کیا گیا تھا۔ راجہ اپنے تمام منم کے ساتھ منہ منہ بکھڑا ہوتا ہے۔ گندہ جلی پوری ہو کر کھاب۔ اس کے باوجود سب کا سب اس کے ہاں اور یہاں ہوتا ہے۔ یہاں ہوتی دپے کھانے کی اور ان کی کاکوئی آپا نے دکھائی دیتا۔ کھیلنے کی مینے اس طرح گزر گئے تھے۔ راجہ اور پجاری کا کھو جھیں اس کا کالی نے بھگتی لیا تھا۔

ناکامی سے دو چار ہوا ہو۔ راجہ کے استفسار پر وہ چہشت ہوا۔

"مہابلی اہم بہت بڑے سنگت میں چھنیں پڑے ہیں۔ یوم ہاتھ ہم سے ہاراش دکھائی دیتے ہیں۔ جو بڑے جو کھم جھنٹ کا کاران بن گئی ہے۔"

راجہ نے قدرے متروہ دہوتے ہوئے کہا۔

"کوئی چارہ کرو مہاراج اکوئی بلیدان۔ دن رکھنا، کچھ تو انتہا پائے ہوگا۔"

پروہت راجہ کا حکم سن کر حریذ گھبراتے ہوئے گزر گیا۔

"مہابلی اہم راج چندرما اور راہو کے بیچ براجمان ہو چکا ہے۔"

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ چوہدار نے جان کی امان چاہتے ہوئے ایک ضروری خبر سننے کی اجازت چاہی۔ اشارہ پاتے ہی وہ گویا ہوا۔

”زیر تعمیر قلعہ کی بڑی دیوار چار منزل تک تعمیر ہونے کے پھر ڈھیر ہو گئی ہے اس کے گرنے سے گلی مزدور اور دوسرے کئی لوگوں کا کلیان ہو گیا ہے۔“

سیالکوٹ شہر کے قلب میں ایک اونچا پہاڑی ٹھکانہ ہے۔ یہ جہہ کیسے وجود میں آیا کوئی نہیں جانتا۔ دور اس کے راجہ نے راج پات سنبھالتے ہی اپنے مشیروں کی تجویز پر اس اونچے اور وسیع جہہ پر ایک کثیر اللہ قلعہ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا اور فی الفور اس کی ابتدائی تعمیر کا حکم بھی صادر کر دیا۔ اس حکم کے پیچھے بھی شاہی مندر کے اس پروہت کی آشیرواد شامل تھی جو اپنے جانے دھپٹاؤں سے شگون اور آخیر وادیتہ قلعہ مگراب درمیان میں اچانک راہوں تک پر اکہ قلعہ کی تعمیر کے متعلق ہر بنا کا مہمگز جاتا جبکہ حسن اور سسے کے قلعہ کئی ایک چاروں طرف نقصان بھی ہو چکا تھا۔ اس منصوبہ کی ناکامی راجہ کے لئے بہت بڑی ہتھی تھی اور وقت قربانی کے کوئی اسے بے تحاشہ تک پہنچا جاتا تھا مگر کچھ عرصہ جتنا مقصد پر زور رائج استعمال کر کے قلعہ کی تعمیر میں مدد ملی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی تعمیر میں ایک بار بھی کسی کی طرف سے کسی کی خواہش بے جا رہی ہو کہ وہ کسی تو راجہ نے دیش بدیش سے بے بے ہنگامی مان 'جو تھی' 'مہندسین' 'مہندسین' مان پاتا تھا۔ تعمیراتی فن و کار کے اصول کار نگہ اسے کہتے تھے۔ تاکہ کوئی ایسا طریقہ کار اختیار کیا جائے جس سے اس کی خواہش کی تکمیل ممکن ہو سکے۔ کئی روز اس نے غور کیا اور مشورے کے بعد ایک پائے سامنے لایا گیا کہ جو قلعہ پر قلعہ تھا اس کی بدھیا یہ بتاتی ہے کہ اس جہہ کے اٹھاؤ بھیڑ پانہ ایسی اشد بدھیا ہے جس کو یہ نہیں چاہتی کہ اس نے چاہی قلعہ یا ایسی قلعہ تعمیر ہو جن میں اس سے سرگ کی ہوئی دشمنیں نہیں استعمال ہوں۔ اسی لئے اس میں وقت بہت آگے نکل گیا۔ قریب راہوں کے چھوٹے موٹے راجہ اس سے بھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ راجہ کے لئے اپنی راجہ عہد کی کے لئے ایک مضبوط قلعہ کی ضرورت شد یہ تر ہو گئی۔

پروہت چٹکت پر شاہزادہ جیسے کئی دلوں سے اپنے اسی عہد کی دلی پوجا استھان پر پڑا ہی تھا۔ شہت جھوگ رہا تھا کہ کسی طرح اس کا کوئی آپا لے رکھائی اسے جائے۔ مہمان پروہت اور راجہ کا مستعد ہونے کی بنا پر اس کے دھار کا مستعد بھی بن چکا تھا۔ ایسی پوری تپا اور انھما جینے کے بعد بالآخر اس کو راجہ آپا لے سوچھا۔ اس سوچھا بہت میں کافی اور شگلی مان کی پوری پوری شگلی اور سہا تا شامل تھی۔ شگلی مان سے شہر دے نے اسے اس ڈر ویش کی شکل بھی رکھا دی تھی جو بیٹوں پٹیلوں کو نہیں بلکہ ایک خدا کے برتر پادشاہ تھا۔

تھا جو کہ تمام عالمین کا رب ہے۔۔۔ جس کے علاوہ اور کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ عیسیٰ مہدی کے ایک ویران سے کنارے پہ وہ نہ جانے کب سے قیام کیلئے ہوئے تھے۔ گھاس پھوس کا ایک چھوٹا سا جھوپڑا اس کی آماجگاہ تھا۔ بے سرو سامانی کا یہ عالم کہ مہدی کا ایک لونا پیالہ۔۔۔ تن کے ٹھیلے منوئے کیلئے بھٹی پرائی سی دلقا کھجوری پیوں و فصلوں کی چٹائی۔۔۔ چمڑے کا ایک ڈھیلا سا تھیلہ جس میں جو کے ستوا کچھ خشک ٹو بانیاں اور کھجوریں تھیں۔ اس کفرستان میں یہ شاید انیٹا اللہ کا بندہ مسلمان تھا جو اللہ کی کسی رضا کے تحت نہ جانے کدھر سے جو کھمبوں کا سفر طے کر کے ادھر پہنچا ہوا تھا۔ اس ویران سمنان ہی جگہ پہ کون تھا جو دیکھتا کہ یہ ہندو ہے یا کسی اور دھرم کا پیروکار۔؟

پروہت و بکٹ پر شاد نے اپنی زرد بدیا اور شکنجی مان کے شر وے کی شنتی سے اسے کھوج لیا تھا اور جان لیا یہی وہ مسلمان مہاشے ہیں جن کے بلیدان سے مجوزہ قلعہ والے بچے کھیلنے کی اویچی دیواریں نیچر گہری بنیادوں پہ اٹھائی جا سکتی ہیں۔ یہ پتہ چلتے ہی اس نے کمال غلٹ سے اپنے خاص کارندوں کو اس درویش کی نگہداشت پہ مامور کرتے ہوئے ریلوے کے چٹوں میں حاضر ہو کر تمام کھانا پانی اور دن رات کی جان توڑ تیار کا ذکر کر کے اپنے خوشخبری دہی کی آواز میں اصرار کیا کہ اس کی کھانا پانی کی سہولتیں آگے آگے رہیں ہوں کہ دیویش کے بارے میں کبھی کبھار سوچنا پڑے گا۔ اب ایک آدھی بیسٹ کے آدھ دیا ہے۔۔۔ راجہ کے قہقہے پہ مزید بتایا کہ کسی مسلمان بھگت آتما کی مٹی پر سمانی پڑے گی۔ قلعہ کی دیواریں اور فصیل کی اتھاویچے کسی ایسے بھگت گیانی کا خون سینہ پر پڑے گا جو ہندو شنتی کا پتھو عام ہے۔ جا کر ہم راج ہمارے بھگتوں اور پراختیاؤں کو خود نکال کر دیں گے۔

راجہ کسی اتھا وچٹا سے ٹھٹھا ہوا پوچھنے لگا۔

”مہادیا ہمارے راجدھانی میں کون ایسا کچھ ہوگا جو ہندو چاتی سے بھی نہ ہو اور بھگت گیانی بھی پر تو کسی درویش بھگت کا خون خرابہ کرنا نہیں ٹوہنا رہتا ہے۔ کیا یہ کسی دھیانی گیانی کے ساتھ لیا ہے نہ ہوگا؟“

پروہت نے دایاں ہاتھ دل پہ رکھتے ہوئے مزید جھک کر کہا۔

”مہاراج! دھرم شاستروں والے اور ہندو سکھ ایسی باتیں کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے دھرم نو سرتی اور دھرم اور دھرم کو اوشم اتم رکھنا پڑے۔ یہ تو اس کے کارن ہمیں دی سے دی بی بی کیوں نہ چڑھانی پڑے۔۔۔ یہ قلعہ کا سرن سندپ بھی ہمارے دھرم اور دھرم دھرم کے حکمران کا ہے اس کے لیے ہم کسی بھی بلیدان سے دریغ نہیں کریں گے۔“

نیرو بار راجہ نے اپنے اس ہنسی مان شاہی مہفت اور مشیر خاص کے اس فلسفہ حکومت کو کمال تحقیر سے
اور مزید استفسار کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس مہا پرش کو کھوجنے کا کیا وطیرہ ہوگا جہاں تک ہم سمجھتے ہیں ہماری راجدھانی میں کوئی ایسا مسافر گمیاں دھمائی نہ ہوگا جس کی ملی جڑ جانے سے قلعہ کی دیواریں اپنی ٹیوں پہ ٹھہریں رہیں گی۔“

”مہاراج کی ہنستہ چھاؤں میں رہتے ہوئے اس داس کو کسی طرح کی کوئی چتا نہیں... میری تہیہ سونچنا کرتے ہوئے دیوتاؤں نے اس مسلمان ٹنچھ کو ہماری راکھن میک ندیا کے زشی گھاٹ پہ آباد کیا ہے۔ دیوتا ہم دوت نے اس کی جانکاری پراپت کر دی ہے۔ بس! اس پندتوں چوتھہ پہ آپ کی آگیا اور آگئی۔ اس سے اس کارکرم کی شروعات ہی جانی چاہئے کہ سے کی منسیا اور جوش کی جیوتی کی یہی ہے جے کارکرم ہے۔“

[illegible]

وہن ماتے موتی ملیں: مانگے ملے و بھیک
راجہ نے تاجہ پر خاموش رہنے کے بعد گہری غفروں سے پردہ ہست کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کی خوش چلایا آنے والے سے کے بارے میں کیا دکھاتی ہے۔ اس مسئلہ پر غور۔“
بلیدان سے قلعہ کی سنگت دور ہو جانے لگی۔ ہمارا راج پات سکھی رہے گا۔“
چروہت نے آنکھیں میچیں ہوئے دلی دلی آواز میں جواب دیا۔

پروہت نے آنکھیں میچے ہوئے دلی دلی آواز میں جواب دیا۔

ہوتی ہے۔ مومن کی قبر بھی قطعہ بہشت نظیر ہوتی ہے جیسے کہ قطر خاص کی خالی شیشی بھی اپنی مہک چیز سے مگی تیز اڑھیں ہوتی۔

رائنھستان ایک وسیع و عریض اور پختہ قطعہ اراض ہے۔ یہاں کا پنک ٹی یعنی بے پورا پانی بہت سوانہ خصوصیات کی بنا پر دنیا بھر میں مشہور ہے ان خصوصیات میں ایک نمایاں خصوصیت یہاں قیمتی پتھروں کی صنعت ہے۔ پیرے جواہرات کی بہت بڑی منڈی ہونے کے ساتھ ساتھ جواہرات کی بنائی کٹائی پالش اور ڈیزائننگ کا کام بھی لا جواب ہوتا ہے۔ قیمتی پتھروں کے بڑے بڑے پارکھ اور کارنگریاں موجود ہیں۔ غرضیکہ پیرے جواہرات کے ہر جز فرید و فروخت 'قدردان شوقین' کا نظلے والے ادھر کا ہی رخ کرتے ہیں۔ یہ راجہ مہاراجوں 'رائہ پوت ٹھاکروں' ٹوچے والے مہندروں اور من موتی ملیح لمیدی مہلاؤں کا دیس ہے۔ بدھ کے کھائے کیلے فینوں والی ٹھکرا میں پانچوں کو چائیک پچا تک کیلے کوئی ہیں کوکھی گردنوں اور جی نیشی ٹوچوں سے بھرا بھرا گڑ والے ٹھاکروں کے پاؤں سے ٹھکڑی کھوسروں کی دھک سے دھرتی بھی کا پچا لے لیتی ہے۔

• ہے پور کا جوہری گن پور کا گوہری •
UrduPhoto.com

منگھڑوں ہی سے پور پنک ٹی کے جوہری بازار میں ایک خاص جوہری علاقہ میں حکام رہا تھا۔ ان زمان میں آج ایک خاص بڑی اور شاہکار دکان پہ ٹوا جو دکان کم اور کوئی پانی میں لڑا دو دکھائی دیتی تھی۔ ایک مہذب سے خانہ نے جسے جسے احترام سے بٹھایا اور میرے اسطو پر پتھر سے لادو لاکر رکھا۔ پتھر طرح پر کٹے کے بعد مجھے اٹھا لیا ہوا کہ یہ پتھر ہم اور ساتھ میں قدرے کم ہے۔ ملازم نے ایک دوسرے پتھر دکھائے مگر جو مجھے مطلوب تھا وہ ٹھکرتا آیا۔ میں وہاں سے آنے ہی والا تھا کہ اندر نکلیں سے ایک بچہ نکلا تو جوان میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ ٹھکی سی مسکراہٹ سے اس نے مجھے آداب کہا اور ملازم کو کچھ اشارہ کرتے ہوئے وہاں سے اٹھا دیا۔

”آپ کھریف رکھیں میں آپ کو اپنی پر علی کو پیش رکھا ہوں شاید ان میں سے آپ کو کچھ پسند داندل جائے۔“

میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ بچی روجاؤں کی سی خوب جامدہی میں کمال کی انفرادی صلاحیت تھی۔ آٹھ دہشت میں تہذیب و تعلیم فراں شاتھے پہ تباہ مندی کی کھڑا مردادہ بانہ۔ مگر بچہ شرم نہ دیا۔ اس کے شانوں پہ جھولتی کاکھوں کی سیاہ بدلیاں بندہ تھا یا کوئی صنم بدخشاں۔ نگاہ و نیت کے مختلف رویوں سے

میں اسے قول ہی رہا تھا کہ اُس وہی قیصر دار ملازم چاندی کی ایک بڑاؤ طشتری جس میں تھقی فیروزے اور کاشغری نکلائے جڑے ہوئے اور دو اسی طرح کے پیالوں میں قبوہ خشک سیوہ جات لیے حاضر ہوں۔ اس جوان رعنا و جاہت نے مجھے قبوہ بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کر لیا۔

”میرا نام ہاشم خان شیروانی ہے۔ جو اہر زانوں کا یہ ہمارا پرانا پُرکھوں کا اُحد ہے۔ اس کے علاوہ ہماری یہاں راجستھان میں کچھ زمینیں ہیں جہاں سنگ امر لکھا ہے جو آپ کے پاکستان شاہجہانی مسجد اور قلعہ کے لیے بھی بھیجا جاتا ہے۔“

یہ باتیں ہوئی رہی تھیں کہ وہی ملازم کچھ ریشمی کپڑے کی تھیلیاں لیے پھر حاضر ہو گیا۔

میں نے مسکراتے ہوئے اُس کی قیافہ شناسی کی داد دیتے ہوئے پوچھا۔

”میرا پاکستانی ہونا تو آپ کو معلوم ہوئی کیا جبکہ میرا لباس شکل و صورت بھی اس کی چغلی کی کھاتی میرے ہاتھ میں مزید آپ کچھ بتائیے جو یقیناً آپ جانتے ہوں گے۔“

اب شاید اُس کے زیرِ لب مسکراتے کی باری تھی۔ وہ مجھے گہری آنکروں سے لگاتے ہوئے بولا۔

”آپ بھٹ متشر ہیں۔ انسانی روحانی اور جسمانی ہونے کی سبب سے کئی اچھوتی ہے۔ مگر اگر تمہارا آپ کو اچھا لگتا ہے۔ آپ یوں ہیں مطلب پرست اور انسان تراشیں ہیں۔“

وہ مجھے مزید نہ تو کہنے کے قدرے خاموش ہوا تو میں نے مزید پوچھ کر یہ پوچھا۔

”اس کے علاوہ کچھ اور۔“

وہ شاید اب اپنا پنڈا اچھڑاتے ہوئے بولا۔

”دیکھئے حضرت اہم دو گاندار لوگ ہیں۔ روزانہ سیکڑوں گاٹھوں سے واسطہ رہتا ہے۔ یہ جو کچھ میں بتایا یہ محض فہم و مشاہدہ کی باتیں ہیں۔ اس میں کسی قیب کے علم کا دخل نہیں۔ چھوڑیے ان باتوں کو۔ یہ دیکھئے؟ یہ تلپنے میرے ذاتی ہیں جو میں کسی کو نہیں دکھاتا۔ اگر ان میں کوئی دانہ آپ کے مطلب کا ہو تو کہہ نہیں سکتیں پیش کروں۔“

میں نے اچھتی ہی گلیوں پہنچتے ہوئے کہا۔

”یہ سب تو ہوتا رہے گا۔ پہلے میں آپ کو تھوڑے دیکھ لوں۔“

اب میں نے اُس کی چند پیدائشی نظریں گزرتے ہوئے کہا۔

”آپ کے لیے راوی جھین ہی جھین لکھتا ہے۔ دھنک کے سب ہی رنگ آپ کے نمروں کے

سارے انگ آپ کے۔ خواب آپ کا شراب آپ کی۔ سوال آپ کا جواب بھی آپ کا۔ سونے کا چاندی آپ کی۔ پیغم آپ کی باندی آپ کی۔ تھینے آپ کے خزانے آپ کے۔
اُس نے میرے منہ پہ ہاتھ رکھنا چاہا۔ میں نے طرح دے کر کہا۔

”صرف آخری بات۔ خواب آپ کے جذبات۔“

میں نے آگے بڑھ کر اُس نے اپنا ہاتھ میرے منہ پہ رکھ دیا۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی جو بنی ہوئی تھی۔
وہ نے اس وعدہ پہ ختم ہوئی کہ ہم رات کا کھانا فورت کے ایک وچھیرین ہوٹل میں اسٹے کھائیں گے۔
میرا خیال تھا کہ کھانے پہ اُس کے ہر اوکھ ہم خیال دوست بھی ہوں گے جن کا خصوصی ذکر اُس نے
وہ پہر کی ملاقات میں کیا تھا۔ میں ہوٹل کے لان میں بیٹھا تھا کہ وہ اپنی خوبصورت بلیک کار ڈرائیو کرتے ہوئے
میرے سامنے پہنچی گیا۔ بلیک شریٹ سیاہ و نرو زراور مردانہ کٹارف میں وہ کوئی فریج شیز او ہی ٹک رہا تھا۔
میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ السلام علیکم کہتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔

”خانی صاحب آپ سے دوبارہ مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ آج کا دن میرے لیے خاص ہے۔“

UrduPhoto.com

سرور انگیزہ۔
میرے لیے یہ بات اچھا ہوئی کہ اُس نے مجھے خان صاحب کہہ کر مخاطب کیا جو میں نے اُسے اس
عمل خلاف نہیں کیا تھا۔

”آپ کو میرا نام ہی ہوتا کیسے معلوم ہوا۔“

وہ میرے سامنے کرسی پہ بیٹھ کر بولنے لگا۔

”آپ نے اپنے ہوٹل کا بتایا تھا۔ اتفاق کہہ لیں کہ وہ ہوٹل ہمارے ایک عزیز کا ہے۔“

اتفاق کہ آپ بھی شیردانی پٹھان ہیں اور ہاں آپ کا سامان وہاں سے بننا کر گھر پہنچا یا جا چکا ہے۔
کھانے کھاتے ہوئے وہ مجھ سے ہم کلام تھا۔

”خان صاحب! مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ اٹھائیس سال میں میرے حوالے سے

حوالات چلا ہو چکے ہیں کہ انہیں بیان کرنے کے لیے لگ بھگ اتنا ہی عرصہ درکار ہے۔ آپ سے ملنے آئے

یوں لگا جیسے آپ ہی میرے وہ گھٹن ہوں جن کے پاس میرے نا آسودہ سوالوں کے جوابات ہوں۔“

انہو کے اندھے پن کو دودھ کر سکتے ہوں۔ آج وہ پہلا جب آپ میرے ہاں سے تشریف لے گئے تھے۔

جب سی سرشاری یا ندہ ہوئی کی کیفیت میں اُنکو کراپنے کمرے میں چلا آیا۔ سمجھیں کہ میری ذات کی خصوصیت

کرا بھی بڑا ادھورا گھمبیر اور سوالات سے بھرا ہوا ہے۔ جب ہم اک آدھے میں ختم ہو جاتے ہیں تو

حکومت خوردہ ڈمی لشکریوں کی مالکداریوں نے ہوئے ہوتے ہیں جو میدان ہارنے کے بعد حالات کے رحم و کرم پہ پڑے ہوئے ہوں۔ میرا یہ کمر اتاری اس پرانی حویلی جس کے ایک حصہ میں ہمارا قلعہ منڈاویہ رہیم ہے بالکل نیچے گہرے تہ خانہ میں واقع ہے۔ سرخ دیوے پتھروں سے بنی ہوئی یہ حویلی صدیوں پرانی ہے یعنی جس دور میں حیر قلعہ تعمیر ہوا تھا یہ حویلی اس کے بعد معرض وجود میں آئی۔ گو قلعہ اور اس کا درمیانی فاصلہ بہت زیادہ ہے پھر بھی حویلی کا تعلق قلعہ سے بہت قریب کا تھا۔

میرے چچا امجد فتح خان شیروانی جو کسی زمانے میں یہاں راجہ تانہ کے حاکم کے لشکر میں عہدہ دار تھے۔ بہادر جرنی و فاکیش اور عسکری تربیت کے بہت بڑے ماہر تھے انہی خویوں کی بنا پر راجا انہیں اپنے قریب تر رکھتا تھا۔ ایک وقت آیا کہ وہ اس کے ذاتی محافظوں اور معتدوں میں شامل کرائے گئے۔ پٹن سنی یا بازار اس زمانہ میں ایک چھاؤنی تھا۔ اس نامزدی حویلی کی زمین اور ارد گرد کا جنگل راجہ کی جانب سے ان کی گرانقدر خدمات کے اعتبار میں عطا ہوئے کہ اپنی من مرضی اور ضرورت کے مطابق رہائش تعمیر کر سکتے ہیں۔ دارے چرکھ نے اپنے مرشد پاک سے رجوع کیا انہوں نے قطعہ زمین ملاحظہ کی اور تعمیراتی جزو دیا ہے سمجھاتے ہوئے حویلی بنانے کی اجازت عطا فرمائی۔ اس زمانے کے حساب سے اس حویلی پر خاصا خرچ کیا گیا یہ سنی محل کی طرح نہ تھا بلکہ ایک قلعہ کی سی تھا۔ اس کے مطابق ہوئی تھی۔ سامان اسی زمانے پتھر چوب لوبا کا مناسب کچھ طیکہ دیا۔ یعنی اس زمانے کے حساب سے ایک ہورا سی حویلی تھی جس کی کوئی کھلی سطح نہیں نہ آتی تھی۔ کام کرنے والے مزدور کارگر بھی مقفل نہیں تھے۔ ایران اور آذربائیجان سے تعلق رکھنے والے یہ لوگ پتھر منہاں غلامی میں تھے۔ ان کے ادھر حاسدوں اور بدخواہوں نے راجہ کے کانوں میں اتنی سیدھی باتیں ڈالیں شروع کر دیں کہ فتح خان آپ کے خلاف سازشیں کر رہا ہے حویلی کی صورت میں وہ ایک ایسا مضبوط کھمبہ قلعہ بنوا رہا ہے جو آپ کے خلاف استعمال ہو سکتا ہے۔ اس کے کنوؤں جب خانوں میں مسلمان پیر فقیر شامل اور جن بھوتوں کے استحقاق بنائے گئے ہیں تاکہ آپ کا راجہ پائے پتہ نہ کر داکر اس پر قبضہ کیا جاسکے۔ راجہ العقیدہ بندہ روپ نے جب مسلمان فقیر جن بھوتوں کا ساتھ دیا تو وہ ان کی باتوں میں آ گیا۔ اس نے ہر ذمہ خود حویلی جا کر تحقیق کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن شاطر سازشیوں نے یہ کہہ کر راجہ کو تحقیق کرنے سے باز رہنے کا مشورہ دیا کہ اس طرح آپ خود اس کے ہاتھ بھوتوں کے ذمے میں پھنس جا دیں گے۔ راجہ کسی نتیجے پہ پہنچ نہیں پا رہا تھا۔ اسے فتح خان کی وفاداری پر ذرا بھروسہ بھی نہیں تھا وہ اسے ہر میدان میں آ رہا چکا تھا مگر دوسرے معتدوں کی باتوں میں بھی وزن دکھائی دیتا تھا۔ راجہ کے ہاتھ کوئی ایسا ثبوت نہیں تھا جس کی بنیاد پہ فتح خان پہ لگا ہوا تھوڑا ال سکتے۔ حویلی ہر طرح سے تیار ہو چکی تو فتح خان نے ایک شہر

موقع پر راجہ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ راجہ نے دیگر مشیروں کی رائے مشورے کو نہیں پشت ڈالتے ہوئے اس کی دعوت قبول کر لی۔ فتح خان نے حویلی گورنر کی شان ہاں کے مطابق آراستہ کیا اور راجہ کی عداوت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ دعوت کے بعد راجہ نے خواہش ظاہر کی کہ وہ حویلی کی مکمل سیر کرنا چاہتا۔ فتح خان نے راجہ کی خواہش کے مطابق حویلی کا کونہ کونہ ملاحظہ میں کھول دیا۔ اب راجہ نے دریافت کیا۔

”فتح خان! معلوم ہوا کہ اس حویلی کے نیچے بڑے شاندار تہہ خانے بھی ہیں اور انہیں بڑے عمدہ سے انداز میں بنایا گیا ہے جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ خاص طور پر بے پور کی زمین نیچے تہہ خانے بنانے کے لیے کچھ خاص موزوں نہیں اور پھر یہاں تہہ خانوں کا رواج بھی نہیں۔ کیا تم ہمیں اس حویلی کے تہہ خانے دکھانا نہیں چاہو گے.....؟“

فتح خان متذبذب سا ہوا۔ ”مہاراج! یہ سب کچھ آپ کی ذمہ سے تقیر ہوا۔ میری کیا مجال جو کسی قسم کی تعمیل میں حیل و حجت کروں۔ لیکن جتنی ہے کہ ان تہہ خانوں میں صرف آپ ہی پہنچ ساریں کسی اور شخص کو وہاں اتارنا مناسب نہیں۔“

راجہ نے نشیمن ہوئے ہوئے پوچھا۔ ”اس کا کیا مطلب؟“

فتح خان نے جواب دیا۔ ”مہاراج! یہاں تک کہ اس حویلی میں آپ ہی پہنچ سکتے ہیں۔“

راجہ نے اس پر غور کر کے کہنے لگا۔

”ہماری راجہ جی میں کون ایسا شخص ہے جسے ہماری اچھیا کے علاوہ کسی اور سے اجازت کی ضرورت ہے؟“

”جیسے جاتا ہو گا کہ نیچے تہہ خانے میں کچھ کچھ ہمارے علاوہ کوئی نہیں دیکھ سکتا؟“

راجہ نے فتح خان سے کہا کہ اس حویلی سے سینے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”مہاراج! راجہ پات میں ایسی بہت سی باتیں اور راز ہوتے ہیں جو صرف راجہ اور راجہ ہی دیکھ سکتے ہیں۔“

مجدد اور جیسے چاہیں۔ میں راجہ کا وہ دارا اور دینا کا بیٹا بنی ہوں۔ آپ مہمان ہیں سب جانتے ہیں کہ سب کے طرف اشارہ کر رہا ہوں۔“

راجہ کے دل میں گرہ چمکی تھی کہ میرے علاوہ کوئی اور نیچے تہہ خانوں میں کیوں نہیں جا سکتا۔

کا مطلب ہے کہ دوسرے کبھی نہ تھے۔ راجہ نے فتح خان کی جانب ’فیصلہ کن نگاہوں سے دیکھتے ہوئے حکم دیا۔

”فتح خان! تم نے ہماری قسم عدولی کی ہے یہ ہمارا ایمان ہے لیکن تمہاری خدمات کی مثال ہم کو دینا

دیا جاتا ہے کہ تہہ خانے کا گودکھ ہمارے سامنے پیش کرو۔“

فتح خان نے بڑے ادب سے پھر وہی کہا کہ اس تہہ خانے میں صرف راجہ ہی جا سکتا ہے اور کوئی نہیں۔ راجہ نے انتہائی غضب سے پوچھا۔
 ”تہہ خانے میں کوئی اور منٹش کمٹش موجود ہے کیا؟“
 ”ایک مہا منٹش کا استھان ہے۔“
 ”وہ کون ہیں؟ کیا ہم انہیں جانتے ہیں؟“

”جی مہاراج! آپ انہیں میرے حوالہ سے جانتے ہیں۔ وہ آپ کے اس سیوک کے بیرو مرشد اور سر بھی ہیں۔۔۔ میں نے فن حرب کے علاوہ جینا مرنا بھی ان ہی سے سیکھا۔۔۔ میں برسوں پہلے ان ہی کی ہدایت پہ آپ کی سینا میں شامل ہوا تھا۔ یہ جو بلی اس کے نقشے تہہ خانے سب ان ہی کے مشورہ سے تعمیر ہوئے ہیں اور وہی بہتر سمجھتے ہیں کہ اس حویلی اور تہہ خانوں میں آپ اور بھگت کے لیے کہاں سلامتی ہے۔“
 ”تم نے اس سے پہلے اپنے کسی بیرو مرشد کا ذکر نہیں کیا۔ کیا وہ ہمارے راجہ کی بات اور اسی دھرتی پہ رہتے ہیں؟“

”جی مہاراج! وہ میری شادی کے بعد سے میرے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ یہیں پہ رہتے ہیں اور یہ بھی انہی کا حکم تھا میں نے ان سے اس بار حوالہ دیا۔۔۔“
 نقشہ نگار کہ راجہ نے اپنے تئیں فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو وہ تہہ خانے میں ضرور جا رہے ہیں اور اس کے بیرو مرشد کی زیارت کر کے کل اس قلعے پہ حاسدوں نے چکر نہ جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن راجہ نے خان کی سگت میں بھمرات کے روڑ حویلی میں ٹھہر گئے۔ اس صبح سے کہیں جو بلی کے چاروں طرف اسی محاذ پر کھڑے تھے۔ راجہ غصوں پر شاگ پڑے بیٹے اترنے کے لیے فتح خان کے ہر نو تیار کھڑا تھا۔ یہ انتظار کن یا گیا کہ کوئی بھی منٹش مورچ ڈھلنے سے پہلے حویلی میں داخل نہ ہو۔

حویلی کے وسیع تھمن کے بائیں کونے میں ایک پڑ پختی کے نیچے ایک نے جھائی دینے والا کٹواں تھا۔ وہی کھڑے بھالے گھڑا دیو اروں کے ساتھ گولائی میں پتھروں کی میز حیدر میں جو کہیں سے تھکے پختی تھیں۔ نیچے اترائی میں چند چوٹی وردانے جو انہی حیرے میں بظاہر دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ایسے بے پانی کے کنویں جو گم کہلاتے تھے راجہ خان کے میدان میں اور نیم صحرائی علاقوں میں صرف بلاے ٹھانڈوں اور آسودہ حال زمینداروں کے ہاں ہی خفیہ طور پہ پائے جاتے تھے۔ ایک دو پاس سے بھی زیادہ یہ جگہ زمین پہ منحصر ہوتا کہ آسانی سے کھودے یا گئے بنانے کے لائق ہے کہ نہیں۔ پانی کی قسم اور گہرائی موجودگی کا اندازہ بھی لگایا جاتا۔ پرنسوں کے گھوٹلوں جیسے یہ ملے بڑے آسودہ خاطر شخص بہتہ ہونے کے علاوہ یہاں کے بے رحم موسموں اور

لیتا۔ وہ کھوئی غاریں، سرنگیں اور کہیں گا ہیں ایسی مہارت نھرتی اور نہر مندی سے کھودتا، گویا وہ پتھر نہ کاے، ہو گئی مٹی صاف کر رہا ہو۔ تاہم اس کا اصل نہر تو بھول بھلیاں تعمیر و تخلیق کرنا تھا وہ ایسی جنگل کر دیں تھیں کاٹتے رہو لیکن داخل ہونے اور نکلنے کا راستہ نہ تلاش کر سکو۔ وہ اندرون زمین کچھ بھی بنانے سے پہلے وہاں نہر کے مطابق سجدہ گاہ ضرور تعمیر کرتا۔ پہلی اذان اور شکرانے کے فوائد ادا کرنے کے بعد ہی وہ اگلا کام شروع کرتا۔۔۔۔۔ ان پہاڑوں کی اکثر اہم پناہ گاہیں اس کے نام پر روزگار فن کی مہربان منت تھیں۔ اس سجدہ گاہ پر مستعد کار کی بظاہر وجہ شہرت اس کا یہی نہر و پیشہ تھا مگر کچھ نفوس خاصان اس کے بالمشئی مقام و منزلت سے کچھ غیب واقف تھے کہ وہ اپنے عصر کا ایک جید صاحب تصرف ہے۔ اس کا شمار اولیائے مستورین میں ہوتا تھا۔

[illegible]

سپاہ گری کا یہ پیشہ کار کی جنگ و جھڈ سے ملنا ہوتا ہے۔ جنگ باز بہت کم میاں و مہمان کے مابین ایک جھوٹے رشتوں کے پیدا ہونے لگے ہوتے ہیں۔ وہ لہجوں اور مذاہن کے حساب سے سالہوں کا تجربہ کرتے ہیں۔ کفن دفن اور قہر کہتے کا ان کے ہاں موبیوم سا قصور بھی نہیں ہوتا۔ روشنی کی کرنوں کو اس کے چہرے اور خوشبو کے پتھر پر ہوں کی مانند ان کا وجود اکہ وجود ہی تو ہوتا ہے۔

وقت کی گزرتے یا معاش کی کوئی ازچہن کہ اس اللہ کے بندے کے مختصر سے خاندان کو وہاں سے ہجرت کرنا پڑی تو ادا ہونے کے ہاتے فتح خان کو ان کا ساتھ دینا پڑا۔ روزی حلال کی ایتھو اور عاتے کی ہچتر چھاؤں کی سٹاٹس انہیں رہنمجان کے وسیع و عریض ہے یہ ہم موموں کے جہ اور برداشت و صبر سے اگلے پنے ریگزاروں تک لے آئی۔ اللہ کا ولی یعنی پاجا کھوتی بابا پیش رفتے اور گھرانے کے چارھوں یوڑھی ایلینہ فتح خان اور اس کی حاملہ بیوی ایک چھوٹا بچہ جس کے والدین فوت ہو چکے تھے۔ اب زیر کفالت تھا۔ دو مدقوق سے ٹھہروں پہ یہ مختصر سا قافلہ کھوے کی رفتار سے کسی ایسی منزل کی جانب مسرت جس کا اس چاچا کھوتی بابا کو ہوتو ہو کسی اور کو نہ تھا اور نہ ہی ان سے سوال و جواب کرنے یا کچھ کہنے سننے کی گنجائش

جراثیم تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کچھ مادیدہ ہستیاں ان متوکل مسافروں کی گھسیٹائی و نظامت پہ مامور ہیں اور ان کو ان کی مخصوص منزل تک پہنچانا ان کی ذمہ داری میں شامل ہے۔ کھوٹی بابا بوزھا اور لاغر ہونے کے باوجود بھی پانز ہند پیدل چلنا پسند کرتے تھے۔ نیچے پتھر ہوں یا مٹی ریت پاؤں یوں پو لے پو لے دھرتے جیسے کوئی معصوم بچہ اپنی ماں کے پیٹ سینے پہ رکھتا ہے۔

تہتہ کی ترانہوں اترانہوں چڑھانہوں اور معبدوں کے درمیانی راستوں پہ لاسے، ہلکھو وغیرہ اسی طرح سر جھکانے ہوئے ہوئے ہوئے گپگپ اٹھائے چلتے ہیں جیسے کوئی گواہا ہوا لوگ تلاش کر رہے ہوں۔ پھو جا کھوجی ہو یا پاتال کھوجا چور کا کھڑا اٹھانا ہو یا زمین کے اندر چھپے ہوئے کسی اسرار کی کھوج لگانی ہو تاکہ نظر اور نیت کی ساری نیاز مندیاں ٹھہریاں پڑتی ہیں۔ تاہم پاتال کھوجا اس سے بہت سوا ہوتا ہے۔ اس کے ہاں اوپر کم اور اندرون زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے مگر حقیقت یہی ہوتی ہے۔ قدرتی طور پہ پاؤں نیچے ٹکروں کے پیڑوں میں ایسے حساس سینسنگس ہوتے ہیں جو دھرتی کے نیچے پاتال تک کی مقناطیسی لہروں کو محسوس کرتے ہیں۔ ان لہروں کی زوہن جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ محسوس ہی تحریرا ہوتی اور مختلف ریڈیائی کیفیاتی اشکال میں تبدیل ہو کر دائرہ اور الگ میں واضح ہو جاتا ہے۔ بالائی ارضی علوم میں ایک بالائی اعداد و شمار جس کی تحصیل یا اکساب ممکن نہیں ہے۔ ارضی و فضا کی سائنس کے علاوہ زمین کی سطح پر فضا کی طبعی پاتال کی جدول بھی ہوتی ہے جو کسی حد تک اکساب سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ القمریونی انہاں اور فضا کی فہرست ہمیشہ شایام فارابی فارابی 'میر و کائنات' وغیرہ کے علوم ہیئت ریاضی 'فلاسفہ نجوم' و نجوم اور علوم ارضی و فضا کی پہلی مقالہ جات 'نقشہ قلمی' لفظ 'جدول' و 'مجلد' سے منقول ہے و فہم و فہم کے علم کدوں میں محفوظ ہیں۔

ارضی اور فضا کی علوم کا ذکر چھڑا تو یہ بھی جانا چاہئے کہ صحرا میں اسٹار ریک ڈائٹ آسمان پہ اسٹار نجوم اور بحر میں اتنی ماہیاں نہیں کہ جتنے علوم گھس اس کثرہ ارضی پہ علم الاسماء کے باطن اور اس کی برکت سے انسان کے لئے آثار سے ملے۔ ان علوم سے کسی انسان کو کتنا فائدہ اور وہ بلا یہ دینے والے کی مشیت اور لینے والے کے مقصودوں اور جس مقدر پہ منحصر ہے۔ آگے بڑھ کر مزید کچھ میں آیا کہ ہر جہان اور طبقات کے اپنے اپنے طور 'قانون اصولی' قدریں 'فلاسفہ' اور علوم ہیں۔ حتیٰ کہ ان پہ نئی 'تغییر' کتابیں اور شریعتیں تک ان کے مطابق اتریں جو دوسرے طبقات دنیاوں سے مضابطہ نہیں رکھتی تھیں۔ بالآخر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمہ اللہ عالمین اور فرقان الحید کو آخری مکمل کتاب کہہ کر دین اور شریعت محمدیہ پہ کمالیہ کی اعلیٰ مہر شہت کر دی گئی۔

میں کئی بار ایسے تجربات مشاہدات سے ہو کر راکہ عالم زویا کیفیات مشہور و مراقبت میں ڈوبا ہوا کہیں

سے کہیں نکل گیا۔ طبقات ارضی و فلکی میں ایسے ایسے جہان جہاں پہلے کبھی رسائی نہ ہوئی وہاں ہر چیز منظر کی الگ کچھ بھی تو ایسا نہ جیسا ہماری دنیا میں ہے۔ ہمارے ہوا پانی آکسیجن کے بنام زندگی کا تصور نہیں۔۔۔ خوراک کے بغیر زندگی نہیں روشنی کے بغیر بصرات نہیں۔ پاؤں دھرنے کے لئے زمین۔ تاک منہ کان ہاتھ پاؤں پھر موسم کے مطابق لباس جوتے۔۔۔ پرندے جانور پھل پھول بنریاں۔ یہ سب محض ہماری دنیا کے تقاضے ہیں ہماری دنیا وی سسٹم انہیں سے مملو ہے۔ دوسری دنیاؤں کے الگ الگ سسٹم ہیں۔ ہم اپنے سسٹم سے نکل کر دوسرے سسٹم میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کمرہ ارض کچھ باہر آپ اپنی ہر ضرورت کی چیز میں تبدیلی لے آتے ہیں۔ مزید کچھ اوپر جا کر ثقل مفقود ہو جاتی ہے۔ اسی طرح زبرد زمین کچھ منزلیں اتر کر تو کشش فلک بھی دم توڑ دیتی ہے۔

ہر اک کام پہ بھٹکا ٹوٹا پٹا پاؤں سے پیچھے زمین کی ٹھن مٹھ ہوا بابا پاتا پاتا کھوجا اجیر کے تار تار اگڑھ کے پہاڑ کے ماحول میں چند جھونپڑوں پہ مشتمل ایک گونڈھ راہ پڑی تو حامد نے بی کو کچھ پریشانی ہوئی تو ادھر سے آواز ڈال دیا گیا۔ فتح خان پیشہ ور سپاہی اور کوئی کام دام نہ کیا نہیں تھا۔ بی کو بیزار یہ سن کر بچے کی آمد اور ادھر۔ حال کہ دو وقت کھانا اب ایک وقت ہو گیا۔ جب اس نے اجیر شہر اپنے چوٹی منڈی میں مزدوری شروع کی تو وہاں سے ایک بار پھر وہاں دھڑک دھڑک کر آئے۔ ان دنوں اس نے اپنے گھر کے ان رات کا واقعہ زب چلنے لگا۔ یہیں محروم مہاں میراں مسین شاہ سے انہی کے ہاں تربت چلنے لگی رات کو ساتھ چلے جبروت چلنے کا حکم ملا۔ بابا گیر و گوہر پھاڑ کی ایک کھوہ میں بیٹھ گئے کہ اس چلنے میں وقت اور دیرت کی کوئی قید شرط نہیں ہوتی۔ میاں میں چاہیں انھار دیں جب چاہیں انھار دیں خادم کا کام تو خدمت میں رہنا ہوتا ہے۔

تار اگڑھ کا پہاڑ ایک آدھ قدمیں کوہ طور سے ہلکی سی مشابہت رکھتا ہے کہ اس کے کسی بھی حصہ پر ان رات کے اک لمحہ خصوص میں عرش بریں سے ایک تجلی اترتی ہے جس کی زد میں جنی بشر جانور پتھر رات بھی آ جائے اس میں اک جذب خاص پیدا ہو جاتا ہے۔ گو یہ پہاڑ کوہ خور کوہ اور ادا کوہ نور کوہ رمت کہیں کہیں عظمت شہرت جلال و جلال نہیں رکھتا لیکن خواہ غریب نواز اور میاں بی مرکار کے تصرف خاص سے اسے بہت سے تحریکات سے نواز دیا۔ میں اک زمانہ سے اس جبرک پہاڑ کا گرویدہ ہوں۔ اس کے آواز آوارہ گردی کر کے مجھے اک گونہ تسکین ہوتی ہے۔ اب تو کالیاں فراتے بھرتے اس کے اوپر تک پہنچ جاتی ہیں۔ پہلے دھنوں میں اس پہ چڑھنا ایسا آسان نہ تھا۔ اس کے اوپر خاص وسیع جگہ ہے۔ میاں صاحب ہزار مسجد دیوان نگر خانہ پولیس چوکی پرانے قلعہ کے کھنڈ رات اور مقامی لوگوں کے گھرانے اور چھوٹا بازار ہے۔

حضرت شریف کے احاطہ میں خُجّرے، فُلکَر خانہ، ساغ گاؤ، سبیل بھی موجود ہیں۔ یہیں قریب فُلکَر کی دو چھوٹی بڑی دیکھیں بھی نصب ہیں۔ فُلکَم میں چھوٹی مگر فُلکَل صورت اور فُلکَر کی تیاری کا طریقہ دینی ازمیر، دُر گاؤ، شریف والا ہی ہے۔ میں نے اُک زمانہ ادھر اس پہاڑ کا خوب مطالعہ کیا۔ مگر حسرت ہی رہی کہ میاں جی مجھے بھی اس چاندِ جبروت کی اجازتِ مراجعت فرمائیں۔ شاید میں اس لائق نہ تھا۔ میں نے اس پہاڑ کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اُک جنون تھا جو مجھے اس کے اندر باہر لئے لئے پھرتا تھا۔ کھو دیں، کھائیاں، دُراڑیں، غاریں۔ ایسے ایسے کوئے کھدے اور بل سرنگیں کہ جن میں شاید کوئی بھیڑ بکری بھی ٹھننے یا ادھر جانے کی ہمت نہ کرتی ہو میں ہاتھ پاؤں کپڑوں کی پروا کیئے بغیر ادھر گھس جاتا۔ کئی بار پتھروں، گوبوں، سائیوں سے پالا پڑا مگر انجام کی پروا کیئے بغیر میں باز نہ آتا۔ بس! یہی پرکا کہ کوئی غار، سُرنگ یا کھنڈہ ایسا دکھائی دے جدھر کسی اللہ کے خوش نصیب بندے نے چاندِ جبروت سے کیا ہو۔ میں دُر اسل یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ صاحبِ چاند اتنا لمبا عرصہ کس مشکل میں بسر کرتا تھا۔ فُلکَم کے طور پر ہی سہی اُس کے خورد و نوش کا بندہ بست اور وہ سب طرح خود کو ڈنیا کی نظر سے مستور کر لیتا کہ لاکھ جتو کے بار جو اس کا کہیں نہ مانے۔

اس وقت کہیں عرض کر چکا ہوں کہ چنانچہ ان کے لیے جو کچھ کہنا تھا وہ یہ تھا کہ ان کے نفس کی مختلف مشقیں ہوتی ہیں۔ ان کو دنیا کو دیکھنا ہے۔ ان کو اس کی کثرت سے دور رہنا چاہی ہے۔ مسلمانوں پر کیا موقوف ہے۔ ان کو دنیا کا تپسیا دھیان کیا ان کا پ عبادت کی صورت اور خدا سب سے بھی مراد ہے۔ موصوم ہوتا ہے روحانی تدابیر کی بلندی اور اپنے جسم و جان اس انسانی خواہشات کی سرکشی سے کئی حاصل کرنے کی خاطر یہ مشقیں ضروری ظہر کرتی ہیں۔ اس کے لیے وہ جس کو دیکھنا چاہتا ہے اس کی نفس چاہیہ ان کے ہی اس اہل ہوتے ہیں جو توفیق و تدابیر کی ان کی پیروی و راہوں پر استقامت رکھنا سکتے ہیں۔

[illegible]

کہتے ہیں کہ سامپ اور چوہہ دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ زمین اور مریہ دیوار آڑاؤٹ
ورخت ہر کوئی انھیں پناہ دے دیتے ہیں۔ مڈی کے سوراخ میں سامپ اور خس کی ٹنی کی آؤٹ میں چوہہ زمین نہیں

ہو جائے۔ سانپ مسمرہ زم سے حواسِ فتل کر دیتا ہے اور چور پکڑے جانے کے خوف سے سر پہ سلیمانی ٹوپی اُڑھ لے مگر میں نے خود کبھی سانپ یا چور یوں غائب ہوتے نہیں دیکھا جبکہ کئی آستین کے سانپ اور بغدادی چور میرے آس پاس ہوتے ہیں۔ ہاں البتہ اللہ کے ولیوں کو کئی مرتبہ منظر سے یوں مستور ہوتے ضرور دیکھا کہ جیسے صاعقہ چوند کر اوجھل ہو جاتی ہے یا انوکھی سی خوشبو کا کوئی لہر اپک بھپکنے میں مشام جاں کو باغِ بہشت کی فضا سے آشنا کر کے کہیں تحلیل ہو جائے۔

ولی جن بھی ہو سکتا ہے بشر بھی ان کے علاوہ کوئی اور مخلوق بھی اس درجہ مقام پہ تقویض ہو سکتی ہے۔ انسان چونکہ افضل المخلوقات ہے اس لئے عام تصور یہی ہے کہ صرف یہ ہی ذریعہ ولایت تک رسائی پا سکتا ہے کوئی اور نہیں..... ظاہرین اور مستورین دونوں اقسام کے ولیوں کے درجات میں بھی کمی بیشی ہوتی ہے ان کی ذمہ داریوں اور خدمات و کار میں کی تفاوت و تقسیم ہوتی ہے۔ جیسے سمندر میں مچھلیاں پکڑنے والے اور اندر مچے سے ٹونگے کی تھیں اور موتی لگانے والے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں..... بحرِ تصور میں بھی کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کچھ اوجھل اور پکڑنے والے اور کچھ اندر اندر آبگیاں لگانے والے۔ ولی کا ایک پیکر بھی ہوتا ہے اور انوری قوم روکنے میں اسے شہنائی باجو کی نمود میں جاتا۔ ولی کے لئے حیات میں خوش چکر کی کارکردگی مقصود نہیں رہتی ہے بلکہ وہی نورِ سرور کے کاروبار ہے۔ ایسے بنو کر رہنا کہ مستور میں چھتا ہے اور چھٹی پہ بھی رہتا ہے۔ مرنے کی طرح پانی اور شہی دونوں مسکن۔ پانی میں رہے تو گیلی نہ ہو اور خشکی میں رہے تو مٹی نہ ہو۔ "ہرام تیری گنگا مٹی" کچھ سب کے پاپ دھوئے کی تو مٹی تو ہوگی۔ ولی بھی بہت گنگا کی مانند ہوتا ہے۔ کہیں سے لچھوئی چھوئی کہہ کر کہہ کر سے مٹی ہوئی کہہ کر کہہ کر مٹی ہوئی چاکلی ہوئی سوتی ہوئی ہنستی روتی ہوئی بحر و شال ساگر میں اپنا وجود ضم کر دیتی ہے۔ سنگ و خشت کی دیوار روشنی کو روک دیتی ہے مگر شیشے کی دیوار اسے راستہ دے دیتی ہے۔ خدا نہیں کہ انہیں دیواروں سے نہ ٹکرا کر کہ تیلوں کرنا ہوں اور فریادوں میں بدل جاتی ہیں۔ سنگلاخ پہاڑوں کے دریاں گھانٹوں میں نرم ٹوپی و انیاں سمیر پوش و اویں سرخساروں کی چاد میں گھسنا۔ چھروں سے سر پختے پختے خود بھی کسی نو کیلے چتر پہ نمایاں سی کاہی میں کریم جاتی ہیں جنہیں پھر بارنور انکھیر آکھو کھاتے رہتے ہیں۔

علم کائنات کے طاہر عالم بھی شاید اللہ کی میں بھٹکتے ہوئے اجرام کی مانند ہوتے ہیں کہ ہر پہلو و انداز ابتدا و انتہا میں جتنا۔ جام گردش گردوں میں لحاظ۔ نٹ نٹے جہانوں خیموں تنکشاؤں سیلاب۔ ستاروں خلاؤں کے مطالعہ میں غرق۔ حیات و کائنات کی صداقتوں حقیقتوں کی جستجو میں یہ بے چین اچھا چکھیرا اُدھر بہت دُور تک نکل لیتے ہیں ایسے کہ کائنات کی ہیئت و وسعتوں میں انہیں اپنا کرہ ارض اک خلیفہ

سے نقطے سے زیادہ دکھائی دے۔ کائناتی مطلقاً عد و مشاہدہ میں یوں لگن کہ خود بھی آفاق و افلاک کا مادہ انجم کا ایک حصہ بن گئے۔..... کرۂ ارض پر رہتے ہوئے بھی وہ خلاؤں فضاؤں میں سانس لیتے۔ ان کی پرواز متخیلہ بہت پورے کی کوڑی لاتی۔ ابطولی تقبیل نفسی اور مخصوص جس وہی ان کی تحقیق و تعلیم میں مدد دیتی۔ مزید برآں ان کی چشم کاوشی زبردگاہیں مطالعاتی جدہ نہیں اور دیگر سالز ہائے مضامین و تقبیل بھی ان کے علم و ادراک میں گیرائی پیدا کرنے کے موجب ہوئے۔ علوم متعارف اور غیر متعارف میں ارق علم شاید علم الافلاک ہے۔ تحقیق کائنات کے بعد یہی افلاک و آفاق ہی تھے جو قائم ہوئے بعد از دیگر جہاں پیدا ہوئے جن میں ارض بھی تھی

فرقان الحمید میں دیگر جہانوں کے ساتھ ساتھ متعدد جگہ ارض و سما کا ذکر بھی بطور خاص ہوا لیکن ارض کو دیگر دنیاؤں جہانوں کی بہ نسبت تشریفات سے نواز کر کھڑکھڑا کر دیا۔ آدم کی جگہ گہ ہونا عرش و فرش کا کعبۃ اللہ اور نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جائے مولود و مدفون ہونا اسی ارض فرش کو زندگ و عرش بنا دیتا ہے۔

مذہب اچھا ہے یا برا پہنچنے ہی ارض تک سے کچھ دکھائی دیتی شروع ہو جاتی ہے۔ ملک کا لوگتا ہوا شہابِ ثاقب آسمانی کا شیلہ سا توڑا کر، وغیرہ سے آنا پھر لاکھ لاکھ کی الماس پر چمکتا ہوا ہوگا۔ یہی عجب عجب لکھارے دکھائی دے گا۔ اس کے پاس سے پہلے ہمارے پاس پہلے کچھ دکھائی دے گا۔ وہی دکھائی دے گا جو اس پہ استوار پیمانہ اس کے سلسلوں کی نشاۃ ثانی کرتے ہیں اور ایک آدمی نے بھی لکھیری جو دنیا کے فلسفے کا نشان ہوگی۔ ترہ دہائے پہل کی فلسفے کا چہرہ دیتی ہے اور دیکھیں کی باتیات بھی انہی غور ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد آگے بڑھتے رہیں تو دیکھیں کہ اس کے ارض کا وجود ایک سراب کی سی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ جب آفاق کی ٹیکر ایلوں میں اٹھا کی غبار کے اک معدوم ذرے سے سارا اس کی کوئی پہچان نہیں ہوتی۔

تحقیق سے معلوم ہوا عرضی افلاکی آسمانی کروہ جانی علوم کسی نہ کسی باورانی طور پر دیگر جالین کے علاوہ عالم باہر اب آشکار ہوا یعنی اس کروہ ارض پہ بھی اترے۔ یہاں کی پونہوں غاروں ٹھکانوں گہری گہروں میں ان کا نزول ہوا ہے ہوا کہ بڑے بڑے نبی و پیغمبروں کی آمد کی توہین سے کہیں دھیان گیان مہادت و مراقبات و عبادت کی طفیل و لطف اسرار ہوئے اور علوم الہیات و کائنات سے مستفید ہوئے۔ سو انیا کے بڑے بڑے پیمانوں کی وجہ شہرت اور بزرگی ایسی برکزیہ و ہستیوں کی۔ سماں سرگرمیاں ظہریں۔ ان بلند و بالا پیمانی سطحاں پہ قدسیوں نبیوں اور دیگر فوری ناری کی آمد و رحلت رہی نہیں سے ہمارے آقا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سفر صہراج شروع ہوا۔ قادر مطلق نے ظاہری ظنی اور کلام سے نوازا۔ وحی اور وحیت انامدی و ظہریاں نبوتیں عطا کیں۔ کشتی نوح کو سلامتی دی۔ پیغمبروں کی قیام گاہ مرقد گاہ چنا و گاہ اور آخری خطبہ گاہ بنایا۔ ان انما

پہاڑوں پہ مختلف مذاہب کی درس گاہیں، آشرم، شفاخانے، قلعے، محلات اور سیارگاہیں وجود میں آئیں۔ یونان کے اشرافیوں، ہندو یوگیوں، بدھ مت بھکشوؤں اور مسلمان صوفیوں کے علاوہ چوروں، ڈاکوؤں، مغرور جرموں نے بھی سبیں اپنی کہیں گاہیں بنائیں۔ بڑے بڑے تاریخی نوعیت کے ہندی خانے، عقوبت گاہیں بھی انہی کا قابلِ تسخیر پہاڑوں پہ بنائی گئیں۔ برازیل میں پہاڑ کی چوٹی پہ یسوع مسیح کا بلند و بالا مجسمہ اُبھرتا ہے۔ کی غاریں، بدھ مت راک، افغانستان اور ٹیکساس میں بدھا کے دیوی شکل مجسمے، اسٹوپے، کوہ بابا کی غاریں، دھارے، کوہ ارارہ، کوہ مہم، جون، چاہ باہل، منیوا کے باغات، حکیم خشب چاہ ماہ، کوہ منگی کے حارات، متھرا وشنو، چوٹی کی سرنگ، رانی کوٹ، پامیان، کوہ سپید، قلعہ اترچیان، کافر کوٹ کا قلعہ، کیرتھر کا قلعہ اور "اولڈ مین آف مونٹین" حسن بن صباح کی پہاڑیوں میں جنت یا اسکر دو میں شگرفورت وغیرہ اسی طرح اور بھی بہت کچھ کہ سب کا انداز ممکن نہیں۔ تہذیب نو سے بہت پہلے ہزاروں آتھوں برس پیچھے بھی جہت کچھ تھا۔ پہاڑوں پہ ایسی ایسی جگہاں جہاں دوسرے سیاروں، جہانوں کی مخلوق اتری۔ نظر بصیر رکھنے والوں پہ یہ انداز نکلا کہ دیگر مخلوقات سے تھن آرض پہ سہ ماہی، پھاڑوں کو ہی محض اپنی آہ کے لئے مقب کیوں کیا۔ یہ اسرار و حکمت جانتے کے لئے کتب نہیں لے رہی، بلکہ مٹی سے مٹی نرم اور پتھر سخت ہے۔ کوہوں اور پوری سالوں کے اس نرم و سخت زمین چاہیے پہاڑوں، مہم سرنگ، یہ کوہ کے طرف سے ہیں۔ پہاڑوں کے قریب و غریب لوگوں و مریض سے زمین کو پکڑے، پکڑے تو ان کہتے ہوئے ہیں۔ مٹی، نوع انسان اور دیگر مرنی، فیر مرنی، مخلوقات کے لئے ہے، یہاں توں نرم ہے، غرائز و معدنیات سے مستحکم ہیں۔ (بے اعلیٰ نے انہیں با استعداد تخلیق نہیں کیا۔ کہہ آرض پہ حیات، وجہ اور نمود، اسباب کے لئے، اللہ کا فرمان ہے، مرنے سے بلکہ آسانی زودانی و تسلسل و تفصیل کی مد میں بھی یہ سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تو درمطلق نے اپنی کمال حکمت و مصلحت سے مخلوقات میں کچھ مخصوص ہستیوں کو ایسی ایسی خاص باتیں
 آتوں علوم و فنون اور صلاحیتوں کا مظہر و مرکزِ امین و اتالیق بنایا ہے کہ اس کی بے نیازی بظاہر و گہر
 دیکھ کر بے اختیار منہ سے بخوان اللہ کھل جاتا ہے۔ اس بخشش و عطائیں حیوانات، نباتات یا حیوانات، نباتات کی
 تخصیص نہ ہوئی۔ کسی کے ہاتھ آہن لگ کر موم ہو گیا۔ کسی کے دست مسیحائی سے کوزہ جیوں اور غریبوں
 شفا اور بقاء ملی۔ کسی کی فکر و بصیرت سے نوشتہ تقدیر بدل گیا۔ کسی کے دم نفس سے نہایت اور فتنہ و نفس
 فرات فرسودہ ظہر سے کسی کی شہادت کسی کی فراست کسی کی طبیعت کسی کا حال کسی کا جہاں کسی کا حال
 اور کسی کا مالی و اسوال۔۔۔ کہیں شہادت اور صبر شکر۔۔۔ کہیں فاقہ و فقر کہیں سیاست و مصلحت اور رہنمائی
 عبادت۔۔۔ کسی کو بحر و بزرگی شناسی عطا کی اور کسی کو آفاق و افلاک کی پہنائی دے دی کسی کو گلشنِ شہادت

تو کسی کو سنگ سہی و ذیبت کی۔۔۔ یہ سب اس ”کل“ کی عطائیں ہیں جو ”نجز“ کو انسانیت اور حقانیت کی تجز و بندی سکھاتا ہے۔

بابا انجانی گپت ذی اللہ تھا۔۔۔ پاتال کھوجا بھی وہ جہاند و تھا۔۔۔ پہاڑوں کا بیٹا پہاڑ پتھر اس سے باتیں کرتے تھے۔۔۔ وہ ان کا ہم راز اور ہم نفس تھا جیسے وہ پہاڑوں سے ہو اور پہاڑ اس سے ہوں۔۔۔ درختوں کی جڑوں کی مانند پہاڑوں کی جڑیں بھی ہوتی ہیں۔۔۔ درخت کی سب سے بلند ٹھک سے اگر باطنی رابطہ ہو جائے تو اس درخت کی جڑ کی آخری ٹوک کی خبر بھی لی جاسکتی ہے جبکہ درخت کی دھڑکن تو پورے درخت میں موجود ہوتی ہے۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ جلال آباد کے نواح سے اجیر شریف تک کا ارضی سفر دراصل بابا کا ایک روحانی سفر تھا جو پاتال کے سم تال سے ہوتا ہوا تارا گندھ کے پارکت پہاڑ پہ پڑنؤ پڑا۔ یہیں بابا کی بیٹی کے ہاں پہلے بچے کی ولادت ہوئی اور یہیں چلہ جبروت چھپنے کا حکم ملا۔ بابا سمادی ذمہ داری فتح خان پہ رکھتے ہوئے۔ ایک روز عشاء کی غماز کے بعد دائیں جانب سے پہاڑ پہ چڑھ گئے۔ خالی ہاتھ لوٹانے مصالے پانی نہ کوئی دل دیا۔ نہ کوئی وقت کا قیاس کہ کب لوٹیں گے یا کسی ضرورت رکھانے کا نسخہ۔ کل کا اس کے لیے کوئی ہدایت نصیر نہ ہو سکتی۔

UrduPhoto.com

پہاڑ پہلے بابا کو بچوں اور بزرگوں جیسے سول پیاس اور خوف سے کاٹنے سے بچنے کو حال ہے کہ اس کی ماں ایک کراچی لگی چادر میں ادا عذاب کرینے سے پرہیز کرتی ہے۔ ہاں اللہ کے بندوں و بیویوں و بچوں آبدانوں کو پہاڑ جنگل صحرا سمندر و زمین کے بڑھ کرینے سے لگا لیتے ہیں تول واکر سیتے ہیں کہ ان کی راہوں میں اپنی جاری محبتیں لچھو لوں گی مائدہ بچا دیئے تھے۔۔۔ فرما دیا کہ جہاں اللہ سے جیسا کہ ہے ساری مخلوق اس سے جیسا کرتی ہے۔ جس کا مقصد حیات اللہ کی رضا حاصل کرنا ہو اللہ کی مخلوق اس کی رضا حاصل کرنے کی جستجو میں لگی رہتی ہے۔ ذرا تصور میں لائیے وہ زمانہ جب اللہ کے پیارے حبیب اللہ کی عبادت و ریاضت کے لیے اپنے کنبے معاش اور گھر مرگڑ سے علیحدہ ہو کر غار حرا میں قیام پذیر ہوتے تھے۔ ایسا بلند اور اشرار گزرا پہاڑ کہ جس کی کوئی حل سیدھی نہیں۔ کوئی راہ راست ایسا نہیں کہ کوئی آسانی سے اوپر پہنچ سکے۔ وسائل و ذرائع کے اس دور میں بھی جذبہ ایمانی اور رتبہ رسول کے بغیر اوپر پہنچنا کچھ ایسا سہل نہیں۔ پہاڑ پتھروں نے اللہ کے رسول کے راستے کو پھلوں سے بھر دیا۔ کہ طہر کوہ ارادہ کوہ آدم خیل نور جیل نور ہالیہ کے بلند و بالا پہاڑی سلسلے۔ علیٰ خدا التماس! سب ہی اشرار گزرا مشکل گھر اللہ والوں کے لیے یہ ملکستان کی زد شمس بن گئے۔

اگلے روز فتح خان کچھ مقامی لوگوں کو لینے بابا کی تلاش میں نکلا مگر تلاش بسیار کے باوجود اس کا نہیں سراغ نہ ملا۔ اس سے اگلے روز اور پھر اک لمبا عرصہ اس کی تلاش رہی مگر وہ جیسے وہاں سے کہیں چلا گیا ہو یا پھر

عالم ہست و وجود سے عالم لاہوت و شہود کے رُخ پہ ڈال دیا جاتا ہے۔۔۔ اس کے طبع و مزاج میلان و مخراب کے مطابق آریہ عناصر میں سے کوئی ایک وسیلہ تکمیل جہد فتنہ کر لیا جاتا ہے۔ کسی کو کوہ و بر میں اور کوئی دریا سمندر میں اتار دیا جاتا ہے۔ صحرائوں و ویرانوں جنگلوں میں ڈیرے ڈلوائے جاتے ہیں یوں کوئی برف زاروں آتش فشاں میں ٹھکانا پکڑتا ہے۔ چہار جہت عالمین صغیرہ میں مشرق آتش افلاماں۔ مغرب بادِ بدامان۔ شمال آبِ استہ اور جنوبِ ثرابِ خست۔ مگر ٹھہریئے ایک تو یہ چہار جہتی نظام ہے مگر اس کے ساتھ دو جہتیں اگر اور شامل کر لیں تو ایک جہتی نظام سامنے آتا ہے وہ دو جہتیں عالمِ زیریں اور عالمِ بالیں ہیں۔ ایک جہتِ الوہی یعنی زمین کے نیچے کا طبقہ پائیل وغیرہ دوسرا عالم بالا یعنی عالمِ افلاک، گردش کو اکب، خارجی دنیا، سورج کے طبقات۔ عرشِ سیر آفاقی و انفاس وغیرہ۔ اپنے اپنے مقامات کے تحت درجات تقسیم ہوتے ہیں مگر چنداں مقربانِ الہی یوں بھی کہ انہیں شش جہاتِ عالم کی رُخسیت سے مکمل و پُرکرم متصف کر دیئے جاتے ہیں۔ کشفیاتِ ثری اور عالمِ افلاک و امثال کی بازویدہ بازگشت سے مستغنی کر دیا جاتا ہے۔ بیہودہ و معبود کے لئے وسیلہِ باجنت اور کئی وسولت کی ضرورت نہیں رہتی۔

اور محفوظ است
UrduPhoto.com

ہفتہ چھ ماہ میں ہمارے چاروں بھائیوں نے اپنے اپنے لئے ایک ایک کمرہ اور انتہار کی ٹپسیں بھی باجنت اور صبر کے پیش پیش شامت پڑ جاتی ہیں۔ انسان دیکھتی آنکھوں کے ساتھ وقت کے سورج کی ٹھلما دینے والی تہذات کے سامنے کھڑا رہنے کا حوصلہ بکڑی لیتا ہے۔ فتح خان اک عرصہ تک کہنے لگے، افغانی بابا کو بھول نہ لیا جائیگا۔ جانتے تو بہت کچھ کہہ کر گزرتا ہے۔ اسی دوران دو بچوں کا باپ تک بن چکا تھا۔ اک گردشِ گلی یا زوزی زوز کا دکانچہ بھیر کہ اسے اپنے خاندان کے ساتھ ایک بار پھر حدودِ پوری کی جانب مراجعت کرنا پڑی۔ پیشہ ورسپاہی کہ کوئی اور کام نہ تھا تو اسے آتا نہیں تھا۔ چھوٹے موٹے راجہ زوزوں میں وقت گزاری کرنا رہا۔ وہ اپنے آبائی پیشہ سپاہ گری میں نام پیدا کرنا چاہتا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ راجہ جانے کی کسی فہم میں ایک جنگجو سردار کی نظر میں آ گیا۔ اس نے اس کے عسکری تیروں، بھی ہوئی صلاحیتوں کو بھانپتے ہوئے راجہ جانی بے پور میں قسمت آزمائی کا مشورہ دیا اور ساتھ اپنے اہلِ حق کی خدمت میں سفارشی پیغام بھی بھیجا کہ یہ وہ شہنشاہِ خدمت گزار بندہ سپاہیانہ نوع ہے سے مالا مال ہے اس کی عسکری فائدہ صلاحیتوں کو مزید اجاگر کرنے کے لیے اس کی رہنمائی کیجئے۔

ٹھا کر خوشییر لکھ جو راجہ و صہیت رائے کا سدھی اور بیہناقی بھی تھا اس سے مل کر بہت خوش ہوا دیکھتے ہی اندازہ کر لیا کہ یہ جواں سال تیز و کاراک دن ضرور اس کا اور ایسا نام روشن کرے گا چنانچہ اس نے راجہ کی

مینا میں اگلی باز کے لڑکوں میں اسے شامل کر لیا۔ فتح خان شیردانی نے اپنے قابل فخر استاد اور محسن کو بر گز مایہ نے کیا۔ اُس نے شجاعت اور حربی حکمت و دانش کے ایسے ایسے کارنامے سر انجام دیے کہ دیکھنے سننے والے انگشت ہندان رو گئے۔ کچھ ہی عرصہ میں وہ اپنے اولین نمایاں جنگجوؤں میں اک نمایاں حیثیت اختیار کر گیا۔ اپنے جیش کا سالار مقرر ہوا تو ناگہاں ایک صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ وہاں بیماری میں مبتلا ہو کر اُس کی پہلی دماغی مغارت دی گئی۔ بوڑھی سدا کی بیمار ساس نے گھر کی ذمہ داریاں سنبھال لیں تھیں دوسری شادی کے لیے اُس کی طبیعت آمادہ نہ تھی اب شاید وہ ازدواجی کھیلوں میں پڑنا نہیں چاہتا تھا اُس کا پہلا اور آخری بیوا اور شوقی میعاد کارزار میں معرکہ آرائی تھا۔ اب جیسے اُس کی تمام تر توجہ اپنے سپاہ گری کے پیشہ پر مرکوز ہو گئی ہو۔ بچوں کی جانب سے بھی مایوسی سی تھی کہ ایک چھوٹا اور دوسرا ڈھیلا ڈھالا جیسے وہ سپاہی کا نہ کسی بنے رہا ہوگا۔ سہوت ہو۔ ساس اور دیگر افراد کے گلے تلے شہباز آمد واری کا آل کردہ راجہ کی رسالہ داری کا ہو کے رہ گیا۔

گھر داری کا پانی اور رنج کا وفادار شجاعت و شہرت کی منزلیں مار رہا تھا اب اُس مقام و منزلت پر متحکم ہوا کہ چاہے اپنے والوں کی باتوں کی مانند پھیلاتا تھا۔ اب وقت کی گرہ نکلتی ہے امر حق کہتا ہے کہ خدا بابا اچانک چمک اٹھ کے پہاڑ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لمحہ کے اُن کی پہلی پہچان اور شناخت جیسے گزشتہ موموں کی باتوں سے ملتی ہے۔ اسی لمحہ کے بعد اُسے ساریاں پڑنے کی بجائے باجی سے اُٹھتا ہے۔ تھا جو کھدائی کے دوران کسی پانی قبر سے اچانک دریافت ہو گیا ہو۔ اس علاقہ کے کسی جوان نے اسے مردہ کے لئے اپنے بچپن کی موت گوارہ نہ کی۔ وہ اوجھرتے بھی تو وارو کہ کسی سے نہ تنگ کی جان پہچان بھی نہ تھی اب جب اسے گھر والے بھی اور کھانڈے دے تو جارو باجی رزاق میں ٹپنے کے گودڑی تیسے میاں میں۔ کبھی کبھی کی مسجد کی نزد میں پڑ گیا کہ اب جو آگے حکم ہو؟

شیر خواہ پندہ سب ماں کی گود میں آسودہ ہوتا ہے تو وہ اُس کے دل کی جڑوں سے اپنی راسخوں کے سر حال ہو سکتا ہوتا ہے۔ کھوئی خاص غور پہ پاتا کہ کھوجا اور وہ بھی ولی اللہ اور عرفی ماتا کے سینے پہ سر رکھتا ہے۔ یوں اکھائی پڑا تھا جیسے کوئی بے باپ بالک سنے جائے میں ماں کی گود گودڑی میں سست سست پڑا تھا۔ بچہ بولتا تھا ایک مائی تو ہوتا ہے۔ اکثر بچوں میں بڑھے اور بوڑھوں میں بچے اُٹے ہوتے ہیں۔ گھر کی منزلیں پرے سے پڑ نکلتے دروازہ ٹکیہ بابا اعظم شاد کے چھوڑے اک چھوٹے سے مکان کے آگے تھکتے سنگ مرمر نشی چٹھ سنگ سرٹا اور دود پتھر کے کچوں سے ٹھپتے ہوئے اک بچے میں ایک بڑا کھانا تھا۔ اُس اب سر بالیں دانہ پڑنے کی دیر ہے۔ بچے کے باپ فتح خان تو اب برسات کے برسات کس گھر میں تھا۔ بچے کو باپ کی شفقت سے کہیں زیادہ بوڑھی مائی کی فہم سے سامنا رہتا۔ جو اُس کی کھانڈی صورت

آرام طلبی کی عادت سے بیزار تھی۔ ہر وقت کچے کھینٹے کی وجہ سے وہ غاصی برہم رہتی اور اس کے باپ سے شکایت کرنے کی دھمکی بھی سناتی۔ ایسا باپ! جس میں پدرانہ شفقت کی از حد کمی تھی اُسے خاندانی ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات عزیز تھیں۔

بچانیر کے پڑھ گڑھ میں اک لمبی جنگی مشق سے فراغت پا کر جوٹھی وہ جو وہ پور پہنچا تو ماس کی جانب سے ایک اشد ضروری پیغام اس کا منتظر تھا۔ دل میں فکر مندی کی گانچہ دبا لے شتم پاشتم بے پور پہنچا جدھر اس کی بوڑھی ماس اپنی شگدستیوں بیماریوں اپنے فواسے یعنی اُس کے بیٹے کی کھانڈری طبیعت اور عجیب و غریب حرکتوں کا گھنڑ سنبا لے اُس کی منتظر تھی۔ لڑکپن نام ہی شرارتوں شیطانیوں کا ہوتا ہے۔ اگر یہ حرکتیں کسی بچے میں نہیں ہیں تو وہ اپنی مر اور اس کے تقاضوں کے حساب سے متوازن نہیں ہوتا۔ مگر اکثر بچوں میں کچھ حرکتیں اور باتیں ایسی انوکھی ہوتی ہیں کہ ان سے افعال برتاؤں چا سکتا۔ ان پر فوری توجہ دھرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُن کی عمر رسیدہ اور زمانہ چشیدہ ماس نے اپنے بڑھاپے اور مستحسن خیالیوں کا دروازہ کھول دیا۔ صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اُس کے بچوں کی نگہداشت اور پالنے پوسنے سے قاصر ہے۔ تہذیب دار فرمانبردار ہے۔ خود کو نہ کی نہ کی طور سے منور رہا۔ مگر اُس کی ماس نے اپنے بچے کو کھانا کھانا نیا نیا کہاں مانج دیا۔ اور بے یار و کس تھا سنا پڑ گیا۔ اُس نے اپنی بڑھاپہ کی اُسے دیکھ کر دھن دھن وہ..... مینی ادھر سے نہیں چاہتی۔ سچ خانا پڑھیا کی نہ کی کی مگر مٹی باتیں ناموشی سے سن کر پلٹ کر واپس رہنے کے علاوہ اور کہہ بھی کیا سکتا تھا مگر وہ لڑکا اُس وقت جب اک عجیب سی بات اُس کے کانوں میں پڑی پڑھیا اُسے ساتھ لیے کھلی کھڑکی میں بیٹھ گیا۔ کچھ نہ بولتا۔ کچھ نہ کرتا۔ کچھ نہ دیکھتا۔ کچھ نہ سناتا۔ اُس کی پرانی مٹی کی ہٹلایا اُس کے ماتھے دھرتے ہوئے بیٹھ گیا۔

”لو! بھو یہ کچے اُخدا جانے کہاں سے لاتا ہے۔ کون اسے دیا ہے؟“ اُس ماس (اُن) نے سے کہیں دیتا ہے۔ کھانے کا بھوسہ کچڑوں کی گڑ گڑے یاں لٹکے مڑکے کا گیارا تہ نہ لوتا ہے۔“

فتح خان چلی چلی نظروں سے بھڑیا میں بھر سے ہوئے عجیب و غریب رنگ برنگے لگوں کو بوس دیکھ رہا جیسے وہ کچے نہ ہوں نیپو لیے ہوں۔ ہر کچھ وقت کے بعد قدمے تاف سے ہاتھ دھا کر ایک سرخ کچھا اٹھایا۔ بٹے کچے بچپن میں تو وہ بھی کہیں رہا مگر کچھا اٹھیلی پر رکھتے ہوئے اُس کا غیر معمولی وزن اور چمک رنگ محسوس کرتے ہوئے سوچنے لگا۔ معمولی کچی ٹھٹھے کے بٹے گایاں اسی (دنی اور خوبصورت چمکدار) نہیں ہوتیں۔ وہ مزید آگے جھک کر غور سے دیکھنے لگا۔ کوئی فراش یا لوٹ پھوٹ بھی کہیں دکھائی نہ دی۔ ایک ایک کر کے ساری گویاں بٹے دیکھیں۔ صاف شفاف کوئی سیاہ کوئی سرخ کوئی سفید اور سبز۔ جب کچھ صحیح

سوچ بچار کی حلیم گھونٹنے میں خاصا وقت لگ گیا۔ اسی دوران بچے نے بسورنا شروع کر دیا کہ مجھے بھوک لگی ہے۔ نانی نے جو ہاتھ لگا سائے لاکر رکھ دیا۔ میں یہ نہیں کھاؤں گا مرنے لگا نے اٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکلنے کے لیے دروازہ کی جانب بڑھا۔ نانی نے وہیں سے فرات پلائی۔ شیر دار جو باہر نکلا اسے دونوں بعد باپ گھر داخل ہوا ہے اور تو باہر نکل رہا ہے۔ فتح خان نے چند لمحے کچھ سوچا اور سانس کو فہم رہنے کا اشارہ دیتے ہوئے بچے کو باہر جانے کی اجازت دے دی۔

● پٹھان کا پوتہ گھڑی میں بولی گھڑی میں بھوتہ !

وہ ایک چھلواوے کی مانند ان کی دھڑکن سے تھا۔ آڑی ترچھی بھٹی لپٹا ہوا چشم زدن میں وہیں آہٹا
جدھر ہر روز اس کا تپکنا مٹھائی اور کچنے لینے اس کا انتظار کر رہا ہوتا۔ ادھر خٹائی اپنی بدھمی پیار ساس کو
گھسیٹتا ہوا پیچھے پیچھے وہاں پہنچے۔ شاید کچھ لمحوں کی دیر نہ ہوئی یا کچھ انہیں بھٹائی نہ دیا۔ وہیں چھلوں والی
دوکانوں کے سامنے کچھ کدو اور کے ساتھ کچھ کدو کی پٹائی لٹائی ہوئی تھی۔ کدو کی پٹائی کہاں کہاں کا دنا
اور وہ ہر روز کے مار رہا تھا۔ اس حالت میں وہ کدو دوکانوں چھلواوے کو لے۔ اسی لمحے وہ فقیہ جس کا
مستقل لڑکا تھا، مسیحا کا کونا تھا پاس چلا آیا۔ سامنے والے محلے سے بھی آئے۔ بچے نے جب باپ کا کونا
دیکھ لوگوں کو دیکھا تو وہ کھینچتے ہوئے اٹھ بھاگا۔ باپ پیچھے پکا پر پھلا وہ کہاں باتھو رہا ہے۔ ان لوگوں سے
پوچھا۔ یہاں بچے کے ساتھ کوئی بھوکھا بچہ لڑکی تھا جو کدو کی پٹائی لٹائی ہوئی تھی۔ ایک بولا۔ ”بھیا یا تو تم
بااے ہو یا پھر نہیں باولا کہتے ہو۔ پوچھیں تو کچھ یہاں بیٹھے بچے جوان بول رہے ہی ٹھکڑوں سے نکالتے رہتے
ہیں۔ یہ تمہارا بااے لا کوندا اور کی ذرا پیسے بھاگتا ہوا یہاں بیٹھا تھا کدو کے دیکھ رہا ہے۔ کچھ کوئی اس کے پیچھے
پڑا تو۔ خالی ہاتھ منہ بھاڑ لیے ادھر اپنے دانی جگہ پہ بیٹھ گیا۔ یہ سنن فقیہ یا بھی اس کو نے پہ کڑا اپنے
دھندے میں لگا تھا۔ اس ایک آدھ خالی ٹھکڑی گراہک کی جانب اٹھی ہوئی پھر جو پلٹ کر دیکھا تو اس کے
پاس پلاؤ کہاں کا دنا دھڑکا تھا۔ قند امرتی بھی پیتے پہ پانی تھی۔ ننگر یا تو ہر روز ادھر بٹا رہتا ہے۔
بھم بھی کھاتے ہیں۔ پر بھیا! ایسا پلاؤ کہاں اور قند امرتیاں تو ہم نے بھی ادھر بیٹھے نہیں دیکھیں اور نہ ہی اس
طرف کے پیتے دہنے ادھر کہیں ہوتے ہیں۔ ہمیں تو یہ بھی کوئی جن چنے ہی دیکھے ہے جن ہی اسے ایسا یا بھیا
کھانا دے کر جاویں۔

فتح خان ساس کو گھر چھوڑ کر اس "جن جن ہے" کو تلاش کرنے دوبارہ درگاہ شریف کے اطراف نکل

لیے تو وہ مجھے ہر روز کھیلنے کے لیے وہ اچھے اچھے کچے دیتے ہیں۔ کہتے تھے یہ کچے نہ کسی کو دکھانا نہ دینا جمع کرتے رہنا یہ بہت قیمتی ہیں۔“

فتح خان نے اپنا وظیفہ بدل لیا تھا جیسے وہ سپاہی سے اک اہم مشفق باپ کے زور پ میں بدل گیا ہو۔ گو وہ ابھی تک تمام تر صورت حال سے کما حقہ واقف نہیں ہو ا تھا تاہم اتنا ظاہر سمجھ گیا کہ اس کا شہر اور تالیق پانا نہ کھوجا افغانی بابا جو عرصہ پہلے ایک زور و حالی مجاہد کے سلسلہ میں تاراج لکھ پیراڑ میں کہیں زور پوش تھا اب تکمیل کے بعد واپس آ چکا ہے۔ اپنے نواسے سے ملتا ہے اور اسے اچھے اچھے کھانے منھیاں کھاتا ہے۔ قیمتی کچے کھیلنے کے لیے دیتا ہے مگر خود اپنے گھر والوں کے سامنے نہیں آتا نہ کسی اور کو دکھائی دیتا ہے۔ اس کی کوئی معقول وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

اس نے مزید کچھ جاننے کے لیے بڑے احتیاط سے پوچھا۔
 ”تم اپنے بابا کو گھر کیوں نہیں لاتے۔ تمہاری نانہ اور میں خود بھی ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ اگر تمہارے بابا ہیں تو ہمارے بھی تو بابا جان ہیں۔“

وہ کچھ لڑکتے ہوئے بولا۔ ”میں نے بابا سے کہا تھا کہ تمہارے بچے ہیں تم سے بھی ملنا چاہتے ہیں۔“
 کسی اور سے ملنے کی بات نہ تھی۔
 وہ اگست بڑی معنی خیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہنے لگا۔

”ادھر بیٹا وہ کچھ بات سے تو دل لیتے ہیں مگر ہم سے ملنے کے لیے انکار ہی کرتے ہیں۔ آخر تم بھی تو میرے بیٹے ہو۔ اگلی بار ان سے ملو گا کہانی سننا چاہتا ہوں۔“
 ”ہاں کی صحت تو یہ ہے“ پھر وہ یہاں ہی ہے جیسے تمہاری بیواؤں سے پہلے تھا۔“
 ادھاپ کے چہرے کو پاؤں تک۔ باقی جیسے وہ کوئی دلچسپ کہانی سن رہا ہو۔ کچھ گت سے نہ کہنے ہوئے بٹا لے لگا۔

”میں نے تو بھی بابا کا چہرہ دیکھا نہیں تھا ہی وہ صاف سامنے دکھائی دیتے ہیں۔“ کہنے لگے ہوتے۔
 پلڑی کچھ بھی تو نہیں وہ تا پھر بھی ادھر سے پاس موجود ہوتے ہیں۔ جیسے آپ میرے پاس چلے ہیں۔“
 واپس گھر لوٹنے وقت بابا وینا دونوں خاموش تھے۔ بابا اس وجہ سے خاموش کہ پتہ نہیں اس میرے پہلوئی کے نیچے کا یہ ہوگا؟ جو گھر میں لڑکا کرتا ہے اور نہ ہی کتبہ دے دے جاتا ہے۔ ہر چند کہ خواہ وہ تالی اسے وقت فوقتاً نماز طے پڑھاتی رہتی۔ مگر اس کا زیادہ تر دھیان اعتقاد حرکتوں کچے کھیلنے اور ادھر ادھر آوارہ گردی میں رہتا۔ اب یہ بابا والی نئی افتاد پڑی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ وہ کیا کرے

اور گیانہ کرے۔ سوچنے لگا ادھر آیا تو تھا دو چار روز کے لیے مگر لگتا تھا آبِ ادھر کا نقشہ بننا کر ہی جانا پڑے گا۔
 گھر پہ پہلی رات ٹھوب گھوڑے سے بچ کر سویا۔ دن بھر کی جاں نسیں دوڑا ڈھوپ اور پڑا سمر ارحم کے
 حالات و واقعات نے مگر حال کر کے رکھ دیا تھا۔ رات بستر پہ یوں لگا تھا جیسے جسم سویا پڑا ہے لیکن کچھ پڑی میں
 کچھ کلبلا رہا ہو۔ بعض اوج سے سجانے ہو کوشش کے باوجود کچھ میں نہیں آتے تو ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے وہاں
 اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اک عجیب سی ورزش میں مبتلا رہتا ہے اور جب تلک کوئی نئی کتاب آمد نہ ہو جائے
 بندے کی ایسی ہی حالت رہتی ہے۔"

صبح فجر کی نماز کے بعد کچھوں والی ہانڈی لینے بیٹھ گیا۔ گزرے روز والے دونوں نیلے اور سرخ کچے
 ابھی تک واسکٹ کی اندرونی جیب میں تھے۔ انہیں بھی شامل کر کے سب مٹھنے پہ ڈال لیے۔ چھوٹے پوتے
 درمیانے رنگ برنگے گول قیمتی پتھر ہیں۔ ان کے سامنے اپنی پہاڑی دکھاتا ہے۔ سبکدستی کا اک خوشگوار سا احساس
 دلانے والی آب و تاب ایسی کے اندر بڑی لطیف سی خیرگی اجال رہی تھی۔ کچھ دیر کھینچنے کا مزہ لینے کے بعد
 یکے بعد دیگرے ان کے لمس سے مٹھو کا ہونے لگا۔ یکبارگی دل چاہا کہ وہ ان سے کھیلے پار کھینچے ان سے
 باتیں کرے۔

UrduPhoto.com

سراغ نہ دینے کے لیے پتھر اٹھا لیے تھے پھر یوں جیسے ان سنگ دانوں سے ہلکا ہلکا ننگوں خیر چھیننے لگا ہو۔ ترقی نہ ہوئی اور نہ ہی
 اس سنگ نے دھوم مچا دی۔ حیران پڑنے لگا مگر ہوش تو بگڑے جب کہنے لگا کہ پتھر کے ان کے نقصان
 میں نفس کو یہ احساس دلایا کہ یہ پتھر اس کے علاوہ بھی کوئی ہستی موجود ہے۔ کئی بے ترتیب سانسوں کا
 زیر و بم صاف سنائی دے رہا تھا۔ پھر لگا کہ کوئی آہستہ سے سرک گیا۔ ان کی ہانڈی کے پاس آ گیا ہو۔
 لمحوں میں وہ سانس لینا آگلیں جھپکن بھی بھول گیا۔ جس طرح دانش نورانی اور دانش افلاکی میں تھا
 ہوتا ہے اسی طرح ان کے ہائے کائنات اور ان کے ہائے کائنات میں بھی فرق ہے۔ بشری کائنات میں
 نور کی تھانے بھی ملے جیسے جیسے۔ مگر جب کسی ہستی میں دونوں صلاحت موجود ہوں تو پھر جاننا پڑتا ہے کہ
 قوانین کی نسبت کیا ہے۔ مادیت کا اور ہے یا نوریت۔؟ اگر نوریت کا اور ہے اور اک ہو تو وہ مادیت
 کے تقاضوں پہ متکثر ہوگی اور اگر مادیت فیذا اور نوریت کوں سار۔ تو پھر مادیت کے مقاصد مقصد
 گے۔ ہر چند ایسی ہستیاں بھی اہل ہستی میں سمجھیں ہوتی ہیں کہ جن کی بشریت کا ہر تہ فطرت سے
 تزکیہ نفس و باطن مجاہدات و مبادات کی بنا پر ایسے لاہوتی و لطیف من صبر کا پرتو جن جاتا ہے کہ خاکی ہونے کے
 باوجود خرق عادت و فطرت استغناء نہیں زیر دست آ جاتی ہیں اور ارضی و افلاکی علوم و اسرار ان پہ ٹھوب

رہتے ہیں۔ گو ان کا بڑا مقصد و ضرورت اٹکھارہ اور تمام واجب نہیں ہوتا تاہم ان ہستیوں سے ان چاہے گا ہے ماہے کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہی رہتا ہے۔ طویل فاصلے خوشم زون میں شے ہو جانا۔ پیاز کی اوت میں یا کسی دوسرے عالم میں جھانک لینا۔ آپ آتش' ہوا یا مٹی' پتھر کے آر پار ہونا۔ کسی کو دکھائی نہ دینا۔ کھانے پینے' لباس یا کپڑے' کھینے کی احتیاج نہ رہنا۔ نایاب نعمتوں' زرد جواہر کا حصول وغیرہ۔ ان سب چیزوں کا مادی دنیا سے کچھ تعلق ہو تو ہو زو حانیت و تصوف میں ان کا کوئی تصور نہیں۔ لیکن افغانی بابا میں کوئی ایسا تصرف ہو گا کہ وہ جسے چاہتا دکھائی دے گا۔ جیسی نعمتیں کھانا اور کھانا چاہتا' اُسے قیب سے کہیں حاصل ہو جاتی ہوں گی اور نواسے کے علاوہ کسی اور کے سامنے نہ آنے میں بھی اُس کی کوئی مصلحت کا فرما ہوگی۔ اولیاء نے مستورین کا ایک یہ بھی طریقہ ہے جب کہیں مخصوص حالات میں عالم مستور سے عالم ظہور میں کسی امر کی نیک نیتی مقصود تھیں تو وہ فہمت کے طور پر عین حق و حقیقت کے طور پر سامنے آتے اور ان کی مدد سے ضرور رکھتے ہیں۔ ایسے میڈیم معصوم بچے' منزہ انفس پیدا کئی طور پر نامرد اور ناعور میں جو بے خطا ہوں کام میں لانے جاتے ہیں۔ اس کی ہدایت یہ جاتی ہو کہ نوریت اور مادیت میں جو بنیادی حجاب ہے اُس میں جھانکنا گانے گانے کے لیے اسی طرح کے افراد کے باقی وہ شوق اور شہتہاں ہوتی ہے جو اس بار یک کام میں مطلوب ہوتی ہے لیکن ایک طرح سے زمینانی دنیا کا عالم۔

شر۔ حالت نزل بخار ہو یا آغوش فہمت کا خدار۔ پیدا پیدا بیمار یا کسی کا انتظار۔ ان کیفیات میں ضرور دنیا کی ملی جلی مخلوق غریبی اور کچے زمرہ و سعاد ہوتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیات غلاموں' غمراؤ و غاضرات' رہنمائی کی تلاش میں بھی پیدا ہو جاتی ہیں کہ دار جنگ کی اور چینی' ہنگو کی جنگ کی وصال..... یہ قرار دی اور طبیعت میں بے طرح کا انتخاب خود آتا ہے۔ لیکن تھمرے' ایک اور کیفیت بھی جو شام و جاں میں ہے۔ اس اور بھیے کا فور کی شرمیلی لپائی جھک اور احصاب و احساسات میں گدگدائی ہی پیا کرتی ہے وہ ہے کسی بھل قیب' ارواح معید و مقرر بان' الہی انفس' قدسیہ یا کسی غیر مرنی' استی کا قرب' موجودگی' آمد و نزول وغیرہ۔ غلو کہ کیفیات میں کچھ تو جسم و وجود ہے اور حدود سے پڑ قلب و زبان پہ جبکہ مخصوص حالات و ضرورت کے تحت چنداں توجہ ان و بطون اور حواس و حواس پہ طاری ہوتی ہیں۔ یہ مشکوفاں' اروا یاں' الہی یا الہی اور معرقاتی کیفیات صادق ہوتی ہیں۔ یہ بازید و بازگشت کے معاملے ہوتے ہیں۔ نسبت و است کی بدہم آیات صنعت کا مشاہدہ۔

۔ لوح محفوظ است پیش اولیاء

چوئی کھڑکی کے روزن سے سورج کی چھٹی ہوئی زرخیزی کرکوں کی چکا چوند نے اسے اور کچھوں کو مزید

اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ کچھوں سے انوکھا ہونے والی چٹک نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ اسی کا انکاس اور کافور کی بھٹی ہوئی مہک کا اک خفیف سا لہریا اس کے اعضاء لطیفہ کو گدگدانے لگا یقیناً یہ اک نئی صورت حال اس لیے کوئی اسرار لیے ہوئے تھی۔ شہد کی مکھیاں ہی جھنڈت ہست اس کے کانوں سے واضح حد پہ گھرائی آس پاس دیکھا کوئی مکھی دنگی تو نظر نہ آئی۔ تاہم ایک طیر مرنی جیونی اپنے زور و محسوس ہوا۔ جیسے گہری دھند یا برف کی موٹی دیوار کے اس پار کوئی بیٹھا ہو۔ آنکھ کے قطبیں تارے میں اگر نور ظاہری کی جہان ہو تو یہ دھندلے پر تو بھی دکھائی نہ دیں۔ وہ قدرے سنبھل کے بیٹھ گیا۔ تاکہ اسے ذہنی طور پہ ایک جھٹکا سر کا جیسے کوئی مشتعل طیس لہر اس کی گدی کی جانب سے دماغ میں سرایت کر گئی ہو۔ بجلی سی زرور کی ٹیس محسوس ہونے لگی۔ کانوں کی بجائے اس کے دماغ میں برزبان پاشتو آواز ابھری۔

”السلام علیکم ایچہ کیا حال؟“ قہار بابا بایوں نے مجبوری سے منہ نہیں نہ تو تمہیں دکھائی دے سکتا تھا اور نہ عام طرح سے بات کر سکتا ہوں۔ خدا نے پاک کے امرا اپنے مرشد پاک کی فکر و فکر سے چلنے کی تکمیل کی ہے اس کے قہار سے مجھے پادرو سے دیا گیا ہے۔ اب میں اک اگلے مرحلہ کا مسافر ہوں۔

بابائی جانب سے چند ساتھیوں کا وقف ہوا تو کھائی آواز میں گونج اٹھا۔
 ”یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ہم آپ کو دیکھ نہیں سکتے جبکہ آپ میرے بیٹے اپنے نواسے سے ملتے ہیں اس کی دکھائی دے رہی ہے۔ یہ حیا یا حیا کیوں کھانے کے لیے اور کھینے کے لیے جتنی چیزوں کی گولیاں مسکنے پر پڑی گولیاں ہاتھ میں لیے ہوئے حیا کہنے لگا۔

”یہ پتھروں کی گولیاں اکولی کا جی شیشہ دکھائی نہیں دیتیں۔“ بچے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے اپنے انجمن کسی کو ریا دکھنا بھی نہیں سنبھال کر دکھنا۔ آپ کو پتہ ہو گا وہ اکثر کمر سے غائب رہتا ہے اگر گھر کی تو جھیلے کمرے میں غصے کر ان کچھوں سے کیا کھینا کرتا رہتا ہے۔ اپنی مانی کی کوئی بات نہیں سنتا نہ کمرے سے کھانا کھاتا ہے۔ اس کی عیب و غریب خرافات کی وجہ سے اس کی مانی پریشان رہتی ہے جبکہ وہ بڑا جی ہے۔ اب آپ اس کے بارے میں کوئی حکم دیں کیونکہ ہم ایسا لٹاری سے سمجھتے ہیں وہ اب ہمارے۔ تو اس نے نہیں آپ کی مملواری میں ہے۔“

آخر چند جیسے خاموشی طاری رہی۔ اور فرخ خان سر ہلے اسے بول سانسے بیٹھا تھا جیسے ہاتھ نہ دے دوتے وقت کوئی حسیدیت خدا پے شیخ کے زور و تہ بہ تہہ بچھا ہوتا ہے۔ یہ وقت بہ بجز قہار میں ڈوبی خان بابا کی آواز ابھری۔

ہوئے اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ کوئی زیورات کی صفائی چھڑائی یا تھکنے سازی کی دکان ہے۔ سوچتے تھے قدرت نے اسے صحیح جگہ پہ پہنچایا ہے۔ دکان والا بھی نیک نمازی ہے یقیناً وہ لگوں کے بارے کوئی صحیح رائے دے گا۔ واسٹ کی اندرونی جیب میں پڑے ہوئے کچے جیسے باہر نکلنے کے لیے ٹھلارہے ہوں۔ ہاتھ سے انہیں محسوس کرتے ہوئے دکاندار کی جانب نگاہ اٹھائی تو وہ تسبیح چھوڑے آنکھیں پچھے زیر لب کوئی نام پڑھ رہا تھا۔ اسی دور ان اندر سے ناشہ بھی پہنچ گیا۔ دکاندار نے چائے کا پیالہ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”ایسی صبح صبح آپ بازار میں کسی کام سے آئے یا محض ادھر سے گزر رہے تھے؟“

چائے کا ایک بھر پور گھونٹ لیتے ہوئے اس نے نیم سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

”اصل کام شاید آپ کی زیارت تھا۔ آپ کی نورانی صورت سورت سورۃ الرحمن کی دلچسپ تلاوت پڑا کرتی اور اخلاق نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میری زندگی اوقات کا اندازہ بھی نہ کر سکا لیکن اللہ تعالیٰ کی جلالت کی جگہ آپ سمجھ میں آئی۔ اگر میں ایسی تلاوتی ادھر نہ پہنچتا تو سورۃ الرحمن کی تلاوت آپ کے منہ میں کی تلاوت اور یہ دھڑکی چائے کیسے نصیب ہوتی۔“

”آپ تمہارے کہتے ہیں قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں۔“

UrduPhoto.com

”کیا ہے۔ میں ہر روز دکان کو ملے پہ اس کی تلاوت کرتا ہوں۔ اس کے مطلب اور روحانی فائدے کی وجہ سے تو شش کرتا ہوں اس پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیسی کیسی نعمتوں سے نوازا ہے۔ اللہ ان نعمتوں میں اخلاق کی طرف بھی اسی قدر توجہ دیتا ہے۔“

”نورانی تلاوت تو اسے بھی ملتی ہے۔ آج صبح مجھے آپ کی تلاوت میں بھی ایک نعمت عظمیٰ ملی۔ آپ کو پہلے اس بازار میں بھی نہیں دیکھا۔ یہیں کہیں ہے؟“

”ہاں ہیں یا۔“

”ہاں جی مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔“ میرے سب دلچسپ سے آپ کو پتہ چل گیا ہو گا میں اخلاق میں ہوں۔ حرکات و سکنات کہاں جسم بھی میرے پیشہ سپاہی ہونے کی پٹری کھاتے ہیں۔ جو وہ پڑا ہوا ہے اس میں تلاوت اور ہوں۔ ایک روز پہلے یہاں پہنچا ہوں میرے دلچسپ اور ساری کہیں ہے پڑا ہوا ہے۔ اور اصل میں اس بازار میں ایک ضرورت کے تحت آیا تھا جبکہ یہاں میری کوئی جائے نہ تھی۔“

دکاندار کی لگاؤ سے ہوا۔ ”اگر جائے والے سے آپ کی طرف رجوع کوئی پرانی جان ہو تو پھر میں آپ کے لیے یقیناً انجمنی ہوں اور اگر جان پہچان۔“ انسانی اللہ ہر اخلاص و اعتماد سے لبریز ہوا۔

”ہاں یہی غرضی ہم آہنگی سے شرط ہے تو میں آپ کا جان پہچان والا ہوں۔ حکم امیں آپ کے لیے ہے۔“

کر سکتا ہوں؟“

”وہ کا انداز کی ایسی حکمت و محنت سے لبریز گفتگو سن کر حیران سا رہ گیا۔ اُنہی ایہ سزاؤں میں بیٹھنے والا آدمی کندن لعل ہے یا کسی دیکھنے والے کا اپنی بیٹی کی پاندی پر شاہ گھا صاف کرتے ہوئے بتانے لگا۔

”میرے ایک بزرگ نے مجھے دو قیمتی پتھر دیئے تھے۔ پتھروں کے بارے میں میرا علم نہ ہونے کے برابر ہے۔ آج ادھر بازار میں آنے کا مقصد بھی یہی پتھر ہیں۔ میری خوش بخشی کہ اللہ نے اپنے سے بلا لیا۔ یہ پتھر دیکھئے۔“

وہ کا انداز ان پر اسرار پتھر کی گولیوں کو دیکھتے ہی الٹ رہ گیا۔ تھوڑی دیر وہ انہیں پر تجسس لگائی سے نکال رہا ہاتھ میں لے کر مختلف انداز سے جانچتا رہا۔ پھر بڑے دھیرج سے پوچھنے لگا۔

”بھائی جی ابراہان مائیں تو تو پتھروں پر اسے جس بزرگ سے دیکھ کر ان کے بارے میں جانیں گے؟“
 جھلکے سے متذبذب لہجہ بولا۔ ”دراصل یہ بزرگ خسر ہونے کے علاوہ میرے ساتھ اتالیق اور شخص بھی بلکہ اس کے ساتھ کرا ایک پیچھے ہوئے اللہ کے ولی بھی۔“

UrduPhoto.com

”خاں خاں سوال سن کر اک عجیب سے غصے میں پھنس گیا۔ کیا ہے کیا نہ کہے۔ جو بھائی کہنے لگا۔“
 ”حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں میں خود بھی نہیں جانتا کہ وہ ہونے میں ہرگز نہ ہونے میں۔“

اس گفتگو کے بعد دونوں طرف ایک عجیب سی خاموشی طاری ہو گئی جیسے دونوں اپنے اپنے ظاہری احمی مادی روحانی تخیلوں میں پھنسے ہوئے ہوں۔ آخر خاں خاں نے ہی زبان کھولی۔

”آپ خاموش ہو گئے۔ کیا کوئی ایسی بات جس کے اظہار میں کوئی تامل ہو؟“

وہ کا انداز پر شوق نظروں سے گزرا کہ بن آنکھیں کھلے کر دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہمارا کلی پشتوں سے پیشہ گینہ سازی ہے۔ ہمہ دانی کا دعویٰ تو نہیں الہت یہ ضرور ہے کہ ہزاروں سالوں پر طرح کے گینوں جو ابرہہ دانوں کی تراش تراش پائش اور دیوانہ کرانے کے مواقع حاصل ہوئے۔

یعنی توکان۔ آپ دیکھ رہے ہیں اور یہی کام ہوتا ہے۔ اصل کارخانہ پیچھے ہے جدھر کی کارگر بیٹھے بیٹھیں یہ قیمتی پتھر تراشتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں شاہی خزانے سے بھی یہ سب ابرہہ تراش اور پائش کے لیے لائے جاتے ہیں۔“ وہ کچھ لمحے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پھر کہنے لگا۔ ”یہ تمہید تمہیں نے لے لیے باندھی کہ میرا آپ سے مناسب سا تعارف ہو جائے۔ میرا نام حبیب دارائی ہے۔ خستہ کنائی والے

ہوں تو سنگ میلِ تعمیر کے نیچے سنگ بنیاد اور قبر کے سر ہانے لوحِ خزاں کہلاتے ہیں یہ دیوانوں عاشقوں اور
کتوں کو مارنے دھمکانے کے کام بھی آتے ہیں۔ اک قہس نامہ ادا تھا جو کُندہ قیشہ سے پھاڑ دوالے ہو گیا۔
قیشہ تو کو کوکن کے ہاتھ ہوتا ہے۔ عاشق لوگ آہن یا سنگ نہیں ہوتے تو تو پیار تک ہوتے ہیں۔ اگلے پانی کی
چھلی اپنی منہم ٹھوکی کا پتھر چانے بنا نہیں رہتی۔ دیر اور گریہ کے قدیم ٹھجر ٹھجرے ٹھر دے پتھروں کی حالت پہ
رونا آتا ہے۔ پتھر میں چونک سوراخ کر سکتی ہے مگر سنگ دل کے ہاں جذبہ ترخم پیدا نہیں ہو سکتا۔

● سامنے گل نیچے پتھر مل.....!

”نیچے مڑ کر جو دیکھو تو پتھر مل ہو جاؤ گے۔“ کچھ چاہیں ایسی ہوتی ہیں جن کے ہارے میں جھوٹی
نچی دل دلا دینے والی باتیں زبانِ زد خاص و عام ہوتی ہیں۔ ایسی جگہیں ہر ملک شہر ملک و قریہ ہر ایک
گھر و خانگیوں میں بھی پائی جاتی ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں انسان ہوگا وہاں لگتے بگتے کوئی نہ کوئی ترسانہ
ہو جائے گا۔ پتھر مل ہو جاؤ گے۔ یہ سنا کر بہت سے
ہالوں سے سوچا۔ یہ سنا کر بہت سے اپنے کو ہم قید سے نجات اور ماحول کے مطابق وہاں جتنا
نبوت پر رت سنا ہے چٹال باؤ تھاس یا کسی ضدیوں پرانے بابے کی روم یا کوئی مستور پر غیبی ایسے وہاں
کے مطابق دریافت کر لیتے ہیں صاف ستھرا صاف ستھرا ہے جی سے روٹی دیا پتھر ہوتے ہیں۔ اپنی پانی
پانی پلیدی کا پتھر خاص خیال رکھا جائے گا۔ یہ پتھر مل ہو جاؤ گے۔ یہ سنا کر بہت سے
سے مولیوں کا نام گردشوں اور اوسے اوپے لپے پتھروں اور شہر انوں سداخوں والی کھدائیوں چھلی اندروں کو پتھروں
مکن کی جڑوں آم کے پتھروں اور گلاب کی پتھروں کی ہاڑوں کا راجہ جاتا رہا تب سے ان ”خاندانہ“
والی جڑوں مستور باؤں اور پتھروں کی اہمیت بھی قدر سے مدہم پڑ گئی۔ لیکن اب بھی یہ انے ملا توں کھی
کھلوں اور یہ باتوں کے اکثر گھر میں ایسے لوگ لگے ہوئے ہیں جو جنت یا باؤں کے بچے استخوان ہیں۔ بات
اس بات سے آگے بڑھی تھی ”نیچے مڑ کر دیکھو تو پتھر ہو جاؤ گے“ اور پتھر پتھر پہ تھا جو پتھر چھلی چند صفحات سے
موضوع نکلے ہے۔ یہی پتھر اگر مٹل پہ پڑ جائے تو پتھر لہو کی دھڑلے ہو جائے۔ یہ سنا کر بہت سے ہاڑوں کی سکل پہ پتھر پڑ
جاتے ہیں ہمیں جس حساب کتاب میں تھا۔

شیر کے کچھار میں شب بھری پتھروں کے پتھال میں چہل قدمی ’سانپ کی باجی میں دستِ دخلی
سے فخر رہنا شاید ممکن ہو مگر بانسوں کے جنگل یا ذخیرے میں سو کر زندہ اٹھ لین ممکن نہیں۔ ادھر زمین پہ سونے

اک عجیب سی ریاضت "بیچ کرہ" کا ذکر نکل گیا۔ یہ ہم بھی سنا چکا تھا تھا۔ کسی جراثیم پیشہ کی طرح یہ عیانا مہنتیں ہی میرے تجسس کی رگ پھڑک اٹھی۔ پھر کیا! صبح و شام اس نوہ میں لگ گیا کہ یہ ریاضت کس نوع کی ہے۔ اس کی مقصدیت، نفع نقصان اور دیگر کوائف جاننے کا کوئی راستہ تلاش کرنے لگا۔ بابا جی سے آگے بڑھ کر کچھ پوچھنے کی جرأت نہ تھی۔ کتابیں کھجائیں اس سلسلہ کے کچھ بڑوں کو سہندہ لگائی۔ لیکن کہیں سے بھی کوئی کٹنگی و پتھا برآمد نہ ہوا تو اس نچ پے سوچا کہ کسی ذہن موقع محل دیکھ کر بابا جی سے پوچھ کر دیکھیں گے۔ اب خدا کی قدرت دیکھئے یہ موقع جلد ہی ہاتھ لگ گیا۔

سڑک کے راستہ ہم سرگودھا سے سلاٹوالی جا رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح میں ہی بابا جی کی خدمت میں تھا۔ سلاٹوالی کے نواح میں ایک چٹک ہے وہاں بابا شیخان اللہ کا زمیندارہ تھا۔ نام تو شاید کچھ اور رہا ہوگا، مشہور وہ بابا شیخان اللہ کے نام سے ہی تھے۔ ان کا شمار اولیائے مستورین میں ہوتا تھا۔ مقامی لوگ گھر برداری والے ان کے مقام سے واقف نہ تھے۔ بالکل سیدھا سادا سا پنڈو بابا، سادہ ان ذرا مٹی کھرپے ہاتھ میں لیے کھیتوں میں کاشت چھانٹتے رہتا۔ اولاد میں تین بیٹے ہوئے مگر وہی کام کرتے تھے۔ بابا شیخان اللہ کی فریت سے شاید اس لیے مشہور تھا کہ یہ گھر اس کا گھر تھا۔ بات بات پر شیخان اللہ کے گھر سے خود غور و خفا جاتا تھا۔ اس کا ہوش پکھلی کی طرح تھا۔ یہاں پر ہر بار ہوتا تھا کہ ایسے ہی جیسے کوئی کسی کے پیچھے لے یا مرنے پر بھی منکر اڑے یا شیخان اللہ کہہ دے۔ عجیب ہے کہ موقع گھر کے مطابق ہی مرنے سے کوئی حسین و انوکھی کاکھ نکالنا چاہے مگر کیا کیجئے کہ یہ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں جن کے لیے ہر موسم وصال کا موسم ہوتا ہے وہ مصیبت میں بھی نہ ہمت نہ ہارنے کا پتہ نہیں دیتے ہیں۔

ایسا ہی ایک اللہ والا جس کا مقصد حیات اللہ کی مخلوق کی خدمت ان کے لیے سوتیلی آسانیاں فراہم کرنا تھا اللہ خدا کے خلیے کا نام پے لگا ہوا تھا۔ ہر بات سوال و جواب پر خود خود اللہ سے اللہ اللہ نکل جاتا تھا کہ اس پر اختیار نہ تھا۔ جانتے والے اسے بابا اللہ اللہ کہتے تھے۔ ذرا دھکا کا دربار۔ خود اپنے ہاتھوں سے دوتے اور خالص پیچھے۔ کہتے مالک ازل وابد نے گور اور پیشاب کے بیچ پاک صاف خوشبودار نالغ نور پیدا فرمایا اس میں خوش آفتابیت اور شگفتگی۔ کیسا نور کھ بد نصیب شخص ہوگا جو اس میں مادہ کا مرکب ہوتا ہے۔ وہ ہندو تسلیم و رضا جس پر مالک مہربان نے "اللہ اللہ" کے سر اور روز آئینہ کروئے تھے۔ مہد میں نمازیوں کے بیچ اللہ کے بندوں سے زمین کی باتیں کر رہے تھے کہ گھر سے نماز مہا کتا پانتا پانچا۔ اطلاع دہی مکان کے اوپر والے حصہ میں آگ لگ گئی ہے۔ حسب عادت فوراً اللہ سے اللہ اللہ نکلا اور چند ہدایات دے کر زخمت کر کے وہ بارہ مصروف گفتگو ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہی نماز مہا کتا پانتا پانچا اور مزید آگ پھیلنے کی خبر

دی۔ ادھر ادھر ہی الحمد للہ اور دبی سکون و اطمینان۔ جیسے کچھ بنوائی نہیں۔ علیٰ خذ القیاس! آگ ہو جتنی
 گئی پورا مکان جل کر راکھ ہو گیا۔ بعد میں مزید اطلاعات جان و اموال کے ضائع ہونے کی بھی موصول
 ہوئیں۔ آخری خبر ہوئی وہ یہ تھی کہ ہر چیز ختم ہو گئی ہے کچھ بھی تو نہیں جو باقی بچا ہو۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! الحمد للہ! کہتے ہوئے پھر مشغول ہو گئے۔ کسی نے جرأت کر کے اس ساری بے اعتنائی کا سبب دریافت کیا۔
 فرمایا۔ ”میں اولاد و اموال کی آزمائش سے شرف و نوا۔ سب کچھ اللہ کا ہے وہ جب چاہے دے اور جب
 چاہے واپس لے لے۔“ اس واقعہ سے ایک آدھ سوال اور بھی پیدا ہوا ہے کہ نقصان ہو رہا ہو تو یوں سکون
 سے بیٹھے بیٹھے الحمد للہ کہہ دینا ہی کافی ہوتا یا پھر نقصان سے بچنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ ضرور کرنی چاہیے
 لیکن یہ اپنے مقام اور محل سوچ کی بات ہے کہ ہم نقصان کسے سمجھتے ہیں اور فائدہ کی تعریف ہمارے
 نزدیک کیا ہے؟ جن کے نزدیک ازل و آخر اللہ ہی ہوتا ہے وہ اس کی رحمت کو ہی اپنی تسلیم سمجھتے ہوئے الحمد للہ
 کہہ دیتے ہیں۔

• سبحان اللہ! الحمد للہ! •

UrduPhoto.com

بابا سبحان اللہ بھی کوئی ایسا ہی بزرگ تھا۔ اپنے چند والوں کی نظر میں صرف سید صاحب کی ان چیزیں
 اور صفت مشقت والا بابا جیسے کٹر پالنے والے حاجی لڑائی بابے ہوتے ہیں کیسے کھانا کی نسبت یا ہر گھر
 میرے بابا سال میں ایک بار ادھر کو دعوتی ضرور جاتے تھے۔ میں اس سے پہلے بھی ایک دو مرتبہ ادھر آ چکا
 تھا۔ ہم یہاں ایک دو روز رہتے پھر واپس آ جاتے۔ بابا کی ادھر کیا لینے دینے آتے اس سے مجھے کوئی سروکار
 نہ تھا۔ میں تو چند اس سیر تفریحاً کھاتے پینے کے چکر اور خصوصی طور پر روحانی تجربوں مشاہدوں کی پیہک و
 پالنے اٹھوا صاحب کا مصاحب بننا ساتھ مستعار رہتا۔ اور یہ جی کہ شاید نہیں نہ کہیں، مگر نہ جی میرا کچھ بھی
 نہیں لگ جائے۔

برخس میں اچھی لڑی یا چھوٹی چھوٹی کچھ تباہیں ہوتی ہیں۔ جنہیں آپ روزمرہ کی سرگرمیوں
 جانے والے بے ضرر نہ دیکھیں مگر کہہ سکتے ہیں، مثلاً میرا ایک مقرب بھائی راجس صاحب اللہ ہر سلسلہ میں ہر گھر
 ناگ کے پکے لانے کی عادت ہے خواہ وہ چھوٹے بھائی کے لائق ہے یا نہیں اسے ٹوٹنے کا ضرور۔ بھلا یا اس
 کے خوش بھوتے بھی کوئی ٹوٹنے چھینے کی چیزیں ہیں۔ خریدے ہوئے یا پیسے سے وہ کمال پھرتی ہوشیاری سے
 انہیں ٹوٹنے لے گا۔ کیک بڑی مٹری چیز اس سے نال چا دل چاہے کی پٹی۔ خشک ڈوہ ڈلیا وہی وغیرہ تو

خیر سوگھ لینے میں کچھ حرج نہیں کہ تازی باسی اسلی نقلی کا پتہ چل جاتا ہے۔ مگر کیا کہیے کہ وہ گھر میں نہ بچا پکڑنے والی کرنی بھی خریدتے وقت سوگھ لیتے ہے کہیں باسی یا پرانی نہ نکل آئے۔ میلے کپڑے اور تھک مشین میں ڈالتے وقت سماشی کے ساتھ ساتھ سوگھتا بھی جا رہا ہے۔ کمرے کی صفائی پچھلے کے دوران اگر ٹیلیوژن کی فری کے نیچے آزار بند پڑا ہوا مل گیا ہے تو اسے بھی سوگھنا اس کا پہلا عمل ہوگا۔ سو اسی طرح اگلی چیزیں سوگھ چکا یا سوگھنے کی کوشش میں ہوتا ہے جو ناک کے لیے نہیں بلکہ آنکھ کان یا سر پیر کے لیے ہوتی ہیں۔ سوناگل پہ کال آ جائے تو کان پہ ڈھرنے کی بجائے ناک سے لگا کر بیلو کہے گا۔ صابن یا صابن کو سوگھ سکتے ہیں کہ خوشبودار ہوتے ہیں۔ پلو بے مار گولیاں کینزے مارواؤ انہیں آٹان چاولوں کی بور یوں میں رکھنے والی زہر کی پونلیاں بھی اس کے لیے سوگھنی ضروری ہوتی ہیں۔ اس کی اس مصوم ہی عادت پہ اب ہم نے دھیان دینا چھوڑ دیا ہے اور اتنا ضرور سمجھا دیا ہے کہ بیوی سوگھنے سے کہیں زیادہ بچنے کی چیز ہوتی ہے۔ یہ اس لیے کہا گیا تھا کہ ایک بار شاہی کے لیے لڑکی والوں کی جانب سے بھیجی تصویر بار بار سوگھ رہا تھا۔

ان بچے گاؤں کو چھوٹی ہوئی نہر گزرتی ہے۔ نہر قریب ہو تو اس پاس کے علاقے والوں کی بڑی سون راتی ہے۔ کھانوں کی مشہوری طور استاد نور شوق کی گھر خانا کے ٹو پور کا گھر اور چنی کے گھر کی چھیلیاں ان کی آٹھوں کو غم دیتی ہیں۔ دایہ برہم طاہرہ اور پشیدہ علیہم جو چھلے کے ریسٹورنٹ میں کھانا پکاتا ہے وہ (دھڑلہ لٹکا کر) اسرا علیاں دیا جاتا ہے۔ میلے چیلے کپڑے لگائے آئی لانا اور گریٹنگ لگائے ہوئے سٹیل سے نہر کے زحابی گھاٹ پہنچتے ہیں۔ انہی کثیر القاعد نہروں کا ایک فائدہ یوں بھی دکھائی دے گا کہ ایک آدھ ٹیڈا بڈھی یا کوئی مولودو لو پائے اس کے پانی سے غسل کیا کہتے ہیں۔ بہت آگے ہیں کہ اس پر انرسوں سرنگوں کی بازوں میں غسل میلے کے لیے چلے جاتے ہیں۔ لوندے موندے چرائی سکتے ہیں۔ سیانے لوگ تریو زخو بونج کرتے ہیں۔ بھنپیں گئے انڈیہ پیراں پانی کے اندر جبکہ گھسے گھسیاں باہر ہی چھیلے مارتے رہتے ہیں۔ ہیر و زکاروں سونے بازوں کو جو انوں عاشقوں کی جائے ملاقات۔ ریم اللہ خان تار با تھا کہ ریاض مند ری نہر پہ جا کر پانی اندر دھند چھیلوں اور پتھروں کو بھی بڑی دلچسپی سے سوگھتا ہے۔ ناجی 'سینٹ' زیت کی مسرت کر دینے والی بھیجی۔ بھیجی ملک کا تو وہ دیرانہ ہے۔ کتے بچے گدھے یا کسی اور ایسے بڑے جانور کی ہڈی کی پہچان نہ سوگھتے ہی کر لیتا ہے۔ ان کے گاؤں میں سانپوں کی گھبراہٹ ہے۔ کجاہر ہے یہ پیچہ دھانپ نہ رہے نہیں ہوتے۔ چڑیوں کے انڈے طوطوں کے ننھے شمار کیے اور بچے کھانے والے ہوتے ہیں۔ اکثر یہ نام نہاد سانپ بچوں بالوں کے منگھے چڑھ جاتے ہیں۔ اٹھا کریں کسی سوز سانپ سنگ دیوانہ سا مگر مستان کا واسطہ نہیں چنڈوؤں سے نہ پڑے۔ سانپ تو بے چارہ دو چار ڈنڈوں سے ڈنڈوت ہو جاتا ہے البتہ سوز

وقت نزاری کا کیا سامن میسر ہے۔ عموماً تہا کو نوش حضرات سگریٹ سناکتے ہوئے اس پاس استہنا و مہارت کے لیے بھیل جاتے ہیں۔ کچھ ڈرائیور کی مدد میں ہٹ جاتے ہیں۔ کچھ ناقلیں سیدھی کرنے کی خاطر چھل قدمی میں لگ جاتے ہیں۔

باہر نکل کر بابا جی میری کھائی پکڑے اور چچی سڑک سے نیچے اتر کر کھیتوں کی جانب ہو لیئے۔ یہی کہ شاید رفیع حاجت کی غرض سے ذرا پرے کہیں اوٹ میں جانا چاہتے ہیں۔ جب وہ چار کھیت آگے نکل لیئے تو خجرات کر کے پوچھ لیا۔

”بابا جی! ہم کافی دور نکل آئے ہیں۔ کہیں جس نہ نکل جائے؟“

وہ اسی رفتار سے چلتے ہوئے فرمانے لگے۔

”گنجر اوٹ ہمارے بغیر بس وہاں سے نہیں چائے گی۔“

● شجر حکمت کی زردہ زریاضت بیخ گرو۔!

UrduPhoto.com

کی داریک ہی پتھار اٹھل رہی تھی یا پھر ہماری دائیں جانب کورا دور ہالوں کا پتھر سا ڈھلے ڈھکا۔ کچھ آگے پہنچ کر بابا جی ایک بازو سے کھیت کی بازو سے دائیں طرف ہو لیے۔ مجھے یوں ”سڑوکی“ کے پکڑا ہوا تھا جیسے کسی چور اپنے کو تھنہ کبھری میں پکڑے تھا۔ ہالوں کا زنجیر چھوٹا ہوا تھا۔ بابا جی میرے ذہن میں یہی تھا کہ وہ ابھر آئے چارے میں رفیع حاجت کے لیے آئے ہیں۔ ذخیرے کے کنارے پہنچ کر ڈوڑک لگے۔ سرلم کیئے کچھ ڈوڑک پڑھتے رہے۔ سناٹا ہوا آواز بلند فرمایا۔ ”السلام علیکم یا اہل النہیں! چند جانے خاموشی کمرے رہے۔ اس خاموشی میں ذخیرے کے کنارے کی خاموشی بھی شامل ہو گئی۔ ذرا دیر پہلے اصرار سے چرخوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اب جیسے گھیرتی چپ نے سارے ماحول کو اپنے حصہ میں لے لیا تھا۔ غم کو جھکوا دے کر بابا جی کی جانب دیکھا تو ڈوڑک بھی آنکھیں پینے ہی پر اسرار خاموشی کا ایک حصہ بنے ہوئے تھے۔ ابھی ایہ کہنا تھا کہ میری ہاتھیں سمجھ سے ہلا رہے تھیں ایک ایک کی آخر دوسے خرغہ لیں ماں کے کھٹانے کی آواز ابھری۔ بابا جی نے الحمد للہ کہتے ہوئے میری کھائی پہ ہلا ڈالا اور ہالیں ڈاڑی کی بازو کے اندر قدم رکھا۔

پہاڑا خاں سمجھرا سمندر و خیرہ دور سے دکھائی دیکھ دیتے ہیں قریب سے دیکھو اور۔ ایسے ہی بھیل بھی دور نزدیک اور باہر اندر سے مختلف ہوتے ہیں۔ خاص طور پر نیستان کے اندر داخل ہو جاؤ تو وہ اک چیتا ہی

جاتا ہے۔ بھول بھلیاں کے راستوں کی کھوج نہیں ملے ہو جاتی ہے۔ یہاں صرف بانس اور یا پھر ان کی پھانسی ہوتی ہے۔ ساری بانس ڈالڑی ایک ہی سبز ڈھاتی رنگوں کے اچھوتے بلند ہانگے پھیلے بانس۔ پورے پورے گروہ پر گھبرندہ حسن۔۔۔ زاد حیا کے کٹیٹے ٹینوں ایسے لالہ لالہ بنے کلاواں پتے ہاتھم و ہایدہ پوسٹ و چوچیاں! آدھا قدم پیچھے میں قریب قریب کھینٹا ہوا ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ وہاں اوپر تھیں لگاتار بانس کے ٹونے آسمان کی خبر لا رہے ہیں جبکہ بانس بن میں اوپر نہیں نیچے دیکھتے ہوئے سنبھل سنبھل چلا پڑتا ہے کہ نو ذائیدہ بانس کی کوئل اچھوتی ہوئی ہزار زہر میں بھی ہوئی کسی برجھی یا گھار کی آئی سے کم نہیں ہوتی۔۔۔ شیر چیتا جنگل کی آگ میں بھلا لالے لالے کا پر بانس ڈالڑی میں ٹھنڈے سے گریز کرے گا۔ شری رام چندر سی کی طرح کسی کو چودو پاچا چالیس برس کی بنیادیں جاسکتی ہے مگر کسی بانس بن میں چودہ ٹھنڈے نہیں رکھا جاسکتا۔۔۔ اس بن سے تو پورا ابھی اپنا پنڈا چولی بچا ہوا گھڑا رہی ہے۔ چاند قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ چاند سے ہلکے بانس کے ساتھ کھینٹے ہوئی اور بھلا اور بانس شروع ہو گئے۔ ان کے درمیان سے کچھ گزرتی ہوئی ہوا اور پلے جسم چن کی جگہ لے آگے جب سر ایٹنگ کی چاک ہوئی تھی۔ کوئی اور جوتے تو بچا ہوا بن کے پیچھے سے ہو گئے اپنا راستہ بنا کر ہمیشہ کوئی اور نہیں تھے۔ کوئی ٹھنڈے بانس کے درمیان سے گزرا تو وہ بھلا اور بھلا آگے بڑھ گئے۔ کوئی اور بانس کی شاخ سے لے لیں وہی گزرتی ہوئی ہوں کہ وہ خود بخود ٹھنڈی جاسکتی ہو۔ کچھ آگے جیسے کسی نے ہاتھ دھوئے ٹھنڈے کی جگہ بنا رکھی ہے۔ اس کی صاف ہوا جگہ کہ خود بخود کچھ اور اور کچھ کچھ لپٹنے کو دل چاہے۔ آپ اس جگہ کو دو مہینے براہ کرم دیکھتے ہیں۔ ہمیں قدرے نیچا ہوا کہ اندر اس جگہ تک پہنچنا پڑا۔ کچھ بڑے کچھ بڑے ہاتھ لپٹنے کو پاؤں جانب میں بھیست لیا۔ اب میں بھی کبھی نظروں سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ اوپر جو دیکھا شاخداروں میں ایسے چرموں زدن کھلے ہوئے تھے سواری کی ذرا ذرا چندری گزریں آگے جب ساتھ جتنی سماں ہاتھ سے ہوئے تھیں بابائی نے میرے سرخ پاؤں چار لپٹے تو میں انہیں گواہ کر کر پالے پالے ڈالنے لگا۔ شاید کسی امریکے کا انتظار تھا کہ وہ انہیں اپنے پچھتے سے نیم دراز تھے۔ ظاہر ہے اگر وہ تھیں تو میں ایک ڈیڑھ پڑ جائے تو وہ بھی جھپٹاں اگلا لپٹاں توڑنے لگتا ہے۔ پتہ نہیں کس آسودہ محل میں میں بیٹھے بیٹھے لڑھک گیا۔

ٹینڈے سے موت صفیرہ کہتے ہیں 'بب کسی صفیرہ سے پاپے شامیائے کھول دیجی ہے تو پھر قیامت کی آمد بھی اس کی لہ لہیں ڈھیلی نہیں کر پاتی۔ چڑھی ٹینڈے بھگ کی ترنگ کی طرح بھی کہ اس کی اہلو سے میرا پھسا ہوا بھگڑی انگری کے جالے میں قفس کی مانند بکرا ہوا ہوتا ہے۔ آفریقہ مری کے پیٹ سے تھکے ہیں کچھ کر اس کی ٹینڈا چاٹ ہوتی ہے۔

جب میری فیند کی ساری چاکلیٹ ختم ہو گئی اور اندر سے ہوش کی گینڈی نکلی تو سورج کا منہ ماتھا سارے دن کی تمازت سہ سہ کر لال بھجھو کا ہو رہا تھا۔ گھولسوں کو کھاتے ننھی بکھیروں کو بیچ ماروں نے اک سماں باندھ رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ حواس بحال ہونے شروع ہوئے تو بہت سے سوال اُتر اٹھائے کھڑے تھے۔ ہم کہاں سے چلے تھے کہاں پہنچنا تھا۔ بس کا مار چنگر بنوا ہاں انتظار کرنے کی بجائے ہم سیدھے ادھر کیوں چلے آئے۔ کیا مار کے لیے یہ ضروری تھا وہ سبیں ہانس واڑی کے سامنے چنگر بوجھا۔ ذخیرے کے اندر اسی خاص مقام پہ بیٹھنے لیٹنے کے لیے یہ جگہ کسی نے ہموار اور محفوظ کی کہ ہم ناک کی سیدھ سیدھ سے یہاں آ بیٹھے۔ پھر کچھ دیر بعد بے سندھ فیند نے آ لیا.....!

یہ ظاہری سن بلوغت سے پہلے کا زمانہ تھا۔ ابھی جو بڑوں کے گندے اٹھلے پائیوں سے ”اٹنے ڈولنے“ کپڑے سکھتے تھے۔ شوریدہ دریاؤں کے کمرے سمندروں۔ مونچھے مڑ جا کھوں اور سپیوں کے ٹوٹا ٹوٹا مڑواریدوں سے واقفیت حاصل نہیں ہوتی تھی۔ ”بابائی کی جانب دھیان دیا ایڈیٹ سی نیند میں آتے تھے یا مرقابہ میں اترے ہوئے۔ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آنکھیں کھولیں تو رُپ چھوں سر کا۔ سسٹانوالی کا آراہ ہے یا اوشن پائس والی“ میں ہی قیام و قرار کا غلط ہے۔ یہی جگہ سوچ ہی رہا تھا بابائی کہ آنکھوں کے درختے و اوشن پائس کے درختے سے دیکھتے ہوئے حیرت پائیں فرمایا۔

”ہر قوم کی کوئی نہ کوئی منزل ہوتی ہے کسی کی کوئی شہنشاہی اور کسی کی لختہ وصال۔ اور وہ شہنشاہی وصال سے بہت چھپ کی مانتے ہیں۔ مزید فرمایا: مسلمانوں کی پانچ ہزار ایک قلعہ دہری اور تین ہزار ویش اور ایک سالک پیش۔ باقی سب لالہ و سب تو کھنڈہ کھنڈہ ہے۔“ گوئے دیاں رحمتاں شنگہ دی ماں ہی چاہے۔ دی نوں دی ہی پیچانے۔“

ان کی یہ نگہی ہی باقیں رہ چے ابابیوں کے خمریت کی طرح ذوق سے گزرتی گئیں۔ ایسی ازموغلی باتوں کی نمن نمن لینے کی سادہ رکھش و ناکس میں کہاں ہوتی ہے! اسیں ہونٹوں کی مانند ان کا چہرہ و شریف بننے لگا۔ مجھے اس طرح استعجاب میں ڈوبا ہوا یا کرمزید فرمایا۔

”اگر بیچو، نہیں تو یاد ہوگا کہ تم ریاضت بیچ کر ہم کے بارے میں کچھ جاننے کے لیے بے چین تھے۔ کوشش پسار کے باوجود جب تم کہیں سے ساقول معلومات حاصل نہ کر سکتے تو مجھ سے اس بارے پوچھنے کا سہا پناہیں اسی دوران اچانک ابھر چکے تھے کی راہ نکلی و کھائی دی۔ غور کیا تو محسوس ہوا کہ یہ سب سلسلے و سلسلے تمہارے بیچ کر وہ خلیفہ کے لیے عمل رہے ہیں۔ اب میں سارا راستہ سبکی و کچھ ہاتھ کا کہاں تمہاری اس ریاضت کی تکمیل کے لیے جملہ انتظامات موجود ہیں۔ سمجھو یا نہ سمجھو مگر سنو! اس بار سورج بارہ کے باج نزدیک حمل

میں جوہری پارکھ لوہا ساز ترکان و صوفی زنگریں چو بڑے ذاکینے' لوہی اور نیوڑ چو کیدار چرواہے' لوگر کا سے وغیرہ یہی بابہ درویشی ہی تو ہوتے ہیں۔ یہی کام پیشے اصل میں ان کی ذات اوقات ہوتے ہیں۔ ولی ولایت والا ہوتا ہے وصانت وورافت اور اوچی منصب و مقصد والا اس کی آن و شان نرانی جبکہ بابہ بیکار کی بیگار اور درویشی و ورور ہمیشہ....."

لدا جانے وقت کی کہسی گرجھی جو ٹھٹھنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بابا جی کی گھل باتیں جو شاید کانوں کے لیے نہیں تھیں کہ ان سے کچھ مطالبہ نکالے جاسکیں۔ یہ باتیں میرے سر پہ سے ان پرندوں کی مانند گزر رہی تھیں جو شام و صبح اپنے اپنے ٹھکانوں کی جانب رواں ہوتے ہیں۔ ان بھر کی کھوٹی کوچ' چچا چار نکلتے پونوں کے بھار اور بام مینا سے اترتے سرخ رو سہراج کے شمار سے ان کی باوقی جھوٹی ترکھڑاتی سی آواز میں یوں جان پڑتی تھیں جیسے یہ کسی افلاکی سے غارت سے نکلتے ہوئے ہوں۔ بابا جی کی خچدری آؤلوں سے شفق کے رنگ ابھرنے لگے تھے۔ جب شوشی کی ٹھکی ٹھری کر دھانس دینے لگی تو بابا جی دھمکتے ہوئے بولے۔

"تو بیکار کو تو آسمان واضح دکھائی نہیں دے گا کہ سفلوں کے ٹھٹھنے پڑے راہ دکھاتے ہیں۔ قافوں کا نام آج ان نہیں اور نہ ہی فلک آسمان ہوتا ہے جسے شمشاد اور عقیق ہر اس آدمی کے دل و فکر پہ تمام دہائیوں کے ان پادشاہوں نے لکھ دیا ہے۔ یہ سب کچھ ان کے پاس کے پادشاہوں کے دل و فکر اور سیاست کی تفصیلی کے تحت آؤلوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دیکھ سکتے ہو کہ ہمارے گرد و گھوم سفلوں کے پانچ ٹھکانے ہیں۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ان پانچوں ٹھکانوں میں تین تھیں گرد و پڑھتی ہیں۔ سب کی سب سے ان ٹھکانوں میں عرب گریں بھی پیدا آؤلوں کی۔ ان پادشاہوں نے لکھ دیا ہے کہ سفلوں کا ورو پانچ منزلوں میں لے کر مقصد ہوتا ہے۔ تمہیں اس گڑی کا کسی اور گائے سہراج کے سے بننے سے ملاپ ہے۔ برقی رفتار ہاتھوں کی آوازوں سے حاصل ہو جائے گا جو تھمارے سر اوپر پڑ پڑاتی ہوئی گزریں گی۔ یہ سے رات ایک پہرہ چٹنے کے بعد ہی متوقع ہوگا کہ اس بعد سے بائیں میں سفلوں کی پہلی کاپی ہوگا جو رات لیتا ہے۔ سیپ کے بیٹ میں چرے قطرہ نیساں میں امر الہی اترتا ہے۔ سہری فصلوں پر گاہاں ہار میں دانہ مضامین و مضار پیدا ہوتی ہے۔ اس سٹکھن سے کے آگے پیچھے ارضی معدنیات میں نکھوتے اور شگفتے کے آثار شروع ہوتے ہیں۔ وزن ٹم میں بھاؤ رنگ و سادہ مکمل ہوتا ہے۔ گہرائیوں میں مہاسے کے سحر میں آتش فشانی کے لیے راستے بنتے ہیں۔ پتہ نہیں پہلو بدلتی ہیں۔ پہاڑ ٹھٹھتے ہیں۔ یہیں جہازات اور قسم جہازات بھی اپنے رنگ و آہنگ میں نکھار اور جمالی جلالی تیروں میں نکھاوٹ لیتے ہیں۔ ان کے روحانی شگفتی اور جسمانی درجہات ہوتے ہیں اور اس طرح مخلوقات جلیلہ کی دسترس میں پہنچنے کے امکان پیدا ہوتے ہیں۔ لدا کی حکمت اور

شان۔ اسی وقت سعدہ شخص میں سے کی اک کروٹ یوں بھی کہ سچ کے سامنے منہ کے دائیں بائیں گھج نہ سکتی
کی جزیں پھونکتی ہیں جو ہر جوہر کہلاتے ہیں۔ منو گھنے کی منو گھنی کو پہل کھڑی لے کر نباتات و جمادات کا جوہر منو
جان مر جان بنتی ہے کیلے میں کا نور کی پلنگی پڑتی ہے۔ سندل و زعفران، مختلف میں خوشبو خوش رنگی آتی ہے۔
مار سپاؤ کی پتلیوں میں زہر جلائی اور پتلیوں کے نیش میں قطرہ شیش پکاتا ہے۔ اسی سے کے آٹ پیسہ میں
ناف ہتھن میں کستوری، نعل کی کستور و پھلی کے ماتھے میں تنک ماسی۔ مقام شام اشعہ ایوان اسو کے گھڑوں پر
کے سنج یوسف میں سیاہ گلاب۔ جمیل سیف الملوک کی ناف سے آسماں زلال ٹپکاتی ہیں۔ جنہ کہ
معد نیائی اور زوحانی تاثیر سے جن پر یاں اُس اور دیگر مخلوق مستفید ہوتی ہیں۔ کسی صاحبِ ہوا کا جسم

اصل حاصل اس لہذا اس کی پہلی گروہ ہے جو اس کو دیکھ کر غم کی شکل پا کر کی نکال دیا ہے۔
نصیب ہوتا ہے کہ جس خوش بخت کو اس سجدہ سعادت کا اور اک و انبیا طیل جائے وہی شیخ تن کی طفیل و برکت سے
شاہ گیارہ ان کے معیار حیلہ سے شیخ گنج عرفان صاحب شیخ نذیر گروہ طیل و حیلہ و حاصل انہماک شیخ سعادت
کے مراتب کا انہی ہو سکتا ہے۔

UrduPhoto.com

ہی کا فوری ہی کیفیت میں کھینچا جا ہوا تو اس وقت کچھ اور آگے سرک لیتا ہے کہ اس میں ایک
خاکستری لہر سرخی رنگی فضا میں برکرا نہ میرے میں زلزلہ جاتی ہے۔ عشرتے طاری اور دیگر شب
یا نور اپنے اپنے جوشے کا احساں دلا کا شروع کر دیتے ہیں۔ تمام کے نوخیز ہونے میں شاید کچھ ایک
تقریب ہی کہیں سے لہاے لہائی اٹھاتی ہے۔ ہوا ایسا پرند غزلد پہ اک چپ ہی لڑ جاتی ہے۔
کے دور اپنے دل کی دھڑکنیں بھی بے دھڑک ہی ہو جاتی ہیں۔ مومن کا روم زوم معوض کا افسانہ

ہے۔ دیکھا جائے تو معرقتی نماز تو اذان کے درمیان ہی ادا ہو جاتی ہے جبکہ ہدفی نماز کا سفر بعد انہیں طے ہوتا ہے۔

[illegible]

یہاں ہنسی داری میں ہی اک نماز سر پہنچی۔ مودبان کے حُبیبی علی الصلوٰۃ کہتے تھے ہم ایک کھیت کی بازگاہ پہنچے تھے جدھر ایک پتلی سی آب جو کھیتوں کو سیراب کر رہی تھی۔ طہارت کے بعد ہم آگے

پیچھے واپس اپنی خصوصیت جگہ پہ پہنچ چکے تھے۔ نماز سے فراغت تک اندھیرے میں مزید برکت پڑ چکی تھی۔
 اک لمبی سی ٹپ ڈعا کے بعد بابائی جیسے مراقبہ میں اتر چکے تھے۔ کچھ کہنے پوچھنے کا یا ر کہاں؟ کچھ سمجھ نہ
 پائے تو ٹپ کا سہارا لینا پڑا ہے۔ سو اس وقت میں بھی ٹپ کا سادھو بنا بیٹھا تھا کہ ناگاہ تیز ہوا کا ایک تھکا
 جھدر سے بانسوں سے ہاندر لگا کھلتا نور اہم سے چھیل خالی کرنے لگا۔ تازگی اور شروع شب کی شریعت کی
 احساس ہوتے ہی بابائی نے مجھے دوزانو ہونے کا حکم دیتے ہوئے اپنے ساتھ ساتھ شیخ طورہ کی تلاوت کے لیے
 کہا۔ پانچ بار پڑھنے کے بعد میرا تھکا دائیں جانب ہانسی کی جڑ کے ہالشت بھر اُپر دھرتے ہوئے فرمایا۔
 "تین گروہ پڑ چکی ہیں مزید دو گروہ اگلے کچھ وقت میں ظہور پڑیں ہوں گی۔ ہاتھ بنائے بغیر شیخ
 کی تلاوت جاری رہے۔ اسی دوران ایسے لحاظ بھی وارد ہوں گے جب تمہیں احساس ہوگا کہ کچھ
 دائیں بائیں آگے پیچھے بانسوں کے تھکا ہونے کو نہیں سمجھنا ہے۔ شہید و دروہور تکیف
 محسوس ہوگی لیکن میرا تصور لاتے ہی یہ سب کچھ منظور ہو جائے گا۔ یاد رہے یہ لحاظ دو پہر شب بیٹنے کے
 بعد دہرایا ہوں گے۔"

قدرتِ غامضی کے بعد پندرہ منٹ سے اندازاً ایک گھنٹہ فرمایا۔

UrduPhoto.com

مجھے بتائے کہ کان سننے کے لیے ہوتے ہیں۔ مگر ایسی باتیں کانوں کے لائق مرزا ہیں۔
 یہ تو کہیں اندر جا پہنچ رہی ہو کہ نہیں۔ انہیں جسم نہیں جان سکتی ہے۔ اس وقت بھی میں کچھ نہ
 آئے سامنے بیٹھے اک ڈوبے کا سایا بنے کہ اندھیرے میں سامنے بھی بڑے کبرے کے سامنے کھڑے
 ہوتے ہیں۔ عشق معشوقی پر ہی چکاری اور روشنی فیری۔ ان میں اگر چلنے کے بھی شامل کر لیں تو یہ
 کھینچیں کھینچیں اندھوں اور اندھیراں کے لیے تو ہوتے ہیں۔

ماشتی پر، فطیر خدا توں منگدے ٹپ نہی،
 اک لٹا دے اک لے اک کھدے سب ج تیرا

مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ دیتے ہوئے اپنا کھ بابائی اٹھے۔ اپنے سیاہ تھکا کھڑے یہ
 غصہ اٹھانا اور میرا کھدھا تھپاتے ہوئے مزید فرمایا۔

"چلے کچ گروہ پہ گروہ پڑے ہی اک کت کتیری قہار سے سر پہ چڑ پڑا تے ہوتے
 گی۔ یہیں تم نے ہانسی کی پانچویں گروہ پہ پڑی گرفت ڈھیلی ڈال دی ہے۔ احمد نے کہتے ہوئے

میں عام فہمیت و مکنات کا کوئی فرد ہوتا۔۔۔ چوروں اور سادوں کی گتیتوں میں سوانوں آدھوں اور پونوں کا رواج کس ہوتا۔ ان کے ناپنے کے گز اور تولنے کے پات بھی جدا جدا ہوتے ہیں۔ ان کے فرلانگ و فرسنگ بھی ایک فاصلہ فردا ہوتے ہیں۔ بوش کے ناخن لیے تو وہیں پہنچا ہوا تھا جدھر بس کا ناز بنگلہ اور میرے چلنے والا یہ دو چکر شروع ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ فالتو ناز بھی خراب تھا۔ رات کے وقت کوئی بس گاڑی دستیاب نہ ہوئی تو ایک سسٹ روٹریکٹر کے ذریعہ سرگودھا نازلے جایا گیا اب کہیں جا کر بس اس قابل ہوئی کہ آگے سلاٹوالی کی جانب رخ کرے۔۔۔ بابائی اندر بیٹھے میری جانب دیکھتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ راستہ بھر ہم دونوں کروچیلانیوں غم غم بیٹھے تھے جیسے ہمارے پاس کبہ سننے کے لیے کچھ بھی نہ ہو۔ خالی خالی بانہرے بھرے۔

متنورے کے تانت و خلیل ہوں یا تنے ہوئے دونوں حالتوں میں حرکیات سے خالی نہیں رہتے۔ ہر اچھی بڑی کیفیت میں اک سواد ملذذ اور آتی کھان پین ہوتا ہے۔ کسی کیفیت کا طعم خوشی، غم، غمی اور چہرہ رکھ کر لیا جاتا ہے۔ کسی کا اظہار کر کے ہلکا ملہ چھپا کر لیا جاتا ہے اور کسی کیفیت کا مزہ بڑے قہر سے لیا جاتا ہے۔ کیفیت میں اس قدر حریف اور جذب کا حیرت سا استرازا ہوتا ہے۔ یہی حالت اس وقت کی ہے۔ میں بظاہر اللہ خلق رکھائی ہے۔ راجھا۔ مگر میں بھی اور دو بھی خوب سے کہ۔ اصل میں وہ میں ایک اور ہے۔

UrduPhoto.com

روچیدہ کالمیں، مضامین، دیکھیں۔

سید انور علی شاہ نے اپنے مباح کا لب کی سنگی تک بھی تھی۔

میں نے اپنے اپنے گھر میں رہنے کی بات کی تھی۔

يا سبحان الله الله الله!

ایسے سویرے سویرے کہ نہ اسے رات کہیں اور نہ صبح۔ کشمیر کے بس لاری اگلے پہاڑ سے تو
 دھل پہ خاکروب نظر آیا یا ایکہ آدھ چالے پانی کی دوکان۔ پتھر میں سویروں نے اس سے اترتے ہی
 اپنے اپنے لہکالوں کی طرف منہ کر لیا۔ ہم بھی نیچے اتر کر شر کے نواح کی جانب ہولے لے گئے کہ شاید بابائی نے ادھر
 جانا ہو۔ گتے کا پر اندون میں چپے چپے بچے بھول رہا تھا۔ ہم شہر سے باہر غائب ہو کر تک نکل آئے تھے۔ گہری
 رات پر جانب ہزار ہی سڑک گھنے درختوں پر پرہے کی انجلی جھگی سے نہیں جاتے تھے۔ سوا کوئی اور گلوں کے
 یہ گیت گایا جاتا تھا کہ ہے اور دو جا شہر و زور و زکا زور و دار۔ شہر کی ہی اندھنی اندھنی پردانی۔ تھکاوے
 سے ہمیں ذول بدولی رہا تھا۔ بابا قتی نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”تھک گئے ہو یا کچھ گئے ہو؟“ تھک کو ان پر نہیں تو کچھ ہوتا ہے دمڑوں والے روشن خمیر باؤں

صاحبوں کے ہاں ایک بات میں سوسو ہاتھیں اور ایک گھات میں کئی کئی گھاتیں اور گھاتیں ہوتی ہیں! غصہ یا طالب اگر ذرا سا بھی اندر سے گھبرا ہو تو وہ ان باتوں گھاتوں سے رزمیں نکال نکال کر مزید پانی پانی بھرتا ہے۔ میں ابھی تھکا اور تھکے کے کھوبے میں ہی ٹھہرا ہوا تھا کہ مزید ارشاد ہوا: ”جسمانی مشقت سے انسان تھک جاتا ہے جبکہ روحانی محنت سے وہ کھٹک جاتا ہے۔“

جن کتھے گزاری آرات ڈے..... میرا دل دلیلاں دے دولت دے

راہ میں پڑی ریلوے پٹری عبور کر کے ہم اب دھلوان سے وسیع و عریض رقبے میں اتر آئے تھے۔ چند گھنٹہ پرے ایک چھان سی دکھائی دی جس پہ گھاس پھوس کا ایک قہر سا بھجوا تھا۔... ذرا بہت کر ایک کٹی کٹی پہاڑ یا ہر بندھی بکری اور دو ننھے مٹے مٹے... جو ہمیں دور سے ادھر آتے دیکھ کر ہمیں میں کرنے لگے تھے۔ ہم ان کے قریب نہیں پہنچے تھے کہ ایک دیہاتی کمرئیدہ پورھا کٹی کے منہ سے برآمد ہوا۔ ہماری جانب دیکھتے ہوئے وہیں سے ہاتھ ہار ہار کر سلام کرنے لگا۔ بابا جی نے بھی ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیا۔ وہاں تک پہنچنے میں ہمیں پادروں پر نہیں گئی مگر اس اشد میں اس نے کمال پُرتی سے نکلی کے باہر کھات سیٹھی کر کے کہ۔ تو ایک چھائی ننھا، عرا چند قدم آگے بڑھا کر جلاوا استہال کہتے ہوئے کہہ کر تھکا۔ یہی میں اس کے ہمراہ گئے۔

UrduPhoto.com

”چھائی ہی ہتی مرٹھ ایسے کتے کام؟ سبحان اللہ! ایچ شیخ مہارکاس!“

گھٹ سے تیرا منہ سے نکلا۔ ”بابا جی! است ست نہارکوں تو کٹا تھاں نکلی“

گھرا گئے ہی سر اسٹاں نکلا کہ میں گھبرا ہوا اس کے منہ میں صاحب حال و حال سے توجہ طور پڑا۔ ”یہ کرو کی مبارک دی ہے۔ شرمندگی سے جھٹے ہوئے میرے سر کو اوپر کرتے ہوئے لمبے سے کہہ۔“

”اچھا اب پنا ذرا صبح کا ٹھہرا شام گھرا میں آجائے تو اسے کیا کہتے ہیں۔“

میرے اندر سے ہچکولے اٹھتا ہوا جواب نکلا۔

”اُسے ٹھہرا ہوا نہیں کہتے۔“

”نہو ماہیں میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سبحان اللہ! کیا اور پوچھنے لگے۔“

”..... اور جو شام کا ٹھہرا ہوا صبح دم لوٹ آئے اُسے کیا کہیں گے؟“

اب میں بڑھکھلایا کوئی بھلا جواب بن نہ پایا تو بھلا منہ ہی کہہ دیا۔

”شاید اُسے بھی ٹھہرا ہوا ہی کہیں گے۔“

”سبحان اللہ! کا کا“ کیا قائم و قائم جواب دیا۔ لیکن اگر تم اس طرح کہہ دیتے۔ ”صبح کا ٹھوٹا“
 شام واپس گھر پہنچ جاتے تو وہ بے سہارا اور غیر ذمہ دار ہے کہ دن کے اُجالے میں جھٹکنے کا کیا امکان۔۔۔؟“
 سبحان اللہ کہتے ہوئے مزید فرمایا۔ ”اور شام کا ٹھوٹا صبح گھر آ جائے تو اسے بھٹکا ہوا کہہ سکتے ہیں کہ
 اندھیرے اور سیاہی کے ایک رخ میں قسموں خیزی اور فسیان انگیزی بھی ہوتی ہے سبحان اللہ اور ہاں ”مزکر نہ
 دیکھنا پتھر ہو جاؤ گے“ اس کے بھی کچھ بعید ہیں۔ اعلیٰ نے سمجھی اور بے حس کی راہ سے گزر کر بندہ جس
 مقام بصیرت و بینش اور محنت تک پہنچتا ہے وہاں سے مزکر چھپے نہ دھجی ہوئی راہوں کو دیکھنے سے وہی تاثر
 آ جھرتے ہے جو سنگواروں میں پھنسے ہوئے کسی اکیلے انسان میں پیدا ہوتا ہے۔ پیاز ہوں یا جنگل۔۔۔ سندھ یا
 صحرا ان سب کے اپنے اپنے بعید ہیں۔ سبحان اللہ! ہر مشقت محنت یا ریاضت و مجاہدہ۔۔۔ چلے مراقبے وغیرہ
 ان سب کا مقصد بعید بحیث جاننا ہی تو ہوتا ہے اور جاننے سے علم حاصل ہوتا ہے۔“

کچھ دیر سانس سیدھی کرنے کے بعد مزید فرمایا۔ ”سبحان اللہ! آپ لوگ ٹھوک لہا سفر اور بہت سی
 مشکلات اٹھاتے ہیں تک پہنچنے۔ ہر وہ قدم جو حقیقت کو سمجھنے جاننے کے لیے اٹھایا جاتا ہے وہ ٹھوک لہا و پہاڑ
 اور مہانت ہی تو ہوتا ہے۔ پھر کے سے کی بات ہوتی ہے پھر اس وقت یہ سن اور اپنے مقصد پر ات ہوتی
 ہے۔ اس سے پہلے ہی کہہ رہا تھا۔۔۔“
 اسی اثناء قریب ہی کسی مسجد سے اذان بلند ہوئی وضو طہارت کے بعد بیٹھیں ٹھوٹا کر نماز سے
 فارغ ہوئے تو آٹھ بیس منٹہ جاری تھیں۔ بدن بھٹکولے کھارہا تھا۔

بابا سبحان اللہ نے ناشتہ کا ٹھوٹا پہلے ہی سے بندہ سے کیا تھا اتھارہ ایک سائیکل سوار گرم گرم پانی سے
 ٹھنک رہی اور سوزن کا اچارے کرتی کیا۔ وہیں کھاٹ پہ دست خوان بھاریا کیا۔ کسی کی گزری بات کی طرح
 بھوک بھی جیسے بھول چکی تھی۔ ان کھیتوں کھلیانوں کے بیچوں بیچ کھلی نصائیں اس قدر لالچا دیہاتی اسٹاک کا
 من و سلوٹی دیکھ کر بھوک اشکارے مارنے لگی۔

آپ کو شاید اندازہ نہ ہو کہ کئی بابے کے پاس چڑ کر کچھ کھانا پینا کس قدر مشکل کام ہوتا ہے اور یہاں
 تو ایک چھوڑو بابے۔ سبحان اللہ اور اللہ جبکہ میں درمیان میں چھٹا ہوا استغفر اللہ۔۔۔ اسکی سچی سے
 تر تر لے ہوئے بلوں والے خستہ پیراٹھے۔ اے موئے موئے ریلے سوار نے ٹھنک لالچا تارہ ہوتی ہوئی
 کسی وہ بھی دافر۔ اس پر ستر لالچا ہائی فیلوں کی خوشبو سے مست لالچا پانی پانی ہوا۔ اور ابھر ناشتہ
 یا بہشت سے اتر آوا کوئی پکوان۔۔۔ بابا سبحان اللہ خود بھی پھینا کچھ نہ کچھ کھا رہے تھے گرم گرم چٹا کو اسرار کر
 کے زیادہ کھلا رہے تھے۔ کھانے والوں اور کھلانے والے نے خوب اپنا اپنا حق ادا کیا۔ دست خوان سمیٹتے ہوئے

گھنٹھیل گھنٹھیل باتیں کرنے اور ذریعہ فہر کی عینک لگانے کا بڑا جنون تھا۔ سوچ یوں کہ انوکھی منہل باتیں کرنے اور مونے فریم کی بھاری عینک استعمال کرنے والے دانشور شاعر پروفیسر وغیرہ لگتے ہیں۔ بس اسی کیپٹیکس میں جتنا میں عینک لگانے لگا۔ یاد دوست یا رشتہ دار پوچھتے تو کھٹ سے جواب دیتا۔ بس پڑھائی کھائی سے نظر ذرا مدھم چمکتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے کچھ عرصہ میں مجھے واقعی ہی حقیقی عینک لگ گئی۔ حیدر علی عینک ساز گھاس منڈی والا میری آنکھوں اور بینائی کا حشر دیکھ کر پوچھ رہا تھا۔

”کا کا! کچا بتا یہ عینک تم نے کہاں سے حاصل کی اور کب سے اسے استعمال کر رہے ہو؟“

حیدر علی آنکھ کی یہ بات سن کر میں شپٹا کر رہ گیا۔ آنکھ حیدر علی جو سیا لکھٹ میں واحد جدید قسم کی عینکیں بنانے والے اور وہ کا مالک اور میرے آپاٹی کا دوست تھا اور ہمارے محلہ کالج روڈ پر ایک خوبصورت سی کوٹھی میں رہتا تھا۔ عینک کو آرٹ پلیٹ کوڑا کیجئے ہوئے وہاں استقبال بھرتے لہجہ میں کہنے لگا۔

”کا کا! مجھے یاد آتا تھا یہ عینک میں نے کوئی ڈیڑھ سال پہلے ماسٹر سکندر خان کو اس کی نظر کے مطابق بنا کر دی تھی ان یوں اس کا آنکھوں کا آپریشن ہوا تھا۔“ پھر وہ عینک کا نمبر چیک کرتے ہوئے بولا۔ ”میرے یہ قوف شکر کر لیتے کچھ نہ کچھ دکھائی دیتا۔ بابا کچھ دیر مزید لگا رہے تھے تو بہت دیر پہلے انہیں عینک سے عینک اپنے پاس لے گیا۔ یہ عینک بھی ان کی بینائی کی خاطر بنائی تھی۔“

میں شیشی عینک فراہم کرانے سے باز چلا آ گیا۔ اگر میں اسے یہ بتا جا کہ یہ کون سے فریم اور عینک والی عینک میں نے تپا سکندر خان کی عینک انتقال کے بعد ان کی کتابوں والی لکھاری سے ڈالی تھی کہ اس کا فریم میرے چہرے پر خوب فٹ بیٹھا تھا اور مزید یہ کہ اب مرحوم کو اس سڑکی ہوئی سڑا خانوں شامل وہاں جگہ کی ضرورت بھی نہ تھی کہ غور سے چاہے ان کی بینائی کیسے بھی کمزور نہ ہو عینک ہرگز استعمال نہیں کرتے تھے کیا پتہ تھا کہ عینکوں کے بھی جوڑوں کی طرح نمبر ہوتے ہیں۔

بات شاید غرائز انوکھی تھی اور میں عینکوں کی جانب غل آیا۔ آپ کے مشاہدہ میں ہو گا کہ آخر اسے گھر میں میں چھوٹی موٹی چھڑیاں ہوتی رزقی ہیں اور وہ چھڑیاں یا دارہاتھیں گھر کے کم از کم نوکرانہ ہیں۔ دارہاتھ کے سر منڈھ دینی جاتی ہیں۔ چاہے وہ کام کسی اور انداز پر والے کا ہو مگر زندگی اپنے گھر سے کسی کو باہر نام فرما پھرتا ہے۔ میرا بھی کبھی حال رہا کہ زندگی کے متنوع رویوں انعلوم و فنون کی جھلک یہ تھی۔ تصوف و سلوک کی گونا گوں روپیہ پیوں مسرو فیات جاسنے بوجھنے کی پینک اور نفع جذب کی خدا داد خوبصورت سے مجھے غم و میاں اور میرے دماغ کو اس کی ذمیل بنا دیا ہوا تھا۔ کوئی بھی کمال و ذوال کوئی خرابی عزت و...

خوشیاں گہما گہمیاں۔ سورج چمکنے پہ جب طلاق والی معاملہ کھلا تو پورا گھر ماتم کدو بن گیا۔ دلہن سکنے کے عالم میں رقم صدمہ اسے کچھ کمن من ہو تو بتائے بھی۔ یہی کہہ کر وہ جوں کا منہ ٹھٹھنے لگی کہ سب کچھ گج گزرا اس علی الصباح اذان سے 'کدو' اٹھے اور غسل خانہ میں چلے گئے۔ اسی دوران کہیں مجھے اونگھ آگئی۔ بد پر ذرا وہ کھٹکھٹانے پہ جب جھکا لے کر بیدار ہوئی تو قسمت پھوٹ چکی تھی میرے سینہ پہ حق مہر کی رقم کا چیک اور طلاق کا کاغذ صرا بھواتھا۔ پورا فتنہ کھولنے سے پہلے تھوڑا سا اونگھ کی بابت بتا دوں کہ یہ کیا ہوتی ہے؟ سیپا یہی ہے کہ کوئی بات اچانک بے بن میرے یاں سے گزرتی ہی نہیں۔ میری فہماتی جراثیم کی شہر زنی کے بغیر کوئی مسئلہ آگے نہیں سرکتا کہ یہ میری عادت نہیں مجبوری ہے۔ بس ایک آدھ بات اونگھ کی بابت من لیں۔

فینہ موت صغیرہ ہوتی ہے اور یہ اونگھ اس کی ایک تخلیق سی سبلی۔ کہ سہیلیاں خوبصورت ہوں یا نہ ہوں اچھی لگتی ضرور ہیں۔ یہ باقاعدہ فینہ اور بے قاعدہ بیداری کے درمیان کی کوئی اونگھ سی سرستی نما اک کیفیت ہوتی ہے۔ جسم بڑا سا پیرکے پہ نہایتن آگلیں پڑھی ہوئی نکلی نہ پوری طرح بند۔ ذات سبکسلی نائن اور اناٹہ شیداز کے درمیان کا کوئی سرور۔ سستی بھی اسی سرور میں چل اور تھل ہو گئی تھی۔ جگہ عروسی میں بیوی اور بستر مرگ پہ باغیچہ کی آگلیں بعض اوقات خاصی تھری تھری اور فتنہ بگڑتی ہیں۔ منہ کی اونگھ اور منہ کی اونگھ کی اونگھوں میں اتنی سی کھلی کھلی بات اور کھلی کھلی بات ہے کہ سب کو دیکھیں شامل ہو جائیں تو وہ خیر خواہ جہم بن جاتا ہے۔ من خواہ میں لڑنے شامل ہو جائیں تو اس کا فائدہ ہائے کوئی چاہتا ہے۔

بات پہلی رات ہی طلاق کے فائدہ تک پہنچا تھا۔ گندہ گندہ بات تھی۔ انسانی روتوں کی اس ایلا میں ایہ اور اس سے بلاہ کر بھی بہت کچھ ہوتا رہتا ہے۔ دلہن روت خوبصورت تھوڑی سی لکھی اور ایہ خاندان کی تھی۔ باقاعدہ طے شدہ شادی تھی۔ زویا دلہن نے اپنی سہاگ رات روائی انداز سے گزاری۔ سچ دم زویا میاں کیسے غسل کے لیے دوش زوم میں کھسا۔ تھکی ہاری دلہن نے پلہ کی پلہ جو فرستے پالی تو وہیں آکر وہی ہو کر بیٹھی لے لی۔ اوکھنے میں جو غسل پڑی تو خزانے کو لے گئی۔ اب اونگھت فٹو دگی یا بار فینہ کی حالت میں انسان کو کیا خبر کہ وہ خوبصورت سر پہلے یا خوف صورت بھیا تک ڈرا دینے والے خزانے لے رہا ہے۔ دلہن پچھاری خزانوں کے مرض میں گرفتار تھی۔ اوکھا نہا دھوا دھس پلا تو دھو خزانوں کا روت چل رہا تھا۔ کبھی ہیں کی آواز کبھی تھنوں کی جھلجھلات۔ غبار سے ہوا نارنج ہو رہی تو کہیں دلیاں غرا رہی ہیں۔

خزانوں کے ساتھ ساتھ منہ مٹا پہ بھی عجیب و غریب سے تاثرات ابھر رہے ہیں۔ ماتھے پہ ٹل پڑ رہے ہیں تو کہیں بیٹھے ہونٹ مسک رہے ہیں نیم مسکراہٹ تو کبھی خفگی کی چڑچڑاہٹیں۔ وہ عجیب پنہا دیا یہ سب نوٹنگی دیکھ رہا

غیر معقول جواب دیتا۔۔۔ ٹیلیفون کی ٹرن فرم نے متوجہ کر لیا۔ میں اس کی جانب ٹیلیفون پڑھاتے ہوئے کہتا۔۔۔۔۔ ”لو بیٹا! تمہارے ابا جان کی کال۔۔۔۔۔“

وہ چوکتا سا فون کو ٹھکورتا ہوا ہوا۔

”بابا جان! ضروری تو نہیں میرے ڈیلری کی کال ہو۔ آپ نہیں تو سہی۔“

”جیتا اسحق کے امیر کے مطابق ’فون کی دوسری جانب چوہدری بشیر احمد ہی ہونے چاہئیں۔ وہ اپنے مرد بیٹے چوہدری نوید احمد کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ وہ وہاں پہنچ چکا ہے چوہدری نے اس انتہائی قدم اٹھانے کے بعد یقیناً چاہئے تھا۔۔۔“

نیلینوں مسلسل بنا رہا تھا۔ میں نے چودھری نوید کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

”لوٹو یڈی سے بات کرو اور کہو:۔۔۔ میں آگے اڑ رہا تھے میں کھڑے ہو رہا ہوں۔ میں یہاں بابا جی کو سلام کرنے آیا تھا۔“

اُس نے ایسا ہی کہا۔ یہ ایفون ہے، کمپیوٹر اس کے گھر بیٹھے بیٹھے ہمیں دیا ہے، ٹھنڈی سی کیا تھا۔

[illegible]

ہم دونوں کروچیلہ جب گھر میں داخل ہوئے تو ہمیں کھانے والی نظروں کا سامنا تھا۔ گنتا تھا کہ ہم بھگورے بھرے ہیں اور آپ جرجے میں اپنی صفائی پیش کرنے کے حاضر کیئے گئے ہیں۔ میں تو ایسی جلیلا سیلہ

میں ایسی نادانی کے لیے بھی گنجائش موجود ہے۔ اگر تم میرے چند سوالات کا جواب دینا پسند کرو تو میں،

لڑکا بیچ میں بات کا نئے نمونے بولا۔ ”مولا! باا ضرورت و رعیت نکاح کرنا اور بوجہ و کراہت طلاق کا شرعی حق مجھے حاصل ہے۔ میں اس ضمن میں مزید گفتگو کرنے یا نہ کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔“

اس کی خاموشی سادھنے پہ اس کے والد بادل ٹھہرا دیا ہوئے۔

”برخودار! جیسے نکاح کے وقت کچھ قرہی عزیز رشتہ دار اور دیگر گواہان کی موجودگی ضروری ہوتی ہے اسی طرح باکراہت علیحدگی پر بھی کچھ گواہیاں اور شواہد ضروری ہوتے ہیں۔ اب جب تم نے اپنے ساتھ ہمیں بھی ذلیل و بدنام کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو جس کی تلافی بھی سراسر مست ممکن نہیں تو کم از کم اس علیحدگی کی وجہ بھی بیان کرو۔“

لوگ نے بڑے قتل کے جواب دیا۔ "میں ضرور جیسا کہ بتاؤں گا، لیکن باتیں صرف لڑکی اور لڑکے والوں کے درمیان ہی کرنی چاہئے سب جوتی ہیں..... سچ سچ سام نہیں۔"

بہارِ کمالی ہے، بزمِ مستعد ہے، چٹختی ہوئی، کوکھا کی، زردی تو اعلانِ مسیحا مل گیا کہ دلیہ سر کی، تہا سے عورت عام کچھ کر، مسخر تو دل لہرا جاتے ہو، جی جاتے ہو، دل میں تسلیم کر لیا ہے۔

ایک شخص کی بیوی نے اپنے شوهر کی ایک دوستی کو جان کر اس شخص کو اپنے شوهر کے ساتھ
آپس کے فاصلے کو خاصہ زبردستی نبھانا پڑا تھا۔ طرح طرح کی باتیں اس پر ہوتی تھیں۔ سب
آپس میں رشتہ دار یاں اس کی والدہ تھے۔ ایک بھتیجی سنا سناتی باتیں۔ کچھ بھائی کھانا لے کر کار سے
ہوئے چلے گئے۔ وہی بات کہ شوہر کی بیوی کو اپنے بھائی کے گھر کسی کا بیٹا یا بیڑے
شرکیوں کو صرف قہر لگانا ہوتا ہے۔ ہر تہمت کا کوئی نہ کوئی "ڈی اینڈ" بھی ہوتا ہے اس کے بعد قہر لگایا
اور تماشائی میں اپنے اپنے راستوں پہ ہوتے ہیں۔ اللہ پاک نے شاید ان دونوں پارٹیوں کو کچھ عقل اور حجت
عطا کر دیا۔ شہرم کو سب ذرا فراغت ملی تو شرکی کا باپ اور ادھر اپنے چودہ دہری بشیر احمد جھٹے لے کر مسجد کی
میں بیٹھ گئے۔ شرکی حلقہ لے کر ابھی تک اپنے بیٹے نہیں پہنچی تھی کہ وہ مسجد کی وجہ سے اس قابل نہیں تھی۔
والٹر نے اسے سکون آور دوا کے ذریعہ سلا یا دیا تھا۔ کسی کی کچھ کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا
ہے۔ دونوں گھروں کے کسی بھی فرد کا ذہن اس تا کہ فی الحقیقت کو توڑنے پہ تیار نہیں تھا اور ادھر اپنے دو بیٹا ہر دو
چودہ دہری نو بیٹے اپنے بھتیجے بھتیجیوں سے اپنے انہوں بیوی کو نکالنے کے بارہ گفتگوں بعد تین طلاق تھیں نہ دی ہو
لکھائے میں ملک کا سارا پارہ ہونے پر معمولی سی سرزنش کی ہو۔

ہم چند سوہنوار لوگ جب کسی حتمی نتیجے پہ پہنچنے کے لیے مسدودگی میں بیٹھے تو طرفین کے لوہان سے کافی

حد تک تکی کا اوبار چیت چٹا تھا۔ اس سخت گونا گونی لوہار خوب جانتا ہے کہ لوہے کو کب اور کس طرح تسکین قسم کے عمل سے گزارا ہے۔ میں جب سے اوپر پہنچا تھا سوائے نایک سلیک اور چند رگی جنموں کے علاوہ کسی بات چیت میں حصہ نہیں لیا تھا۔ میں ان چودریوں جنموں، بنوں، شیخوں اور خوجوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ ان کے زور و براؤں اک چپ نوٹکھ "والی پالیسی" یا بی نتیجہ خیز ہوتی ہے اور پھر میں جو کچھ بھی تھا وہ اس نچے کے لیے تھا۔ اس کے رشتہ داروں اور سرکاریوں کے لیے میں شاید تعویذوں گندوں والے دو نمبر ہج کی مانند تھا۔ میں ان کی نظروں میں اپنے پرے پڑھ رہا تھا۔ اس لیے خاموشی سا دھڑے ہوئے اپنی جگہ پر کسی بے کار چیز کی طرح چسپاں لیکن اس امر سے بھی واقف تھا کہ مجھے ایک مشتاق کوہار کی طرح کب اور کیسا سلوک "ان نیم خام" کو ہے کے ماحولوں سے زور رکھنا ہے۔ اب وہ سنہ شاید آ گیا تھا۔ چودری شیر احمد نے انتہائی بے دلی سے مجھ سے پوچھا۔

"بابا جی! آپ سے لوہے کا کھٹ لڑائی تعلق کبھی ہے۔ میں چودریوں اس کے باوجود اس نے اس غیر انسانی حرکت کی۔ چودری نوید میرے دائیں پہلو بیٹھا ہوا تھا شاید اس کے سبب کی اس بات کا جواب دینا چاہتا تھا مگر میں نے پاؤں سے اس کے پیروں کو دبا دے ہوئے جواب دینے سے باز رہنے کا اہتمام دیتے ہوئے کہا۔

UrduPhoto.com

سکتے ہیں۔ قول ملے کا میل اور گڑھے کا چیرا ہے۔ اسے نہ انہی سے کوئی نصرت نہیں آتی۔ طرفین کی رضا و برکت سے شادی اور تہہ میاں بڑی واسطے مراحل جنس طبعی طبعی ملے ہوئے۔ یہ بھی قسمت کہ رات کے آخر میں وہاں جنس طبعی کے بعد جب باہر آیا تو تھکی تھکے ہونے کے باوجود غرائے لے رہی تھی۔ غرائوں کا ہیجان تھا کہ غرائوں کا جو ایک خصوصیت ہے، ان کے اندر کے لیے صورت و سراپا کی صورت حال میں ان سے کوئی بھی ایسی انتہائی حرکت نہ کر سکتا ہے جس کی کسی صورت توقع نہیں کی جاسکتی۔"

اسے چودری صاحب آنکھیں چال سے میری جانب دیکھ رہے تھے جبکہ لڑکی کے باپ بھائی کی حالت یوں تھی کسی نے ان کی زور قبضہ کر لی ہو۔ میں یہ کچھ کہہ کر ان کا دھمیل چالنے کی غرض سے خاموش رہا۔ یہ خاموشی کے سادگت و جامد لغت شاید سادگت کے غرض سے چودری شیر احمد نے ہی تنگ ہونے کو زبان سے تر کرتے ہوئے کہا۔

"بابا جی! غرائے تو قریب قریب ہر انسان لیتا ہے۔ میں جیتا ہوں میری اہلیہ بھی۔ حتیٰ کہ وہ بے دادا تک سب لیتے ہیں۔ مگر ایسا کچھ تو کبھی اس گھر میں نہیں ہوا۔"

میں نے اک استہزائیہ سی نگاہ چوہدری نوید پہ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

”ایک تو آپ کے خزانے ایسی کوحیت کے نہیں ہیں۔ دوسری فوج یہ کہ چوہدری نوید ہمیشہ دوسروں سے الگ تھلک شب بصری کا عادی ہے۔ اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو بھی جائے کہ اسے اجتماعی طور پہ رہنا پڑ جائے تو وہ اطمینان کر لے گا کہ ادھر کوئی خزانے لینے والا فرو تو نہیں۔“

چوہدری بشیر احمد میری بات پر اپنی بات رکھتے ہوئے بولا۔

”یہ میرا پتر ہے، اتنا سا فچھوتا تھا اب ماشا اللہ ایسا گھبرو جوان۔ مگر میں تو یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ آپ اتنی تفصیل سے اس کی یہ عادتیں کیسے جانتے ہیں؟“

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ محض باپ ہیں اس لیے نہیں جانتے اور میں اس کا بابا ہوں اسی لیے جانتا ہوں۔ بابا میں ایک باپ ہوتا ہے اور بابا میں وہ چوہدری صاحب! بحیثیت باپ آپ کو کچھ یاد ہو گا بچپن میں بھی یہ شور مچانے بیٹھنے اور خزانوں سے پریشان ہو جانا تھا اور کبھی دوسرے پہلے آپ نے مکہ شریف سے ٹیلیفون پر اس کی شکایت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ نوید اپنی اپنی کوچہ و کرکسی پر ہوٹل میں چلا گیا ہے اور میں نے آپ کو جواب میں کہا کہ اس کے پاس آپ کے پاس ہے۔ آپ میری بات کو سمجھ نہیں سکتے۔ شاید میں اس جیسا ہی پاشا ہوں۔ ٹیلیفون پر یہاں سے سب کچھ نہیں سنا تھا اور آپ اس بار ایک بات کو سمجھ نہیں سکتے تھے۔ اصل قصہ یوں تھا کہ آپ میاں روٹی بھی خزانوں کے عادی تھے جبکہ وہ اچانک اپنی توری خزانوں کے راجہ مریض۔ اصل بات بتانے بغیر یہ اپنی اور آپ سب کی آسودگی کی خاطر دوسرے ہوٹل میں چلا گیا۔ اس کی بھانجی کے ساتھ آپ کی بھانجی کے ساتھ تھی جبکہ یہ اس کی بھانجی اور وقت کی ضرورت تھی۔ اب اس شادی کے موقع پر آپ دونوں پارٹیوں سے غلطی یہ ہوئی کہ لڑکی کی اس عادت یا مرض کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے لڑکے کو بے خبر رکھا۔ آئیے! میں آپ کو ایک چھوٹا عام سا واقعہ بتا دوں۔ میرے ایک عقیدہ مند کی ایک غلطی میں چھپکھپک سے ہی بیٹے کے کسی عارضہ کی بنا پر ٹھٹھ پہنچی ہوئی تھی۔ تباہ کوش کر کے اسے المافہ رہا تھا۔ بچپن سے ملوان شباب تک وہ ٹھٹھ کی ایسی عادی ہو چکی کہ اب اس کے بغیر اس کا رہنا ناممکن تھا۔ ایک چھوٹا سا ٹھٹھ ہر وقت اس کے تصرف میں رہتا۔ سارے خاندان والے اس کی مجبوری کو سمجھتے تھے اس لیے کوئی اس سے شادی نہیں تھا۔ ہوتے ہوتے اب اس کی شادی کا وقت آیا تو یہ ٹھٹھ بھی آ لے آیا۔ جو بھی رشتہ آتا، ٹھٹھ کو شادی کا شکر ہر گز نہ تھا کہ وہ کوئی عارضہ نہ تھا۔ کئی راتیں آئیں مگر یہ بے نیاز دے لوائی اپنی جوانی کی چادر میں مٹی مٹی خٹکھٹک کرتی رہی۔ کہتے ہیں کہ بارہ برس بعد لڑکی کی بھی شادی ہو گئی ہے۔ کہیں کالے کوسوں سے ایک رشتہ آ یا بندہ کوئی افسر تاسپ تھا۔ خود بھی سگریٹ دھوا

پانچ ہفتہ کا ترسیا۔ سر و سمن چرچل نوابزادہ نصر اللہ خان بیچ صاحب پکاڑو کی طرح تمباکو کا کینڑا۔ وہ کسی ایسی شریک حیات کی جستجو میں تھا جو اس کی بے انتہا تمباکو نوشی سے متاثر نہ ہو بلکہ ایک ڈوسہ کے پتلو میں بیٹھے "قاریاں لیں اور دیں" اس طرح تمباکو کی بھینی بھینی مہک روں سے مشام جان کو تازہ کرتے رہیں۔

بے حساب و شمار تمباکو نوشی کی وجہ سے اس کے بھی کئی رشتے ہوتے ہوتے رو گئے تھے۔ اوجھڑائی والوں کے بھی دارے نیارے ہو گئے۔ بڑی شان و شوکت سے بارات آئی 'مہمانوں کی انواع و اقسام کے تمباکو کا تختوں 'سگریٹوں 'سگاروں سے تواضع کی گئی۔ 'دولہا' گھوڑی پہ بیٹھا 'ہوانا' کے قیمتی۔ گار سے لطف اندوز ہوا تھا۔ پارٹیوں کے ہاتھوں میں بھی۔ گار تھے۔ ججز میں لڑکی کو بہت کچھ دیا گیا۔ خاص طور پر چاندی کا قیمتی تختہ جو خصوصی طور پر کانپور سے ہوا یا گیا۔ جس کی منہال ہونے کی اوست چناہ چاندی کا چلم کا گنبد تانبہ کا تیکہ بچہ پتیل اور اونت کی پوست کا تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ایسی کامیاب اور چمک شادی آج تک نہیں دیکھی گئی۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ دونوں شادی سے قبل ایک دوسرے کے معائب و منحوس نہ تھے۔ جانتے سمجھتے تھے جو کہ یہاں ایسا نہیں ہوا۔ لڑکی والے اپنی بیٹی کے اس مرض سے اچھی طرح واقف تھے۔ کے باوجود اس سے اغماض نہ کیا۔ شادی ایک عوامی کارروائی تھی۔ شادی کا شادی کا منی سے اور وہ شادی کے سلسلے میں خوب آشیفتہ تھے۔ جو راجہ سگریٹوں میں گھسیا اور پیسے میں شہرت ہے۔ اس پر کسی اور صاحب کے ہاں اس کی شریک حیات نے چٹختے ہیں ہر پہلو کا خیال رکھتے۔

میری باتیں تو کولہ کی وہ شرطیں تھیں جو دونوں پارٹیاں اپنی اپنی عقول پر پڑانی ہوئی محسوس کہیں تھیں ایک مناسب سا واقعہ لینے کے۔ یہ مسئلہ ان کی سبکدوشی سے نکال دیا۔

"چوہدری صاحب جی! کیا آپ اپنی بیٹی کی اس پریشانی سے واقف نہیں تھے؟" سر یہ بھی کہہ کر کے کمرے میں گھر کے افراد سولے سے اجتناب رہتے تھے۔ آپ نے اس سلسلہ میں ذرا کلام نہ کیا۔ ماہرین سے بھی کئی مرتبہ رجوع فرمایا۔ آؤ کو چنگر اور مختلف طریقہ ہائے علاج بھی آزمائے۔ آپ بیٹن کی سستی بھی قہمی مگر بڑی نہ مانی۔ پڑھی لکھی پریشانی کی صورت میں شادی کی ضرورت آگئی۔ آپ کو چوہدری جی کی بات میں اچھا بڑ بھی مل گیا اور شادی ہو گئی۔ آپا تک پہنچی رات اس پر ظاہر ہوا کہ وہی خواتین کی یہ بات سنی تھی ہے۔ وہ ہلکے کیا پہلے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا پھر جو اس کی سمجھ میں آیا وہ کمرزرا۔ اب سارا مشق قسمت کا مناسب کتاب آپ کے سامنے آ رہا ہے۔ مجھے اجازت دینا رات کے وقت میری پکار مصرعہ لیتے رہے۔

میں واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ لڑکی کا والد پکڑا ہوا امیر سے پاس آیا۔ نوبت اس سے بھرے لہجہ میں مخاطب ہوا۔

”بابا جی! اندر اٹھائیں تو ایک دو باتیں پوچھنے کی جسارت کرتا ہوں۔“

”پوچھئے۔“ میں نے اس کی سرکٹی ہوئی ہوا دیکھتے ہوئے کہا۔

”بابا جی! آپ نے ابھی اندر جو باتیں کی ہیں وہ تو میرے گھر کے اندر اور آپس کی ہیں۔ زندگی میں

پہلی مرتبہ آج آپ سے ملاقات اور بالمشافہ گفتگو کا شرف حاصل ہوا۔ آپ میرے گھر اور بچوں کے معاملات
اتنی تفصیل سے کیسے جانتے ہیں اور وہ باتیں بھی جن کا تعلق محض ہماری ذاتیات سے ہے۔“

بڑی توجہ سے میں نے جواب میں کہا۔ ”حضرت! اس کا جواب تو آپ نے سوال کرنے سے پہلے خود

ہی دے دیا ہوا ہے۔“

وہ قدرے غور کرتے ہوئے بولا۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں.....؟“

”بھائی! آپ نے مجھے کیا کہہ کر مخاطب کیا تھا۔“

وہ ثبوت بولا۔ ”میں نے آپ کو بابا جی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔“

معاذیں! کے ہاتھ کو تھپتھپاتے ہوئے میں نے جوابا کہا۔ ”آپ نے مجھے حج بابا کہا تھا۔“

غراؤنگی یہ ہی کیا موقوف! بعض اسیان اور بھی بہت سے امور ہیں جن سے الزہک

ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اس وقت ہمارے پاس چاہے کتنا ہی مال ہو۔ اس کی رو سے انسانی زندگی

موسموں کی کارستانی، عوام و مشرکات، خوشبوئیں، ہاتھ نہیں۔ بچل بچل دن رات، مخصوص پہلو پر بندے

چوہا لے، بعض قرابت و اقارب، رانگیاں، چند دیکھیں، تیار اور بھی بہت کچھ؟ کچھ بچے تو یہ کوئی غور و غی

بیاری، کوئی خاص نفسیاتی عارضہ، کسی شخصیت کے طبع و مزاج، کوئی توہمات، فرسوس، کم علمی اور

خاص طور پر اس کے جسکی جانور کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کا جسمی یا فوری طور پر خاندان یا دار و نو

تو خا ہر ہے اس کے زور و بیا آس پاس اگر کوئی فرد ناگ یا گن کے سروپ میں ہو گا تو یہ پگنے جھپٹنے پہ آمادہ ہو

جائے گا یا اس کی سرکات اور زوہوں میں بے چینی، اضطراب و اضطراب در آئے گا۔ بھید یا غفل کے آگے کوئی

پہنچاں کر کے اور کا تو خا ہر ہے وہ واحد نظر کھائے گا۔ چاند کی چاندنی کو مانی اور نیم ہوئی کیفیت کر دیتی ہیں۔

ماموں میں کیا، شکر و پیر، خاندان، مہر ہوں تو انہیں سورج کے منظر یا پگنے نہیں پھٹا چاہیے۔ اتنی کھڑے کے

عقلموں کی ماموں سے سرعام ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ پہنچے کا روکا کھائے اور دات کو گناہ و جوار، داشت نہیں کر

سکتے۔ ہاوردی خاندان میں برتنوں کے کھڑکنے کی آوازیں، رقیق طبعیت، تنگاتی کام کرنے والوں میں انتشار، پیرا

کرنے کا مہر، جب ہتی ہیں۔ گدھے کی ڈھنگوں، ڈھنگوں، خواتین ہونے آوارہ لینڈی لگتے۔ ہزنی ہوئی یا روتی

ہوئی بلیاں۔ جھینگروں کی بے طرح آوازیں۔ ہر گھنٹے کے وقفہ بعد من کی آواز والے کھاک۔ دھوبی کی

نچوٹا حاکم کا زور زدہ سے کراہنا۔۔۔ چونکدار کے تھکھڑے سونے کی ٹپک ٹپک یا بجاتے رہو کی آواز۔۔۔ طلبہ سر دنگ کی ٹھکانی کی ٹھک ٹھک۔۔۔ گونج کی کراہٹ شرف اور سیاہ رنگ۔۔۔ کسی درندے کا کسی معصوم اور کمزور بچہ پر جھپٹنا۔۔۔ غروب آفتاب سورج گرہن علیٰ خذا القیاس ہزاروں رنگ انگ یوں کہ حضرت انسان ان سے بد کے۔۔۔ موسیقی میں کئی ایک رنگ ایسے کہ اگر ان کی سماعت اور وقت حاضری میں احتیاط نہ برتی جائے تو خود کشی کے زچانات عود آتے ہیں۔

میرے ایک بچے نے اپنا اچھا خاصا کاروبار محض اس لیے خراب کر لیا کہ اس کے پارٹر کا ناک اٹھائی بعد اور ابوالبول کی طرح تھا۔ ایک شام وہ خاصا پریشان میرے ہاں پہنچا۔

”ابھی خیر۔۔۔!“ اس کا ہونا تھوڑا دیکھتے ہی خود بخود میرے منہ سے نکل گیا۔ علیک سلیک اور دست بوسی کے بعد پھٹ پڑا۔

”بابا جی! مجھے لگتا ہے مقرب آپ کو میرے بارے کوئی اچھی خبر سننے کو ملے گی۔“

میرے منہ سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”کو اس بندہ کو اور ذویات بتاؤ جس کی وجہ سے تمہارا۔۔۔“

میں ایسا انسان نہیں آتا۔“

”ابھی۔۔۔“ پھر کی جانے شروع میں دقت میں بیٹھا تھا کہ وہ وقت سے کچھ پہلے یہ دقت نہ پڑے۔

پہنچے تک کر کے واپس آ گیا۔ گری پیس سے اس کا چہرہ لالہ لال اور ہاتھ۔۔۔ کچھتے ہی وہ گھوٹے پائے پہ۔

میں نے پانی پائے کا پوچھا۔ اس نے ہاں میں کوئی جواب نہ دیا تو میں نے خود ہی اس کے لیے پانی بنا کر شروع کر دی۔ اب اس سے مخاطب ہوا۔

”الھو تمہارے پانی کا پیسہ نکالو۔ اتنی دیر میں پائے تیار نہ جاتی ہے۔“

وہ بھدی ہی وہ نہیں نکل آیا۔ جیسے دھواں روٹ میں ہاتھ نہ دھوئے نہیں محض سلیکے کرنے کی وجہ۔

اچھا آپ جانتے ہیں کہ میں بات چیت کرتے وقت اس کے چہرے کی جانب نہیں دیکھتا۔

با اوب بچے کی طرح صبر اور ٹکریں بھٹکاتے رکھتا ہوں کہ آپ نے ایک بار نصیحت کی تھی کہ میں پارٹر کا ناک اٹھانے کے زور نہ ڈالوں۔

اور دوسری خاص چیز ان کے چہرے کا وہ حصہ ہے جس سے انسان کا وقار، انجرام اور عزت کا معاملہ قائم رہتا ہے۔ جسے میں بعد کوشش بھی اک نظر دیکھ نہیں سکتا یہاں نظر یہ ضرورت کا فلسفہ بھی کچھ کام نہ آیا۔۔۔ میں نے کچھ گز بڑھسوس کرتے ہوئے یونہی ان چاہے میں اس کے چہرے پہ نظر ڈالی تو ناک خاصا لمبولا ہوا اور سرخ آلو بھرا کی مانند دکھائی دیا۔۔۔ اک دم مجھے یوں یاد آ گیا۔ جس نے مصر میں ابو الہول کے مجسمے کا ناک تڑوا دیا تھا کہ یہ خاصا بھدا ہے میں اسی مزید برداشت نہیں کر سکتا۔۔۔ خدا جانے کیا ہوا میرا دامخ اک دم اُٹ گیا۔ اب میرا ارادہ کہ کسی طرح میں اس کے جلوہ ناک کا قصہ پاک کر دوں اور اللہ کی معصوم مخلوق کو اس کے آزار سے آزاد کرادوں۔ اس ڈینوسار کی نازک اندام دیوی جس کا پورا وجود اس کے ناک کے خم سے بھی کہیں کم ہے اور میں خود جو عرصہ ساڑھے تین برس سے کئی ہار اُست یا کم از کم اس کے ناک کو سبوتاژ کرنے کے منصوبوں پہ بنجیدگی سے غور کر رہا ہوں۔ مگر ہجو کوئی ایسا آبرو مند ان طریقہ دریافت نہ کر سکا جس سے میری عزت سادات پہنچی آج نہ آئے اور ٹوڈی ناک کا پتہ کھن بھی ہو جائے۔

میں اس کی ہرزہ سرائی سے جب خاصا بیزار ہو چکا تو آگے دھرتے پوچھا۔

”شاہ صاحب مقتول کہاں ہے اور آئے قتل؟“

ہرگز نہ! وہ ایک بڑے بڑے کس کی بیانی میں ہے۔ یہ پتہ نہیں چلا۔ اپنے دفتر پر وہ پانی ناک والا دھرا تھا کوئی کے باوجود کوئی ایسا اوزار دکھائی نہ دیا جسے اس مجسمہ کے لیے کام میں لایا جاسکتا ہو۔ سوائے سنگ سفید کے ایک ہی وسیع دیت کے گھر وہ اس کے تنوں ناک سے بہت زیادہ قیمتی اور کارآمد تھا۔

”یہی نائف سے تو موسم کا ناک تک پھینک نہیں جاسکتا“ گیتھ نے کیڑا کیڑا کہا کہ راجا جاسکتا ہے۔“

میں نے اوجھٹے ہوئے پھر پوچھا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ ٹوڈی ناک ابھی اپنے چہرے سے اور چہرے اپنے جسم کے ساتھ ملاستی میں ہے۔“

”جی ہاں میری بد قسمتی کہ موقع بھی ملا مگر کوئی اوزار ہاتھ نہ لگا۔ سچ پوچھیں تو میں اسی پریشانی میں یہاں آیا تھا۔ آپ میرے بابا ہیں کچھ میری دیکھیری فرمائیں گے۔“

دیکھا آپ نے ناک اس کے پارٹر کے چہرہ پہ ہے۔ تحلیف اسی سید زائے کو سید اور لکھی بہ زاری اور نفرت کہ وہ اسے پار کرنے کا کوئی محضو اور شریفانہ طریقہ نہ سوچ رہا ہے اور اس نیک کام میں میری دیکھیری کا بھی طلبگار ہے۔

میں اس کے مسکے کو خوب سمجھتا ہوں۔ اس ناک سے شاہ صاحب کا تعلق اور دشمنی بہت پرانی ہے۔۔۔ ان کے والد مرحوم بھی ناک والے کے آباؤ اجداد مکانی کے کاروباری پارٹر تھے۔ آگے چھپے دونوں

ملوٹے۔ مستیاں برتیں اٹکیں... کیا کچھ نہ تھا آب کہیں اس کا عشرِ عشر بھی نہیں ہے۔

یہی کچھ اپنی لمرِ عقل کے مطابق سوچتا کھو جتا۔ جانے کب کہیں نیند کی کسی گلی میں لگی لیا۔ چہرہ پتھر ہی پتھر سلپیں ہی سلپیں... کیا دیکھتا ہوں میں ایک دُعلوانی پتلی سی گلی میں اترتا جا رہا ہوں۔ پیچھے سے بابا بُحان اللہ کی آواز گونجتی ہے۔

”بُحان اللہ بُحان اللہ... بچے! پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا! سب زلہ ہو جاؤ گے۔“

● تلوار کی آنی ہیرے کی کٹی!۔

کہتے ہیں کہ ہیرے سے چھوڑات کو حاصل کرنے سے نہیں بچتے۔ کد انسان خود ان جتنی بھگتا ہے احمد پیدا کر لے۔ فتح خان دُنیاء اور اس کی آسانشوں کا کچھ زیادہ طالب نہیں تھا۔ اس کی پہلوانوں، فزکاروں کی طرح پیشہ و پیشہ باز بھی زیادہ تر مشکل اوقات سے پسند اور حال مست ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ کچھ تلوار کے بھی فائدے جانتے ہیں۔ آقا داری پشتر خاں ستوار کی دنیا کا پہلا آفری لہری لہجہ بولتا ہے۔ عمر فتح خان شیخ پور دُنیاء کے بڑے بھائی ہیں۔ اس نے اپنے بھائی کو جو شیخ پور دُنیاء کی توقعات سے کہیں آگے بڑھ کر مسکری میدانوں میں کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ سکھ بڑی دلیہ اور جنگجو قوم ہے۔ بے شک کی کمر میں کرپاں کی کوبہ کی آس کے انداز فکر کی نشاندہی کے لیے کافی ہے۔ یہاں انسان میں سکھ خوجا کے ساتھ ایک نمایاں لہجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ دُنیاء کے ساتھ ساتھ ہی کے بہادر و ہیر انسان کی عزت مند کرتا ہے۔ چہ جائیکہ وہ جانی دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح یہ استاد شاگرد بھی مذہبی مذاق والی اور سانی قد سے ہونے کے باوجود انسانی اور فنِ حرب کی مشق کے قدروں کی وجہ سے ایک دوسرے کے بہت قریب و جوار تھے۔ ایک ساتھ کھانا پینا ایک ہی رہائش سے سوچنا۔ اسی مہربان کی خصوصیت کاوشوں اور توجہ سے وہ سب اس مقام پہ تھا کہ راجہ دھپتے رہنے نہ صرف اس پہ بے پناہ اعتماد کرتا بلکہ اسے اپنا مشکل کشا بھی سمجھتا تھا۔ اسے نہ جانے کیسے احساس ہو گیا تھا کہ فتح خان اپنے تمام کی مانند اس کے راج پاٹ اور شہر شہرے کے لیے ایک حدی کا نشان ہے اور یہ بھی کہ مسلمانوں اور خاص طور پہ فتح خان کے قبضہ میں اس کی عقلیاں ہیں وہ آس سے بڑے بڑے کام لے سکتے ہیں۔ اور قدردانِ مہروم شناس راجہ اپنے بیٹا پتی خوشیہ سنگھ کو بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا کہ وہ اور آس کا شاگرد۔ راجہ راج پاٹ اور اور پر جا کے لیے عزتِ حفاظت اور اعتماد کا نشان ہیں۔ سینا پتی آس کا استاد تھا کہ خوشیہ سنگھ خوب جانتا تھا کہ اس کی بیوی انتقال کر چکی ہے۔ وہ بیٹے کا اٹھنا

اور قاسم خان اپنی بوجھل مافی کے پاس رہتے ہیں اور یہ بھی کسی حد تک معلوم تھا کہ اس کا بوز حال سسر افغانی بابا چٹا کھو جا ہے۔ جو کسی دھیان گیان کے سلسلہ میں کہیں لگن ہے۔ یہ بھی کہ اس کے ہاتھوں بازوؤں اور پاؤں کے دھرتی اپنے وجود کو کھول دیتی ہے پتھر پھار آستے گود بھر لیتے ہیں۔ اور ہر راجہ و حنیف رائے بھی گیانی دھیانی بوجھل مانوں پہ خوب دھواں دھرنے والا منٹھ تھا۔

فتح خان کو بے پور میں بڑا بے کئی روز گزار چکے تھے۔ ساس کی بیماری بڑھاپے کے علاوہ بڑے بچے ہاشم خان کے پراسرار حالات نے جو راز اختیار کیا اس کا قفا نہابی تھا کہ وہ اس وقت تک واپس اپنے جھٹے میں نہ جانے جب تک گھر کے حالات سے مطمئن نہ ہو جائے۔ ایک اور خوشگوار سی تبدیلی جو سسر کی جانب سے عطا ہوئے قیمتی پتھروں اور ان سے ان کی ملاقات سے حاصل ہوئی تھی وہ بھی ایک وجہ تھی۔ اس کے علاوہ ان سے جو راز افغانی بھر کے بعد عاتقانہ ملاقات اور بات چیت ہوئی تھی اس کا بوز اور کیفیت بھی کچھ نہ اگانہ ہی تھی۔ اس ملاقات کے بعد وہ سارا دن اک عجیب سے انبساط میں گم رہتا۔ جسے کبھی کبھی کافوری

تہ نے اس کے کمرے کو اسے نکلتے آئینہ دھار میں لے لیا تھا۔
 خوشیوں کے ساتھ ساتھ اس کو اس خان کو بڑا بے کئی تھا کہ وہ اس کا سسر افغانی سے ملے اور اس کا منٹھ استوار ہو سکے۔ اس مقام تک پہنچنے میں وہی تو تھا جس نے اس کا ساتھ دیا۔ اب ملاقات پہ تمام حالات و واقعات سن کر اس کے ذہن پر گرجے۔ وہ انہیں پھیلائے اس کی عجیب و غریب باتوں پہ غور کر رہا تھا۔ مثلاً اپنے لڑے کو کھڑکھڑائی کی سیٹھ لایا۔ ان کا لانا چہرہ بھی دستیاب نہ تھے۔ اس کے علاوہ کسی اور کو دکھائی نہ دینا، جیسے کے لیے قیمتی پتھر کے ٹپے اور خاص طور پہ وہ نایاب جواہر جو فتح خان کے پاس تھے جن کے بارے میں جوہری بازار جواہرات کی کتابی پاشی والے صیب وارٹی المعروف حسو کٹائی والے کی رائے تھی کہ ایسے نایاب پیش قیمت جواہر جو کسی راجہ کے خزانے میں بھی نہیں ہوں گے۔

اس ملاقات میں فتح خان نے پڑے کی تھیلی سے وہ چار دانے پتھروں کے نکال کر دکھا کر خوشیوں کی تھیلی پہ دھروے۔ ان کی پوند اور خوش رنگی سے اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ کئی ایک لمبے وہ مسرورہ انہیں بکھارے۔ پھر نظر میں ہٹائے جن بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”اس جوہری بازار والے حسو کٹائی والے نے مجھ کو لایا نہیں کہا تھا۔“ وہ انہیں مختلف زاویوں سے دیکھنے تو لے لگا۔ تھوڑی دیر بعد تھیلی میں ڈال کر وہ انہیں دیتے ہوئے پوچھنے لگا۔
 ”حسو کے علاوہ کسی اور کو بھی ملاحظہ کرائے۔“

”خیریت۔“

فتح خان تشویش بھرے لہجہ میں بتانے لگا۔ ”میر کی ساس کہہ رہی ہے کہ ہمارے اصرار پہنچنے سے کوئی دس منٹ پہلے ہاشم خان نرمی طرح بھاگتا ہوا آیا اور بغیر کچھ کہے سیدھا اندر چھلی کوٹھڑی میں گھس گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی اس حرکت پہ کوئی گرفت کی جاتی وہ گھوڑوں کی قھیلی اٹھانے باہر بھاگ نکلا۔ اس کی نانی تو اٹھنے بیٹھنے سے معذور۔ محض آوازیں دیتی رہ گئی۔ اگر آپ میرے ساتھ جانا پسند کریں تو اسے کہیں دیکھتے ہیں مگر زیادہ دیر نہیں گیا ہوگا اور پھر مجھے اس کے ٹھکانوں کا بھی پتہ ہے۔“

”چلو! میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس قھیلی میں وہ قیمتی کچن ہی ہوں گے جن کا ذکر تم مجھ سے کر چکے ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ تم نے ان کی حفاظت کا کوئی معقول بندوبست کیا ہوگا لیکن بچے کا قھیلی کو اتنی آسانی سے باہر لے جانے سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔“

”میں خود اندر نہیں جاؤں گا کہ اسے قھیلی کا پتہ کیوں کر چلا جبکہ اس کی نانی کو کبھی خبر نہیں کہ میں نے یہ قھیلی کدھر نہیں رکھا ہے۔“

اور پھر فوراً گاہ کے آگے پاس اُڑ رہے تھے کہ میدان میں ان کی آمد باوجود کے انہوں نے ہاتھ نہ دیا۔ دیکھا محروم چلا وہ کہیں نظر نہ آیا۔ سنا کہ کوئی کچن کے اندر سے باہر آیا اور سانس لے رہا تھا۔

”بچہ کبھی ہوتا ہے مگر تمہیں تو احتیاط اور اس پر کڑی نگاہ رکھنی چاہئے۔“

اور فتح خان اگلے تین سو فٹ باق تھا کہ اس بے ذمگی سے بچے نے پتہ نہیں کہاں کہاں شرمندہ و گھبرایا ہے۔

نرا کہ خوشیوں کے رشتہ سے نہ ہونے کے باوجود وہ قہقہے سے ہنسنے لگا۔ اس کی تلاش سر کر رہا ہو گیا۔

اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب کے دن اسے سخت سزا دلانی کرنی ہے۔

شام کے سوتھکا ہار اگھر پہنچا تو ہاشم خان نانی کے سامنے ہر مہموں کی طرح کھڑا اس کے کونے میں رہا تھا۔ باپ کو آتے دیکھ کر چلا اٹھا ہوا چھلی کوٹھڑی میں گھس گیا۔ اندر سے کچن کے لیے جانے لگا تو ساس نے اشارے سے روک کئے ہوئے کہا۔

”کیوں اس کا خون شگ کرنے کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ یہاں میرے پاس بیٹھ نہیں تجھے بتاتی ہوں۔ ساما قتلہ بھر جو چاہے کرے۔ ہاشم خان نے مجھے بتایا ہے کہ وہ درگاہ و شریف کے باہر میدان میں گولیوں کے سنگ کھیل رہا تھا کہ اچانک مجھے زور کھڑے مانو دکھائی دیا۔ جو اشارے سے مجھے یاد ہے تھے۔ وہاں گیا تو نانو نے پوچھا۔ تم گھوڑوں سے کیوں نہیں کھیلتے۔ میں نے بتا دیا بابا نے میرے کچن میں نہیں لیے ہیں۔ نانو نے خفا ہوتے ہوئے غم دیا۔ بھاگا بھاگ گھر جا چھلی کوٹھڑی میں اناج کے گھوڑے میں گھوڑوں کی قھیلی دبی پڑی ہے۔“

نکال کر لا اور ادھر میرے سامنے بیٹھ کر کھیل۔ جب کھیل چکو تو قبیلیٰ ادھر برگد کے نیچے جڑوں میں دیکھ چلا۔
 کر دیا وہاں یہ محفوظ رہے گی۔"

اب وہ پوچھنے لگی۔ "تم نے کچھ پھینے یا اس سے چھپانے کی کیا ضرورت محسوس کی تھی۔ تم جانتے ہو کہ یہ اس کے مانوسے بچے کو کھینے کے لیے دیے ہوئے تھے؟"

فتح خان بوڑھی بیمار اور موٹی عقل و سوچ کی حامل ساس کو کیا جواب دیا۔ وہ کچھوں کو محسوس کاٹنے کی گولیاں سمجھے ہوئے تھے جبکہ وہ قیمتی پیش قیمت پتھر تھے۔ وہ مال منوا کر کے 'بھجلی کوٹھڑی' میں پہنچ گیا۔ کھاٹ پہ پڑی چادر وہاں میں گھسے ہوئے بچے کو بڑے بیمار و پتھکار سے باہر نکالا۔ میٹھی گولی اس کے منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے مانوسے بچے ہیں؟"

"اتھے ہیں۔"

"تم جانتے ہو آج بھی یہ جیسا سا کھانا اور مسٹائیاں کھاتی ہوں گی؟"

اس نے سر ہلاتا ثبات میں جواب دیا۔

UrduPhoto.com

"مانوسے کہا تھا وہ میرے کھیلنے کے لیے ہیں۔ کھیلنے کے بعد انہیں بچے کے نیچے رکھ دیا کرتے ہیں۔"

انہیں اور گاؤں والے اس میں بچے کے نیچے رکھ آیا ہوں۔"

اب وہ اسے ساتھ کھینچنے پر آمنا نا وہاں برگد کے نیچے پہنچا تو کھاناں بسیار کے باوجود وہ کھلی

نکلیں دکھائی دیں تو وہ ہنسنے لگا۔

"بتاؤ کہاں رکھی تھی قبیلی؟ یہاں تو کہیں بھی رکھائی نہیں رہی۔"

وہ ہنسا کیا جواب دیتا۔ میں نہ سو کر رہ گیا۔ فتح خان بھی کچھ سوچ کر مصلحہ خاموش ہو رہا۔

اگلے روز صبح نماز کے بعد وہ اس آسن میں بیٹھ گیا جسے اختیار کرتے ہی اسے سسرالانی بابا سے

ہویدنی عاقبت کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ بابا اس پاس موجود ہیں۔

گھر گرہ نہیں کھول رہے۔ چوتھو یہ انتظار کے بعد بھی جب یہی صورت برقرار رہی تو اسے یقین ہو گیا کہ

دانت اجتناب برت رہے ہیں۔ ظاہر ہے اس کی وجہ وہی گھنے تھے جنہیں ان کی دہیت کے چل گھر سے

سے چھپا گیا تھا جبکہ افغانی بابا کے لیے اس کے پیارے ابا کے نواسے کی خوشی سب سے اہم تھی۔ اس کے

کاموں سے فراغت کے بعد ویرگا و شریف پہ فاتحہ پڑھنے کی نیت سے گھر سے نکلے گا تو ہاشم خان اپنے بیٹے کے

کروائے تھے۔ ان میں سے ایک گنڈولہ کا نقشہ ایسا کہ اس میں سے ایک چمکا سارا ستہ ڈرگاؤ شریف کے میدان میں چھتار برآمد کی ہزار انگ شاخی جڑوں میں پھپھا ہوا تھا اور اس سے آگے نہ جانے کہ حرمہ کہیں اس نقشے کو افغانی بابا ہی صحیح سے جانتے ہوں گے۔

اب یہ قصہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جدھر راجہ دھنپتہ رائے اپنے حساب کے مطابق فتح خان کی خویلی کے علائقہ کے لیے اس کے ہاں چھارٹا ہے۔ راجہ دعائی کا دستور تھا کہ راجہ کے جنم دن سے گنوار پہلے راجہ کے مشیر امیر نور ہاری تعاقب دار اور سینا کے عہدہ دار اپنے مقام کے مطابق راجہ کو اپنے ہاں محبت دیتے خاص طور پر وہ 'جنتیں' اس نے تعاقب نہ میں یا کوئی بارش کھیت وغیرہ بخشا ہوتا۔

راجہ کی نظر میں فتح خان کے لیے بڑی کوٹیر تھی مگر وہ اپنے ہم منصبوں کی آنکھوں میں کاسے کی طرح ٹھٹھکتا تھا۔ ایک پیشہ ورانہ طاقت کو وہ ہے اس کا بڑا جرمی بہادر اور آرمو وہ ہونا اور یہ ہے اس کا تاریخ حبیب مسلمان غصہ نہ ہے۔ ہندوستان کے چھوٹے موٹے راجوں مہاراجوں کی ایک بڑی بد قسمتی یہ کہ جنتی کہ اس قدر محافاتی سازشوں اور توڑاؤ اور بکھر رہا تھی ریشہ داروں کے خلاف شائشی کوئی ٹوٹن نہیں رہا اور اس ہوگا ہوا اپنی بد قسمتی کے لیے اس کی بد قسمتی اور اس کی بد قسمتی کی بد قسمتی کی بد قسمتی کی بد قسمتی سازشوں کا فائدہ اٹھاتے اور اپنے اچھے بڑے انجام کو پہنچتے۔

فتح خان کے خلاف مسلمانوں کی بد قسمتی کا سبب تھا کہ اس نے فتح خان کے خلاف اسے منظم کر دیا تھا۔ کوئی موقع نہیں مل رہا تھا۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی کہ اس ٹوہ کوئی کی قیصر نے بدخواہوں کو اس کے خلاف سازش کرنے کے خاطر خود مواقع فراہم کر دیے۔ اس کے کچھ منظمی جواز بھی تھے جیسے کہ حویلی کی قیصر کے کارنگار، مسز می طرفہ وہ بھی اور پارے آئے تھے لیکن یہ بھی کوئی ایسی اچھن بات نہ تھی۔ بے پناہ شہروں میں بہت سی خصوصیتیں تھیں جو یہ دینی استاد و مہاراجوں کے کمال فن کا شکار تھیں۔ اس بات تو اس کا راجہ کی نظر میں قابل اعتبار ہونا تھا۔ باقی رہی یہی کہ حویلی کا افغانی طرز کا قلعہ نما ہونا اور اس کے نیچے کی پراسرار طرز قیصر کے کمال دی۔ قیصر کے دوران کسی بھی غیر متعلقہ فرد کا داخلہ ممنوع تھا۔ یہ بات لیکن ظن کو بید کرتی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی قیصر تھی اور اس پر اتنے والے مصارف بھی کچھ معمولی دکھائی دیتے تھے اور بھی چند شبہات و ابہام تھے جن کی بنیاد پر بدخواہوں نے اس کے بارے میں راجہ کے دل میں پیدا کیا۔

پیدا کرتی شروع کر دی تھیں۔

● راجے کا بیٹا گیا باجا.....!

بالآخر ایک شجہ دن متحد بہت سارے لہجہ تن و تنہا وہاں پہنچتا ہے کہ یہی ایک مقام اور مناسب صورت فتح خان کی سمجھ میں آتی جو اس کے سرسرا تالیق اور مرشد کے حکم اور مصلحت کا تقاضا بھی تھی۔ ضروری ملل اور حفاظتی دستہ حویلی کے باہر تعینات تھا۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ راجہ اپنی پر جا یا کسی جتھہ دار کی حویلی میں نیوں تن تنہا داخل ہوا۔ فتح خان نے اپنی افغانی اور زراستستانی روایات کے مطابق اس کا استقبال کیا۔ اس کی ماس نے ایک ماسا کے بہ طور اس کے گتھے میں لٹھو لوں کا ہار پہنایا۔ ماسے سینہ و رکاب لگا کر تھالی بھر چاندنی کے زوچوں کا شکن ڈال دیا۔ سر پہ ہاتھ رکھ کر آشر بادوی۔ راجہ نے انہیں خوش ہوا۔۔۔ پاس ہی افغانی لباس میں ہاشم خان اور قاسم خان کھڑے بیٹھیں بھری نظروں سے پڑ دجا بہت مہربان لہجہ کو تک رہے تھے۔۔۔ راجہ کو ایسے خوبصورت لباس میں بوسہ آنکھوں والے من موئے بچوں پہ بے حد چار آیا۔ دونوں اگلے قدم سے ٹھٹک کر سینہ پہ ہاتھ دھر گئے اور تقسیم دی۔ راجہ کے من میں کیا آئی اس نے اپنے گتھے سے دو ماسک نکالیں اٹھاریں اور ان دونوں کو پہنایا۔۔۔ ان کے سر پہ بے حد شگفتہ اور دلکش ماسک پہنائے۔ اسی اٹھاروں کی یاد میں

فتح خان کے بڑے احقر امیر احمد نے اسے ایک خوبصورت مسند پہ بٹھایا۔ اسی اٹھاروں کی یاد میں ماس نے تاج پہنکائی سنی میں اپنے خاندانی روایت کے مطابق سات امان (گندم، جو، گند، بجزہ، چاول، چنے، مسور) چھ پھل (آلو، پیاز، گندم، شریف، انگور، کیلا) پانچ توکڑیاں (پھل، مین، اٹھار، آلو، گوبھی) چار پارچہ (چکری، انگرکھ، تہیندا، چار، آلو، مین، اٹھار، آلو، گوبھی) اور ایک تھپیار (کنار) پیش کیے۔ اب دو بوز بھی ماس اہل پان کا بندوبست کر لے ماس کے سنگ اندرون خانہ چلی گئی اور ادھر یہ دونوں بچے بھی تھپی ماس سمیت کہیں ماس ہو چکے تھے۔

راجہ تین بھری نظروں سے گرویش کی ہر جگہ کو ملاحظہ کر رہا تھا۔ اس کی ماس بچوں اور مخالف کی مناسب ہی توصیف کے بعد وہ اور وہاں سے کھڑے فتح خان سے مخاطب ہوا۔

”فتح خان! ہمیں شہادی و عداوتی اور بھادری پہ رتی ٹھٹک نہیں۔ تم ہماری بیٹا کے ایک اصول دہن ہو۔ تم نے بہت کم کھات میں ہمارا دھن حاصل کر لیا ہے۔ یہ حویلی والی جگہ صرف شاہی خاندان کے لیے تھی۔ ہم نہیں جانتے تم کس طرح اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہو؟ اس کے باوجود ہم سمجھتے ہیں تم اس اہل تھے کہ ہمارے اور قلعہ کے قریب رہو۔“

راجہ اسے ذرا دیر دنگاہوں سے تو تھا ہوا مزید گویا ہوا۔

”اس نے بہادر بیٹا پتی خوشیہ سنگھ کی زبان بھی سنا اور خود اپنے طور بھی محسوس ہوا کہ تمہارے خاندان والوں کے پاس کچھ ایسی غلطیاں ہیں جن سے آپ اٹھوئی کو بھی ہونی میں بدل سکتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم نے کسی ایسی ہی غلطی سے کام لے کر یہ جگہ حاصل کی اور ایسی پر اسرار قلعہ نما جوہلی بنائی کہ جس پہ میرے آہوازے کے مطابق بہت سے اخراجات اٹھیں۔ جبکہ قعیر کے معاملہ میں تمہاری کوئی خاطر خواہ معاونت بھی نہیں کی گئی۔“ تراویہ کہہ رہا تھا۔ ”وٹا کی گئی زمین پہ جو جوہلیاں مکان قعیر کہنے جاتے ہیں ان پہ اٹھنے والے اخراجات بھی ریاست ادا کرتی ہے مگر ایسی تعمیرات اک خاص طرز اور معیار کی ہوتی ہیں۔ نہ صرف ان کے نقشے مکانات اور قعیری مصارف ایک سے ہوتے ہیں بلکہ ان کے رنگ بھی لگائی ہوتے ہیں۔ تمہاری یہ جوہلیاں بے چور کی کسی بھی قعیر سے مختلف ہے۔ اس پہ کام کرنے والے مستری مزدور بھی باہر سے منگوائے گئے۔ جگہ سامان کا ٹھہ وغیرہ بھی کہیں اور سے بچا لیا گیا اور اٹھنے والے نظر کے مطابق کوئی شروع آخر ہی دکھائی نہیں دیتا۔ آپ تم ہی کوئی ہی موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے اور اصل حقائق سے بے خبر کوئی منش تمہارے اور جوہلی کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا؟ مگر میرا بھیتر پخت ہے۔ بلا یہ تم جو بھی ہو مگر یہ انجنت و شہر ہے کہ تم میرے بارے میں اور بھٹا کے ڈنڈا دار ہو۔“

UrduPhoto.com

ابھی تک اس نے زبان نہیں بلائی تھی۔ اسی دوران اجازت لے کر اس کی سانس شربت کی بوتلی لے کر باہر آئی۔ شربت شربت چیشی کو چھکے فتح خان نے نذرانہ والی سینی پہ سے ہاریکہ بہت کاٹیں پس ہٹایا۔ تراویہ نے دیکھا کہ سات چھوٹے میں دو سینی سے بھی پھل منو جوڑی جن کا نہ تو موسم ہے اور نہ ہی ادھر پائے جاتے ہیں۔ تراویہ نے اس کا بھی لگ بھگ یہی حال تین دھاتی جل کواری بھی ایسی کو بھرت کر دی کہ نہ دیکھتے ہی رہے۔ گداگر انھیں تندہ کاری میں حلالی راہنمائی کا بخیر پھول پیچیں۔ ”نئے نئے فیروزے عقیق نکلے ہوئے شہر سے لباپ۔ کاڑھے کا انگرکھا تہہ زلفانی رشتم کی گجری اور شیشے کی چادر۔ کالے کھاتے پرے اور میں تھمرا نکلار اور زہیر کا دودرا۔ مہوہ کے لہو انھوں کو کھجور کاٹ کر رکھا ہو مولسے کے شگم نے کہ جب اٹک سہارے تھے ہوں۔ تراویہ ششدر رہا دیکھ کہتے۔ ایسی کرشماتی بیہوش جو دیکھیں نہ سکی۔“

فتح خان نے آہستگی سے ہنس لواتے ہوئے کچھ جل پانی کی درخواست کی۔ راجا اب اس قدر سے غور سے بنا کر اسے دیکھنے لگا۔ کچھ وقت کے بعد کوڑی ہوا۔

”فتح خان! یہ اٹھوئی کی بیہوش بے موسم کے پھل پھول اور یہ ساری لہجہ سی چیزیں آگے سے یہ منشوں کی نہیں۔ کہیں دیوتا ہوں نے غمگن کے اس پار سے بھیجی ہیں۔ کچھ بتاؤ یہ سب کچھ کیا ہے؟“

فتح خان ہاتھ جوڑتے ہوئے نہایت ادب سے کہنے لگا۔

”مہاراج! آپ جانتے ہیں کہ میرے سسر ہیں جو پاتال کھوتی ہیں۔ وطن میں لوگ انہیں اللہ کا کپتہ مانی کہتے ہیں۔ چونہاں اُن کی بیٹیاں اور پہاڑ اُن کے فرزند ہیں۔ اجمیر شریف میں تارا گلدھ کے پرستہ پانہوں نے بابا میراں شاہ سرکار کے ظلم سے آگ لہی تپسیا پوری کی۔ اس کے بعد اُن کی کوئی ایسی منزل شروع ہو گئی کہ انہیں اپنے ظاہری جسم کو پردہ دینا پڑا۔ پاتال کھوتی ہونے کے ہاتے انہیں زمینوں پہاڑوں کے بھیتر کی ایسی کھوجوں اور رازوں تک رسائی حاصل تھی جو کسی عام انسان کے لیے ممکن نہیں ہوتی۔ اس پر حق پینے کے دوران اور بعد بابا پچھوانی شکتیاں بھی تھیں جو اس سے پہلے حاصل نہ تھیں انہی شکتیوں سے بابا کو برہمنوں کے نیچے چھو جیتی پتھروں کی ریتوں کی کھوج پڑی۔“

یہ باتیں ہوتی رہی تھیں کہ دونوں بچے کبھی باجھ سے اکٹھے نہیں رہیں گے۔ دونوں نے اپنے ہاتھ اپنی پشت کی اوٹ میں کیے ہوئے تھے۔ انہوں نے اندر دیکھتے ہی سر نیوڑ کر تقسیم ملی پھر ایک دوسرے کو استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے ہاتھ آگے لائے ہاتھوں میں ایک ایک لڑی کی مالاں لٹک رہی تھیں۔ مالاں میں صمیں سموئے شہنائے کے سرخ ڈاورے میں ایک ایک کچڑہ بٹھایا تھا۔ کسی کو مل پھر کو دھکے ڈارے میں باندھنا کھڑا کیا۔ انہوں نے اپنے اپنے ڈاورے میں اپنے اپنے کچڑے کا کچھ قابو کمری ایا ہوا تھا۔ راجہ اور سہ خان ان کا یہ مضموم سا بھر اور عقیدت کا اظہار دیکھ کر اندر ہی اندر غائب مغلوب ہوئے۔ راجہ ہنڈھکھڈوایا کہ باری باری شققت خیر انہوں سے تھکا۔ ہاپار خواہ دو قدم آگے بڑھتے ہوئے گروں ان کے آگے گروی۔ انہوں نے اسلئے کے بعد بچوں نے اپنی جیبوں سے ہر ایک ایک اور ختمنا کچھ نکالی۔ کمر اس کے پیش کیا تو یہ اس کے لیے ایک حیرت انگیز منظر تھا۔ وہ تو پہلے ہی وہی تھیں۔ میں تھا اور اب ان کچھوں کی فسوں خیمڑی نے مزید جکڑ لیا۔

بہت ہی دیر بعد کہیں میری کچھ میں آیا تھا کہ ملائیت میں بھی مادارائیت پیدا ہو سکتی ہے اگر کسی صاحبِ فکر کے کا اذن حاصل ہو جائے تو۔ مثال اس کی یوں کہ اگر کوئی رشتہ دار آپ کے گھر میں فقرا لے کر توپ کھنٹا ہوتا ہے اگر ماں کھلائے تو کچھ اور ستار۔ یہی اور مجھ پر کے قصوں میں بھی نہیں الگ الگ ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی فرشتہ یا باہا کھلا دے تو یہ لمحے اک نعمتِ یزدانی بن جاتے ہیں۔

حضرت جیسی علیہ السلام کے ہاتھوں انھیں میں اللہ کریم و حکیم نے مسیحائی پیدا فرمادی تھی۔ اسی طرح بناب داود علیہ السلام کے دست و بازو میں آج بھی گو نگہاز کرے کی آیت تھی۔ سیدنا نون علیہ السلام کے لیے لکڑی کا کام آسان تھا۔ نور کریم کہ نبیوں جیہیں وہ نبیوں انھیں اور اللہ کے دیگر منتخب بندوں کو نصیب مسیحائی سے سرفراز فرمایا گیا۔ عبادات، نمازات اور اعمال صالحہ سے بھی شغلی تھے۔ پیدا ہو سکتی ہیں

اور ان سے انسانیت کی فلاح کے لیے بہتر کام لینے جاسکتے ہیں۔ شغالی لہروں کا تعلق انسان کی باطنی ضرورت اور روحانی بیداری سے۔ لگاؤ و شہیت کی ذکاوت و بالیدگی اور ظاہری جسمانی طہارت و عبادت کے درجہ سے ہوتا ہے۔ ہاتھوں کی انگلیاں توجہ و مومن نفس نظریں لگا ہیں اور نگاہ خیال قبیل نفسی و غیرہ ایسی وہ روحانی قوتیں ہیں جو پیرائے سائنس کے مفہوم میں آتی ہے۔ اب ان کے آگے 'سینکڑوں' نرم سائنسوں کی پانچا پناؤم پر یہ نگہ قہرانی 'فلکیس' قہرانی 'کلر قہرانی' پانچا اثری میڈیٹیشن وغیرہ سے مسیحا یا شغالی لہروں کی افادیت یا مقبوضیت کا تصور آگے بڑھتا ہے۔ مقصد اس کا اجمال کا یہ تھا کہ ایک مسیحا صفت اللہ کے بندے سے جو ایک عام چیز ٹھہ جائے یا جسے وہ چھو لے تو کیا عجب وہ خاص نہ ہو جائے۔ اس کی عام ہی مثال 'مٹھا ٹیس' سے دی جاسکتی ہے کہ اس کو اگر مٹس خام سے کسی کمرہ یا جائے تو اس میں بھی مقناطیسیت آجاتی ہے۔

پاتال کھو جائی یعنی بھائی بابا اپنی عبادت و بندگی یا مقصدوں سے وہ مقام پا چکا تھا کہ زمین کی سطح سے پاتال تک وہ سب لایع و معدن، مضر و مہرب کو نہ صرف محسوس کر سکتا تھا بلکہ ان سے اختلاف و حاصل کرنے کی استطاعت بھی رکھتا تھا۔ واضح ہے کہ اللہ کے ایسے خاص بندے اپنی فوقی افئیت سے ہوتے ہیں۔ روحانی قوتوں سے ان کی زندگی کی تمام چیزیں ان کی اپنی ذات سے نکلتی ہیں۔ ان کی اپنی ذات سے ان کی اپنی معالجات میں بڑے شگافتی ہوتے ہیں۔ افغانی بابا کو اپنی انھوں میں سے والہانہ محبت تھی۔ یہ محبت سے اپنے دوسرے شغالی کی ولادت کے کچھ ہی عرصہ کے بعد گہانی موت کا فکار ہو کر اپنے سنا خدا ان کو سنا گوارا گئی۔ نور جا افغانی بابا بنے وہ کسی قہر اللہ کی رضا آ کے مرال دیا۔ انتقال صفت بشریت یا آل اولاد کی شہیت کہ باشم خان لائے لوات کی دیہ راز میں اپنے اپنے کو چاہا۔ یہ یوں بڑی اور پیار۔ معاشی ہا آسوی کا دورہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا منہ نہیں چہ ہاندھا کہ نواسوں کو کسی اکل کرے۔ ان بچوں کا بچپن بہلانے اور شگافتی اور کرنے کی خاطر کچھ کچھ اپنے جواہر دانے کہیں پہاڑوں سے کھنڈ کر ان باپ بچوں کو دیا۔ اور راجہ کی چاہ سے زمین میں تو اس پر غولی کی کھیل و قہر کے لیے خانہ دانہ و سائل پیدا کر دیے۔ ایسے جگہ کی گہرائیوں میں اپنی استھانوں سے ایسے ایسے راستے بنے اور تہہ خانے بنوائے جنہیں دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ کام عام انسانوں کا نہیں۔ یقیناً یہاں ان کی ہستیوں کا غفل و غل رہا جو زمین سے ظاہر و باطن کی جواہر نکالیں۔ انہیں گزرنے مو جو دور آنے والے وقت حالات کا خوب اور اکل تھا۔

راجہ کی عقل پر وہ رنگ دانے چڑے رکے۔ جہے تھے۔ جہے صرف انمول تھے بلکہ ایک عجیب و سرسٹ بھری کشش بھی پیدا کر رہے تھے۔ آنکھوں میں لطفک اور دل میں کشادگی ہی بھرائی تھی۔ جہے جواہرات راجوں مہاراجوں کے لیے روزمرہ کی طرح ہوتے ہیں مگر یہ تو کچھ دیگر ہی کیفیت لینے ہوتے تھے

کیونکہ انہیں ایک پاتال کھیتی اور ولی نے چھوڑ دیا تھا۔ شکاری قوتوں کے حامل ان پتھروں نے راجہ کے دل و دماغ میں اک نور سا بھردیا تھا۔ وہ گوگھوسی حالت میں کبھی کچھوں کو تکتا اور کبھی ان بچوں کو۔۔۔ چند لمحے توقف کے بعد پوچھنے لگا۔

”بالگو! پراسمول جو اہر کہاں سے لائے ہو؟“ پھر وہ اپنے گلے کی مالاؤں کو دیکھتے ہوئے مزید بولا۔
 ”ایسے سندر جو اہر تو کسی نے سنے میں بھی نہ دیکھے ہوں گے۔“ ہاں! کبھی یہ کہاں سے ملے؟“
 بچوں نے اک دُوبے کو استقبالیہ نظروں سے دیکھا۔ بدشت ہاشم خان گویا ہوا۔
 ”یہ کپٹے ہمیں مانو بابا نے دیے تھے“ کہا تھا راجہ جی کو دے دیں۔“ چند لمحے ڈیز خاموشی طاری رہی۔۔۔ راجہ جی تو جیسے پتھر کی لاث بن چکے تھے۔ آخر پتھر کی لاث میں جو تک لگی۔

”بچو! کیا میں آپ کے پاس سے مانو بابا کے لاش کو ملاتا ہوں؟“
 ”پتہ نہیں۔۔۔ مانو بابا نہ کسی سے ملتے ہیں اور نہ ہی دکھائی دیتے ہیں۔“ ہاشم خان نے جواب دیا۔
 راجہ نے اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

”اگر تم یہ کہو تمہارے مانو بابا اس وقت کہاں ہیں اور کیا وہ تمہیں دکھائی دیتے ہیں؟“
 ”جی ہاں! وہ دکھائی دیتے ہیں اور وہ اس وقت کہاں ہیں؟“
 راجہ نے دلچسپی لیتے ہوئے مزید پوچھا۔ ”یہ بھی تو بتاؤ کہ وہ اس وقت کہاں ہیں؟“

ہاشم خان نے فوراً جواب دینے کی بجائے اپنے باپ کی جانب دیکھا۔ پھر پوچھ کر بتایا کہ وہ اپنے قہر خانے میں ہوتے ہیں۔ پتھر کی کدو دلوں تیزی سے باہر کی جانب لگی تھیں۔

راجہ کو جیسے جتن پڑ گیا تھا۔۔۔ وہ ہر لمحہ اس کے پیچھے پیچھے کے گدے پہ آکر مارتا دے بیٹھا۔
 ہلکی پھلکی بات چیت کے دوران ملکا پھلکا ناشتہ بھی ہوتا رہا۔ کھنگوڑا اور تیرہویں کی قیصر مسالہ سا، ان اور ان پہ اٹھنے والے مصارف کے متعلق غمی۔ رجب کی مصلحت کے مطابق اسطیلو زمین کے علاوہ اور کبھی طرح کے اخراجات ایسے نہ تھے جو ریاست سے وصول کیئے گئے ہوں۔۔۔ جبکہ قیصرانی مصارف غیر معمولی مہارت کے دکھائی دے رہے تھے۔ فتح خان کے بدخو اہوں نے جن اثرات کی بنیاد پر اجداد کو رکھایا تھا ان میں سر فرہست و الزام تھے۔ ایک یہ کہ فتح خان نے قہار و شہنشاہات کے قریب جو عجیب و غریب سرکاری قیصر رکھے۔ ان کے اندر نیچے اور ان کی پر انوار مہارت و مقامیت ہے جس سے اس کے مذہب و عزائم کی بوجھوں ہوتی ہے۔ وہ ان ایک اجداد جس کے دماغ میں ایک حد تک حدود ہوں وہ اٹھنے والے غیر معمولی اخراجات کا کیونکر قائل ہوا۔

اور پھر یہ کہ مستری مزدور وغیرہ کوئی نفع دہانی نہیں تھا اور نہ ہی کسی ریاستی اہلکار کو سوا سی پانی تھا کہ خوشییر سیکھ کے معائنہ کی اجازت دی گئی یہ سب اثرات جو بے گنہگار اور قابل فہم تھے۔ یہی وجہ تھی کہ رجب کے من میں بھی

ہال پر گیا تھا اور یہ بھی کہ راجہ کے علاوہ کوئی اور دعوت میں شریک نہیں ہو سکتا۔ یہ قدغن بھی مزید اس شک کو مضبوط کرتی تھی کہ فتح خان راجہ کے وفاداروں میں سے نہیں، جبکہ اس کا مسلمان ہونا بھی اس کے حق میں نہیں جاتا تھا۔

کہتے ہیں کہ راجہ مہاراجہ بادشاہوں کے سروں پر اوپر والے کا خاص سایہ ہوتا ہے۔ ان کے ہاتھ عقل و دانش، زور و باری، مصلحت گوئی اور عائی اشارے بھی ہوتے ہیں۔ حکمران ہوتے ہی وہی چیز جو خاصان خاص ہوتے ہیں۔

جو ہر سامنے تھا وہ اس کے حق میں نہیں تھا مگر اس کے باوجود راجہ باطنی طور پر محسوس کر رہا تھا کہ فتح خان اس کا وفادار اور ایک بہادر جانیوار ہے۔ مگر کچھ تو ہے جس کے پردہ داری ہے۔ وہ اسی پردے کو بنانے کی غرض سے شامی اور خاتلی لڑائیوں کے خلاف ہاتھ کسی جانشین کے اکیلا ہی اس کی پراسرار حوٹلی میں چلا آیا۔ بغیر موسم کے پھل میلے تو کھتا ہوا وہ سوچ رہا تھا کہ فتح خان کے حاسنوں نے تو اس کے خلاف کان بھرنے میں کوئی کچھ نہیں رکھی تھی۔ یہ بھگوان کی کرپا سے ویرودش کی جتا کرنے کے نکل گیا۔ راجہ خلی پہ لڑخاب کے خدوں کی مانند فرش رنگ و فرش کیف قیمتی پتھروں کو لگا ہوں میں تو لانا ہوا اس سے بھلا ہے۔

UrduPhoto.com

”ام راجہ کے گرد مہاراج کے دشمن کرنا پاتے ہیں۔“

فتح خان ہنس کر اس سے پہنچے ہوئے ہوئے۔

”میں خود ایک عرصے سے دشمن کے لیے کام کر رہا ہوں۔ یہ بھی ان کی طرح ہے۔“
 دیا ہے کہ میں ان کی بھی آواز سن چکا ہوں۔ انہوں نے دیکھنے کی قسمی شاپہ ہاشم خان کوئی لڑنے کی ہے اس کے علاوہ وہ تو اپنی بیوی کو بھی دکھائی نہیں دیتے۔“

راجہ نے شکرانہ لہو میں لہی لہو کر کے نورے ہلی ہی آواز میں گویا۔

”اس کا کوئی آپا ہے؟“

”مہاراج امیری کچھ میں تو اس کا آپا کوئی نہیں، اور اگر کوئی ہے بھی تو وہ ہاشم خان کے پاس ہی ہوگا جو ان کا لڑا تھا۔“ ہے۔ یہ جتنی چہر آپ کا اور پادشاہ اور یہ حوٹلی تھا ہے پات و نیمہ سب اور اس کے کا آپ کا اور ان کا تو اس سے کا ہی چھٹا ہے۔“

فتح خان کا جواب اپنی جگہ پر درست مگر لہو طہن نہیں تھا۔ کافی دیر ان کے درمیان اسی طرح کے متعلق گفتگو ہوتی رہی مگر راجہ کے بشرے سے لگتا تھا اس کے دماغ کی ٹوٹی ٹوٹی اور انکی ہوئی ہے۔

ایسا تک راجہ پوچھ بیٹھا۔ ”چچہ کہیں آس پاس دکھائی نہیں دے رہے۔ کہیں وہ کھیلنے کے لیے باہر تو نہیں نکل گئے؟“

”مہاراج! وہ اکثر پیچھے حویلی کے تختوں میں کچے کھیلنے رہتے ہیں۔ تکھیل میں وہ اس قدر منہمک رہتے ہیں کہ کسی اور کام کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ شاید یہی وجہ کہ ان کے کھانے پینے کی امداد داری اک زمانہ سے نافذ بابا نے اٹھا رکھی ہے۔ ہم تو اتنے مجبور اور خوف زدہ ہیں کہ انہیں کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ خاص طور پر بڑے بیٹے باشم خان پہ تو ہماری کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ پڑھائی لکھائی نہیں کرتا نہ ہی مانی کی کسی بات پہ دھیان دیتا ہے۔ آوارہ گردی یا کچے کھیلنا رہے گا۔ ادھر سے اگر جی بھرے تو پھر چتر اور مٹی میں جُست جانے کا سب سے حویلی بنی ہے‘ جانے کہاں سے بڑے بڑے جنگی خرگوش ادھر چلے آئے ہیں۔ آپ پسند فرمائیں تو پیچھے چل کر

بچوں اور خرگوشوں کے قصائے بھی مل جائیں گے۔“

[illegible]

کی ایک جانب سے گھٹیں تو دوسرے رخ سے برآمد ہوں۔

راجہ اس جہان حیرت میں یوں گم غم کہ اسے ایک جانب کندھولے سے اوپر آتے ہوئے ہاشم خان اور قاسم خان کی خبر بھی نہ ہوئی۔ ہاشم خان کی منگی میں باہنل کا بچہ اور قاسم خان کے ہاتھ کا لایا سیاہ خرگوش۔ ایسا معدوم معلوم سا کہ جیسے سیاہ ڈرباف کا پٹھا نرم ہاتھ داب رکھا ہو۔ اچانک باپ اور راجہ کو سامنے پاکر مہبوت سے باہنل اور خرگوشے والے ہاتھ بیٹھ پیچھے لگانے لگے۔

راجہ نے بات نہ مانتے ہوئے پوچھ لیا۔ ”بھئی بچو! کچھ ہمیں بھی تو دکھاؤ تمہارے ہاتھوں میں کیا ہے؟“

بچے اک دو بچے کا منہ تھمتے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ اب کیا کریں؟

یہاں اب فتح خان ہوا۔ ”شاہاش پتو! مہاراج کو دکھاؤ کہ تمہارے ہاتھوں میں کیا ہے؟“

دونوں نے ایک ساتھ اپنے ہاتھ اُس کے کمرے میں چھوئے چھوئے ہاتھوں میں نئے نئے بچے۔

یوں آسودہ مطمئن جیسے دیکھی جائے اماں میں پہنچ پائے ہوں۔

راجہ مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”ان معصوموں کو کاہے دیو بچ رکھا ہے۔“

ان کی ماتیں انکس محاش کہ ہی ہوں گی۔ لاؤ! راجہ بھی دکھاؤ انہیں۔“

راجہ نے انکس محاش کہ ہی ہوں گی۔ لاؤ! راجہ بھی دکھاؤ انہیں۔“

انکس محاش کہ ہی ہوں گی۔ لاؤ! راجہ بھی دکھاؤ انہیں۔“

انکس محاش کہ ہی ہوں گی۔ لاؤ! راجہ بھی دکھاؤ انہیں۔“

انکس محاش کہ ہی ہوں گی۔ لاؤ! راجہ بھی دکھاؤ انہیں۔“

انکس محاش کہ ہی ہوں گی۔ لاؤ! راجہ بھی دکھاؤ انہیں۔“

انکس محاش کہ ہی ہوں گی۔ لاؤ! راجہ بھی دکھاؤ انہیں۔“

انکس محاش کہ ہی ہوں گی۔ لاؤ! راجہ بھی دکھاؤ انہیں۔“

راجہ انکس دیکھتے ہوئے بے ساختہ بولی اٹھا۔

”اے یہ تو بڑے شہر دہندہ ہیں۔۔۔ کہاں سے ملے؟“

”نا نوبہ پانے دیے کھیلنے کے لیے۔۔۔“

راجہ ان کے برابر آ کر دوں بیٹھ گیا۔ ہاشم خان کے کندھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی رہنمائی سے

کہنے لگا۔

”ہمیں بھی تو عواذ اپنے باپا سے۔ ان کے درشن سے بڑی شائستگی ملے گی۔ ان کے پاس سے جہت

میں اُن کے چہرے چھونا چاہتا ہوں۔۔۔“

وہ دونوں بیک وقت اپنے باپ کی جانب بھاگے۔ چند لمبے تو فتح خان کی بوجھ میں نہ آ پا کر بچوں کو کیا کہنے جو اپنے باپ سے اس کنکشن مرحلہ پہ مدد کے خواہاں تھے۔ آپس کی دیکھا دیکھی اور خاموشی میں حسبِ اہمیت کی شکل پڑنے لگی اور راجہ نے بھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ کہاں اس کے منہ سے نکل گیا۔

”ہاں ہاں اپنے مانو بابا سے کہو۔ مہاراج آپ کے درشن کرنا چاہتے ہیں۔“

یہ ٹکمر پاتے ہی بچے کا نہیں جانب برآمدے کی جانب لپکے اور گونے کے ایک کونے میں اتر گئے۔“

فتح خان نے شاید راجہ کا دھیان ہٹانے کی غرض سے کہا۔

”آئیے مہاراج! آپ کو خرگوشوں کے بل دکھاتا ہوں۔“

”یہ خاص خرگوش! سیاہ کھوئی خرگوش کہلاتے ہیں! یہ عام گھروں میں پائے جانے والے پالتو نہیں

خرگوشوں سے قطعی مختلف ہوتے ہیں اور اس سے بھی جو جنکھوں وغیرہوں کی کھانوں میں پائے جاتے ہیں۔ بلی کی

جسامت رکھنے والے یہ سیاہ خرگوش ناپید ہونے والی ایک خاص نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیکھا ہوگا کہ فاسد یا

خالو خوں نکالنے کے لیے مالجی یا ٹنگی لوگ بھوکیں جمع کرتے ہیں۔ وہکاری جھرات کے ٹھکانا بھکرے چھپتے

پاتے ہیں اور شب دن پورا اپنے فن میں استاد کے درجہ پہنچا ہوتے ہیں ان کے ہاں جہاز کی تہہ کا ٹھکانہ کے

پالتو گوبہ ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک عجیب و غریب قسم کا جانور ہے۔ اس کی شکل اور رنگت استعمال

کرتے ہیں۔ یہ خاص طور پہ چوری کے لیے چڑھا آسان نہیں ہوتا۔ پاک و بھارت کے اکثر مسندروں کے

مجلسوں مسجدوں کے گنبدوں میں تاروں پہ منڈھانیا سولے کا چتر نہیں گوبہ والے چتر ہوتا کرتے ہیں۔ اسی

طرح تربیت یافتہ گوبہ کو سونے سے لگے اور سونے سے لگے مختلف ہار لٹا ہار کا موہن میں استعمال ہوتے ہیں

ان میں سیاہ کھوئی خرگوش صرف اور صرف خاندان کے خاندان کے اراکین میں دفن و شہداء بچہ پانی

معدنیات کوغ اہستہ کے سلسلہ میں مہر ثابت ہوتے ہیں۔ عام کھوئی اور خاص ہاتھ کھوئی بھی نہ صرف ان

سے بیشتر معاملات میں رہنمائی لیتے ہیں بلکہ پال کر ان کی سبب تربیت بھی کرتے ہیں۔“

راجہ بظاہر فتح خان کی باتیں اور ان سیاہ خرگوش کی کھانوں دیکھ اور سن رہا تھا مگر اندر سے دھیان

اس گوشہ میں کی جانب تھا جہاں پہنچتے وہاں بچے کا سب ہو گئے تھے۔ راجہ نے اس کی باتوں سے صرف گوش

کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ بالک کو حرا کر چھو ہو گئے۔ کیا ان کے بابا اور گھس بیٹے رہتے ہیں؟“

بلی مہاراج ان کے اصل محلہ کے کا تو یہ نہیں کہ کہاں رہتے ہیں لیکن بچے کے محلے میں ان کا امتحان سا

بنا ہوا ہے۔ بچوں سے وہیں پہ بات چیت ہوتی ہے۔ اور میں بھی بچہ کی نماز کے بعد وہیں پہ انہیں مجلسوں

کرتا ہوں اور اگر ضروری ضررے تو کچھ بات چیت کا اذن بھی مل جاتا ہے لیکن انہیں دیکھنے کی حلقی نصیب نہیں

اقسام ہیں۔ شیرازی، کرمانی، مشہدی، حسنی حسینی، سلیمانی، نیشاپوری اور شجری مشہور ہیں۔ عربان کے بعد اور مرہارید سے پہلے یہ اپنی خواہی اثرات اور روحانی تیغیات کی بدولت صنفِ اولیٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قہرہ زئی رنگت اور شفافیت اس کے درجات بلند کرتی ہیں۔

ابا بیل کا آنسو کوئی باقاعدہ فیروزہ نہیں ہوتا ہے۔ یہ میرے کی گلی کی مانند ایک انتہائی معدوم نقطہ سادہ ہوتا ہے۔ جو مصر کے جنوب مشرق کے علاقہ کی وسیع کانوں سے سرخ ریتیلے پتھروں سے چمٹے ہوئے فیروزوں کے ساتھ کہیں برآمد ہوتا ہے۔ ایسا ہار یک بادن سا کہ ہار یک چھٹی سے بھی چھن کر نقل لے اور دکھائی بھی نہ دے۔ یہ ہار یک دانے کانوں کے حالات کی آس پاس ٹھہر جی ریت میں کہیں ٹنگروں میں چمٹے ہوئے بھی ملتے ہیں۔ ایسے دانے اگر حاصل ہو بھی جائیں تو وہ کچے ہوتے ہیں یا پھر بندرتھے۔ تیز روشنی اور خشک ہوا انہیں بہت قیر کردیتی ہے۔ صحرائی ابا بیل میں جو امرا صوبہ مصر میں اور قدیمی قبرستانوں میں پائی جاتی ہیں یہ فیروزہ دانے ان کی من بھالی نعت ہوتے ہیں جنہیں وہ وحوش ذوالحوش سمجھتی ہیں۔ مزے کی بات ہے کہ یہ دانے انہیں دن کے اُجالے کی نسبت شام کے چھپنے اور رات کی تاریکی میں زیادہ واضح دکھائی دیتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ کوئی باطنی سن انہیں ریت کے لیے بھی گینوں کی موجودگی کی نشاندہی کرا دیتی ہے اور یہ سندری کا رس ہے جس کی طرح بہت اور یہ غریب ملک اب دکھائی جاتی ہے۔ اس وقت یہ دانے اس کی پہونج کی حرکت میں آجاتا ہے وہ اس کے نزدیک جتنی پہونج کرے گا اتنی ہی ہے۔ مگر بیج کی سی حرکت سے بچے جھولنے والے غریب دکھائی ہے۔ لیکن ابھی بہت دور ہوتی ہے کہ اسے فضا میں ہی تھوڑی دوسلے لیتی ہے۔ اسے فضا میں یہ بیل خیل بہت پسند ہے شاید یہی وجہ کہ خوب سے علماء اور لوگراط میں بھی باقیوں پر اس پراسرار پرنڈ ہے کے ذریعے کسی بھی شخص یا جاندار کو زندہ کیا گیا۔ اس "طائر لاہوتی" کا ذکر فرقان الحمید میں خصوصاً طور یہ ہوا۔ شخصوں کے بعد کثرت سے اللہ کی حمد بیان کرنے والا یہی پرنڈ ہے۔ اسے اللہ کا سپاہی ہواؤں فضاؤں کی ماہی اور لیدی راہوں کا راہی بھی کہتے ہیں۔ اس میں حسیت رہتے محنت اور صلاحیت سب پرنڈوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی امی روحانیت کا اندازہ دلچسپ لگا میں کہ اللہ بخوانے اس کا نام قدسیوں کی اسمائیکت کے شرف کے ساتھ دعا کیا۔ جیسے جبرائیل عزرائیل اور میکائیل وغیرہ ان کے ناموں کے ساتھ دعا کیا۔ ابا بیل کا لیبہ ابھی عجیب ہوتا ہے۔ کٹری نکسایا اور یہ کا حاتمہ رات میں ان کے کار بھی ایک عجیب قدرت و قدرت کے حامل ہوتے ہیں۔

ابابیل کے تمام تر جیہ تو چند ہی لمحے تک ہی جانتے ہوں گے جنہیں مالکِ کل نے اپنی رحمت کے فرشتوں سے علومِ اسماءِ ہرین یا حسیہ غیبیہ کے ساتھ تحفہء مہربانہ بخشا۔ و قدوری جہامتِ مطافِ ربانی۔ ابابیلوں کے بصرے اور پھرے وہاں ہوتے ہیں جہاں یہ نورانی و روحانی استغاثوں کی عملداری اور عہداری ہوتی

کسی آبائیل سے کچھ تعلق ہو سکتا ہے اور اسے آبائیل کا آنسو کیوں کہتے ہیں؟

یہ سنا ہی تھا۔۔۔ کیوں یا حکمت دہن نہیں جو یہ جانتا ہو کہ جو اہم است کا قبیح و ماخذ منفس سمندر دریا پہاڑ صحرایہ میدان ہی نہیں چرند پرند و درند و گیر جاندار اور نباتات و اشجار بھی ہوتے ہیں۔ غیر معمولی بصارتی تب و تاب رکھنے والے والے پرندے از قسم شاہین، شکر، خیل، چکوز آبائیل، بڈ بڈ، سبیں مرغ، مرغابی، مرغ خاکی، گہرے گرم اور نیلے پانیوں کی مچھلیاں کچھوے۔ کوہستانی علاقوں کے نیل کنجھ، چکاری چریاں، مارخوز، عقاب، شیش ناگ، نیولے صحرائی گود کے پیٹ پوٹوں اور مری ہڈی میں ایسے سنگ دانے دستیاب ہوتے ہیں جن کا شمار جوہرات میں ہوتا ہے۔ متعدد پرندوں کے گھونسلوں میں بھی قیمتی پتھر ملتے ہیں۔ جنگلوں میں گھومنے والے شکاری لوگ اس راز سے خوب واقف ہوتے ہیں اور اکثر ان پتھروں کو حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ زیر زمین حشرات اللہ میں کے بھون اور کھوٹوں، بونوں، ہاشیتوں، حتیٰ کہ خرگوشوں اور کیڑوں مکوڑوں کی کھدوں میں بھی قیمتی سنگ دانوں کے شب چرائے پائے جاتے ہیں۔ اساطیر کے قصوں کہانیوں اور دیو مالائی کتھاؤں میں بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جس سے ہمیں اس کی پراسراریت، افادیت اور کرشماتی اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔

سوانحی و قصوں کے ساتھ ساتھ کچھ عجیب و غریب روایات بھی ملتی ہیں جو آبائیل اور آبائی کا کاروبار کرنے والے کے نظر کسی مچھلیاں شکار کرنے میں کامیاب ہو جانے میں جنت کے پیٹ اور دھن سے ملتی ہوئی اور سنگ۔ بھی مل جاتے ہیں۔ بھوں اور سمندری مرغابیوں کی بیٹیاں اور لکے سے بھی ملتی ہیں۔ جو اہر دانے مل جاتے ہیں۔ سانپوں کے معدے سے بھی قیمتی دانے ملتے رہتے ہیں۔ اکثر چیلوں کے گھونسلوں سے ماس لگے نہ لگے۔ سوئے جانے والی کھانوں اور کھانوں کے علاوہ کھانوں میں مل جاتا ہے۔ آپ کے لیے یہ چھوٹا سا اقتدار تحریر کھول دے گا کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

وہ ایک ایم ایم رہا تھا۔ میں نے کسی نہ کسی طور وہاں الیکٹریسیٹی کی نوکری حاصل کر لی تھی جبکہ چلی کی الف بائے سے بھی نہیں واقف نہیں تھا۔ چرب زبانی خوبصورت منگاری اور اداکاری سے میں نے سارا دل و جان چھانوں میں اتھی خاصی صنعت سادات پیدا کر لی تھی۔ چھوٹی سی شری، ارجمی، سریوٹی کو چیلے اُجالے پڑے خانہ بچہ موقع محل کے مطابق بچے بنی لکھتو۔ لکھوے کا نماز روزہ اور ظاہری پرستیز گاری۔ اللہ صوف کرے تھوڑے ہی عرصہ میں میں تمام صاحب کے لاسٹ سے خاصہ مشہور ہو گیا۔ ہم روز پچھو گئے جھارے تعویذ گنڈے بھی چلے گئے۔ اب یہ عالم کہ منفس خاندانی کے لیے ہر کتاب جاتا اور سارا دن پاؤں دیرا رہتا۔ نہ کام نہ کوئی پوچھ چڑھال، تنخواہ بھی نہ ملے اور راتوں میں ہر ماہ سیدھی میری جیب میں تنفی جاتی تھی راوی میرے لیے پیش ہی پیش لکھتا تھا۔ چیلے اب اس اجمال کا دوسرا رخ دیکھتے ہیں یہ سچ ہے کہ اس نوکری

کو حاصل کرنے کے لیے میں نے چھٹی اسٹاپ پیش کی تھیں جبکہ میں لیور لگانا بھی نہیں جانتا تھا کہ گھر میں مٹی کے تیل کی لائینیں بٹا کرتی تھیں۔ اس حالت یا مقام تک پہنچنے کے لیے میری کسی خاص کوشش کو بھی دخل نہیں تھا بلکہ زیادہ تر قصور چھانٹوں ان کے عقیدے توہمات اور کچھ میرے سیا لکونی دوستوں کا بھی تھا جنہوں نے مجھے سید زادہ اور پچھٹا لہو اور ویش بنا کر ہاں مشہور کر کے اپنے انوں کو سید صاحب کیا تھا یا پھر ایک ایسا مجید بھراؤ تھا جس میں میرا کوئی کمال نہیں تھا بس اک بہانہ بن گیا جس سے میں کچھ اور مشہور ہو گیا۔ یہ بھی آزاد یا گیا تھا میرے ہاں مہنگات کی حاضری ہوتی ہے۔

● لائبریری مچھلی مونگا مٹوتی.....!

لہو انہوں کہ ہماری ایک شاپ کا ایک مزدور جس کا تعلق علاقہ فیروز سے تھا ہمارے ساتھ والے خیمہ میں رہتا تھا۔ غریب اور شریف سہا یہ چھان تھیں ہمیں برس کا ہو گا۔ دوسرے مقامی لوگوں کی طرح یہ بھی توہمات کا مارا تھا۔ بیرونی فقیروں کا وہ دوات حاصل کرنے کا بے پناہ خواہشمند تھا۔ اسے اپنے قبیلے سے باہر کسی ویشیز سے ملنے کے لیے اس نے ایک اور گاؤں کی طرف سفر کیا تھا۔ وہاں اس نے ایک شخص کو جنہیں پورا کر کے کے لیے اسے ایک اچھی خاصی رقم دے کر گاؤں کی اوریہ دم اس کی اوقات اور سوچتے ہیں۔ ہوشی مگر وہ جو کہتے ہیں کہ حقیقت تو ایسے ایسے سحر کے بھی بنے کر والیتا ہے جو وہ امکان سے کہیں پہنچتے ہیں۔ ان عاشق صادق نے باہری کو گھر بھیجتے ہوئے اور اپنے پیار کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے نہایت مائی اور فریادیں طرح محنت کا کدال اور محبوبہ کی قربت کا مشعلیہ طریقہ استعمال کیا۔ وہ اس کی خاطر اپنے گاؤں سے باہر نکل آیا۔ دارمک ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں قدرے معقول آمدنی ہو سکتی تھی۔ چھانکھ یا کوئی ہنرمند تھا۔ انہیں دیہالی دار مزدوروں میں سے جگہ مل گئی۔ تنخواہ کے حساب سے کہ وہ اس میں ایک بڑے طرح کیے بغیر جمع کرتا رہے تو چند روزوں کا لہو اسے دے کر رہا تھا۔ اس وقت کو کم کرنے کی خاطر یہ عاشق صادق ویش کی اپنی پوری کی پوری تنخواہ نہیں منگوا کر لیتا۔ اپنی رولی پائی لہو پوری کرنے کے لیے وہ ابھر ادا کر کے کام کرتا رہتا۔ دیوینی کے بعد کسی بول چالے خاتے میں برتن صاف کرنے پر بحث جاتا۔ ہر ہفتہ لکھنی کے رہنے والے صاحبان طور ٹم پتھر لگاتا وہاں سے لوگوں کی ضرورت کا مادی سے آتا۔ اس طرح کے چھوٹے موٹے سیر کے کاموں سے وہ اپنے مصداق پورے کر لیتا۔ میری ماں لہو شہرت آنے پر اس کا میری چاہیہ سے ملتا تھا کہ میں اس کا ہمسایہ بھی تھا۔ سوڈو میرا بھی بھولی چپ بن گیا۔ چھوٹے موٹے کام کھانا یا نیچے کی مٹاؤں سترائی کپڑے دھونا پاؤں دینا۔ غرضیکہ پوری طرح اس نے مجھے اپنی "خدمات" کے حصار میں محصور کر

ہوا تھا۔ میں یونس خان کی غلامی باطنی 'ساری کیفیات سے خوب واقف تھا۔ خوب سمجھتی تھی وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ ہمارا کوشش کے باوجود میں اُس کے دل و مانع سے اپنے ہارے میں خوش فہمی نکال نہ سکا۔ مگر اُس کی ہار اُسے دلیل دے کر سمجھا یا کہ اگر میں ایسا ہی دوسروں کے حالات بدلنے پر قادر ہوتا تو خود اپنے حالات درست کیوں نہیں کر لیتا۔ چودہ روپے دیہانزی پہ پڑیوں میں جھک کیوں ماروں۔ مگر اُس کی کھوپڑی میں بھیجا کی جگہ کوئی دتہ تھا جو اس کی عقل پہ چڑا ہوا تھا۔ بس ایک ہی رات۔ مجھے کوئی ایسا نسل بتائیں جس سے میں جلد سے جلد اتنی رقم حاصل کر سکوں کہ میری شادی ہو جائے۔ اُسے خدشہ تھا اُس کی محبوبہ کا باپ کہیں رشتہ دینے سے انکاری نہ ہو جائے۔ تجوں تجوں میں اُسے سمجھا تا توں ٹوں وہا اور پُر امید ہو جاتا کہ میں ہی اُس کی یہ شادی والی مشکل کو حل کر سکتا ہوں۔

”شاہ صیب! آپ ہم کو کوئی تعویذ دے دیجیے گا۔ ہمارے بیٹا، خروٹ کی گریاں نکالتے ہوئے کھڑا تھا۔

[illegible]

”ہاں کے دروازے پر کھیرا پڑا نہیں گیا، جیسے کہ یہاں ہر صبح نماز کے بعد ہوتا ہے۔“

”یہ سنا کر میرے منہ سے لاجول و لا قوت نکلا۔“ یہ لیا جہالت ہے۔

”شہاد صیب! اس تعویذ نے بہت کام کیا ہے۔“ میں نے ہر روز آدھی رات دریا کے کنارے پانی میں

”و انہیں نائیک یہ کھڑا ہو کر انہیں بارگاہ تعویذ والا کلام پڑھتا ہوں۔“

میں نے قبر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”کیا تمہاری محبوبہ کے گاؤں میں دریا ہے؟“ اور تم یہاں نہیں مرتے کیوں چاہتے ہو۔ میں یا انیس
 مرتبہ کیوں نہیں؟“

”شاہ صاحب! ہماری محبہ کے گاہوں میں دریا نہیں چھڑھتی چھڑھ ہے اور شگفتہ جان انہیں پس کی ہے ہم میں یا انہیں بار کیسے پڑھ سکتا ہے۔ بس ایک تعویذ ایسا بنا دو کہ انہیں سے اتنی رقم مل جائے کہ میری شادی بن جائے۔“

میں اس حقیقت سے خوب واقف ہوں کہ کسی پڑھے لکھے سردار اور ان پڑھ خان سے کسی مسئلہ بات کی تصدیق کروانا کتنا دشوار عمل ہے۔ یہ شادی کا مارا بوا بھان میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔ مجھ سے دولت کے حصول کے لیے تعویذ مانگ رہا تھا میں اُسے کیسے بتاتا کہ مجھے خود کتنے لوگوں کا قرض دینا ہے۔ ان قرض خواہوں سے منہ پھیر کر ہی تو دوسرا بھاگ آیا تھا۔

اُس کے جن بیٹھے سے تنگ پڑ کر اور جان ٹھٹھانے کی خاطر میں نے اُسے رازداری کے لہجہ میں بتایا کہ آدھی رات آگے آدھی پیچھے دیریا کے کنارے کسی پتھر پہ بیٹھ کر اپنی اور محبوبہ کی عمر کی تعداد جمع کر کے "لامیری مچھلی موٹا مٹوٹی" کا ورد کرنے کے بعد اس کی صورت تصویر میں لاکڑ مچھلی پکڑنے کی کمانا دہری دہری دیریا میں پھینک دینی ہے۔ اگر مچھلی پھنس جائے تو مچھلی کا پیٹ چاک کر کے اُس کے معدے کی آلائش میں کوئی سنگ داند تلاش کرے۔ تھرا دھادی کی رقم کا مسئلہ حل ہو جائے گا مچھلی صرف ایک پکڑنی ہے اور اگر مچھلی گائے میں نہ لگے یا معدے سے کچھ برآمد نہ ہو تو اس وقت تک یہ عمل جاری رکھنا ہے جب تک گوہر مقصود حاصل نہ ہو جائے۔

تو انہی ایہ سارا دارا میں نے اُس سے اپنی جان کا دان پالنے کی شرط کیا تھا۔ بھگت داس نے منہ نہیں ہونچا اور بے اختیار کہنے لگا کہ میں اس سے بے خبر ہوں۔ تو چھانٹے پھریں ہو چکی تھیں۔ دن بھر میں بس ایک آدھ بار ہی مسجد یا خیر میں لاٹھالی جوتی کا میں فرش بنا کر میری "جان پڑھائی" کی ترکیب کا میاں بولی۔ اب میں اکثر رات کو اٹھ کر وہی کی جانب ہوجاتا ہے اور سے دیکھتا شہر پر دیریا میں مٹی ڈالے پتھر پہ بیٹھا ہوتا۔ اور سے مٹی یا حراقت تیرے ڈھنگ تک لے لے ہیں۔ میں چند لمحوں اور کچھ اٹھتے اور ان کے پاس آکر پھر اسی جگہ سے لوٹ آتا۔

انہی دنوں میں بیمار پڑا تو چند روز آرام اور کھرا والوں سے ملنے کی خاطر سیالکوٹ چہ آیا۔ مگر یہاں تو آرام اور ملنے ملائے کے لیے تھا۔ مگر زراں کام ایسا بگڑا کہ میں اور وہم بھڑ کر رہ گیا۔ چند دنوں میں وہاں واپس واپس واپس چلا گیا تو بے شمار تہذیبیں میری منظر تھیں۔ نمایاں تبدیلی یہ تھی کہ پولس خانہ یہاں سے جڑا تھا۔ جانے کی وجہ تو معلوم نہ ہو سکی۔ اڑتی اڑتی خبر یہ تھی کہ اچانک وہ امیر ہو گیا اور مری مضمون کواری سرداری پہ خاک ڈاک کر اپنے گاؤں واپس چلا گیا۔ پشور سے بہت سافٹی عروسی ماہان بھی اپنے ساتھ لے کر گیا ہے۔ میرے گھر لے آئے یہ کیا ہو گیا؟ واقعی کوئی موتی موتی کا تھلک گیا یا کہیں اور سے آیا تھا؟ یہ چند اور لوگوں سے بھی انداز کی بات دریافت کرنے کی کوشش کی مگر کچھ کچھ سے معلوم نہ ہو سکا۔ کچھ دنوں کے بعد میں بھول بھی گیا کہ پولس خان نامی کوئی بندہ میرے پاؤں دبا کر تا اور میرے لیے اوپر کے کام کرتا تھا۔ شاہ صیب شاہ صیب کہتے کہتے وہ عقیدت سے شراہور ہو جایا کرتا تھا۔ اب پھر وہی نزدیک و دور ان بات

بھاری مشینوں کی گز گز اہستہ ڈوریا کا شور بوتلوں چائے خانوں اور عیموں کی ڈھیا۔

ہاں میں بتا رہا تھا کہ مجھے شاید صیب بنا کر مشہور کر دیا کہ میرے قہقہے میں ہوائی چیزیں ہیں۔ میں بھی وہاں اچھی نوکری اور عزت و شہرت حاصل کرنے کی خواہش کے پیش نظر نہ موش تھا۔ دریائے کابل کنارے ایک خیمہ میرے تعارف میں تھا۔ پاس ہی مسجد اور چچے ڈھلوان کے اوجھڑے اور طہارت کے لیے مناسب سی اوت تھی۔ اس ڈھلوان سے سو قدم آگے دوہری خاردار آہنی باڑا سوارہ تھی جس پہ لمبیاں سی پٹھان اور دو اور انگریزی میں ہدایات لکھی تھیں کہ اس سے دوسری جانب علاقہ غیر ہے۔ ڈارنگ پر دیکھت میں کام کرنے والے ملکی غیر ملکی کارکنوں کو واضح طور پر خبردار کیا جاتا ہے کہ وہ اس حد کی دوسری جانب جانے سے قطعی گریز کریں۔ اس اعتقاد کی خلاف ورزی کرنے والوں کی جان و مال کی کوئی عطا و مدد نہ ہوگی۔ سرخ رنگ کی یہ سنسنی خیز تحریر ہم پر بے خوف و استعجاب کی کیفیت میں پڑھا کرتے آں ڈھلوان، زکی دوسری جانب بھی دیکھا کرتے جدھر رنگ پرانہ سی پٹھانوں اور بچے بچے جھار جھکاڑ کے علاوہ کچھ اور دکھائی نہ دیتا۔ انسان تو انسان کوئی پہچانی جاتو پرندہ تک نظر نہ آتا۔ سوچا کرتے یہ کس طرح کا علاقہ غیر ہے کہ انگریزی کوئی چیز منظرِ موسم از بین آجائے آسمان پر کچھ بھی تو غیر دکھائی دے گا۔ کرتے کرتے وہاں پہچان رہتے ہیں۔ نقل و مکان کے سوا کچھ بھی وہاں نہیں ہے اور لوگ ماراں ماراں جاتے ہیں۔ وہاں ہی طرح اس پار کوئی ایسا خوشحال انسان دکھائی دے جاتے مگر کوئی نظر نہ آیا۔ بارہ سوت بتاتے رات جا کر کئی گھنٹے اور سے پہچان آتے ہیں اور ادھر بچے کے بڑے بڑے غیر ملکی اہم افراد کو ان کے علاقہ غیر سے جاتے ہیں پھر ان کی رہائی کے لیے جی جی رقبوں کا ہتھوڑا کہہ رہے ہیں۔ یہ سب کچھ سنیں تو ان کے دل متانی اور اپنے مسلمان پاکستانوں کو چنداں پریشان نہیں کرتے کہ ان کے انوائس انہیں نہ تو کچھ حاصل ہوتا اور نہ ہی فوٹی ہوتی بلکہ انہیں انہیں کھانا پانا پڑتا۔ اسی خوش فہمی کے پیش نظر ہم ایسے اور سادہ کے ہزاروں کارکن جی جی آزادی سے نکلی ڈھلوان میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جدھر ہی چاہا اور دیکھا گیا۔ جہاں میں کھانا خشک تھوڑا کھانا لیا۔ پنجان پنجابی ہوئی تھوڑا خانے چھوٹی سوئی دوکانیں۔ اک چرب سا کچا بھنی مٹوں تھا کہ چوبیس میں اینوں سے الگ دو اور دو گروزی کھانا اور پھر ٹو کو مصرف و سرور کھانا کچھ ایسا میل بھی نہیں ہوتا۔

دریائے کابل کا کنارہ جدھر ہم بجلی والوں کے چند خیمے چھوٹی سی مسجد چھتر کباب ہوئی اچانک خانہ تھا۔ جی شاداب اور خوشنما جگہ تھی۔ دریا یہاں سے سٹ کر پیانہ لے کر جا کر رہتا تھا۔ دھوپ میں پیو جھاگ اڑاتا ہوا پانی، چھلکی پھینک کر پھیلیاں لہرائی بل کھائی آئینہ گھیریاں پڑا ہوا منظر پیش کرتی تھیں۔ چندار پھسلواں گول پنچروں میلوں پہ پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھتا ہوا تسکین آمیز ہوتا۔ ذرا آگے بڑھ کر

پوچھا۔ ”یہ جو ٹوٹے ہوئے ہیں یہ شاہ صاحب ہیں؟“

”نہیں! یہ صدر علی باجوہ ہیں۔“ اس نے ایک اور چٹان اُتار دیا۔ ان کی آپس میں پشتوں میں بات چیت ہوئی۔

اب آگے بڑھ کر تینوں اجنبیوں نے باری باری میرے ہاتھوں پہ کوس دیا۔ پہلے والا بولا۔
 ”شاہ صاحب! اس بے وقت تکلیف دینے کی معذرت چاہتے ہیں۔ مجبوری ہے اس وقت آپ ہمارے ساتھ تشریف لے چلیے۔“

میں ہکا بکا اُن کا منہ کھینچنے لگا۔ اس وقت آدھی رات تھی، انہوں نے پچھان لیں کہ میں کون سا شخص ہوں؟ مجھے یہ کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔ میں نے جرأت کرتے ہوئے پوچھ دی تھی۔

”اس وقت آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں، کوئی خاص کام کروانا ہو تو صبح تشریف لے آئیں اس وقت۔۔۔۔۔؟“

وہی شخص بھر بولا۔ ”شاہ صاحب! مجبوری نہ ہوتی تو آپ کو تکلیف نہ دیتے، کام ہوتے ہی آپ کو واپس پھولا جائیگا۔“ میرے لیے رستہ دکھاتے ہوئے مزید کہا۔ ”وقت کم ہے آپ آئیے۔“

وہی شخص بھر بولا۔ ”شاہ صاحب! مجبوری نہ ہوتی تو آپ کو تکلیف نہ دیتے، کام ہوتے ہی آپ کو واپس پھولا جائیگا۔“ میرے لیے رستہ دکھاتے ہوئے مزید کہا۔ ”وقت کم ہے آپ آئیے۔“

وہی شخص بھر بولا۔ ”شاہ صاحب! مجبوری نہ ہوتی تو آپ کو تکلیف نہ دیتے، کام ہوتے ہی آپ کو واپس پھولا جائیگا۔“ میرے لیے رستہ دکھاتے ہوئے مزید کہا۔ ”وقت کم ہے آپ آئیے۔“

وہی شخص بھر بولا۔ ”شاہ صاحب! مجبوری نہ ہوتی تو آپ کو تکلیف نہ دیتے، کام ہوتے ہی آپ کو واپس پھولا جائیگا۔“ میرے لیے رستہ دکھاتے ہوئے مزید کہا۔ ”وقت کم ہے آپ آئیے۔“

وہی شخص بھر بولا۔ ”شاہ صاحب! مجبوری نہ ہوتی تو آپ کو تکلیف نہ دیتے، کام ہوتے ہی آپ کو واپس پھولا جائیگا۔“ میرے لیے رستہ دکھاتے ہوئے مزید کہا۔ ”وقت کم ہے آپ آئیے۔“

وہی شخص بھر بولا۔ ”شاہ صاحب! مجبوری نہ ہوتی تو آپ کو تکلیف نہ دیتے، کام ہوتے ہی آپ کو واپس پھولا جائیگا۔“ میرے لیے رستہ دکھاتے ہوئے مزید کہا۔ ”وقت کم ہے آپ آئیے۔“

وہی شخص بھر بولا۔ ”شاہ صاحب! مجبوری نہ ہوتی تو آپ کو تکلیف نہ دیتے، کام ہوتے ہی آپ کو واپس پھولا جائیگا۔“ میرے لیے رستہ دکھاتے ہوئے مزید کہا۔ ”وقت کم ہے آپ آئیے۔“

وہی شخص بھر بولا۔ ”شاہ صاحب! مجبوری نہ ہوتی تو آپ کو تکلیف نہ دیتے، کام ہوتے ہی آپ کو واپس پھولا جائیگا۔“ میرے لیے رستہ دکھاتے ہوئے مزید کہا۔ ”وقت کم ہے آپ آئیے۔“

ہاتھوں اور خون گندگی کے علاوہ کچھ باقی نہیں بچتا۔۔۔ کہہ سکتے ہیں کہ کسی بدترین دشمن کے لیے اس سے بڑھ کر بدترین لعنہ شاید ہی کوئی اور ہو۔

گھپ اندھیروں سے جب شناسائی ہو جاتی ہے تو راہ راستے 'سنگ میل' بلکہ دائیں یا بائیں آگے پیچھے کی ہر چیز روشن ہو جاتی ہے۔۔۔ ہمارا مختصر سا قافلہ 'بغیر کسی روکدیاؤ شواہی' اپنی منزل کی جانب زواں زواں تھا۔۔۔ میں بھی یوں ایٹھا ہوا پتھر پہ بیٹھا تھا جیسے کوئی مغویہ نہ ہوں ڈولہا ہوں۔۔۔ اترائیاں چڑھائیاں۔ یہ کوئی باقاعدہ راہ راستہ نہ تھا۔۔۔ گھگ کئی پچھلی پگڈنڈیاں پتھری پتھری پتھروں کے پاؤں پر پٹ پٹ جاتیں۔۔۔ اچھی تک میری کسی سے باضابطہ گفتگو نہ ہوئی تھی حتیٰ کہ میں نے یہ تک نہ پوچھا کہ بھائی کو گوا آپ کے نزدیک میرا مصرف کیا ہے۔ گائے قتل کا پکا گوشت بڑی دھوتوں کے کام آتا ہے۔ ذنب بھیڑ بکری مرغی اکاڈ کا آئے گئے مہمانوں کے لیے کائے جاتے ہیں۔ میرے جیسے کچے پٹو پہنچانے کھانے لائق نہیں بلی چیل گئے کے قابل ہوتی ہیں۔ مگر ادھر کھٹے پروانگی کہ یہ میرے ساتھ کیا حشر کریں گے؟

چونہ پگڈنڈوں کو بچے کر لے جا رہے تھے۔ راستے میں موقع ملا تو ایک گدھا دو سڑک سے کہنے لگا۔
"بھائی! اب کیا ہوگا ہمیں تو چور لے جا رہے ہیں۔ دوسرے نے جو میری طرف نظر اگدھا تھا۔
"جیب کی بے نیازی سے اس نے کہا۔

"بھئی بھائی! ہم گدھے پر سوار پہلے مالک سے کسی گایاں سوار سے ملنے سے پہلے نصیب تھی۔
ان چوراہوں سے کسی ٹھکانہ کو جانے لگے۔ گا۔۔۔ ہمارے لیے ساواہر چور میں کچھ فرق نہیں
ایک اور کہانیت کہ پہلی کو ٹکڑوں سے فرض۔۔۔ وہ کسی سرے والے کے دوستوں کے ہوں یا کسی کے
دیکھنے کے۔ اس کے لیے ڈنوں چور میں چور ہوتے ہیں۔۔۔ میرا تو کسی بھی حال کہ میں سفر پہ رہوں یا قنصر میں
کسی فتنے کے حصار پہ یا شاہی بازار میں۔ مجھے چور نے چائیں یا موڑ کچھ فرق نہیں پڑتا ہے۔ جہاں ہوں گے
گردش میں ہوں گے۔۔۔"

ظہور کو تو کھانا پہلے سفر میں قدم قدم پھر اس کے بعد راستہ ہموار دیکھنا
زور اٹھانے پہاڑوں کی کنار پہ اچھائی اچھائی دی تو احساس ہوا کہ سپیدہ حمر کا تھکا لگ
چکا ہے۔ کچھ آگے بڑھے تو دائیں جانب چند گھر بندے اور باڑے دکھائی دیے۔ ہماری آہٹ پا کر قریب
زور غٹے بھی بھونکنے لگے تھے۔ بھٹیوں کی پجڑ پجڑ آہٹ نے اطلاع دی کہ یہاں ہریالی پانی اور انسانی خوراک
بھی موجود ہے۔ ایک کشادہ سے باڑے کے قریب ہمارا کالہ لڑک چکا تھا۔ اسی اٹھانے آیا اور ایک
روشن لائٹیں باڑے کے اندر کھینچی پہنکا کر چلا گیا۔۔۔ قدرے روشنی ہوئی تو معلوم ہوا یہ بازار ان کا ٹھکانہ تھا جو
مہمانوں کی نشست و برخاست کے لیے ہوتا ہے۔ دو اتر چائیں گھٹے کی پہاڑی مسافت کے بعد ہم نے پہلی نیکی

لی تھی جبکہ یہ کچھ خبر نہ تھی کہ ہماری اصل منزل کہاں ہے؟ یقیناً یہ جگہ راہ کا کوئی پڑاؤ تھا۔۔۔ اور کہ دو چار بوڑھے اور بچے میں آہستہ سے تھے پشتو چل رہی تھی۔ بوڑھے گفتگو کے دوران بار بار عقیدت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ بات ”مولوی ندن“ کی ہی ہو رہی ہے۔ لازم تھا کہ اب میں لینے دینے کی نشست اختیار کر لیتا۔ قہورہ ناشہ خطہ نسواری کے مہماتداری کے لوازمات پہنچ گئے۔ اذان سے پہلے ہم کھاپی کر فارغ ہو چکے تھے۔ بچے کے عقب میں قدموں سے اونچی جگہ پہ مسجد تھی۔ میرے خدشے کے عین مطابق امامت کے لیے مجھ سے درخواست کی گئی جبکہ ہاں کے امام صاحب کے پوتے کے برابر میری عمر تھی۔ پتھان بیچ ہو یا مرید دونوں صورتوں میں وہ سراپا پتھان ہوتا ہے اسی لیے کہ اس کے پاس لوزونہ دوقی ہوتی ہے۔ بندوق کی موجودگی میں حرف انکار گزر ہوتا ہے۔

امریکہ کی کسی ریاست کے ایک صحافی مولیٰ کے ہاں میں وہ جواری تاش پہ بٹوا کھیل رہے تھے کافی دیر تک ہارجیت اور پتھوڑی رہی۔ آخر ایک بازی بڑی طرح چھٹ گئی۔ مولیٰ کے پاس پہنچے بھاری تھے اور دونوں کو ہی اپنی اپنی بیٹ کا یقین تھا۔ ہر بازی کی کوئی حد ہوتی ہے تو یہیاری ہو یا بٹواری۔۔۔ جب چاروں میں رقم ڈالنے والے دونوں کی سسٹیں خالی ہونے پہ آئیں تو ایک نے باقی ماندہ آٹھ فی لٹھی ڈالتے ہوئے اپنے سر کاٹا لیا کہ میں کے پاس بڑے پتے یعنی تین ہار شاہ تھے۔ پیسے نے بھی رقم پہ اپنا ہاتھ رکھنے ہوئے کہا۔ میرے پتے بھی آٹھ لٹاوا۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے پتے بھی الٹ دیے جو وہ اس کے اور ایک ملازم تھا۔ دوسرا چلا یا۔ یہ تو وہ اس کے ہیں انھوں نے پاس تین یا سٹو چو۔۔۔ دو اکوڑ والے نے منٹا رام سے روپے الور نکال کر دو اکوڑ کے ساتھ دھرتے ہوئے کہا۔

کہنا یہ متصور تھا کہ ڈورا اور کامات میں کاسو ہوتا ہے اور کمزور کا انھیں بھی لو ہوتا ہے۔ انڈیا کا احسان سیالکوٹی اور پتھان بھائیوں کی مہربانی تھی انہوں نے مجھے شاہ دیا کوئی کہ انہیں دیا اور اوسر نی دھنچکا نہ کی امامت کے لیے منتخب کیا اور نہ اگر مجھے اپنی اور اپنے چچا والے کافی جھڑواؤں کی امامت پہ تقویٰ بخش کر پتے تاش میں ان کیا بکاڑ لیتا۔ بات دہی رائٹل کی کہ جس کے ہاتھ ہوتی ہے وہی مسالے میں جاکھل ہوتا ہے۔ عزتوں شرمیں پردے رکھنے والی وہی اداست ہے ہوتا ہے!

وہیں پٹھانوں کے ”بھرے شاہ نصیم“ چلتے ہیں جدھر ہم نے اپنے سفر کے پہلے پڑاؤ کے کھرا دم درست کرنے کی غرض سے ٹھہرے۔ لیکن ٹھہرے ایک چھوٹا سا واقعہ حمزہ شاہ نصیم کے حوالے سے یاد آ گیا۔ پاک بچن شریف کے کاروباری لوگ ہر سال میڈیا داغی کے موقع پہ ایک اہتیار شاعر سے کاغذ کر تے ہیں بابا مظفر وارثی خصوصی طور پہ اس مشاعرہ میں شامل ہوتے ہیں۔ ایک بار انہوں نے مجھے بھی

بیرکست محفل میں شمولیت کی دعوت دی وہاں کی کاروباری برادری بابا باقی کی بڑی معترف ہے۔ مشاعرہ کے بعد طعام کی دعوت میں بھی بابا باقی سے اُن کا تعلق یہ کلام سنا جاتا اور رات وہیں قیام رہتا اگلے روز واپسی ہوتی۔ ہم دونوں کے قیام کا انتظام وہاں کے ایک بھٹے سے پولیس افسر کے ہاں تھا۔ آدھی رات آگے آدھی پیچھے۔ ہم دونوں کروٹیں بدل بدل بے حال ہو گئے مگر فیصلہ نہ آتا تھا نہ آتی۔

”بابا! خیند نہیں آرہی۔۔۔۔۔“

وہ چڑچڑ سے بولے۔ ”اوجھ بھی یہی حال ہے۔“

جب یقین ہو گیا کہ ہم کسی نہ کسی وجہ سے یہاں سو نہیں سکتے تو ایک دوسرے کو شعر سنانے شروع کر دیے۔ جب اُن کا سناک بھی ختم ہو گیا تو لطیفے شروع ہو گئے۔ آخر یہ سلسلہ بھی جلد بند کرنا پڑا کہ جائز جائز لٹیفے چند ایک ہی لفظ باقی نا جائز، جنہیں نہ ہر اپنے دل میں لکھتا تھا۔ اُمس نے الگ وق کر رکھا تھا۔

میں نے ہی تجویز پیش کی۔ ”بابا! مناسب سمجھو تو لاہوری جانب رخ کرتے ہیں۔“

پہلو تو وہ چند لمحے خاموش رہے پھر آنکھیں میچے ہوئے ہی پوچھا۔

”کیا اس وقت آدھی رات سفر کرنا مناسب ہو گا یہاں سے ادا کا نہ تک کا راستہ کچھ لمبا ہے نہ نہیں۔“

”بہر حال میں نے کسی طرح بابا کو اسی طرحی کیا۔ میرا ہاں تو جتا یا اپنی بیوی کی بیماری کی ساری رات کا نام لے اٹھ لیتے۔ راستہ بابا کہتے تھے۔“

”یار! تم بھی کچھ مصلحتی کے فیصلے بھی کر لیا کرتے ہو۔“

رات کا پچھلا دہر لاہوری محفلوں کے دو عالم میں گزرتا تھا۔ جو آخر بیسیوں پہلوانی پہلوانی تھی۔ بیٹا سا چاند اور شو کا خان۔ ہم دونوں کی طرح ہماری گاڑی بھی ٹی گزرتی تھی۔ ٹیکسوں سے اور بھی اول بڈول رہی تھی۔ میں مختلف میلوں جڑوں سے بابا کو دھکے دے رکھنے کی کوشش میں تھا جو میری سائیڈ میٹ پہ اوٹھنے کے ابتدائی مراحل سے گزر رہے تھے۔ ذرا بعد کے ساتھ اگر نشست ٹیپر دلچسپ خاص طور پہ کوئی بوڑھا بیٹا ہو تو اس بیچارے کی حالت بڑی دکھناؤں ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے سزا قیامت کا سفر بن جاتا ہے۔ میرا بھی یہی حال۔ کچھ سہرا تھا کہ میں نے اس وقت سڑک کا مشورہ دیا اور غراب کیا ہو سکتا تھا۔ رات کو سفر خوب کٹتا ہے آدھے سولے آدھے جاگے ہم تین بڈھے کھیت جی میں بابا اور چند دوسری لڑائی گاڑی المعروف داتا کی ملنگنی کسی نہ کسی طور اپنے راستے پر نے والے پہلے پڑا کا ٹیپر وٹھانہ ٹیپر کے قریب پہنچ گئے۔ میں باز آؤ سڑک کنارے ایک مناسب سے ہوٹل میں روٹی دیکھ کر گاڑی روک لی۔ لڑائی گاڑی لٹھر کھانا ہوا بوڑھا اور تاپ دے کا پرائیمر ٹیبلٹ چلتے یاڑکتے وقت ایک آدھ جھکا معذوری یا مجبوری سے ضرور کھاتے ہیں۔

بابا وارثی گاڑی نرکے کے جھکے سے جھکائے کر بیدار ہو گئے۔

”لاہور پہنچ گئے۔۔۔۔۔؟“

”جی نہیں ابھی ہم بمشکل جٹی والے ٹھہر و شاہ نعیم کے آس پاس ہی پہنچ پائے ہیں۔“

”نجرے شاہ نعیم دے اک جٹی عرض کرے۔۔۔ میں گنگنا رہا تھا اور بابا حیرت سے میری جانب

دیکھ رہے تھے۔

”آئیے چائے پیتے ہیں۔۔۔۔۔“

بابا نے ہونے نہ ہونے کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کہاں ہے چائے۔۔۔۔۔؟“

”ہوٹل میں۔۔۔۔۔!“

اب بابا نے جھنجھٹا کر پوچھا۔ ”ہوٹل کہاں ہے۔۔۔۔۔؟“

میں نے اشارے سے بتایا۔ ”وہ سامنے ایک ہوٹل ہے۔ باہر بڑے سے دروازے والے سائین بورڈ

کے ارد گرد بسٹل لٹھ رہے ہیں۔“

اب بابا نے دیکھتے دیکھتے گنگنا کر کہا۔ ”ابھی تو میں نے کہا تھا کہ یہاں سے پوچھا۔

یہ ہوٹل آدھا بار ہے یا ہوٹل۔“

اب میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اشارے ہوئے جواب دیا۔

”اندر جا کر دیکھتے ہیں کہ یہ دروازہ یا کوئی بار۔۔۔۔۔؟“

اب میں بابا کا ہاتھ تھامے ہوٹل کے دروازے پہنچا اور دیکھ کر دیکھ کر ہنس کر کہنے لگا۔

”ماہر کا تک یا چھوٹا دروازہ کھائی دے مگر نہیں۔ شک ہوا کہیں کسی نہوت ہوٹل میں تو چلے نہیں آئے۔ نہیں کہیں

یہ دروازہ ہوٹل ہے نہوت و نوت کا یہاں کیا کام؟۔۔۔ اب میں اور بابا جی ہا ہر کھڑے ہیں ہمیں سوچ رہا ہوں کہ

کیا گروں کیا نہ گروں۔ بابا جی نے خوار ہی آواز لگائی۔

”بھئی کیا کوئی اندر ہے۔۔۔۔۔ چائے مل جائے گی؟“

اب جواب میں اندر سے نون آواز آتی ہے جیسے نہانی کالی کھانسی کا مریض دور در دور چلے پے پے

جھکی ہوئی سے کہتا ہے۔ ”نی اندر آ کے میریاں رکاں تے تھل تے ٹھڑ دے۔“ ”ہوٹل کے اندر کہیں قریب

سے جواب آتا ہے۔

”ٹنگ آ کرتے دیکھ جاؤ۔ اللہ دے حکم مال سب شج ملے گا۔۔۔۔۔“

چلے کچھ تو تسلی ہوئی۔۔۔ بابا ذرا اونچا سنتے ہیں۔ پوچھنے لگے۔

”نالوں کا کیا جواب آیا.....؟“

میں نے کوئی جواب سنانے کی بجائے ادب سے بڑھاوا دیتے ہوئے اندر لے گیا۔ قریب ہی ایک مناسب سائیکل دیکھ کر انہیں بٹھایا۔ اپنی لوکیشن کے حساب سے خاصا بہتر ہوئی تھا۔ صاف ستھرا دیواروں پر طغریٰ اور کاغذی رنگین ٹیچر۔ سامنے شیشے کی الماریاں یا شوکیس جن میں دیہاتی انداز کی رنگ برنگ مٹھائیاں سمو سے وغیرہ سجے تھے۔ ابھی میں دیکھ ہی رہا تھا کہ بابا نے کچھ کہنے کے لیے مجھے کان قریب لانے کو کہا۔ قریب ہوا تو سرگوشی کے انداز میں بولے۔

”یہاں دیکھی تمہا کو سٹلنگ کی بو آ رہی ہے۔“

میں نے فوراً ناک و حرا بابا ورسٹ کر رہے تھے انتہائی گھٹیا قسم کے پینڈو تمباکو کی ذہلا دینے والی باس تھی۔ خود پہ پاؤ آیا کہ اندر داخل ہوتے ہوئے مجھے محسوس کیوں نہیں تھا کہ میرا ناک تو ان سے بھی تیز ہے۔

”کیا خیال ہے مولانا اجیئیں... ادھر چائے پینے آئے تمہا کو کی بدبو محسوس نہیں۔“

ابھی ہم اس حصے میں ہی تھے کہ اندر کی جانب سے ایک لمبی سی ریش والا دیہاتی باہر آیا۔ ریش کے ساتھ ذرا زخمی بھی نمودار رہی تھیں۔ لمبی سی اسلام سلیم کے بھائی نے ہمارا حال پوچھا۔ وہ خوشی سے بے ٹور سا ہوا تھا۔ بابا نے اس کی بات سن کر کہا کہ وہ چلا آگیا ہے۔ وہاں سے باہر نکلا تو بابا نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

”آپ مجھے وائس مجھے کا بتادیں۔“

وہ آگے ہم دونوں بڑے پیچھے ہٹنے والی دکان تو خوب مسکرا کر نکلا۔ فوراً دکان ایک دائرے میں بیٹھے ہیں۔ درمیان میں ایک جہازی ساز کا کٹہرا جس کی لے و کو زیادہ سی لمبی تھی پڑا ہے۔ چھوٹا بڑا ریشہ بے ریشہ باری باری تمباکو کش کر رہے ہیں۔ دو چار سونے لٹا کر لے آگے بڑھا دی جاتی ہے۔ ہم لوں لٹکتے جیسے انجانے میں امیر علی تنگ کے گروہ کو دیکھ لیا ہو۔ وہاں دیکھتے ہی پہچان گئے اور کٹہر کی ہان چھوڑ ہمارے دوا لے ہو گئے۔

باتھ روم گیلے کرنے کے بعد ذرا ہوش بکڑے تو بابا بولے۔

”مولانا ادھر سے لٹکنے کی کڑا میری طبیعت یہاں تنگ نہیں رہی۔“

میں نے آہستہ سے کہا۔ ”میرنی بھی یہی کیفیت ہے۔ لیکن اخلاق کا تعلق ہے ہم زیادہ نہ کسی کچھ دیر کے لیے یہاں ٹرکیں..... چائے کی بھی حاجت ہے۔“

بابا بولے۔ ”بھئی چیشاب کی حاجت تھی سو پوری ہوئی۔ چائے کھیں آگے چل کر پی لیں گے۔“

میں نے جیسٹرا بدلتے ہوئے کہا۔ ”بابا! دیکھیں یہ لوگ آپ کو پہچانتے ہیں۔ آپ کی مشہور زمانہ ”وہی خدا ہے“ دکھائی بھی جو نہ دے کسی کو نوالی ہوا سنتا و نصرت فتح علی خان کی منفرہ پیٹھکاری اور ”یہ رنگ کالا“ کی سی کالی سیاہ پس منظری نے آپ کو بے پناہ عزت و شہرت سے نوازا ہے۔ اب اگر ہم چائے پیئے بغیر ادھر سے چلے گئے تو یہ سارا دوسرا وہ سے لوگ کیا سوچیں گے؟ مجھے تو ادھر کوئی نہیں جانتا سوچ لیں۔“

بابا میرے چکر میں آ گئے اور بات میں مہربان دیا۔

واش ڈوم سے وہی چاسی بڑے ہال سے گزرنے لگے دیکھا کہ وہ تمام لوگ ہمارے انتظار و احترام میں دست بستہ کھڑے ہیں۔ آگے بڑھ کر باری باری بابا جی اور میرے ساتھ مصافحہ کرنا شروع کر دیا۔ اس عمل سے بھی ہمیں خاصی پریشانی ہوئی کہ ان لوگوں کے منہ سے دیہاتی تمباکو کی بیزار کر دینے والی بو کے بجائے انھوں نے تھکے جگے یہ بال بھی گھٹیا تر کی گئی تھیں۔ یہاں تک کہ سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ اچانک میری نظر چیچھ دیوار پر آ کر ان اک بڑی سی تصویر پر پڑی۔ ایک بوڑھے سے دیہاتی بزرگ منہ پر نیک لگائے بیٹھے منہ سے تھک لی رہے ہیں۔ اب میری توجہ میں کچھ بات آئی کہ یہ تصویر ان کے ہر صاحب کی ہے اور مزید یہ کہ ان کی تھکید میں واسطے ثواب و نجات تمباکو نوشی کرتے ہیں۔ اب جتنی سوری پوری طرح سمجھنے کی تھی وہ سب نکلتی جا رہی تھی۔

UrduPhoto.com

”جی چاہئے بابا حضور ہیں۔“ مختصر مبالغہ اور ہم گرامی بتانے کے بعد ان کے تصرفات اور کرامتوں کا بھی ذکر کیا۔

میں نے جھپکتے جھپکتے اپنی یہ بات کہہ کر بابا جی کو تھکے تھکے خاصی رحمت دکھائی دیتی ہے۔

”جی۔“ تصویر کی جانب تنقید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مزید بتایا۔ ”خُف‘ حق ہے یہ معرفت اور طریقت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔“ (نئی (روزمہ) آگ (چم) پانی (پچھ) ہوا) (م) بشر کے بنیادی چار عناصر کا مجموعہ ہوتا ہے۔“

معاذ اور وہ میرے منہ سے نقل کیا۔ ”خُف‘ کا بنیادی جزو تو تمباکو ہے جس کے بغیر خُف‘ کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور تمباکو کمرہ جو ہے۔ کمرہ بات اوسطاً امدادات کو کر فکر میں کر اہست کا نمونہ ہوتا ہے۔“

دوسرے بوڑھے منتہا ہے۔ کچھ جواب دینے کی بجائے ہمیں ہونک کے باہر بیٹھنے کی دعوت دیتے ہیں۔

آگیا۔ چار کرسیاں میز پانی گلاس موجود تھے۔

”آپ کے لیے چائے ہوا تو انہوں نے آپ یہاں کھلی نضا میں بیٹھیں۔“

بابا بولے۔ ”مجھے تو بڑی اخلاقیات پر حصار ہے مجھے اور خود اس غریب کی اچھی خاصی گلاس لے لی۔“

کوئی جواب نہ آئے۔

بس بونجی پٹھانوں کے اس فخر و سے فخر شاہ مقیم والوں کا حق خُدا یاد آ گیا تھا۔ ویسے فخر و کسی صوفی درویش کا ہو یا پٹھانوں کا ان میں تو وضعِ نشست و برخاست، قیام و طعام کے طور طریقے ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ اس کو ہستانی ہستی کے فخر و میں اس وقت میرے علاوہ مجھے غوا کرنے والے چار کڑیل پٹھان جن میں دو اردو بولتے سمجھتے تھے۔ تین ادھر کے مقامی بوڑھے جن میں ایک اپنی رہش و ستار و وضع و قطع سے سرگروہ لگتا تھا اور دو مجھول سے لڑکے جو شاید ادھر فخر وے کی دیکھ بھال کے لیے تھے موجود تھے۔ فخر وے میں مہمان نوازی کی جو پہلی "لعت" لائی گئی وہ صوفی خُدا تھا۔ لانے والا نو جوان اس کی چھوٹی سی پلم میں انگارے پہ پھونکیں مارتا لارہا تھا۔ وہ نو جوان سیدھا میری جانب بڑھا اور نے میرے منہ کے قریب لاکر خُدا کو پکڑے یوں آکڑوں بیٹھ گیا جیسے کسی شیر خوار بچے کو لپکتی لپکتی دیکھ رہا ہو۔ وہ پٹھان یہ سب کچھ مہمان کے پر تو کول کا ابتدا کیے تھا۔ میں اس ناگہانی آفت کے خبردار کیچھے کی جانب ہنک گیا ہاتھ کے اشارے سے لارہی کی کا اظہار کیا۔ میرے انکار کے بعد "وضع مشاعرہ" کی طرح "خُدا فخر و" میرے ساتھ بیٹھے ہوئے مہمان کے پیش کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ "چہ انوں میں روشنی نہ رہی" کے مصداق "فخر و میں آسکین نہ رہی" اور "کشف و کلیل و احسان کر آسکین نہ رہی" کے مصداق "خُدا فخر و" کے الفاظ پڑھ کر کم کشت نما ہونے نہ ہونے میں لگن رہ گیا۔ وہاں سے اُسے یا ادھر ادھر ہونے کا کوئی عمل نہ تھا کہ انوشکانہ کچھ سوچا تو ضرور سکتے ہیں۔ کچھ کہہ کر ہرگز نہیں سکتے۔ بلکہ بات نہ بھی لگائی۔ قہر و ہمار کی مولیٰ مولیٰ کوئیوں پہنچا چہ کچھ کچھ نہا چہ اور ساتھ افغانی اچھہ چھہ کی نمائی اور آلوچہ سے بنا یا جاتا ہے۔ وقت کی بات سطر کا تھا خُدا حاصل کی کیفیت مجلس کا اثر یا کوہستانی آپ کا فخر و جو کچھ خُدا سے بہت پرے نہیں ہی کے اس ہشت سے ایک ایسا طعانی تلخ حاصل ہوا کہ طبیعت ہشت ہو کی جگہ وہیں مٹی کے ایک برتن میں ہاتھ دھوئے گئے تھے۔

دور پرے پہاڑوں کی اوٹ سے نورج طالع ہو رہا تھا۔ بھیگے بھیگے شہری غبار سے فضا آٹ رہی تھی۔ ایسے میں وہی تلخ و کڑواؤ شکلیں گڈے نیچے اٹھائے داخل ہوئے معلوم ہوا کہ کمر سیدھی کرنے کا اہتمام ہے۔ اک مناسب سے کونے میں میری نشست کے لیے گڈے بچھائے گئے بڑے بڑے ریشمی شیشے بھی تھے۔ میرے ساتھ بھی آس پاس بٹ گئے اور فخر و کا واحد دروازہ کھیل دیا گیا۔ خُدا تو کانٹوں کی بیج ہو تھکے دار پہ بھی اپنا کام دکھا جاتی ہے۔ یہاں قہر و کے نرم نرم کچھو کا پست میں بڑا مٹوئی ہاتھ اور اھساب میں شخص کا بخارا تر اٹھوا تھا۔ آنکھیں موندتے ہی مومن مُشرک برابر ہو گئے۔ گھوڑے فخر کا امتیاز چاہا رہا۔۔۔۔۔

شاید کسی فخر کے پہنچانے پہ آنکھ اچنی یا نو پر کھیر لی محبت سے مٹی براہہ کرنے سے کہ منہ مانتا ہے

خاصی خاک پڑی ہوئی تھی۔ دیکھا تو ساتھیوں کے بستر خالی دکھائی دیئے کھڑکی سے آنے والی آوازوں سے اندازہ ہوا کہ باہر کافی لوگ جمع ہیں۔ انگڑائیاں توڑتا ہوا اٹھا۔ بڑے دار اور کھڑکیوں سے ٹھٹھے والی تیز روشنی سے وقت کا اندازہ ہوا کہ دن دوسرے پہر میں داخل ہو چکا ہے۔ ایسے میں پاس ہی کئی مسجد سے آذان کی سردی آواز ابھری اور دھیرے سے جو بٹ واناہو تو میرے سفر کا ایک ساتھی السلام علیکم کہتا ہوا اندر داخل ہوا۔

”شادی صیب! غیند بھرا ہا ہر آ جائیں۔ نماز سے فارغ ہو کر کھانا کھائیں گے پھر ادھر کے بھائیوں سے آپ کی ملاقات ہوگی۔ بہت دور دور سے آپ کی زیارت کے لیے یہاں پہنچے ہیں۔“

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھ لیا۔ ”خان صاحب! اور ملک سے یہاں تک میں نے آپ سے کچھ نہیں پوچھا اور نہ ہی مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت یا مجھے کوئی تردد خوف یا جلدی ہے۔ مجھے آپ جہاں بھی لے چلیں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔“ لیکن ایک بات پھر واضح کر دی کہ میں سید نہیں ہوں اور نہ ہی کوئی ذلی پیر، میں ایک عام سالن کا مالک ہوں اور دار ملک میں بجلی کا کام کرتا ہوں۔ یہ سب کچھ صاف صاف واضح کر دینے کے باوجود بھی اگر آپ کسی خوش فہمی میں خود اور دوسروں کو ہٹا کر کھانا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی۔“

اسے اور قہر میں ڈال دیا ہوا جواب آیا۔ ”شادی صیب! ہم لوگ کارندے ہیں۔ ہمارا کام سچ یا کھانا دیکھنا نہیں، سرنگٹھ میں رہنا ہے۔“

میری کواختلا کم ہوئی کہ عام نماز میں تو کسی نہ کسی طرح کام چلا یا جاسکتا ہے مگر یہاں کا قہر امامت کسی عالم فاضل خطیب کا کام ہے۔ اس کارندے کے جواب سے تسلیم و رضا کا یہ ہار ایک ٹکٹ بھی پٹے پر آکر اگر بندہ اپنے جیسے کسی بندے کے کارندوں سے کی چیزیں سے نصیب کی وجہ سے آگے مر یا تسلیم و نیاز ہی کر اس کے ہر حکم کی من و منی تعمیل کرتا ہے، میں سچ یا جیل جنت نہیں نکالں۔ تو ہم اس سب مالکوں کے مالک کے زور و قضا و قدر کے معاملہ پہ کیونکر بحث و تھلیل کر سکتے ہیں وہی کچھ ہوا جس کا خدشہ تھا۔ چھوٹی سی مسجد جو ادھر کے مقامی افراد کے لیے تو کافی ہوگی مگر آس پاس کی دیگر بستیوں سے ادھر پہنچنے والے لوگوں کے لیے وسعت نہیں رکھتی تھی۔ ان کے لیے باہر اونچی نیچی جگہوں پہ بلندے مصلے بچھا کر نماز کا انتظام کر لیا گیا تھا۔

یہی لمبی ریلوے اور بڑے بڑے گڑوں، بنگلوں، فیلوں والے پٹمان جن کے ستانوں پہ بھڑکے بھڑکیں لگی ہوئی تھیں یہاں نماز کے لیے جمع تھے۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ نماز سے کہیں زیادہ میری زیارت کے لیے ادھر پہنچنے والے ہیں۔ دیر نہ ہوئی کہ نماز تو وہ اپنے گاؤں میں بھی ادا کرتے تھے۔

اب اصل بات کل پہنچی تھی۔ وہ مجھے کوئی پہچانا ہوا سید زادہ ذلی اللہ سمجھ کر اٹھا لائے تھے جو اپنی روحانی طاقت سے غریب لوگوں کے مالی مسائل حل کر سکتا ہے۔ خاص طور پہ ان جوانوں کے مسائل جن کی

پیسہ پیدا کرنے کے لیے ہر جائز کام کرنے کے لیے تیار رہتا لیکن فارغ اوقات میں کسی ہوٹل پہ اوپر کے کام کرنے یا کسی کے پاؤں دابنے کی خدمت سے توفیقی دولت نہیں کما لی جاسکتی تھی کہ کسی دوشیزہ کے باپ کی طلب پوری کی جاسکے۔ ایسا لگتا تھا اس کی اول اور آخری امید اب میں ہی بن چکا تھا۔ اپنے وہ فارغ اوقات میں بڑی تندہی سے میری خدمت کرتا اور پرامید لگا ہوں سے میری جانب ہنستا رہتا۔ اکثر موقعہ پاتے ہی وہ اپنی خواہش کا اظہار کرنا بھی نہ بھولتا کہ جسے من من کر میں بیزاری کی حالت تک پہنچ چکا تھا۔

ایک دن عشاء کی نماز کے بعد دوسرے پاؤں دابنے ڈا بے پھسک پاؤں

”شاہ نصیب! اوپر خدا ہے نیچے آپ۔۔۔ بات شادی کی نہیں اس کے دیوث باپ کی نیت کی ہے۔ اس نے مجھے کم تر اور غریب سمجھ کر یہ پیسے والی شرط لگائی اور ایک سال کا ٹیم دیا۔ میں نے اللہ پاک کا نام لے کر قبول کر لیا۔۔۔ اب بات میرے لیے غیرت اور عزت کی ہے۔۔۔ میں نے اپنا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”فرض کرو کہ وقت کے اندر تم کا ہندوستان ہو گیا ہے لیکن وہ کوئی اور بہادر تر اس کے شہرینے سے انکاری ہو جائے تو پھر تم کیا کرو گے؟“

اس لیے انکار نہیں کر سکتا۔ اسی دوران اس نے مضبوط سے میرے پاؤں پکڑ لیے کھلیا پتے ہوئے کہا۔

”شاہ نصیب! خدا کا نام لے کر میں اس دیوث کی شرط پوری نہ کر سکتا تو اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دے گا۔“

میں نے اوجھڑتے ہوئے کہا یہ تم پر کتنا بڑا بھروسہ ہے۔ جب تم نے اس لڑکی سے عشق کیا یا جب اس کے باپ سے شرطیں دے کھینچے تھے اس وقت تو میں تمہاری اس پاس نہیں تھا۔ تم عمر میں مجھ سے بڑے ہو اور اپنے علاقے میں ہو۔۔۔ بھلا میں کس طرح اس معاملہ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں؟“

وہ میرے پاؤں پکڑ گیا۔ ”شاہ نصیب! آپ کچھ بھی نہیں سمجھ پکارتیں ہے کہ میرا یہ مشکل کام آپ کی ذمہ داری سے ہی حل ہو گا اور ایک دن میں آپ کو اس کا ثبوت بھی دیں گا۔“

میں اس کی ثبوت دینے والی بات پہ چونک سا گیا۔ سہکتا آنکھوں سے اسے ٹھہرتے ہوئے پوچھا۔

”تم ایسا کیسے کہہ سکتے ہو.....؟“

بالوقت جواب نہ ملا۔ ”مجھے سید بابا مردان بادشاہ نے آپ کا چہرہ مبارک دکھا کر بتایا تھا کہ اسے پہچان لو یہ تمہیں پہنے پائی کے کنارے ملے گا اسے مت چھوڑو۔“ پھر بتانے لگا کہ یہ اشارہ حالت خواب میں ملے مرتبہ ہو چکا ہے۔

عید میلاد النبیؐ سامنے تھی پھر اور اور اور کے کام۔ قصہ کوتاہ لگ بھگ تیس چالیس روز بعد واپس وارننگ پہنچا تو بھلی والوں کا گپ پھیل چکے تھے اٹھا کر ڈرا پرے دریا کے بہاؤ کی جانب بھاگ دیا گیا تھا۔ مسجد اور ہوٹل وغیرہ اب قدرے دور ہو چکے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی میں نے دوسرا سوال اس پنخان کے بارے میں پوچھا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ اُسے تو میرے استقبال کے لیے اور موجود ہونا چاہئے تھا۔ اب جو سننے کو ملا وہ میری توقع کے عین مطابق تھا۔ میرے ادراک میں تھا کہ یہ حضرت دانش مجھے کسی نہ کسی غیر معمولی حالات و واقعات سے ضرور درہ چار کریں گے، مگر ایسا ہی ہوا۔

وہ میری ہدایت کے مطابق ہر شب دو پہر رات بیٹھے پڑھتا تھا۔ ایک ہفتہ پہنچ جاتا۔ ورور ورور پڑھ کر ہنسی پانی میں پھینک دیتا۔ پو پھینے تک وہیں موجود اس دوران اگر کوئی پھلی لگ جاتی تو ادھر بیٹھے اُسے صاف کر کے معدہ پیٹ دیکھ لیتا۔ میں نے ہی اسے بتایا تھا کہ اگر اللہ نے چاہا تو کسی پھلی کے پیٹ سے ہی تمہارا گوہر فراہم ہو گا جو تمہارے سارے مسئلے حل کر دے گا۔

اصل میں ہمیں نے اپنی بے علمی کی بنیاد پر یہ فرض کر لیا اللہ کے نبیؐ یونس علیہ السلام جن کی آزمائش میں پھلی کا بہت بڑا کردار ہوا اور بظاہر پھلی ہی ان کا ذریعہ نجات بنی تھی اس لیے چارے کی مالی اور دوسری مشکلوں کا حل بھی کیا۔ پھر یہاں تک پہنچا کہ یہ تھا ایک شیر بہدف ثابت ہوا۔ ایک ایسی بھلی جو اور دریا سے کاہل کے پار تھی جس میں شاید ہی کہیں دکھائی دے، اس کے ہاتھ لگ گئی۔ پیٹ چاک کیا تو بے کاہلی پھنے کے برابر ایک دوسرا دانہ کھناک اچھلتا ہوا پیٹے بھیکے ہوئے گول گولوں میں کہیں گم ہو گیا۔ بھلی ہی چومنے سے اسے اچھٹا ہوا کہ کوئی چنگاری شے نیچے گری تو ہے لیکن نیم تاریکی میں کچھ نہ دیکھ سکتی تھی۔ وہ دیکھ سکتی تھی کہ کسی نہ کسی۔ یہ اس سرسوں کی موٹی باہر کوئی ہوئی زمین زمریں آنکھیں اسی رنگت کے چمکے پھنے نیچے سفید نرم پیٹ اور زخم کی جانب دو شاخ بھلی سی بڑی۔ تاریکی کی روشنی میں پھلی اک جھوٹی سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی نقلی ہوئی آلاش سے بڑھتی بھانے اک مست کروینے والی غریب خوشبو سارن ہو رہی تھی۔ اسے بھلی بھلی لہند کا غلبہ برا محسوس ہوا، ابھی وہ اس کیفیت کو سمجھنے سے بھونہ پایا تھا کہ دائیں جانب ہنگول نے کربے معدہ سا پڑ گیا۔

صبح دم نمازی لوگ جب فراغت و طہارت کے لیے اس جانب سے گزرے تو یہ دریا کنارے سے سوتا ہوا پایا گیا۔ بھلی تاریکی پھری پاس دھری جبکہ وہ دات والی نادر پھلی نادر تھی۔ دوستوں ساتھیوں نے اسے بیدار کیا تو بکا بکا سا انہیں دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد جب اس کام کرنے لگے تو دات والی پھلی اور اس کے پیٹ سے نکلنے والی وہ چنگاری پڑھاری گئی یا دھاتی۔ نیم اندھیرے میں وہ سنگ دانہ ایک چھتی ہوئی چنگاری کی مانند ہی تو تھا جو نیچے پڑے ہوئے گولوں میں کہیں اتر گیا تھا۔ دواک اچھٹی سی نظر ادھر ڈال کر

سہاواں اٹھائے ٹیمر کی جانب بڑھا یا۔

آج وہ اپنی ذیوقی سے غیر حاضر رہا۔ ایک عجیب سا بیچگام اس کے اندر چا تھا وہ کسلندی کا بہانہ بنائے لیٹا رہا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ تنگی ساتھی اپنے اپنے کام پہ لگن جائیں تو چھوڑ دیا کی جانب بڑھتے چہرہ رات وہ جھلکدار ستاروں جھلک دکھا کر پھر کہیں غائب ہو گیا تھا۔

تمنا جب تھا اٹھے خوشی خوشی چھوڑنے گئے امرامحل میں ماہتاب بن کر آئے تو فرد عصر کی قید سے وقتی طور پر آزاد ہو جاتا ہے اور وہ خود بھی امر عصر کی خواندہ کی کیفیت بنا ہوتا ہے۔ ایسی ہی کسی کیفیت میں سرشار اٹھا۔ ذرا پہاڑی اسی جگہ پہنچا۔ مین ٹھوڑی تلے خوبصورت رنگ برنگے گھیلوں میں اس سنگدانہ کو تلاش کرنے لگا جو محض کے پست سے نکل کر ادھر کہیں خیمہ بگایا تھا۔

چھوٹے موٹے سنگریزوں کو اچھا، اچھا تو وہ نگہاڑا جو ایک بے عیب نایاب رُمرز کی صفت تھا ایسے
ریت پر بڑا دک رہا تھا۔ کچھ بچے ہاتھوں سے اٹھایا۔ خیر، نگاہوں کے زور پر برف کی چھب ہی نہ رہی تھی۔

[illegible]

پشاور کے جوہری بازار میں اس کے ساتھ ساتھ ایک اور لڑکھانہ بھی تھا جس کا نام "شیرت خان" تھا۔ یہ علاقہ حیات سے بڑا بڑا ہونے والے خام قیمتی پتھر وں کا کام کرتا تھا۔ اس سے معمولی سی یاد دہانہ بھی تھی۔ سامنے بیٹھ کر شنگدانہ زور زور کر دیا۔ مختلف اقدار سے دیکھنے پر کھنے کے بعد اس نے ایک معمولی قیمت پر اسے خریدنے کا عندیہ دیا۔ یہ قیمت ایسی نہ تھی جس کی ضرورت اور سوچ سے کہیں بڑھ کر تھی۔ اس کے بار بار پوچھنے پر بھی اس نے یہ نہ بتایا کہ اسے کہاں سے حاصل ہوا۔ اس پر کچھ نے بتایا اس نے اپنی بیوہ ورنہ عرصہ حیات میں ایسا آپ کو ملے گا۔ اس اور ذوالنی زمرہ شاید وہ دوسری بات میری بار دیکھ جائے۔

شادی اور گھر کے لیے کچھ ضروری سامان خرید کر ادھر واپس وارنگ کے اپنے گھر میں چلا آیا۔ یہاں اس کے دوست نے بھائی بھی کام کرتے تھے۔ دوچار روز میں کھیتی سے اپنا حساب کتاب اور دیگر دھرم کے امور نبھاتا رہتا تھا۔ بھائیوں کے ساتھ علاقہ غیر اسے گاؤں لوٹ آیا۔

یہاں یکمپ میں نوکری چھوڑنے اور اک دم امیر ہو جانے کی خبر ڈوبا کی طرح پھیل گئی تھی۔

تفصیل کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے ہاتھ کون سا الہ دین کا چراغ آیا ہے جس کے جنم نے راتورات اسے لفظ سے تو غمزدہ دیا ہے۔۔۔ آدمی رات دریا پہ بیٹھنا کچھ ورد کرتا مچھلی پکڑتا تو سب کے سامنے تھا مگر اصل بات میرے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ میرے حساب سے یہ پٹھان شاید اپنی زندگی میں پہلی بار کوئی سیانی حرکت کر گزرا تھا۔ مگر اپنے گاؤں پہنچ کر وہ اسے برداشت نہ کر سکا یا اس کے رشتہ داروں نے اس سے اگلا ہی لیا۔ ہاں یہی آخری بات درست تھی۔

یونس خان شادی کی پوری تیاری کر کے اپنے ہونے والے نسرو کے پاس پہنچا۔ مطالبہ والی رقم سامنے رکھی اور نکاح کی تاریخ طلب کی۔۔۔ نسرو جو انتہائی خفیہ چالاک اور مصلحتی آدمی تھا اس نے سامنے ڈھیر سارے ثبوت دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ اسے قطعی توقع نہ تھی کہ یہ کچا سا بیکار نو جوان کبھی اپنی بڑی رقم اکٹھی کر سکے گا اس نے بس اس کم حیثیت سے اپنی سسٹن کو ملنے والی رقم کا پتہ پتہ نہ تھا۔ چال چلی تھی۔ جو اس پہ سیالٹی پڑ گئی۔ اب بات وعدہ پورہ کرنے کی رہ گئی تھی جس میں اسے تامل تھا۔ اس نے مصلحت و من نے ایک نئے خدشے کا اظہار کیا کہ تم یہ ثابت کرو کہ یہ خطیر رقم جائز طریقہ سے حاصل نہیں کی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ تم نے کوئی چوری ڈاکہ کھینچنے کا نقشہ یا کسی اور ناجائز ذرائع سے اس کا انتظام کیا ہو۔ اور کل کا اس نے جانے پہ میری بدنامی کی ہے۔

UrduPhoto.com

اس ہتکار نے ایک بار پھر یونس خان کی محبت اور محنت کو آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ اس نے کچھ بزرگوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ تمہارا رقم والی شرط پوری کر دی گئی اب تم شادی کا وعدہ پورا کرو۔ مگر اس کی ایک ہی بات کہ پہلے یہ ثابت کرنا ہو کہ یہ جائز طریقہ سے حاصل کی ہے کیونکہ جسے تم حرم میں اپنی رقم اکٹھی محنت و مزدوری سے حاصل نہیں ہو سکتی۔۔۔ بات میں اسوں نے اتفاق کیا لیکن ثبوت پیش کرو اور شادی کرلو۔

ادھر اس کی محبوبہ نے بھی یہی کہا۔ محبت اور شادی اپنی جگہ لیکن عزت اور خاندانی رویات بھی کوئی چیز ہیں۔ تم اگر اپنے موقف میں رہو تو ثبوت پیش کرو اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو میں بھی غصہ عزت کی خاطر اپنے خاندان اور معزز باپ کی عزت پہ حرف نہیں لاسکتی۔

یونس خان انہیں مات کھا گیا۔ اس نے انتہائی رازداری اور احتیاط میں اپنے بزرگوں اور بزرگوں کے سرکردہ افراد کو من و عن ساری "داستان الامیر علی مچھلی ٹوٹا نموتی" سنائی۔ مگر کسی کو بھی اس کی داستان سرائی پہ یقین نہ آیا۔ ثبوت کے طور پر اپنے خطیر بھائیوں کی گواہی دلائی مگر یہ کہہ کر انہیں بھی مستزور کر دیا گیا کہ اولی تو اس دور میں ایسا تو ہر کوئی شام سبب ہو ہی نہیں سکتا کہ جو خود تو بارہ چورہ دہ پے روز پہ مزدوری کرتا ہو اور دوسروں کو بھی جتنی ہزار روپے کا مزدور دلاتا ہو۔ دوسری بات یہ کہ شاید ہی اس دور میں کسی کچھلی کے پیٹ سے مزدور نکلا ہو۔ سمندر کی کسی مچھلی سے اگر نموتی مر جان نکل آئے تو قحط نہیں لیکن دریائے کامل کے پانیوں

ہیں۔

ایک دوسرے کا تڑپ چھوڑے تو ان میں سے ایک جھڑکے کی جانب بھاگا۔ تھوڑی دیر میں وہاں سے وہی بڑی سی ریش والی امعزز چھان بھنی گئی۔ اس کے دریافت کرنے پہ میں نے اندر بیٹھے بیٹھے ہی بتایا کہ مجھے محسوس ہوتا ہے صبح کا ناشتہ میرے لیے پریشانی کا باعث بنا ہے۔ پیٹ میں سخت کڑکڑاہٹ ہے۔ میں اور پتلی جیسی صورت حال پیدا ہو چکی ہے۔ جسمانی کمزوری ایسی کہ میرے لیے یہاں اٹھنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ ان کی آپس میں کچھ نرم گرم گفتگو ہوئی جسے میں سمجھ نہ سکا۔ صرف یہی دیکھنے میں آیا کہ وہی باہر کھڑے دونوں گنبد ار اندر آنے پڑے آرام سے پکڑ کر اٹھایا میرا آزار بند باندھا اور سہارا دے کر جھڑکے تک لے آئے۔ پڑے پڑے محسوس ہوا کہ ان کی سرگرمیوں میں خاص سرد مہری واقع ہو چکی ہے۔ باہر مسجد کے آس پاس اچھے خاصے لوگ اکٹھے ہو چکے تھے جو میری عیادت و خطابت کی خاطر گورنمنٹ سے کھینچے چلے آئے تھے۔ میں چپٹ پڑے دونوں ہاتھ پیٹتے۔ پتھرے ہائے دانے کی آوازیں نکال رہا تھا۔ چیرپے پتھر کی کیفیت جیسے زچگی کے دوران کسی رزق کے بشرہ پہ ڈراتی ہے۔

قصہ کوتاہ کہ نماز جمعہ کی امت خطابت حسب سابق ان کے مولوی صاحب سے سنا کر انجام پائی۔ جو میرے لیے پہلی خطابت کا باعث بنی۔ اس خطابت کے دوران میں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ ”ترکیب کلمات“ مجھے بیت القیام میں بھی کر ہی کیونکر سونجھی۔ معلوم ہوا کہ ہر سوچہ لوحہ کے لیے کوئی مقام مخصوص ہوتا ہے۔ ٹھول ٹھول اور یوں میں آگتے ہیں اور یوں میں نہیں۔ اور وہ میں نے ہر نئی کلمہ یا اسٹی ہیں جن پہ نالک اٹھنے لگتے ہوتے ہیں۔ یہ سب میرے شرارتی ذہن کا ادنیٰ سا کارنامہ تھا۔ میری مکاری اور اداکاری کہ میں اپنے خوبصورت و دلکش خطابت کے مختلف آوازیں نکال لیا کرتا تھا۔ کچھ امثال یوں کہ کھڑے کھڑے کسی لڑکے کے پیچھے نہ نہ کر کے لپوں آواز نکالتے جیسے اس کی بیٹی کسی نے پکار کر چلا دی ہے۔ دوپٹ کر دیکھتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ اسی طرح کسی مجمع میں بیٹھے بیٹھے ایسی ٹھیکہ آواز نکالتے جیسے کسی کا پیٹ بول رہا ہے۔ اسے ہاتھ زہم ہانے کی ضرورت ہے۔ لیکن میں میں اپنی سیٹ پہ بیٹھے بیٹھے یہ مکروہ آواز ایسی ہشامدی اور بصر سے نکال کر آگے پیچھے والے تاشی ہی کرتے رہ جاتے کہ کس کا پیٹ خراب ہے۔ جب تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہ سلسلہ جاری رہتا تو کوئی نہیں اس طبع نسا فرنگ پڑ کر بول نکلتا۔

”یارا کہوا پتیر سے بھوا ہاتھ لہوہ جان وی بجائے“ اچھے آبیٹھا اے۔ جبکہ میں اس کے ساتھ ہی بیٹھا ہوتا۔ کسی جلسے مناسبت یا قومی میں بیٹھے بیٹھے ہر دو جاتا تو ذرا لکھن پیدا کرنے کی خاطر ای فن سے کام لیتے کہ بڑی مشافی سے کسی پلو بیا کی چیخ نما آواز نکالتا جو کسی کے پیچھے بولی ہوئی کر اور ہی ہے۔ بس میرے ارد گرد وہ ہڑ بونگ مچتی کہ اللہ بھلی! اپنی شلوار جھاڑ رہا ہے تو کوئی اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے یا ادھر سے اٹھ کر

کھیں اور جا رہا تھا ہے۔ میں خود بھی اپنے بچے کسی بچہ سے چھو ہوا کو تلاش کرنے کی ایکٹنگ کرتا۔ محفل دارہم و برہم اور زمین خوشتر و خرم۔

● بیگم کامیکا بلیوں کا سسرال.....!

ایک بار مجھے اپنی بیگم کے ہمراہ اُس کے ایک قریبی رشتہ دار کے ہاں (مجمودا) جانا پڑا۔ ذور دراز شہر اور کچھ ملاقات کی نوعیت یوں تھی کہ پانچ چھ روز وہاں ٹھہرنا ہوتا تھا۔ عام رشتہ داروں سے تو بے بھلی ہوتی ہے چہ جائیکہ سسرالی رشتہ دار ان سے بننے کے لیے تو چیتے کا کھجکا چاہتے ہوتا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ کوئی شریف اور ذکی انجس انسان اپنی زوی کے سبکے کچھ زیادہ باوقار و باعزت نہیں ہو سکتا۔ یہی حال میرا ہوا ایک آدمی روز میں میں اپنی ہی نظر میں اسی سا ہو گیا۔ لگتا تھا میں کوئی بھانڈے کا ٹٹو ہوں جو ادھر سسرال میں بیگار پہ لگا ہوں۔ بس میرے گلے میں کسی زنجیر زنجی کی کسباتی رہ گئی تھی۔ گھر بھر کے بچے اپنی نظموں میں مجھے سنا رہے ہیں۔ نہ اُسے پہلے ہونے چکھے استریاں کار ہیں حرمت کے لیے مجھے دکھانی جا رہی ہیں کہ میں کچھ کا کام جانتا ہوں۔ شہر میں کچھ لوگ ہیں جو کہ میرے ذور دراز شہر کے لیے میرے لیے میں ہی لیبارٹری جا رہی ہوں۔ جنگ واپڈہ کے دفتر کیلینڈر ادھر سب جھوں کے لیے میں ہی سوزوں ہوں کہ دفتر کی اور انگری زبان سمجھوں۔ اپنی جوان بچیوں کے لیے کوئی آسودہ حال نامہ دار ختم کا پرچہ پیش کرنے اور ان کو کھڑے مصالحتی پر پائی کی تہ کیے بے عملی طور پر سمجھانے کے علاوہ خوش فطرتی کافی دینے کی جب مجھ پہ ڈالا گیا تو میں نے بیگم سے اپنی قیمتی سیر کی کاغذ کو ہاتھ سے لے کر ہاتھ میں لے کر یہ چور و زور دیکر ام انہی دور دراز شہر کے واپس چلتے ہیں۔ بیگم نے انتہائی خشکیوں لگا ہوں سے نکالتے ہوئے کہا۔

”آپ ہاں سے بے صبرے اور ناگھرے ہیں۔ گھر بھر آپ کی خاطر مدارت میں لگا رہتا ہے جو فو قیہ اور فوقیت آپ کو یہاں مل رہی ہے۔ بھلا کہیں کسی کو نصیب ہوگی۔ چھوٹے ہاں سے آپ کے دے جانے خالو خالو ہو رہی ہے۔ ہر مسئلہ میں آپ کو آگے آگے رکھا جا رہا ہے۔ میں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی ہوں کہ چلو آپ کی کہیں تو انکی عزت اور قدر ہو رہی ہے اور آپ ہیں کہ ناشکری کرتے ہوئے ادھر سے بھاگنے کی کور ہے ہیں۔“

یہی تو کسی معاملے میں قائل کر لینا یا کوئی سمجھ داری کی بات اسے سمجھا لینا اگر ایسا ہی آسان ہوتا تو آج دنیا کی حالت یوں نہ ہوگی۔ اس شخص اچھا میں جب تیسرا روز بھی آگیا اور مجھے ادھر سے نکلتے ہی کوئی معقول صورت دکھانی نہ دی تو تنگ آمد جنگ آمد کے مصداق میں نے اپنا انسانی پورشن بند کرنے اور شرارتی پورشن کھولنے کا فیصلہ کر لیا یعنی دلچسپی حالات دیکھ کر دینے۔

اب مجھے رات کا انتظار تھا۔ گلابی سردیوں کے دن ہم اوپر چھت پہ الگ برآمدے میں سو رہے جبکہ دیگر اہل خانہ کھلی چھت پہ چھاؤنی ڈالے ہوئے تھے۔ آدھی رات آگے آدھی پیچھے بیگم صاحبہ حسب حال خزانوں کے چابک میری غنیمت پر ابرار ہی تھیں۔ بتادوں کہ اگر میں کوئی بزرگ و زنگ ہوں تو بیگم کے ان خزانوں اور اس کی اڑلی حماقتوں کی بدولت ہوں ورنہ مجھ بے آب بے تاب کو کون پوچھتا تھا کہ ساری ساری رات جاگتا تیسرے کمرے کا دروازہ کھاتا رہتا۔ بہت بعد ایک لٹلے دوست نے مشورہ دیا تھا اگر اتنا عرصہ سورہ لیں گے تو ضرور بیمار ہو جائے گا۔ لا بہر حال جب بیگم کے خزانوں کے ساتھ اوجھ گھڑالوں کے دو تین روزہ سے جو ان افراد نے بھی سنگت و عی شریع کی تو میں نے خود سہا ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

خدا جانے کہاں سے ایک پیڑا سا بڑا کسی شہری بلی کوسلے کر چھت پہ چڑھ آیا تھا۔ جب کوئی مہذب و شیزہ سی بلی کسی ایجنڈ گنواہ کنی کے گلے کے گھٹے چڑھ جاتی ہے اور وقت بھی رات کا ہو تو پھر جانے دوع کے گردا گرد شاید ہی کوئی خوش نصیب ہو جو سکون کی میند سو سکے۔ بلی بیچاری اپنا پنڈا اٹھڑائے کی خاطر بے سہارے چلتی چاتی اور اسے اوجھ بھانگتی بھانگتی ہے۔ میرے بھائی زبیر میں سمجھ گیا کہ بلیوں کے لیے اوپر چڑھنے کی آہم وغیرہ ہر جگہ آہٹ ہے۔

آنکلی کی تھانگی میں ایسی ترسٹھکتی ہے کہ سوتے ہوئے ہر جاگ بیدار ہو جاتے ہیں۔ میں ڈشنام بندھا میں نے اٹھا کر کچھ ادا ہو جاتا ہے۔ گھنٹہ نو سیاہ پائڑیٹے لے مضمون۔ بلی کو گھر کے اوپر سے بڑی طرح بکڑ رکھا ہوتا ہے۔ وہ کسی کی برہنہت سے عاجز آ کر نہ ہی طرح کو سے چننا میں ایتنا ہے اور ادا سولے ادا جگہ لوگ آنکلوں چار پائیوں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ کوئی بھی نہ دیکھتا ہے کہ وہ اس حالت میں نہیں ہوتے۔ انہیں دیکھ کر جو کسی نے دوسری طرف کر لیتی ہیں اور مردانہ ان کی طرف۔

میں نے ایک بار بلیوں کوں کی ”گربہ مستیوں“ سے بڑا بڑا کراہیکہ مضمون ”بلیوں کے راستے بند نہیں ہوتے“ لکھا تھا۔ کوئی بازہ بکلی کا کرتے شیشیوں کی کڑیاں آٹلی لائے آبی خدقیں بانی و ام وغیرہ ان کی راز کراہ میں جاری نہیں ہو سکتے۔ اس کو چھوڑیں یہ تو اپنے ساتھ نوزائیدہ بچے بھی وہاں پہنچا آتی ہیں جہاں چھوٹا دواڑے نہیں دے سکتی اور پچھلی چھپ نہیں سکتی۔ کبوتر مرغیاں، بچہ جیر تو یہ کو سے کی کا بکوں کھڑی کے مضمون و جھروں سے مکھن سے ہال کی مانند کال کر لے جاتی ہے۔ ادا تو وہ ایسی جگہوں پر رکھے اور دکھائے برتنوں سے بھی پٹی جاتی ہے جدھر اس کی رسائی کا کوئی گل نہیں ہوتا۔ انسانوں سے وہ بالکل خائف نہیں ہوتی۔ سننا اس کا چیری اس لیے ہے کہ وہ اس کے چھپنے سے اچک لیتی ہے۔ ذرتی صرف باڑیٹے سے ہے

جو اس کی گردن اسی طرح ہی ڈبو چکا ہے جس طرح یہ چوہے کی گردن ڈبو چکی ہے۔ دونوں کے ڈبو پٹنے میں فرق یہ ہوتا ہے۔ بلی ڈبو پٹے تو چوہا پیٹ میں ہوتا ہے اور بلی ڈبو پٹے تو بلوگرے پیٹ میں ہوتے ہیں۔۔۔۔۔
قسط مختصر بلی جڑی کمیٹی، مکارہ خرافہ، خود پسند اور کھنڈری طبیعت کی ہوتی ہے۔ گھنپا پٹنے کی انتہا کہ سامنے پکارے کی ران دھری ہو مگر یہ دکھائی دینے والی دھڑکی کی چوہا پیٹ پکالے کر ہر چیز کا پیٹ تھمن کر دے گی۔

شاید سلسلہ گفتگو وہاں سے اکھڑا تھا جدھر میں تنگم کے سینکے پھنسا ہوا تھا۔ تنگم وہاں کچھ روز رکنا چاہ رہی تھی جبکہ منہاں سے بھاگنے کی فکر میں تھا۔ پرانے پنڈو بابے کہتے ہیں کہ منہاں کے گھر بھائی کٹا اور سوہرے گھر جوائی کٹا۔۔۔۔۔ میں بابے بھٹے شاہ کا کٹا تو بن سکتا ہوں لیکن کسی قلعے شاہ کا نہیں۔ شادی کے ایک لمبے عرصہ کے بعد مجھے تنگم کے ساتھ کسی سرسالی رشتہ دار کے ہاں جانے کا موقع ملا تھا۔۔۔۔۔ ذہن میں یہی تھا کہ داماد کی حیثیت سے خوب خاطر داری کا لطف اٹھاؤں گا مگر فسوس کہ میری یہ خواہش اک حسرت بن کر میرے لیے ایک آسیب کی صورت اختیار کر گئی اور جب تنگم کے آگے بھی میری ایک نہ چلی تو میں پھر سیالکوٹی وژن میں آ گیا۔

سیالکوٹیوں کی مسلسل فحش نے سوتے والوں کی میٹھی نیند میں کھنڈت ڈالی۔۔۔۔۔ اس کے بعد دو بلیوں میں لڑائی تھی، چوہا بلی کا بچہ تھا، بلی نے بچہ کھانسی۔۔۔۔۔ تنگم بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔۔۔۔۔ چوہا بلی اور بلی کے بچے پا پٹے۔۔۔۔۔
”کھنڈت کا لیاں، کھنڈت کا لیاں، کھنڈت کا لیاں، کھنڈت کا لیاں“

میں نے کمال کھنڈت کی سی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔
”ابھی ابھی آکھ گئی تھی، ابھی ابھی آکھ گئی تھی، ابھی ابھی آکھ گئی تھی، ابھی ابھی آکھ گئی تھی۔“

اکھڑا ہوا تو راتے ہوئے پھر سونے کی تہیاں شروع ہو گئیں۔ بمشکل پلک سے پلک بڑی ہوئی کہ پھر کھنڈت ماری بلیاں آنکھیں۔ لڑائی جھگڑا تو سبائی نہ دیا الہتہ آوار کا شروع ہو گیا۔ گتا تھا وہ خود جس تازہ کار و بیوہ ہوئی ہیں۔ ایک فریادیں نکلیں اور بین کہ سن بن کر گھیر نہ آتے۔۔۔۔۔ کسمسا اور یوزا کر پھر سارے کوٹھے والے بعد میری تنگم اٹھ بیٹھے۔۔۔۔۔ خود کوٹھ کی مانند آنکھیں پھاڑے خود کو کوس رہے ہیں کہ ٹوڑی بلیوں کے روتے پٹنے اور بین بطوری کے لیے کیا بلی کو ضرور کیا تھا؟ اکھڑا تھا میں بڑے گھومڑے کہ نہیں نظر آئیں تو دس ماریں مگر بلیاں تو چھٹا دوں کی ممالیاں ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ اس پھر وہ منہاں میں تہاں سوارے پھر سب لڑکھا۔۔۔۔۔ بلی کوٹھ کی طرح کوٹھ نیند بھی میٹھی طویل راتوں میں بڑی اکھن دیتی ہے۔۔۔۔۔ دیر ہو کر فوج کھنڈت کا کھنڈت پھر کھنڈت سے اپنی دردناکی سمیت وارہ ہو جاتی ہیں کہ آنکھوں میں کاسٹ کا شٹ کھینے ہوئے نیند کے کسان پھر اٹھ بیٹھتے ہیں چاروں اطراف فوج گر گر باؤں کو تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے سوچتے ہوں گے

قبول تو تھا مگر اس پر اسے وضو کے کا مرتکب ہونا منظور نہ تھا۔ نماز کے بعد لوگ میری زیارت اور دعاؤں
تعوذوں سے مستفید ہونا چاہتے تھے مگر اچانک میری طبیعت خراب ہو جانے سے ان میں خاصی مایوسی پھیل گئی
تھی۔ وہ دُور سے مجھے لینے ہوئے دیکھ کر ہاتھ اٹھا کے شاید میری صحت کے لیے دعا نہیں مانگ رہے تھے۔ میں
سوچ رہا تھا یہ بھولے بھالے لوگ دعا مانگ رہے ہیں کہ میں صحت مند ہو جاؤں تاکہ میں ان کے لیے
دعا نہیں مانگوں۔ یہاں یہ فلسفہ بھی سمجھ میں آیا کہ اللہ کریم چاہتا ہے اس سے مانگا جائے اسے قاضی الحاجات کہا
جائے۔ تاکہ وہ ہماری حاجتیں پوری کرے۔ اور یہ بھی کہ کسی دانی وہ اسب کو اپنا وسیلہ بھی مقرر کیا جائے۔
کسی اچھے وکیل کا مقرر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ مقدمہ صحیح ہاتھوں سے ہوتا ہوا منصف تک پہنچ رہا ہے۔

پریزی کھانا اور قبوہ۔ طبیعت سخت بیزار پڑے پڑے بھی پور ہو گیا تھا۔ بیماری چونکہ خود ساختہ تھی
محض جمعہ کی نماز نہ پڑھانے کی خاطر نہیں بلکہ میں خود ہی تندرست ہو گیا تھا۔ میرے محافل کی جان میں
بھی جان آگئی تھی۔ کمال یہ کہ ابھی تک میرے علم میں یہ نہ تھا کہ میں راہ میں اٹھیں یا کسی منزل پہ۔۔۔ ظہر کی
اذان کا ابھی زور دور تک پڑ نہ تھا کہ ظہر کے باہر کچھ معمول سے زیادہ لمبل سی محسوس ہوئی ابھی میں اس
سے کچھ توجہ دینے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک نوجوان اندر داخل ہوا اور سید صاحب سے کئی مائدہ میرے
پاؤں پہ جھپٹا۔

UrduPhoto.com

میں نے پشتوں میں کچھ دایا کرنا شروع کر دیا۔ ظہر بے میں سیر اساتھ کیا تھا ابھی ایسی ہی آقا کہاں سے آگئی۔
گندھے پہ ہاتھ مار کر ہنسنے لگا۔ سید صاحب تو دس وارسک والا میرا حقیر سے منہ میرے پاؤں ڈاہنے والا
"امیری چھلی میرا سونکا کھوٹا" "قیم یونس خان تھا" میں نے اس کے چہرے پہ نظریں گارے تکتا رہا۔
کچھ مقام اور سچاٹے ایسے بھی ہوئے ہیں کچھ کھانا کھاتے ہیں کھانا نہ سکتا، محض آنکھیں شگم ہوتی
ہیں۔ بڑی طبعیت اور وہ ایک گھٹنہ ٹھہرین اکہ ڈاہنے کا مانی انصاف خوب سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ سوال اور
جوابات سب کچھ۔ مگر غصہ شیں اور لگا ہوں کی زبان سے۔ "شاید میری لگا ہوں کی تاب نہ لاسکا اور نہ ہی
اس سے میرے اس سوال کا جواب بن چکا کہ" "تم نے اپنے شاہ صیب کو سی انوا کر دیا؟" وہ گڑبڑا کر پھر
میرے پاؤں میں گر گیا۔

"یونس خان اکیسے ہوا؟ اٹھو آرام سے مجھے کہ بات کرو۔" یہ ڈا شادی ہو گئی یا ابھی۔
اس نے اپنی دگرگوں حالت پہ قابو پانے میں خاصا وقت لیا۔ گتا تھا وہ اپنے دل و دماغ میں بہت
کچھ دبا رہے ہوتے۔ وہ پہلے سے کچھ بدلا ہوا اور کھوٹا کھوٹا سا تھا۔ کچھ سرت ہلانے کے بعد اس نے بتانا
شروع کیا کہ کس طرح پھپھی می اس کے پیٹ سے حاصل ہونے والا سنگ دان پشاور میں اپنے علاقہ والے
جوہری کو دکھاتا۔ اس کو فروخت کر کے واپس اپنے گاؤں پہنچتا اور پھر طے شدہ رقم لے جا کر اپنے ہونے والے

شہر سے ملاقات کر کے نکاح کی تاریخ کے لیے کہنا... اور پھر اس کا اعتراض ڈالنا کہ ثابت کرو کہ یہ رقم تم نے جائز طریقہ سے حاصل کی ہے۔ وہ پھر میرے پاؤں پکڑتے ہوئے گلگایا۔

”شاہ ضیہ اللہ نے پاک کی قسم نہ تو میری نیت تھی اور نہ ہی میں نے خود دانستہ ایسا کیا... میں نے بہت اُس کو سمجھایا قسم کھایا کہ وہ تو میں نے جس پوزیشن پر ہے اور نہ کرانے کی قاطعی کی ہے۔ یہ میرے خدا کے پاک سے دیا ہے۔ میرے شاہ ضیہ کی دعا سے۔ لیکن وہ دیوت نہیں مانا اور بولایا یہ پیسے اٹھا کر لے جاؤ میں رشتہ نہیں دیتا۔ اب شاہ ضیہ! میں نے مجبور ہو کر ترکہ بولایا۔ ترکہ نے بھی یہی فیصلہ دیا کہ اگر تم نے جائز طریقہ سے یہ رقم حاصل کیا ہے تو اس کا ثبوت دینے میں کیا اعتراض ہے؟ شاہ ضیہ! پھر میں نے دُرتے دُرتے آپ کا بتایا کہ آپ میرے ہیر بابا ہیں۔ آپ نے اپنی کرامت اور دعا سے مچھلی کے پیٹ سے مجھے جو اہرات دلوایا ہے اور یہ بھی بتایا تھا۔ حضرت یونسؑ کی طرح میری مشکل کا حل بھی مچھلی تھا کہ مجھے مسکین کا نام بھی یونس خان ہے۔ شاہ ضیہ! اب مصیبت یہ پڑا کہ سب گاؤں قبیلہ والا میری سماعت میں ہو گیا۔ کہنے لگا کہ شاہ ضیہ کو ادھر بٹاؤ ہم بھی ان سے اعابرت لے لے گا۔ شاہ ضیہ! ادھر تو علاقہ غیر ہے پاکستان کا حکم قانون تو ادھر نہیں چلتا اور نہ ادھر کا اور چلتا ہے۔ میں نے ان کو منع کر دیا ہاں میری کسی سے نہیں سنی۔ آگے آگے دیکھو یہاں کی حالت کی کوئی تصویر دیکھو۔ ان کے گاؤں میں کچھ اور ہر پتلیا ہے۔ خدائے پاک کی قسم میں نے ان کو بہت منع کیا مگر وہ۔“

میں نے اس کی رواں بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں تم میری فکر نہ کرو۔ بالواسطہ کب ہو رہی ہے۔ اللہ نے مجھے تمہاری

شادی میں شرکت کے لیے یہاں بھیجا ہے۔“

وہ تو خوشی سے دیوانہ ہو گیا، اک دم چھانک کا اٹھا۔ باہر رات تھی۔ میں پہنچا چادرا اتار چ سے بھٹکی بندوق سیدھی کی۔ اذان اذان تین قازت لے لے ساتھ باہر کھڑے لوگوں نے بھی یہی عمل دہرایا۔ میرا تو کچھ اچھل آیا۔ مارے خوف میری تھکی بندھ گئی۔ یوں گھوس جیسے وہ احتیاب کر رہی تھی۔ باہر لوگوں کی حالت دیدنی تھی، جوش و خروش کا یہ عالم کہ اک آوے کو مبارک سلامت دہری ہے۔ پشٹو میں گیت اور اصولی چٹنی بھی شروع ہو گئی۔ میں خبروں کہ ان اللہ کے بندوں کو کیا ہو گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ لوگ یونس خان کی شادی میں میری شرکت کے سلسلہ میں خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔

ان بنگالوں سے ذرا کی دارالفرست تھی تو یونس خان بڑے ادب سے سر جھکا کر اللہ راعل ہوئے۔

”شاہ ضیہ! اجازت ہو تو ہم کچھ دیر بعد اپنے گاؤں روانہ ہو جائیں۔ انشاء اللہ! شام سے پہلے پہلے

اپنے گھر پہنچ جائیں گے۔“

حواس بحال ہوئے تو اگلے روز میں نے یونس خان کو تھلیہ میں بٹا کر پوچھا۔

”عزیز حسن! آپ کے کیا ارادے ہیں.....؟“

جواب میں بتانے لگا۔ ”آج عصر کی نماز کے بعد میرا ہونے والا سسر آپ کی زیارت کے لیے آئے والا ہے۔ اصل مقصد اس کا یہ قصد ہے کہ میرے پاس جو رقم ہے وہ جائز ہے اور آپ اس کے گواہ ہیں۔“

”ٹھیک ہے مجھے یہ کہنے میں کوئی اعتراض نہیں۔“

سارا دن مصافحہ زیارت اور دعا میں چلتی رہی۔ یہاں کے لوگ حیران تھے کہ میں کوئی تعویذ گنڈا اور ٹھونک ٹھونک کیا کیوں نہیں کرتا۔ چھوٹے بچوں کی بناریوں کے تعویذ مانگنے والوں کی بہتات تھی۔ بوڑھے حج کے لیے آسانی کی دعاؤں کے طلبکار جوان طبقہ شادی کی رقم کے لیے میری کراہت کے خواہاں تھے۔ یونس خان کی طرح ہر جوان کی خواہش تھی کہ وہ حدیث میں پانی ٹھونکے اپنی شادی کا بندوبست کروائیں۔ یہ صورت حال میرے لیے بڑی خطرناک تھی۔ یونس خان والا ٹکا آب ہر جگہ تو گول ملک سکتا تھا۔ میں من ہی من میں دعا مانگ رہا تھا۔ ”اے پٹھانوں! چٹائیوں کے بھی مالک اب میری عزت سنا لیتے“ ترے ہاتھ میں ہے۔ پولیس کی دیکھو! انکڑوں کی طرح پٹھانوں کی عقیدت ابھی نہ ان کی بدعت اچھی ہے۔“

نہر نے بھی اس وقت کو یاد کیا۔ ”میں نے اس وقت کو یاد کیا۔“ اور نہ تھا۔ میں نے تو اس وقت کے لیے دوپٹہ بھیڑ کے سچے ساتھ لایا۔ لا لیا چنڈا اور ایک کھان تھا اسے دیکھ کر مجھ میں آیا کہ یونس خان کے ساتھ پھنڈا لانا ہوتا تھا۔ بھر حال تو ادا احترام و محنت سے پیش آیا اور اس رقم و سہولت میں کھڑی ہو گئی۔ میں نے یونس خان کے سامنے رکھ دیا اور یونس خان کی تعریف کرتے ہوئے مزید کہا کہ تمہاری بیٹی میں سے بہتر بہت بڑی ہے۔ اسی قسم کی اور بھی بہت باتیں ہوئیں۔ اللہ کا شکر کہ وہ مطمئن ہو گیا اور مجھ سے بہت سے معاملات میں دعا برائتوں کا متنی ہوا۔ اب آخری شرط پور ہو گئی اسے سن کر میں پریشان ہو گیا۔ شرط یہ تھی کہ آپ خود کالج پڑھائیں گے اور شادی کی تمام سہولت میں بھرپور شرکت کریں گے۔ شادی کی جو تاریخ رکھی گئی وہ پورے ایک ماہ کی تھی۔ میں نے شرکت کا وعدہ کر لیا مگر ایک شرط کے ساتھ۔ میں پنجاب اپنے گھر جاؤں گا شادی سے کچھ دن عیش میں گزار سکے گا۔ وہاں سے آپ مجھے دوبارہ انوار کر کے یہاں لے آئیں۔ تب یہ بتایا کہ یونس خان عیش پسند ہے اس کی شادی کی تکمیل میں چھ دن بھی زبردستی شامل کر لیا گیا ہوں اس لیے اس کے سر پرست کی حیثیت سے اس کی شادی میں روایتی انداز سے شرکت کروں گا۔ اس کی عمر اس کے لیے کپڑے تھے لے کر آؤں گا۔ بات متحول اور دلچسپ سے تھی اس لیے سب کے لیے قابل قبول ہو گئی۔

قرعین! میں نے یہ سارا ڈراما ان سے جان چھڑانے کی غرض سے کیا تھا۔ مجھے ساری عمر بھی اگر وہ

وہاں اپنے پاس رکھتے مجھے کچھ فرق نہ پڑتا تھا۔ میں صرف اُن کی امدادی مقیمت اور اپنے ”شاہ ضیب“ ہونے سے ترکتا تھا۔

انسان کچھ بھی کر لے مگر دین کے نام پہ فراڈ نہ کرے۔ اللہ نے مجھے اور انہیں بچنے کی توفیق فرمائی۔ وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے میں نے چیدہ چیدہ لوگوں کو ٹھہرے میں بلایا اور کم و کاست بغیر اتمام اپنی کہانی سنائی کہ کس طرح میرے دوستوں نے مجھے نوکری اور اپنے نور ہٹانے کی خاطر وہاں شاہ ضیب بنا کر پیش کیا۔ ویسے میں خود بھی ایسا ہی مجبورا مکار اور فراڈ یہ سا تھا۔ اپنے مطالب کی بداموری کے لیے میں سو کبیس بدل لیتا تھا۔ پھر میں نے انہیں ’پیت خرابی کے سلسلہ میں‘ آواز بدلنے کا قصہ سنایا۔ مچھلی والی بھی جان ٹھنڈا سلوری سنائی۔ غرضیکہ اپنے پیٹ پہ سے سارے پردے اٹھا دیے۔ کسی انجام کی پروا کیئے بغیر پچھلے اگلے سارے فراڈ ٹھہرتے۔ کھانا پکانا، چھوڑا دیں، پھار مولاے اور سوکے لگانا وغیرہ پورے سیاق و سباق سے گوش گزار کر دیئے۔ یہ بھی بتا دیا کہ میں آدھا شیر وانی پنہان اور باقی سستی گہوار ہوں۔ ہمارے آباء و اجداد کسی افغانستان سے سیالکوٹ آئے تھے اور میری تعلیم زبردہ نازیرہ ہے۔ مقلد سب اجمال بیان کرنے کا حق ہے۔ یہ سیدھے سارے اللہ کے بندے میرے بارے میں کسی خوش فہمی میں پڑ کر نہ خود خراب ہوں اور نہ مجھے گناہ ہے۔ میں نے اپنے آپ کو ”شاہ ضیب“ کہا اور نہ ہی میں نے اپنے آپ کو ”شاہ ضیب“ کہا۔ بات کا بیان نہ کیا بلکہ سارے اقبال جرم کو میری ملاحتی کسر کسی اور جان چھڑا دے حکمت عملی تصور کیا۔

جب مجھے پتہ چل گیا کہ اول سے دوسرے میں پانچا گیا تو کمپ و انوں کی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اول تو علاقہ غیر سے کسی گاڑی کی واپسی ہی نہیں ہوتی اور اگر ہوتی ہے تو یوں تھوڑی اور عورت و قدر سے نہیں جھڑتی۔ یوں میری واپسی بھی ”خدا کی“ واپسی تھی جس طرح وہاں کی واپسی تھی کہ پراسرار سی حیثیت اختیار کرتی تھی جو میرے لیے مزید پریشانی کا سبب بنی کہ میں وہاں پہلے سے ہی ادھر کے توہم پرندہ قدرت پرست لوگوں میں گھرا ہوا تھا۔ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ پنہان اپنے اور دوسرے کے عہد کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ وہ مسلمان انسان مرد اور پنہان ہو ہی نہیں سکتا تو اپنے دھڑے کا پاس نہ کر سکتا ہو۔ اسی طرح کامیں بھی شادی میں شرکت کا ایک دھڑہ کر کے آیا تھا۔ اصل مقلد یہی تھا کہ یوں نان کی کمی نہ کسی طرح شادی سرانجام پا جائے۔ جس کی وجہ سے یہ سارے دھڑہ پیدا ہوئے تھے اور یہ بھی طے ہے کہ جو بھلا کام جس کے ہاتھوں انجام پائے ہو گا لکھا ہوتا ہے وہو اسی کے ہاتھوں ہو کر رہتا ہے۔

وقت مقرر نہ ہو گا کہ کھانا کھائی جائے وہاں کھلی کیا تھا اور وہ لوگ بھی پہلے سے وہاں پہ موجود تھے۔ اس بار یوں محسوس ہوا کہ میں انوار ہو کر نہیں بار خدا و رحمت اپنے دوستوں سے ملنے جا رہا ہوں۔ آدھی رات کا وقت جب ایک مخصوص پوائنٹ سے ہاتھ پھلا گئی تو اس پانچمین چار انوار کھدگان کی بجائے میں پچیس اسلو بردار

پٹھانوں کا جیش میرے استقبال کے لیے موجود تھا۔ یہ تو کچھ سفر طے کر لینے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ چار گوجر کے باقی تمام شاہیوں کے امیدوار تھے جنہیں شادی کے مصارف اور مطالبہ کی رقم کی ضرورت تھی اور یہ سب کچھ وہاں رہ کر جائز طریقہ سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ میری شکل میں انہیں بھی شادی والا لونا گیا ہونے کی کوئی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اب یہ حالت کہ یونس خان کی شادی کی تیاریاں زوروں پہ ہیں اور ادھر ان ناکھڑوں جوتوں کی خدمات بھی شروع پہ ہیں۔ دن رات میری ناز برداریوں میں بٹکتے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ کوئی پاؤں داب رہا ہے، کوئی پشتو کے گیت سن رہا ہے۔ الغورہ بج رہا ہے تو کہیں چنگ و زباب نہیں بجھ رہے ہیں۔ تلواریں و انگاروں پہ قدم۔ ہر جوان مجھ کی تعویذ کراست کا طلبگار جبکہ میری مصیبت کے میں انہیں اردو میں ہی سمجھا سکتا تھا۔ وہ ہاں ہاں کرتے رہتے مگر کسی کے پتے کچھ نہ پڑتا۔ ادھر وہ پشتون ملی گلی فارسی اردو میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتے اور میں بھی انہیں نہیں مانگتا تھا کہ میں ان کی بات خوب سمجھ رہا ہوں جبکہ بات ایک ہی تھی جو میں پہلے ہی سمجھ گیا ہوا تھا کہ وہ شادی چاہتے ہیں جو خیر خواہیوں کے بغیر ممکن نہیں اور وہ روپے حاصل کرنے کی کچی جھوٹی امید مجھ سے لگائے ہوئے ہیں۔ ”لا میری پٹھانی میرا نمونہ نموتی“ والا وحید ہر بچان کو زبانی اذیر ہو چکا تھا۔۔۔۔۔ وہاں پہاڑوں میں سے لی برساتی ندی تالے تو تھک کر باقاعدہ کوئی دریا نہ بن سکی تھی۔۔۔۔۔ پتھر کے ٹکڑے اور لٹریں اس کے کنارے گڑے ہوئے تھیں۔۔۔۔۔ چھوٹے موٹے برساتی پانی کے ذخیروں میں کسی نمونے نموتی والی پھلی کو پکڑنے کی کوشش کی گئی ہاں تو میسر نہ ہوئی تھی پھلی کہاں سے آتی۔۔۔۔۔


شادی سے فراغت ہوئی تو میں فوری واپسی کی کوئی موثر سی ترکیب سوچنے لگا کیونکہ میں شدت سے فحشوں کر رہا تھا کہ شادی اور اس کے پہلے کوڑے حاصل کرنے سے ملنے والی جوتوں کی تعداد اور اوقاف و شوق میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اسی نسبت میرے خدشات میں برکت پڑتی جا رہی ہے۔ ایسے ہی ایک نشست میں نسبتاً کچھ معقول سے ایک جوان نے جو اردو میں بھی شکر بڑا رکھتا تھا۔ مجھ سے پوچھا۔

”شاہ صاحب! جس عارف میں دریا اور پھلی نہ ہو۔۔۔۔۔ وہاں ”لا میری پٹھانی میرا نمونہ نموتی“ والا وحید کیسے کام کرنے لگا۔۔۔۔۔ آپ کے پاس اس کا کیا چوز تو رہے؟“

میں نے اک جہان سی ساعت میں اس کا سوال سنا اور سوچنے لگا کہ اس کا کون سا معقول جواب ہو سکتا ہے جو ہو بھی صاحب اس کو بھی مطمئن کرے اور مجھے بھی کسی مزید مصیبت میں مبتلا ہونے سے بچائے۔ دماغ کی گڑیاں اکر گر پھل رہی تھیں۔ میرا معمول رہا ہے کہ کسی سوال کا کوئی معقول جواب یا کسی مسئلہ کا صحیح حل مجھے نہ سمجھے تو میں دماغ اور فحش کو میٹھوں سے آنوٹینگ پہ لگا دیتا ہوں۔ اس طرح یہ نوک مجھے فضولی قسم کی ذہنی اتصال و اتصال سے محفوظ رکھتا ہے۔ آنوٹینگ تے ہی کھٹ خٹ سے نکلا۔

UrduPhoto.com

فوتو پھوٹو
مخصوص طور پر لوگوں کی سہولت



UrduPhoto.com

● درویشی فقیری..... اس کے کتنے زوہپ اور کیسے کیسے انگ رگ ہیں۔ کوئی کچھ بھتا ہے اور کسی کے ہاں اس کی تعریف کچھ اور ہے ریاضت و مجاہدات کو درویشی گردانتا ہے۔ کوئی مست است ہو کر مشیات میں فقیری تلاش کرتا ہے۔ میں نے جانا کہ یہ جہاں گردی کی دین ہے۔ یہ قیاس و قیافہ ہے قیاس بھی درویشی قیافہ بھی فقیری۔ جہاں گردی کی دین جہاں بانی جہاں گیری..... جہاں بینی و جہاں نووردی..... ہر لحظہ قیاس و قیاس برحق و حقی..... ہر گوشہ گمان میں کم فکشی.....!

● فرمانِ سدید ہے کہ درویش..... سورج بادل بھولا اور زمین کی مانند ہوتا ہے۔ وہ کاسہ درویشِ افلاک ہے۔ وہ قلم درویشِ جنت ہے اور اک ہے۔ وہ ابر صبرِ خاک ہے۔ وہ جنت میں بھی طاق ہے۔ وہ اک شعلہ بے باک ہے وہ بھٹکا ہوا آفاق ہے وہ ابر بیانِ صمد چاک ہے..... دراکھ اور بھی خاک ہے۔ یہ پراسرار ہونے کیا نہیں ہوتے؟ یہ لوگ سناں پہ تلی بھانے والے..... صبرِ مہکاں مٹاتی جاتے والے..... یہ آہ و نغماں سے نکلنے والے..... یہ کلمہ حق سنانے والے..... یہ فانی ہونے والے.....

● صادق افہامِ لوگ کہتے ہیں۔ کہیں بہت جہان بھی ہے جزا ہی ہے..... اور کہیں کم جہان عیبِ ضمیر ہوتا ہے۔ کہیں عقلِ میاں ہے تو کہیں عقل و دانش مختصر ہو جاتا ہے۔ کہیں حجاب ہے قبالی کی ذیل میں آتا ہے اور کہیں نقاب کی اوڑھن میں نقاب ہی آنکھیں کتنے جالوں کی پردہ پوشی کرتی ہیں گی..... انہی عقل مند اور ظاہر حق..... وہاں کی کائنات کبھی بے حجاب ہوتی ہے۔ شمشیر کی آب اور درویش کی اکاویں تاپ کے مقابلہ گردن ہے نہ گردن..... سنست کیلئے مرتبان میں ہی رہتے ہیں مگر کہنے والے حق بات ہی کہتے ہیں۔ مولوں کے بلوں کی مٹی بھر بھری ہوتی ہے۔ جو نہ تنگ کی نہ تھاگ کی..... مگر درویشوں 'عقاربوں کے گھونسلوں لٹکانوں میں خار۔ فیلاں کے آستر' بستر ہوتے ہیں جو تھلوں میں کسی کے پاؤں کی پازیب بھی اور کسی شانہ بدوش دار کے سر کا تاج بھی.....!

الہی! یہ کن لوگوں کے مگر ہوتے ہیں.....؟



● اس صحیفہ میں اُزمنہ قریب و قدیم کے بہت سے پُر اسرار واقعات و حالات درج ہیں..... کچھ کا تعلق تاریخ و تمدن اور کچھ کا سلسلہ اس دور کی طرز معاشرت، ثقافت اور تصوف و روحانیت سے جُڑا ہوا ہے..... تاریخ کا حصہ ایسے واقعات و حالات بنتے ہیں جن کے ڈانڈے عوام الناس، جغرافیائی اور سیاسی، سماجی معاملات سے جُڑے ہوئے اور انکسار من الشمس ہوتے ہیں..... صدیوں پرانے اسرار و واقعات جن کا واسطہ ذاتیات یا کسی مخصوص مقصد سے ہوتا ہے وہ سر راست ہی رہتے ہیں اور وقت زمانے کی زد میں آئے بغیر عہد رفتہ کا حصہ بن کر اساطیر میں ڈھل جاتے ہیں۔ اصول کائنات کے تحت جب کئی رد و بدل، ارتقا و تہذیب و تمدن کا نامور ہوا ہے، پھر بہت سے نوبت اخلاقی اسرار کا انبہار بھی ہوتا ہے۔ جیسے پہاڑوں کی آتش فشانی، دریاؤں سمندروں کے سیلاب و طوفان..... ارضی جھٹکے زلزلے آندھیاں، جھکڑ، آسمانی بجلیاں دھماکے وغیرہ اپنے اندر بے شمار کرشماتی اسرار رکھتے ہیں..... انسان کے لئے نئی نئی معلومات سامنے آتی ہیں۔ ارض و آفاق بحر و بر نے اپنے بقول میں جو کچھ پھپھایا ہوا ہے یہ سب کچھ جنوں اور انسانوں کے لئے ہے، قدیموں کے کام کی یہ چیزیں نہیں ہیں..... اب ان انسانوں میں کچھ مخصوص بندے بھی ہوتے ہیں یہ بندے خاص اس لئے ہوتے ہیں کہ ان کے پاس کچھ وہ بھی علوم مابعد الطبیعیاتی جتنیں اور چشم بینا ہوتی ہے۔ گزرا ہوا موجودہ اور آنے والا وقت زمانہ ان سے سرگوشیاں کرتا ہے۔ یہ اُن کے مزاج اور انداز سمجھتے ہیں۔ غیر مروجہ مُردہ زبانیں، لوجیں، حرف و نقش، اُن کے روبرو لب کشا ہوتے ہیں۔ روزِ نزول سے روزِ نشور تک کی ایک ایک ساعت، مخلوق کی ہر حرکت و نطق کی ایک اک جنبش تک رسائی اور آشنائی ہوتی ہے۔